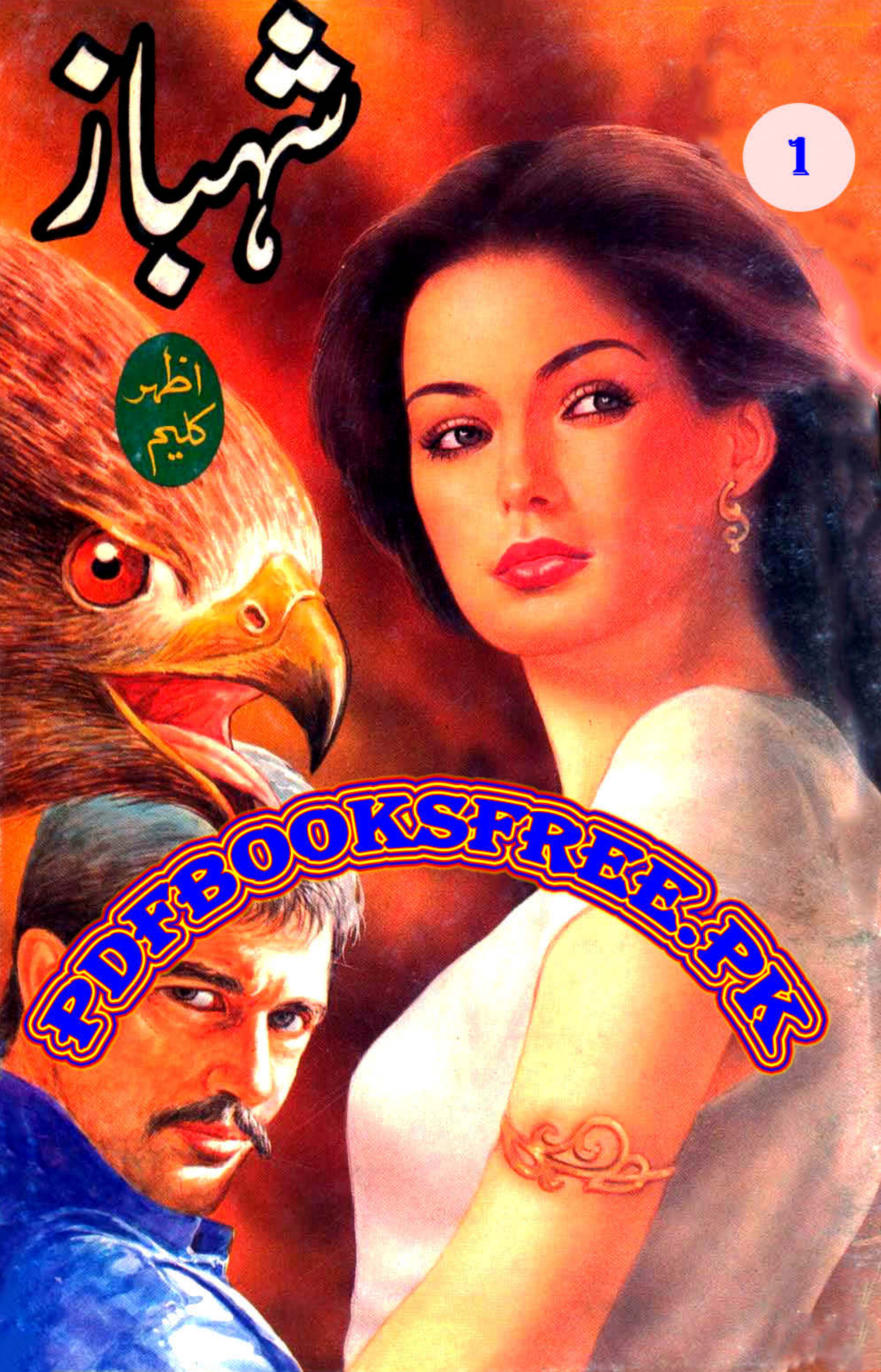

شہباز
1
اظہر
کلیم
PDFBOOKSFREE.PK

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شہباز

1

اظہر کلیم

PVL
PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جملہ حقوق محفوظ ہیں۔

بار اول : ۱۹۹۹ء

قیمت : ۵۴/- روپے

ناشر محمد علی قریشی نے نیر اسد پریس سے چھپوا کر

مکتبہ القریش لاہور سے شائع کی۔

میری داستان ہنگاموں سے لبریز ہے۔

میں ہنگاموں کا بیٹا ہوں، ہنگاموں کی گود میں میری آنکھ کھلی اور ہنگاموں ہی میں پروان چڑھتا رہا۔ زندگی بھر ان ہنگاموں نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔

میری کہانی کا آغاز درحقیقت میرے بابا شالیار خان کی زندگی کے ایک ایسے دن سے ہوتا ہے، جس نے نہ صرف اُن کی زندگی کا رُخ موڑ دیا بلکہ ان کی ذہنی حالت بھی بدل کر رکھ دی۔ یہی وجہ ہے کہ میری داستان کا ابتدائی حصہ بے حد رقت آمیز اور حزنیہ ہے۔ میں اُن دنوں دُنیا میں نہیں تھا لیکن آج بھی تصور کی آنکھ سے ان مناظر اور واقعات کو بالکل اسی طرح دیکھ سکتا ہوں جس انداز میں، وہ ماضی کے اَوراق پر نمودار ہوئے تھے۔

میری کہانی کا ابتدائی حصہ چند بوسیدہ اَوراق پہ پشتو زبان میں لکھا ہُوا ہے جو امتدادِ زمانہ کے باعث اب اس قابل بھی نہیں رہے کہ اُنہیں اُلٹ پلٹ کر دیکھا جا سکے۔ . . یہ اَوراق بوڑھے مُراد خان نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں لکھے تھے اور اس واقعے کو اُس نے میرے بابا کے لیے تحریر کیا تھا۔ اُسی سے میری داستان کا آغاز ہوتا ہے۔

"پانوش آج بہت خوش نظر آتا ہے۔ میں بیمار ہُوں لیکن میری بیماری پانوش کی خوشی کی وجہ سے آدھی رہ گئی ہے۔ وہ اُس نئے جھونپڑے سے کچھ فاصلے پر کھڑا دُور اُفق کی طرف دیکھ رہا ہے جہاں گرد و غبار اُٹھتا نظر آتا ہے۔

آج پانوش کے بھائی شالیار خان کی واپسی کا دن تھا۔ اور پانوش اس کے انتظار میں، ایک چٹان پر جا کھڑا ہُوا تھا۔

پانوش بہت اچھا بچہ ہے۔ میرا بے حد احترام کرتا ہے . . . میں بھی اسے بیٹوں کی طرح عزیز رکھتا ہُوں۔ آخر ان دونوں کے علاوہ اَب اس بھری دُنیا میں میرا ہے بھی کون؟

پانوش کی آنکھیں اُس راستے پر جمی ہُوئی تھیں جس پر شالیار خان کو واپس آنا تھا . . . دُور اُفق پر جو گرد و غبار سا چھا رہا تھا، اُسے میں بھی دیکھ سکتا تھا۔ یقیناً کوئی گھڑسوار تیزی سے چلا آ رہا تھا۔ اچانک لیٹے لیٹے میرے پیٹ میں شدید تکلیف اُٹھی۔ میں بے چین ہو گیا۔ بیمار تو تھا ہی . . . مروڑ اُلگ پریشان کر رہے تھے۔ میں کراہتا ہُوا بستر سے اُٹھا اور ہانپتا کانپتا جھونپڑے سے کچھ دُور واقع درختوں کے ایک جھنڈ کی طرف چل دیا۔

درختوں کے جھنڈ سے نکل کر میں ابھی چٹان کی اوٹ میں تھا کہ میرے کانوں سے گھوڑوں کی ٹاپیں ٹکرانے لگیں۔ میں ٹھٹھک گیا۔ شالیار خان کو تنہا واپس آنا چاہیے تھا . . . پھر یہ گھڑسوار کون ہو سکتے ہیں۔ اِسی اُلجھن کا شکار میں چٹان کی اوٹ میں کھڑا تھا کہ میری ٹانگوں نے میرے جسم کا بوجھ سہارنے سے انکار کر دیا اور میں گر گیا۔

میں بمشکل گھسٹتا ہُوا چٹان تک پہنچا اور اس سے ٹیک کر بیٹھ گیا۔ میری سانس بُری طرح پھُول رہی تھی اور میں خود میں مزید چلنے کی ہمت نہیں پا رہا تھا۔

میرے کانوں سے گھوڑوں کی ٹاپیں اب بھی ٹکرا رہی تھیں۔ میں نے چٹان کے سہارے جھُک کر پانوش کو آواز دینے کا فیصلہ کیا تاکہ وہ مجھے سہارا دے کر جھونپڑے تک پہنچا دے . . .

لیکن میں نے جو کچھ دیکھا اُسے دیکھتے ہی میرا حلق خشک ہو گیا اور باوجود کوشش کے آواز نہ نکل سکی۔

پانوش کا دایاں بازو اُٹھا ہُوا تھا اور کچھ اس انداز میں حرکت کر رہا تھا جیسے وہ کوئی چیز گِن رہا ہو... ایک جھٹکا... دوسرا جھٹکا... پھر تیسرا... حتیٰ کہ اس کے بازو نے چھ جھٹکے کھائے میں نے ایک طویل سانس لی۔ یقیناً وہ اِن گھوڑوں کو شمار کر رہا تھا جن کی میں ٹاپیں سُن رہا تھا۔

میرا دل شدت سے دھڑکنے لگا۔

بار بار عجیب سے خدشات میرے ذہن میں پیدا ہو رہے تھے اور مجھ بیمار بوڑھے کو ہلکان کر رہے تھے۔ میں ان وسوسوں کے جنگل میں پھنسا چٹان کی اوٹ میں ٹیک لگائے بیٹھا ہانپتا رہا... اور جس قدر بھی گردن کو گھمانا ممکن تھا، اُسے گھما کر پانوش کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ جس انہماک سے گھڑ سواروں کو شمار کر رہا تھا، اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اُسے کسی خطرے کا احساس نہیں ہے۔ نہ جانے کیوں مجھے بار بار یہ احساس ہو رہا تھا کہ یہ ٹاپیں درحقیقت موت کے قدموں کی آہٹیں ہیں جو آہستہ آہستہ ہمارے جھونپڑے کی طرف بڑھ رہی ہیں... لیکن پانوش کے انداز میں ذرا سی بھی گھبراہٹ نہیں تھی۔ شالیار خان کو فوج میں بھرتی ہُوئے تین ماہ سے زائد ہو گئے تھے اور وہ پہلی بار ہم سے ملنے واپس آ رہا تھا... میں نے اپنے سٹھیائے ہُوئے ذہن کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ اس کے چند ساتھی بھی تو اس کے ساتھ آ سکتے ہیں۔ میں نے خود کو سمجھایا لیکن دل جب گھبراہٹوں کا شکار ہو تو اسے قائل نہیں کیا جا سکتا۔

میں نے چٹان کی اوٹ سے ایک بار پھر دیکھا۔

میری سانس بُری طرح پھُول رہی تھی۔

میں اپنی کانپتی ہُوئی اور کمزور ٹانگوں کو دبانے لگا کہ شاید اسی طرح دورانِ خون کچھ ٹھیک ہو جائے اور میں اُٹھ کر جھونپڑے تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاؤں...

پانوش مجھ سے کافی فاصلے پر تھا۔ میں نے ایک بار پھر اُسے پکارنے کی کوشش کی لیکن میرے حلق سے ایسی آواز نکلی جیسے کسی مینڈک پر پاؤں پڑ جانے سے اس کی ٹرٹراہٹ نکل جاتی ہے... یقیناً پانوش اتنی خفیف سی آواز پر چونک نہیں سکتا تھا۔ ہَوا تھم چکی تھی۔

رات بھر بادل چھائے رہے تھے لیکن علی الصباح چند آوارہ ٹکڑوں کے علاوہ آسمان پر کچھ نہیں تھا۔ سورج نکل چکا تھا اور اس کی تیز کرنیں مجھے چُبھتی ہُوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ ان کرنوں کی حرارت سے میرے ٹھٹھرے ہُوئے وجود کو کافی سہارا ملا لیکن میں پھر بھی حرکت کرنے کے قابل نہ ہو سکا۔

پانوش کا دایاں ہاتھ ایک بار پھر شمار کرنے کے انداز میں جھٹکے کھا رہا تھا۔ غالباً وہ گھڑ سوار اب نسبتاً زیادہ واضح طور پر دکھائی دینے لگے تھے... اور وہ دوسری بار انہیں گِن کر یقین کر لینا چاہتا تھا کہ کہیں پہلی مرتبہ گننے میں کوئی غلطی تو نہیں ہو گئی۔ ایک... دو... تین... حتیٰ کہ چھ بار اس کے بازو نے جھٹکا کھایا۔ وہ تعداد میں یقیناً چھ ہی تھے۔

"مُراد بابا..." پانوش نے پلٹ کر جھونپڑے کی طرف دیکھتے ہُوئے چیخ کر کہا "دیکھو... بھائی آ رہا ہے... اور اس کے ساتھ پانچ اور سوار بھی ہیں۔"

اس کی تیز آواز میری سماعت تک پہنچ گئی لیکن میں جواباً صرف تھوک ہی نگل کر رہ گیا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میری ٹانگیں مفلوج اور بے جان ہو گئی ہوں۔ میرے حلق میں کانٹوں جیسی چبھن تھی اور میں بولنے سے معذور ہو گیا تھا۔

پانچ سوار... چھٹا یقیناً شالیار خان ہی ہو گا۔ میں نے خود کو اطمینان دلانے کی کوشش کی لیکن وسوسوں کے گھر میں اطمینان کی خفیف سی لہر بھی نہیں دوڑی۔ پانوش کی بات سے البتہ میں یہ ضرور سمجھ گیا تھا کہ آنے والے فرس خان کے آدمی نہیں ہیں، بلکہ فوجی ہیں۔ اگر وہ لوگ وردیوں میں نہ ہوتے تو پانوش یقیناً بدک جاتا اور کبھی اس چٹان پر نہ کھڑا رہتا جہاں اس پر میلوں دُور سے بھی نگاہ پڑ سکتی تھی۔

اس سے پہلے بھی وہ ایک بار ایسا ہو چُکا تھا۔ وہ اسی چٹان پر کھڑا اپنے بھائی کی راہ دیکھ رہا تھا کہ اچانک اُسے دو گھڑ سوار دکھائی دیے تھے... چونکہ یہ گھڑ سوار فوجی وردیوں میں نہیں تھے اس لیے وہ اپنی ناکارہ ٹانگ کو ایک ہاتھ کے سہارے دباتا ہُوا جھونپڑے میں آ گیا تھا اور مجھے قبل از وقت اطلاع مل گئی تھی اس لیے میں نے احتیاطاً جھونپڑے سے نکل کر پانوش کے ساتھ ایک ایسے غار میں پناہ لے لی تھی جسے آسانی سے تلاش نہیں کیا جا سکتا تھا۔

میں نے اپنی شل پنڈلیوں کو خاصا دبایا تھا لیکن میری ٹانگیں اب بھی بے جان تھیں۔

گھوڑوں کی ٹاپیں اب مزید واضح ہو گئی تھیں اور ان ٹاپوں کو میں بلاوجہ ہی اپنی دھڑکنوں سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا کیوں کہ میرا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دل نسبتاً زیادہ تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

میں نے پانوش کی طرف دیکھا۔

وہ بے حس و حرکت کھڑا تھا۔

اس کے جسم میں خفیف سی بھی حرکت نہیں ہُوئی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اس چٹان پر کھڑے کھڑے خود بھی پتھر کا ہو گیا ہو۔ "پانوش!" میں نے پُوری قوت سے اُسے پکارنے کی کوشش کی۔ اس بار بھی آواز مینڈک کے ٹرانے جیسی ہی تھی جسے صرف میں ہی سُن پایا تھا۔ معلوم نہیں یہ خفیف سی آواز بھی نکلی تھی یا نہیں؟ ممکن ہے میں نے اس آواز کی بازگشت ہی سُنی ہو... آواز میرے حلق سے نکلنے کی بجائے حلقوم میں گونج کر رہ گئی ہو، اور میں نے اسے صرف اپنے احساس کے باعث سُنا ہو۔

اُف خدایا! میری رُوح تک کراہ اُٹھی۔

بڑھاپا بجائے خود سو بیماریوں کی ایک بیماری ہوتا ہے... پھر میں کئی روز سے بیمار تھا اور [illegible] نے مجھے ہڈیوں کے ڈھانچے میں تبدیل کر دیا تھا۔ شالیار خان کی آمد کی اطلاع ایک سپاہی نے دی تھی۔ یہ سپاہی اس کا دوست بن گیا تھا اور رونیال کے ایک شمالی گاؤں کا باشندہ تھا۔ اس نے گھر جاتے ہُوئے، راستے میں رُک کر ہمیں شالیار خان کی خیر و عافیت بتاتے ہُوئے یہ مژدہ بھی سُنایا تھا کہ وہ تین روز بعد علی الصباح ہمارے پاس پہنچ جائے گا... جس وقت وہ فوجی یہ اطلاع لے کر آیا تھا، میں زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھا...

پھر خوشی کی چند سانسوں نے میرے جسم کو توانائی دی اور میں دل ہی دل میں خُدا سے دُعا کرنے لگا کہ اگر میری موت قریب ہے تو اسے شالیار کی آمد تک مجھ سے دُور ہی رکھے... اور اب جب کہ شالیار کو آ جانا چاہیے تھا... ان لمحوں میں اُس کی بجائے انجانے خدشات اور بھیانک وسوسے ہی چلے آ رہے تھے۔

پانوش کے بے حس و حرکت ایستادہ جسم کو دیکھ کر میں سمجھ سکتا تھا کہ وہ گرد و پیش سے بے نیاز ان گھڑ سواروں کو دیکھنے میں مصروف ہے جو سیدھے اسی طرف آ رہے تھے۔ اگر ان گھڑ سواروں میں شالیار خان موجود ہوتا تو وہ یوں ساکت و جامد کبھی نہ رہتا۔ اپنی ایک ناکارہ ٹانگ کے باوجود وہ خوشی سے یقیناً ناچنے لگتا۔

وہ اُنیس سال کا ہو چکا تھا۔ اس کا قد لمبا تھا اور اس کے بال بھُورے تھے۔ اس کے چہرے میں بے پناہ کشش تھی۔ یُوں تو پٹھان تقریباً سارے ہی سُرخ و سپید ہوتے ہیں لیکن پانوش کے حُسن میں کچھ اور ہی رنگ تھا۔ اس کی آنکھیں اتنی چمک دار تھیں کہ بعض اوقات ان میں جھانکنا ناممکن ہو جاتا تھا۔ اس کی آنکھیں نیلی تھیں... نیلی اور چمک دار۔

اگر ان گھڑ سواروں میں شالیار خان موجود نہیں ہے تو پھر یہ کون لوگ ہیں؟ میں اپنے سٹھیائے ہُوئے ذہن کو مصروف رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہر گھڑی یوں لگتا جیسے اب میری سانسوں اور جسم کا تعلق ختم ہو جائے گا۔

ابھی نہیں... خدایا... ابھی نہیں۔ میں شالیار خان سے ملے بغیر نہیں مرنا چاہتا۔ میں نے صدقِ دل سے دُعا کی۔

سُورج اب خاصا بلند ہو چکا تھا اور اس کی کرنوں میں جھُلسا دینے والی حرارت پیدا ہو گئی تھی۔ میں جس چٹان سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا، وہ بھی گرم ہو چکی تھی اور اس سے ٹیک کر بیٹھنا محال ہو گیا تھا۔ مجھے افسوس ہونے لگا کہ میں جھونپڑے سے اتنی دُور کیوں نکل آیا تھا۔ پیٹ میں تو مروڑ اب بھی اُٹھ رہا تھا... لیکن اب میں ایک قدم بھی نہیں سرک سکتا تھا۔

میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا پیٹ دبا لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ درد ناقابلِ برداشت اور سوچیں ناقابلِ ضبط ہو رہی تھیں میں نے چٹان سے سر ٹکرا دیا اور چند لمحوں تک چکراتے ہُوئے سر کو سنبھالنے کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ چاہے میری جان ہی کیوں نہ نکل جائے میں گھسٹ کر پانوش کے پاس پہنچ جاؤں۔

خود کو زمین پر گرانے سے میرا جسم چیخ اُٹھا۔

میری آنکھوں میں بے شمار آنسو آ گئے۔

میں کہنیوں کے بَل بھی اپنے جسم کو گھسیٹ کر آگے نہیں لے جا سکتا تھا۔ میرے بازو بھی ٹانگوں کی طرح شل ہو رہے تھے۔ میں اوندھے مُنہ اس چٹان کے قریب پڑا رہا... لیکن... دل ہی دل میں خدا کا شکر بھی ادا کر رہا تھا کہ میں ایک ایسی جگہ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا جہاں سے کم از کم پانوش تک میری نظریں پہنچ سکتی تھیں... ورنہ میں چٹان سے کچھ پیچھے ہی بے بس ہو جاتا تو شاید تنہائی کی وجہ سے میرا دَم ہی گھُٹ گیا ہوتا۔

اب میرے پاس خاموش تماشائی کی حیثیت سے اوندھے پڑے رہنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں اپنی دھندلائی ہُوئی آنکھوں سے پانوش کو دیکھتا رہا جو اس وقت برہنہ چٹان پر غیر مسلح کھڑا تھا اور نیچے راستے پر نہ جانے کون آ رہے تھے؟ دوست تھے یا دشمن؟ میں نے ایک بار پھر ذہن سے ان اندیشوں اور خطرات کے احساسات کو پوری قوت سے دھکیل کر ان کی طرف سے خیالات کے ہر دروازے کو بند کر لینے کی کوشش کی لیکن ذہن ایک [illegible]

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے جس میں ان گنت خیالوں کے ان گنت دروازے ہوتے ہیں۔ میں بھلا کس کس دروازے کو بند کرتا؟ ایک دروازہ بند کرتا تھا تو ایک خوف و خدشے کے عفریت سے نجات مل جاتی تھی لیکن دوسرے ہی لمحے کئی اور دروازے کھل جاتے تھے۔

پانوش کو رائفل چلانے کی خاصی مشق تھی۔ میں نے اُسے نشانے بازی میں خاصا ماہر بنا دیا تھا لیکن وہ فطرتاً ایک نرم دل کا لڑکا تھا اس لیے وہ رائفلوں یا کارتوسوں کو کبھی پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتا تھا۔ خاص طور سے جانوروں پر گولیاں چلانے سے تو اُسے شدید نفرت تھی۔ اس لیے شکار بھی مجھے خود ہی کرنا پڑتا تھا۔ بعض اوقات تو شکار کے دوران اس کی وجہ سے خاصی دشواریاں پیدا ہو جاتی تھیں۔ عین اس وقت جب کہ کوئی پہاڑی بکرا یا ہرن میرے نشانے کی زد پر ہوتا، وہ مجھے چونکا کر یا ہاتھ سے رائفل کا رُخ موڑ کر اُسے بچا لیتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ شکار کے لیے جاتے وقت میں اُسے بہت کم ساتھ لے جایا کرتا تھا۔

کاش! تم نے اپنے ہاتھ میں رائفل رکھی ہوتی۔

میرے دل میں اچانک ہی یہ خواہش پیدا ہوئی۔ اب بھی موقع تھا۔ وہ جھونپڑے کے اندر جا سکتا تھا اور اپنی رائفل سنبھال کر واپس چٹان پر آ سکتا تھا۔ .. لیکن وہ نہ جانے کن خیالوں میں کھویا کھڑا تھا۔ اگر وہ جھونپڑے میں چلا جاتا تو اُسے میری عدم موجودگی کا بھی پتا چل سکتا تھا۔ .. اور تب وہ میری تلاش میں اس چٹان کی طرف بھی آ سکتا تھا۔ .. لیکن یہ سب کچھ میرے جذبات، میرے احساسات اور میرے خیالات ہی تک محدود رہا... اور وہ چٹان پر بے حس و حرکت کھڑا اُس راستے کی طرف دیکھتا رہا جس پر اس کے بھائی کو آنا تھا۔

پانوش اس وقت وہی مخصوص لباس پہنے ہوئے تھا جو اُس کے بھائی نے کسی دوست کے ہاتھ اُسے بھجوایا تھا۔ وہ اپنی عمر کی مناسبت سے زیادہ قد کا لڑکا تھا۔ اگر وہ بے حس و حرکت کھڑا یا بیٹھا ہو تو کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس کی ایک ٹانگ خراب ہے... بس صرف چلتے وقت لنگڑاہٹ نظر آتی تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنی صحت مند ران کو جکڑ لیتا تھا اور پھر معذور ٹانگ کو ایک قدم آگے بڑھا کر آہستہ آہستہ لنگڑاتا ہوا چلنے کا عادی تھا۔

اچانک مجھے اس کا کتا دکھائی دیا۔

یہ کتا جھاڑیوں سے نکل کر تیزی سے پانوش کی طرف دوڑا تھا اور پھر دُم ہلاتا ہوا اس کے قریب ہی پچھلی ٹانگوں کے سہارے نیم نشستی حالت میں بیٹھ گیا۔

"بھائی گھر آ رہا ہے... بھائی گھر آ رہا ہے، پشیو۔" پانوش کی آواز میرے کانوں تک پہنچی اور ایک طویل سانس لے کر میں نے اپنا جسم ڈھیلا چھوڑ دیا۔

اس کی خوشگوار آواز نے میرے دل و دماغ میں ننھی ننھی چھپکلیوں کی طرح چپکے ہوئے خوف و خدشات کو ختم کر دیا۔ یوں لگا جیسے میرے جسم میں توانائی کی لہر دوڑ گئی ہو۔ میں نے سر اُٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ اب بھی میری طرف پشت کیے، نیچے راستے کو گھور رہا تھا اور اس کا ایک ہاتھ اپنے کتے کی گردن سہلا رہا تھا۔ پشیو حالانکہ پشتو میں بلی کو کہتے ہیں لیکن اس نے نہ جانے کیوں اپنے کتے کا یہی نام رکھ لیا تھا۔ میں اکثر اس بات پر اُس کا مذاق بھی اُڑاتا رہا ہوں لیکن وہ مسکرا کر چپ ہو رہتا تھا۔

سورج اب آگ برسانے لگا تھا۔ میرے جسم کے برہنہ حصوں پر جلن ہونے لگی تھی جیسے کسی نے وہاں گرم گرم لوہے سے داغ دیا ہو۔ میری سانس ایک بار پھر اُکھڑنے لگی تھی۔

پشیو زور زور سے دُم ہلانے لگا۔ چٹان پر موجود مٹی اس کے دُم ہلانے سے باریک غبار کی شکل میں اُڑنے لگی۔ اس کے حلق سے دھیمی دھیمی غراہٹیں بھی نکلی تھیں جیسے وہ اپنے مالک کے پُرجوش لہجے سے اس کی دلی مسرت کا اندازہ کر کے جواباً خوشی کا اظہار کر رہا ہو۔

گھوڑوں کی ٹاپیں اب مزید قریب سے سُنائی دے رہی تھیں۔

غالباً گھڑسوار اس وادی میں داخل ہو گئے تھے۔

میں نے دونوں ہاتھوں سے زور لگایا اور خود کو زمین سے کافی بلند کر لیا۔ میری طرف کتے اور پانوش دونوں کی پشت تھی... لیکن میں اُس راستے کو بھی دیکھ سکتا تھا جس پر ان کی نظریں جمی ہوئی تھیں...

گرد و غبار کا بادل سا اُٹھ رہا تھا۔

میں نے غور سے اُڑتی ہوئی دُھول کو دیکھا۔

ایک بار پھر میرا دل شدت سے دھڑک اُٹھا۔

دُھول جس انداز میں اُٹھ رہی تھی، اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ گھڑسوار بے حد اطمینان سے بڑھتے چلے آ رہے ہیں۔ اگر شالیار خان ان گھڑسواروں میں شامل ہوتا تو گھوڑوں کی رفتار اتنی سست نہیں ہو سکتی تھی۔ شالیار کبھی گھوڑے کو سست رفتاری سے دوڑانے کا عادی نہیں تھا... پھر وہ تین ماہ بعد واپس گھر آ رہا تھا۔ ایسی صورت میں تو اس کے گھوڑے کو سرپٹ دوڑتے ہوئے اب تک جھونپڑے کے سامنے پہنچ جانا چاہیے تھا۔ اُسے پانوش سے جتنی محبت تھی بس

کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ اُڑ کر اپنے بھائی کے پاس پہنچ جاتا... لیکن وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ اطمینان سے گھوڑے کو چلاتا ہوا چلا آ رہا تھا۔

وہ آ بھی رہا تھا یا یہ ہم تینوں کی اپنی اپنی جگہ خوش فہمی تھی؟

میرا ذہن پھر بہک گیا۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دُھول کی طرف دیکھا جو گھوڑوں کے قدموں سے اُٹھ اُٹھ کر ان کے سواروں کو میری آنکھوں کے سامنے دُھندلا رہی تھی۔

آخر یہ گھڑسوار اتنے آہستہ کیوں آ رہے ہیں؟

شاید گرمی کی زیادتی اور دُھوپ کی ناقابلِ برداشت تپش کی وجہ سے میرا دماغ پگھلنے لگا تھا اور کھوپڑی کی بند ہنڈیا اندر ہی اندر کھولنے لگی تھی کہ میں بار بار ایسے اُلٹے سیدھے خیالات میں ڈوب جاتا تھا۔ یہ بھی تو ممکن تھا کہ یہ گھڑسوار ایک طویل مسافت طے کر کے آ رہے ہوں۔ چھاؤنی یہاں سے کافی دُور ہے۔ غالباً تین چار روز کا فاصلہ ہے۔ ایسے میں گھوڑوں اور سواروں دونوں کا تھکن سے نڈھال ہونا کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ اس حالت میں ان کو اس رفتار سے بھی کہیں کم رفتار کے ساتھ چلنا چاہیے تھا... لیکن شالیار...

میں نے ہر خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔

میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔

یکا یک مجھے چکر سا آ گیا اور میری کھوپڑی گھومنے لگی۔

میں نے آنکھوں کو سختی سے بھینچ لیا۔

چند ساعتوں کے بعد جب میں نے آنکھیں کھولیں تو مجھے اپنی آنکھوں کے سامنے کچھ دیر تک تو تاریکی ہی دکھائی دی۔ میں گھبرا گیا... لیکن تھوڑی ہی دیر میں میرا خدشہ بے جا ثابت ہُوا۔ میں وقتی طور پر اندھے پن کا شکار ہو گیا تھا کیوں کہ دُھوپ نے مجھے جھلسانا شروع کر دیا تھا۔ نہ جانے کیوں ایک لمحے کے لیے مجھے یوں لگا جیسے پانوش کے میری طرف متوجہ ہونے اور شالیار کے پہنچنے سے پہلے پہلے میں اس شدید دُھوپ میں بھسم ہو کر رہ جاؤں گا اور چٹانوں پر ہر طرف میری راکھ اُڑتی پھرے گی۔

وقتی طور پر آنکھوں کے سامنے چھا جانے والا اندھیرا دُور ہُوا تو میں نے پانوش کی طرف دیکھا۔ اب میری آنکھوں کے سامنے نیلی پیلی چنگاریاں اُڑنے لگی تھیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے سورج کی تمازت سے ہوا کو آگ لگ گئی ہو یا فضا میں شرارے سے رقص کرنے لگے ہوں۔

پانوش اب بھی راستے کو دیکھ رہا تھا اور پشیو کی توجہ بھی اُدھر ہی تھی۔ اس وقت وہ پانوش کے ساتھ تھا اس لیے اِدھر اُدھر بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔ اگر وہ ایک بار بھی پلٹ کر دیکھ لیتا تو شاید اس کی حیوانی حس میرے بارے میں اُسے کچھ بتا سکتی... مجھے یقین تھا کہ اگر کتا ایک بار بھی میری طرف دیکھ لیتا تو وہ بھونک بھونک کر پانوش کو میرے بارے میں ضرور بتا دیتا... لیکن ایسا نہیں ہُوا۔

دونوں سامنے ہی متوجہ تھے۔

یہ بھائی کی شدید محبت ہی تھی جس کی وجہ سے پانوش نے مجھے صرف ایک ہی بار پکارنے کے بعد غالباً ذہن سے نکال دیا تھا۔ شاید اُسے احساس ہی نہیں تھا کہ وہ کتنی دیر سے چٹان پر کھڑا ہے۔ کھڑے کھڑے یقیناً اس کی ٹانگیں تھک گئی ہوں گی لیکن وہ ایک ایسے ستون کی طرح ایستادہ تھا جو شاید اپنے بھائی کے لیے نشانِ راہ ثابت ہو سکتا تھا۔

دُھول کا بادل بہت آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا۔

ٹاپیں اب وادی میں گونج کر کہرام سا برپا کر رہی تھیں۔

بار بار کسی گھوڑے کے ہنہنانے سے کسی شیطانی روح کے قہقہے کا سماں پیدا ہو جاتا تھا۔ دھمک آہستہ آہستہ... بے حد سست روی سے قریب آتی جا رہی تھی۔

... پھر گرد و غبار کا بادل چھٹ گیا۔

میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔

گھڑسوار اب صاف نظر آ رہے تھے۔

میری بے چین آنکھیں ایک ایک لمحے تک ہر سوار کا جائزہ لیتی ہوئی دوسرے سوار کی طرف متوجہ ہو جاتیں... اور پھر آخری سوار کے چہرے پر جم گئیں۔

ان میں شالیار خان شامل نہیں تھا۔

وہ سب کے سب وردیوں میں تھے۔

ان کی رائفلیں کندھوں کے عقب میں بلند تھیں اور ان کے چہرے گرد و غبار سے اَٹے ہوئے تھے۔ میں نے پانوش کی طرف دیکھا۔ وہ جس ہاتھ سے کتے کی گردن سہلا رہا تھا، اس کی حرکت ختم ہو چکی تھی، بلکہ اب اس کی انگلیوں نے کتے کی گردن کو گویا جکڑ رکھا تھا۔

فاصلے کے باوجود، شالیار خان کو ان سواروں میں شامل نہ دیکھ کر پانوش پر جو کچھ گزر رہی تھی، میں اُسے محسوس کر رہا تھا۔ کاش! میں اس وقت قریب ہوتا... تو کم از کم اس کی ڈھارس بندھانے کے لیے ایک آدھ ٹوٹا پھوٹا جملہ ہی کہہ دیتا۔

"آگے آگے ایک سارجنٹ ہے، پشیو!" پانوش کی مدھم آواز سنائی دی۔ وہ اپنے کتے سے مخاطب تھا۔ کاش! اُسے اب بھی احساس ہو جاتا کہ میں نے اس کی پہلی بات کا کوئی جواب

نہیں دیا . . . اس احساس کے ساتھ ہی وہ جھونپڑے کی طرف متوجہ ہو سکتا تھا۔

. . . لیکن اس کی آواز آنسوؤں سے بھیگی ہوئی اور بھاری تھی جیسے اپنے بھائی کو ان سواروں میں شامل نہ دیکھ کر اس کے ضبط کا دامن ہاتھ سے جاتا رہا ہو۔

کتا دُم ہلا رہا تھا۔

ظاہر ہے، وہ ہر بات کے جواب میں صرف دُم ہی ہلانے پر قادر تھا۔ اب یہ اس کے مخاطب کی سوجھ بوجھ پر منحصر تھا کہ وہ ہر بار اس کی دُم کی حرکت سے کیا مطلب اخذ کرتا ہے۔

گھڑسواروں میں سب سے آگے ایک فوجی سارجنٹ تھا۔ یہ انگریز تھا اور اس کے پیچھے جو پانچ سپاہی تھے، ان میں سے دو پٹھان اور تین انگریز تھے۔ جو راستہ اُوپر پہاڑی کی طرف آتا تھا، اُس سے یہ سوار تقریباً ایک سو گز دُور تھے . . . لیکن تیز دھوپ میں وہ صاف نظر آ رہے تھے۔ اچانک پانوش کے حلق سے خوشی کا نعرہ اُبل پڑا۔

میں بھی چونکے بغیر نہ رہ سکا۔

اُسی لمحے ٹیپو بھی بھونکنے لگا۔

ہم تینوں نے ایک ہی بات، ایک ہی وقت میں محسوس کی تھی۔ تینوں کو لمحے بھر کے لیے یکساں طور پر غلط فہمی ہوئی تھی۔ انگریز فوجی سارجنٹ کو دیکھ کر ہمیں شالیار خان کا دھوکا ہوا تھا۔ ان دونوں میں شباہت کا ذرا بھی فرق نہیں تھا۔

پانوش نے اپنی صحت مند ٹانگ کو دونوں ہاتھوں سے دبایا اور چٹان سے چند قدم دُور ہٹ گیا۔ کتا اب بھی بھونک رہا تھا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اس کی دُم بھی حرکت کر رہی تھی۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ ان چھ سواروں کو خوش آمدید کہہ رہا ہو۔

میں نے اپنے ڈوبتے ہوئے ذہن کو سنبھالنے اور آنکھوں کے سامنے ناچتی ہوئی نیلی پیلی روشنیوں کو ختم کرنے کی کوشش کرتے ہوئے ان گھڑسواروں کو دیکھا جو ڈھلان عبور کر کے اُوپر میدانی حصے پر پہنچ چکے تھے۔

پانوش اپنی ناکارہ ٹانگ کو گھسیٹتے ہوئے جتنی تیزی سے چل سکتا تھا، چلتا ہوا اُن گھڑسواروں کی طرف بڑھ گیا۔ گھڑسوار رُک چکے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی اپنے گھوڑے سے نیچے نہیں اُترا۔

سب سے آگے آگے جو انگریز سارجنٹ تھا، وہ چند لمحوں تک تو عجیب انداز میں پانوش کو دیکھتا رہا . . .

پھر وہ گھوڑے سے اُترا تو یوں محسوس ہوا جیسے تھکن کی وجہ سے وہ بمشکل حرکت کرنے کے قابل ہو۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے خود کو زمین سے بلند کرنے اور انہیں اپنی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کی لیکن اس بار بھی میرے حلق سے آواز نہ نکل سکی۔ شاید میں قوتِ گویائی ہی کھو چکا تھا . . . پھر میرا جسم اس قدر گرم تھا جیسے میں ابھی ابھی کھولتے ہوئے پانی سے اُبل کر باہر آیا ہوں۔ پسینے کی وجہ سے میرے کپڑے جسم سے بُری طرح چپک گئے تھے اور دھوپ اب بھی جسم کے کھلے حصوں کو داغ رہی تھی۔ انگریز سارجنٹ گھوڑے سے اُترنے کے بعد اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ میرا دل لمحے بھر کو شدت سے دھڑکا اور میں نے دل کی گہرائی سے دُعا کی کہ کاش اس کی نگاہ مجھ پر بھی پڑ جائے۔

اس نے پہلے تو غور سے پانوش کو دیکھا . . . پھر جھونپڑے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ جھونپڑے سے اس کی نگاہ ہٹی تو گردن دائیں بائیں گھومنے لگی۔ وہ اس چٹان کی طرف بھی دیکھ رہا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں ہلکی سی چمک بھی نہیں لہرائی۔ تب میں مایوس ہو گیا۔ یوں لگا جیسے میں وہاں پڑے پڑے غائب ہو گیا ہوں اور کوئی انسانی آنکھ مجھے دیکھنے کے قابل نہیں رہی۔

مجھے حیرت تھی کہ گھڑسواروں میں سے بھی کسی نے مجھے نہیں دیکھا۔ میں نے مایوسی سے ٹھوڑی جلتی ہوئی چٹانی زمین سے ٹکا دی۔ اگر میری لمبی ڈاڑھی نہ ہوتی تو یقیناً میری ٹھوڑی جھلس ہی جاتی۔ اب مجھے احساس ہوا کہ میں اُن لوگوں کو کیوں دکھائی نہیں دے رہا ہوں۔

جس جگہ میں لیٹا ہوا تھا، وہاں لمبی لمبی گھاس کے چند پودے بھی تھے۔ یہ گھاس اگرچہ چھدری تھی لیکن میرے جسم پر سبز شلوار اور قمیص تھی . . . پھر میں لیٹا ہوا تھا اس لیے صرف اُسی صورت میں کسی کو دکھائی دے سکتا تھا جب وہ خصوصیت سے اس طرف مجھے تلاش کرنے والی نگاہ سے دیکھتا۔

کچھ دیر میں ڈاڑھی کے سہارے چٹانی زمین پر ٹھوڑی ٹکائے اور آنکھیں بند کیے اسی طرح لیٹا رہا . . . پھر میں نے گردن کے پٹھوں میں اکڑن کو کم ہوتے محسوس کیا تو دوبارہ سر اُٹھا کر اُن لوگوں کی طرف دیکھنے لگا۔

تمام گھڑسواروں کے چہرے دھوپ سے تمتما رہے تھے ان کے چہروں پر چند روز کا بڑھا ہوا شیو تھا۔ کانٹوں جیسے ان بالوں، اور تیز دھوپ کے باعث ان کی آنکھوں کے نیچے سُرخ سُرخ حلقے دیکھ کر کوئی بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ مہذب

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لوگ ہیں۔ ان کے چہرے درشت تھے اور آنکھوں میں دیوانگی تھی۔ ان کے انداز میں تھکاوٹ کے باوجود جارحانہ پن محسوس ہوتا تھا۔

سارجنٹ گھوڑے سے اُتر کر پانوش کے سامنے جا کھڑا ہوا: "ہیلو بوائے . . ." اس نے بھاری آواز میں پانوش کو مخاطب کیا: "میرا خیال ہے، تم شالیار خان کے بھائی ہو۔"

شالیار خان کا نام سارجنٹ کے منہ سے سُن کر ایک بار پھر سکون کے نرم و گداز احساس نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا میری ٹانگوں کی اینٹھن میں یکایک کمی ہو گئی اور پسینہ مجھے ٹھنڈا ٹھنڈا سا محسوس ہونے لگا۔

میں یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ شاید ان لوگوں کو شالیار خان ہی نے بھیجا ہے تاکہ وہ پانوش کو اور مجھے اطلاع دیں کہ اس نے آنے کا ارادہ ملتوی کر دیا ہے . . . یا پھر کوئی اور ہی بات ہو گی۔

میں نے غور سے سارجنٹ کی طرف دیکھا۔

وہ ایک دراز قامت شخص تھا۔ اس کے کندھے چوڑے تھے اور بولتے وقت اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی تھی . . . لیکن نہ جانے کیوں وہ مجھے کوئی کمینہ خصلت آدمی محسوس ہوا۔ وہ بے تحاشہ تمباکو استعمال کرتا تھا جس کی وجہ سے، فاصلے کے باوجود اس کے بھورے بھورے دانت بے حد بھیانک لگ رہے تھے۔ مسکراتے وقت یہ بھورے دانت نمایاں ہو گئے تھے اور شاید اس کے چہرے کی مکروہ حالت ان دانتوں ہی کی وجہ سے پیدا ہو گئی تھی۔

پانوش بڑے صبر و تحمل سے کھڑا سارجنٹ کی طرف دیکھ رہا تھا . . . جیسے ہی سارجنٹ نے اس کے بھائی کا نام لیا، یقیناً اس کے جسم میں ہیجان آمیز خوشی کی لہر دوڑ گئی ہو گی . . . یہی وجہ تھی کہ وہ جب بولا تو یوں لگ رہا تھا جیسے وہ بُری طرح چیخ رہا ہو۔

"تم میرے بھائی شالیار کو جانتے ہو؟ میں اُسی کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ کہاں رہ گیا؟ ابھی تک آیا کیوں نہیں؟"

یکایک میرے جسم میں خوف کی سرد لہر دوڑ گئی۔

باقی پانچ گھڑسوار ابھی تک اپنے گھوڑوں کی پُشت پر تھے۔ ان میں سے ایک نے بے ساختہ قہقہہ لگایا تھا۔ میں نے پانوش کی طرف دیکھا۔ وہ پوری طرح سارجنٹ کی طرف متوجہ تھا، شاید اسی لیے اس نے قہقہہ لگانے والے سوار کے قہقہے میں طنز کا چھپا ہوا نشتر محسوس نہیں کیا تھا۔

معاً سارجنٹ کے ہونٹ بھینچ گئے۔

اس کے ہونٹوں سے مسکراہٹ یوں چھن گئی جیسے سورج کی آخری کرن رات کی تاریکی میں کھو جاتی ہے۔ وہ بے حد سنجیدہ اور سوچ میں ڈوبا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس نے پانوش سے نگاہ ہٹا کر ایک بار پھر جھونپڑے کی طرف اور پھر اطراف میں دیکھا۔ کاش! اس بار ہی سارجنٹ کی نگاہ مجھ پر پڑ جاتی۔ اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد سارجنٹ نے زمین پر تھوک کا پٹاخہ مارا تو کتا غرانے لگا۔ اُسی لمحے پانوش نے بے قراری سے کہا۔

"آخر تم بتاتے کیوں نہیں کہ میرا بھائی کہاں ہے؟"

"بات دراصل یہ ہے لڑکے . . ." سارجنٹ نے زمین پر جوتے کا تلا رگڑتے ہوئے کہا: "اوہ، جب کسی کو کوئی خبر سُنانا ہو تو غالباً جلدی سے سُنا دینی چاہیے . . . لیکن میرے ساتھ مصیبت یہ ہے کہ میں جلد باز نہیں ہوں۔ بہرحال، تمہارا بھائی آج نہیں آئے گا۔"

"پھر وہ کب آئے گا؟"

"کبھی نہیں۔"

"کیوں . . . کیوں؟" پانوش کی آواز بھرا گئی۔

"اس لیے کہ وہ مر چکا ہے۔" سارجنٹ نے کہا۔

ایک لمحے کے لیے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں جس چٹان پر لیٹا ہوا ہوں، وہ میرے نیچے سے سرک کر میرے دل پر بیٹھ گئی ہو۔ مجھے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

پانوش کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے جنہیں وہ بڑی بہادری سے پینے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر کپکپاہٹ تھی وہ ان آنسوؤں کو پینے میں ناکام رہا . . . کیونکہ یہ ناممکنات میں سے تھا۔ اس کے رُخساروں پر دو ندیاں بہہ کر دھوپ میں چمکنے لگی تھیں۔

. . . پھر شاید اس پر دیوانگی نے حملہ کر دیا۔

وہ دونوں ہاتھ بڑھا کر غالباً سارجنٹ کو گریبان سے پکڑنا چاہتا تھا لیکن اس کے بڑھتے ہوئے ہاتھ اچانک ہی رُک گئے اور وہ جس حد تک پھیلے ہوئے تھے، اسی حالت میں ساکت ہو گئے کیوں کہ اپنے مالک کو حملہ آور ہوتے دیکھ کر ٹیپو زور سے غرایا تھا اور اس نے لپک کر سارجنٹ کی ٹانگ دانتوں میں جکڑنے کی کوشش کی تھی۔

سارجنٹ تیزی سے پیچھے ہٹا اور پھر اس کی ایک ٹانگ

گھوم گئی۔ ٹھوکر کتے کی پسلیوں پر پڑی اور وہ فضا میں اُچھل کر کئی گز دور جا گرا۔ چوٹ اتنی شدید تھی کہ وہ گرنے کے بعد وہیں پڑا لوٹتا رہا اور اُٹھ نہ سکا۔

"جو کتے دوستانہ انداز نہیں رکھتے، میں انہیں ہرگز پسند نہیں کرتا۔" سارجنٹ نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔ "لڑکے تمہیں اپنے کتے کی تربیت اس انداز میں کرنا چاہیے تھی کہ ایس طرح کی کوئی حرکت نہ کرتا۔"

پانوش کا چہرہ دُھواں دُھواں ہو گیا۔

وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے شیرو کی طرف دیکھنے لگا جو اب بھی زمین پر پڑا لوٹ رہا تھا اور اس کے حلق سے دلدوز آوازیں نکل رہی تھیں۔

دفعتاً پانچ سواروں میں سے ایک حرکت میں آ گیا۔ پانوش اور سارجنٹ نے اس شخص کو جس وقت دیکھا، انہیں بہت دیر ہو چکی تھی۔ اس کے باوجود سارجنٹ چیخ پڑا تھا۔

"نہیں۔۔۔ ایسا نہ کرو!"

"اوہ۔ خدایا نہیں!" پانوش نے روتے ہوئے کہا اور دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا۔

اس سوار نے رائفل کتے کی طرف تان کر ٹریگر دبا دیا تھا۔ گولی کا دھماکا سماعت شکن تھا۔۔۔ پھر میں نے کتے کو زمین سے کئی فٹ اُچھلتے دیکھا۔ چند لمحوں تک فضا میں اس کا جسم متحرک نظر آیا۔ اس نے ٹانگیں چلائیں اور پھر کسی بوجھ کی طرح دھپ سے زمین پر گر کر بے حس و حرکت ہو گیا۔

میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔

یہ لوگ کسی طرح بھی دوست نہیں ہو سکتے۔ میرا اندازہ اُن کے بارے میں غلط نہیں تھا۔ میرے وسوسے بے جا نہیں تھے۔ خوف و خدشات کی وہ چھپکلیاں بلا وجہ ہی میرے شعور اور لاشعور میں نہیں رینگنے لگی تھیں۔

کتے کی موت پانوش کی آنکھوں میں اندھیرا طاری کرنے کے لیے کافی تھی۔ اس حادثے نے غالباً شالیار خان کا خیال بھی اس کے ذہن سے نکال دیا تھا۔ اُسے شیرو سے بے پناہ محبت تھی۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ اس کا ننھا سا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ہو گا۔

"اوہ گورڈن۔۔۔" سارجنٹ نے جھلاہٹ میں کہا۔ "تمہیں اس لڑکے کے کتے کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

انگریز بندوقچی نے دوبارہ رائفل کا گھوڑا چڑھایا اور بے نیازی کا اظہار کرنے کے بعد اس نے مضحکہ خیز لہجے میں کہا۔ "تمہاری ٹھوکر بہت سخت تھی۔ اس بے چارے کتے کی ریڑھ کی ہڈی یقیناً ٹوٹ گئی ہو گی۔" اس کی آواز میں دکھاوے کا غم جھلک آیا۔ "ایسے میں اس کتے کو زندہ رکھنا درندگی تھی۔ میں نے اسے زندگی کی اذیتناکیوں سے نجات دلا دی ہے اور اس کے لیے تمہارے اس بے چارے لڑکے کو میرا شکرگزار ہونا چاہیے۔"

سارجنٹ کے متحرک جبڑے کو دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ اُسے اپنے ماتحت کا یہ طرزِ عمل اور خصوصاً گفتگو قطعاً پسند نہیں آئی لیکن اس نے کمال ضبط کا مظاہرہ کیا اور اپنے ماتحت کی مضحکہ خیزی پر پردہ ڈالتے ہوئے پانوش کو مخاطب کیا۔

"لڑکے۔۔۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ تم لوگوں کے دشمنوں کی تعداد کافی ہے۔" اس کا لہجہ سمجھانے والا تھا۔ "ہر طرف تمہارے دشمن بکھرے ہوئے ہیں۔ اتنے دشمنوں میں گھر کر زمین پر زندہ رہنا بے حد مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ تمہارے بھائی کی دونوں آنکھوں کے درمیان ایک اور آنکھ بن گئی تھی۔"

پانوش کی مٹھیاں سختی سے بھنچ گئیں۔

"بہرحال۔۔۔" سارجنٹ نے دونوں ہاتھ اس انداز میں پھیلا کر کہا جیسے مارے بے بسی کے اس کے سامنے کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔ "تمہارے بھائی کے جسم میں سیسہ اُتر گیا۔۔۔ اور اتنی تعداد میں گولیاں اس کے جسم میں پیوست ہوئیں کہ جب اُسے دفن کرنے کے لیے لے جایا جا رہا تھا تو دو گھوڑے اُسے بمشکل گھسیٹ رہے تھے۔"

پانوش اب تھر تھر کانپ رہا تھا۔

میرے ذہن میں ایک بار پھر اپنی کمزوری، بیماری اور نقاہت کے خلاف بغاوت پیدا ہوئی اور میں نے ہاتھوں کے سہارے اُٹھنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔

پانوش کو ان کی باتوں سے جو اذیت ہو رہی تھی، اُسے محسوس کر کے میرا دم گھٹ رہا تھا۔۔۔ لیکن افسوس، میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اگر میرے حلق سے آواز نکل سکتی تو میں انہیں چیخ چیخ کر اپنی طرف متوجہ کر لیتا۔ تب شاید پانوش کو چھوڑ کر وہ مجھے اذیت دینے لگتے اور یوں اس معصوم بچے کی جان بچ جاتی۔

"تمہیں فکرمند نہیں ہونا چاہیے۔" سارجنٹ نے مسکرا کر کہا۔ "ہم نے اس کی تدفین بڑی دھوم دھام سے کی ہے۔"

گھڑ سواروں نے ایک ساتھ کچھ کہا۔ ان کی بڑبڑاہٹ سے میں صرف یہی سمجھ سکا کہ وہ اپنے سارجنٹ کی تائید کر رہے ہیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پانوش صدمے کی وجہ سے بُت بنا کھڑا تھا۔۔۔ اور غالباً چاہتا تھا کہ وہ لوگ اُسے اس کے حال پر چھوڑ کر چلے جائیں۔ اگرچہ اس کے رخساروں پر آنسو ڈھلک آئے تھے لیکن وہ دھاڑیں مار مار کر رونا چاہتا تھا۔۔۔ اور اس خواہش کو محض اس لیے دبائے ہوئے تھا کہ دشمنوں کے سامنے وہ اپنی سُبکی نہیں کرانا چاہتا تھا۔ یہ اس کے ذاتی وقار ہی کا نہیں اس کے مرحوم بھائی۔۔۔ اور خاندانی وقار کا بھی مسئلہ تھا۔

"سارجنٹ فرینک۔۔۔" ایک گھڑ سوار اچانک ہی چیخ پڑا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ اس صورتِ حال کو مزید ضبط نہ کر پا رہا ہو۔ "ہمیں اب اس معاملے کو ختم کر دینا چاہیے۔"

دوسرے گھڑ سواروں نے بھی کچھ کہا اور یہ بڑبڑاہٹ بلا شبہ بولنے والے گھڑ سوار کی تائید کے سوا کچھ نہیں تھی۔

"ہاں۔۔۔" سارجنٹ فرینک نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ "ہم تمہیں صرف یہ خبر ہی سُنانے نہیں آئے تھے بلکہ ہمیں تم سے ایک اور کام بھی تھا۔"

پانوش کسی مجسمے کی طرح ساکت و صامت کھڑا رہا۔

"تم جوان ہو اور اس صدمے کو آسانی سے برداشت کر سکتے ہو۔" سارجنٹ کہہ رہا تھا۔ "۔۔۔ پھر تم اس ویرانے میں تنہا رہتے ہو اس لیے تمہیں اس دولت کی قطعاً ضرورت نہیں ہو سکتی۔"

پانوش نے کچھ نہ سمجھنے کے انداز میں پلکیں جھپکائیں۔

۔۔۔ اور پھر پہلی بار پانوش کی آنکھوں میں خوف کی جھلک پیدا ہوئی۔ اب تک وہ ان لوگوں کو سمجھ ہی نہیں سکا تھا۔۔۔ لیکن جیسے ہی سارجنٹ نے دولت کا تذکرہ کیا، بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ میں تو پہلے ہی سمجھ چکا تھا کہ وہ شالیار خان کے دشمن ہیں لیکن سارجنٹ نے جس دولت کا تذکرہ کیا تھا، اس کے بارے میں پانوش کو یا مجھے کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔

جو صورتِ حال اب سامنے تھی اس کے تحت خوف کی وجہ سے میرا پسینہ سرد پڑنے لگا اور میں اپنے ٹھٹھرے ہوئے وجود کے تحت کانپنے لگا۔ اوپر سے دھوپ اب بھی میرے یخ بستہ جسم کو جھلسانے میں مصروف تھی۔

کاش پانوش اپنے پاس کوئی ہتھیار رکھنے کا عادی ہوتا۔ جھونپڑے میں دو رائفلیں، شکاری چاقو اور ایک ریوالور بھی موجود تھا لیکن پانوش کے لیے ان میں سے کسی بھی ہتھیار تک پہنچنا ممکن نہیں تھا۔ وہ نہتا تھا، معذور تھا اور چھ بدمعاشوں کے سامنے تنہا تھا۔

"دولت۔۔۔" اس نے زیرِ لب کہا۔

سارجنٹ نے خوش دلی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"کیسی دولت؟" پانوش کی سرگوشی بھرائی ہوئی آواز میں ڈھل کر ادا ہوئی۔

"بات یہ ہے کہ تمہارا بھائی جب گولیوں کا شکار ہوا تھا، تو اس کے سر پر ہمارا کچھ قرض تھا۔ تم ایک غیرت مند پٹھان ہو۔ میرا خیال ہے تم اپنے بھائی کی رُوح کو بے چین دیکھنا پسند نہیں کرو گے۔۔۔ پھر جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں، تمہیں اس ویرانے میں رہنے کے لیے دولت کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ ٹھیک ہے نا؟"

"کیسا قرض۔۔۔ کیسی دولت؟" پانوش اب بھی حیران تھا۔

"دراصل اس نے جوئے میں کافی رقم ہاری تھی اور ہارتے وقت اس کے پاس ادائیگی کے لیے رقم نہیں تھی۔" سارجنٹ نے وضاحت کی۔

"شالیار خان جواری نہیں تھا۔" پانوش غرّایا۔

سارجنٹ کھل کھلا کر ہنس دیا۔ گھڑ سوار بھی قہقہے لگانے لگے۔ ایک دو لمحوں کے لیے ماحول ان کے مکروہ قہقہوں کی گھن گرج سے کانپ اُٹھا۔ جب یہ طوفانِ بدتمیزی تھم گیا تو پانوش بُری طرح چیخ رہا تھا۔ وہ بار بار یہی کہہ رہا تھا کہ وہ لوگ اوّل درجے کے جھوٹے ہیں اور اس کا بھائی ہرگز جواری نہیں تھا۔

"خاموش!" سارجنٹ گرجا۔

پانوش کانپتا ہوا چُپ ہو گیا۔

"جس رات شالیار خان کو گولی ماری گئی تھی اس سے ایک شب پہلے وہ میرا مقروض ہو گیا تھا۔" سارجنٹ نے ٹھوس لہجے میں کہا اور اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھنے لگا۔ "میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟"

تمام گھڑ سواروں نے تائید کی۔

"یہ پانچ گواہ میری بات کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔" سارجنٹ فرینک نے اپنے ساتھیوں کی طرف اشارا کرتے ہوئے کہا۔ "بہرحال، تمہارا بھائی ایک دلیر اور بے جگر نوجوان تھا۔ جُوا کھیلنے میں بھی اُس نے بے حد دلیری کا مظاہرہ کیا۔ وہ کافی جیت چکا تھا لیکن افسوس آخری لمحے کے کھیل میں ہار گیا۔ تمہارا بھائی اگر ضدی اور ہٹ دھرم نہ ہوتا تو شاید وہ اس وقت زندہ ہوتا۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"شاںیار خان جُواری نہیں تھا" پانوش نے سسک کر کہا۔

"اس دُنیا کا ہر شخص جُواری ہے، ناداں لڑکے" سارجنٹ فرینک نے کہا۔ "تم بھی اس وقت ہمارے ساتھ ایک جُوا کھیلنے کی کوشش کر رہے ہو" سارجنٹ، پانوش کو گھورنے لگا اور اس کے ہونٹوں پر مکروہ مُسکراہٹ رقص کرنے لگی "بہرحال، میں اپنی رقم کے سلسلے میں قطعاً فکر مند نہیں تھا کیوں کہ شاںیار خان نے مجھے بتایا تھا کہ اس کا ایک نوعمر بھائی بھی ہے جو اس کی رُوح کو پُرسکون کرنے کے لیے اپنی زندگی تک قربان کر سکتا ہے ... اب جیسا کہ تمہیں اپنے بھائی کے آخری الفاظ کا علم ہو چکا ہے، تمہیں چاہیے کہ ان لفظوں کو شاںیار خان کی وصیت سمجھ کر اسے ہر حال میں پورا کرو۔"

پانوشس خاموش اور بےحس و حرکت رہا۔ اس نے تائید یا تردید میں گردن تک ہلانے کی کوشش نہیں کی۔

"شاںیار خان نے ہارتے وقت مجھے کہا تھا کہ میں، تم سے مل کر وہ دولت حاصل کر لوں، جو اس جھونپڑے میں کسی جگہ چھپی ہوئی ہے۔ اس نے تمہارا نام لے کر یہ پیغام دیا تھا کہ تم وہ رقم میرے حوالے کر دو۔ اب تم جلدی سے رقم لا دو کیوں کہ اتنی تیز دھوپ میں مزید یہاں ٹھہرنا ہمارے لیے ممکن نہیں ... جب تک شاںیار خان کا قرض ادا نہیں ہو جاتا، اس کی رُوح کو چین نہیں آئے گا۔"

میں نے زور سے پیشانی زمین پر دے ماری۔ میرا سر گھوم گیا لیکن پیشانی زمین سے ٹکرانے کے باوجود اتنی آواز پیدا نہ ہو سکی کہ ان میں سے کوئی میری طرف متوجہ ہوتا۔

پانوشس چونکہ خاصی دیر سے غم و غصّے کا شکار تھا۔ اس لیے اب صورتِ حال اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہو رہی تھی۔ میں نے اس کے چہرے اور کھڑے ہونے کے انداز سے اس بات کا پتا چلا لیا تھا کہ وہ اب ذہنی طور پر اس منزل کو پہنچ چکا ہے، جہاں کوئی مصلحت، کوئی خوف اور کوئی خیال انسان کو اپنے ارادے سے باز رکھنے میں کامیاب نہیں ہوتا . . . اور اندھے ارادوں کی تکمیل عموماً انسان کے لیے تباہ کُن ہی ثابت ہوتی ہے۔ پانوش کی مُٹھیاں بھنچ گئی تھیں۔

"اس جگہ کوئی رقم دفن نہیں ہے . . . او کُتیا کے بچے! تم شاںیار خان کے بارے میں جھوٹ بول رہے ہو۔ اس نے اپنی پوری زندگی میں کبھی جُوا نہیں کھیلا۔ وہ جو کچھ بھی کما رہا ہے، میں سمجھتا رہا ہے کیوں کہ اس ویرانے میں جسم اور جان کا رشتہ برقرار رکھنے کے لیے ہمیں بہت سی چیزوں کی ضرورت رہتی ہے"

سارجنٹ کا چہرہ غصّے سے سُرخ نظر آنے لگا۔ اس کی آنکھیں دہکنے لگی تھیں۔ وہ اپنی، سانپ کی سی گول گول اور خوف ناک آنکھوں سے پانوش کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے اُسے اس بچّے کی جسارت پر حیرت ہو رہی ہو۔

پانوش غصّے سے چیختے چیختے نڈھال ہو گیا تو اپنے کُتّے کے قریب جا کر اس پر جُھک گیا۔ یقیناً وہ ایک بار پھر آنسوؤں کو پینے کی کوشش کر رہا تھا جنہیں پینے میں اُسے پہلے بھی ناکامی ہو چکی تھی۔ کُتّے پر اب مکھیاں بھنبھنانے لگی تھیں۔ وہ ایک ہاتھ سے ان مکھیوں کو اُڑانے لگا۔

"سارجنٹ . . ." گھڑسواروں میں سے ایک نے للکارنے کے سے انداز میں کہا "کیا تم کل کے ایک لونڈے کو اس طرح توہین کرنے کی اجازت دے سکتے ہو؟"

ایک اور گھڑسوار کُود کر زمین پر پہنچ گیا۔

اس نے پانوشس کے قریب جا کر کہا "اور ایک لنگڑے لڑکے سے گالیاں کھانا تو کسی طور بھی مناسب نہیں ہے۔" پھر اس نے پلٹ کر سارجنٹ کی طرف دیکھا اور مُسکرانے لگا۔ اس کی مُسکراہٹ زہر میں بجھی ہوئی تھی۔

"اس کی کون سی ٹانگ خراب ہے؟" سارجنٹ نے جذبات سے عاری لہجے میں سوال کیا۔

"دائیں ٹانگ، سارجنٹ"۔

"کھڑے ہو جاؤ، لڑکے" سارجنٹ نے تحکمانہ لہجے میں کہا "اور میری طرف دیکھو"

پانوش نے اُٹھنے سے پہلے آستین سے اپنی آنکھیں کو پونچھا۔ اس کے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے اور آنکھوں سے گہرے غم و غصّے کے تاثرات ظاہر تھے۔ وہ اب سارجنٹ کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ یہ بڑی جرأت کا کام تھا۔

میرا دل شدّت سے دھڑک رہا تھا اور ان شدید دھڑکنوں نے میری رہی سہی جان بھی کھینچ لی تھی۔ میں خود کو ایک ایسی لاش سمجھ رہا تھا جو دیکھنے اور محسوس کرنے پر قادر تھی۔ سارجنٹ فرینک کے دائیں ہاتھ میں ریوالور تھا۔ وہ اپنے دائیں بازو کو ڈھیلے ڈھالے انداز میں، پہلو میں رکھے پانوش کو گھور رہا تھا . . . پھر اس نے چٹان پر تھوک کا چھینٹا مارا اور بولا۔

"میں اس معاملے کو خوش اسلوبی اور سکون سے نمٹانا چاہتا تھا، لڑکے۔ بہرحال، اب بھی اگر تم رقم میرے حوالے کر دو تو میں تمہارے لیے ہمدردی سے سوچنے کی کوشش کر سکتا ہوں۔ تم نے وہ رقم کہاں چُھپا رکھی ہے؟"

"رقم نام کی کوئی شے میرے پاس نہیں ہے . . . اور مجھے یقین ہے کہ میرا بھائی اب بھی زندہ ہے"۔

"شاںیار خان مر چکا ہے۔ وہ میرا مقروض تھا۔ میں تمہیں ایک موقع اور دیتا ہوں۔ رقم کہاں ہے؟"

پانوش نے جواباً نفی میں سر ہلایا۔

"میرے قریب آ جاؤ، لڑکے"۔

پانوش کے چہرے سے پتا چلتا تھا کہ اُسے سارجنٹ کے ارادوں کا علم ہے۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ سارجنٹ اُسے گولی مار دے گا لیکن وہ اپنے دفاع میں کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اگر وہ دوڑ پڑتا تو عقب سے چھ گولیاں اُسے چھلنی کر سکتی تھیں . . . پھر شاید اس نے مردانہ وار موت کو گلے لگانے کا ارادہ کر لیا۔ وہ ایک قدم آگے بڑھ آیا۔

یکایک پانچوں گھڑسواروں نے بھی رائفلیں سیدھی کر لیں۔ اب وہ معصوم سا لڑکا پانچ رائفلوں اور ایک ریوالور کے سامنے تنہا اور بےبس تھا . . . لیکن پانوش کے چہرے پر اب سکون کا گہرا تاثر تھا۔ اس نے اپنی معذور ٹانگ کو گھسٹا کر زمین پر ٹکانے کے لیے اُٹھایا ہی تھا کہ فضا گولی کے دھماکے سے گونج اُٹھی۔

سارجنٹ کے لمبی نال والے ریوالور کی نال سے نیلگوں دھوئیں کی لکیر نکل کر فضا میں تحلیل ہو رہی تھی۔ پانوشس کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے ایسا تاثر نظر آیا جیسے وہ خود کو مُردہ دیکھ کر حیران رہ گیا ہو . . . پھر یہ حیرت کا تاثر ایک لمحے میں زائل ہو گیا اور اس کے حلق سے ایک دلدوز چیخ نکل گئی۔

میرے دل پر چرکا سا لگا۔ میری دھڑکنیں بےترتیب ہو گئیں۔ دل یوں تڑپا جیسے آخری ہچکی لے کر خاموش ہو جانا چاہتا ہو اور مزید غم کا بوجھ برداشت نہ کرنا چاہتا ہو۔

گولی پانوش کی معذور ٹانگ میں لگی تھی اور وہ یوں جُھول گئی جیسے کسی درخت کی کٹی ہوئی شاخ چند ریشوں کے سہارے لٹک کر رہ جاتی ہے . . . پھر وہ گھٹنے کے بل گر گیا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور پوری قوّت سے چیخا . . لیکن آواز میرے سینے کے پنجرے سے حلق کے دروازے تک بھی نہ پہنچ سکی۔ میں نے ایک بار پھر پوری قوّت سے اپنی پیشانی چٹان زمین پر دے ماری۔

مجھے اپنی کھوپڑی گھومتی ہوئی محسوس ہوئی اور میری آنکھوں کے سامنے اندھیرے کی چادر اُتر آئی۔ مجھ میں اب کچھ دیکھنے کی تاب نہیں تھی لیکن مقدر جب انسان کو تباہی کا کوئی تماشا دکھانے پر تُل جائے تو اس کے تقاضے پورے ہو کر ہی رہتے ہیں۔

کچھ ہی دیر بعد میری بینائی مجھے وہ بھیانک خواب پھر سے دکھانے لگی جسے میں جاگتی آنکھوں دیکھ رہا تھا۔

"تم نے کس ٹانگ کے بارے میں کہا تھا، میری؟" سارجنٹ کی کرخت آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

"میرا خیال ہے، تم نے جس ٹانگ کو نشانہ بنایا ہے، وہی ٹانگ ناکارہ تھی" گھڑسوار نے ہنس کر کہا "ناکارہ چیزوں کے ساتھ یہی سلوک ہونا چاہیے"

سارجنٹ کھِل کھِلا کر ہنس پڑا۔ اس کی ہنسی میں ہذیان کی آمیزش تھی۔

"کھڑے ہو جاؤ لڑکے!" سارجنٹ نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

پانوشس نے جواباً خون آلود نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں اور چہرے پر نفرت ہی نفرت تھی۔

"یہ اب کھڑا نہیں ہو سکتا" ایک گھڑسوار نے کہا اور اس کی بات ختم ہوتے ہی پانوش جس پھُرتی سے اُٹھ کھڑا ہُوا، اس پر میں عش عش کر اُٹھا۔ وہ واقعی ایک دلیر لڑکا تھا اور دشمنوں کے سامنے خود کو کسی طرح بھی کمزور ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔

. . . پھر ایک اور دھماکا ہُوا۔

میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

اس بار کوئی چیخ سُنائی نہیں دی۔ یوں لگا جیسے ہر طرف یکایک خاموشی کا سمندر پھیلا ہُوا ہو . . . گہرا اور پُرسکون سمندر جس میں خیال و خدشے کی کوئی چھوٹی سی مچھلی بھی تیر نہ رہی ہو۔ میں نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھول دیں۔ میرا خیال تھا کہ میں آنکھیں کھولوں گا تو مجھے پانوش کا خاک و خون میں لتھڑا ہُوا بےحس و حرکت اور پُرسکون جسم نظر آئے گا . . . لیکن قسمت شاید مجھ سے اس حد تک رُوٹھ چکی تھی کہ میری اتنی گئی گزری خواہش بھی پوری نہیں ہو سکتی تھی۔

پانوش ابھی تک بےحس و حرکت کھڑا تھا۔

اس کا چہرہ کسی چٹان کی طرح سخت اور کرخت تھا۔
اس کی آنکھیں ہر تاثر سے عاری تھیں۔
اس کے ماتھے پر ایک بھی شکن نہیں تھی۔
اس کے لبوں پر خفیف سا کھنچاؤ تھا اور اس کھنچاؤ میں تنفر آمیز مسکراہٹ کی آمیزش تھی۔ جیسے وہ اپنی بے پناہ قوتِ ارادی کو استعمال میں لاکر آخری دم بھی اپنے دشمنوں کو بے نیازی دکھانا چاہتا ہو۔ اس کی صحت مند ٹانگ پر جسم اکڑا ہوا تھا اور گھٹنے کے مقام سے خون اُبل اُبل کر اس کے پاؤں پر گر رہا تھا۔

. . . پھر اس کا جسم آہستہ آہستہ جھکنے لگا۔
زندگی موت کے سامنے جھک رہی تھی۔
میرا دل رو رہا تھا۔ میں نے اپنی زبان دانتوں تلے دبا کر کاٹ ڈالی کہ اگر یہ کوئی خوفناک خواب ہے تو اس کا سلسلہ ختم ہو جائے۔ زبان کٹ جانے سے میرا منہ خون کے ذائقے سے نمکین ہونے لگا۔ اپنے ہی خون کا مزا چکھ کر میرے ذہن پر ایک بار پھر دیوانگی سی چھانے لگی۔
پانوش منہ کے بل گر گیا۔
اس کی دونوں زخمی ٹانگوں میں کپکپاہٹ تھی . . . پھر اس کا جسم ساکت ہو گیا۔ غالباً تکلیف کی زیادتی سے اس پر بے ہوشی طاری ہو گئی تھی۔ سارجنٹ اور اس کے درندہ صفت ساتھی اس صورتِ حال پر بُری طرح ہنس رہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کسی لاش کے گرد بھیڑیوں کا غول کھڑا غرا رہا ہو۔
میں اب ایک خاموش اور بے حس تماشائی تھا۔
میرے دل میں اب تکلیف کی کوئی لہر نہیں دوڑ رہی تھی۔
میرے ذہن میں کوئی خدشہ سر نہیں اُبھار رہا تھا۔
میں نے اپنا سب کچھ اپنی آنکھوں سے لٹتے دیکھ لیا تھا اور اب میرے پاس درندگی کو بھینٹ دینے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ موت اور بدقسمتی کے بھیانک سایوں نے سب کچھ چاٹ لیا تھا۔ شالیار خان کی موت پر بھی مجھے یقین ہو گیا تھا۔ کیوں کہ اگر وہ زندہ ہوتا تو یہ لوگ اس کے چھوٹے بھائی پر اتنے ستم ڈھانے کی کبھی جرأت بھی نہ کرتے۔
سارجنٹ کے اندر چھپا ہوا درندہ شاید ابھی پیاسا ہی تھا اس نے ایک سوار کو اشارہ کیا۔ وہ سوار جھونپڑے کی طرف گیا اور جب واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں پانی کی ایک بالٹی تھی . . . سارجنٹ فرینک نے اشارہ کیا اور وہ بالٹی پانوش کے سر پر انڈیل دی گئی۔
سوار نے بالٹی ایک طرف پھینک دی اور جھک کر پانوش کے گال تھپ تھپانے لگا۔ ایک بالٹی پانی اور ہاتھوں کی چند تھپ تھپاہٹوں سے زندگی لوٹ کر بھی آجاتی ہے، یہ میں نے زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا۔ پانوش نے آنکھیں کھول دیں اور اس نے دونوں ہاتھوں کو زمین پر ٹکا کر اُٹھنے کی کوشش کی . . .
"اب جلدی سے اُٹھ جاؤ۔" سارجنٹ غرّایا۔ "تمہیں مجھے اور میرے ساتھیوں کو کچھ بتانا بھی ہے۔"
پانوش اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ دونوں پلکیں جھپکائے بغیر ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانک رہے تھے جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں اپنی شخصیت کا اثر سامنے والے کے دل میں اتار رہے ہوں۔ سارجنٹ کے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔
سارجنٹ کے ساتھی جو اب تک محض تماشائی تھے انہوں نے بھی ایک مصروفیت ڈھونڈھ نکالی۔ وہ جھونپڑے میں گھس گئے اور چند لمحوں میں غالباً انہوں نے اس جھونپڑے کا چپہ چپہ چھان مارا۔ میں حیران تھا کہ آخر کس نے انہیں کسی رقم کے بارے میں غلط اطلاع دے کر اس طرف بھیجا ہے؟ اس جھونپڑے میں مفلسی اور بے کسی کا چراغ ٹمٹماتا تھا اور ہمارے لیے یہی کافی تھا۔
میں ایک بے حس لاش کی طرح پڑا رہا۔
پانوش سے کچھ فاصلے پر اس کا لاڈلا چھیوا اپنی مُردہ آنکھوں سے یہ منظر دیکھ رہا تھا اور ادھر چٹان کے پیچھے گھاس میں چھپا ہوا میں اپنی زندہ آنکھوں لیکن مُردہ تن سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔
جب سوار مایوس ہو کر واپس آگئے تو سارجنٹ کی آواز ایک بار پھر میرے کانوں تک پہنچی: "ہاں تو لڑکے . . . اب محسوس کر چکے ہو گے کہ کس حالت سے دوچار ہو۔ میرے ساتھی تمہارے جھونپڑے کی تلاشی لے چکے ہیں لیکن انہیں رقم نہیں ملی جس کی تلاش میں ہم نے دور دراز کا سفر طے کیا اور اتنی مصیبتیں جھیل کر یہاں تک پہنچے ہیں۔ اب اگر تم یہ بتا دو کہ وہ رقم کہاں پوشیدہ ہے تو تمہیں آزاد کر دیا جائے گا۔ ہم تمہیں کسی ڈاکٹر تک لے جائیں گے جو تمہیں چند دنوں میں دوبارہ اپنی ٹانگوں پر کھڑا ہونے کے قابل بنا دے گا۔"
گھڑ سوار غالباً اس صورتِ حال سے بیزار ہو گئے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ سب کے سب گھوڑوں کو چارہ کھلانے اور انہیں تازہ دم بنانے میں لگ گئے تھے۔ ایک نے اپنا شکاری چاقو نکالا اور ایک بکری ذبح کر ڈالی . . . پھر ایک الاؤ روشن کر کے وہ اُسے بھوننے میں مصروف ہو گیا۔ یہ بکری بھی ٹوٹی ہوئی ٹانگ کی وجہ سے دوسری بکریوں کے ساتھ چرنے نہیں گئی تھی۔
سارجنٹ اب بھی پانوش کی طرف متوجہ تھا۔
پانوش کی پیشانی پسینے سے تر تھی اور پسینے کے زہر آلود قطرے اس کی آنکھوں میں گر گر کر انہیں مزید سُرخ بنا رہے تھے . . . لیکن اب بھی وہ بغیر پلکیں جھپکائے، سارجنٹ کو دیکھ رہا تھا۔
"یہاں رقم نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔" پانوش نے کافی دیر بعد پہلی بار لب کشائی کی تو اس کی آواز غیر انسانی لگتی تھی۔
"اگر رقم نام کی کوئی چیز یہاں موجود نہیں تو سمجھ لو کہ تمہارے جسم میں زندگی نام کی کوئی چیز نہیں رہے گی۔ تمہاری زندگی یا وہ رقم . . . دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کر لو . . . اور جلدی۔"
بکری بھن کر تیار ہو چکی تھی۔
ایک دراز قامت شخص نے گھوڑے سے بندھے ہوئے تھیلے سے شراب کی ایک بوتل نکالی اور وہ سب وحشیوں کی طرح بکری کے ٹکڑے کر کے انہیں چباتے ہوئے شراب پینے لگے۔ اب وہ بات بے بات بلند قہقہے لگا رہے تھے۔ ان کے قہقہوں کی گونج سے پہاڑیاں لرز رہی تھیں۔
دوپہر ڈھل رہی تھی۔
دھوپ میں اب ناقابلِ برداشت تیزی آچکی تھی لیکن میں جو کچھ برداشت کر چکا تھا اس کے سامنے دھوپ کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی . . . پھر پانوش زخمی حالت میں ابھی زندہ تھا اور سارجنٹ کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس کی پیاس بڑھتی جا رہی ہے۔ مجھے ابھی اور بہت کچھ دیکھنا تھا . . . لیکن اب میں نے اپنے سینے پر صبر کا پتھر رکھ لیا تھا۔ میں زندہ رہنا چاہتا تھا تاکہ اس صورتِ حال کو شالیار خان کے لیے تحریر کر سکوں . . . مجھے اب بھی یقین تھا کہ وہ نہ صرف زندہ ہے بلکہ کسی بھی وقت یہاں پہنچنے والا ہے۔
کاش! وہ ابھی اور اسی وقت آجائے۔
میں نے خلوصِ دل سے دُعا کی اور اُس ویران راستے کی طرف دیکھا جس کا سینہ سپاٹ تھا اور دھول کا ایک بھی بادل نظر نہیں آ رہا تھا۔ جس سے پتا چلتا کہ شالیار خان گھر کی طرف آ رہا ہے۔ میری نگاہیں راستے سے مایوس واپس آگئیں اور میں پانوش کی طرف متوجہ ہو گیا جس کے چہرے پر جھکا ہوا درندہ صفت سارجنٹ کہہ رہا تھا۔
"لڑکے! تمہارے دائیں ہاتھ میں چار انگلیاں اور ایک انگوٹھا ہے۔" اس کی آواز حیرت انگیز حد تک نرم اور انداز سمجھانے والا تھا۔ "اس کے علاوہ تمہارا دوسرا بازو بھی سلامت ہے، میری تسکین کے لیے تمہارے کئی ناخن مل جائیں گے۔ میں انگوٹھے سے ابتدا کروں گا اور یقین کرو، میں اس فن میں ماہر ہوں۔ تمہیں یہ بات یوں بھی سمجھ لینی چاہیے کیوں کہ انگریز سرکار نے مجھے بلا وجہ پلاٹون کا سارجنٹ نہیں بنا دیا۔ بتاؤ رقم کہاں ہے؟"
سارجنٹ فرینک کے باقی پانچ ساتھی بھی اب اُن کے قریب آ کھڑے ہوئے تھے۔ مجھے ان دو پٹھان سپاہیوں پر افسوس ہو رہا تھا جو دشمنوں کے ساتھ اس درندگی کے کھیل میں شریک تھے اور انہیں اپنے ایک ہم قوم پر توڑے جانے والے مظالم پر ذرا بھی رحم نہیں آ رہا تھا۔
درندگی کا رقص ایک بار پھر شروع ہو گیا۔
پانوش کو درخت سے باندھ دیا گیا اور اس کی دائیں ہتھیلی کو تنے پر رکھ کر اس میں ایک کیل ٹھونک دی گئی۔ پانوش کے چہرے پر پریشانی کا تاثر مزید بڑھ گیا تھا۔
سارجنٹ فرینک کا دایاں ہاتھ بلند ہوا۔
چٹانوں کے سینے پر لرزہ طاری کر دینے والا دھماکا گونج اُٹھا اور پانوش کی دیر سے جھپکنے کو ترسنے والی پلکیں جھپک گئیں اس بار گولی اس کے دائیں ہاتھ پر چلائی گئی تھی۔
سارجنٹ نے جو کچھ کہا تھا اس میں جھوٹ کی آمیزش نہیں تھی۔ اس کا نشانہ واقعی سچا تھا۔ پانوش کی نگاہ اپنے دائیں ہاتھ پر جم گئی۔ میں نے دیکھا اور میرے مُردہ جسم نے ایک جھرجھری سی لی۔ اس کا انگوٹھا غائب تھا۔
پانوش نے ایک طرف دیکھا۔
میری نگاہوں نے بھی اس کی نگاہوں کا تعاقب کیا۔
کچھ ہی فاصلے پر پانوش کا خون آلود انگوٹھا چٹانی زمین پر پڑا تھا اور یوں تڑپ رہا تھا جیسے کسی چھپکلی کی دُم کٹ کر دیر تک تڑپتی رہتی ہے۔ پانوش کا ہاتھ بھی خون آلود تھا۔ جہاں کبھی انگوٹھا ہوا کرتا تھا، وہاں سے سُرخ سُرخ اور گاڑھا گاڑھا خون اُبل رہا تھا۔
پانچ درندے، درندگی سے بھرپور قہقہے لگانے لگے۔
ان قہقہوں سے ماحول کانپ اُٹھا۔
مجھے اپنی ٹانگوں میں شدید اینٹھن اور دل پر شدید بوجھ

محسوس ہونے لگا۔ خون دیکھ کر میری طبیعت متلانے لگی اور میں اُبکائی لے کر رہ گیا۔ اُبکائی لیتے وقت میرے حلق سے خفیف سی خرخراہٹ ہی نکلی اور سینہ یوں کھل گیا جیسے غم کی زیادتی سے کھل گیا ہو۔

"وہ رقم کہاں ہے، لڑکے؟" سارجنٹ غرّایا۔ اس کی آواز پانوش کی دلدوز کراہوں پر حاوی تھی۔

پانوش اب بھی اپنا زخمی ہاتھ، دوسرے ہاتھ سے دبائے ہوئے تھا۔ کراہوں کے درمیان اس نے کچھ کہا جو میں نہ سمجھ سکا۔ . . پھر ایک اور دھماکا ہوا۔ میرے کان اس دھماکے سے وقتی طور پر بہرے ہو گئے۔ . . کاش! میری سماعت بالکل ہی ختم ہو گئی ہوتی، میرے احساس کی طرح یہ قوت بھی چھین لی گئی ہوتی۔ . . لیکن آج میری دعاؤں کی قبولیت کا دن نہیں تھا۔ آج میرا نصیب سویا ہوا تھا۔ قسمت کی مہربان دیوی پر قہر کا دیوتا غالب آ چکا تھا اور ظلم کے اندھیروں نے ہر دعا کو قبولیت کی منزل تک پہنچنے سے پہلے ہی نگل لیا تھا۔

دوسرے دھماکے سے پانوش کی انگشتِ شہادت نے جسم کا ساتھ چھوڑ دیا۔ وہ اس بار بھی چیخا تھا لیکن اس کی چیخ گھٹی گھٹی سی تھی اور اسے محض خرخراہٹ ہی کہا جا سکتا تھا۔

اس کے لبوں نے کچھ کہنے کے لیے حرکت کی . . .

لیکن آواز نہ نکلی۔ میں نے زندگی میں پہلے کبھی یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ لڑکا اس قدر سخت جان ہو سکتا ہے۔ جتنے بڑے مظالم اس پر ڈھائے جا رہے تھے، شاید قدرت نے اتنا ہی زیادہ صبر اور برداشت کا مادّہ بھی اس میں پیدا کر دیا تھا۔

"میرا خیال ہے اس ہدف پر نشانہ لگاتے ہوئے تمہیں کافی لطف آ رہا ہے۔" ایک اور درندے نے نشے میں جھوم کر کہا اور اپنا ریوالور نکال کر اس بے بس لڑکے پر تان لیا۔ یہ وہی شخص تھا جس نے کتّے کو گولی ماری تھی اور سارجنٹ نے اسے گوروں کے نام سے پکار کر تنبیہ کی تھی۔

پانوش نے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا لیا۔

گویا وہ اس نئے ستم کے لیے خود کو آمادہ کر رہا تھا۔

اس نے اب تک ایک بار بھی ان وحشیوں سے رحم کی بھیک نہیں مانگی تھی۔ اس کے انداز سے شکست کا احساس نہیں ہوتا تھا حالانکہ وہ آہستہ آہستہ ٹوٹ پھوٹ رہا تھا اور وہ ظالم اسے ایک ایک انچ کر کے کاٹ رہے تھے۔

ایک فائر ہوا . . .

چٹانوں میں ایک نئے دھماکے کی گونج پیدا ہوئی۔

میں پلکیں جھپکائے بغیر دیکھتا رہا۔

پانوش کے بائیں رخسار پر ایک گہری خراش پیدا ہوئی جو اگلے ہی لمحے یوں خون سے بھر گئی جیسے نم آلود مٹی میں انگلی سے لکیر کھینچ دی جائے اور اس میں پانی بھر جائے۔

ایک فوجی نے بڑھ کر پانوش کو کندھوں سے پکڑ کر اٹھایا، اور گھٹنوں کے بل بٹھانے کی کوشش کی۔ میں نے دیکھا کہ پانوش کی شلوار بھیگ چکی ہے۔

"احمق . . ." سارجنٹ دھاڑا۔ "اسے ابھی جان سے مت مارو۔ مجھے اس کی ضرورت ہے۔"

اس ایک فوجی کی دیکھا دیکھی باقیوں نے بھی اپنا اپنا ریوالور نکال لیا تھا لیکن سارجنٹ کی دھاڑ سن کر ایک کے ریوالور کی نال جھک گئی۔ جو شخص دوسرے ہاتھ میں شراب کی بوتل تھامے ہوئے تھا، وہ بے پناہ نشے میں دُھت لگتا تھا۔ اس نے اچانک ہی فائر کر دیا اور گولی سارجنٹ کے کندھے کو چھوتی ہوئی پانوش کی آنکھوں کے درمیان جا لگی۔

اس کی سیدھی آنکھ میں خون کی سرخی ایک لمحے کو نظر آئی اور دوسرے ہی لمحے میری آنکھوں کے سامنے جیسے خون کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا۔ میں نے کسی تھکے ہارے کچھوے کی طرح گردن ڈال دی اور ٹھوڑی چٹانی زمین پر ٹکا کر گہری گہری سانسیں لینے لگا۔

پانوش کو جب میں نے کچھ دیر بعد دیکھا تو اس کی گردن ڈھلک چکی تھی۔ اس کی دونوں ٹوٹی ہوئی ٹانگیں جسم کے نیچے دبی ہوئی تھیں اور اس کا بدن خاک و خون میں لتھڑا ہوا، ان لوگوں کی درندگی کا منہ بولتا شاہکار تھا۔

میں نے سارجنٹ کی طرف دیکھا۔

اس کی آنکھیں دہکتے ہوئے کوئلوں جیسی تھیں۔

اس کے ریوالور سے اچانک ہی ایک شعلہ سا لپکا۔ اس بار میں دھماکا نہیں سن سکا۔ غالباً میری سماعت بھی اب میرا ساتھ چھوڑ گئی تھی۔ . . گولی اس شرابی کی رانوں کے بیچ میں لگی اور وہ ٹانگیں ہوا میں چلاتا ہوا بالکل اسی طرح پیٹھ کے بل گر گیا جیسے میں نے کچھ دیر قبل پانوش کے کتّے کو گولی کھا کر گرتے دیکھا تھا۔

شرابی درندے کے ہاتھ سے ریوالور گر گیا اور اس کی بوتل لڑھکتی ہوئی دوسری طرف کے نشیب میں چلی گئی۔ اس کی نگاہ اپنے آس پاس کھڑے ساتھیوں پر جمی ہوئی تھی۔ اس کا منہ کھل گیا تھا۔ . . پھر اس کے ہونٹ حرکت کرنے لگے جیسے اپنے ساتھیوں سے کچھ کہنا چاہتا ہو لیکن قوتِ گویائی سے محروم ہو جانے کے باعث اس کی آواز نہیں نکل رہی تھی۔

سارجنٹ فرینک چند لمحوں تک اسے گھورتا رہا . . . پھر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ آہستہ آہستہ گرے ہوئے سپاہی کے ریوالور کے قریب پہنچا اور جھک کر اسے اٹھا لیا۔ اپنا ریوالور چمڑے کی پیٹی میں اُڑس کر سوگوار انداز میں چلتا ہوا وہ واپس زخمی سپاہی کے پاس آ گیا۔

"میری مدد کرو، فرینک۔" زخمی نے بمشکل کہا۔ ایک ایک لفظ کے ساتھ کئی کئی کراہیں اس کے حلق سے آزاد ہو رہی تھیں۔ "میری آنتوں میں آگ لگی ہوئی ہے۔ م . . . میں . . . میں اسے قتل نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن . . ."

"لیکن پھر بھی تم نے اسے قتل کر دیا۔" سارجنٹ نے جارحانہ لہجے میں کہا اور پھر اچانک ہی اس کی دائیں ٹانگ حرکت میں آ گئی۔ ایک بھرپور ٹھوکر زخمی سپاہی کے جبڑے پر پڑی اور اس کا چہرہ گھوم گیا۔ بھاری فوجی بوٹ کی ٹھوکر اس کا جبڑا توڑنے کے لیے کافی تھی۔ اس شخص کی صورت بدلی بدلی سی نظر آنے لگی۔ اسے دیکھ کر یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ زمین ہی کا کوئی باشندہ ہے۔

دونوں ہاتھ رانوں میں دبائے وہ بُری طرح چیخ رہا تھا اور آہ و زاری کر رہا تھا۔ اس کی آہ و بکا سے ماحول کانپ رہا تھا لیکن اس کی فریاد سننے والا وہاں کون تھا؟ میں مُردوں سے بھی بدتر حالت میں تھا اس لیے اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ ہر طرف چٹانیں ہی چٹانیں تھیں اور چٹانوں پر موجود باقی پانچ افراد کے سینوں میں بھی دل کی جگہ چٹانیں ہی رکھی ہوئی تھیں جن پر اگر کوئی اثر ہونا ہوتا تو بے چارے معذور لڑکے پانوش کو اذیت دیتے وقت ہی ہو جاتا۔ درندگی کا اظہار اور عمل دونوں ہی کتنے آسان ہوتے ہیں لیکن اسے برداشت کرنا کس قدر مشکل ہوتا ہے۔ اس کا اندازہ غالباً زخمی فوجی کو زندگی میں پہلی بار ہو رہا تھا۔

سارجنٹ نے اپنے باقی ساتھیوں کی طرف دیکھا۔

سب کے سب بے حد خوف زدہ تھے۔

سارجنٹ فرینک کو متوجہ پا کر ان سب کے ہاتھوں نے میکانیکی انداز میں حرکت کی اور ہر کسی کا ریوالور اس کے ہولسٹر میں پہنچ گیا۔ اس وقت کوئی بھی سارجنٹ سے نگاہیں چار کرنے کی ہمت نہیں کر رہا تھا۔ غالباً سارجنٹ کی فطرت سے وہ سب اچھی طرح واقف تھے اور شاید انہیں خدشہ تھا کہ کہیں جھلاہٹ میں وہ انہی پر نہ الٹ پڑے۔ . . "اس لڑکے کی لاش درخت سے باندھ دو۔" سارجنٹ نے اپنے ساتھیوں کو گھورتے ہوئے حکم دیا۔

سارجنٹ کچھ دیر پانوش کی لاش کو گھورتا رہا . . . پھر اس نے نفرت سے تھوکتے ہوئے کہا: "کاش! یہ لڑکا ضد نہ کرتا۔" وہ اپنے

سنہری غول
اسلم راہی ایم اے قیمت:= /150

ساتھیوں کی طرف متوجہ ہوا۔ "میرا خیال ہے، فرس خان نے مجھے جو اطلاع دی تھی، وہ غلط ہے۔"

"فرس خان ایک قابلِ اعتماد سردار ہے، سارجنٹ۔" ایک پٹھان سپاہی نے جلدی سے کہا۔

"ہُنہ . . ." سارجنٹ نے نفرت سے ایک بار پھر تھوک دیا۔ "میرا خیال ہے تمہاری قوم میں صرف چند ہی قابلِ اعتماد اور وفادار آدمی ہیں اور تم دونوں ان ہی میں سے ہو ورنہ کسی عام پٹھان کے بارے میں میری رائے بالکل مختلف ہے۔"

پٹھان سپاہی بے غیرتی سے ہنس پڑا۔

میرا خون کھول اٹھا۔

یہ پٹھان زادہ اپنی ہی قوم کی تذلیل پر قہقہے لگا رہا تھا۔ حالانکہ اسے سمجھ لینا چاہیے تھا کہ خود انگریز قوم ایسی ہے جیسا کہ وہ پٹھانوں کے بارے میں کہہ رہا تھا۔ . . اور اس کی جیتی جاگتی مثال وہ انگریز فوجی تھا جو اس کے ہاتھوں زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا اس وقت بھی تڑپ تڑپ کر فریاد کر رہا تھا۔ . . لیکن کوئی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ سب کے سب اپنے سارجنٹ کی خوشنودی کے لیے اس کی طرف پشت کیے کھڑے تھے۔

کاش میرے ہاتھوں میں اتنی طاقت ہوتی، کاش! میں اس قابل ہوتا کہ اس پٹھان زادے کی گردن مروڑ سکتا جس نے محض دولت کے لالچ میں نہ صرف اپنی پوری قوم سے غداری کی تھی بلکہ وہ اس کی تذلیل کا باعث بھی بن رہا تھا۔ لیکن میرے پاس سوائے خون کے گھونٹ پی کر رہ جانے کے اور کوئی چارہ نہیں تھا کیوں کہ میں ایک زندہ لاش بن کر رہ گیا تھا۔

تو یہ سب کچھ فرس خان کا کیا دھرا ہے۔

سارجنٹ فرینک نے بالآخر میری یہ اُلجھن بھی رفع کر دی تھی۔ شالیار خان کے جواری ہونے، اس کے ہاتھوں ہارنے اور اس کا مقروض ہونے کی اطلاع غلط تھی۔ میرا ذہن بڑی حد تک اس طرف سے مطمئن ہو گیا اور مجھے نہ جانے کیوں یقین ہو گیا کہ شالیار خان کے بارے میں یہ بات بھی غلط ہی ہو گی کہ وہ مر چکا ہے۔ وہ کوئی آسان لقمہ نہیں تھا کہ سارجنٹ فرینک جیسے آدمی کے حلق میں اتر جاتا . . .

سارجنٹ فرینک میں شالیار خان کی زبردست مشابہت البتہ میرے لیے تشویش کا باعث تھی۔

"چلو دوستو۔۔۔" سارجنٹ نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ "ہمیں اب یہاں سے چل دینا چاہیے۔ ہمارا بہت سا وقت پہلے ہی ایک غلط اطلاع کی وجہ سے ضائع ہو چکا ہے۔ میں اس فرس خان سے بھی نمٹ لوں گا۔ اُسے ایسی افواہوں کے لیے بھاری نقصان برداشت کرنا پڑے گا۔"

سب اپنے اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر وہاں سے رُخصت ہو گئے۔

ان کا رُخ اس بار اُدھر نہیں تھا جدھر سے وہ آئے تھے بلکہ تمام گھڑسوار مخالف سمت میں روانہ ہو گئے تھے۔ ہمارا گاؤں رونیال بھی اسی طرف تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ سارجنٹ فرینک، رونیال پہنچ کر وہاں کے غاصب سردار فرس خان سے ملنا چاہتا تھا تاکہ اس سے غلط اطلاع کے سلسلے میں بازپرس کر سکے۔

میں نے آنکھیں بند کر لیں اور صدقِ دل سے دُعا کی کہ کاش! یہ سارجنٹ اس قدر غصّے میں آجائے کہ بالآخر یہ فرس خان کے لیے سزائے موت تجویز کر دے۔

میں آنکھیں بند کیے ٹاپیں سُنتا رہا۔

جاتے ہوئے گھوڑوں کی ٹاپوں سے مجھ پر عجیب سا اثر ہونے لگا اور میرے ذہن پر غنودگی طاری ہوتی چلی گئی۔۔۔ چند ہی لمحوں کے بعد میں آس پاس سے بے خبر ہو چکا تھا۔

میری آنکھ کھلی اور حواس بیدار ہوئے تو میں نے غیر ارادی طور پر اُٹھنے کی کوشش کی لیکن میرا پورا جسم کسی نازک سی شاخ کی طرح کانپ کر رہ گیا۔ اگرچہ میں دیر تک سوتا رہا تھا۔۔۔ یا پھر شاید میں اتنے عرصے بے ہوش رہا تھا، بتانا مشکل ہے کیوں کہ میں ہر طرف سے بے خبر ہو کر طویل وقت گزارنے کے بعد اپنے حواس میں واپس آیا تھا۔

سُورج ڈھل چکا تھا۔

دُھوپ کی شدت ختم ہو چکی تھی،

ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے میرے جسم سے چھو کر اس میں تازگی اور توانائی کی لہریں پیدا کر رہے تھے، دُور اُفق سے کہیں پہاڑوں کی سپید سپید چوٹیاں نظر آ رہی تھیں۔

میں نے ماحول پر طائرانہ نگاہ ڈالی۔

میرا ذہن ہر خیال اور ہر خدشے سے بے نیاز تھا۔

— اچانک میرے کانوں سے کسی گھوڑے کے جنہنانے کی آواز ٹکرائی تو میں چونک پڑا۔ آواز کی سمت میں دیکھا تو ایک درخت سے بندھا ہوا گھوڑا نظر آیا۔ یہ گھوڑا اسی انگریز فوجی کا تھا جسے اس کے ساتھی شدید زخمی حالت میں چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ گھوڑا خود کو درخت سے چھڑانے کے لیے زور لگا رہا تھا، وہ چمڑے کی جن لگاموں کے ذریعے بندھا ہوا تھا، خاصی مضبوط تھیں لیکن کسی سرکش گھوڑے کے سامنے ان کی کوئی اہمیت نہیں ہو سکتی تھی۔

گھوڑے نے اچانک زور لگایا۔ اس بار جھٹکا اتنا شدید تھا کہ ایک لگام ٹوٹ گئی۔۔۔ پھر دو تین جھٹکوں میں دوسری لگام بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی اور گھوڑا آزاد ہو گیا۔۔۔ اگلے ہی لمحے وہ بھی سرپٹ دوڑتا ہوا اسی طرف چلا گیا جدھر سارجنٹ اور اس کے ساتھی اپنے گھوڑوں پر سوار ہو کر گئے تھے۔ چند ہی ساعتوں کے بعد اس کی دُور ہوتی ہوئی ٹاپیں سُنائی دیں اور وہ میری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔۔۔ پھر اس کی آوازیں بھی گم ہو گئیں۔

میں نے اس طرف دیکھا جدھر پانوش کو باندھا گیا تھا۔ اس کی لاش اب بھی درخت سے بندھی ہوئی تھی اور اسی حالت میں بیٹھا نظر آ رہا تھا جس میں بٹھا کر اُسے باندھا گیا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے لاش اکڑ کر سخت ہو گئی ہو۔

میں نے چٹانی زمین پر پڑے اس فوجی کی طرف بھی دیکھا، جسے اس کے ساتھی نہایت بے رحمی اور خود غرضی کا مظاہرہ کرتے ہوئے چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ اس کا جسم اب بھی بے حس و حرکت تھا۔ موت کے فرشتے نے غالباً اُسے زندگی کے عذاب سے نکال لیا تھا۔ اس کے گرد خون ہی خون پھیلا ہوا تھا اور تیز دھوپ کی وجہ سے پپڑیاں سی بن کر پھٹ گئی تھیں۔ خون جس طرح پھیلا ہوا تھا اس سے پتا چلتا تھا کہ اس نے کس انداز میں تڑپ تڑپ کر دم توڑا ہو گا۔

دفعتہً مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے عقب میں نشیب بیدار ہو گیا ہو۔ خاموش جھاڑیاں جاگ اُٹھی ہوں۔۔۔ آہٹیں اور سرسراہٹیں سی فضا میں پھیلنے لگی تھیں۔ میں گردن گھمانے سے قاصر تھا لیکن میرا ذہن کام کر رہا تھا اور میں آسانی سے سمجھ سکتا تھا کہ بھیڑ بکریوں نے دن بھر پہاڑیوں پر چرنے کے بعد بالآخر گھر کی طرف واپس آنا شروع کر دیا ہے۔

نشیب سے اوپر آنے کے بعد یہ بھیڑ بکریاں میرے قریب سے گزرنے لگیں۔ ایک بکرا جو مجھ سے بے حد مانوس تھا، وہ رُک کر مجھے سونگھنے اور ممیانے لگا۔ میں نے اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرا اور اس کی گردن تھپ تھپانے لگا۔۔۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پھر اچانک ہی میرے ذہن میں ایک ترکیب آگئی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کی ایک ٹانگ پکڑ لی اور اُسے زور سے جھٹکا دیا۔ اگرچہ میں ناتوانی کے باعث اُسے گرا نہ سکا لیکن میرا مقصد پورا ہو گیا۔

وہ بدک کر دوڑنے لگا۔

میں نے اس کے گلے میں پڑی ہوئی رسّی کے اس چھوٹے سے سرے کو دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے پکڑ لیا تھا اس لیے طاقت ور بکرے کی حرکت سے میرا لاشہ بھی متحرک ہو گیا۔

اس نے گردن جھٹک کر میرے بوجھ سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کی اور زور سے چیخا۔ غالباً وہ میرے اس انوکھے طرزِ عمل پر احتجاج کر رہا تھا لیکن اُسے کیا معلوم تھا کہ میں کس اذیت سے دوچار ہوں۔

وہ سیدھا جھونپڑے کی طرف جا رہا تھا۔

چٹان کے بعد نرم نرم گھاس کا ایک میدانی ٹکڑا تھا۔ اسے پار کرتے ہوئے تو مجھے کچھ محسوس نہ ہوا لیکن جب وہ چٹانی لیکن ہموار حصے میں دوڑنے لگا تو میرا جسم شدّتِ تکلیف سے نڈھال سا ہونے لگا۔ میں ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ گیا تھا، ہڈیاں چٹانی زمین سے رگڑ کھا کر چٹختی ہوئی سی محسوس ہونے لگیں۔

میں اپنی کراہوں کو دباتا ہوا اور بار بار ڈوبتے ہوئے ذہن کو سنبھالتا بمشکل تمام رسّی کو جکڑنے میں کامیاب ہو رہا تھا۔ فاصلہ بتدریج کم ہوتا جا رہا تھا اور میری حالت لمحہ بہ لمحہ خراب ہوتی جا رہی تھی۔

جھونپڑے کے باہر وہ رُک گیا۔

میں نے ایک ہاتھ سے رسّی تھام کر دوسرے ہاتھ سے اس کی ٹانگ کو دوبارہ جھٹکا دیا۔ اگر میری گرفت مضبوط نہ ہوتی تو اس بار میرے ہاتھ سے وہ رسّی کا مختصر سا ٹکڑا یقیناً چھوٹ گیا ہوتا۔ اس نے گھبراہٹ میں اِدھر اُدھر دیکھا۔۔۔ اور پھر وہ کوئی جائے پناہ نہ پا کر جھونپڑے ہی میں گھس گیا۔

میں گھسٹتا ہوا اس کے ساتھ اندر پہنچا اور پھر میں نے رسّی چھوڑ دی۔

میں فرش پر بے حس و حرکت لیٹا، اپنے گھومتے ہوئے سر کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگا۔ بکرا اب بھی بدک کر اِدھر اُدھر دوڑ رہا تھا۔ وہ بے پناہ شور مچا رہا تھا۔ اس کی آوازوں کے جواب میں باہر سے بھی آوازیں آ رہی تھیں۔ اس قدر شور ہو رہا تھا کہ میرے اعصاب جواب دیتے جا رہے تھے۔

اگرچہ جھونپڑے کا چٹان سے فاصلہ کچھ زیادہ نہیں تھا۔ لیکن میں جس انداز میں گھسٹ کر یہاں تک پہنچا تھا، وہ موجودہ حالت کے پیشِ نظر کچھ زیادہ ہی تکلیف دہ تھا۔

بکرے کی بھاگ دوڑ سے قریب پڑا ہوا ٹرنک کھل گیا تھا اور اس کی ٹھوکروں میں سب کچھ بکھرتا جا رہا تھا۔ میں اپنے اشعار جن کاغذات پر لکھ لکھ کر جمع کر رہا تھا، وہ سب کے سب بکھر گئے۔ قلم بھی ایک طرف پڑا نظر آیا۔

میں نے ہاتھ بڑھا کر اسے اُٹھا لیا۔

شاید گھسٹنے کی وجہ سے عضلات میں شدید کھنچاؤ پیدا ہوا تھا اور اس سے میرے ہاتھ پیروں میں حرکت بھی پیدا ہو گئی تھی۔ اس لیے میں نے اُٹھ بیٹھنے کی کوشش کی تو مجھے تھوڑی سی کامیابی ہو گئی۔۔۔ لیکن اگر میں فوراً ہی جھونپڑے کی دیوار کا سہارا نہ لیتا تو دوبارہ گر گیا ہوتا۔

میں نے آنکھیں بند کر لیں اور دیر تک یوں بیٹھا ہانپتا رہا۔ میرے دائیں طرف جھونپڑے کی اکلوتی کھڑکی تھی۔ اس کھلی کھڑکی سے وہ راستہ نظر آتا تھا جس پر صبح شالیار خان کو آنا تھا۔۔۔ لیکن وہ نہیں آیا۔ راستہ اب بھی سنسان نظر آ رہا تھا۔ دھول کا خفیف سا بادل بھی دُور اُفق تک دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

بکرا نہ صرف پُرسکون ہو چکا تھا بلکہ وہ جھونپڑے سے باہر بھی جا چکا تھا۔ دوسرے جانوروں نے بھی شور مچانا بند کر دیا اور ہر طرف گہری خاموشی چھا گئی۔۔۔ تیزی سے شام ہو رہی تھی، شاید یہ میری زندگی کی آخری شام ہے۔۔۔ میں نے ایک بار پھر سنسان راستے کی طرف دیکھا اور جہاں تک میرے ہاتھ پہنچ سکتے تھے، میں انہیں پھیلا پھیلا کر کاغذ کے ٹکڑے جمع کر کے اپنے گھٹنے کے نیچے رکھتا گیا۔

۔۔۔ پھر میں نے شالیار خان کی آمد کی اطلاع دینے والے دوست کے آنے سے اس شام تک کی ایک ایک بات اور ایک ایک احساس کاغذ پر منتقل کر دیا۔ میں جانتا ہوں کہ اگر شالیار خان آیا تو وہ ان کاغذات کو کبھی نظر انداز نہیں کرے گا۔ اُسے میرے شعروں سے بے پناہ دلچسپی تھی، پھر میں قلم ہاتھ سے نہیں جانے دوں گا۔ اسے میرے ہاتھ میں دیکھ کر وہ سمجھ جائے گا کہ میں نے اس حادثے کی تفصیل کاغذ پر منتقل کر دی ہے۔

کہانی ختم ہو چکی ہے۔ میں نے جیسے تیسے سب کچھ لکھ دیا ہے۔ اب میں سکون سے مرجانا چاہتا ہوں۔۔۔ بالکل اسی طرح جس طرح تھکن سے نڈھال انسان نیند کی خواہش کرتا ہے اس کی ضرورت محسوس کرتا ہے بالکل اسی طرح زندگی تھک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جائے تو ہمیشہ کی نیند ہی اُسے مکمل سکون دیتی ہے۔

میں نے کاغذات کو اپنے گھٹنے کے نیچے رکھ لیا ہے تاکہ کھڑکی سے آنے والے جھونکے انہیں اُڑا کر نہ لے جائیں میں اپنی داستان کو اس وقت تک بکھرتے ہوئے نہیں برداشت کرسکتا تھا جب تک یہ تحریر شالیار کے ہاتھوں میں نہیں پہنچ جاتی۔

اب مجھے مرنے کے علاوہ کوئی کام نہیں تھا۔

میں اس سنسان راستے پر نگاہ جمائے بیٹھا ہوں اور میرا جسم آہستہ آہستہ زندگی کا لبادہ اُتار کر موت کی پُرسکون چادر اوڑھتا جارہا ہے۔۔۔

سُورج تیزی سے ڈوب رہا ہے لیکن راستہ روشن ہے۔

اوہ۔۔۔ یہ کیا ہے۔۔۔ کہیں میری مُردہ ہوتی ہُوئی آنکھیں مجھے آخری بار دھوکا تو نہیں دے رہی ہیں؟

نہیں۔۔۔ یہ دھوکا نہیں ہوسکتا!

یہ میری دُعاؤں کا انجام ہے۔

یہ میری خواہشوں کی منزل ہے۔

دُور اُفق پر غبار سا اُٹھتا نظر آرہا ہے۔ یہ غبار تیزی سے بڑھ رہا ہے۔۔۔ لیکن موت اب مجھے زیادہ مہلت نہیں دے رہی۔۔۔ میں۔۔۔ میں۔۔۔ شالیار آرہا ہے۔۔۔

جاسوسی ڈائجسٹ کے مقبول سلسلے

ناگ بھون — اقلیم علیم
(دو جلدیں) قیمت =/300 روپے

سنگتراش — اقلیم علیم
(دو جلدیں) قیمت =/300 روپے

برہمچاری — انوار صدیقی
قیمت =/150 روپے

سرکش — محمود احمد مودی
(12 حصے) مکمل سیٹ =/600 روپے

مکتبہ القریش سرکلر روڈ اردو بازار لاہور
فون 7668958

★ یہ برطانوی دورِ حکومت تھا۔

پٹھانوں اور انگریزوں کے درمیان آخری کشمکش چل رہی تھی۔ سرحدی علاقے اور آزاد قبائل کے لوگ انگریزوں کے خون کے پیاسے تھے اور ان گنت تحریکیں جنم لے کر یا تو دم توڑ گئی تھیں یا پھر سسک رہی تھیں۔ ایسی ہی ایک تحریک میرے آبائی گاؤں روتیال سے بھی پیدا ہُوئی۔ میرے دادا عبدالرحیم خان اس تحریک کے سربراہ تھے۔۔۔ میرے دادا کے ایک دُور کے رشتے دار فرس خان نے چند غداروں کے ساتھ روتیال پر حملہ کردیا اور راتوں رات انگریزی فوج کی مدد سے پُورا گاؤں نیست و نابود کردیا۔

میرے دادا اس جنگ میں کام آگئے اور وہ چھوٹی سی تحریک ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دَم توڑ گئی۔ فرس خان نے میرے والد شالیار خان کو دھکے دے کر گاؤں سے نکال دیا اور ان کی منگیتر مگینہ سے زبردستی شادی رچالی۔ میرے بابا جوان تھے اور ان کی رگوں میں تازہ خون جوش مار رہا تھا لیکن انہوں نے انتقام کی راہ اختیار نہیں کی۔۔۔ بلکہ پہاڑوں میں ایک لکڑی کا جھونپڑا بنا کر زندگی کے دن گزارنے لگے۔

یہ سب کچھ انہوں نے اپنے چھوٹے بھائی یعنی میرے چچا پالوش کی خاطر برداشت کرلیا تھا۔ پالوش چاچا کم عمر تھے اور ان کی ایک ٹانگ خراب تھی۔ اپنے معذور بھائی اور بوڑھے ملازم شاہ مراد خان کے ساتھ وہ اس جھونپڑے میں رہنے لگے۔ چند بھیڑ بکریوں پر یہ تین افراد آخر کب تک زندگی گزار سکتے تھے۔ میرے بابا نے بالآخر انگریز فوج میں بھرتی ہونے کا فیصلہ کرلیا۔

بوڑھے ملازم شاہ مراد خان نے بھی انہیں روکنے کی کوشش نہیں کی کیوں کہ وہ اپنوں کا سلوک دیکھ ہی چکا تھا۔۔۔ پھر میرے بابا شالیار خان اپنے معذور چھوٹے بھائی کو شاہ مراد خان کے پاس اس سنسان جگہ پر واقع جھونپڑے میں چھوڑ کر چلے گئے۔

میرے بابا شالیار خان نے انگریزوں کی غلامی مصلحتاً یوں بھی اختیار کرلی تھی کہ فرس خان انگریزوں کا وفادار ہونے کی وجہ سے اُن کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھ سکتا تھا۔۔۔ لیکن بعد کے حالات سے پتا چلتا ہے کہ فرس خان کو میرے بابا کی اس حرکت پر بے پناہ غصہ آیا تھا اور اس کے سینے میں مزید انتقامی جذبے بیدار ہوگئے تھے۔ ایسا ہونا بھی چاہیے تھا کیوں کہ اب وہ پالوش چاچا اور بوڑھے شاہ مراد خان کو بھوک سے ایڑیاں رگڑتے ہوئے دیکھنے کی خواہش کو پُورا نہیں کرسکتا تھا۔

پالوش چاچا جس دردناک انداز میں موت سے گلے ملا۔ اس سے اس کی مردانگی اور ہمت و برداشت کا پتا چلتا ہے۔ مجھے فخر ہے کہ اس نے مرتے دَم تک دُشمنوں اور غداروں کے سامنے سر نہیں جھکایا۔۔۔ یہی ہماری شان ہے اور یہی ہماری عظمت ہے جس پر میرا سینہ مزید پھیل جاتا ہے۔

کچھ لوگوں کو فلموں میں خون ریزی دیکھ کر خوف محسوس ہوتا اور کچھ مخصوص تحریروں سے خوف زدہ ہوجاتے ہیں۔ ایسے لوگوں سے میں صرف اتنا ہی کہنا چاہتا ہُوں کہ دُنیا میں مردانہ وار زندہ رہنا کوئی مُشکل کام نہیں ہے۔ مردانگی اپنانے میں جو کچھ خرچ آتا ہے، وہ ہر انسان کی اپنی ذات میں موجود ہوتا ہے۔۔۔ بس اسے خرچ کرنے کی ہمت پیدا کرنا ضروری ہے۔ کچھ کرکے مرنے اور کچھ نہ کرکے مرنے میں، پیدا ہونے اور نہ پیدا ہونے جتنا فرق ہے۔۔۔ لیکن یہ ضرور سوچنا چاہیے کہ آخر انسان کیا کرکے مرے!

کیا وہی کچھ جو میرے بابا شالیار خان نے کیا تھا؟

کیا وہی جو میرے چچا پالوش نے کیا؟

یا پھر وہ کچھ جو ایک وفادار بوڑھے ملازم نے مرتے دَم تک کیا؟ اس کا اندازہ آپ کو میری مکمل کہانی پڑھنے کے بعد ہی ہوسکتا ہے۔ یہاں میں صرف اسی بات پر زور دوں گا کہ کم ہمتی ایک ایسی لعنت ہے جسے غیور قومیں کبھی اپنے گلے کا ہار نہیں بننے دیتیں۔ ہمت و شجاعت مَردوں کا زیور ہے اور مَرد انہیں پہن کر جگمگاتا ہی اچھا لگتا ہے۔

میری کہانی تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے دو حصے پیش منظر ہیں اور پس منظر میں میرے اپنے حالات ہیں جن کا تذکرہ بعد ہی میں اچھا لگے گا۔ اس ترتیب کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ پڑھنے والوں کو میرے وجود کی پیدائش کا قدرتی جواز مل جائے گا اور حالات نے مجھے جو کچھ بنادیا اُسے سمجھنے میں مدد ملے گی۔ تب ایک عام شخص کو اپنی زندگی پر نگاہ ڈالنے کر یہ احساس ہوگا کہ وہ اب تک بلاوجہ ہی زندگی سے خوف زدہ رہا ہے۔

میں اپنی داستانِ حیات کا پہلا حصہ آپ کو سُنا چکا ہوں اب دوسرے باب کے لیے مجھے اپنے بابا شالیار خان کے اس چھوٹی روزنامچے کی طرف متوجہ ہونا پڑے گا جسے میرے ہاتھوں میں اس وقت دیا گیا تھا جب میری ایک ایک حس بیدار اور جوان ہوچکی تھی۔ تب سے اب تک میں نے بڑی بے کل زندگی گزاری ہے اور یہ زندگی ہنگاموں سے بھرپُور ہے۔ ایسے ہنگاموں سے لبریز جس کا تصور بھی عام آدمی کے لیے ممکن نہیں۔۔۔ یہی وجہ ہے کہ میں خود کو ہنگاموں کا بیٹا کہنے میں فخر محسوس کرتا ہُوں۔

نواب حیدر علی
الماس ایم اے — قیمت:-/200

★

اُس شام میں بے حد خوش تھا کیوں کہ میں گھر واپس جارہا تھا۔۔۔ لیکن مجھے یہ تشویش بھی تھی کہ میرا چھوٹا بھائی پالوش اور وفادار ملازم انتظار کرتے کرتے مایوس ہوکر نہ جانے کس قدر پریشان ہورہے ہوں گے۔ میں نے اپنی یونٹ کے ایک سپاہی سے درخواست کی تھی کہ وہ اپنے گھر جاتے ہوئے تھوڑی سی زحمت کرکے میرے بھائی کو اطلاع دیتا جائے کہ میں آج صبح گھر واپس آرہا ہوں۔ یہ سپاہی روتیال کا رہنے والا تھا اور اسے اُسی راستے سے جانا تھا جو ہمارے اس جھونپڑے کے قریب سے گزرتا تھا۔ جہاں ہم تینوں نے فرس خان کے مظالم سے تنگ آکر رہائش اختیار کی تھی۔ اس نے یقیناً میرا پیغام پالوش کو دے دیا ہوگا اور پالوش نے گزشتہ شام ہی سے میرے انتظار میں ایک ایک پل گن گن کر گزارنا شروع کردیا ہوگا۔ آخر ہمارا ایک دوسرے کے سوا دُنیا میں تھا بھی کون؟ بوڑھا ملازم چند دنوں کا مہمان ہے معلوم نہیں وہ میرے پہنچنے تک زندہ بھی ہوگا یا نہیں؟

میرا گھوڑا تیزی سے دوڑ رہا تھا۔

سفر کرتے ہوئے میں نے بہت کم آرام کیا تھا۔

اگر چلتے وقت چند ضروری کاموں کی وجہ سے مجھے رُکنا نہ پڑتا تو میں حسب وعدہ علی الصباح ہی اپنے گھر پہنچ گیا ہوتا اور یوں مجھے جھلستی ہُوئی اس دُھوپ میں سفر نہ کرنا پڑتا۔

میں نے اس چٹان کی طرف دیکھا جس پر پالوش کو میرا منتظر ہونا چاہیے تھا۔۔۔ لیکن وہاں تو کسی کا ہیولا بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میرا دل شدت سے دھڑکنے لگا۔ یہ ایک خلافِ معمول بات تھی۔ پالوش کو وہاں کھڑے ہوکر میرا انتظار کرنے سے دُنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی تھی۔۔۔ پھر مجھے خیال آیا کہ میں نے علی الصبح آنے کا وعدہ کیا تھا۔ پالوش نے یقیناً میرا انتظار کیا ہوگا۔ ممکن ہے اس نے دن بھر اسی چٹان پر کھڑے کھڑے گزار دیا ہو۔۔۔ اور پھر بوڑھے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شاہ مُراد خان نے اُسے جھونپڑے میں بُلا لیا ہو۔

جب انسان کا دل جذبات کے اثر میں ہو تو ذہن اندیشوں کی پیداوار میں بڑی تیزی دکھاتا ہے۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہُوا۔ اس چٹان کو خالی دیکھ کر میرے دل کو دھکا سا لگا تھا حالانکہ یہ کوئی تشویش آمیز بات نہیں تھی۔ یہ چٹان کافی فاصلے سے دکھائی دیتی تھی اور ہم اسے بطور نشانِ راہ بھی استعمال کیا کرتے تھے۔۔۔ ورنہ اس کی طرف توجہ نہ دی جائے تو آدمی اس راستے پر آگے ہی آگے بڑھتا چلا جائے۔ اور اُسے کچھ بھی دکھائی نہ دے۔ ہمارے جھونپڑے کے آس پاس درخت ہیں جھاڑیوں کی بھی بہتات ہے۔ اس لیے نیچے سے جھونپڑے کو نہیں دیکھا جا سکتا جب کہ جھونپڑے کی کھڑکی یا دروازے میں کھڑے ہو کر اس طویل راستے کو افق تک دیکھا جا سکتا ہے۔ جھونپڑا بلندی پہ ہے جب کہ یہ راستہ میلوں تک میدانی علاقے سے گزرتا ہے۔

میں نے تھکے ہُوئے گھوڑے کو مزید دوڑانا مناسب نہ سمجھا کیوں کہ اب وہ بُری طرح ہانپنے لگا تھا اور کسی بھی لمحے گر سکتا تھا۔ میں نے لگامیں کھینچیں اور پھر اطمینان سے آگے بڑھتا رہا۔

جہاں سے چڑھائی شروع ہوتی ہے، وہاں سے گھوڑا خود بخود اوپر چڑھنے لگا۔ جیسے جیسے جھونپڑے سے فاصلہ کم ہوتا جا رہا تھا، میری بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔۔۔ اور پھر اوپر پہنچتے ہی میں نے چیخ کر پالوشن کو پکارا۔

"پالوش۔۔۔ میں آگیا ہُوں۔۔۔ تمہارا بھائی شالیار آگیا ہے، پالوشن؟"

میں نے پُوری قوت سے گھوڑے کی لگامیں کھینچیں، اور میری نگاہیں اُس درخت پر جم گئیں جس کے تنے سے پالوشن بندھا ہُوا تھا۔۔۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا میری آوازیں اب بھی پہاڑوں میں گونج رہی تھیں۔ اس بازگشت نے مجھے پاگل سا کر دیا۔ پالوشن جس حالت میں نظر آ رہا تھا، اس سے یہ اندازہ دُور ہی سے ہو گیا کہ وہ مجھ سے رُوٹھ کر ایک ایسی منزل کی طرف جا چکا ہے، جہاں سے کبھی کوئی واپس نہیں آتا۔

گھوڑے نے اس خوفناک منظر کو دیکھا تو بدک گیا۔ اس کی ہنہناہٹ سے چٹانیں گونج اُٹھیں اور اس نے پچھلی ٹانگیں اس انداز سے چلائیں کہ ٹاپوں سے پہاڑوں کا سینہ کانپ اُٹھا۔ اُسے سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔ میں گھوڑے سے اُترا اور آہستہ آہستہ اس درخت کی طرف بڑھا۔

پالوشن کو اگر درندوں نے چیر پھاڑ ڈالا ہوتا تو یقیناً اس کی حالت اتنی قابلِ رحم اور خوفناک نہ ہوتی جس قدر کہ اس وقت دکھائی دے رہی تھی۔ دُشمنوں نے اسے جس انداز میں اذیت دے دے کر مارا تھا، اس کی تصویر میرے ذہن میں گھوم گئی۔

میرے سینے پر غم کا ایک پہاڑ یُوں بیٹھ گیا کہ دل کی ناتواں دھڑکنیں اس پہاڑ کو ہٹانے میں ناکام ہونے لگیں۔ میں مُردہ قدموں سے اس درخت کے پاس پہنچا۔ پالوشن کی لاش دیکھ کر میں سسک پڑا۔ میں اس سے لپٹ گیا اور دیر تک اس کے سینے سے لگا بلکتا رہا۔

۔۔۔ پھر میں نے لاش درخت کے تنے سے کھول کر اٹھائی اور اسی درخت کے نیچے قبر کھودنے میں مصروف ہو گیا۔ پالوشن کا مُردہ جسم قبر میں بے کفن اُتارنے کے بعد میں نے اس کا انگوٹھا اور انگلی بھی اُٹھا کر قبر میں اس کے اوپر ہی پھینک دی۔۔۔ پھر وہ مٹی اور پتھروں کے نیچے دفن ہوتا چلا گیا۔

میں دیر تک قبر کے پاس بیٹھا رہا۔

ہر طرف تاریکی پھیل چکی تھی۔

جھونپڑا ابھی تاریک تھا۔

پالوشن کے دلدوز انجام پر میں ذہنی طور پہ ماؤف ہو چکا تھا۔ اس لیے مجھے کسی اور چیز کی طرف توجہ دینے کا موقع ہی نہ مل سکا۔۔۔ میں انتقام کی آگ میں سرتاپا جل اُٹھا تھا اور یہ آگ اب میری رُوح تک کو لپیٹ میں لے چکی تھی۔ میں خالی خالی نظروں سے تاریک جھونپڑے کی طرف دیکھ رہا تھا جو اب میری زندگی، اور میرے ماضی کے ایک ایسے نشان کی طرح تھا جس کے اندر اور باہر اندھیرے ہی اندھیرے تھے۔

۔۔۔ پھر مجھے اس بوڑھے وجود کا خیال آیا جس کے بارے میں مجھے اطلاع ملی تھی کہ وہ کئی روز سے بیمار ہے۔ میں تیزی سے اُٹھا اور جھونپڑے کے دروازے کی طرف دوڑا۔

جھونپڑے کا دروازہ کُھلا ہُوا تھا۔

اس کی کھڑکی بھی کُھلی تھی۔

جھونپڑے کی دیواروں سے لگی بھیڑ بکریاں میری آمد پر شور مچانے لگیں۔ تب مجھے احساس ہُوا کہ تمام جانور باڑے کی بجائے جھونپڑے کے آس پاس ہی بکھرے ہُوئے ہیں۔ کچھ دیوار سے لگ کر بیٹھے ہُوئے تھے اور بعض اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ رات کے سناٹے میں ان کی صدائیں بے حد خوفناک اور ان آوازوں کی بازگشت نوحہ کناں محسوس ہوتی تھیں۔

میں دوڑتا ہُوا جھونپڑے کے کُھلے دروازے میں داخل ہُوا۔

"مُراد بابا۔۔۔!" میں نے چیخ کر کہا۔

جھونپڑے کے تاریک ماحول سے کوئی جواب نہ ملا۔

میں نے شمع جلائی تو وہ مجھے کھڑکی کے قریب دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا نظر آیا۔ وہ زمین پہ بیٹھا تھا اور اس کی آنکھیں باہر تاریکی میں گھور رہی تھیں۔ "مُراد بابا۔۔۔" میں نے اس کے قریب جُھکتے ہُوئے سرگوشی کی لیکن اس کے بھینچے ہُوئے ہونٹوں میں خفیف سی حرکت بھی پیدا نہیں ہُوئی۔

وہ مسلسل باہر ہی گھورتا رہا۔

تب مجھے احساس ہُوا کہ اس کی آنکھوں میں وہ چمک نہیں ہے، جو زندہ انسانوں میں ہوتی ہے۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ برف کی طرح سرد ہاتھ تھا۔ میری آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں میں اضافہ ہو گیا۔ میں دیر تک اس کے قریب بیٹھا رہا۔ حتیٰ کہ موم کی شمع کی روشن آنکھ سے ٹپکتے ہُوئے تمام آنسو ختم ہو گئے اور جھونپڑا ایک بار پھر تاریک سمندر بن گیا۔

میں نے دوسری موم کی شمع روشن کی۔ تب مجھے جھونپڑے میں بکھرے ہُوئے کاغذات نظر آئے۔ میں نے وہ کاغذات سمیٹ لیے۔ ان میں شاہ مُراد خان کی دھڑکنوں سے سجا ہُوا کلام تھا۔ ان میں سے بیشتر اشعار مجھے زبانی یاد تھے کیوں کہ میں انہیں بچپن ہی سے سُنتا اور یاد کرتا چلا آیا تھا۔۔۔ پھر چند کاغذات مجھے ایسے بھی مل گئے جن پر بوڑھے مُراد خان نے پالوشن کی اذیتناک موت کا احوال لکھا تھا۔ یہ کاغذات خون آلود اور آنسوؤں سے بھیگی ہُوئی داستان بیان کر رہے تھے۔ میں بیٹھ گیا اور شمع کی لرزتی ہُوئی لَو کی روشنی میں پڑھنے لگا۔

سارجنٹ فرینک۔۔۔ اور اس کے ساتھی۔۔۔

سب کچھ میری نگاہوں کے سامنے گھوم گیا۔

باہر ایک اور لاش بھی پڑی تھی جس کی طرف میں نے توجہ نہیں دی تھی۔ پالوشن کو دفن کرنے تک میں گرد و پیش سے یوں بھی بیگانہ ہو گیا تھا۔۔۔ پھر اندھیرا پھیل گیا اور اس کے بعد میں جھونپڑے میں چلا آیا تھا۔ مُراد خان نے رُوداد کو تفصیل سے لکھ کر میری ایک بڑی مشکل حل کر دی تھی۔ اب دشمن میرے سامنے بے نقاب تھے۔ میں انہیں تلاش کر کے انتقام کی پیاس بُجھا سکتا تھا۔ انتقام کے ان بھڑکتے ہُوئے شعلوں کو سرد کرنا ہی میری زندگی کا اب واحد مقصد تھا۔

مُراد خان کی لاش بھی میں نے پالوشن کی قبر کے قریب ہی دفن کر دی البتہ اس فوجی کو یُوں ہی پڑا رہنے دیا۔ اسے ٹھکانے لگانا ضروری نہیں تھا کیوں کہ درندوں اور کیڑے مکوڑوں کو اس کی شدید ضرورت تھی۔۔۔ پھر میں نے جھونپڑے پر الوداعی نگاہ ڈالی اور اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر تیزی سے اس طرف روانہ ہو گیا جدھر سارجنٹ فرینک اور اس کے درندہ صفت ساتھی گئے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ چند گھنٹوں میں وہ زیادہ دُور نہیں گئے ہوں گے اور میں انہیں جا لوں گا۔

میرا گھوڑا تھکا ہُوا تھا لیکن اس کی رفتار حیرت انگیز تھی یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس پہ دُشمنوں اور میرے درمیان فاصلہ کم کرنے کی دُھن سوار ہو گئی ہو۔

میں رات بھر گھوڑے کی پشت پر سفر کرتا رہا۔ ویران راستوں اور سنسان ماحول میں گھوڑا مسلسل دوڑتا رہا حتیٰ کہ سورج نے اپنی روشن آنکھ کھول کر دُنیا کو دیکھنا شروع کر دیا۔ میں نے گھوڑے کو روکا اور صبح کی نرم نرم کرنوں میں اس گھوڑا گاڑی کو دیکھنے لگا جو دائیں طرف ایک وادی میں کھڑی تھی۔ مجھے شدید بھوک لگ رہی تھی۔۔۔ رات بھر گھوڑے کے سفر کے ساتھ ساتھ میرا ذہنی سفر بھی جاری رہا تھا اور میرے اندر وہ درندہ نہ صرف پیدا ہو گیا تھا جو انتقامی کارروائیوں سے دل کی پیاس بجھاتا ہے بلکہ یہ درندہ شب بھر میں جوان بھی ہو چکا تھا۔

بغداد کی رات

قمر اجنالوی

الف لیلیٰ کی ایک ہزار راتوں سے زیادہ حسین و رنگین رات' دجلہ اور نیل کے دامنوں میں لپٹی ہوئی رات' جسے بے شمار کتابوں کے حوالوں سے آراستہ کیا گیا ہے

1200 سے زائد صفحات

قیمت:- 600/

ناشر مکتبہ القریش

اردو بازار لاہور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بند جھونپڑے جیسی گھوڑا گاڑی یقیناً کسی انگریز فوجی افسر ہی کی تھی۔ میرے سر پر خون سوار ہونے لگا۔ پاروش کی لاش میری نگاہوں میں گھوم گئی اور میں گھوڑے سے اتر کر آہستہ آہستہ اس گھوڑا گاڑی کی طرف بڑھنے لگا۔ میں کوشش کر رہا تھا کہ میرے یا گھوڑے کے قدموں سے کوئی پتھر نہ لڑھکنے پائے۔۔۔ پھر میں ٹھٹھک گیا۔

"اوں، ہوں! اب کوئی حرکت نہ کرنا۔ میں تمہیں اسی حالت میں دیکھنا چاہتا ہوں، ڈارلنگ!" ایک مردانہ آواز سنائی دی۔۔۔ جواباً کسی عورت کا جذبات سے بندھا ہوا قہقہہ ابھرا اور دیر تک فضا میں گونجتا رہا۔۔۔

میں نے اپنا ریوالور نکال لیا اور دبے قدموں اس گھوڑا گاڑی کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

بند جھونپڑے جیسی اس گھوڑا گاڑی سے جو نسوانی قہقہہ سنائی دیا تھا، اس میں جذبات سے بھرائی ہوئی آواز بھی شامل تھی، ان سنگلاخ چٹانوں کے بے داغ دامن میں ایک گناہ کی دیوی اتر آئی تھی جو ہمارے علاقے کے تقدس کو خاک میں ملا رہی تھی۔ آواز سے یہ اندازہ تو ہو گیا تھا کہ یہ کوئی انگریز جوڑا ہی ہے جو اس تنہائی کو گناہ آلود کرنے میں مصروف ہے، جو اگر کسی نیک دل بندے کو میسر آ جائے تو وہ ولی ہو جائے۔۔۔ لیکن تنہائی بھی زندگی ہی جیسی ہے اور ہر کوئی اسے اپنی مرضی اور فطرت کے مطابق گزارتا ہے۔

میں گھوڑا گاڑی سے کچھ فاصلے پر رک گیا۔۔۔

مرد کی آواز اور عورت کا قہقہہ سننے کے بعد میں نے ان کے بارے میں اندازہ لگایا۔۔۔ پھر دل کی نفرتوں نے ان کے لیے فیصلہ دے دیا۔ میرے سر پر یوں بھی خون سوار تھا۔ پاروش کا مردہ جسم رات بھر میری نگاہوں کے سامنے گھومتا رہا تھا اور صبح کی پہلی کرن کے ساتھ ہی میں نے اسے ذہن کے کسی دور افتادہ خانے میں دھکیل دیا تھا۔

میرے دل سے رحم کے جذبے کا جنازہ اٹھ کر اس کی تدفین دل ہی میں ہو گئی تھی اور اب مجھے اپنی ہر حرکت قلب کسی ٹھوس چٹان میں زلزلے سے پیدا ہونے والی لرزش کی مانند محسوس ہو رہی تھی۔ میں اب ایک انسان نہیں بلکہ درندہ تھا۔ ایک ایسا درندہ جس پر ہر وقت خون سوار رہتا ہو۔ انتقام کا الاؤ میری روح کے اندر بھڑک رہا تھا اور میری روح آہستہ آہستہ جھلس رہی تھی۔

نامور مصنف محمود احمد مودی
وہی تحریر اور وہی انداز
کے ساتھ، اپنے چاہنے والوں
کے لئے ایک نئی سوغات لئے
بہروپ
خوبصورت سرورق، بہترین
طباعت و کتابت، سفید کاغذ
قیمت =/180
مکتبہ القریش
سرکلر روڈ اردو بازار لاہور
7668958

اس وقت شدید بھوک کی وجہ سے میں یوں بھی باؤلا ہو رہا تھا۔ میں اپنے جسم میں راتوں رات پرورش پانے والے درندے کی بھوک بھی مٹانا چاہتا تھا۔۔۔ اور اس وقت ایک انگریز جوڑا مجھ سے قریب ہی رنگ رلیاں منا رہا تھا۔

میرے قدم گھوڑا گاڑی کی طرف اٹھتے رہے۔ گھوڑے کو میں نے کچھ پیچھے ہی چھوڑ دیا تھا۔ اب تک میں کسی چیتے کی طرح بے آواز چلتا ہوا گھوڑا گاڑی تک پہنچا تھا۔ ایک بھی پتھر میری ٹھوکر سے نہیں لڑھکا اور نہ ہی کوئی ایسی آواز پیدا ہوئی جس سے میری موجودگی ظاہر ہو جاتی۔ ایسے میں اگر تھوڑا بہت شور پیدا بھی ہو جاتا تو بند جھونپڑے جیسی گھوڑا گاڑی میں موجود جوڑے کو احساس تک نہ ہوتا۔ وہ جس انداز میں ایک دوسرے کی طرف متوجہ تھے اس کا اندازہ مجھے ان کی آوازوں اور قہقہوں سے ہو گیا تھا جب دو شخص ہم آہنگ ہوں تو اطراف کا شور بھی سناٹوں میں بدل جاتا ہے۔۔۔ وہ دونوں بھی اسی سناٹے میں یک جان ہونے کی کوشش کر رہے تھے جبکہ میں اس سناٹے کو روندتا ہوا مسلسل آگے بڑھ رہا تھا۔

"اوہ! ڈیئر۔۔۔" عورت کی آواز سنائی دی۔

میں بند جھونپڑے جیسی گھوڑا گاڑی کے دروازے کے سامنے رک گیا۔ میری انگلیوں نے ریوالور کو یوں جکڑ رکھا تھا جیسے وہ کوئی خونناک اژدہا ہو جو ذرا سی گرفت ڈھیلی کرنے پر بھاگ اٹھنے پر آمادہ ہو۔

یکایک میری دائیں ٹانگ اٹھی۔

پوری قوت سے ایک ٹھوکر دروازے پر پڑی۔

دروازہ یوں کھل گیا جیسے میری ٹھوکر کی تاب نہ لاتے ہوئے

گھبرا کر اطراف میں سمٹ گیا ہو۔

"جہاں اور جس حالت میں ہو۔۔۔ اسی میں بے حس و حرکت ہو جاؤ۔" میں نے انگریزی میں کہا۔

اندر اس گاڑی کے فرش پر میرے سامنے دو جسم تھے بے لباس اور بے حیائی کے پیکر۔ عورت کسی بے نیام تلوار کی طرح مرد کے قریب پڑی تھی۔ دونوں ہی میری آواز پر ٹھٹھک پڑے۔

۔۔۔ پھر عورت کا ہاتھ حرکت میں آ گیا۔

وہ بہت آہستہ آہستہ ایک کمبل کی طرف ہاتھ بڑھا رہی تھی۔

میں نے ٹریگر دبا دیا۔

ایک دھماکا ہوا اور عورت کے نرم و گداز ہاتھ میں چھوٹا سا سیاہ داغ ابھرا۔۔۔ پھر وہاں خون بھر گیا۔ اس کے حلق سے ایک لرزتی چیخ نکل گئی اور ہاتھ تیزی سے بلند ہو کر دوسرے ہاتھ میں یوں دب گیا جیسے مارے تکلیف کے اس ہاتھ کی پناہ میں چلا گیا ہو۔

وہ اب پلٹ کر میری طرف دیکھ رہی تھی۔

اس کی آنکھوں میں زخمی شیرنی جیسی نفرت بھری چمک تھی اور اس کے نقش و نگار میں کرب کروٹیں بدل رہا تھا۔ اب اسے اپنے بے لباس ہونے کا احساس نہیں تھا۔ موت کا خوف اور دہشت انسان سے باقی تمام احساسات چھین لیتا ہے۔

یہی حالت اس عورت کے ساتھی کی تھی۔

"یہ۔۔۔ یہ میری بیوی ہے۔" وہ ہکلایا۔

"اگر یہ تمہاری ماں بھی ہوتی تو مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔" میں نے سفاک لہجے میں کہا۔

"تم کیا چاہتے ہو؟"

"میں جو کچھ بھی چاہتا ہوں، ابھی حاصل کر لوں گا۔" میں نے کہا اور مرد کے چہرے پر نگاہ گاڑ دی۔ "اوہ۔۔۔ تو یہ تم ہو۔" میں بے اختیار کہے بغیر نہ رہ سکا۔

"شش۔۔۔ شالیار خان!" اس نے بھی مجھے پہچان لیا تھا۔ میرے حلق سے ایک بے ساختہ قہقہہ ابل پڑا۔

"اچھا ہوا، تم نے مجھے پہچان لیا!" میں نے قہقہے کی گونج میں کہا۔ "ورنہ شاید تمہیں اپنے قاتل کے بارے میں الجھن رہتی۔ قبل از وقت موت سے ہمکنار ہوتے ہوئے اگر انسان کو اپنی ناگہانی مرگ کی وجہ معلوم نہ ہو تو اس کی روح بلبلاتی اور بھٹکتی پھرتی ہے۔"

عورت کی زخمی شیرنی جیسی غصے اور نفرت سے دہکتی ہوئی آنکھیں اب بھی میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

ایک بے بس نوجوان کی حیرت انگیز داستان
جسے اپنی موت کا وقت معلوم ہو گیا تھا
مظلوم
یعقوب جمیل کے ہوشربا قلم سے
جس کا قارئین کو برسوں سے انتظار تھا
مکتبہ القریش سرکلر روڈ اردو بازار لاہور
فون 7668958

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"تمہارا ہاتھ زخمی ہے۔" میں نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "مجھے افسوس ہے۔"

"تم درندے ہو۔" وہ غرائی۔ "تمہیں ایک عورت پر ہاتھ اُٹھاتے ہوئے شرم آنا چاہیے تھی۔"

"میرے اظہارِ افسوس کا غلط مطلب نہ لو۔" میں نے اُس کی آنکھوں سے دل تک جھانکتے ہوئے کہا: "تمہارے زخمی ہاتھ کا افسوس مجھے اس لیے ہوا کہ تم زخمی ہاتھ سے کھانا تیار کرنے میں کافی دیر لگا دو گی۔"

وہ دانت پیس کر اور ہونٹ کاٹ کر رہ گئی۔

اُس نے زیرِ لب کچھ کہا بھی تھا لیکن میں اس وقت توہین محسوس کرنے کی بجائے پیٹ کے دوزخ میں ایندھن ڈالنے کی فکر میں مبتلا تھا۔

"جلدی..." میں نے ریوالور والا ہاتھ لہرایا۔

"لیکن میں اس حالت میں کچھ نہیں کر سکتی۔"

"میں صرف تین تک گنوں گا۔ ایک...!"

"نہیں... نہیں... نہیں۔" وہ ہسٹریائی انداز میں چیخ پڑی۔ "میں اس حالت میں..."

"دو..." میں نے غیر متحرک آنکھوں سے اُسے دیکھتے ہوئے کہا اور ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ کیوں کہ وہ تیر کی طرح میری طرف آئی تھی۔ وہ گاڑی سے کود گئی اور قریب ہی بنے ہوئے پتھروں کے چولہے کے قریب جا بیٹھی۔

"تم بھی نیچے آ جاؤ۔" میں نے ڈینی کو حکم دیا۔

وہ کانپتا ہوا نیچے آ گیا۔ میں نے چولہے کی طرف اشارہ کیا۔ وہ عورت کے قریب جا بیٹھا۔ اُس کی التجا آمیز آنکھیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ اُس کا چہرہ زرد تھا اور ہونٹ کانپ رہے تھے۔ میرے چہرے اور میری آنکھوں میں اُس کے لیے موت کا واضح پیغام موجود تھا... اُس نے یہ پیغام پڑھ لیا تھا اور اُسے یقین تھا کہ آئندہ چند لمحے اُس کے لیے جان لیوا ثابت ہوں گے۔

"تم دونوں کھانا تیار کرو۔ اس دوران میں گاڑی میں رہوں گا۔" میں نے سرسری سے انداز میں کہا اور عقبی دروازے سے جو نیم وا تھا گاڑی میں داخل ہو گیا۔ اندر پہنچتے ہی میں نے جا تو سے کینوس میں شگاف ڈالا اور وہاں سے باہر جھانکا۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل گئی۔

عورت نے آہستہ آہستہ میرے گھوڑے کی طرف کھسکنا شروع کر دیا تھا۔ میں نے ریوالور کی نال کینوس کے شگاف میں رکھی اور فائر کر دیا۔

گولی عورت کے پیروں سے قریب ہی لگی۔

گرد و غبار کا چھوٹا سا بادل بلند ہوا۔

عورت یوں چیخی تھی جیسے گولی اُس کے دل میں اُتر کر آخری دھڑکن تک چاٹ گئی ہو۔ وہ ذبح ہونے کی منتظر کسی بکری کی طرح خوف زدہ انداز میں گاڑی کے اُس حصے کی طرف دیکھنے لگی جہاں میں اور میرے ریوالور کی نال، شگاف میں سے اُسے نظر آ رہی تھی۔ اس دوران میں ڈینی کی طرف سے تغافل بے خبر نہیں رہا تھا۔ وہ اب بھی چولہے کے قریب بیٹھا تھا۔ اُس کی حالت عورت سے زیادہ خراب تھی... اور یہی وجہ ہوئی کہ اُس نے فرار ہونے کی ہمت نہیں کی۔

عورت چولہے کے قریب واپس آ گئی۔

...اور پھر اُس کے ہاتھ تیزی سے کام کرنے لگے۔

میں نے گاڑی میں رکھی ہوئی رائفل اُٹھائی اور اُسے اِس انداز میں شگاف سے کچھ نکال کر کھڑی کر دیا کہ ڈینی اور اُس کی ساتھی اُسے آسانی سے دیکھ سکتی تھی۔ رائفل کی نال دیکھنے کے بعد اُنہوں نے گاڑی کی طرف سے توجہ ہٹائی اور چولہے کی طرف متوجہ ہو گئے۔

میری نگاہوں نے گاڑی کے اندرونی حصے کا جائزہ لیا۔ کونے میں مجھے ایک چرمی تھیلا نظر آیا۔

میں دبے قدموں اُس تھیلے کی طرف بڑھا۔

تھیلا خاصا وزنی تھا۔ اُسے کھولا تو میری آنکھیں بھی کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ طلائی سکوں سے بھرا ہوا تھیلا تھا۔ یقیناً یہ وہی دولت تھی جس کی تلاش میں سارجنٹ فرینک اپنے ساتھیوں کے ساتھ مارا مارا گھوم رہا تھا... یہ برطانوی خزانہ تھا جسے لوٹا گیا تھا۔ تفصیل تو مجھے معلوم نہیں تھی لیکن میں اس سلسلے میں اُڑتی اُڑتی خبریں ضرور سن چکا تھا۔

میں نے گاڑی میں موجود کپڑوں کا ایک جوڑا اُٹھایا اور پھر تھیلے پر بھی قبضہ کر لیا۔ شگاف سے جھانک کر دیکھا تو اُن دونوں کو سرگوشیوں میں مصروف پایا۔ انداز سازشی تھا۔ اِس لیے مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ میرے ہی بارے میں باتیں کر رہے ہیں۔

میں گاڑی سے کود کر اُن کی طرف بڑھا۔

میرے ہاتھ میں چرمی تھیلا اور کپڑے دیکھ کر دونوں چونک پڑے۔ میں نے اُن سے کچھ فاصلے پر ایک پتھر دیکھا تو اُس پر بیٹھ گیا۔ فضا میں بھنے ہوئے گوشت کی مہک تھی۔

عورت نے گوشت کا ایک پارچہ کاٹا اور میری طرف آئی۔

میں نے اُس کے ہاتھ سے گوشت کی سلاخ لے لی اور اُسے اشارے سے واپس چولہے کی طرف جانے کے لیے کہا۔

اُس نے میری طرف ایسی نگاہوں سے دیکھا جیسے اُسے یقین نہ آ رہا ہو کہ میں اُس کو بے لباس دیکھنے کے باوجود نظر انداز بھی کر سکتا ہوں۔ میں خاموشی سے گوشت کو سلاخ سے اُدھیڑ اُدھیڑ کر کھانے لگا۔ بھوک کی زیادتی نے ویسے بھی مجھے دیوانہ کر رکھا تھا۔

یکایک اُس کی آنکھوں میں ایک بار پھر نفرت اُبھر آئی۔

اُس نے خود کو یوں نظر انداز کیے جانے پر شدید توہین محسوس کی تھی... میرا خیال ہے عورت کے لیے سب سے زیادہ توہین آمیز بات یہی ہے کہ کوئی مرد، اُسے نظر انداز کر دے۔

سلاخ پر خاصا گوشت تھا جسے میں چند ہی لمحوں میں ہڑپ کر گیا۔ میں اس دوران میں دونوں کی طرف کنکھیوں سے دیکھتا رہا تھا۔ وہ اب بھی آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے کچھ کہہ رہے تھے۔ میں ذہنی طور پر تیار ہو گیا۔ اب وہ کوئی بھی حرکت کرتے تو میں شکست میں اُن سے مات نہیں کھا سکتا تھا۔

چولہے پر ایک کیتلی رکھی ہوئی تھی جس میں سے اُڑتی ہوئی بھاپ سے قہوے کی مہک محسوس ہو رہی تھی۔ عورت نے چولہے کے قریب رکھی ہوئی ٹوکری سے ایک پیالہ نکالا اور اُس میں قہوہ انڈیلنے لگی۔ میں نے سلاخ سے آخری بوٹی نوچ کر سلاخ ایک طرف اُچھال دی اور منہ چلاتے ہوئے پانی کی بوتل کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"ڈینی..." میں نے بوتل منہ سے ہٹا کر رائفل کا رُخ بدلتے ہوئے کہا: "اب تم اس چرمی تھیلے میں موجود دولت اور سارجنٹ فرینک کے سلسلے میں بتانا شروع کر دو۔"

اُس کا چہرہ دُھلی ہوئی چادر کی طرح سفید نظر آنے لگا۔

عورت پیالے میں قہوہ انڈیل چکی تھی۔

وہ پیالہ لے کر میری طرف بڑھی۔

میں نے ایک ہاتھ اُس کی طرف بڑھایا۔

اُس کے ہونٹوں پر ایک بار پھر مسکراہٹ اُبھر آئی تھی...

میں حیران تھا کہ وہ اپنے زخمی ہاتھ کی تکلیف کا اظہار کیوں نہیں کر رہی ہے؟ وہ میرے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

ایک لمحے کے لیے ڈینی میری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

اُس ایک لمحے میں نہ صرف عورت کا بے لباس جسم ہمارے درمیان حائل ہو گیا تھا... بلکہ ایک اور حادثہ بھی ہو گیا۔ ایک ایسی حرکت جس کی میں توقع بھی نہیں کر سکتا تھا۔

پیالہ میرے ہاتھ میں دینے کی بجائے اُس نے پوری قوت سے اُچھال دیا تھا۔ گرم گرم قہوے کی لہر سی پیالے سے میری طرف آئی اور میں نے خود کو دوسری طرف گرا لیا۔ اگر مجھ سے ایک لمحے کی بھی سستی کا مظاہرہ ہو جاتا تو کھولتا ہوا قہوہ میرے چہرے کو جھلسا کر رکھ دیتا اور شاید میری آنکھیں بھی جھلس جاتیں۔

گرتے ہی میرا ہاتھ بائیں طرف کمر سے بندھے ہوئے شکاری چاقو کے دستے پر پڑا تھا کیونکہ رائفل دائیں طرف تھی اور میں جھونک میں اُس کے اوپر ہی گرا تھا۔ عورت نے پیالہ اُچھالنے کے بعد مجھ پر چھلانگ لگائی تھی... اور میں نے اُس کی پشت سے ڈینی کو کسی طوفانی لہر کی طرح بلند ہوتے دیکھا تھا۔

میرا چاقو والا بایاں ہاتھ ذرا سا بلند ہوا اور پھر عورت کے سینے سے گزرتا ہوا میرے ہاتھ سے نکل گیا۔

میں نے چاقو ہاتھ سے اُچھالتے ہی ہاتھ کو واپس پیچھے کی طرف تیزی سے جھٹکایا، اور عورت کی گردن پر چوٹ لگائی۔ وہ منہ کے بل گر گئی۔ جب کہ میں ایک آخری کروٹ لے کر رائفل سنبھالتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔

چند لمحوں پر محیط یہ جدوجہد ختم ہو گئی۔

زندگی چھین لینے کی خواہش کرنے والے موت سے شکست کھا گئے تھے۔ میرے ہاتھ سے نکلا ہوا شکاری چاقو، ڈینی کے نرخرے میں پیوست ہوا تھا اور اُس کا پھل دوسری طرف نکل گیا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے کھڑا مجھے گھورنے لگا۔

...لیکن اس کی آنکھیں بے جان ہو چکی تھیں۔

خون، اُس کے نرخرے سے سینے تک پہنچ رہا تھا۔

...پھر وہ اپنے پیروں پر کھڑا نہ رہ سکا۔

وہ گر گیا۔ جان تو اس کی اسی وقت، حالت میں نکل گئی تھی اس لیے گرتے وقت اور گرنے کے بعد اُس کے جسم میں ذرا سی بھی تڑپ باقی نہیں تھی۔

عورت کی کنپٹی پر چوٹ آئی تھی۔

وہ اوندھے منہ پڑی رہی۔

اس کا جسم بھی بے حس و حرکت تھا۔

یہ اندازہ نہ ہو سکا کہ وہ زندہ ہے یا مر چکی ہے۔ میں نے بالوں سے پکڑ کر اُسے اُٹھایا اور اُس کا چہرہ دیکھا جو اب دہشت سے اپنے نقش و نگار کا حسن اور جاذبیت کھو چکا تھا۔

وہ کسی خوف زدہ ہرنی کی طرح میری طرف دیکھنے لگی۔

اچانک اُس نے چولہے کی طرف جست لگائی۔
اُس کے بال میرے ہاتھ سے نکل گئے۔
میں نے عقب سے اُس کی کمر پر ٹھوکر ماری۔ وہ بلبلا اُٹھی اُس کے گھٹنے خمیدہ ہو گئے... پھر وہ توازن برقرار نہ رکھ سکی... اور منہ کے بل گری تو اُس کی دلدوز چیخ سے ویرانے کا ذرہ، ذرہ تپ اُٹھا۔

اس کا چہرہ سلگتی ہوئی لکڑیوں اور کوئلوں میں گرا تھا۔ دونوں ہاتھوں سے چہرے کو چھپائے وہ اُٹھی تو اُس کے بالوں کو آگ پکڑ چکی تھی۔ ایک لمحے کے لیے مجھے یوں لگا جیسے کسی مرگھٹ سے جلتی ہوئی کوئی بیوہ بھاگ نکلی ہو... وہ دیوانہ وار چیختی ہوئی اِدھر اُدھر دوڑتی رہی۔

اچانک ایک جگہ وہ رُک گئی۔
اُس نے آسمان کی طرف منہ اُٹھایا، دونوں ہاتھ پہلوؤں میں گرائے اور پھر میری طرف دیکھنے لگی۔ اس کا بھیانک چہرہ دیکھ کر مجھے جھرجھری سی آ گئی۔ اُس کے رخساروں کی سیاہی سے سفید سفید خون آلود چربی جھلک رہی تھی اور آنکھیں بھی لہو میں ڈوبی ہوئی لگتی تھیں وہ میری طرف دیکھ رہی تھی اور اسی حالت میں زمین پر جھکتی جا رہی تھی... پھر وہ گر گئی۔ گناہ کا پیکر خاک نشین ہو گیا... بے حیائی کا بت ٹوٹ گیا۔ میں نے اُس کے جسم سے نگاہ ہٹالی۔ اپنے بھیانک چہرے کے باوجود جسمی اعتبار سے وہ اب بھی توبہ شکن نظر آ رہی تھی۔

میں نے ڈینی کی طرف دیکھا۔
اُس کی لاش، خون اور مٹی میں لتھڑی ہوئی تھی۔ میں نے ٹھوکر مار کر اُسے سیدھا کیا اور پھر اُس کے نرخرے سے شکاری چاقو کھینچ نکالا۔ میں چرمی تھیلا سنبھالے واپس گاڑی کی طرف آیا اور اس بار میں نے قدرے اطمینان اور سکون سے اُس کی تلاشی لی لیکن کوئی کار آمد چیز نہ ملی۔

گھوڑے پر چرمی تھیلا باندھنے کے بعد میں اُس پر سوار ہو گیا اور تیزی سے آگے بڑھنے لگا۔ ڈینی میری پوزیشن کا حقدار تھا۔ ہم دونوں نے شروع ہی سے ایک دوسرے کو کبھی پسند نہیں کیا تھا۔ اُسے اپنے ہاتھوں موت کے گھاٹ اُتار کر مجھے سکون اور بے سکونی کی ملی جلی کیفیت کا احساس ہو رہا تھا۔ اگر وہ زندہ رہتا تو بہت سی باتیں مجھے آسانی سے معلوم ہو جاتیں... لیکن خیر، وقت کے ساتھ ساتھ سبھی کچھ خود بخود سامنے آ جاتا ہے۔
میرے گھوڑے کی ٹاپوں سے چٹانیں گونج رہی تھیں۔

میں تیزی سے مسلسل آگے بڑھ رہا تھا۔
دھوپ میں خاصی تیزی آتی جا رہی تھی اور میں جانتا تھا کہ ایک دو گھنٹے بعد گھوڑے کی پشت پر بیٹھنا دشوار ہو جائے گا۔ میں چاہتا تھا کہ اس سے پہلے پہلے کسی ایسی جگہ پہنچ جاؤں جہاں شام کے سائے ڈھلنے تک سورج کی جھلسا دینے والی کرنوں سے روپوش رہا جا سکے۔

میرا ذہن ایک عجیب سے نشے میں ڈوبا ہوا تھا۔
درحقیقت میں ناقابلِ فہم ہیجان سا محسوس کر رہا تھا اور اس ہیجانی کیفیت نے میرے جسم میں دوڑتے ہوئے لاوے کی تپش کم کر دی تھی۔
گھوڑا بری طرح ہانپ رہا تھا۔
میں سوچ رہا تھا کہ اب اُسے مزید دوڑانا خطرناک ہوگا۔ وہ گزشتہ تین روز سے مسلسل دوڑ رہا تھا اور اسے اس دوران میں بہت کم آرام اور غذا ملی تھی... لیکن وہ میرا جاں نثار ساتھی تھا چاہے کتنی ہی شکستہ حالت میں کیوں نہ ہو میرے ایک ہی اشارے پر ہوا ہو جانا اس کی عادت ہے۔
سورج کی آگ سے محفوظ رہنے کے لیے میں نے ایک غار دیکھا تو رُک گیا۔ یہ غار عام راستے سے ہٹ کر تھا... پھر وہاں ہریالی بھی تھی گھوڑا آرام کرنے کے ساتھ ساتھ اطمینان سے چر بھی سکتا تھا۔ ایک اُتھلی سی ندی بھی تھی جس سے پتا چلتا تھا کہ قریب ہی کوئی چشمہ بھی ہے۔
میں نے گھوڑے کو ندی سے پانی پلایا اور پھر اسے کھول کر چرنے کے لیے چھوڑ دیا۔ خود منہ ہاتھ دھو کر میں نے سوکھی گھاس جمع کی اور غار میں نرم نرم تنکوں کا بستر بنا کر لیٹ گیا۔
تھکن سے میرا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔
ایسا ہی تھا کہ نیند ذہن پر حاوی ہو گئی۔
نہ جانے کب تک بے خبر پڑا سوتا رہا۔
جب میں غار سے باہر آیا تو دیکھا کہ آسمان پر بادل چھائے تھے

دو جلدیں
ایم اے راحت
قیمت: ۲۰۰/- روپے
تاریک وادی

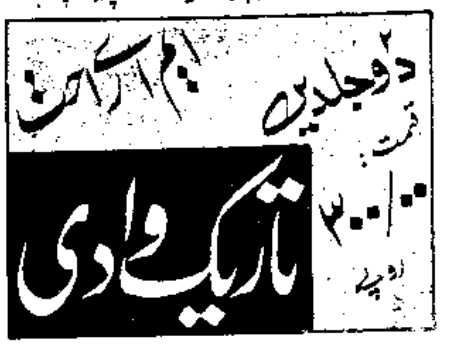

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور فضا میں نمی تھی۔ شام ہو رہی تھی اور بادلوں کی وجہ سے قبل از وقت ہی اندھیرا پھیل رہا تھا۔
گھوڑا کہیں قریب ہی تھا۔ سیٹی کی آواز پر دوڑتا ہوا میرے قریب آ گیا۔ کچھ دیر بعد میں سفر پر روانہ ہو گیا لیکن نیم تاریکی میں اصل راستے سے ہٹ گیا۔
میں دیر تک پہاڑی راستوں کی بھول بھلیوں میں کھویا رہا۔ میں پریشانی میں گھومتے گھومتے... نہ جانے کہاں نکل آیا۔ دفعتاً گھوڑا زور سے ہنہنایا اور رُک گیا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر بت سا بن کر رہ گیا۔
وہ ایک لڑکی تھی۔
تنہا... اُداس... اور خیالوں میں کھوئی ہوئی۔
وہ ایک چٹان پر بیٹھی دور افق کو گھور رہی تھی۔ اس کی مخروطی انگلیوں میں ایک سگریٹ سلگ رہی تھی۔ میں مبہوت سا اُس کے حسین جلوے میں کھو سا گیا۔
لڑکی اس قدر حسین اور پرکشش تھی کہ میں چند لمحوں کے لیے اس لڑکی کے علاوہ سبھی کچھ بھول گیا۔ میرے دل میں بے ساختہ یہ خواہش پیدا ہوئی کہ اس حسینہ کو اپنے دل کی دنیا میں اُتار لوں۔
بے اختیار میرے قدم اس لڑکی کی طرف بڑھنے لگے۔
میں نے گھوڑا وہیں چھوڑ دیا تھا اور یوں لڑکی کی طرف بڑھ رہا تھا جیسے اس کی کشش مجھے کھینچ رہی ہو۔ میرے قدموں کی آہٹ وہ لڑکی سن چکی تھی۔ گھوڑا زور سے ہنہنایا تھا۔ اس کی آواز بھی یقیناً اُس نے سنی ہوگی... لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ اس کے اطمینان میں کوئی فرق نہیں آیا۔
مجھے اپنے بارے میں کوئی خوش فہمی نہیں تھی لیکن میں نے محسوس کیا کہ لڑکی میری مردانہ وجاہت سے بے حد متاثر ہے۔ ایک دو لمحوں تک تو وہ بھی یوں ساکت نظر آئی جیسے میری کشش نے اُسے مسحور کر دیا ہو۔ میں بھی اسی حالت کا شکار تھا۔ ہم دونوں ہی ایک دوسرے کی طرف کھنچ گئے تھے۔
وہ کچھ دیر تو میری آنکھوں میں جھانکتی رہی... پھر اس کی نگاہیں حجاب سے بوجھل پلکوں کی وجہ سے جھک گئیں۔ اس کے رخساروں پر شفق کی لالی پھیل گئی تھی اور اس کے پنکھڑیوں جیسے ہونٹ کانپنے لگے تھے
میں آہستہ آہستہ اس کے قریب جا کر کھڑا ہوا۔
مجھے حیرت تھی کہ میں اس لڑکی سے کیسے گفتگو شروع کروں۔ اس نے بڑی ادا سے ہاتھ اٹھایا اور انگلیوں میں سلگتی ہوئی سگریٹ کا کش لگانے لگی۔ میں نے فوراً ہی سگریٹ طلب کرنے کو بطور تعارفی جملہ بنا لیا۔

"کیا تم مجھے بھی ایک سگریٹ دے سکتی ہو؟" میں نے اپنے قبائلی لہجے میں مٹھاس پیدا کرنے کی بہت کوشش کی تھی لیکن مجھے احساس ہوا کہ میں ایسا کرنے میں ناکام ہو گیا ہوں۔
لڑکی نے مسکراتی ہوئی آنکھوں سے میری آنکھوں میں دیکھا... پھر اس نے جس انداز میں سلگتی ہوئی سگریٹ میری طرف بڑھا دی تھی اس میں لڑکی کے ارادے کو ہرگز کوئی دخل نہیں تھا۔ میں اس کے قریب ہی چٹان پر بیٹھ گیا۔
ایک بات سے مجھے خوشی ہو رہی تھی کہ لڑکی کو مجھ سے اجنبیت کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے اس کی انگلیوں سے حاصل کی ہوئی سگریٹ کا کش لگایا۔ سگریٹ کے گوشے پر اس کے ہونٹوں کی لالی کا احساس میرے جسم میں پہلے بوسے کی لذت بن کر دوڑ گیا۔
وہ مجھ سے اتنی قریب بیٹھی تھی کہ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔ ذرا بھی تو نہیں کسمسا رہی تھی۔ خود مجھے بھی اجنبیت کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ہمارے جوان جسموں کو ایک دوسرے کی شدت سے طلب رہی ہو... یا پھر شاید ماحول اور موسم نے ہمیں ایسا محسوس کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ہم ایک دوسرے سے یوں مل کر بیٹھے تھے کہ ہمارے درمیان ذرا سا بھی فاصلہ نہیں تھا۔
میں نے موسم کی بات شروع کی۔
وہ بھی جلدی مجھ سے گھل مل گئی۔
تھوڑی ہی دیر میں ہم یوں باتیں کر رہے تھے جیسے برسوں سے ایک دوسرے کے شناسا ہوں... اور پھر جب موسم بھیگی بوندوں کی شکل میں ہمارے رخساروں پر اُتر آیا تو میرے ہونٹ لڑکی کے ہونٹوں سے زیادہ دور نہیں تھے۔ اس کے ہونٹوں پر پیاس کی کپکپاہٹ تھی اور وہ سیراب ہونے کے لیے نیم وا ہو گئے تھے جب میں اس کے چہرے پر مزید جھک گیا تو وہ خاموشی اور رضامندی سے یوں میری بانہوں میں آ گری جیسے شاخ پر لگی لگی پک کر میری ہی آغوش میں گرنے کی منتظر ہو۔
میں نے محسوس کیا کہ اس کا جسم بے پناہ کمزوری اور نقاہت کا شکار ہو گیا ہے جیسے وہ کئی روز سے خون بہا رہی ہو اور اس کا جسم نڈھال ہو۔ اسے یقیناً اپنے بارے میں سوچنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ کسی نوجوان لڑکی کو کسی جوان مرد کی بانہوں میں گرنے کے بعد یوں بھی سوچنے سمجھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔
یکایک بارش ہونے لگی۔
میں نے ایک ہاتھ سے اُسے اُٹھایا۔
جن راستوں سے میں آیا تھا وہ مجھے یاد تھے انہی راستوں پر گھوڑا

دوبارہ چلنے لگا وہ گھوڑے پر میرے ساتھ بیٹھی بے حد مطمئن تھی اور مجھے خواب کی سی کیفیت کا احساس ہو رہا تھا۔ راستے میں کسی جگہ گھوڑا پھسلا اور ہر بار میں نے مضبوط بانہوں میں لڑکی کو سنبھال لیا حتیٰ کہ ہم اس غار تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے جہاں میں نے کافی دیر پہلے نرم نرم تنکوں کا بستر بنایا تھا اور اس پر گہری نیند کے مزے لوٹے تھے۔

سردی شباب پر تھی اور بارش سے ہم دونوں بُری طرح بھیگ گئے تھے لیکن ہمارے جسموں میں جوان خون دوڑ رہا تھا ایسا خون جو قطب شمالی کی ساری برف سے بھی ٹھنڈا نہیں ہو سکتا تھا۔

ہمیں ایک دوسرے سے قریب ہوئے نصف گھنٹے سے زیادہ وقت گزر چکا تھا لیکن ابھی لڑکی میرے نام سے واقف تھی اور نہ ہی میں نے اس سے نام پوچھا تھا۔ ہم تو یوں ایک دوسرے سے مل بیٹھے تھے جیسے ازل سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔

بھیگے ہوئے جسم کانپ رہے تھے اور ہم دونوں ایک دوسرے سے لپٹ کر اس نرم نرم سوکھی گھاس پر لیٹ گئے تھے۔

لڑکی کی انگلیاں میرے بالوں میں اُلجھ گئیں اور وہ میرے بالوں کو آہستہ آہستہ سنوارنے لگیں۔ ان دُبلی پتلی انگلیوں میں نہ جانے کیا جادو تھا کہ میری آنکھیں خود بخود بند ہونے لگیں۔ لڑکی نے بھی سختی سے اپنی آنکھوں کو بند کر لیا تھا۔

... اور پھر ہم کیف و سرور میں ڈوب گیا۔

بارش تھم چکی تھی لیکن لڑکی کی آنکھوں سے موتی برسنے لگے تھے۔ میں نے ان موتیوں کو اپنے ہونٹوں میں سمو لیا۔ ان آنسوؤں کی قدر و قیمت کا مجھے خوب اندازہ تھا۔ ان آنسوؤں میں ایک ایسی داستان تھی جسے اس لڑکی نے میرے شفاف دل پر آنسوؤں کی نظر نہ آنے والی روشنائی سے لکھ دیا تھا۔

"میرا نام شاہ نیاز خان ہے۔" تاریکی میں محبت سے سرشار میری آواز لڑکی کی سماعت سے ٹکرائی۔

"تم میرے سرتاج ہو!" لڑکی نے جواب دیا۔

یہ دو جملے ایجاب و قبول کا درجہ رکھتے تھے۔ سات سمندر پار کا ایک نقرئی جسم میرے نام منسوب ہو گیا تھا اور میں نے دل کی گہرائیوں سے اٹھنے والے جذبات میں اس لڑکی کو سمو لیا تھا۔

"میرا نام نوگی ہے۔" کچھ دیر بعد لڑکی نے کہا۔

"تم یہاں ویرانے میں تنہا کیا کر رہی تھیں؟"

"شاید تمہارا ہی انتظار..."

"مجھے اپنے بارے میں بتاؤ جان۔ سب کچھ بتاؤ۔ تمہیں ملنے کے بعد میں یوں محسوس کر رہا ہوں جیسے میری تکمیل ہو گئی ہو جب کسی کی یوں تکمیل ہو جاتی ہے تو اس کی زندگی کے دن گنے جا چکے ہوتے ہیں۔" میں نے جذبات سے مغلوب لہجے میں کہا۔

"میں کرنل اسٹیفن کی سوتیلی بیٹی ہوں۔" نوگی نے کہا... اور نوگی نے ایک ایسی داستان کا آغاز کیا... جس نے میری زندگی کا رُخ ہی بدل دیا۔

نوگی کی ماں ایک ریڈ انڈین عورت تھی۔ برطانیہ کا ایک نہلات، ولیم، دُنیا کی سیاحت کے لیے نکلا تو امریکا پہنچنے کے بعد اتفاق سے ان جنگلوں میں جا پہنچا، جہاں ریڈ انڈین قبائل بسے ہوئے تھے۔

جڑی بوٹیوں سے دیوانگی کی حد تک دلچسپی اُسے ان قبائل میں سے ایک قبیلے کے اس قدر قریب لے گئی کہ وہاں سے اس کی واپسی کا خیال بھی متمدن دُنیا کا کوئی شخص نہیں کر سکتا تھا۔

اسے نرغے میں لے لیا گیا۔

اس سے پہلے کہ وہ جنون ہتھیار، اس کے جسم کی بوٹی بوٹی کر دیتے، زمین کے اس سیارے پر ایک عجیب و غریب رومان کا آغاز ہو گیا۔ ریڈ انڈین سردار کی دو بیٹیاں بھی اس وقت حملہ آوروں کے ساتھ تھیں۔ ان میں سے بڑی لڑکی، ہُشکی نے نگاہ بھر کر ولیم کی طرف دیکھا اور اپنے باپ کے کان پر جھک گئی۔

سردار چند لمحوں تک سخت نگاہوں سے ہُشکی کو گھورتا رہا لیکن بالآخر اس کے تیور ڈھیلے پڑ گئے۔ اس نے اپنے آدمیوں کو ہاتھ روک لینے کا حکم دیا اور ولیم کے قریب آ گیا۔

ولیم حیرت اور خوف کا مجسمہ بنا کھڑا تھا۔

"تم یہاں سونے کی تلاش میں آئے ہو؟" سردار نے پوچھا۔ "اس سرزمین کی دولت چوری کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟"

"محترم بزرگ!" ولیم نے دہشت میں ڈوبے ہوئے احترام

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے کہا: "میں اس دھات کے لیے نہیں، بلکہ ایسی جڑی بوٹیوں کی تلاش میں مارا مارا پھرنے والا ایک دیوانہ ہوں، جن سے انسانیت کی خدمت کی جا سکتی ہے۔"

"لیکن یہاں قدم رکھنے کے بعد موت تمہارا مقدر ہو چکی ہے۔"

ولیم اس بات کا بھلا کیا جواب دیتا۔ بس حیرت اور خوف سے پھٹی پھٹی آنکھوں سے سردار کو گھورتا رہ گیا۔

"کیا تم یہ فرض کر کے زندہ رہنا چاہتے ہو کہ تمہاری موت واقع ہو چکی ہے؟" ہُشکی نے مداخلت کی۔

نرم و لطیف آواز، موسیقی کے کسی مسحور کن سُر کی طرح ولیم کی رُوح تک اُتر گئی۔ وہ خطرے اور خوف کو بھول کر اس لڑکی کے حُسن میں ایسا کھویا کہ لڑکی کا چہرہ فطری حیا سے لالۂ صحرائی بن گیا اور اس کی سُرمگیں پلکیں جھک گئیں۔

"ہاں... میں مر چکا ہوں۔" ولیم نے ایک طویل سانس لے کر دھیمی آواز میں کہا۔ یہ جملہ غیر ارادی طور پر اس کی زبان سے نکلا تھا لیکن اس جملے میں اس کی زندگی چھپی ہوئی تھی۔

اسے زندہ رکھا گیا... اور پھر وہ ریڈ انڈین قبیلے میں زندہ درگور ہو گیا۔ ہُشکی کی ذات، اس کی مددگار نہ ہوتی تو شاید وہ اس غیر متمدن مقام پر ایک سانس بھی نہ لے سکتا اور دم گھٹ جانے کی وجہ سے ہلاک ہو جاتا۔

ہُشکی اپنی تمام تر جلوہ آفرینیوں کے ساتھ، اس کی زندگی میں اُتر آئی اور دو سال میں ولیم بھی اس گھٹن کا عادی ہو گیا جو اُسے ریڈ انڈین وحشیوں سے محسوس ہوتی تھی۔

... لیکن اس دوران میں ہُشکی کو اس دُنیا کی سیر کرنے کا جنون لاحق ہو گیا جس کے بارے میں وہ، ولیم سے بہت کچھ سُن چکی تھی... ریڈ انڈین قبیلے نے بہت مخالفت کی لیکن ایک رات ہُشکی اپنی ایک سالہ بچی نوگی اور شوہر کو لے کر وہاں سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئی۔

برطانیہ پہنچ کر اس نے مثالی بیوی بن کر زندگی کو از سرِ نو... شروع کیا لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ متمدن بھیڑیے کس قدر عیّار ہوتے ہیں۔

ولیم ایک حادثے میں ہلاک ہو گیا۔

ہُشکی کے لیے دُنیا اندھیر ہو گئی۔ اس وقت نوگی کی عمر صرف دو سال تھی۔ ولیم کے بھائی اسٹیفن نے ہُشکی کا ہاتھ تھام لیا اور وہ بے سہارا عورت، اس کی آغوش میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئی۔

اسٹیفن ایک اوباش نوجوان تھا۔

شادی سے چند ہی روز بعد ہُشکی کو احساس ہو گیا کہ ولیم اور اسٹیفن میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ولیم فرشتہ تھا تو اسٹیفن شیطان تھا۔ نہ جانے اس کی فطرت میں کہاں سے اتنی درندگی آ گئی تھی کہ وہ ہُشکی پر طرح طرح کے ظلم ڈھانے لگا۔

یہ اس کے مجرم ضمیر کا کیا دھرا تھا کہ ایک شب، نشے میں دُھت اس اوباش نوجوان نے ہُشکی کو بتا دیا کہ ولیم درحقیقت کسی حادثے کا شکار نہیں ہوا بلکہ اُسے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت قتل کیا گیا تھا۔

... اور ولیم کا قاتل خود اس کا بھائی اسٹیفن ہی تھا۔

ہُشکی غم سے نڈھال بستر سے لگ گئی۔ حتیٰ کہ وہ چار سال تک ایڑیاں رگڑتی رہی اور پھر اپنے محبوب سے جا ملی جو آسمانوں میں بیٹھا، اس کا انتظار کر رہا تھا۔

ماں مر گئی لیکن وہ جاتے جاتے اپنی بیٹی کو اپنے... اور اپنے محبوب کے قاتل کے بارے میں سب کچھ بتا گئی۔ اس نے کمسن نوگی سے وعدہ لیا کہ اس درندے کو کیفرِ کردار تک ضرور پہنچائے گی۔

... پھر اچانک ہی اسٹیفن، فوج میں بھرتی ہو گیا۔

فوجی زندگی نے اس کے دل و دماغ پر خوشگوار اثر کیا اور وہ رفتہ رفتہ اس حالت کو پہنچ گیا جہاں انسان اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کر کے دل کو سکون پہنچا سکتا ہے۔

... لیکن اس مرحلے سے کچھ پہلے ہی نوگی نے ایک روز جذبات سے بے قابو ہو کر اس پر حملہ کر دیا۔ اسٹیفن ایک بار پھر درندہ بن گیا۔ اس نے نوگی پر ستم ڈھانے شروع کر دیے۔

قسمت ان دونوں کو ہندوستان لے آئی۔ اس وقت تک اسٹیفن ترقی کرتے کرتے کرنل کے عہدے کو پہنچ چکا تھا۔ وہ یہاں آیا تو نوگی کو اپنے ساتھ ہی لایا تھا۔

برطانوی حکومت ان دنوں آزاد قبائلی علاقے سے بے حد نالاں تھی۔ لیکن یہ علاقہ اس قدر دشوار گزار تھا کہ حکومت بے بسی کا شکار ہو گئی تھی۔ کرنل اسٹیفن نے ہر ممکن کوشش کی لیکن وہ گنتی کے چند پٹھانوں سے زیادہ کی حمایت حاصل نہ کر سکا...

اور پھر رفتہ رفتہ بے غیرت اور غدار لوگ اس سے ملتے چلے گئے۔

اس کی فطرت میں ظلم و ستم کُوٹ کُوٹ کر بھرا ہوا تھا۔

وہ نت نئے انداز میں پٹھان قبائل کو پریشان کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور اُسے پے در پے ہر معاملے میں شکست ہو رہی تھی۔ وہ ہر شکست کے بعد اپنے کمرے میں بند ہو جاتا اور بے تحاشا شراب پیتا... پھر وہ نشے میں دُھت ہو کر نوگی کے کمرے کا رُخ کرتا اور اس کے ہاتھ نوگی کے جسم پر ظلم و ستم کی نئی داستانیں تحریر کرنے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں مصروف ہو جاتے۔

نوگی کو صرف اپنی ماں اور اپنے باپ کی موت کا انتقام لینا تھا۔ یہ بات ہر وقت اُس کے دل و دماغ میں گھومتی رہتی تھی اُسے کسی ایسے موقعے کا انتظار تھا، جب وہ بھرپور انداز میں انتقامی کارروائی کرسکے۔ ایک بار نا کام ہو جانے کے بعد وہ کوئی ناپختہ اور ادھورا قدم نہیں اُٹھانا چاہتی تھی۔

وقت گزرتا جا رہا تھا اور گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ ساتھ اُس کے انتقامی جذبے میں بھی شدت آتی جا رہی تھی... لیکن وہ جس ماحول میں زندگی کے دن پورے کر رہی تھی وہ بے حد گھٹا گھٹا سا تھا اور ہر لمحے اُسے یہ گھٹن بڑھتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔

کبھی کبھی اس گھٹن میں اتنی شدت آجاتی کہ وہ کرنل اسٹیفن کی بجائے خود اپنی ہی زندگی کو ختم کرنے کا منصوبہ بنانے لگی تھی۔

آج سرِ شام ہی وہ اس بے پناہ گھٹن سے گھبرا کر گھر سے نکل آئی تھی اور اُس نے اُن ویران چٹانوں کا رُخ کیا تھا۔

وہ اس چٹان پر بیٹھی سگریٹ پھونکتی رہی اور سوچتی رہی کہ اُسے اس زندگی کا خاتمہ کر کے اُس جہان میں پہنچ جانا چاہیے جہاں اُس کے والدین کی رُوحیں بے چینی سے اُس کی انتظار کر رہی تھیں۔ جو سگریٹ اُس کے ہاتھ میں سُلگ رہی تھی اُس کے راکھ ہوتے ہی اُسے چٹان سے کود کر اپنی زندگی کو ختم کر لینا تھا... لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

اُس نے مجھے بتایا کہ جب اُس کی نگاہ مجھ پر پڑی تھی تو اُسے یکایک یوں محسوس ہوا تھا جیسے قسمت کا ستارہ کائنات کی بیکراں وسعتوں میں بھٹکتا ہوا بالآخر اُس کی آغوش میں آ گرا ہو۔ اگرچہ میرے ساتھ اُس نے بہت کم وقت گزارا تھا لیکن وہ یوں ظاہر کر رہی تھی جیسے ہمیشہ سے میری بانہوں کے حصار میں مقید رہی ہو۔

میں بھی ایک ٹوٹا ہوا ستارہ تھا۔ میں جس جگہ گرا وہاں مجھے اتنی آب و تاب حاصل ہو گئی کہ میری زندگی کا رُخ ہی بدل گیا میرا دل کہہ رہا تھا کہ مجھے جس چیز کی ضرورت تھی، وہ مجھ کو نوگی ہی سے حاصل ہو سکتی ہے... اور میں اس محبت کو حاصل کرنے میں کامیاب بھی ہو گیا تھا۔

نوگی کی داستان سُن کر میرے جوان خُون نے کھولنا شروع کر دیا۔ انگریزوں سے میری نفرت نے اس جذبۂ انتقام کو مزید ہوا دی تھی۔ میں نے نوگی کا نرم و نازک ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھ میں لے کر بھینچ لیا۔

"کرنل اسٹیفن کے زندگی کے اتنے ہی دن باقی ہیں جتنے قدم کے فاصلے پر وہ یہاں سے دُور ہے۔" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"سچ... کیا تم ایسا کر سکتے ہو؟" نوگی نے مضبوط سہارا ملتے ہی کسی کمزور سی بیل کی طرح مجھ سے لپٹتے ہوئے کہا۔ "پھر میں اطمینان سے مر سکوں گی۔"

"تم زندہ رہو گی، جان!" میں نے ایک عزم سے کہا۔ "ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے زندہ رہیں گے۔"

نوگی نے میرے سینے میں منہ چھپا لیا۔

باہر بارش میں تیزی آگئی تھی۔ آندھی کے جھکڑ چٹانوں سے سر ٹکرا رہے تھے اور بجلی کڑک کڑک کر ماحول کو کانپ جانے پر مجبور کر رہی تھی۔ میرا ہاتھ اپنی رائفل کی طرف اُٹھ گیا۔

رائفل کو مضبوطی سے تھام کر میں نے اپنے فلک بوس... نوگی کا چہرہ اُٹھایا اور اُس کے ہونٹوں پر محبت کی ایک اور مہر ثبت کرتے ہوئے کہا۔ "میں جا رہا ہوں، جان۔"

جاسوسی ڈائجسٹ کے مقبول سلسلے
ناگ
اقلیم علیم
PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk
مکتبہ القریش سرکلر روڈ اردو بازار لاہور
فون 7668958

"میں بھی تمھارے ساتھ جاؤں گی۔"

"نہیں۔ تم یہیں انتظار کرو۔"

"میں اس درندے کا انجام اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتی ہوں۔" نوگی نے بے ترتیب سانسوں سے ہانپتے ہوئے کہا۔ "میں اُس کی تڑپتی ہوئی لاش کو دیکھ کر انتقام کے اُن جذبوں کو پُرسکون بنانا چاہتی ہوں، جو ماں کی تڑپ اور تکلیفیں دیکھ دیکھ کر میرے دل میں پیدا ہوئے تھے اور میں اُن جذبوں کی آگ سینے میں چھپائے اب تک زندہ ہوں۔ یہ آگ اُسے بے بس، نڈھال، اور دم توڑتے دیکھ کر بُجھ جائے گی۔"

"میں تمھیں کسی خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا۔"

"اگر ایسا ہے تو میں تمھیں کسی خطرے میں کیسے ڈال سکتی ہوں۔ ہم نے ایک ساتھ جینے اور ایک ساتھ مرنے کا عہد کیا ہے، جان۔ کیا تم اتنی جلدی بھول گئے؟"

"لیکن تمھارا میرے ساتھ جانا...؟"

"میں سب کچھ سنبھال لوں گی۔" نوگی نے مجھے سمجھایا۔ "اگر وہ قتل ہو گیا اور میں گھر سے غائب پائی گئی تو بہت بُرا ہوگا۔"

"تم مجھے اندیشوں میں مبتلا کر رہی ہو۔" میں نے کہا۔

"سمجھنے کی کوشش کرو، جان۔ میں چاہتی ہوں کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔"

"تم مجھ پر اعتماد کر سکتی ہو؟"

"میں نے تو اپنی ساری سانسیں تمھارے لیے وقف کر دی ہیں۔" نوگی نے جذباتی لہجے میں کہا۔ "دراصل میں یہ چاہتی ہوں کہ کرنل کی موت کے بعد ہم دونوں امریکا چلے جائیں۔"

"یہ کیسے ممکن ہے؟" میں نے چونک کر کہا اور میری آنکھوں میں پانوش کی لاش گھوم گئی۔ میرے ذہن میں اَن گنت گھوڑے دوڑنے لگے۔ وہ گھوڑے جن پر سارجنٹ فرینک اور اس کے ساتھی بیٹھے ہوئے تھے۔ اُس نے میرا ہاتھ تھام لیا تو اُس کے ہاتھ کے لمس نے مجھے ماضی کی دھند سے حال میں کھینچ لیا۔

"تم جانتے ہو کہ میں اس سلسلے میں بچپن ہی سے کام کر رہی ہوں۔ یہ الگ بات ہے کہ مجھے اس سے نکلنے کا کبھی موقع نہیں مل سکا۔ یہاں کرنل کا ایک کزن بھی موجود ہے۔ اس کے علاوہ اسٹیفن کا کوئی بھی رشتے دار اس دُنیا میں نہیں ہے اور کرنل کو اپنے اس کزن سے بے حد محبت ہے۔ جیسے ہی اُسے اطلاع ملے گی وہ فوراً میرے پاس پہنچ جائے گا... اور اس طرح مجھے برطانیہ اور پھر وہاں سے امریکا جانے کا آسانی سے موقع مل جائے گا۔ میری ماں کی ایک ہمدرد وہاں موجود ہے۔ وہ ہمیں برطانیہ سے امریکا جانے میں مدد دے سکتی ہے۔"

"مگر یا کرنل کا کزن تمھیں ساتھ لے جائے گا؟" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "اور میرا کیا ہوگا؟"

"تم میرے ساتھ جاؤ گے۔"

"وہ کیسے؟" میں نے حیرت سے کہا۔

نوگی کے ہونٹوں پر بکھرنے والی مسکراہٹ بے حد پُراسرار تھی۔ چند لمحوں تک وہ میری آنکھوں میں دیکھتی رہی۔ پھر اُس نے دھیمی آواز میں سمجھاتے ہوئے کہا۔

"تم اسے ایک غیبی امداد کہہ سکتے ہو۔ کرنل کے کزن فرینک کی شکل و صورت اور قد و قامت، تم سے ہُو بہُو بھی مختلف نہیں ہے۔"

"کیا مطلب، وہ میرا ہم شکل ہے کیا؟"

"ہاں... تم کل سے شالیا رفان نہیں بلکہ سارجنٹ فرینک بن جاؤ گے۔"

میں چند لمحوں تک اس کی آنکھوں میں جھانکتا رہا لیکن نوگی کی آنکھوں میں سچائی کے بھرپور تاثرات تھے۔ میرے ذہن سے شک و شبے کے تاثرات زائل ہو گئے اور آنکھیں تفکر آمیز انداز میں سکڑ گئیں۔

"میں سارجنٹ فرینک نہیں بن سکتا۔" میرے لہجے سے مایوسی ظاہر ہو رہی تھی اور میں تیزی سے سوچ رہا تھا قسمت نے مجھے بڑے عجیب اتفاق سے ہمکنار کر دیا تھا۔

"کیوں نہیں بن سکتے؟" وہ مجھ سے پوچھ رہی تھی۔

"میں تمھاری زبان کسی اہلِ زبان کی طرح نہیں بول سکتا۔"

نوگی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

میں اُسے اُلجھی ہوئی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

"میں کہہ چکی ہوں کہ کوئی غیبی مدد میری زندگی پر اثر انداز ہو رہی ہے۔ میں نے جب پہلی بار تمھاری جھلک دیکھی تھی تو یہی سمجھی تھی کہ فرینک میرے سامنے آ گیا ہے۔" نوگی نے وضاحت کی۔ "رہی زبان تو میرا خیال ہے کہ تمھیں تھوڑی سی محنت کرنا پڑے گی۔"

"حیرت انگیز... ناقابلِ یقین..." میں نے بظاہر حیرت سے کہا۔ "لیکن فرینک کا کیا ہوگا؟"

"وہی جو کرنل اسٹیفن کا ہوگا۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن تم تمھیں ایک بار پھر کہوں گا کہ ہمارا ساتھ ساتھ جانا خطرے سے خالی نہ ہوگا۔"

"تو پھر ہم ایک دوسرے سے الگ الگ جائیں گے؟"
"اور اس کے بعد؟"
"اس کے بعد تم واپس اُسی غار میں آجاؤ گے۔"
مَیں خاموش رہا۔
"کرنل کو ٹھکانے لگانے کے بعد تم واپس اسی غار میں آ جانا۔ یہاں تمھیں اس وقت تک رہنا پڑے گا جب تک فریک یہاں نہیں پہنچ جاتا... پھر تم اس سے نمٹ کر اُس کی جگہ لے سکتے ہو۔"
"لیکن مَیں تمھارے بغیر ایک لمحہ بھی نہیں گزار سکتا؟"
"مَیں ہر رات تمھیں ملنے آؤں گی۔"
"وعدہ...؟"
"ہاں، وعدہ۔" نوگی نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا، "تم نے کرنل کا مکان تو دیکھا ہی ہو گا؟"
"مَیں نے وہ مکان دیکھا ہے۔" مَیں نے ذہن پر زور ڈالتے ہوئے کہا، "تم فکر نہ کرو۔ کرنل تک پہنچنے سے دُنیا کی کوئی طاقت مجھے نہیں روک سکتی۔ یہ اُس کی زندگی کی آخری رات ہے۔ صبح کا سورج اُس کی بھیانک لاش ہی دیکھے گا۔"
"اوہ، آج مَیں کتنی خوش ہوں۔" نوگی نے کہا اور وفورِ جذبات میں مجھ سے لپٹ گئی۔ مَیں نے اُسے اپنی مضبوط باہوں کے حصار میں لے لیا۔
باہر ایک بار پھر بادل گرجنے لگے اور بجلی چمکنے لگی۔
ہم دونوں دیر تک اسی طرح کھڑے رہے۔ پھر نوگی چونک کر مجھ سے الگ ہو گئی۔ اس نے اپنے بکھرے ہوئے بالوں کو سنوارا اور کپڑوں کی شکنیں ہاتھ سے درست کر کے میری طرف متوجہ ہوئی۔
"اب ہمیں یہاں سے چلے جانا چاہیے۔"
"آؤ... میں چھاؤنی تک تمہارے ساتھ چلوں گا... پھر ہم ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں گے۔"
"عارضی طور پر..."
"ہاں... عارضی طور پر۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔
ہم ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر غار سے باہر آ گئے۔ باہر تاریکی تھی۔ میں نے ہتھیاروں کے علاوہ اپنی ہر چیز غار ہی میں چھوڑ دی تھی۔ حتیٰ کہ طلائی سکوں کا وہ چرمی تھیلا بھی وہیں چھوڑ دیا۔

★

چھاؤنی میں عام ہنگامہ تھا۔
یوں محسوس ہوتا تھا جیسے فوجیوں میں بھگدڑ سی مچ گئی ہو۔

میں ایک چٹان کی آڑ میں بیٹھا روشنیوں کی طرف متوجہ تھا۔ سامنے خاردار تاروں کا جنگلا تھا اور اس سے نصف فرلانگ کے فاصلے پر فوجیوں کی بیرکس تھیں۔ میری نگاہ بیرکس سے ہٹ کر ایک مکان پر جمی ہوئی تھی۔
کرنل اسٹیفن اسی مکان میں رہتا تھا۔
اس وقت رات کے دو بجے تھے۔ بارش تیز ہو گئی تھی اور میں بُری طرح بھیگ گیا تھا۔ نوگی چند منٹ پہلے ہی مجھ سے رخصت ہوئی تھی اور اب اس کا ہیولیٰ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔
مزید چند منٹ انتظار کرنے کے بعد میں چٹان کی اوٹ سے نکلا اور گہری تاریکی میں بے آواز چلتا ہوا خاردار جنگلے کی طرف بڑھنے لگا۔ میری رائفل دائیں ہاتھ میں مضبوطی سے دبی ہوئی تھی۔
بارش کی وجہ سے کوئی پہرے دار اس خاردار تاروں کے قریب نظر نہیں آ رہا تھا۔ کیمپ کے گرد روشنی کا کوئی انتظام نہیں تھا... پھر غالباً سب ہی کسی تقریب کے سلسلے میں کہیں جمع تھے اس لیے مجھے کیمپ میں داخل ہوتے وقت ذرا سی بھی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔
میں ایک جگہ رُک گیا۔
ہنگامہ اسی بیرک کی سمت میں تھا، جہاں تمام فوجی اُس وقت جمع تھے۔ میں نے اطمینان سے سر کو اثبات میں ہلایا۔ اسی ہنگامے کی وجہ سے مجھے چوروں کی طرح کیمپ میں داخل ہونے کا موقع مل گیا تھا ورنہ عام حالات میں یہ میرے لیے اتنا آسان ثابت نہ ہوتا۔
میں سوچ رہا تھا کہ کہیں اس جشن کے سلسلے میں کرنل بھی اپنے گھر سے باہر نہ ہو۔ اس بات کا قوی امکان تھا۔ میں مکان کے عقبی حصے میں پہنچ کر رُک گیا۔
کیمپ میں روشنی کا انتظام خاص طور سے کیا گیا تھا۔ البتہ کرنل کا مکان تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا اور آس پاس کے دوسرے مکانات بھی تاریک تھے۔
میں دیوار سے چپک کر کھڑا رہا۔ میرا دل شدت سے دھڑک رہا تھا اور اس دھڑکن کو میں خود بھی سُن رہا تھا۔ یہاں کھڑے کھڑے مجھے نوگی کے اشارے کا انتظام کرنا تھا۔
نوگی نے مجھے بتایا تھا کہ کرنل سرِ شام ہی پینے میں مصروف ہو جاتا ہے اور نصف شب تک شراب کے کئی جام حلق میں انڈیل کر اپنی خواب گاہ کا رُخ کرتا ہے... اس کے بعد وہ اپنی خوابگاہ کو مقفل کر کے سوتا تو صبح ہی اس کی صورت نظر آتی تھی۔
میرے اندازے کے مطابق اگر کرنل اس وقت گھر سے باہر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نہیں گیا تھا تو یقیناً اپنی خواب گاہ میں خمار آلود نیند میں ڈوبا ہوا ہو گا۔ مجھے دیوار کے ساتھ چپک کر کھڑے کھڑے کئی منٹ گزر گئے تھے لیکن ابھی تک نوگی کی طرف سے کوئی اشارا نہیں ملا تھا۔
میں اندیشوں کا شکار ہو گیا اور میری حالت غیر ہونے لگی۔ گھر سے کوئی آواز بھی بلند نہیں ہو رہی تھی۔ مکمل سکوت اور تاریکی نے مکان کو نگل رکھا تھا۔
ابھی میں اندیشہ ہائے دُور دراز میں اُلجھے ہوئے ذہن کو کسی پہلو غور کرنے کے لیے یکسوئی بھی حاصل نہیں کر پایا تھا کہ مجھے قریب ہی ایک سرسراہٹ سی سنائی دی۔
میرا ہاتھ رائفل پر سخت ہو گیا۔
رائفل کی نال اس آواز کی طرف اُٹھ گئی۔
اچانک مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی کیچڑ میں دبے قدموں چلتا ہوا میری طرف بڑھ رہا ہو۔ میں پوری طرح ہوشیار تھا۔ ذرا سے خطرے کے جواب میں گولی رائفل کی نال سے نکلنے کے لیے تیار تھی۔
"شاپیار خان..." مترنم سرگوشی سنائی دی۔
میرے حلق سے اطمینان کی طویل سانس نکل گئی۔
"شاپیار خان..." اس بار نوگی کی آواز قدرے بلند تھی۔
"سیدھی چلی آؤ۔" میں نے جواباً کہا۔
نوگی میرے قریب پہنچی تو اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ اس نے ہانپ ہانپ کر مجھے بتایا، "کرنل کا کمرہ کھلا ہوا ہے اور وہ غائب ہے۔" اس کے لہجے میں بے قراری تھی۔
"پروا نہ کرو۔" میں نے اُس کے کندھے کو ٹھونکتے ہوئے تھپ تھپایا، "بیرکس میں کوئی تقریب ہے۔ یقیناً وہ اسی طرف گیا ہو گا۔ تم اندر جاؤ۔"
"تم بھی اندر چلو۔ معلوم نہیں آج روشنی کو کیا ہوا۔ بڑا اندھیرا ہے۔ مجھے خوف محسوس ہو رہا ہے۔"
"اپنے کمرے میں جا کر خاموشی سے سو جاؤ۔"
"کیا اس عالم میں نیند آسکتی ہے؟"
"جاؤ لیٹ جاؤ اور آنکھیں بند کر لو۔ نیند آجائے گی۔"
"اور تم...؟"
"میں یہیں اُس کا انتظار کروں گا۔"
"تم بھی اندر ہی کیوں نہیں آجاتے؟"
"بحث نہ کرو۔" میرا لہجہ سخت ہو گیا۔ چند لمحوں تک وہ خاموش کھڑی رہی۔ پھر آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتی ہوئی واپس چلی گئی۔
اُس کے قدموں کی چاپ ختم ہوئی تو مجھے چند لمحوں کے لیے یوں لگا جیسے میری رُوح تک میں سناٹا چھا گیا ہو۔ زندگی انسان کو کیسے کیسے عجیب تماشے دکھاتی ہے۔ چند گھنٹے قبل میں انتقام کی آگ میں جُھلسا ہوا ایک درندہ تھا... لیکن میری درندگی پر نوگی کے پیار کا امرت بازی لے گیا۔ میں اُسے دِل کی گہرائی سے چاہنے لگا تھا۔ مجھے یُوں محسوس ہو رہا تھا جیسے نوگی میری ہی کائنات کا ایک سِتارہ ہے۔
میں نے اپنے دِل کو ٹٹولا۔
نوگی سے محبت بلاشبہ سچی تھی... پھر اُس نے پل بھر میں اپنا سب کچھ میرے اندھے جذبات کی بھینٹ چڑھا دیا تھا۔ میں نے نوگی کا خیال ذہن سے ہٹایا اور کرنل اسٹیفن کے بارے میں غور کرنے لگا... اور اس کے ساتھ ہی سارجنٹ فرینک کا ہیولا میری نگاہوں کے سامنے رقص کرنے لگا۔ یہ بات مجھے یونٹ میں پہلے بھی کسی نے کہی تھی کہ ایک سارجنٹ میرا ہم شکل ہے... پھر میں نے اُسے دیکھ بھی لیا تھا... اور یہ کتنی عجیب بات ہے کہ ہم نے پہلی ہی ملاقات میں ایک دُوسرے کو پسند نہیں کیا تھا اُس کی آنکھوں میں شیطنیت کے سائے تھے۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی سارجنٹ فرینک کی آنکھوں میں عجیب سی چمک لہرا گئی تھی۔ جیسے وہ فوراً ہی جاگتے میں کوئی خواب دیکھنے لگا ہو۔
ڈیڈی... چرمی تھیلا... طلائی سکے... سارجنٹ فرینک اور اُس کے ساتھی... یہ سب کچھ میرے ذہن میں گھومتا رہا اور میں اُن میں کوئی تعلق پیدا کرنے کے لیے غور کرتا رہا... پھر نوگی کا طلسمی پیکر میری نگاہوں میں روشن ہو گیا۔ میرے ذہن میں یہ خیال بھی پیدا ہُوا کہ کہیں نوگی محض ایک خوب صُورت جھوٹ اور پُرکشش فریب تو نہیں ہے؟ دِل نے فوراً ہی اِس بات کو رَد کر دیا... نہیں وہ ایسی نہیں ہے...
مجھے یُوں لگا جیسے میں کسی ایسی دُنیا میں پہنچ گیا ہُوں، جہاں ہر چیز گُونگی ہو گئی ہو۔ میں اس تبدیلی پر حیران اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا کہ میری توجہ اُس فوجی بیرک کی طرف مبذول ہو گئی جہاں کچھ دیر پہلے قہقہے ہی قہقہے بکھر رہے تھے اور شراب کے نشے میں دُھت فوجی بُری طرح حلق پھاڑ پھاڑ کر گا رہے تھے... پھر اچانک ہی یہ سناٹا کیسا؟ میں اپنی بے ترتیب دھڑکنوں پر قابو رکھنے کی کوشش میں خاموشی سے دیوانہ ہوتا جا رہا تھا... کہ سناٹے کے اس عمیق سمندر میں ذرا سی ہلچل پیدا ہُوئی۔
کوئی نرم نرم قدموں سے دوڑ رہا تھا۔

آواز میری ہی طرف بڑھ رہی تھی۔

"اوہ... جان... کرنل کو کسی نے قتل کر دیا ہے" نوگی نے میرے قریب پہنچ کر ہانپتے ہوئے کہا "ابھی ابھی ایک سپاہی مجھے اطلاع دے کر گیا ہے"

"سارجنٹ فرینک کہاں ہے؟"

"اُس کے بارے میں کسی کو بھی پتا نہیں ہے"

"ہُوں... کیا وہ اکثر یونہی غائب ہو جاتا ہے؟"

"نہیں۔ تھوڑے ہی عرصے سے اُس کے معمُول میں فرق آیا ہے، وَرنہ اِس سے پہلے وہ بہت کم باہر جاتا تھا۔ ممکن ہے اُسے کسی علاقے میں بغاوت فرو کرنے کے لیے بھیجا گیا ہو"

"ہُوں... کرنل کی لاش کہاں پائی گئی ہے؟"

"اصل میں کرنل کو میں نے پرسوں رات ہی سے نہیں دیکھا" نوگی نے وضاحت کی "وہ اور سارجنٹ فرینک کسی بات پر بحث کر رہے تھے... پھر میں نے فرینک کو بہت غصّے میں جاتے ہُوئے دیکھا تھا۔ اِس کے بعد سے نہ تو میں نے کرنل کو دیکھا اور نہ ہی فرینک کہیں نظر آیا ہے"

"ہُوں..." میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

ڈینی... چرن تھیلا... طلائی سکّے... سارجنٹ فرینک اور اُس کے ساتھی جن میں میری قوم کے غدّار پٹھان بھی شامل تھے میرے ذہن میں ایک بار پھر آندھی سی چلنے لگی۔

"سُنو..." میں نے نوگی کا بازو تھام کر سرگوشی کی "اب مجھے جانے دو۔ میرا خیال ہے، یہ مُعاملہ اتنا سیدھا سادا نہیں ہے، جتنا کہ نظر آتا ہے۔ میں تمہیں ٹھیک دسویں روز اِسی غار میں مِلوں گا... تم شام کو یا دِن کے وقت جب بھی موقع مِلے، وہاں آ جانا۔ میرا خیال ہے، اُس وقت تک سارے راز کُھل کر سامنے آ جائیں گے، تب ہم اپنا لائحۂ عمل تیار کریں گے"

"دس روز..." وہ بڑبڑائی۔

"ہاں... میں وعدہ کرتا ہُوں کہ جہاں کہیں بھی ہوں گا، وہاں سے تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔ بتاؤ... آؤ گی نا؟"

"ضرور آؤں گی لیکن..."

"ہوشیار رہنا... مجھے یقین ہے کہ کوئی زبردست سازش ہُوئی ہے" میں نے کہا اور اُس سے جانے کی اجازت چاہی۔ گھوڑے کو میں کیمپ سے کافی دُور چھوڑ آیا تھا... اور اب مجھے ہر حال میں جلد از جلد اِس علاقے سے دُور نکل جانا چاہیے تھا۔ کیوں کہ ایک مبہم سا خیال میرے ذہن میں کسی سانپ کی طرح بَل کھا رہا تھا۔

کوئی سازش ہُوئی تھی اور میری زندگی ہر طرف سے خطرات میں گِھر گئی تھی۔

مجھے رہ رہ کر سارجنٹ فرینک کی چمک دار آنکھیں یاد آ رہی تھیں۔ اُس کے ہونٹوں پر جو مکّاری سے بھرپُور مُسکراہٹ اُبھری تھی، وہ یاد آ آ کر مجھے بے چین کر رہی تھی... لیکن اگر میرا خیال غلط تھا تو سارجنٹ فرینک اور اُس کے ساتھیوں نے میرے منہ بولے بھائی پانوش پر اتنے ستم کیوں ڈھائے تھے؟ انہوں نے اُسے موت کے گھاٹ کیوں اُتار دیا تھا؟ وہ کس دولت کی تلاش میں تھے؟ کیا وہی دولت جو ڈینی سے مجھے حاصل ہُوئی تھی؟ ڈینی کے پاس اتنے طلائی سکّے کہاں سے آ گئے تھے؟

یہ ایک اُلجھا ہُوا مُعاملہ تھا۔ جس پر میں جتنا بھی غور کرتا تھا، میرا ذہن اُتنا ہی اُلجھ رہا تھا... اِن سب باتوں سے قطع نظر مجھے، سارجنٹ فرینک اور اُس کے ساتھیوں کو تلاش کرنا تھا۔ کیوں کہ اب وہ دُہرے مقصد کے تحت مجھے مطلوب تھے۔ نہ جانے کیوں یہ خیال میرے ذہن پر سوار ہو گیا تھا کہ جب تک اُن سب کو ٹھکانے نہیں لگا دوں گا، میری زندگی سکون سے نہیں گزرے گی خواہ نوگی جیسی ایک ہزار لڑکیاں میرے دل و دماغ پر حاوی کیوں نہ ہو جائیں۔

کیمپ سے نکل کر میں اُس جگہ پہنچا، جہاں میں نے گھوڑے کو باندھا تھا۔ گھوڑا میری آہٹ پا کر ہنہنایا اور پاؤں زمین پر مارنے لگا۔ میں نے قریب پہنچ کر اُس کی گردن تھپ تھپائی اور اُس کی ایال پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

... پھر میں گھوڑے کی پُشت پر سوار ہو کر تاریک راستوں سے ہوتا ہُوا ایک بار پھر اُسی غار کی طرف روانہ ہو گیا جہاں میں اپنا سامان چھوڑ آیا تھا... جہاں نوگی نے مجھے زندگی کے حقیقی لُطف اور محبت کی مٹھاس سے رُوشناس کرایا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

★

رات بھر گھڑ سواری کے بعد... اگلے روز کا سُورج نکل کر آگ برسانے لگا تھا۔ گھوڑے کی چال میں تھکن آ گئی تھی اور اُس کی پُشت پر بیٹھے بیٹھے، میں خُود کو پتّھر کا ایک ایسا مجسمہ محسُوس کر رہا تھا جو اپنی مرضی سے حرکت نہ کر سکتا ہو۔

ایک ندی کے کنارے گھوڑے کو چھوڑ کر میں درخت کے سائے میں لیٹ گیا۔ نہ جانے کب تک بے سُدھ پڑا سوتا رہا اور اُٹھا تو تھکن کے آثار پھر بھی زائل نہیں ہُوئے تھے۔ میں نے سوچا کہ تھیلے سے سُوکھی غذا نکال کر استعمال کروں اور پھر قہوے کی چُسکیوں سے اپنے اعصاب کو پُرسکون بنا کر سفر شرُوع کر دوں۔ میری منزل اب زیادہ دُور نہیں تھی۔

شام گہری ہونے سے پہلے پہلے میں رونیال پہنچ سکتا تھا۔ وہی گاؤں رونیال، جہاں کبھی میں شہزادوں کی طرح رہا کرتا تھا... لیکن قسمت نے ایسا پلٹا کھایا کہ مجھے دَر بدر ہونا پڑا۔

کھانے سے فارغ ہو کر میں نے ندی کے شفاف ٹھنڈے پانی سے پیاس بُجھائی اور قہوہ تیار کرنے کے لیے پتّھروں کا چُولہا تیار کرنے لگا... پھر میں نے قہوے کا پانی چڑھا دیا۔

میرا ہاتھ چھوٹی سی پتیلی کی طرف بڑھتے بڑھتے رُک گیا۔ ایک غیر مانُوس سی آہٹ سُنائی دی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ آواز بائیں طرف سے آئی ہے... اور میرا اندازہ تھا کہ جس شخص کے قدموں کی خفیف سی آہٹ میری سماعت تک پہنچی ہے، وہ زیادہ سے زیادہ دس قدم کے فاصلے پر موجود ہے۔ مجھے اپنی بے خبری پر بے حد تاؤ آ رہا تھا۔ یہ غالباً تھکن اور ذہنی اُلجھاؤ ہی تھا، جس کی وجہ سے میں دُنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا تھا۔ وَرنہ عام حالت میں، اِس سے کہیں خفیف آہٹیں میرے کانوں تک پہنچ جاتی تھیں... یا میں اُنہیں محسوس کر لیتا تھا ایسی حالت میں، میں کسی کو اپنے اِس قدر قریب آنے کی مُہلت ہرگز نہ دیتا... تب ہی مجھے یاد آیا کہ میں نے گھوڑے کی بے چینی کو بھی نظر انداز کر دیا تھا۔ گھوڑا کسی اجنبی کو دیکھ کر پاؤں زور زور سے زمین پر مارنے لگا تھا اور کچھ دیر قبل مجھے ایسی آوازیں سُنائی دی تھیں۔

اِس سے پہلے کہ میرا ہاتھ ریوالور، شکاری چاقو یا اپنی رائفل کی طرف بڑھتا، ایک خوف ناک آواز سُنائی دی۔ مخاطب میرا ہی کوئی ہم وطن تھا اور اُس کے لہجے میں درندگی تھی۔

"خبردار... حرکت نہ کرنا وَرنہ اپنی کھوپڑی سے محروم ہو جاؤ گے" اِس آواز کے ساتھ ہی میرے عقب میں موجود اُس شخص کے پیروں تلے کوئی سُوکھی شاخ چٹخ گئی... اور میری گُدّی سے ریوالور کا سُوراخ چپک گیا۔

میں بے حس و حرکت رہا۔

اچانک مجھے یُوں محسوس ہُوا جیسے میرے عقب میں صرف ایک ہی آدمی نہیں ہے۔ مختلف آہٹیں، مختلف سمتوں سے سُنائی دے رہی تھیں۔ اِس کا مطلب تھا کہ میں چاروں طرف سے گِھر چکا تھا۔

مجھے احساس تھا کہ گردن پر رکھی ہُوئی ریوالور کی نال تو میں آسانی سے ہٹا سکتا ہُوں اور ریوالور بدست شخص کو آسانی سے قابو میں کیا جا سکتا ہے لیکن چاروں طرف بکھرے ہُوئے آدمیوں کی رائفلوں سے نکلنے والی گولیوں سے البتہ میں چھلنی چھلنی ہو جاؤں گا۔ یہی وجہ تھی کہ میں اب جلد بازی کر کے اِس صُورتِ حال کو مزید خراب نہیں کرنا چاہتا تھا جو میری ذرا سی غفلت کے باعث پہلے ہی ناقابلِ برداشت ہو چکی تھی۔

"اگر تم لوگ قہوہ پینے کا ارادہ رکھتے ہو تو میری طرف سے خوش آمدید..." میں نے خوش گوار انداز میں کہا اور پلٹنے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ عقب میں کھڑے شخص کا ہاتھ کانپتا محسوس کر کے میں دوبارہ ساکت ہو گیا۔

وہ یقیناً گھبراہٹ میں مُبتلا تھا۔

ایسے گھبرائے ہُوئے آدمیوں کے ہاتھ میں آتشیں اسلحہ ہمیشہ خطرناک ثابت ہوتا ہے کیوں کہ اُنہیں یہ کبھی احساس نہیں ہوتا کہ وہ کب ٹریگر دبا دیتے ہیں۔ گھبراہٹ میں، غیر محسوس انداز میں اُنگلی کا دباؤ بڑھ جاتا ہے اور پھر خوف ناک نتائج سامنے آئے بغیر نہیں رہتے۔

"میرا خیال ہے، تم لوگ تعداد میں چھ ہو"

"نہیں... سات ہیں"

میں نے قہوے کا برتن چولہے پر رکھ دیا "میرا خیال ہے یہ قہوہ آٹھ آدمیوں کے لیے بہت کم رہے گا"

"یہ قہوہ سات آدمیوں میں تقسیم ہو کر پُورا ہو جائے گا" ریوالور والے نے کھُردرے لہجے میں کہا۔

"لیکن میرا خیال ہے کہ تم محض ایک پیالی قہوے کے لیے تو مجھے ہرگز قتل نہیں کرو گے"

"ہم اِس سے بھی کم تر چیزوں کی خاطر قتل کر چکے ہیں" وہ شخص یہ کہتا ہُوا سامنے آ گیا۔ تب میں نے دیکھا کہ وہ ایک فوجی

ہے۔ اُس کے بائیں ہاتھ میں ریوالور دَبا ہُوا تھا اور اُس کی نال میری طرف اُٹھی ہُوئی تھی۔

...پھر باقی لوگ بھی سامنے آ گئے۔

یہ سب کے سب فوجی ہی تھے۔ انگریز تعداد میں تین تھے۔ جب کہ پٹھانوں کی تعداد بھی تین تھی۔ میں چونک پڑا۔ کیونکہ پہلے مجھے بتایا گیا تھا کہ وہ تعداد میں سات ہیں۔ آخر اس شخص کو مجھ سے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی؟

"تم نے اپنے ساتھیوں کی تعداد سات بتائی تھی؟"

"ہاں۔" اُس شخص نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھتے ہُوئے کہا۔ "ہمارا ایک ساتھی گھوڑوں کی نگرانی کر رہا ہے۔"

ایک نے دو انگلیاں مُنہ میں ڈال کر تیز سیٹی بجائی۔ ایک ہی لمحے بعد گھوڑوں کی ٹاپیں سُنائی دینے لگیں اور ایک نوجوان فوجی سامنے آیا۔ جس نے ایک ہی ہاتھ میں تمام گھوڑوں کی لگامیں تھام رکھی تھیں۔

"تمھارا نام کیا ہے، نوجوان؟" ریوالور والے نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہُوئے کہا۔

"شالیار خان...؟"

"اوہ... تو تم شالیار ہو؟" وہ اُچھل پڑا۔ اُس کے ساتھی بھی چوکنا ہو گئے اور ان سب نے اپنی اپنی رائفل سیدھی کر لی۔ اس وقت میں موت کے جتنے بھی دہانوں کے سامنے بے بس تھا۔ میرا جسم اُن کی تعداد کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ اتنی گولیاں بیک وقت لگتیں تو شاید میرا قیمہ ہی بن جاتا۔

ان کے انداز میں یکایک تبدیلی آ گئی۔

یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کئی دنوں سے میری ہی تلاش میں مارے مارے پھر رہے ہوں... میرا دل شدت سے دھڑک اُٹھا اور ذہن میں کلبلانے والا اندیشوں کا سانپ پورے زور و شور سے پھنکارنے لگا۔ میں اس سانپ کو اپنے ذہن سے نکال پھینکنا چاہتا تھا۔ لیکن ایسا ممکن نہ ہو سکا۔

"کیا تم مجھے جانتے ہو؟" میں نے مسکرا کر پوچھا۔

"ہمیں تمھاری ہی تلاش تھی، نوجوان۔" اُس شخص نے گہری نظروں سے مجھے گھورتے ہُوئے کہا۔

"وہ کس سلسلے میں؟"

"کرنل اسٹیفن کو قتل کرنے اور لُوٹنے کے...؟"

میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اُسے دیکھتا رہ گیا اور میرے ذہن میں پھنکارتا ہُوا سانپ بے حس و حرکت ہو گیا۔ کیونکہ اُس

نامور مصنف محمود احمد مودی

وہی تحریر اور وہی انداز

کے ساتھ 'اپنے چاہنے والوں

کے لئے ایک نئی سوغات لئے

تلاش

دو جلدیں جلد اول =/150

جلد دوئم =/150

خوبصورت سرورق 'بہترین

طباعت و کتابت 'سفید کاغذ

مکتبہ القریش

سرکلر روڈ اردو بازار لاہور

7668958

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی بے چینی کی وجہ یہی تھی۔ سارجنٹ فرینک سے شباہت، کرنل اسٹیفن کی لاش... اور وہ چرمی تھیلا جو میرے گھوڑے کی زین سے بندھا ہُوا تھا... اور جس میں اَن گنت طلائی سکّے تھے... سب کچھ میرے ذہن میں ایک ہی لمحے کے اندر اندر گھوم گیا... پھر یانوش کی لاش اُبھری اور میرے اندر کا درندہ انگڑائی لے کر بیدار ہو گیا۔

"میں نے کسی کو قتل نہیں کیا۔" میں نے بھرّائی ہُوئی آواز میں کہا اور اُسے صورتِ حال سے آگاہ کرنے لگا۔ یانوش کی لاش سے اب تک پیش آنے والے تمام واقعات بتانے کے بعد میں نے کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ میرے خلاف سازش ہُوئی ہے۔"

وہ شخص اُلجھن میں پڑ گیا۔

"ہم نے پانچ آدمیوں کو دیکھا تھا... اور اُن میں سے ایک تمھارا ہم شکل بھی تھا۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔ "ہو سکتا ہے تم جو کچھ کہہ رہے ہو، وہ درست ہی ہو لیکن..."

اُس کا جملہ اُدھورا ہی رہ گیا۔ کیونکہ جو نوجوان گھوڑوں کی نگرانی پر مامور تھا، وہ اچانک ہی چیخ پڑا تھا اور سب اُس کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

"دولت... طلائی سکّے..." وہی نوجوان کہہ رہا تھا۔

تین فوجی دوڑتے ہُوئے اُس کی طرف چلے گئے اور تین میرے آس پاس کھڑے رہے۔ میں اب بھی بیٹھا ہُوا تھا۔ یہ مہلت میرے لیے کافی تھی۔ میرے اندر کا درندہ ہر طرح سے خونریزی کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ میں نے چولھے سے جلتی ہوئی لکڑی کھینچ کر ریوالور والے کے ہاتھ پر ماری اور دوسرے ہاتھ سے ریوالور اپنی پیٹی سے کھینچ نکالا۔ میں نے خود کو زمین پر گرا لیا اور دائیں طرف لُڑھکتا چلا گیا۔ اس دوران میرے ریوالور کی سُرخ زبان دو بار لپکی اور دو آدمی زمین پر گر گئے۔ وہ بُری طرح تڑپ رہے تھے۔

اس سے پہلے کہ وہ شخص ریوالور اُٹھانے میں کامیاب ہو جاتا۔ جس کے ہاتھ پر میں نے جلتی ہُوئی لکڑی مار کر اُس کا ریوالور گرا دیا تھا۔ میرا شکاری چاقو دوسرے ہاتھ سے آزاد ہو کر اُس کے سینے میں پیوست ہو گیا۔

دھماکے اور چیخیں اُن چاروں نے سُنیں تو وہ طلائی سکّوں کی چمک دمک بھول کر اُدھر متوجہ ہُوئے۔ لیکن اُس وقت تک میں جھاڑی میں رُوپوش ہو چکا تھا۔

میں نے اُوپر تلے دو فائر کیے۔

دونوں گولیاں نشانے پر لگیں۔

اِن دونوں کے گرتے ہی باقی دو فوجی بدحواس ہو گئے۔ ایک نے قریبی گھوڑے کے پیچھے پناہ لے لی۔ میں نے دُوسرے کی طرف دیکھا۔ وہ چرمی تھیلا تھامے خاموش کھڑا تھا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان لاشوں کو دیکھ رہا تھا جنھیں اُس نے چند لمحے پیشتر زندہ و سلامت دیکھا تھا۔ اُس کی پیشانی پر گولی سے ایک چشمِ حیرت کا اضافہ ہو گیا اور چرمی تھیلا اُس کی تشنج سے اکڑی ہُوئی اُنگلیوں سے پھسلنے لگا... پھر تھیلا گر گیا۔ طلائی سکّے بکھر گئے۔

...لیکن میں ان سکّوں کی بجائے اُس شخص کی طرف متوجہ تھا جو گھوڑے کی اوٹ میں تھا۔ اُس کے ہاتھ میں رائفل نہیں تھی۔ ممکن ہے اُس نے اپنا ریوالور نکال رکھا ہو... لیکن اُس کے ہاتھ گھوڑے کے پیچھے ہونے کی وجہ سے مجھے دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

وہ آہستہ آہستہ کھسکنے کی کوشش کرنے لگا۔

میں نے گھوڑے کی عقبی ٹانگ کا نشانہ لے کر گولی چلا دی۔ دھماکا ہُوا اور گولی کھا کر گھوڑا اُچھل پڑا۔ وہ کربناک انداز میں ہنہنایا اور پھر اُس نے دونوں عقبی ٹانگیں پوری قوت سے اُچھال دیں۔ اتفاق سے آخری فوجی اس وقت اُن ٹانگوں کی زد میں تھا دولتی اُس کے سینے پر پڑی۔

اُس کے حلق سے ایک دلدوز چیخ نکل گئی۔

وہ فضا میں یُوں بلند ہُوا تھا جیسے اُس کے پیروں میں کوئی ایسی چیز لگ گئی ہو جس کی مدد سے اُس کے لیے اُڑنا ممکن ہو گیا ہو۔ کافی فاصلے پر وہ گرا تو میں نے دیکھا کہ اُس نے ایک بار بھی تڑپے بغیر جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا تھا۔ اُس کی رُوح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی تھی۔

میں تیزی سے اپنے گھوڑے کی طرف دوڑا۔ بکھرے ہُوئے طلائی سکّے سمیٹ کر جلدی جلدی تھیلے میں ڈالے۔ سامان سمیٹا۔ اور اُن فوجیوں کی تلاشی سے جو اسلحہ اور بارُود حاصل ہُوا۔ اُسے لے کر گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ اگلے ہی لمحے میرا گھوڑا طوفانی انداز میں دوڑ رہا تھا۔

میں نے اُن پانچ آدمیوں کو قتل کرنے کی قسم کھائی تھی جنھوں نے میرے معذور بھائی یانوش کو انتہائی درندگی سے مارا تھا۔ ایک فوجی نے غیر ارادی طور پر اُن پانچ سواروں کا تذکرہ کیا تھا جو اُنھیں کہیں نظر آئے ہوں گے... لیکن پھر وہ اُن کی گرد تک نہ پا سکے ہوں گے۔ اس سے یہی پتا چلتا تھا کہ میرے دُشمن زیادہ دُور نہیں ہیں۔

میرا کافی وقت ضائع ہو گیا تھا لیکن ظاہر ہے وہ لوگ بھی آرام اور کھانے پینے کے لیے یقیناً رُکے ہوں گے۔ اُنہیں صرف اتنے ہی وقت کی سبقت حاصل تھی، جتنا وقت میں نے نوکی کے شفٹے میں گزارا تھا یا پھر جتنی دیر بعد میں اپنے گھر پہنچا تھا... اور وقت کے اس فرق کو میں ختم کر سکتا تھا۔ مجھے صرف یہ خوشی تھی کہ ابھی تک میں اُسی سمت میں سفر کر رہا تھا جدھر وہ لوگ جا رہے تھے۔ اگر میں اُن کا نشان کھو دیتا تو پھر میری بھاگ دوڑ کا دائرہ مزید وسیع ہو جاتا۔

اُن بچوں کے خون سے انتقام کی خواہش کے سبب میرے پاس وقت ہی نہیں تھا۔ میں زندگی کی آخری سانسوں تک اُن کا تعاقب کر سکتا تھا اور یہی میں نے قسم بھی کھائی تھی۔ رونیال کا گاؤں میرے سامنے تھا اور میں گھوڑے پر سوار آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔ جب میں گلی میں داخل ہوا تو وہاں تاریکی اور ویرانی کی سلطنت تھی۔

گلی کے نکڑ پر میں نے گھوڑے کو چھوڑ دیا۔

جلدی تھیلا لیے اور رائفل سنبھالے میں دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ پورے گاؤں پر سناٹا چھا رہا تھا۔ کبھی کبھی کسی کُتّے کے بھونکنے کی آواز سنائی دیتی تھی اور پھر خاموشی ہی خاموشی کا احساس ہونے لگتا تھا۔

رات ہو چکی تھی اور مجھے صرف یہی خوف تھا کہ کوئی مجھے دیکھ نہ لے۔ میں نے جب سے اس گاؤں میں قدم رکھا تھا میرے دل میں بار بار ایک ٹیس سی اُٹھنے لگی تھی۔ اس گاؤں میں میرے کچھ ہمدرد بھی تھے لیکن اُن کی ہمدردیوں پر فرس خان کی دہشت کا پہرہ تھا۔ فرس خان کا خیال آتے ہی میری رگوں میں دوڑتا ہوا خون آتش فشاں کے لاوے کی طرح کھولنے لگا کیونکہ ماضی میں اُس نے جو کچھ میرے ساتھ اور میرے بزرگوں کے ساتھ کیا تھا اُن زیادتیوں کا حساب بھی مجھے ابھی بے باق کرنا تھا۔

مجھے یقین تھا کہ سارجنٹ فرینک اور اُس کے لٹیرے ساتھی اِس وقت رونیال میں فرس خان کے مہمان ہوں گے اور میں یہ بھی سمجھ رہا تھا کہ جو کچھ اب تک ہو چکا ہے اُس میں فرس خان کا بھی ہاتھ ہے۔

میرے ذہن میں حکیم کا پیکر اُبھرا اور پھر ایک آہٹ نے اُسے میرے ذہن سے یوں صاف کر دیا جیسے ہوا کا کوئی تیز جھونکا کسی معمولی تنکے کو اُڑا کر نگاہوں سے اوجھل کر دیتا ہے۔

میں جہاں تھا وہیں دیوار سے چپک کر کھڑا ہو گیا۔

کوئی آہستہ آہستہ اسی طرف چلا آ رہا تھا جہاں میں کھڑا تھا۔

میں دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اُس کے قریب آنے کا انتظار کرتا رہا۔ جب وہ متحرک سایہ مجھ سے چند قدموں کے فاصلے پر موجود رہا تو میں نے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ کر اُسے پہچاننے کی کوشش کرنے لگا... لیکن ایک عرصے تک گاؤں کے لوگوں سے دُور رہنے کی وجہ سے میں اُس ہیولے کو شناخت کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔

ہیولا آہستہ آہستہ میرے قریب آتا چلا گیا۔

جیسے ہی وہ میرے قریب پہنچا میں نے اپنا شکاری چاقو نکالا اور تیزی سے اُس کی پُشت پر پہنچ گیا۔ ایک ہی لمحے میں میرا بایاں ہاتھ اُس کے منہ پر جم گیا اور دائیں ہاتھ میں دبے ہوئے شکاری چاقو کی نوک اُس کی گردن پر ٹک گئی۔

"خبردار..." میں نے خوفناک لہجے میں کہا۔ مجھے اپنی سرگوشی کسی غضبناک درندے کی بھبک محسوس ہوئی۔ "اگر تم نے ذرا سی بھی جدوجہد کی یا تمہارے حلق سے آواز نکلی تو وہ تمہاری زندگی کا آخری لمحہ ہوگا۔"

میری گرفت میں جکڑا ہوا وہ شخص خاصا جاندار تھا لیکن میں نے اُسے کانپتے ہوئے محسوس کیا۔ میں نے اُس کے منہ سے ہاتھ ہٹائے بغیر کان کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔ "میں جو کچھ بھی کہہ رہا ہوں اُس کے جواب میں سر ہاں یا ناں میں حرکت دے کر جواب دو۔"

اُس نے سر کو مثبت جنبش دی۔

اس کا مطلب تھا کہ وہ مجھ سے تعاون کرنے کے لیے پوری طرح آمادہ ہے۔ میں نے آہستہ آہستہ اُس کے منہ سے ہاتھ ہٹا کر فوراً ہی اُس کی کلائی جکڑ لی اور پھر پوری قوت سے اُس کے بازو کو مروڑ کر پُشت سے لگا دیا۔ چاقو کی نوک اب بھی اُس کی گردن پر رکھی ہوئی تھی اور وہ پوری طرح بے بس تھا۔ میں نے اُسے دیوار کی طرف دھکیلا اور اُس کو دیوار سے لگا کر دایاں گھٹنا اُس کی ریڑھ کی ہڈی پر جما دیا۔

"تم کون ہو؟" اُس نے گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔ "اور مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

"سوال میں کروں گا۔" میں نے لہجے کو بدستور سرد رکھتے ہوئے کہا۔ "سب سے پہلے یہ بتاؤ کہ تمہارا نام کیا ہے؟"

"میرا نام یوسف ہے اور میں..."

"...اور تم شاہ نسیم کے بیٹے ہو۔" میں نے اُس کا جملہ پورا کیا۔

"تم کیسے جانتے ہو؟" اُس نے حیرت اور خوف میں ڈوبی ہوئی آواز حلق سے نکالی اور اُنہی خدشات کے تحت اُس کا جسم کانپنے لگا لیکن میں نے اپنے بارے میں بتاتے ہوئے فوراً ہی اُسے آزاد کر دیا۔

"یوسف! میں شاہ یار خان ہوں۔"

وہ ہٹ گیا اور دیوار سے پُشت لگا کر میری طرف دیکھنے لگا... اندھیرے کی وجہ سے میں اُس کی آنکھوں اور چہرے کے تاثرات تو نہ دیکھ سکا لیکن اُس کے حلق سے آزاد ہونے والی سکون کی سانسیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میرے چہرے سے ٹکرا رہی تھیں اور مجھے احساس ہو رہا تھا کہ وہ میرا نام سنتے ہی خوف اور خدشات سے نجات حاصل کر چکا ہے۔

"شاہ یار خان! تم اس وقت یہاں کیا کر رہے ہو؟" اُس نے سرگوشی میں سوال کیا۔

"کیا ہم کہیں اطمینان سے بات چیت نہیں کر سکتے؟" میں نے پوچھا۔ "میرا خیال ہے اگر یہاں ہم ایک ساتھ پائے گئے تو تم بھی پریشانیوں میں مبتلا ہو جاؤ گے۔"

"میرے بابا کی طبیعت بہت خراب ہے اور میں گاؤں کے حکیم کے پاس جا رہا تھا۔" اُس نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ تم گاؤں کے مشرقی حصے میں واقع کنوئیں پر چلے جاؤ۔ میں حکیم کو گھر پہنچا کر جتنی جلدی بھی ممکن ہوا تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں وہاں تمہارا انتظار کروں گا لیکن میرے پاس وقت بہت کم ہے اس لیے جتنی جلدی بھی ممکن ہو... وہاں پہنچ جاؤ... اور یہاں کسی سے میرا تذکرہ نہ کرنا۔"

میں اُس سے جدا ہو کر دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا تیزی سے گاؤں کے مشرقی حصے کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ بھی فوراً ہی آگے بڑھ گیا تھا۔ سنسان گلی میں چلتے چلتے کئی بار کسی نہ کسی پتھر سے میرا پاؤں ٹکرایا اور یوں کبھی تو منہ کے بل گرنے سے سنبھلنے کے لیے رُک گیا اور کبھی لڑھکتے ہوئے پتھر سے پیدا ہونے والے شور کا ردِعمل دیکھنے کے لیے مجھے رُک جانا پڑا۔ رونیال میں یوں چوروں کی طرح چھپ چھپ کر بے بس گھومنے کا یہ پہلا اتفاق تھا ورنہ یہی وہ گلیاں تھیں جن میں میں آنکھیں بند کر کے دوڑتا رہتا تب بھی ٹھوکر نہ کھاتا۔

یوسف خان میرا بچپن کا دوست تھا۔ اُس سے مجھے کسی قسم کی بدگمانی نہیں تھی اور نہ ہی کوئی نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ وعدے کے مطابق جلد ہی کنوئیں پر پہنچ جائے گا اور اس دوران میں میرے متعلق وہ کسی سے ایک لفظ بھی نہیں کہے گا۔ یہ میری خوش قسمتی ہی تھی کہ جس ہیولے کو دیکھ کر میں چند لمحوں کے لیے پریشان ہو گیا تھا، وہ بالآخر یوسف خان کے روپ میں میرے سامنے آ گیا تھا۔ اگر اُس کی بجائے گاؤں کا کوئی اور آدمی ہوتا تو یقیناً میرے لیے کافی دشواریاں پیدا ہو جاتیں... اور پھر شاید مجھے اُس شخص کو ٹھکانے ہی لگا دینا پڑتا۔

رونیال میں جتنی بھی آبادی تھی، اُس کے بیشتر لوگوں نے فرس خان کی سرداری کو قبول کر لیا تھا اور ہمارے ہاں کسی کو سردار قبول کرنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ پھر آدمی اُس کی غلامی قبول کر لیتا ہے۔ جن لوگوں نے فرس خان سے وفاداری کا حلف نہیں اٹھایا تھا، اُنہیں اُسی وقت گولی مار دی گئی۔ یہی وجہ تھی کہ لوگوں نے خوفزدہ ہو کر نہ صرف حلفِ وفاداری اٹھا لیا تھا بلکہ اگر کسی کے دل میں فرس خان کے خلاف نفرت تھی تو اُسے بھی چہرے پر سجانے کی بجائے دل کی گہرائیوں میں دفن کر دیا تھا تاکہ جسم و جان کا رشتہ فرس خان کی درندگی کی بھینٹ نہ چڑھ جائے۔

یوسف خان بھی ایک ایسا ہی نوجوان تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ ایک غیرت مند نوجوان ہے۔ اُس کا اپنے بوڑھے بابا کے علاوہ اس دُنیا میں کوئی بھی رشتے دار یا عزیز نہیں تھا اور اُس نے فرس خان کی غلامی بھی محض اپنے بوڑھے باپ ہی کی خاطر قبول کی تھی۔

اس وقت میں جس گلی میں چل رہا تھا، اس میں میرے دو تین دُور کے رشتے داروں کے گھر بھی تھے لیکن میں کسی دروازے کے سامنے نہیں رُکا اور نہ ہی اُن میں سے کسی سے ملنے کی خواہش میرے دل میں پیدا ہوئی۔ انتقام کا جذبہ بار بار مجھے فرس خان کی حویلی پر حملہ آور ہونے کے لیے اُکسا رہا تھا لیکن مجھے معلوم تھا کہ ایسا کرنا... خودکشی کے مترادف ہے۔ میں تنہا، فرس خان کے کتنے آدمیوں سے مقابلہ کر سکتا تھا... اُس سے نمٹنے کے لیے ضروری تھا کہ میں کوئی ایسی چال چلوں جو اُس کے لیے تباہ کُن اور میرے لیے بقا کا باعث ثابت ہو۔

چلتے چلتے اچانک میرا پاؤں، ایک نالی میں پڑا اور میں لڑکھڑاتا ہوا گر گیا۔ گرتے ہی مجھے یوں محسوس ہوا جیسے یکایک اندھیرا بیدار ہو گیا ہو اور سناٹے نے گرجنا شروع کر دیا ہو۔ شکاری چاقو، میرے ہاتھ میں دبا ہوا تھا۔ میں نے اندھیرے کے اس حصے پر وار کیا، جہاں سے یکایک آوازیں پیدا ہوئی تھیں۔ یہ ایک کُتا تھا جو میرے جسم کے نیچے دب گیا تھا۔ چاقو کا وار کارگر ثابت ہوا۔ کُتے کے حلق سے آخری غراہٹ نکلی اور پھر سناٹا چھا گیا۔ اگرچہ یہ ایک معمولی حادثہ تھا... لیکن اس حادثے نے میرے لیے خاصی دشواری پیدا کر دی۔ گلی کا ایک دروازہ فوراً ہی کھل گیا تھا۔

کسی نے باہر جھانک کر اس شور کی وجہ جاننے کی کوشش کی۔ میں نے دروازہ کھلنے کی آواز سن لی تھی اس لیے زمین پر جس حالت میں پڑا تھا، اُسی حالت میں پڑا رہا۔

دروازہ بند ہو گیا اور گلی پُرسکون ہو گئی۔

میں نے اندھیرے میں اِدھر اُدھر ہاتھ گھما کر چاقو کے دستے کو تلاش کیا... اور پھر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس گلی کو پار کرنے کے بعد میں مشرقی حصے میں واقع کنوئیں تک آسانی سے پہنچ سکتا تھا کیونکہ گاؤں کی یہ

گزر گئی تھی۔ اس کے بعد درختوں کے جھنڈ تھے اور جا بجا جھاڑیاں چھپی تھیں... اور ان جھاڑیوں کا سلسلہ چٹانوں تک چلا گیا تھا۔

گلی کی نکڑ پر پہنچ کر میں ایک بار پھر رک گیا۔

مجھے حیرت تھی کہ اب تک چوکیدار کی آواز کیوں نہیں سنائی دی۔ فرس خان اتنا غافل نہیں رہ سکتا تھا۔ مجھے گاؤں میں داخل ہوتے وقت کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا اور نہ ہی اب تک یوسف خان کے علاوہ، کسی سے مڈبھیڑ ہوئی تھی۔ کم از کم فرس خان کے آدمیوں سے تو آمنا سامنا ہونا ہی چاہیے تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کے آدمی تھوڑے تھوڑے وقفے سے گشت کرتے رہتے ہیں... اس کے علاوہ، گاؤں کے گرد، اس کے آدمیوں کا پہرہ رہتا تھا۔ یہ سکون اور خاموشی مجھے کسی طوفان کا پیش خیمہ محسوس ہونے لگی۔ سازش کا احساس شدید ہو گیا۔ یقیناً فرس خان نے اپنے تمام پہرے داروں کو ایسی ہدایت دی تھی جس کے تحت وہ ان راستوں سے ہٹ گئے تھے، جہاں سے کوئی شخص گاؤں میں داخل ہو سکتا تھا۔

... اور پھر میرے خیالات کا شیرازہ بکھر گیا۔

جس گلی کی نکڑ پر میں اس وقت کھڑا تھا، اس کے مخالف سمت سے ایسی آوازیں سنائی دینے لگیں جیسے کوئی بھاری قدموں سے چلا آ رہا ہو۔ میں نے غور سے ادھر دیکھا۔ لالٹین ہاتھ میں لیے کوئی آہستہ آہستہ آگے آ رہا تھا۔ میں وہیں کھڑا، لالٹین بردار، اس شخص کو دیکھتا رہا... یقیناً یہ فرس خان کے انہی آدمیوں میں سے ایک تھا جو رات بھر گاؤں میں گشت کرتے رہتے تھے۔

وہ جیسے ہی چند قدم آگے آیا، اسے رک جانا پڑا۔

... پھر اس کے حلق سے تیز آواز نکلی۔

مخالف سرے سے دو آدمی دوڑتے ہوئے آئے۔

میں ان سے کافی فاصلے پر تھا، اس لیے مجھے یہ خطرہ نہیں تھا کہ ان کی نظر مجھ پر پڑ جائے گی... میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ ان پر کتے کی نعش دیکھ کر کیا اثر پڑتا ہے... اور وہ کیا ردعمل ظاہر کرتے ہیں۔

میرے بائیں ہاتھ، تھوڑی سی میدانی جگہ تھی اور اس کے بعد درختوں کا جھنڈ تھا۔ میں صرف چند قدم چل کر اس جھنڈ میں غائب ہو سکتا تھا اور پھر وہ لوگ میری گرد کو بھی نہیں پا سکتے تھے۔

دراصل مجھ سے غلطی ہو گئی تھی۔ مجھے کتے کی نعش کو بھی ساتھ ہی گھسیٹ لانا چاہیے تھا۔

دونوں دوڑتے ہوئے آدمی، لالٹین کی روشنی میں تھے اور وہ لالٹین بردار سمیت کتے کی نعش پر جھکے اس کا جائزہ لے رہے تھے۔ کتے کی موت زیادہ تشویشناک نہیں تھی۔ اصل مسئلہ یہ تھا کہ اس کی ہلاکت میرے شکاری چاقو سے عمل میں آئی تھی اور تازہ خون بہہ رہا تھا۔ اس سے انہیں اندازہ ہو جانا چاہیے تھا کہ کسی نے کتے کو حال ہی میں ہلاک کیا ہے... اور یہ حرکت گاؤں کا کوئی آدمی تو ہرگز نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اسے کتے کے بھونکنے یا اس سے پیدا ہونے والے شور سے کسی قسم کا خوف محسوس نہیں ہو سکتا تھا۔ یقیناً یہ کسی باہر کے آدمی کی حرکت تھی۔ کسی ایسے آدمی کی حرکت، جو شور کے باعث اپنی ذات کے لیے خطرہ محسوس کر رہا ہو۔ یہ خیال ان کے ذہن میں بھی آ گیا۔ تب میں نے دیکھا کہ ان میں سے ایک تو واپس دوڑا، جب کہ لالٹین بردار اور اس کا ساتھی گلی کے اس سرے کی طرف دوڑنے لگے، جہاں میں کھڑا تھا۔

میں نے وہ جگہ چھوڑ دی اور خود کو درختوں کے جھنڈ میں پہنچا دیا۔ ایک درخت کے تنے کی اوٹ سے میں گلی کی نکڑ کو دیکھتا رہا... تھوڑی ہی دیر بعد وہ نکڑ پر نظر آئے۔

وہ لالٹین کی روشنی میں مجھے تلاش کرنے کی کوشش کر رہے تھے، جب کہ ان کا ایک ساتھی شاید یہ اطلاع پہنچانے کے لیے حویلی کی طرف دوڑ گیا تھا۔ میں درخت کے تنے کی اوٹ میں کھڑا رہا۔ وہ نکڑ پر کھڑے رہے۔ ان میں سے کسی نے بھی درختوں کے جھنڈ کی طرف بڑھنے کی جرأت نہیں کی تھی۔

کچھ دیر بعد لالٹین کی روشنی غائب ہو گئی اور گلی کی... نکڑ تاریک نظر آنے لگی۔

میں سوچ رہا تھا کہ یوسف خان کو... اب کنویں تک آنے کا موقع ملے گا یا نہیں؟ اس کا انتظار کیا جائے یا اپنے طور پر کوئی اقدام کر گزروں؟ انہی خیالوں میں ڈوبا ہوا، میں کنویں کے قریب پہنچ گیا۔

وہاں میں نے ایک ایسے درخت کا انتخاب کیا جہاں سے کنویں پر نظر رکھی جا سکتی تھی۔ چاندنی کے باوجود چند قدم سے زیادہ فاصلے کی کوئی چیز دیکھنا ممکن نہیں تھا۔

درخت کی ایک شاخ پر بیٹھ کر میں یوسف خان کا انتظار کرنے لگا۔ گاؤں کی طرف سے رفتہ رفتہ آوازیں بلند ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے آہستہ آہستہ گاؤں کا ہر شخص بیدار ہو گیا ہو۔ کتوں کے بھونکنے کی آوازیں بھی خاصی بلند تھیں... پھر مجھے گھوڑوں کی ٹاپیں بھی سنائی دیں۔

میں نے اپنا گھوڑا جہاں باندھا تھا، وہاں تک کسی بھی لمحے کوئی پہنچ سکتا تھا... میں ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا کیونکہ اب گھوڑے کو حاصل کرنا ممکن نہیں رہا تھا۔

گاؤں کی طرف سے آنے والی آوازوں کو سن کر میرے ذہن

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں اس خدشے نے جنم لیا کہ شاید اب یوسف خان، مجھ سے ملاقات کا وعدہ پورا نہ کر سکے۔ میں اسی ادھیڑبن میں تھا کہ مجھے اچانک ہی گھوڑے کی ٹاپیں سنائی دیں۔

میں چونک کر ادھر متوجہ ہوا۔

وہ یوسف ہی تھا... اور جس گھوڑے پر سوار تھا، وہ میرا ہی گھوڑا تھا۔ کنویں کے پاس رک کر اس نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر دھیمی آواز میں پکارنے لگا۔ "شالیار خان... شالیار خان!"

چند لمحوں تک میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

میں اطمینان کر لینا چاہتا تھا کہ وہ تنہا ہی ہے۔

جب میں مطمئن ہو گیا کہ اس کے ساتھ یا اس کے پیچھے کوئی اور نہیں ہے تو میں درخت سے کود کر نیچے آیا اور اس کے پاس پہنچ گیا۔ اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔

"بہتر ہو گا کہ تم فوراً یہاں سے چلے جاؤ۔" اس نے مجھ پر نگاہ پڑتے ہی کہا۔ "اتفاق سے تمہارے گھوڑے پر میری نظر پڑ گئی تھی... میں اسے ساتھ ہی لے آیا ہوں۔"

"کیا گڑبڑ ہے؟"

"پورا گاؤں بیدار ہو چکا ہے اور سب لوگ بڑی سرگرمی سے کسی ایسے شخص کو تلاش کر رہے ہیں، جس نے ایک کتے کو چاقو کی مدد سے ہلاک کیا ہے... اس کے علاوہ انہیں کتے کی نعش کے قریب چند طلائی سکے بھی ملے ہیں۔"

"اوہ..." میں نے ایک طویل سانس لی۔ یقیناً چرمی تھیلے سے چند سکے، وہاں گر گئے ہوں گے کیونکہ تھیلا گرنے کی وجہ سے ایسا ممکن تھا۔ "میں تم سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔"

"جو کچھ پوچھنا ہے، جلدی پوچھو... ورنہ میرا خیال ہے کہ زندگی محفوظ رہے تو انسان سوالات کسی اور وقت بھی کر سکتا ہے۔" یوسف خان نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "ابھی ان لوگوں کی تلاش کا دائرہ، گاؤں تک محدود ہے۔ اس مہلت سے استفادہ کر کے تم یہاں سے کافی دور جا سکتے ہو۔ جلد ہی وہ مختلف ٹولیوں میں بٹ کر تلاش کے دائرے کو وسیع کر دیں گے۔ تب ان کی نظروں سے محفوظ رہنا مشکل ہو جائے گا۔"

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اسے پرسکون رہنے کی ہدایت کرتے ہوئے اب تک کے تمام حالات سے مختصراً آگاہ کر دیا۔ وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

"ہاں... میں نے کل چند ایسے گھڑسوار دیکھے تو تھے لیکن وہ چند لمحے فرس خان کی حویلی میں گزار کر چلے گئے تھے۔"

"کہاں... کس طرف؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔

وہ شمال کی طرف جانے والے راستے کی طرف دیکھنے لگا... اس کی آنکھیں اس راستے کو گھورتی رہیں اور ہونٹ خاموش رہے۔ اچانک وہ چونک کر عقب میں دیکھنے لگا۔

درختوں کے جھنڈ کے اس پار سے گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دے رہی تھیں۔ ان آوازوں کو میں نے بھی صاف سنا۔

"شالیار... اب تم جاؤ، دوست خدا تمہارے ساتھ ہے۔" یوسف خان نے کہا اور تیزی سے جھاڑیوں کی طرف بڑھ گیا۔ چند ہی لمحوں میں وہ میری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

میں گھوڑے کی پشت پر سوار شمالی راستے کی طرف چل دیا۔ یوسف خان نے مجھ پر بڑی مہربانی کی تھی کہ وہ گھوڑے کو لے آیا تھا... غالباً شروع میں اس نے یہ سمجھا ہو گا کہ مجھے دیکھ لیا گیا ہے... لیکن بعد میں اسے کتے کی نعش اور طلائی سکوں کا پتا چلا تو وہ سمجھ گیا کہ میں محفوظ ہوں اور شمالی کنویں پر اس کا منتظر ہوں۔ جس وقت اس سے میری ملاقات ہوئی تھی تو میں گھوڑے پر نہیں تھا۔ جس جگہ میں نے گھوڑا باندھا تھا، اس طرف یوسف خان کا خیال یوں چلا گیا ہو گا کہ ہم بچپن میں اس جگہ کو کھیلنے کے لیے استعمال کرتے تھے اور صرف ہم دو تین دوستوں ہی کو اس مقام کا پتا تھا۔

عقب سے گھوڑوں کی ٹاپیں اب بھی سنائی دے رہی تھیں میں نے اپنے گھوڑے کو سرپٹ دوڑانا شروع کر دیا اور نیم تاریک رات کا سینہ چیرتا ہوا، تھوڑی ہی دیر میں کافی دور نکل آیا۔

رونیال میں جو کچھ ہوا تھا، وہ میری توقع کے خلاف ہی ہوا تھا۔ میں غصے سے اندھا ہو کر، دشمن کے علاقے میں گھس آیا تھا اور یہ زبردست حماقت تھی... لیکن میری سانسیں اب بھی برقرار تھیں اور جسم میں دوڑتے ہوئے لہو میں آتش فشانی حدت تھی۔ انتقام کا الاؤ، میرے دل میں اب بھی دہک رہا تھا اور میں، اسے بجھانے کے لیے اپنے دشمنوں کے خون کا متلاشی تھا۔

گاؤں میں آنے سے میری وجہ سے کہرام مچ گیا تھا لیکن یوسف خان کی ذہانت اور وفاداری نے مجھے دشمنوں کی نگاہوں سے بچا لیا تھا... پھر مجھے اس کی نگاہوں سے یہ بھی پتا چل گیا تھا کہ میرے دشمن کس طرف گئے ہیں۔ ان کے اور میرے درمیان وقت کی خلیج حائل ہو گئی تھی لیکن مجھے یقین تھا کہ میں، اسے پار کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ مدھم چاندنی سے نیم روشن راستے پر گھوڑا سرپٹ دوڑ رہا تھا اور وقت کی یہ خلیج مختصر ہوتی جا رہی تھی۔

صبح ہوتے ہوتے میں چترپال کے علاقے میں داخل ہو گیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

قصبہ دُور ہی سے خاموش اور پُرسکون نظر آ رہا تھا۔
سُورج نکلا تو محسوس ہُوا کہ آج کا دن بے حد گرم ہوگا۔ میں نے سوچا کہ اس قصبے میں مجھے کھانے اور آرام کرنے کا موقع مِل جائے گا... اور میں، سارجنٹ فرینک اور اُس کے ساتھیوں کے بارے میں بھی معلومات حاصل کر سکوں گا۔

میرا گھوڑا جب قصبے میں داخل ہُوا تو بازار سُنسان پڑا تھا۔ ابھی تو لوگ پوری طرح سو کر بھی نہیں اُٹھے تھے۔ اس لیے بازار میں زیادہ چہل پہل نہیں تھی۔

بازار میں داخل ہوتے وقت میں گھوڑے پر سوار رہا۔ اور محتاط نظروں سے یہ دیکھنے کی کوشش کرتا رہا کہ کوئی ایسی چشمِ نگراں تو نہیں جس میں میرے لیے کینہ پروری کے تاثرات پائے جاتے ہوں۔

بازار میں ایک سرائے کا دروازہ کھلا نظر آیا۔ اُس کے باہر ایک چارپائی پڑی تھی لیکن اُس چارپائی پر کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ بازار میں سرائے کی مُخالف سمت میں ایک پولیس چوکی تھی جس کی کھلی کھڑکی میں مجھے ایک انگریز پولیس افسر کھڑا نظر آیا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک رائفل دَبی ہُوئی تھی جس کا رُخ میری ہی طرف تھا۔

میرا دِل اُچھل کر حلق میں اٹک گیا۔

میں اس بات کی توقع نہیں کر سکتا تھا کہ چیرپال میں میرا اس انداز میں بھی استقبال کیا جا سکتا ہے۔ پولیس افسر کے ہاتھ میں رائفل دیکھ کر مجھے اندازہ ہو گیا کہ اگر میں نے ذرا سی بھی غلط حرکت کی تو وہ گولی چلانے سے باز نہیں رہے گا۔ فاصلہ اس قدر کم تھا کہ میں گھوڑے کو دوڑا کر وہاں سے فرار بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے گھوڑے کی لگام کھینچی اور رُک کر پولیس افسر کے اگلے اقدام کا انتظار کرنے لگا۔

مجھے اپنی طرف متوجہ پانے کے باوجود پولیس افسر کے چہرے کے تاثرات میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہُوئی۔ اُس کی آنکھوں میں آہنی چمک تھی اور اُس کے ہونٹ سفاکی سے بھنچے ہُوئے تھے۔

"گھوڑے سے اُتر جاؤ۔" اُس کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ "اور اپنے ہاتھوں کو اسلحے سے دُور ہی رکھنا۔"

صرف دس گز کے فاصلے پر اگر کوئی رائفل تانے کھڑا ہو تو بہتر یہی ہوتا ہے کہ آدمی اُس کی ہدایات پر بے چُوں و چرا عمل کرنا شروع کر دے۔ میں نے خاموشی سے اُس کے حکم کی تعمیل کرتے ہُوئے نہ صرف خود کو گھوڑے سے اُتارا بلکہ اپنے ہاتھ بھی اسلحے سے دُور رکھے... اچانک گھوڑے کو نہ جانے کیا ہُوا۔ اُس نے پُوری قوت سے دولتی چلائی۔

میں اُچھل پڑا۔

اُسی لمحے ایک فائر ہُوا۔ فضا دھماکے سے کانپ گئی اور مجھے یُوں لگا جیسے میرے بُوٹ کی ایڑی اُڑ گئی ہو۔ میں پُشت کے بَل زمین پر گر چکا تھا اور اسی گرنے کی وجہ سے میں گھوڑے کی دولتی اور گولی سے محفوظ رہا۔ گولی پولیس چوکی کی طرف سے نہیں آئی تھی۔ اگر یہ فائر پولیس افسر نے کیا ہوتا تو یقیناً وہ اب تک سینہ تھامے گر گیا ہوتا۔ کیونکہ میں اپنے ہولسٹر سے ریوالور نکال کر اُس پر فائر کرنے کی حالت میں تھا... لیکن گولی کی سمت مختلف تھی۔

میں نے اُس طرف دیکھا۔ جدھر سے دھماکا سُنائی دیا تھا۔

ایک باوردی شخص سرائے کی چھت پر کھڑا تھا اور اُس کی رائفل کی نال سے اب بھی دُھوئیں کی باریک سی لکیر نکل کر فضا میں تحلیل ہو رہی تھی۔ میں نے ایک طویل سانس لی۔ اِس وقت میں دو طرف سے گھرا ہُوا تھا۔ میں گرد میں لتھڑا ہُوا وہیں لیٹا رہا۔ پھر میں آہستہ آہستہ کہنیوں کے بَل اُٹھ گیا۔ اِس دوران میں میری نگاہ مُسلسل اُس شخص پر جمی رہی تھی جس نے مجھ پر فائر کیا تھا۔ وہ گولی چلانے کے سلسلے میں کچھ جلد باز معلوم ہوتا تھا۔ اِس لیے اُس پر نگاہ رکھنا ضروری تھا۔

"یہ میرا ماتحت ہے۔" پولیس افسر کی آواز سُنائی دی۔ "اگر اسے یقین ہوتا کہ گھوڑا اپنے طور پر بدک گیا تھا اور تم حقیقتاً لڑکھڑا گئے تھے... تو گولی تمہاری ایڑی کی بجائے کھوپڑی ہی پر پڑی ہوتی۔ اِس کا نشانہ کبھی خطا نہیں جاتا۔"

میں جواباً خاموش رہا۔

پولیس افسر نے جو کچھ کہا تھا، اُس میں میرے لیے مزید تنبیہ تھی۔

"ہم بڑی بے چینی سے تمہارا انتظار کر رہے تھے شایار خان۔" پولیس افسر چوکی کی کھڑکی میں کھڑے کھڑے کہہ رہا تھا۔ "ہمیں بتایا گیا تھا کہ تمہارا رُخ چیرپال کی جانب ہے۔"

میں نے اب بھی کوئی جواب نہیں دیا۔

صُورتِ حال بے حد خطرناک تھی۔ میں جس سازش کا شکار ہُوا تھا۔ اُس کا احساس... اور بعد میں یقین کر لینے کے باوجود اُس سے نجات نہیں حاصل کر سکا تھا... بلکہ سازش کی اِس دَلدل میں مزید دھنستا چلا جا رہا تھا۔

سارجنٹ فرینک کو یقین تھا کہ میں انتقام کی آگ میں جلتا ہُوا اُن کا پیچھا ضرور کروں گا اِس لیے وہ میرے راستے کو ہر ممکن پُرخطر اور خاردار بناتا ہُوا آگے بڑھ رہا تھا۔ رونیال میں جو کچھ ہُوا تھا۔ وہ تو میں بُھگت کر نکل آیا تھا لیکن چیرپال کی پولیس کے نرغے میں پھنس جانے کے بعد مجھے بے حد تشویش لاحق ہوئی تھی۔ میں جانتا تھا کہ مجھ پر کرنل اسٹیفن کو قتل کرنے اور حکومتِ برطانیہ کا خزانہ لُوٹنے کا الزام عاید کیا جا چکا ہے۔ حالانکہ اِن دونوں ہی وارداتوں کے سلسلے میں میرا دامن پاک تھا۔

"چھت سے نیچے آ جاؤ۔" پولیس افسر چیخ کر اپنے معاون سے کہہ رہا تھا۔ "اور اِس شخص کو غیر مسلح کر کے اندر لے آؤ۔ میں یہیں کھڑا اِسے رائفل کی زد میں رکھوں گا۔"

گولی کے دھماکے سے پُورا قصبہ بیدار ہو گیا تھا۔ مکانوں کے دروازے اور کھڑکیاں کُھلنا شروع ہو گئی تھیں اور بہت سے آدمی بازار میں دِکھائی دینے لگے تھے... لیکن اُن میں سے کسی نے بھی قریب آنے کی جراُت نہیں کی۔

میں نے سرائے کی چھت کی طرف دیکھا۔

پولیس افسر کا مُعاون اب چھت کے پاس دِکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ مجھے سرائے کے دروازے سے باہر آتا نظر آیا۔ اُس کے ہاتھ میں اب بھی رائفل تھی۔ جس کی نال کا رُخ میری طرف تھا۔ میں خاک میں لتھڑا ہُوا لیٹا رہا۔ حتیٰ کہ وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر رُک گیا۔

اُس نے گھوڑے کو ایک طرف ہانک دیا اور رائفل کی نال میرے سینے پر جما دی۔ میں ساکت پڑا رہا۔ میرے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں لیکن میں خون کے گھونٹ پینے کے علاوہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ اُس نے میرے ہولسٹر سے ریوالور اور میان سے شکاری چاقو نکال لیا... پھر وہ دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

"اُٹھو... اور ہاتھ سر سے بلند رکھتے ہُوئے چوکی کے دروازے کی طرف چلنا شروع کر دو۔"

میں زمین سے اُٹھا اور ہاتھوں کو سر سے اُوپر اُٹھائے آگے بڑھنے لگا۔ میرے سینے کی طرف چوکی کے پولیس افسر کی رائفل کی نال تنی ہُوئی تھی اور عقب میں اُس کا معاون رائفل تھامے چلا آ رہا تھا۔ میں نے دروازے سے اندر قدم رکھا تو انچارج نے طنزیہ انداز میں مُسکرا کر میری طرف دیکھا۔ یہ طنزیہ مُسکراہٹ گویا میرے استقبال کے لیے اُس کے ہونٹوں پر اُبھری تھی۔

"اِس کے بارے میں جو کچھ مشہور ہو چکا ہے، یہ وہ تو ہرگز

الف لیلہ ڈائجسٹ کا مقبول سلسلہ
انسان اور شیطان
مصنف محمد فراز
امیر علی خان کی خوفناک آپ بیتی
مکتبہ القریش سرکلر روڈ اردو بازار لاہور
فون 7668958

اے حمید
کے ایڈونچرس قلم سے
گنگا کے
پجاری ناگ
دو جلدوں میں
جلد اول =/150
جلد دوم =/200
مکتبہ القریش سرکلر روڈ اردو بازار لاہور
فون 7668958

نظر نہیں آتا۔" پولیس افسر نے ہنس کر کہا۔

"یہ مت کہو۔" معاون نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں نے جب اِس پر گولی چلائی تھی تو اُس کے چہرے پر اُبھرنے والے تاثرات بھی دیکھے تھے۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں، بینیک... اگر پوری برطانوی فوج بھی میری پُشت پر ہو تو میں اِس شخص پر اعتماد نہیں کروں گا۔"

"اوہ، ڈاگ..." انچارج بینیک بے یقینی سے ہنس پڑا۔

"چلو دوست..." معاون ڈاگ نے میری طرف دیکھتے ہُوئے کہا۔ "آہستہ آہستہ اور احتیاط سے اُس سلاخ دار دروازے کی طرف بڑھ چلو... اور یاد رکھو، چلتے وقت تمہارا انداز اُس مُرغی جیسا ہونا چاہیے جو انڈوں پر چلتے وقت یہ خیال رکھتی ہے کہ کوئی انڈا ٹوٹنے نہ پائے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
میری نگاہ کھڑکی کی طرف اُٹھ گئی۔
باہر بہت سے لوگ دکھائی دے رہے تھے۔ میں جیسے ہی پولیس چوکی میں آیا تھا، یہ لوگ چوکی کے باہر جمع ہو گئے تھے۔ اب فرار کی ہر راہ مسدود ہو کر رہ گئی تھی۔

"آؤ، دوست! آؤ... خوش آمدید!" ایک خوش گوار آواز میرے کانوں تک پہنچی تو میں نے آنکھیں سکیڑ کر اُدھر دیکھا۔ یہ آواز سلاخ دار دروازے کی طرف سے آئی تھی۔ سلاخوں کو دونوں ہاتھوں سے تھامے ایک جسیم پٹھان کھڑا تھا۔ اُس کے بھدے بھدے ہونٹوں پر سفاک مسکراہٹ تھی۔ یہ ایک ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ اس چوکی میں دو سلاخ دار دروازے تھے۔ ایک کے پیچھے وہی شخص کھڑا تھا جس نے مجھے خوش آمدید کہا تھا اور دوسرا دروازہ کھولے، معاون ڈاگ میرا منتظر تھا۔ میں آہستہ آہستہ چلتا ہُوا سلاخ دار دروازے سے داخل ہُوا اور پھر ڈاگ نے ایک دھکے سے اُسے بند کر کے مقفل کر دیا۔

اس دوران میں میرے گھوڑے سے سامان اُتار کر چوکی کی واحد میز پر رکھا جا چکا تھا۔ اس میں وہ چرمی تھیلا بھی موجود تھا جس میں طلائی سکے تھے۔

پولیس افسر سب چیزوں کا جائزہ لینے کے بعد سلاخ دار دروازے کے سامنے آ کھڑا ہُوا۔ اُس کے ہونٹوں پر تنفر آمیز کھنچاؤ تھا اور آنکھیں دہکتی ہُوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

"تم تو ایک پورا خزانہ لیے گھوم رہے ہو۔" اُس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "اس دولت کے بارے میں کیا کہنا چاہتے ہو، جو تمھارے چرمی تھیلے میں پائی گئی ہے؟"

"میں نے یہ ساری دولت جُوئے میں جیتی ہے۔"

نامور مصنف ایم۔ الیاس۔ کے شہکار
قلم سے ایک اچھوتی کہانی
ذلیل
خوبصورت سرورق عمدہ پرنٹنگ کتابت
قیمت =\150 روپے

"اوہ... کیا واقعی؟"
"سچ اور جھوٹ کا فیصلہ تمھیں کرنا چاہیے۔" میں نے بے پروائی سے کندھے اُچکا کر کہا۔ "فی الحال میں یہ دیکھ رہا ہُوں کہ صبح ہو چکی ہے اور ناشتے کا وقت ہو رہا ہے۔"

میری بات پر اُس کی بھنویں ناگواری سے سمٹ گئیں۔ شاید وہ میرے بارے میں کچھ زیادہ ہی غلط فہمی کا شکار تھا۔ اُسے غالباً مجھ سے گھبراہٹ کے تاثرات ظاہر کرنے کی توقع تھی۔ اس کا معاون ڈاگ کرسی پر بیٹھا، مجھے اب بھی گھور رہا تھا۔ اُس نے ایک سپاہی کو ناشتہ لانے کے لیے بھیج دیا۔

"واہ... واہ" برابر کی حوالات سے آواز آئی۔ "کیا شان سے تمیاں(؟) ہے۔ انگریزوں کو کم از کم یہ احساس..."
"چپ رہو، اُلو کے پٹھے!" انچارج نے پاؤں پٹخ کر کہا۔
جواباً اُسی حوالات سے قہقہہ بلند ہُوا۔
انگریز پولیس افسر دانت پیس کر رہ گیا۔
"تم نے سُنا نوجوان..." ادھیڑ عمر کا... لیکن مضبوط اعصاب والا پٹھان قیدی کہہ رہا تھا۔ "اس نے ابھی ابھی مجھے اُلو کا پٹھا کہا ہے۔ حالانکہ یہ جانتا ہے کہ اس کے والدین سے میری کوئی رشتے داری نہیں ہے۔"

"تم چپ نہیں رہ سکتے؟" انگریز افسر دہاڑا۔
"رہ سکتا ہُوں... لیکن ناشتے کے بعد۔" قیدی نے مضحکہ اُڑانے والے انداز میں کہا اور مُسکرا کر میری طرف دیکھنے لگا۔ "تمھارا نام تو میں سُن چکا ہوں، شاید شالیار خان! کل رات سے یہاں تمھارا نام اتنی بار لیا گیا ہے کہ اگر یہ لوگ اتنی بار خدا کو یاد کر لیتے تو اب تک دنیا میں چھپے ہوتے۔ تم جیسے نڈر پٹھانوں سے مجھے بڑی عقیدت ہے۔ تمھیں گھبرانا نہیں چاہیے۔ یہ لوگ تمھارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔"

پولیس افسر دندناتا ہُوا سلاخ دار دروازے کی طرف بڑھا لیکن دو سلاخوں میں ہاتھ ڈال کر قیدی کے چہرے پر تھپڑ مارنے کی حسرت دل ہی میں دبا کر رہ گیا۔ میں نے دیکھا، قیدی بڑی تر نوالہ نظروں سے پولیس افسر کو گھور رہا تھا۔

"ناشتہ..." ایک نسوانی آواز سنائی دی اور میں چونک پڑا۔ میں نے دیکھا کہ وہ ایک نوعمر لڑکی تھی جس نے ناشتے کے برتن اٹھا رکھے تھے۔ لڑکی کو دیکھ کر میرا خون کھولنے لگا۔ وہ ان فرنگیوں کی خدمت گار تھی۔ حالانکہ میرے خیال کے مطابق اُسے خدمت گاری کے فرائض سرانجام دینے کی بجائے کسی تنور میں جھونک دینا چاہیے تھا۔

لڑکی نے پہلے قیدی کی طرف اور پھر میری جانب دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے چمک سی لہرائی اور معدوم ہو گئی۔ اس نے نگاہ مجھ پر سے ہٹائی اور برتن معاون ڈاگ کے سامنے میز پر رکھ دیے۔

معاون نے ناشتے کو چکھا اور پھر دو تھالیاں اُٹھا کر میرے دروازے پر آ گیا۔ سلاخ دار دروازے کے نیچے تھالی گزرنے کے لیے جگہ بنی ہوئی تھی۔ اس نے باری باری دونوں تھالیاں اندر سرکا دیں۔ میں نے خاموشی سے ناشتہ شروع کر دیا...

برابر والی حوالات میں جو قیدی تھا، وہ بھی ناشتہ کر رہا تھا اور منہ چلاتا ہُوا میری طرف بھی دیکھ رہا تھا۔

"تم نے اپنا نام نہیں بتایا؟" میں نے پوچھا۔
"میں دُوشَم ہوں... دُوشَم خان!" اس نے شاہانہ انداز میں اپنا تعارف کرایا۔ "جتنے بھی سفید سُور میرے نام سے واقف ہیں، وہ سب کے سب میرے تذکرے پر مزید سفید پڑ جاتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ میں ڈاکو ہوں حالانکہ مجھے یقین ہے کہ اصل ڈاکو یہی لوگ ہیں جو سات سمندر پار سے یہاں حکومت کرنے کا خواب دیکھنے آئے ہیں۔"

"میں تم سے متفق ہوں۔" میں نے مسکرا کر کہا۔
"ہمارے کان مت کھاؤ۔" معاون ڈاگ نے پاؤں پٹخ کر کہا۔ "اور یہ سیاسی بحث کر کے میرا ناشتہ خراب نہ کرو۔" وہ کسی اہلِ زبان کی طرح پشتو میں بات کر رہا تھا۔

"اگر میرا بس چلے تو میں تمھیں ایسا ناشتہ دوں..." دُوشَم نے نفرت سے ہونٹ سکوڑتے ہوئے کہا لیکن اس کا جملہ ادھورا ہی رہ گیا کیونکہ ڈاگ کرسی سے اُٹھ کھڑا ہُوا تھا۔ اس کا چہرہ غصّے سے دہک اُٹھا تھا اور اس کی آنکھیں دیوانگی کی چمک لیے دُوشَم کو گھور رہی تھیں... پھر وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہُوا برابر کی حوالات کے دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ پولیس افسر بڑے اطمینان سے میز پر ہاتھ پھیلائے نیم وا نظروں سے تماشا دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنے معاون ڈاگ کو روکنے کی کوشش نہیں کی بلکہ اس کی آنکھوں میں شرارت کی چمک نمایاں ہو گئی تھی۔

ڈاگ سلاخ دار دروازے کے سامنے رُک گیا۔ اس کے ہونٹ سختی سے بھنچے ہوئے تھے اور اس کی مٹھیاں اتنی شدت سے بند تھیں کہ مجھے اس کی انگلیوں کے جوڑ سفید نظر آ رہے تھے۔ یہ شخص واقعی اذیت پسند تھا۔ اس نے جس انداز میں مجھ پر نظر جمائی تھی، اس سے میں نے ڈاگ کی فطرت کا اچھی طرح اندازہ لگا لیا تھا۔

دُوشَم اور ڈاگ دونوں ایک دوسرے کو گھور رہے تھے۔
قیدی کا منہ اب بھی چل رہا تھا جیسے اُسے ڈاگ کے غضب ناک ہونے کا ذرا بھی احساس نہ ہو... البتہ اس کی آنکھیں ڈاگ کی آنکھوں میں پیوست تھیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ دونوں اپنی اپنی قوتِ ارادی کے بل بوتے پر ایک دوسرے کو متاثر اور مسحور کرنے کی کوشش کر رہے ہوں۔

میں نے محسوس کیا کہ معاون افسر کی مٹھیاں آہستہ آہستہ ڈھیلی پڑتی جا رہی ہیں۔ گویا وہ دُوشَم کی آہنی نظروں سے پھوٹتی آنکھوں کی تاب لانے سے قاصر ہوتا جا رہا تھا۔
اس کی مٹھیاں کھل گئیں۔
ہونٹوں پر بھی سی حرکت نظر آئی۔
... پھر وہ آہستہ آہستہ جھکتا گیا۔ اس کا چہرہ سلاخوں سے چھو گیا... اچانک اُس نے اس تھالی میں تھوک دیا جس میں دُوشَم کھا رہا تھا۔ دُوشَم کے ہاتھ سے تھالی گر گئی اور غصّے سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے پوری قوت سے سلاخوں کے درمیان سے گھونسا مارا تھا۔

ڈاگ نے بڑی پھرتی دکھائی تھی لیکن وہ اپنے چہرے کو اتنی جلدی پیچھے نہیں ہٹا سکا تھا... ناک پر پڑا اور وہ کچھ پیچھے ہٹ گیا۔
اس لمحے ڈاگ کا ہاتھ اپنے ہولسٹر کی طرف رینگ گیا۔ اس نے ریوالور نکال اور حوالات کی طرف فائر جھونک مارا... پھر اس کے حلق سے ایک دلدوز چیخ... ریوالور اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جا گرا تھا۔ پیچھے مُڑتا ہُوا... میری نگاہ سے اس کی آنکھوں اور چہرے سے حیرت ٹپک رہی تھی۔
میرے ہاتھ میں تھالی بڑی تیزی سے نکل گئی...

مصنف اظہر کلیم
شہباز
دو حصوں میں
مکمل سیٹ =/100 روپے
مکتبہ القریش
سرکلر روڈ اردو بازار لاہور
فون 7668958

نشانہ صحیح نہیں لیا تھا۔ اگر مجھ سے ذرا سی بھی چوک یا تاخیر ہو گئی ہوتی تو وہ شہ یقیناً زخمی ہو گیا ہوتا۔۔۔ یا پھر ممکن تھا کہ وہ راہی ملک عدم ہی ہو گیا ہوتا۔

"واہ۔۔۔ واہ۔۔۔ واہ دوست!" اس نے بلند آہنگ قہقہوں کے درمیان میرے اس کارنامے کو سراہا۔

ڈاگ چند لمحوں تک تو میرے ساتھ لگا کھڑا رہا پھر اس نے لپک کر دیوار سے ٹنگی ہوئی ایک رائفل اتاری۔۔۔ لیکن اس بار اس کا سپاٹ چہرہ سامنے آگیا۔ ڈاگ دانت پیس کر رہ گیا جینک نے اس کے ہاتھ سے رائفل چھین لی۔

"نہیں ڈاگ!" اس نے بڑی متانت سے کہا۔ "ہمیں اپنے ہی قانون کو اپنے ہاتھوں پامال نہیں کرنا چاہیے۔۔۔ ان دونوں کے لیے جب تک اوپر سے کوئی حتمی حکم نہیں آجاتا، ہم ان پر ہاتھ نہیں استعمال کر سکتے۔"

ڈاگ نے دانت بھینچے لیکن کچھ بولا نہیں۔

جینک نے رائفل دوبارہ وہیں شکار کی جہاں سے ڈاگ نے اسے جھپٹ کر اتارا تھا۔

"تم نے اس رائفل اور میرے ڈاگ کی طرف داری کر کے اچھا نہیں کیا۔" ڈاگ نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ "تمہیں بہت جلد اپنی اس حرکت کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔"

میں نے بے پروائی سے کندھے اچکا دیے اور خاموش رہا۔

وہ میز پر رکھے ہوئے میرے شکاری چاقو کی طرف متوجہ ہو گیا۔ چاقو اٹھا کر اس نے اسے دیکھا اور اس دوران میں کنکھیوں سے میری طرف بھی متوجہ رہا۔

ڈاگ کا غصہ کوئی دیر بعد ٹھنڈا ہوا۔۔۔ اس کے بھی کافی دیر بعد اس کی مسکراہٹ واپس آئی۔ مجھ سے اب تک کسی قسم کی بازپرس نہیں کی گئی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ جینک نے میرے بارے میں اعلیٰ حکام کو اطلاع بھجوائی ہے اور وہ ان کی طرف سے ہدایات کا منتظر ہے۔

عقبی سکوں کا تیری پھیلا۔ اس نے ایک وزنی الماری میں مقفل کر رکھا تھا۔ میری رائفل اور شکاری چاقو بھی اسی قیمتی کے ساتھ ہی رکھ دیا گیا تھا۔

میں دن بھر اس نئی صورت حال کے بارے میں غور کرتا رہا لیکن فرار کا کوئی طریقہ سمجھ میں نہ آیا۔ دنیا بھر میں کوئی میرا مددگار نہیں تھا۔ اگر کوئی دوست تھا تو تنہا تھے جن کے بارے میں مجھے تسلی تھی کہ خیال بھی نہیں کر سکتا تھا۔۔۔ وہ شم خان تھا جو ایک زبردست لڑکی کی ڈاگ کے روپ میں، جو میری دشمنوں

میں شدت، آنکھوں میں حرارت اور نسوں میں پکھلا ہوا لاوا! تو وہ زمینی تھی جو مجھے کسی عذاب سے نہیں بچا سکتی تھی۔

شام کے سائے ڈھل گئے۔

رات کا دامن کائنات پر پھیل گیا اور میں ٹھنڈک سے پریشان ہو کر اس دبیز کمبل کی طرف متوجہ ہو گیا جو مجھے اوڑھنے کے لیے دیا گیا تھا۔

میں اس کمبل میں ہواڑھو کر لوگی کے خوشبو دار خیالوں میں کھو گیا۔۔۔ اور جلد ہی ان خیالوں کی مہک میرے دل و دماغ پر حاوی ہو گئی۔ میں نیند کی وادی میں اتر گیا اور وہاں کی معطر فضا نے مجھے ہر طرف سے بے گانہ کر دیا۔

۔۔۔ لیکن نیند کی حالت زیادہ دیر برقرار نہ رہ سکی۔

آنکھ کھل گئی تو میرا دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔ کچھ آوازیں تھیں جن کی وجہ سے میری نیند اچاٹ ہو گئی تھی۔ میں اٹھ بیٹھا۔ جس حوالات میں مجھے رکھا گیا تھا وہ اتنی تاریک تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ برابر کی حوالات سے دوشم خان کے لرزہ خیز خراٹوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

میں ان آوازوں کو غور سے سننے لگا جن کی وجہ سے میری نیند اچاٹ ہوئی تھی۔ دوشم خان کے خراٹے تو میں سر شام ہی سے سننے لگا تھا اس لیے وہ میری بے چینی کا باعث ہرگز نہیں ہو سکتے تھے۔ آوازیں حوالات کی عقبی دیوار سے پیدا ہو رہی تھیں۔

میں نے پولیس افسر کے کمرے کی طرف دیکھا۔

ایک پٹھان پہرے دار رائفل کے سہارے ٹکا بیٹھا تھا اور اس کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا جیسے وہ بیٹھے ہی بیٹھے گہری نیند سو گیا ہو۔ میں بے چین ہو کر کھڑا ہو گیا۔

"دوشم خان۔۔۔" میں نے تیز سرگوشی کی۔

جواباً اس کا تیز خراٹا سنائی دیا۔

"دوشم خان۔۔۔" میں نے نسبتاً بلند آواز میں اسے پکارا۔

لیکن اس بار بھی ایک خراٹا جواب تھا۔ زیادہ زور سے بول کر میں پہرے دار کو چوکنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے بے چینی سے ان پُراسرار آوازوں کی طرف ہی متوجہ رہا جو عقبی دیوار سے پیدا ہو رہی تھیں۔ میں دبے قدموں اس دیوار کی طرف بڑھا لیکن ابھی میں نے دوسرا قدم ہی اٹھایا تھا کہ اچانک ایک دھماکا ہوا اور میں نے تیزی سے کانوں کے پردے بچانے کی کوشش کی۔ میرا سر گھوم گیا اور میں چند ثانیے بے ہوشی و تشدد اندھیرے میں ٹکٹکی باندھے کھڑا دیکھتا رہ گیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دھماکا خاصا شدید تھا۔

حوالات کی عقبی دیوار کو غالباً بارود کی مدد سے اڑا دیا گیا تھا۔ میرے کان ابھی تک دھماکے کی وجہ سے سائیں سائیں کر رہے تھے اور ذہن پر لمحاتی بے ہوشی کا خمار تھا۔ نیند کی حالت میں ایسا دھماکا یوں بھی اعصاب پر کافی اثر انداز ہوتا ہے جب کہ میرے اعصاب پر گزشتہ دو روز سے ویسے بھی کافی بوجھ تھا۔

دھماکے کی گونج ختم ہوتے ہی میں نے دونوں ہاتھوں کو کانوں سے ہٹا لیا۔

اس وقت چوکی کا افسر جینک اور دو پٹھان سپاہی وہاں پر موجود تھے۔ پولیس چوکی کا حوالات سے ملحقہ دفتر مٹی کے تیل کے لیمپ کی مدھم روشنی میں میرے سامنے تھا جب کہ میری حوالات اور دوشم خان کے سلاخ دار کمرے میں تاریکی تھی۔

عقبی دیوار میں ایک سوراخ ہو چکا تھا۔

دھماکے کی وجہ سے مٹی کا طوفان سا اٹھ کھڑا ہوا۔

تاریکی اور گرد کے اس سانس کا سلسلہ منقطع کر دینے والے بادل کی وجہ سے مجھے اپنے حلق میں خراش سی محسوس ہونے لگی اور میں کھانسے بغیر نہ رہ سکا۔۔۔ مجھے حیرت تھی کہ دوشم خان ڈاکو کے کمرے سے کوئی آواز کیوں نہیں آرہی ہے؟ کیا وہ اتنی ہی بے ہوشی کی نیند میں ڈوبا ہوا ہے کہ دھماکا اسے سنائی نہیں دیا۔ دوشم خان کے خیال سے دھماکے کی وجہ میری سمجھ میں آگئی تھی۔ یقیناً اس کے ساتھیوں نے حوالات توڑ کر اسے نکالنے کی کوشش کی تھی لیکن انہوں نے غلط دیوار سے بارود لگا دیا تھا۔

"اوہ۔۔۔ ڈاکو۔۔۔!" جینک کی آواز میرے کانوں تک پہنچی۔ وہ چیخ چیخ کر ان دو پٹھان سپاہیوں کو ہدایات دینے لگا جو اس وقت چوکی کے باہر پہرہ دے رہے تھے۔

دیوار میں جو سوراخ نظر آرہا تھا، وہ میری آزادی کا راستہ تھا جو مجھے نکل جانے کی دعوت دے رہا تھا۔ میں نے دونوں ہاتھ سمیٹے اور پھر انہیں اس انداز میں سامنے پھیلا لیا جیسے میں پانی میں غوطہ لگانے جا رہا ہوں۔ اس سوراخ سے نکل کر میں دوسری جانب جا گرا۔

میری ہتھیلیاں زمین سے ٹکرا گئیں۔۔۔ پھر میں نے پھرتی سے کروٹ بدل لی اور میرا جسم کچھ دور تک زمین پر لڑھکتا چلا گیا۔ دھوئیں کی وجہ سے میری آنکھیں جل رہی تھیں۔ دھوئیں بھی ایسی کہ اس میں بارود کی آمیزش تھی۔ میں نے سنبھلتے ہی ادھر ادھر دیکھا۔ پہلے تو آس پاس کوئی نظر نہ آیا۔۔۔ پھر تاریکی میں تین سائے نظر آنے

نامور مصنف محمود احمد مودی
وہی تحریر اور وہی انداز
کے ساتھ' اپنے چاہنے والوں
کے لئے ایک نئی سوغات لئے
نجات
PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk
مکتبہ القریش
سرکلر روڈ اردو بازار لاہور
7668958

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لگے۔ کچھ فاصلے پر تین گھڑ سوار موجود تھے۔

ایک گھڑ سوار نے گھوڑا دوڑایا اور مجھ سے کچھ فاصلے پر رک گیا
"تم دُوشم خان نہیں ہو۔" لہجہ کھُردرا اور زبان پشتو تھی۔ میں نے گھڑ سوار کے لہجے میں حیرت کا تاثر محسوس کر لیا تھا۔ انہوں نے واقعی دُوشم خان کو آزاد کرانے کے لیے دیوار توڑی تھی لیکن غلط دیوار میں سوراخ کرنے کی وجہ سے مجھے آزاد ہونے کا موقع مل گیا تھا۔

میرا اندازہ درست ہی تھا۔ وہ دُوشم خان ہی کے ساتھی تھے۔

"رائفل مجھے دے دو۔" میں نے سخت اور تحکمانہ لہجے میں کہا۔

گھڑ سوار کے انداز میں ہچکچاہٹ تھی۔ میں نے وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھتے ہوئے اس کے گھوڑے کی زین سے بندھی ہوئی رائفل کو کھینچ لیا۔ رائفل ہاتھ میں آتے ہی میں نے پولیس چوکی اور اس کے برابر والے مکان کی درمیانی گلی میں دوڑ لگا دی۔

پولیس چوکی اور سرائے کے درمیان نکلنے کے بجائے میں رک گیا۔ دیوار کی آڑ میں رک کر میں نے بازار میں دیکھا۔ وہاں سناٹا تھا اور سوائے دو سپاہیوں کے کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ چترپال کی آبادی ابھی تک نیند کے مزے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ میں نے اوپر تلے دو فائر کیے۔

دونوں سپاہی گر گئے۔

اچانک کھڑکیاں اور دروازے کھلنے لگے۔

میں نے رائفل لہرائی اور للکارا: "کوئی باہر نہ آئے ورنہ زندہ نہیں رہے گا۔" میری گرج دار آواز کے جواب میں دھڑا دھڑ کھڑکیاں اور دروازے بند ہونے لگے۔ میں تیزی سے آگے بڑھا۔

ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔

اب پولیس چوکی میں انگریز افسر ہینک کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ اس کا معاون ڈورک نہ جانے سرِ شام ہی کہاں چلا گیا تھا اور اس کی واپسی ابھی تک عمل میں نہیں آئی تھی۔ میں دروازے کی طرف لپکا اور ٹھوکر مار کر اُسے کھول دیا۔

رائفل لیے میں چوکی کے دفتر میں گھس گیا۔

انگریز افسر ہینک اس وقت سلاخ دار دروازے کے سامنے کھڑا اندر جھانک رہا تھا اور غالباً تاریکی کی وجہ سے وہ یہ دیکھنے میں کامیاب نہیں ہو رہا تھا کہ کوئی قیدی فرار ہو گیا ہے یا نہیں۔ باہر کے دھماکوں پر بوکھلاہٹ میں اس نے توجہ ہی نہیں دی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ یہاں سرکار کے آدمیوں کی بہتات نہیں تھی۔

دروازہ کھلنے کے دھماکے نے ہینک کو چونک کر پلٹنے پر مجبور کر دیا۔

"اوہ... تو یہ تمہارے ساتھی ہیں؟" اس نے غصے سے کہا اور ہاتھ ریوالور کی طرف بڑھایا ہی تھا کہ میری رائفل کی نال اٹھ گئی اس کا ہاتھ جہاں کا تہاں رک گیا۔ "تم فرار نہیں ہو سکتے۔"

"فرار تو میں ہو رہا ہوں..." میں نے ہنس کر کہا۔ "اور میرے ہاتھ میں جب تک رائفل موجود ہے، تم یا تمہارے آدمی مجھے نہیں روک سکتے... اور چترپال کے لوگوں کو کسی انگریز افسر سے زیادہ ایک پٹھان ڈاکو سے ہمدردی ہو سکتی ہے۔"

"مگر اس وقت دُوشم خان کے ساتھیوں نے یہاں گھیرا ڈال رکھا ہے تو یقین کرو وہ تمہیں بھی قتل کر دیں گے۔"

میں نے لبلبی دبا دی۔

گولی کا دھماکا ہوا لیکن یہ ایک پرانی طرز کی رائفل تھی اس لیے میرا نشانہ خطا گیا۔ میں نے گولی ہینک کے دل کا نشانہ لے کر چلائی تھی لیکن زخمی اس کا کندھا ہوا۔ وہ گر گیا۔ اس نے گرتے گرتے ریوالور نکال لیا تھا لیکن کندھا زخمی ہونے کے بعد اس کی انگلیوں میں جان ہی نہ رہی... اور ریوالور اس کی بے جان انگلیوں کی گرفت سے نکل کر زمین پر گر گیا۔

میں نے اس کا ریوالور اٹھایا۔ یہ برطانوی ساخت کا ایک اچھا ریوالور تھا۔ وہ زمین پر پڑا تڑپتا رہا اور میں تیزی سے چوکی کے دفتر میں آ گیا۔ چابیوں کا گچھا سامنے ہی دیوار سے ٹنگا ہوا تھا۔ اُسے اتار کر میں نے لوہے کی وہ الماری کھول لی جس میں گزشتہ روز ہینک نے میرا تھیلا اور دوسرا سامان رکھا تھا۔ میں نے جلدی جلدی اپنی تمام اشیا سمیٹ لیں اور حوالات کی طرف دیکھا۔

دُوشم خان سلاخوں کو دونوں ہاتھوں میں جکڑے مجھے گھور رہا تھا۔

"تم بھی میرے ساتھ چل رہے ہو، دُوشم خان؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں... تم تنہا فرار نہیں ہو سکتے۔" وہ غرایا۔ "میرے ساتھیوں کو اندازہ ہو چکا ہے کہ میں زندہ ہوں۔ اگر میں تمہارے ساتھ نہ ہوا تو وہ تمہاری کوئی مدد نہیں کریں گے۔"

"اب مجھے کسی کی مدد کی ضرورت بھی نہیں ہے۔" میں نے کہنے کو تو کہہ دیا لیکن یہ خیال فوراً ہی میرے ذہن میں آیا کہ میرا گھوڑا تو باہر کہیں نظر نہیں آ رہا....... ایسے میں مجھے فرار ہونے کے لیے ان ڈاکوؤں کے ساتھ ہی جانا پڑے گا۔ میں نے تین گھوڑے دیکھے تھے اور دُوشم خان کا کہنا بھی درست تھا۔ اس کے ساتھی واقعی مجھے ساتھ نہ لے جاتے۔

چابیوں کا گچھا ابھی تک میرے ہاتھ میں تھا۔

دروازے میں جو بڑا سا تالا لگا ہوا تھا، اس کی لمبی سی چابی تھی۔ میں نے جلدی جلدی اُسے آزمایا۔ اتفاق سے وہی چابی تھی۔ تالا فوراً کھل گیا۔

"تم احمق ہو شیار خان۔" ہینک نے کراہتے ہوئے کہا۔

میں نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔

اس کے زخمی کندھے سے خون بہہ بہہ کر زمین کو سرخ کر رہا تھا اور وہ زمین پر کسی ڈھیر کی طرح پڑا میری طرف دیکھ رہا تھا۔

"ان ڈاکوؤں کا کوئی اعتبار نہیں۔" ہینک نے ایک بار پھر مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔ "یہ تمہیں قتل کر دیں گے۔ اگر تم رک جاؤ اور دُوشم خان کو بھی فرار نہ ہونے دو تو یہ ایک ایسا کارنامہ ہوگا جس کا سرکار تمہیں انعام دے سکتی ہے۔ میں تمہاری سفارش کر دوں گا... اسے آزاد نہ کرو۔"

میں نے نفرت سے زمین پر تھوک دیا۔

"تمہاری سرکار سے کوئی انعام حاصل کرنے کی بجائے میں اپنے ہی جیسے کسی پٹھان ڈاکو کے ہاتھوں مرنے کو ہزار بار پسند کروں گا۔" میں نے کہا اور ایک جھٹکے سے سلاخ دار دروازہ کھول دیا۔ "باہر کے دروازے کا دھیان رکھو۔" میں نے دُوشم خان کو حکم دیا۔

"کیا...؟" دُوشم خان کی آنکھوں میں حیرت پیدا ہو گئی۔

غالباً اُسے میرا اندازِ تخاطب پسند نہیں آیا تھا۔

"دروازے کا دھیان رکھو۔" میں نے مزید سخت لہجے میں کہا اور میان سے اپنا خنجر نکال کر انگریز افسر ہینک کی طرف متوجہ ہو گیا۔ "میں انگریزوں کے خلاف ایک نئی جنگ کا آغاز کر چکا ہوں... اب میرے ہر شکار پر سرکار کے لیے ایک مخصوص نشان ہوگا۔" یہ کہہ کر میں ہینک کی طرف جھک گیا۔

اس کی آنکھوں سے دہشت ٹپکنے لگی۔

اچانک باہر سے فائرنگ شروع ہو گئی۔

گولیاں سنسناتی ہوئی اندر آنے لگیں۔ ایک گولی میز پر لگی اور اس پر رکھا ہوا شیشہ چکنا چور ہو گیا۔ میں نے دُوشم خان کے ساتھی سے حاصل کی ہوئی رائفل اٹھا کر اس کی طرف پھینک دی اور وہ رائفل لے کر بیرونی دروازے کی طرف دوڑ پڑا۔

"تم... تم... میرے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہتے ہو؟" انگریز افسر نے دہشت میں ڈوبی ہوئی آواز میں سوال کیا۔

"وہی جو ایک غیرت مند پٹھان کو کسی سفید سُوّر سے کرنا چاہیے۔" میں نے قہقہہ لگا کر کہا اور خنجر لیے اس کی طرف جھک گیا۔ ایک لمحے کے لیے میرا ہاتھ اٹھ کر گرا اور خنجر اس کے دل تک اتر گیا۔ اس کی چیخ بڑی بھیانک تھی... لیکن اگلے ہی لمحے اس کا جسم بے حس و حرکت ہو گیا تھا۔ میں نے خنجر کھینچ لیا اور پھر اس کی پیشانی پر خنجر کی نوک سے "پانوشش" لکھ دیا۔

کتنا سکون محسوس ہوا تھا اس وقت مجھے... ایک لمحے کے لیے یوں محسوس ہوا جیسے میرے دل سے کوئی بہت بڑا بوجھ ہٹ گیا ہو۔

"اوہ... وہ مارا!" دروازے کی طرف سے للکار سنائی دی۔ "میں نے ایک کو چت کر دیا ہے۔" دُوشم خان کہہ رہا تھا۔ "باہر اب صرف ایک آدمی ہے۔"

میں نے ہینک پر الوداعی نگاہ ڈالی۔ اس کی پیشانی پر اپنے چھوٹے بھائی پانوشس کا نام کندہ کرنے میں میں نے جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ جہاں جہاں خنجر کی نوک نے اس کی پیشانی کے ماتھے کو کاٹا تھا، وہاں اب خون بھر گیا تھا۔

"لو... دوسرا بھی گیا۔" دُوشم خان کا نعرہ سنائی دیا۔

ایک دھماکا ہوا۔

باہر سے درد میں ڈوبی ہوئی ایک آواز ابھر کر معدوم ہو گئی۔

وہ دوڑتا ہوا اندر آیا... پھر ہینک کی طرف دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ "یہ تم نے اس کے ماتھے پر کیسا نشان بنایا ہے؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"پانوشس..." میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

"میں اَن پڑھ ہوں۔" دُوشم خان نے مسکرا کر کہا۔ "لیکن یہ نشان اس سفید سُوّر کے ماتھے پر کتنا اچھا لگ رہا ہے۔ تم واقعی ایک عجیب نوجوان ہو۔"

"آؤ چلیں! ایسا نہ ہو کہ انگریزوں کے خوف سے چترپال کی پوری آبادی ہمیں گرفتار کرنے کے لیے سامنے آ جائے۔ ابھی تو سب لوگ اپنے اپنے گھروں میں دبکے ہوئے ہیں لیکن جلد ہی سب کو احساس ہو جائے گا کہ اُن کا یوں غیر جانب دار رہنا ان کی بقا کے لیے مسئلہ بن جائے گا۔"

میں تیزی سے اس حوالات کی طرف دوڑا جس میں کچھ دیر قبل مجھے قید رکھا گیا تھا۔ اب چوکی کے سامنے والے دروازے سے نکلنا خطرناک ہو سکتا تھا اس لیے عقبی دیوار کے سوراخ سے نکلنا ہی مناسب تھا۔

میں نے سوراخ سے باہر چھلانگ لگا دی۔

دُوشم خان ایک جسیم آدمی تھا، وہ اس سوراخ میں پھنس گیا۔ مجبوراً مجھے اس کو کھینچ کر نکالنا پڑا۔ ہمیں باہر آتے

دیکھ کر وہ تینوں گھڑسوار بھی گھوڑے دوڑاتے ہوئے قریب آ گئے ... ہو ان میں سے ایک نے شکایت آمیز لہجے میں کہا: "تم نے باہر آنے میں بہت دیر لگا دی۔"

"بکواس مت کرو۔" دُوشم خان غُرایا۔ "میں اندر کسی رنڈی کے پاس نہیں گیا تھا۔ تم لوگوں نے غلط حوالات توڑ دی تھی۔"

"چلو... اب جلدی سے چلو... بازار میں لوگ جمع ہو رہے ہیں۔"

اسی دوران میری نگاہ چوتھے گھوڑے پر پڑی جو کچھ فاصلے پر تھا۔ میں تیزی سے اس کی طرف بڑھا تو عقب سے ایک ڈاکو نے للکارا: "یہ گھوڑا ہم دُوشم خان کے لیے لائے ہیں۔ تم اپنا کوئی اور بندوبست کر لو۔"

"تم نے غلط حوالات توڑی تھی۔" میں نے پلٹ کر کہا۔ "اگر میں دُوشم خان کو آزاد نہ کراتا تو تمہارے فرشتے بھی اسے یہاں سے نہیں نکال سکتے تھے۔ اس لیے دُوشم خان کو آزاد کرانے کا سہرا میرے سر بندھتا ہے۔"

"گھبرانے کی ضرورت نہیں!" دُوشم خان نے جلدی سے کہا۔ "میں، تمہارے ساتھ بیٹھ جاؤں گا۔" اس کے انداز میں گھبراہٹ تھی جیسے وہ اس بحث کو مزید طول دے کر وقت ضائع نہ کرنا چاہتا ہو۔

"تم ادھر میرے ساتھ آ جاؤ۔" ایک ڈاکو نے کہا۔ "میرا گھوڑا زیادہ مضبوط اور تازہ دَم ہے۔"

میں نے چرمی تھیلا اسی شخص کے گھوڑے کی زین سے باندھ دیا اور پھر اچھل کر اس کے پیچھے بیٹھ گیا۔ دُوشم خان نے یہ دیکھ کر چوتھے خالی گھوڑے کی طرف دوڑ لگا دی تھی۔ اس نے گھوڑے کی پشت پر سوار ہوتے ہوئے کہا: "کیا تم ہمارے ساتھ ہی چلنا چاہتے ہو، شاہیار خان؟"

"بہتر یہی ہو گا۔" ایک ڈاکو نے کہا۔ "ورنہ چند ہی لمحوں میں اسے چھلنی کر دیا جائے گا۔ بازار کی طرف غالباً کافی لوگ جمع ہو چکے ہیں۔"

میں نے سُنا... واقعی بازار کی طرف سے آوازیں آنا شروع ہو گئی تھیں اور غالباً کچھ لوگ رائفلیں سنبھالے چوکی میں بھی گھس پڑے تھے۔ اچانک مجھے اسی سوراخ میں کوئی نظر آیا جہاں سے میں اور دُوشم خان فرار ہوئے تھے۔ میں نے بڑی تیزی سے اس طرف فائر کیا تھا لیکن سوراخ کی دوسری جانب موجود آدمی اس وقت تک گولی چلا چکا تھا۔ سنسناتی ہوئی گولی ہمارے گھوڑے کی طرف ہی آئی۔ اس کے ساتھ ہی دوسرا فائر بھی ہوا۔

پہلی گولی نے میرے سامنے بیٹھے ہوئے ڈاکو کی ناک اُڑا دی اور اس کے چہرے پر نتھنوں کے سوراخ ہی باقی رہ گئے۔ دوسری اس کے کان میں گھسی اور پھر شاید دماغ تک پہنچ گئی۔ خون اس کے کان اور کھوپڑی کے عقبی حصے سے کسی چشمے کی طرح اُبل پڑا تھا۔ میں نے اُسے دھکا دے کر گرا دیا اور خود گھوڑے کی پشت پر جھک گیا۔ اگر مجھ سے ذرا سی بھی کوتاہی ہو گئی ہوتی تو تیسری گولی میری کھوپڑی کے پرخچے اُڑا چکی ہوتی۔

"نکل چلو...!" دُوشم خان دھاڑا۔ "مقابلہ کرنے کی ضرورت نہیں۔"

اس نے اپنے گھوڑے کو موڑا اور اسے ایک طرف دوڑانے لگا۔ عقبی حصے میں جھاڑیاں اور چٹانیں بکھری ہوئی تھیں۔ ہم اسی طرف اُتر گئے اور ہمارے گھوڑے جھاڑیوں کو روندتے ہوئے دوڑتے چلے گئے۔ عقب سے اب بھی گولیوں کے دھماکے سُنائی دے رہے تھے ... لیکن کسی نے ہمارا پیچھا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ دُوشم خان کا گھوڑا سب سے آگے تھا۔ میں اس کے پیچھے اور باقی دونوں ڈاکو میرے عقب میں گھوڑے دوڑاتے ہوئے چلے آ رہے تھے۔ جلد ہی ہم جھاڑیوں سے نکل کر ان چٹانوں کے قریب پہنچ گئے جہاں پہنچنے کے بعد ہمیں کسی طرف سے گولیوں کا نشانہ نہیں بنایا جا سکتا تھا۔

●

دُوشم خان ڈاکوؤں کے جس گروہ سے تعلق رکھتا تھا، اس کی کمین گاہ ایک تنگ سی گھاٹی میں واقع تھی۔ یہ پہاڑوں کا نشیبی علاقہ تھا اور ان نشیبی چٹانوں میں دریا بہتا تھا جس گھاٹی میں ڈاکوؤں کا مسکن تھا، اس کے دہانے پر ایک بڑا سا پتھر تھا۔ یہ درحقیقت ایک قدرتی چٹان تھی جس سے وہ تنگ سی گھاٹی سرسری نگاہ میں نظر نہیں آ سکتی تھی۔

ہم چاروں گھڑسوار رُک گئے۔

ایک سنسناتی ہوئی گولی آئی اور ہم سب کے سروں سے گزر گئی تھی۔

گھوڑوں کو یکایک روکنے سے بے پناہ شور پیدا ہوا — لگامیں سختی سے کھینچی گئی تھیں۔ گولی کا دھماکا اس بات کی تنبیہ تھا کہ اپنی شناخت کرائے بغیر... آگے نہیں بڑھنا چاہیے۔ گھوڑے اچانک رُکے تو بُری طرح ہانپنے لگے۔

چاروں گھوڑے ایک ساتھ ہنہنائے تھے اور انہوں نے ٹاپیں مارنا شروع کر دی تھیں۔ میرے گھوڑے کی دُم تیزی سے گھومی اور مجھے اس کے بالوں کا لمس اپنی پشت پر محسوس ہوا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"رُک جاؤ... رُک جاؤ۔" دُوشم خان چیخ پڑا۔ "یہ ہم ہیں... دُوشم اور ساتھی۔" اس نے دہانے پر موجود چٹان کی طرف مُنہ کر کے کہا۔

ایک شخص رائفل ہاتھ میں لیے چٹان کی اوٹ سے نکل آیا۔ باہر آنے کے بعد اس نے باری باری ہم سب کو دیکھا... پھر اس کی نگاہ مجھ پر جم گئی۔ اس کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے چمک لہرائی۔ اجنبیت اور شبہے کی پرچھائیاں سی رقص کرتی محسوس ہو رہی تھیں۔

"یہ کون ہے؟" پہرے دار نے رائفل کی نال میرے سینے کی طرف اُٹھا کر پوچھا۔

"اسے یوسف خان سے ملوانا ہے۔" دُوشم نے جواب دیا۔

"کیوں...؟"

"ہو سکتا ہے، یہ ہمارا نیا ساتھی بن جائے۔"

"اندر سے منظوری کے بغیر آگے نہیں جا سکتا۔"

"بکواس مت کرو۔" دُوشم خان کے نتھنے غصے سے پھولنے اور پچکنے لگے۔ "یہ ہم تینوں کے ساتھ جا رہا ہے۔ کیا تم ہم تینوں کو قابلِ اعتماد نہیں سمجھتے؟"

سورج طلوع ہو چکا تھا اور دھوپ پھیلنے لگی تھی۔ زرد زرد سی دھوپ ان چٹانوں پر پگھلے ہوئے سونے کی طرح چمک رہی تھی۔ پہرے دار نے چند لمحوں تک سوچا پھر کندھے اُچکا دیے۔

"ٹھیک ہے... لیکن اس کی ذمے داری تم تینوں پر ہو گی۔" اس نے کہا اور رائفل کا رُخ پھیر دیا... پھر ہاتھ کے اشارے سے ہمیں آگے بڑھنے کی اجازت دے دی۔

دُوشم خان نے گھوڑا بڑھا دیا۔

ہم تینوں ایک قطار میں اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ گھوڑوں کی یہ قطار گھومتی ہوئی اس چٹان کی اوٹ میں پہنچی تو میں نے دیکھا کہ سامنے دو پہاڑوں کے درمیان ایک تنگ سا درہ ہے۔ اس درے سے ایک وقت میں صرف ایک ہی گھوڑا گزر سکتا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہیں مجھ سے ان لوگوں کے ساتھ آنے میں غلطی تو نہیں ہو گئی؟ غلطی تھی یا نہیں... مجھے ان کے ساتھ مجبوراً آنا پڑا تھا کیوں کہ میرے پاس گھوڑا نہیں تھا۔ معلوم نہیں مجھے گرفتار کرنے کے بعد ان لوگوں نے میرا گھوڑا کہاں لے جا کر باندھ دیا تھا... اور گھوڑے کے بغیر اس سرحدی علاقے میں میرے لیے ایک روز بھی زندہ رہنا محال تھا۔

میرے پاس طلائی سِکّوں کا چرمی تھیلا تھا اور اس بات سے صرف دُوشم خان ہی واقف تھا... اس شخص کے بارے میں مجھے زیادہ تو پتا نہیں تھا لیکن اتنا ضرور اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ ایک لالچی اور خود غرض آدمی ہے۔ ظاہر ہے اگر وہ فطرتاً ایسا نہ ہوتا تو اُسے ڈاکو بننے کی کیا ضرورت تھی۔

درّہ آگے جا کر پھیل گیا۔

سامنے ایک پیالہ نما میدانی جگہ تھی۔ چاروں طرف سے چٹانوں نے اس میدانی حصے کو ڈھانپ رکھا تھا۔ درختوں کی بہتات تھی اور یہاں سے دریا کے بہاؤ کی آواز بھی سُنی جا سکتی تھی۔ ان ڈاکوؤں نے واقعی ایک بہترین اور محفوظ ترین کمین گاہ بنا رکھی تھی۔ اگر میں دُوشم خان اور اس کے ساتھیوں کے ہمراہ نہ آتا تو شاید اس جگہ کے گرد کئی روز تک گھومتا رہتا، تب بھی مجھے اس کمین گاہ کا پتا نہ چلتا۔

ہولناک اور پراسرار ماحول میں جنم لینے والی ایک حقیقت جو کہانی بن گئی

ایک ... تلِ عبرت جسے قانون نے

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

میدانی حصے میں درختوں کے درمیان ایک جھونپڑا تھا۔ جس کی دیواریں چوبی تھیں اور چھت پر گھاس پھونس پڑا ہوا تھا۔ اس جھونپڑے کا دروازہ اور اکلوتی کھڑکی اس وقت بند نظر آ رہی تھی۔ جھونپڑے کے چاروں طرف، کچھ فاصلہ رکھ کر گھاس پھونس کے گٹھڑ اوپر تلے رکھے ہوئے تھے... اور ان پر کرخت چہرے اور خونخوار آنکھوں والے آدمی براجمان تھے۔

سیاہ شلواروں اور سیاہ قمیصوں میں ملبوس ہر شخص چہرے سے خوفناک لگ رہا تھا۔ اس سے پہلے مجھے کسی ڈاکوؤں کے گروہ کو دیکھنے کا موقع نہیں ملا تھا اس لیے الجھن سی ہونے لگی۔ ہر ڈاکو کے سینے پر کارتوسوں سے بھری ہوئی پیٹیاں تھیں اور ان کی رائفلیں کندھوں سے لٹکی ہوئی تھیں۔

میں نے سرسری نگاہ سے ان کی تعداد کا اندازہ لگانے کی کوشش کی۔ وہ چاروں طرف بکھرے ہوئے تھے اس لیے ان کی تعداد کا تعین کرنا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ تین ڈاکو ایک طرف بیٹھے زمین پر چھوٹی چھوٹی کنکریاں رکھے کسی کھیل میں مصروف تھے۔ وہ کسی طرح بحث بھی کرتے جا رہے تھے... گھوڑوں کی ٹاپیں سن کر انہوں نے کھیل ادھورا چھوڑ دیا اور ہماری طرف دیکھنے لگے۔

میں نے ایک ڈاکو کی طرف دیکھا جو سب سے الگ تھلگ لیٹا غالباً سو رہا تھا۔ اس نے شاید گھوڑوں کی ٹاپیں نہیں سنی تھیں یا پھر اس نے ان آوازوں کو کوئی اہمیت ہی نہیں دی تھی۔

یہ ڈاکوؤں کا ایک بہت بڑا گروہ تھا۔

انگریزوں کو اس علاقے میں جس قدر نقصان سے دوچار ہونا پڑا تھا، اس کی وجہ سمجھ میں آتی تھی۔ اس گروہ کا سردار میرے خیال میں تو دُوشم خان تھا لیکن اس نے گھاٹی میں داخل ہونے سے پہلے کسی یوسف خان کا نام لیا تھا۔ اس نام سے مجھے اپنا دوست یوسف یاد آ گیا جو میرے آنے کے بعد نہ جانے کس حال میں ہوگا؟

دُوشم خان پر نگاہ پڑتے ہی دو تین ڈاکوؤں نے نہایت فحش الفاظ میں اس کا استقبال کیا۔ دُوشم اس وقت بے حد مسرور لگ رہا تھا۔ وہ ان کی طرف دیکھ کر ہاتھ سے اشارے کرنے لگا گویا غلیظ الفاظ کا قابلِ اعتراض اشاروں سے جواب دے رہا ہو... اور پھر تب شاید ان لوگوں کو پہلی بار احساس ہوا کہ دُوشم خان کے ساتھ ایک اجنبی بھی ہے۔

اب سب ڈاکو مجھے گھور رہے تھے۔

فضا میں یکایک خاموشی چھا گئی تھی۔

ہوا سے متحرک پتوں کی کھڑکھڑاہٹ، دریا کے بہاؤ کی ٹوں ٹوں اور گھوڑوں کی کبھی کبھار کی ٹاپوں یا ہنہنانے کے سوا اب کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ایک ڈاکو دوڑا اور جھونپڑے کے دروازے پر پہنچا اور چیخ کر بولا "یوسف خان... یوسف خان! ہمارے ساتھی آ گئے ہیں۔"

آواز کے جواب میں فوراً ہی دروازہ کھل گیا۔

ایک لمبا تڑنگا آدمی دروازے میں کھڑا تھا۔

اس کی مونچھیں دونوں طرف سے جھکی ہوئی تھیں اور انہوں نے ٹھوڑی کے گرد گھوم کر عجیب سی شکل اختیار کر لی تھی میں نے اتنا لمبا تڑنگا آدمی پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں سرخی تھی اور چہرہ یوں دہک رہا تھا جیسے اس کے جسم میں خون کی بجائے لاوا بھرا ہوا ہو۔

وہ براہِ راست میری ہی طرف دیکھ رہا تھا۔

میں نے بھی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ چند لمحوں تک ہم ایک دوسرے کو اسی انداز میں دیکھتے رہے... پھر اس کے ہونٹ پھیل گئے اور نوکیلے دانتوں کی قطاریں جھانکنے لگیں۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ مسکرایا تھا یا کسی اور وجہ سے اس کی باچھوں نے پھیل کر دانت نمایاں کر دیے تھے۔ اس کی آنکھوں میں البتہ خفیف سی بھی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس کا نام یوسف خان کی بجائے نفرت خان ہو۔

دُوشم خان گھوڑے سے کود گیا۔

میں بھی آہستہ سے اتر آیا۔

ڈاکوؤں نے ہمیں گھیرے میں لے لیا۔ سب کی متجسس نگاہیں میرے بارے میں معلوم کرنے کے لیے بے چین تھیں۔ دُوشم خان کے وہ دونوں ساتھی جو ہمارے ساتھ آئے تھے انہوں نے چاروں گھوڑوں کی لگامیں تھام لیں اور انہیں لے کر اس طرف بڑھ گئے جہاں باقی گھوڑے کھڑے تھے۔

میں نے انگریز افسر سے چھینے ہوئے ریوالور کو ٹٹولا اور جھونپڑے کے دروازے میں کھڑے یوسف نامی اس سردار کی طرف دیکھتا رہا۔ جس نے غالباً ابھی میرا پوری طرح جائزہ نہیں لیا تھا۔ اس کی آنکھیں اب بھی مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔

"تم کون ہو اجنبی؟" اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پہلا سوال کیا۔

"اس کا نام شالیار ہے... شالیار خان۔" دُوشم نے جلدی سے کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"تم خاموش رہو۔" سردار نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ انداز کسی کٹکھنے کتے جیسا پھاڑ کھانے والا تھا۔ "کیا یہ گونگا ہے؟ یا اس کی سماعت کمزور ہے؟"

"اس نے میرا نام درست ہی بتایا ہے، سردار۔" میں نے جواب دیا۔ "دراصل ہم دونوں ایک ہی حوالات میں تھے۔ چیرپال کی اس حوالات پر تمہارے آدمیوں نے دھاوا کیا تو انہوں نے غلطی سے میری حوالات کی عقبی دیوار میں شگاف پیدا کر دیا۔ میں فرار ہوا تو میں نے دُوشم خان کو بھی رہا کرا لیا..."

"تمہارا مطلب ہے، اگر تم دُوشم خان کو آزاد نہ کرواتے تو یہ ابھی سفید سؤروں کی قید میں ہوتا؟" اس نے نخوت سے سوال کیا۔

"میرا دعویٰ ہے کہ یہ تینوں اسے آزاد نہیں کرا سکتے تھے۔" میں نے کہا۔ "انہوں نے اگر اسی حوالات کی دیوار میں شگاف پیدا کیا ہوتا تو البتہ دوسری بات تھی۔"

"وزیرو کہاں ہے، وہ نظر نہیں آ رہا؟"

"اگر تمہاری مراد اس تیسرے آدمی سے ہے تو مجھے افسوس ہے کہ وہ ہلاک ہو گیا ہے۔ چلتے وقت چیرپال کے چند مقامی جوکی میں گھس آئے تھے۔ ان میں سے ایک کی فائرنگ اسے چاٹ گئی۔"

"ہوں..." سردار نے کہا اور دُوشم خان کی طرف متوجہ ہو گیا۔ "اب بتاؤ، تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

دُوشم خان نے میری گرفتاری اور حوالات میں ہونے والی ایک ایک بات تفصیل سے سردار کے گوش گزار کر دی اور کہا۔ "یہ ایک خطرناک اور دلیر آدمی ہے، سردار۔ اس نے اُس سفید سؤر کے ماتھے پر کچھ لکھ دیا تھا۔ یہ کہتا ہے کہ گوروں کو شکار کر کے اپنا نشان ان کی پیشانی پر ڈال کر اسے سکون ملتا ہے۔"

"ہوں... کیا تم اس شخص کی طرف سے پوری طرح مطمئن ہو؟"

"ہاں... اسی لیے میں اسے ساتھ لیتا آیا ہوں۔"

دُوشم خان نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا اور میری طرف دیکھ کر مسکرانے لگا۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔

میں اب تک پوری توجہ سے اس کی ایک ایک بات سن رہا تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ اس نے ان طلائی سکوں کا تذکرہ کیوں نہیں کیا جو میرے پاس تھے اور جن کے بارے میں اُسے اچھی طرح معلوم تھا۔ اچانک مجھے اس کے بدلے بدلے سے نقش و نگار میں مکاری جھلکتی محسوس ہونے لگی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ اس چرمی تھیلے کو بھولا نہیں ہے بلکہ اس نے دانستہ یہ بات سردار اور اپنے ساتھیوں سے چھپائی ہے۔

"کیا تم ہمارے گروہ میں شامل ہونا چاہتے ہو؟" سردار نے میری طرف دیکھا۔

"اس کا انحصار حالات پر ہے۔"

"کس کے حالات؟" وہ ناگواری سے بولا۔ "حالات کو ذہن میں رکھنے والے کبھی ڈاکو نہیں بن سکتے۔ ڈاکو ہر حال میں ڈاکو ہی ہوتا ہے۔ تمہارے چہرے اور انداز سے مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ تم ان سفید سؤروں کے ساتھ کافی عرصے تک رہ چکے ہو۔"

"میں نے کچھ عرصے تک فوج میں نوکری کی ہے۔"

"غلامی..." وہ دھاڑا۔ "نہیں... تم ڈاکو نہیں بن سکتے۔"

"ڈاکو بنانے سے پہلے تم نے انسان کی آزمائش کا کوئی پیمانہ بنا رکھا ہے؟"

"ہاں... اور اس پیمانے پر پورا اترنے کے بعد ہی تم ہمارے ساتھی بن سکتے ہو۔" سردار نے کہا۔ "کل تمہارا امتحان ہوگا۔ اب تم آرام کر سکتے ہو۔"

میں نے تعظیماً جھک کر توجہ دُوشم خان کی طرف کر لی... لیکن اسی لمحے عقب میں گھوڑے کی ٹاپیں ابھریں۔ میں نے پلٹ کر دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔

وہ ایک حسین لڑکی تھی۔

اس کے بال چھوٹی چھوٹی چوٹیوں میں گندھے ہوئے تھے اور چند چوٹیاں اس کے سینے تک ڈھلک آئی تھیں۔ اس کے ہونٹ خوب سرخ سرخ تھے۔ وہ قریب آ کر گھوڑے سے کود گئی۔ میں نے کن انکھیوں سے سردار کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں اب بے پناہ ملائمت تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اس لڑکی کو دیکھ کر وہ درندگی کا چولا اتار پھینکنے پر مجبور ہو گیا ہو۔

"میرا شبہ غلط نہیں تھا یوسف خان!" اس نے سردار کی طرف دیکھ کر مترنم آواز میں کہا لیکن اس کے لہجے میں بے پناہ غرور اور سفاکی تھی۔ "مجرم اور دھوکے باز فروانت ہی ہے۔ اسی نے مخبری کی تھی۔"

"مہروجانہ..." سردار نے مٹھاس بھری آواز میں کہا۔

"بس بس!" لڑکی نے اشتعلا کر کہا۔ "تمہیں تو میری بات پر یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ یہ رہا وہ رومال جس پر فروانت خان نے اطلاع لکھ کر وہاں گرا دی تھی۔ اگر یہ ایسا نہ کرتا تو رات ہمیں ناکامی نہ ہوتی۔" لڑکی مہروجانہ نے رومال اس کے پیروں میں پھینک دیا۔

سردار نے رومال اٹھا لیا۔

چند لمحوں تک وہ اس سفید ریشمی رومال کو گھورتا رہا...

پھر اس نے وہی رُومال قریب کھڑے ایک ساتھی کی طرف بڑھا دیا۔ وہ خوفناک چہرے والا ڈاکو چند لمحے رُومال کو گھورنے کے بعد اپنے برابر کھڑے شخص کی طرف دیکھنے لگا۔ اس نے اثبات میں سر ہلا یا۔

"میں اسے ایسی عبرتناک سزا دوں گا کہ..." سردار نے کہا لیکن اس کی بات ادھوری ہی رہ گئی کیونکہ مہرو جانہ نے جھک کر اپنے پیروں تک لٹکے ہوئے لباس کو اُٹھایا تھا اور اگلے ہی لمحے اس کے ہاتھ میں ایک تیز دھار خنجر چمک رہا تھا۔ سردار اس خنجر کو گھورنے لگا... پھر ہنس پڑا۔ "ٹھیک ہے! وہ تمہارا شکار ہے۔"

مہرو جانہ کے ہونٹوں پر بڑی جان دار مسکراہٹ اُبھر آئی۔

وہ اب تک پہلی بار مسکرائی تھی۔

اس کی مسکراہٹ میں نہ جانے کیا تھا کہ میری دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگیں۔ میں اب بھی کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دُرشم خان اس وقت میرے قریب ہی کھڑا تھا۔ اس نے میری پسلیوں میں کہنی مارتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔ "اس فتنے کی طرف مت دیکھو... اس کا دوسرا نام موت ہے۔"

اُسی لمحے مہرو جانہ نے اطراف میں نگاہ ڈالی تو اس کی آنکھیں مجھ پر آ کر رُک گئیں۔ چند ساعتوں تک وہ میری طرف دیکھتی رہی... پھر اس نے سوالیہ نظروں سے سردار کی طرف دیکھا یوسف خان اُسے میرے بارے میں بتانے لگا۔

"خوب... تو تم ہمارے ساتھی بننا چاہتے ہو؟"

وہ پلٹ کر میری طرف دیکھتی ہوئی بولی۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔

"کیا تم گونگے ہو؟" وہ غرائی۔

"نہیں..." میں نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔

"پھر بولتے کیوں نہیں؟" وہ تلملا کر بولی۔

"میں فضول گوئی کو پسند نہیں کرتا۔"

چند لمحوں تک اس کی آنکھوں میں قہر و غضب کے شعلے رقص کرتے رہے... پھر صرف اس کے ہونٹ مسکرا اُٹھے۔ "تمہارا امتحان شاید کل ہو گا... اس دوران میں آؤ میں تمہیں دکھاؤں کہ غداروں کی ہمارے ہاں کیا سزا ہوتی ہے۔"

وہ خنجر بکف آگے بڑھ گئی۔

سردار یوسف اس کے پیچھے کسی وفادار اور پالتو کُتّے کی طرح چل رہا تھا۔

دُرشم خان نے مجھے ٹھوکا دیا تو میں بھی دوسرے ڈاکوؤں کے ساتھ ان کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ میرا ذہن اس لڑکی میں اُلجھ گیا تھا۔ اب تک جو صورتِ حال سامنے آئی تھی اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ سردار یوسف کی منظورِ نظر ہے... لیکن میں نے یہ بھی محسوس کر لیا تھا کہ گروہ کا ہر فرد اُسے محبت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور اس کے ایک اشارے پر جان کی بازی لگانے سے بھی دریغ نہیں کرے گا۔

"یہ فردانت خان کون ہے؟" میں نے دھیمی آواز میں پوچھا۔ "اور یہ قاتلہ اس پر کیا ستم ڈھانا چاہتی ہے؟"

"کل ایک بہت بڑی واردات ناکام ہوئی ہے اور مہرو جانہ کا خیال تھا کہ فردانت خان نے انگریز سرکار کو مُخبری کی ہے آج یہ وہ ثبوت بھی لے آئی ہے۔ میرا خیال ہے، اس شخص کو پھانسی دے دی جائے گی۔ اس گروہ کا اصول ہے کہ غداروں کو موت کی سزا دیتا ہے۔"

"تمہیں ایک گھوڑا خریدنا پڑے گا۔" یوسف خان نے چلتے چلتے رُک کر میری طرف پلٹتے ہوئے کہا۔ "اتفاق سے زرد رنگ کا گھوڑا اس وقت برائے فروخت ہمارے پاس موجود ہے۔ کیا تم اسے خرید سکتے ہو؟"

"میرا خیال ہے کہ میں وہ گھوڑا خرید لوں گا۔" میں نے بلند آواز میں جواب دیا اور یوسف خان اثبات میں سر ہلاتا ہوا ایک بار پھر آگے چلنے لگا۔

میں نے محسوس کیا کہ ڈاکوؤں میں سے ہر شخص کن انکھیوں سے میری طرف متوجہ ہے۔ سب لوگ چلتے چلتے جھونپڑے کے عقبی حصے میں پہنچ گئے۔ یہ حصہ وہاں سے دکھائی نہیں دیتا تھا، جہاں ہم پہلے کھڑے تھے اس لیے میں اس شخص کو نہیں دیکھ سکا تھا جسے ایک درخت کے تنے سے باندھا ہوا تھا۔

اس شخص کی عمر تیس کے لگ بھگ ہو گی۔

دہشت اس کی آنکھوں سے جھلک رہی تھی اور اس کا چہرہ کفن کی طرح سفید تھا۔ اس کی پشت درخت کے تنے سے لگی ہوئی تھی اور اس کے دونوں بازوؤں کو عقب میں پھیلا کر تنے کی دوسری سمت میں باندھ دیا گیا تھا۔ اس کے مُنہ میں ایک سُرخ رُومال ٹھنسا ہوا تھا جس کی وجہ سے اس کے گال خوب پھولے پھولے لگ رہے تھے۔ اس کے ہونٹوں پر پیاس کی شدت سے پپڑیاں سی جمی ہوئی تھیں۔

وہ رحم طلب نگاہوں سے مہرو جانہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جس جگہ اُسے باندھا گیا تھا، وہاں قیدی کے دونوں طرف شوکھی گھاس کا ایک ایک گٹھڑ پڑا ہوا تھا۔ قیدی کی گردن کی رگیں پھولی ہوئی اور نمایاں تھیں جیسے بہت زیادہ چیخنے کی وجہ سے یہ رگیں اندر ہی اندر ناکارہ ہو کر رہ گئی ہوں۔ ظاہر ہے مُنہ میں ٹھنسے ہوئے رُومال کی وجہ سے آواز تو کسی کو سنائی نہیں دی ہو گی۔

"اس چوہے کے مُنہ سے رومال نکال دو۔" مہرو جانہ کی آواز گونجی۔

ایک ڈاکو نے بڑھ کر رومال نکالا۔

چند لمحوں تک قیدی کا دہانہ کھُلا ہی رہا۔ جیسے وہ اسے بند کرنے کی سکت نہ رکھتا ہو... پھر دھیرے دھیرے اس نے مُنہ بند کر لیا۔ اس کے انداز سے پتا چلتا تھا کہ اس کا حلق خشک ہو کر کانٹوں جیسی گزرگاہ بن گیا ہے۔

"فردانت..." مہرو جانہ کی آواز گونجی۔ "یہ ثابت ہو گیا ہے کہ تم غدار ہو۔ تم نے گوری چمڑی والے سؤروں سے سازباز کی اور ہمارے منصوبے کو خاک میں ملا دیا۔ تمہارا جرم ثابت کرنے کے لیے آج مجھے دبئی جانے کا خطرہ مول لینا پڑا جہاں جا کر تم نے واردات کی منصوبہ بندی کی تھی۔ تم نے ایک رُومال پر منصوبے کی تفصیل لکھ کر وہاں گرا دی۔ لیکن جس کے لیے بھی یہ پیغام تھا، وہ اتنا احمق نکلا کہ اس نے منصوبے کے بارے میں پڑھنے کے بعد رُومال کو وہیں پھینک دیا تھا۔"

"یہ جھوٹ ہے... یہ الزام ہے۔" بھرائی ہوئی آواز قیدی کے حلق سے نکلی وہ بار بار تھوک نگل رہا تھا۔

"خاموش! کیا تم مہرو جانہ پر جھوٹ کا الزام لگا رہے ہو؟" ایک ڈاکو نے تیزی سے کہا۔ "ورنہ تمہاری زبان کھینچ لی جائے گی۔"

"اس سے کوئی کچھ نہ کہے۔" مہرو جانہ نے سفاک سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "یہ میرا شکار ہے اور اس سے میں ہی نمٹوں گی۔"

میں خاموش تماشائی بنا رہا۔ مہرو جانہ اس پر جو الزام لگا رہی تھی وہ میری دانست میں واقعی جھوٹ تھا۔ کوئی اور ہی معاملہ تھا جسے چھپایا جا رہا تھا اور غداری کی آڑ میں اس شخص پر ستم ڈھایا جا رہا تھا۔

لڑکی آگے بڑھ کر قیدی کے قریب پہنچ گئی۔

"بتاؤ... تم نے اس مخبری کے عوض کیا حاصل کیا تھا؟" مہرو جانہ نے قہر و غضب کی دیوی بن کر سوال کیا۔ "اور وہ رقم کہاں ہے؟"

"میں نے کچھ نہیں لیا۔" قیدی نے پھٹی پھٹی آواز میں کہا۔

مہرو جانہ نے خنجر والا ہاتھ گھمایا اور پھر اس قدر مکروہ منظر سامنے آیا کہ میں نے مُنہ پھیر لیا۔ میرے کانوں سے قیدی کی چیخیں اور کراہیں ٹکراتی رہیں لیکن میں اس کی طرف نہ دیکھ سکا اور نہ ہی اس کے لیے کچھ کر سکا۔ لڑکی بار بار چیخ کر اس رقم کے بارے میں پوچھ رہی تھی جو اس نے غداری کے عوض حاصل کی تھی اور قیدی بار بار اپنی بے گناہی کا رونا رو رہا تھا۔

... پھر آوازیں آنا بند ہو گئیں۔

"بُزدِل..." مہرو جانہ کی غضبناک آواز اُبھری۔ "تھوڑا سا پانی لا کر اس کے مُنہ پر چھینٹے مارو۔ یہ بے ہوش ہو گیا ہے۔ میں اسے اس وقت تک تھوڑا تھوڑا کر کے کاٹتی رہوں گی جب تک یہ اُس رقم کے بارے میں نہیں بتا دیتا... یا اس کا قیمہ نہیں بن جاتا۔"

"تمہیں شاید اس غدار پہ رحم آ رہا ہے۔" دُرشم خان نے سرگوشی کی۔

"نہیں..." میں نے سختی سے کہا۔ "مجھے کسی اجنبی سے کوئی واسطہ نہیں..."

"اس کے لیے یہی بہتر ہے کہ اس رقم کے بارے میں بتا دے ورنہ مہرو جانہ واقعی اس کی بوٹی بوٹی نوچ لے گی۔ یہ جتنی حسین ہے اتنی ہی خطرناک ہے۔ سردار یوسف ہی کا دَم خَم ہے کہ اسے سنبھالے ہوئے ہے۔"

"یہ مشورہ تمہیں اسی شخص کو دینا چاہیے۔" میں نے کھائی سے کہہ کر اس کی بات کاٹ دی اور کن انکھیوں سے اس طرف دیکھنے لگا جدھر سے کچھ دیر قبل میں نے نفرت اور کراہیت کی وجہ سے مُنہ پھیر لیا تھا۔

اس شخص کی حالت واقعی قابلِ رحم تھی۔

اس کے رخساروں پر جا بجا گڑھے پڑے ہوئے تھے۔ مہرو جانہ نے اس کے گالوں کا گوشت جگہ جگہ سے کاٹ دیا تھا خون آلود بوٹیاں اس شخص کے سامنے پڑی تھیں اور چہرے پر جہاں جہاں سے بوٹیاں کاٹی گئی تھیں، وہاں وہاں خون کے دھبّے تھے جن کا حجم لمحہ بہ لمحہ بڑھتا جا رہا تھا۔

جو شخص پانی لانے گیا تھا، وہ واپس آ گیا۔

اس نے بے ہوش آدمی کے چہرے پر چھینٹے دینے شروع کر دیے۔

تھوڑی دیر بعد غدار ڈاکو ہوش میں آ گیا۔

اس کی آنکھیں کھُلیں تو ان سے ویرانی جھانک رہی تھی۔ چہرے پر پانی کی بوندیں محسوس کر کے اس نے ٹھوڑی کی طرف زبان نکالی۔ اس کی زبان پر کانٹے ہی کانٹے نظر آ رہے تھے۔ خشک اور پھولی پھولی سی زبان ٹھوڑی پر لگی ہوئی پانی کی بوندوں کو سمیٹ کر

حلق کو تر کرنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن ان بوندوں میں خود اُسی کے خون کی آمیزش تھی۔

"بولو... بتاؤ... وہ رقم کہاں ہے؟" لڑکی غرائی۔

اس بار قیدی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

مہرو جانہ نے غضبناک ہو کر دوبارہ خنجر آزمایا۔

اس بار قیدی کے ماتھے پر ایک سیدھی لکیر کھنچ گئی تھی خون آلود یہ لکیر چند لمحوں تک تو سیدھی نظر آتی رہی۔ یوں لگا جیسے اس کی پیشانی پر سُرخ رنگ کا تاگا باندھ دیا گیا ہو... پھر یہ لکیر پھیلنے لگی اور خون رِس رِس کر قیدی کی پلکوں پر آ گیا جہاں سے وہ اس کی آنکھوں میں گرنے لگا۔ اُس نے آنکھیں بند کر لیں اتنا بھیانک منظر تھا کہ موت بھی اس نظارے سے کانپ کانپ گئی ہو گی۔

"کُتیا... " قیدی نے زیرِ لب کہا "تم چاہے مجھ پر کتنے ہی ستم ڈھاتی رہو میں کوئی الزام قبول نہیں کروں گا جو مجھ پر عائد نہ کیا جا سکتا ہو... اگر الزام ہی لگانا ہے تو یہ لگاؤ کہ میں نے تمھاری شیطانی بھوک۔"

اس کے حلق سے ایک بے ساختہ کراہ نکل گئی۔

لڑکی نے پوری قوت سے اس کے مُنہ پر ٹھوکر ماری تھی۔

اس ٹھوکر سے قیدی کا بالائی لب کٹ گیا۔ اس کا چہرہ مزید بھیانک ہو گیا۔ اس نے مہرو جانہ پر جو الزام لگانے کی کوشش کی تھی اس پر سارے ہی ڈاکو بھڑک اُٹھے تھے۔ ایک تو خاص طور سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ اس نے پستول نکال لیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے کئی گولیاں چلا دیں۔ ہر گولی پر قیدی کا بندھا ہوا جسم اچھل پڑتا حتیٰ کہ گولیاں بھی اُسے متحرک کرنے میں ناکام ہو گئیں۔ اس کا سینہ چھلنی ہو چکا تھا اور چہرہ بھی جہاں جہاں گولیاں لگی تھیں ان کے سوراخوں نے قیدی کے چہرے کو اتنا بھیانک بنا دیا تھا کہ اس کی طرف دیکھنا ممکن نہ رہا۔

"گران خان..." یوسف خان کی غضب ناک آواز گونجی۔

"بے افسوس ہے سردار" گران خان نے ہانپتے ہوئے جواب دیا "تمھاری منظورِ نظر کے لیے اتنے نازیبا الفاظ سُن کر میرا خون کھول اٹھا تھا۔"

"اسے معاف کر دو" مہرو جانہ نے مسکرا کر کہا۔ یہ جملہ بظاہر نکالا یہ کہنے کے بعد اُس نے گران خان کی طرف جن نگاہوں سے دیکھا تھا اس سے ساری بات میری سمجھ میں آ گئی۔ لڑکی واقعی ذہین تھی۔ اس نے غالباً گروہ کے سارے ہی آدمیوں سے آنکھ مچولی شروع کر رکھی تھی... اور یوسف خان اسے اپنے لیے ایک بہترین ڈھال کے طور پر استعمال کر رہا تھا میرا اندازہ تھا کہ قیدی کو کسی اور ہی جرم کی سزا دی جا رہی ہے... اور میرا یہ خیال غلط نہیں تھا۔

تاہم اب خاموش کھڑے لاش کو گھور رہے تھے۔

سورج سر پر آ پہنچا تھا لیکن درختوں کی وجہ سے دھوپ کی تیزی اس کمین گاہ تک پہنچنے میں کامیاب نہیں ہو رہی تھی۔ دریا کی طرف سے آنے والی ہوا کے جھونکوں سے گھاٹی کا درجۂ حرارت یوں بھی کم ہی رہتا تھا۔

"اب اس کی لاش کو لٹکا دو" لڑکی نے کہا "اگرچہ اسے پھانسی دینے سے اب کوئی فائدہ نہیں لیکن یہ دوسروں کے لیے عبرت کا سامان ہو گا... اور اس کی لاش اس وقت تک رسّی کے سہارے لٹکی رہنے دو جب تک یہ محض ہڈیوں کا پنجر نہیں بن جاتا... چلو... تم تینوں..." اس نے خنجر کی نوک جیسے نوک دار ناخن سے مزین انگلی باری باری تین ڈاکوؤں کی طرف اٹھائی اور وہ تینوں یوں متحرک ہو گئے جیسے اس انگلی کے جادو کے زور سے ان بے جان پتلوں میں زندگی کی لہر دوڑ گئی ہو۔

اگلے ہی لمحے لاش کے گلے میں رسّی ڈال کر اسے درخت کی ایک شاخ سے لٹکا دیا گیا۔ لٹکانے کی وجہ سے لاش کی زبان لٹک گئی... اور وہ مزید بھیانک نظر آنے لگی۔ میں نے دُرشم خان کی طرف دیکھا۔ وہ بغور لاش کو دیکھ رہا تھا۔

"میرا خیال ہے یہ بے گناہ تھا" میں نے سرگوشی کی۔

"تمھارا خیال ٹھیک ہے۔"

"پھر تم نے اسے اتنی بے دردی سے کیوں مر جانے دیا؟" میں نے دبی آواز میں کہا تاکہ آس پاس کھڑے دوسرے لوگ میری آواز نہ سن سکیں "آخر یہ شخص تمھارا ساتھی تھا۔"

دُرشم خان کے ہونٹوں پر مکاری سے بھرپور مسکراہٹ رقص کرنے لگی "اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہو گا کہ گروہ میں آئندہ کسی کے ذہن میں غداری کرنے کا خیال نہیں آئے گا۔ کیا خیال ہے اس منظر کو دیکھ کر تم پر کیا گزر رہی ہے؟ کیا تم زندگی کے کسی بھی لمحے میں اس منظر کو بھول سکو گے؟"

"تمھارا خیال درست ہے" میں نے سختی سے کہا اور میری نگاہوں میں پلوشہ کا مُردہ جسم گھوم گیا۔ وہ منظر تو اس سے کہیں زیادہ دلخراش تھا۔

سردار یوسف نے مہرو جانہ کا ہاتھ تھام لیا۔

"میری بلّی اس وقت بہت غصّے میں ہے" اس نے قہقہہ لگا کر کہا اور پھر اس کا ہاتھ تھام کر جھونپڑے کی طرف چل دیا۔

باقی ڈاکو بھی منتشر ہو گئے اور اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے۔

میں ایک طرف بیٹھ گیا۔

میرا ذہن اس وقت ان پانچ سواروں میں اُلجھا ہوا تھا جنہوں نے اپنے مقصد کی انجانی سے اپنے اور میرے درمیان فاصلہ مزید بڑھا لیا تھا میرے ذہن میں وہ پٹھان لڑکی گھوم گئی جو حوالات میں ناشتہ لے کر آئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے چمک سی لہرائی یہ سب کچھ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دو جلدیں
قیمت ۳۰۰/- روپے
تاریک وادی
ایم اے راحت

لگاتی تھا لیکن مجھے ابھی تک بھولا نہیں تھا۔ اس لڑکی کو میں نے زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا... پھر وہ شناسائی کی خفیف سی جھلک کیسی تھی؟ وہ مجھے دیکھ کر کیوں چونک پڑی تھی۔ اب وہ میرے سامنے ایک واحد سُراغ کی حیثیت رکھتی تھی اس لیے میں نے سوچا کہ مجھے رات کسی وقت واپس جا کر اُس سے ملنا چاہیے۔

چیرپال واپس جانے کا خیال خطرناک تھا لیکن خطرات کی اب میرے نزدیک کوئی خاص اہمیت نہیں رہ گئی تھی۔ میری زندگی کا صرف ایک ہی مقصد تھا اور اس مقصد کی تکمیل میں خون کے کئی دریا میرے راستے میں پڑتے تھے جن سے مجھے گزرنا تھا... جن کے اُس پار منزلِ مقصود تھی۔

غدار ڈاکو کا معاملہ سرد پڑتے پڑتے سہ پہر ہو گئی تھی لیکن وادی میں ابھی سے تاریکی پھیلنا شروع ہو گئی تھی میں گھاس پر لیٹ گیا اور اس لڑکی کے بارے میں غور کرنے لگا جس سے مجھے چیرپال واپس جا کر ملاقات کرنی تھی... وہی چیرپال کی بستی جہاں سے میں دُرشم خان اور ان کے ساتھیوں کے ساتھ فرار ہو کر آیا تھا مگر اب مجھے ایک بار پھر دانستہ موت کے مُنہ میں واپس جانا تھا۔

●

میں اُس جھونپڑے کی عقبی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھا ہوا تھا جس میں سردار اور اس کی منظورِ نظر کی رہائش تھی۔ گروہ کے باقی ڈاکو گھاٹی میں ادھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے اور کھلی فضا میں گھاس کے بستروں پر سو رہے تھے ہلکی ہلکی چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ سارا دن بے سکونی میں گزرا تھا اس لیے سب کے سب لیٹتے ہی سو گئے تھے۔

دن بھر میرا ذہن یا تو چیرپال کی اس لڑکی میں اُلجھا رہا تھا جس سے ملنے کے لیے مجھے جانا تھا یا پھر میں دُرشم خان اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ ان میں سے کسی نے مجھ سے گھُلنے ملنے کی کوشش نہیں کی تھی اور نہ ہی سردار یا اس کی منظورِ نظر نے مجھے مخاطب کیا تھا۔ اس وقت وہ دونوں اندر جھونپڑے میں تھے اور کبھی کبھی ان کی باتوں کی آواز یا مہرو جانہ کا شیطانی قہقہہ میرے کانوں تک پہنچ جاتا تھا۔ اس وقت بھی میں دُرشم خان کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔

دُرشم خان نے چرمی تھیلے اور طلائی سکّوں کا تذکرہ نہ کر کے مجھے جس اُلجھن میں ڈال دیا تھا، اس کی عملی صورتِ حال اب سامنے آنے کا وقت آ گیا تھا۔ تعلقات ڈھل چکی تھی اور رات کی تاریکی ہی میں شیطانی منصوبوں کی تکمیل ہوتی ہے۔ جو کچھ بھی تھا کچھ ہی دیر بعد سامنے آنے والا تھا اور میں ہر قسم کے حالات کے لیے تیار تھا۔

یوسف خان نے مجھے ایک گھوڑا خریدنے کے لیے کہا تھا۔ وہی گھوڑا جوان کے ایک ساتھی کی موت کے بعد خالی ہو گیا تھا۔ یہ بات سب کے سامنے ہوئی تھی اس لیے سب کو آسانی سے اندازہ تو با آسانی ہو گیا تھا کہ میرے پاس ایک گھوڑا خریدنے کے لیے تو رقم موجود ہے جبکہ دُرشم خان یہ جانتا تھا کہ میرے پاس طلائی سکّوں سے بھرا ہوا ایک چرمی تھیلا ہے۔ وہ تو اچھا ہوا کہ اس نے یہ اطلاع سب کو نہیں دے دی۔ اگر ایسا ہوتا تو میرے لیے خطرات مزید بڑھ جاتے۔ اتنی بڑی رقم کا سُن کر تو یوسف خان ہی مجھے گولی مارنے کا حکم دے سکتا تھا۔ اتنی دولت کے سامنے انہیں ایک نئے ساتھی کی اہمیت کا ذرا سا بھی احساس نہ ہوتا۔

میں دیوار سے ٹیک لگائے انتظار کر رہا تھا۔

نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

ایک دو بار میری نگاہ اس طرف بھی گئی جدھر درخت کی شاخ سے نام نہاد غدار ڈاکو کی لاش اب بھی جھول رہی تھی جیسے جیسے رات زیادہ ہوتی جا رہی تھی آس پاس محوِ خواب ڈاکوؤں کے ڈراؤنے خراٹوں کی آوازیں شدید ہوتی جا رہی تھیں۔ میں نے کن انکھیوں سے اس طرف دیکھا جدھر دُرشم خان سرِ شام ہی جا کر لیٹ گیا تھا۔ وہ اب بھی ساکت و جامد دراز تھا۔

اچانک اس کے ہیولے میں حرکت پیدا ہوئی۔

اس نے کروٹ بدلی اور جھونپڑے کی طرف رُخ کر کے اٹھ بیٹھا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے کسی وجہ سے اس کی نیند اچاٹ ہو گئی ہو۔ چند لمحوں تک وہ بیٹھا آنکھیں مسلتا رہا لیکن میں سمجھ چکا تھا کہ وہ میری طرف متوجہ ہے۔ میں یوں بیٹھا تھا جیسے بیٹھے بیٹھے ہی سو گیا ہوں۔

... پھر وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

کچھ دیر وہ ساکت کھڑا رہا... پھر میں نے اس کے ہیولے کو متحرک دیکھا۔ وہ دوسرے خوابیدہ ڈاکوؤں کے درمیان گھومتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ میں نے سر پر ایک چھجے دار ٹوپی اوڑھ رکھی تھی اور اسے پیشانی پر جھکا رکھا تھا۔ میری آنکھوں پر سایہ تھا۔ اس

لیے وہ یہ نہیں دیکھ سکتا تھا کہ میں سو رہا ہوں یا نہیں . . . البتہ میں نے جسم کو یوں ڈھیلے ڈھالے انداز میں چھوڑ رکھا تھا کہ وہ مجھے سویا ہوا ہی سمجھ سکتا تھا۔

جب وہ کچھ قریب آگیا تو کوئی شبہ نہ رہا۔ وہ دُرشم خان ہی تھا اور اس کے دبے قدموں چلنے کے انداز سے اس کے ارادوں کا پتا چلتا تھا۔ چاندنی میں اس کے بھینچے ہوئے ہونٹ نظر آرہے تھے اور اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ لالچ کی چمک جس نے اُسے اندھا کر دیا تھا اور وہ یہ بھی بھول گیا کہ میں نے ایک بار اس کی زندگی بچائی تھی۔ اگر میں حوالات میں تھالی مار کر ڈوانگ کے ہاتھ سے ریوالور نہ گرا دیتا تو یقیناً وہ اُسے گولی مار چکا ہوتا . . . پھر میں نے اُسے فرار ہونے میں مدد دی تھی۔ اس احسان فراموش شخص سے مجھے ویسے تو کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن مجھے اس کی احسان فراموشی پر دُکھ ہو رہا تھا جس نے میرے دل میں اس کے خلاف نفرت کی چنگاریاں بھر دی تھیں۔

وہ جھونپڑے کی نکڑ پر پہنچ کر رُک گیا۔

اس کے ہونٹوں پر ایک بار پھر مسکراہٹ رقص کرنے لگی تھی۔ میری اپنی دانست میں اس نے احتیاطی کارروائی کی تھی کہ اگر میں جاگ رہا ہوں گا تو اس مسکراہٹ سے غلط فہمی میں پڑ جاؤں گا . . لیکن میں کسی غلط فہمی کا شکار نہیں تھا۔ اس کے فرشتوں کو بھی یہ بات معلوم نہیں تھی کہ میں تو بڑی دیر سے اسی انتظار میں بیٹھا ہوا تھا۔

میرے رُخسار پر ایک مکھی بھنبھنانے لگی۔

میں نے اُسے بھی اُڑانے کی کوشش نہیں کی۔

میرے رُخسار کا وہ حصّہ بے حس و حرکت رہا، جہاں وہ مکھی بار بار بیٹھ رہی تھی۔ دُرشم خان میرے قریب آکر رُک گیا۔ وہ چند لمحے تک بے حرکت کھڑا رہا . . . پھر اس کے ہونٹوں سے مسکراہٹ غائب ہو گئی اور اس کا ہاتھ اپنی شلوار کے نیفے کی طرف بڑھ گیا۔

اس کے دانت سختی سے بھینچ گئے تھے اور وہ ہیجانی کیفیت کا شکار ہو گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے حلق سے سانس، دانتوں کے خلا میں سے کسی سیٹی کی مدھم آواز کی طرح نکل رہی تھی۔

اس نے نیفے سے چاقو نکال لیا۔

میرا اندازہ غلط نہیں تھا۔ اس نے طلائی سکوں سے بھرے ہوئے تھیلے کے بارے میں معلومات اپنی ذات تک صرف اسی لیے محدود رکھی تھیں کہ وہ اس دولت کو تنہا حاصل کرنا چاہتا تھا۔ چاقو کھول کر وہ جیسے ہی مجھے مارنے کے لیے جھکا، میں بول پڑا۔

"سونا انسان سے کس قدر زیادہ پُرکشش ہوتا ہے، دُرشم خان، اس کا مجھے آج اندازہ ہوا۔" میں نے اپنے ماتھے پر جھکی ہوئی ٹوپی ہٹا دی۔

وہ ٹھٹک گیا۔

میں نے بہت دھیمی آواز میں اس سے بات کی تھی۔

چاقو ہاتھ میں لیے وہ یوں کھڑا تھا جیسے میری بات نے اُسے پتھر بنا دیا ہو۔

"بیٹھ جاؤ۔ دُرشم خان!" میں نے دھیمی آواز میں کہا اور آہستہ آہستہ ہاتھ اپنے شکاری چاقو کی طرف بڑھایا جو میرے دائیں طرف زمین پر کھلا پڑا تھا۔ "وہ رقم میں تمہیں یوں بھی دے سکتا ہوں۔ اس کے لیے مجھے قتل کرنے کی ضرورت نہیں۔"

"اوہ، شالیار . . ." وہ بظاہر نادم سا ہو کر میرے پہلو میں بیٹھ گیا۔ "مجھے معاف کر دینا، میرے دوست! دراصل میں لالچ کے ہاتھوں اندھا ہو گیا تھا۔"

"کوئی بات نہیں۔" میں نے خالی ہاتھ دوستانہ انداز میں اس کے کندھے پر رکھتے ہوئے کہا۔ "کبھی کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے۔" یہ کہتے کہتے میرے ہاتھ کی گرفت اس کے کندھے پر اچانک ہی سخت ہو گئی اور اگلے ہی لمحے میں نے اُسے جھٹکا دے کر اپنی رانوں پر گرا لیا۔ جہاں دوسرا ہاتھ شکاری چاقو لیے اس کی گردن کا منتظر تھا۔

تیز دھار چاقو کی ایک ہی جنبش سے اس کا نرخرہ کٹ گیا۔

اس نے مچلنے کی کوشش کی۔

میرا ہاتھ سختی سے اس کے مُنہ پر جم گیا اور دو انگلیاں اس کے نتھنوں میں رینگ گئیں۔ چاقو والے ہاتھ کا دباؤ مزید بڑھ گیا۔ اس کے نرخرے کی نسیں کٹنے اور گرم گرم خون بہنے کی آوازیں میں صاف سُن رہا تھا۔ اس کے حلق سے ہلکی سی خرخراہٹ نکلی۔ وہ بُری طرح تڑپا لیکن میری گرفت سے نکلنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔

سب کچھ نہایت خاموشی سے ہو گیا۔

ایک حریص شخص کی زندگی ختم ہو گئی تھی۔ سرحدی ڈاکوؤں کے مسکن میں، ان تمام لٹیروں کی عین ناک تلے ان کے ایک ساتھی کو بے دردی سے ذبح کر دیا گیا تھا۔ لیکن کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی تھی۔

میں جس دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا، اس کے عقب میں شیطانی کھیل اب بھی جاری تھا۔ مہرو جانہ کے قہقہے میرے کانوں تک پہنچ رہے تھے۔ میں نے ایک نظر اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے ڈاکوؤں کی طرف دیکھا۔ سب خوابِ خرگوش میں ڈوبے ہوئے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اسلم راھی ایم اے کے ولولہ انگیز تاریخی ناول

اندھیروں کے ساربان	۲۰۰/-	سنہری غول	۱۵۰/-
تاریک رزم گاہ	۲۵۰/-	صلیب و حرم	۱۵۰/-
صقلیہ کا مجاہد	۱۵۰/-	نیشاپور کا شاہین	۱۵۰/-
عقاب	۱۵۰/-	بابل کا بت شکن	۱۵۰/-
صحرا کی آگ	۱۵۰/-	طلسم کدہ	۱۷۵/-
قتیبہ بن مسلم	۱۵۰/-	آتش فشاں	۱۵۰/-
موت کے مسافر	۱۷۵/-	آخری حصار	۲۰۰/-
یثرب کا ابلیس	۱۵۰/-	بنت نیل	۱۵۰/-

مکتبہ القریش اُردو بازار لاہور

تھے۔ میں نے دُرشم خان کو گھسیٹ کر دیوار کے ساتھ ہی لٹا دیا۔

حریص ڈاکو کا جسم بے حرکت ہو چکا تھا۔

میں اُٹھ کھڑا ہوا اور پھر وہیں منجمد ہو گیا۔

اچانک کچھ فاصلے پر لیٹے ہوئے ایک ڈاکو کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی تھی۔ وہ خواب کی حالت میں شاید بڑبڑایا تھا . . . پھر اس نے کروٹ بدلی اور ساکت ہو گیا۔ میں نے چند ہی قدموں میں جھونپڑے کے عقبی حصّے سے گھوڑوں تک کا فاصلہ طے کیا اور کوشش کی کہ خفیف سی بھی آہٹ نہ پیدا ہونے پائے۔ اگر تھوڑی بہت آواز پیدا ہوئی بھی ہوگی تو جھونپڑے کے اندر شب بیدار شیطانوں کو اس کی طرف توجہ دینے کی فرصت ہی کب تھی۔ وہ تو لُطف و لذّت کی وادیوں میں چُہلیں کرنے میں مصروف تھے۔

میں نے اپنا چرمی تھیلا اور دوسرا سامان اُٹھا لیا تھا۔

گھوڑوں کے قریب ہی زینوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ میں نے ایک زین اُٹھائی اور اسی گھوڑے پر ڈال دی جس پر میں یہاں تک پہنچا تھا۔ زین کستے وقت میری نگاہ ایک بار پھر درخت سے لٹکی ہوئی لاش کی طرف اُٹھ گئی۔ نام نہاد غدار ڈاکو کی لاش کا رُخ اصطبل کی طرف تھا۔ وہ زبان نکالے، خالی خالی نظروں سے میرے فرار کا منظر دیکھ رہا تھا لیکن کسی کو کچھ بتانے کے قابل نہیں تھا۔

گھوڑے پر زین ڈالنے کے بعد میں نے ایک بار پھر شکاری چاقو نکال لیا۔ اب میں باری باری ہر گھوڑے کی لگامیں کاٹ رہا تھا۔ اس طرح میں نے تمام گھوڑوں کو گویا آزاد کر دیا تھا لیکن ان میں سے کسی ایک نے بھی اِدھر اُدھر دوڑنے کی کوشش ہی نہیں کی . . . غالباً انہیں ابھی اپنی آزادی کا احساس ہی نہیں ہوا۔

لگامیں کاٹنے سے فارغ ہو کر میں نے سوکھی گھاس کی طرف دیکھا اور پھر جھک کر اُسے آگ لگانے لگا۔ گھاس نے فوراً ہی آگ پکڑ لی اور تیزی سے پھیلتی چلی گئی۔ اگلے ہی لمحے میں اُچھل کر اپنے گھوڑے کی پشت پر سوار ہو گیا اور پھر میں نے حلق سے تیز اور خوفناک آواز نکالی۔

گھوڑے دہشت زدہ ہو کر دوڑے۔ وہ بُری طرح ہنہنا رہے تھے اور بعض نے ٹاپیں اور دولتیاں بھی ماری تھیں لیکن میں اس وقت تک اپنے گھوڑے پر سوار درّے کی طرف جا رہا تھا۔ ریوالور نکال کر میں نے ایک ہاتھ میں تھام لیا تھا۔

گھوڑوں کے شور اور آگ کے شعلوں کی وجہ سے سوئے ہوئے تمام ڈاکو ہڑبڑا کر اُٹھ کھڑے ہوئے تھے لیکن ان کے اعصاب

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پر ابھی تک نیند سوار تھی اسی لیے انہیں فوری طور پر کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔۔۔ پھر دوڑتے ہوئے اور بھڑکے ہوئے گھوڑے پوری گھاٹی میں بکھر گئے تھے۔ جدھر جس کا منہ اٹھا، وہ ادھر ہی بھاگ نکلا تھا۔۔۔ پھر آگ تیزی سے پھیل رہی تھی۔ پوری گھاٹی میں خشک گھاس ہی گھاس تھی اسی لیے جب تک میں درّے کے قریب پہنچا، گھاٹی جہنم بن چکی تھی۔

درّے تک گھاٹی کی آوازیں بہت مدھم ہو کر پہنچ رہی تھیں کیوں کہ نیچے جو ہنگامہ ہو رہا تھا، وہاں سے درّہ خاصی بلندی پر واقع تھا۔ اب میری راہ میں صرف ایک ڈاکو حائل ہو سکتا تھا اور اس کے لیے میں پوری طرح تیار تھا۔

"رُک جاؤ۔۔۔" اس کی دھاڑ سنائی دی۔

میں گھوڑے کو درّے میں لانے کے بعد اطمینان سے چلا رہا تھا اس لیے پہرے پر متعین ڈاکو کو میری طرف سے زیادہ خطرے کا احساس نہیں تھا۔

"میرا نام شالیار خان ہے" میں نے بلند آواز میں کہا۔

"وہی۔۔۔ جو نئے آئے ہو؟"

"ہاں۔۔۔ وہی ہوں۔"

"کہاں جا رہے ہو؟" اس نے رائفل تان کر پوچھا۔ وہ جس جگہ بیٹھا ہوا تھا، وہاں پر اُسے نشانہ نہیں بنایا جا سکتا تھا۔ اس لیے میں بے حد خوش گوار انداز میں اس سے نمٹ لینا چاہتا تھا۔

"چیرپال۔۔۔ میرا کچھ سامان وہاں رہ گیا تھا۔"

"اوہ۔۔۔ لیکن یہ نیچے گھاٹی میں ہنگامہ کیسا ہے؟"

"مہرو جانہ رقص کر رہی ہے" میں نے ہنس کر کہا۔

جواباً وہ بھی ہنس پڑا "اوہ۔۔۔ نہ جانے وہ ہمیشہ میری عدم موجودگی میں ہی کیوں رقص کرتی ہے۔ پرسوں رات بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ میں یہاں تھا اور نیچے گھاٹی میں ہر شخص اس کے رقص سے لطف اندوز ہو رہا تھا" وہ اس کمین گاہ سے نکل آیا اور اٹھ کر درّے کے انتہائی حصے کی طرف چل دیا۔

اسی لمحے میرے ریوالور نے ایک شعلہ اُگل دیا۔

گولی اس کی پشت پر پڑی۔ وہ لہرایا اور نیچے درّے میں آ گرا۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ گرتے گرتے اس کے ہاتھ سے رائفل نکل گئی تھی۔ میں گھوڑے سے اُترا اور اس کی طرف بڑھا۔ میں اس کی طرف سے محتاط تھا لیکن قریب پہنچنے پر معلوم ہوا کہ وہ بے جان ہو چکا ہے۔ قد و قامت میں وہ میرے ہی جیسا تھا۔ اس کے جسم پر نئے کپڑے تھے۔ سیاہ قمیص اور سیاہ شلوار۔۔۔

میں جلدی جلدی اُس سے کپڑے بدلنے لگا کیونکہ دوشم خان کے خون سے میرے تمام کپڑے بُری طرح بھیگ گئے تھے اور مجھے بدبو محسوس ہو رہی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد میں درّے کے دہانے پر رکھی ہوئی چٹان کی اوٹ سے نکل کر کھلی فضا میں آ گیا تھا۔ میں نے گھوڑے کا رُخ چیرپال کی طرف کر کے ایڑ لگا دی۔

تازہ دم گھوڑا پل بھر میں ہوا ہو گیا۔

•

چیرپال کی آبادی دھند آلود چاندنی میں لپٹی ہوئی بڑی پُرسکون لگ رہی تھی۔

میں نے گھوڑے کو کافی دُور روک لیا تھا۔ اس طرف سے کوئی اندیشہ نہیں تھا۔ کسی کو یہ گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ میں یا ان کا میں سے کوئی اس طرف واپس آنے کی جرأت بھی کر سکتا ہے۔۔۔ پھر جہاں انگریز فوج تھی، وہاں تک پیغام پہنچانے والا شاید ابھی راستے ہی میں ہوگا اور اگلے روز دوپہر بلکہ رات سے پہلے پہلے فوج کا چیرپال تک پہنچنا یوں بھی ممکن نہیں تھا۔ تعاقب کی بھی فکر نہیں تھی کیوں کہ پوری گھاٹی نذرِ آتش کر کے میں نے ان ڈاکوؤں کو بہت بڑی پریشانی میں مبتلا کر دیا تھا۔۔۔ پھر میں سے زیادہ بھڑکے ہوئے گھوڑوں میں ان لوگوں کے ہوش یوں بھی ٹھکانے آ گئے ہوں گے۔ گھوڑوں نے یقیناً ہر قریب آنے والے کو دولتیوں پر رکھ لیا ہوگا۔

ہر طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں نے گھوڑے کو آبادی کے نسبتاً ویران حصے کی طرف بڑھا دیا۔ جس سرائے والے کی بیٹی سے مجھے ملنا تھا، اس تک پہنچنے کے لیے یہ راستہ مناسب اور محفوظ تھا۔ کیوں کہ اب حالات خواہ کتنے ہی پُرسکون کیوں نہ نظر آ رہے تھے۔ میں آبادی کے بازار میں قدم نہیں رکھنا چاہتا تھا

سرزمین نیپال کا سچا واقعہ
درندہ
یعقوب جمیل کے ہوشربا قلم سے
دو جلدوں میں
مکمل سیٹ =/300 روپے
مکتبہ القریش سرکلر روڈ اردو بازار لاہور
فون 7668958

ڈاکوؤں کے مسکن سے باہر آنے کے بعد میں خود کو کافی تر و تازہ محسوس کر رہا تھا اس لیے رات گزر جانے کے باوجود نیند میری آنکھوں سے دُور تھی۔ تھوڑی سی تھکن کا احساس ضرور تھا لیکن یہ تھکن میرے ارادے کے راستے کی دیوار نہیں بن سکتی تھی۔۔۔ پھر کھلی فضا اور آزادی کے احساس نے مجھے ذہنی اور جسمانی توانائی بخشی تھی۔ یوں بھی جب سے مجھے اپنے اندر ایک نئے وجود کا احساس ہوا تھا، تب سے میں نے خود کو انسان ہی سمجھنا چھوڑ دیا تھا۔ اب میری زندگی میں صرف ایک ہی دلچسپی تھی۔۔۔ خون۔۔۔ اس کے وجود کا نشہ اب تک میرے حواس پر طاری تھا۔

میں نے اپنی نئی شخصیت کا ایک لمحے کے لیے بھی تجزیہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ میں تو اپنے بھائی پانوش کو دیکھ کر مر چکا تھا۔۔۔ اب میرا وجود ایک چلتا پھرتا انتقام تھا۔ پانوش کو جس بے دردی سے ہلاک کیا گیا تھا، اس کی لاش دیکھنے کے بعد خوف و دہشت، اب میرے لیے کسی اہمیت کی حامل نہیں رہ گئی تھی۔

راستے میں ایک جگہ رُک کر میں نے بہتی ندی سے پانی پیا تھا تو ندی میں اپنا عکس دیکھ کر مجھے کوئی حیرت نہیں ہوئی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے میں شروع سے ایسے ہی درندگی آمیز تاثرات کا مالک رہا ہوں۔ میری آنکھوں میں ایسی چمک پیدا ہو گئی تھی، جیسی آپ نے کبھی چیتے کی بلوریں آنکھوں میں دیکھی ہوگی۔ میری آنکھوں کے اطراف میں چند جھریاں نمایاں ہو گئی تھیں، بالکل ایسی جیسی کسی بھیڑیے کے چہروں پر نظر آتی ہیں اور ایسی ہی جھریاں میرے لبوں کے دونوں طرف تھیں۔ یہ جھریاں عمر کا تقاضا نہیں بلکہ میری اندرونی شخصیت کی آئینہ دار تھیں۔ پانی پیتے وقت میں گھٹنوں کے بل جھک گیا تھا اور منہ لگا کر پانی پیا تھا۔ میرے قریب ہی گھوڑا پانی پی رہا تھا لیکن مجھے ذرا سی بھی نفرت یا کراہیت محسوس نہیں ہوئی تھی۔

گھوڑا آہستہ آہستہ اس پگڈنڈی پر آگے بڑھ رہا تھا۔۔۔ جو چیرپال کے نسبتاً ویران اور تاریک حصے کی طرف جاتی تھی۔ ٹھنڈک میں کچھ اضافہ ہو گیا تھا اور چاندنی ہر گزرتے ہوئے لمحے کے ساتھ مدھم ہوتی جا رہی تھی۔

بستی کے شمالی حصے میں پہنچ کر میں گھوڑے سے اُتر گیا۔

اس جگہ گھوڑے کو باندھ کر میں گلی میں داخل ہوا۔

گلی سنسان تھی اور یہ حصہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا اور دُور کسی جگہ سے ایک کتے کے بھونکنے کی آواز آ رہی تھی اور کسی مکان کے اندرونی حصے میں کوئی بچہ رو رہا تھا۔ ان دو آوازوں کے علاوہ کوئی آواز نہیں تھی۔ میں نے گھوڑے کو ایک ایسی جگہ باندھا تھا جہاں صبح تک کسی کے آنے کا امکان نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے خلافِ معمول اس سے بھرا ہوا چرمی تھیلا بھی زین سے بندھا چھوڑ دیا اور گھوڑے سے کوئی چیز بھی نہیں اُتاری۔ ریوالور اور شکاری چاقو میرے پاس موجود تھا اور ان دونوں کی موجودگی میں، میں ہر قسم کے حالات سے نمٹ سکتا تھا۔

گلیوں میں دبے پاؤں گھومتا ہوا میں سرائے کے پچھواڑے پہنچ گیا۔

ادھر ایک کھڑکی تھی۔

کھڑکی اس وقت بھی روشن تھی۔

گویا اتنی رات گزر جانے کے باوجود سرائے کے مالک نے کام بند نہیں کیا تھا۔ میرے کانوں سے مدھم سی نسوانی آواز ٹکرائی۔ میں نے کھڑکی میں ایک سایہ سا لہراتے دیکھا۔ یہ اسی لڑکی کا ہیولا تھا جسے میں نے چوکی میں دیکھا تھا۔

سرائے کے اس کمرے میں کوئی شخص بیٹھا ہوا تھا۔ غالباً یہ کوئی قہوے کا رسیا تھا جس نے اتنی رات گئے بھی اس کی ضرورت محسوس کی تھی۔۔۔ لیکن جب میں کھڑکی کے قریب پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہ کوئی گاہک نہیں بلکہ اس لڑکی کا کوئی چاہنے والا تھا۔ جو آوازیں میرے کانوں تک پہنچ رہی تھیں اُن سے تو کم از کم یہی اندازہ ہوتا تھا۔

میں کھڑکی کے قریب دیوار سے لگ کر کھڑا رہا۔

اس شخص کی موجودگی میں لڑکی سے بات چیت نہیں ہو سکتی تھی۔

"شرم کرو۔۔۔ تمہیں کم از کم یہاں ایسا نہیں کہنا چاہیے" لڑکی کی آواز آئی۔

جواباً مردانہ قہقہہ سنائی دیا۔

۔۔۔ پھر دروازہ کھل گیا۔ یہ ایک عقبی دروازہ تھا۔ اس کے کھلتے ہی وہ مرد باہر آ گیا۔ دروازے میں لڑکی بھی نظر آئی۔ مرد نے اُسے بازو سے پکڑ کر دروازے سے باہر گھسیٹ لیا اور دروازہ بند ہو گیا۔ وہ دونوں ایک پگڈنڈی پر چل دیے۔ میں جس جگہ دبکا کھڑا تھا، وہاں تاریکی تھی۔ اس لیے وہ مجھے نہ دیکھ سکے۔۔۔ پھر ایک دوسرے کی طرف اس قدر جذباتی انداز میں متوجہ ہونے کی وجہ سے کون کسی اور طرف دھیان دیتا ہے۔

وہ سرائے سے کافی دُور نکل گئے تھے۔

اُن کا رُخ ویرانے کی طرف تھا۔

میں بھی مجبوراً اسی پگڈنڈی پر چل دیا لیکن میں کوشش کر رہا تھا کہ میرے قدموں کی خفیف سی آہٹ بھی نہ پیدا ہو۔ ایک اعتبار سے ان دونوں کا ویرانے کی طرف جانا میرے لیے فائدے مند ہی تھا۔ وہاں انہیں آسانی سے گھیرا جا سکتا تھا اور جو کچھ اس لڑکی سے معلوم کرنا چاہتا تھا، وہ بھی میرے علم میں آ سکتا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دونوں ایک دوسرے سے پٹے ہوئے چل رہے تھے۔

اس علاقے میں عموماً اس قسم کے مناظر دیکھنے کو نہیں ملتے... کیونکہ لڑکیوں کو اتنی آزادی نہیں دی جاتی۔ یہ کوئی خاص ہی معاملہ تھا... اور دونوں کسی خاص تعلق کی وجہ سے یوں چھپ چھپ کر مل رہے تھے۔ بہرحال مجھے ان دونوں کے اخلاقی معاملے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

ویرانے میں پہنچ کر وہ رک گئے۔

سکون اور تنہائی کے متلاشی اس جوڑے کے لیے یہ جگہ واقعی بے حد مناسب تھی۔ وہاں درختوں کا ایک جھنڈ تھا، وہ اسی میں جاکر گم ہو گئے۔ میں دبے قدموں ایک درخت کی اوٹ میں جب کھڑا ہوا۔

میں نے ان کی سرگوشیاں سن لی تھیں۔

وہ مجھ سے زیادہ دور نہیں تھے۔

"اب مجھے جانے دو، رحیم خان!" لڑکی کی آواز آئی۔

"کچھ دیر تو اور رک جاؤ۔ ہمیں آئے ہوئے دیر ہی کتنی ہوئی ہے۔" مرد نے استدعا کی۔ "ابھی تو میں نے تمھیں جی بھر کر دیکھا بھی نہیں بخت!"

"اگر میرے بابا کو معلوم ہو گیا تو وہ مجھے جان سے مار ڈالے گا اور تمھیں بھی زندہ نہیں چھوڑے گا۔ آخر تم ایک شادی شدہ مرد ہو... رحیم خان! بس، اب مجھے جانے دو۔ کہیں بابا کی آنکھ نہ کھل جائے۔"

"وہ چرس کے نشے میں بے سدھ سو رہا ہوگا، اتنی جلدی اس کی آنکھ نہیں کھل سکتی۔" رحیم خان کی آواز آئی۔ "بخت... آخر تم..."

"لیکن دوست! میں کھلی آنکھوں کے ساتھ یہاں موجود ہوں۔"

میں نے درخت کی اوٹ سے نکلتے ہوئے کہا۔ رحیم خان کا ہاتھ فوراً اپنے تیغے کی طرف گیا تھا لیکن میرے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کر اسے رک جانا پڑا۔ غالباً وہ سمجھ گیا تھا کہ چاقو کسی ریوالور بدست کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ بخت نامی وہ لڑکی سفید پڑ گئی۔

میں نے ریوالور والے ہاتھ کو لہراتے ہوئے باری باری ان دونوں کا جائزہ لیا۔ غالباً رحیم خان نامی اس شخص نے مجھے پہلے بھی دیکھا تھا۔ وہ چونک پڑا اور اس کی آنکھوں میں خوف لہرانے لگا حالانکہ جسم اور چہرے سے وہ کمزور دل آدمی نہیں لگتا تھا۔ میں نے ریوالور کی نال اس کی طرف اٹھاتے ہوئے لڑکی کو مخاطب کیا۔ "میرا خیال ہے تم اس بات کو کبھی پسند نہیں کروگی کہ تمھارے بابا کو ان خفیہ ملاقاتوں [illegible]"

[illegible] حیرت اور خوف سے گنگ مجھے گھورنے لگی۔

[illegible] میں نے قدرے نرمی سے کہا۔ "میں صرف کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔"

لڑکی اور اس کا چاہنے والا، دونوں ہی سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگے۔ میں نے رحیم خان کی طرف سے غفلت نہیں برتی۔ مجھے معلوم تھا کہ ایسے آدمیوں کو بہادری کا مظاہرہ کرنے کی خاص عادت ہوتی ہے کیونکہ اس طرح انھیں اپنی منظور نظر کی خوشنودی حاصل ہونے کی توقع ہوتی ہے۔

"میں جب حوالات میں تھا تو میرے لیے کھانا لے کر تم ہی آئی تھیں؟" میں نے کن انکھیوں سے رحیم خان کی طرف دیکھتے ہوئے، لڑکی سے پوچھا۔

اس نے خوف زدہ انداز میں تائید کر دی اور اس سلسلے میں لڑکی نے گردن کو خفیف سی حرکت دی تھی۔

"اور تم مجھے دیکھ کر چونک پڑی تھیں۔"

"ہاں..." اس نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

"کیوں...؟ جب کہ تم نے مجھے اور میں نے تمھیں زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا! تمھارے چونکنے کی کیا وجہ تھی؟"

"مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے میں تمھیں پہلے بھی کہیں دیکھ چکی ہوں۔"

رحیم خان کی آنکھوں میں حسد کی پرچھائیاں رقص کرنے لگیں۔ اس نے قہر آلود نگاہ سے میری طرف اور پھر لڑکی کی طرف دیکھا... تب میں نے ریوالور والا ہاتھ لہرایا اور سخت لہجے میں کہا۔ "دیکھو رحیم خان! یہ میری زندگی اور موت کا معاملہ ہے۔ میں اس سلسلے میں ان گنت قتل کر چکا ہوں اور تم دونوں کی موت پر بھی مجھے بالکل ملال نہیں ہوگا۔ بہتر ہوگا کہ میرے حساب میں اپنا خون نہ لکھواؤ۔ یہاں سے تین قدم پیچھے ہٹو اور منہ دوسری طرف پھیر کر کھڑے ہو جاؤ۔ جلدی!"

ہونٹ چبا کر وہ ہٹ گیا اور منہ پھیر کر کھڑا ہو گیا۔

"اب بتاؤ۔" میں نے گرج دار آواز میں کہا۔

"پپ... پانچ فوجی..." وہ ہکلانے لگی۔

"ہوش میں رہو... اور جو کچھ کہنا چاہتی ہو، جلدی سے کہہ دو۔"

"کل رات سرائے میں پانچ فوجی آئے تھے۔ ان میں سے ایک بالکل تمھاری ہی شکل کا تھا۔ تمھیں دیکھ کر میں یہی سمجھی تھی کہ وہ انگریز فوجی واپس آگیا ہے۔"

"ہوں... وہ سارجنٹ فرینک تھا۔" میں نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔ "باقی چاروں کے حلیے تمھیں یاد ہیں؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور باری باری ان چاروں کے بارے میں بھی بتا دیا۔ وہ وہی تھے جن کی تلاش میں میں مارا مارا پھر رہا

تھا۔ "ٹھیک ہے۔" میں نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔ "تم نے یقیناً ان کی باتیں بھی سنی ہوں گی۔ بتاؤ، وہ کیا باتیں کر رہے تھے؟"

میں براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا اور لڑکی میری نگاہوں کی تاب نہ لاتے ہوئے بار بار نگاہیں چرا رہی تھی لیکن اب مجھے اطمینان ہو گیا تھا کہ یہ ان دونوں کے لیے اس وقت تک خطرناک ثابت نہیں ہو سکتا جب تک میرے لیے ناگزیر نہیں ہو جاتا۔

"میں ان کے لیے کھانا لے کر گئی تھی تو وہ اپنے کمرے میں باتیں کر رہے تھے۔" اس نے دھیمی آواز میں کہنا شروع کیا۔ "میں ان کی زیادہ باتیں سننے میں کامیاب نہیں ہوئی لیکن چند جملے میرے کانوں تک ضرور پہنچ گئے تھے۔"

"اگر وہ جملے تمھارے ذہن میں محفوظ ہیں تو میں انھیں لفظ بہ لفظ سننا پسند کروں گا۔"

"وہ کچھ کہہ رہے تھے..." لڑکی نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا اور اس کا خوف زدہ ذہن یادداشت کے خانوں سے ان الفاظ کو جمع کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ "ایک جملہ تو یہ تھا... اگر شالیار خان نے اپنے بھائی کی لاش دیکھ لی تو وہ کیا کرے گا؟"

"ہوں... اور؟"

"تمھارے ہم شکل نے غصے سے جواب دیا تھا... اس کی پروا نہ کرو۔ وہ اس کھلے علاقے میں ہمارا پیچھا کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا... خصوصاً اگر ہم پانچوں اسی طرح ساتھ رہے تو وہ ہمارے قریب بھی نہیں آئے گا۔"

"ٹھیک ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم جو کچھ کہہ رہی ہو، وہ درست ہے۔ ان لوگوں نے ایسی ہی باتیں کی ہوں گی۔ انھوں نے کس طرف جانے کا تذکرہ کیا تھا؟"

"شمال کی جانب..."

"لیکن شمال میں تو کتنے قصبے اور گاؤں ہیں۔" میں نے کہا۔ "کسی خاص جگہ کا نام نہیں سنا تھا تم نے؟"

لڑکی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔

"سارجنٹ فرینک نے شاید وادی خوف کا نام لیا تھا۔"

یہ نام میرے لیے نیا تھا لیکن مجھے یقین کرنا پڑا کہ لڑکی نے یہی نام سنا ہوگا۔ اس وقت وہ اتنی خوف زدہ تھی کہ اس سے کسی غلط بیانی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

"تم نے بہت کارآمد باتیں بتائی ہیں۔ ان کے لیے میں تمھارا شکر گزار ہوں۔" میں نے لڑکی کا کندھا تھپتھپایا تو وہ مارے خوف کے سمٹ گئی۔ "تم نے ابھی ابھی جس عجیب سی جگہ کا نام بتایا تھا، کیا تم اس کے بارے میں تفصیل سے بتا سکتی ہو؟"

وہ جلدی جلدی اس پراسرار قصبے کے بارے میں بتانے لگی جس کا نام وادی خوف تھا۔

میں نے ایک بار پھر اس کا شکریہ ادا کیا اور پھر رحیم خان کو متوجہ کیا۔ "میری طرف گھوم جاؤ دوست! مجھے افسوس ہے کہ میں تمھاری لطف و لذت کی گھڑیوں میں بدمزگی پیدا کرنے کا باعث بنا... لیکن جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ یہ میری زندگی اور موت کا معاملہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم دونوں میرے بارے میں اپنی زبانیں بند رکھو گے... اگر تم میں سے کسی نے ایک لفظ بھی کہا تو میں تمھارے زندہ جسموں سے کھالیں کھینچ کر ان میں بھس بھر دوں گا۔"

لڑکی میرے خوفناک لہجے پر بری طرح کانپ گئی اور میں چند قدم الٹے چلتے چلتے یکایک ایک درخت کی اوٹ میں پہنچ گیا... پھر میں درختوں کی اوٹ ہی میں جھنڈ سے نکلا اور تیزی سے چوپال کی طرف چل دیا... اسی طرف جہاں میرا گھوڑا بندھا ہوا تھا اور اس گھوڑے پر میرا چرمی تھیلا بھی تھا جس میں طلائی سکے بھرے ہوئے تھے۔

●

وادی خوف کا سفر کٹنے میں نہیں آ رہا تھا۔

گھوڑے کی پشت پر بیٹھے بیٹھے پورا ایک دن اور ایک رات گزر گئی تھی۔ راستے میں ایک لمحے کے لیے بھی آرام نہیں کیا تھا اور پتھریلے راستوں پر گھوڑے کو دوڑاتے دوڑاتے میں خود بھی تھکن سے چور چور ہو چکا تھا... سرائے والے کی بیٹی کو وادی خوف کے بارے میں زیادہ معلوم نہیں تھا لیکن اسے سمت کا بہرحال یقین تھا۔ وادی خوف کسی بستی ہی کا نام ہو سکتا تھا۔ یہ نام پہلے کبھی سننے میں نہیں آیا تھا۔ اس لیے جب سفر کرتے کرتے اتنا وقت گزر گیا تو مجھے یہ شبہ ہونے لگا کہ کہیں میں اندھا دھند غلط سمت میں تو نہیں دوڑتا جا رہا ہوں؟ چوپال کے بعد اب تک ایک بھی آبادی نظر نہیں آئی تھی اور نہ ہی میں نے کسی انسان کی صورت دیکھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے میں اس دنیا میں تنہا رہ گیا ہوں اور خالی خالی زمین پر ازل سے بھٹک رہا ہوں... اور شاید آخری دم تک یونہی بھٹکتا رہوں گا۔

اب تک کوئی اچھا یا برا واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔

میں مسلسل سفر کر رہا تھا حالانکہ گھوڑے کی حالت اب قابل رحم ہوتی جا رہی تھی۔ مجھ پر بس ایک ہی دھن سوار تھی کہ کسی نہ کسی طرح دشمنوں سے اپنا فاصلہ کم کر لوں۔ میں نے زندگی کی آخری سانسوں تک ان پانچوں سے انتقام لینے کا تہیہ کر رکھا تھا اور مجھے اس بات کی بھی پروا نہیں تھی کہ وہ کہاں تک بھاگ لیتے ہیں۔ اگر ان کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

منزلِ مقصود پاتال بھی تھی تو میں وہاں بھی پہنچنے کا ارادہ رکھتا تھا۔
... لیکن مقدر انسان کو کچھ اور ہی تماشے دکھاتا ہے۔

شام ہو رہی تھی اور گرمی کی لہریں زمین سے آسمان تک ہر شے کو جھلسا دینے پر تلی ہوئی لگ رہی تھیں کہ مجھے گھوڑے کی لگام کھینچ لینی پڑی۔

اس وقت میں خاصی بلندی پر تھا۔

پستی میں تھوڑی سی میدانی جگہ پر مجھے دھواں سا اُٹھتا ہوا محسوس ہوا۔

میں نے دھوپ سے پریشان آنکھوں کو پھاڑ پھاڑ کر اُدھر دیکھا۔ ایک گھوڑا گاڑی اُلٹی پڑی تھی۔ اس گاڑی کی ترپال کو آگ لگ چکی تھی اور اس سے دھواں اُٹھ رہا تھا۔ غالباً اس گاڑی میں کچھ بارود بھی رکھا ہوا تھا۔ اچانک اس بارود نے آگ پکڑی اور ایک سماعت شکن دھماکا ہوا۔ گاڑی کے پرخچے اُڑ گئے اور شعلے دور دور تک بکھرتے نظر آنے لگے۔ اس دھماکے سے گاڑی میں جتے ہوئے گھوڑے بھی ہلاک ہو گئے۔

مجھے حیرت تھی کہ اس گاڑی میں کوئی انسان نہیں تھا۔

کئی گھنٹے بعد کچھ نظر آیا تھا اور وہ بھی پریشان کن... مجھے یقین تھا کہ اس گاڑی کے مسافر کہیں آس پاس ہی موجود ہوں گے... ان کی تلاش میں میں نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی تو کافی فاصلے پر مجھے چند اور گھوڑا گاڑیاں نظر آئیں... اور پھر بغور دیکھنے پر پتا چلا کہ ان گاڑیوں کے سائے میں عورتیں، بچے اور مرد موجود ہیں۔ فاصلے کی وجہ سے ان کی تعداد کا تعین نہیں ہو سکا۔

دھماکا اور اس کی گونج ختم ہوتے ہی فضا پُرسکون ہو گئی...

تب میرے کانوں میں کسی عورت کے سسکنے کی مدھم مدھم آوازیں پہنچنے لگیں۔ مجھ سے صرف بیس گز نیچے ایک مرد زمین پر چت پڑا تھا۔ یہ ایک وسیع اور بکھرا بکھرا سا منظر تھا اس لیے میں نے ایک بار پھر بغور سب کچھ دیکھا۔ تب معاملہ میری سمجھ میں آیا۔

بائیں جانب جو چوڑی چٹان نظر آ رہی تھی راستہ اسی کے عقب میں جا کر نگاہوں سے غائب ہو جاتا تھا۔ اُدھر ایک وادی تھی اور وادی میں لمبی لمبی گھاس لہلہا رہی تھی۔ گھاس میں چھپے ہوئے وہ نیم برہنہ وحشی بھی میری نگاہ سے اس بار چھپے نہ رہ سکے جو غالباً اس سارے معاملے کے ذمے دار تھے۔ میرے قریب ہی ڈھلان پر جو لاش پڑی تھی وہ شخص غالباً انہی لٹیروں کے ہاتھوں ہلاک ہوا تھا اور گاڑی کو آگ بھی انہی لوگوں نے لگائی تھی۔

میں نے غور سے ان وحشیوں کی طرف دیکھا جو گھاس میں

سسپنس ڈائجسٹ کا
مقبول ترین
سلسلہ
داستان
ایک عشق گزیدہ نواب زادے کی
ہنگامہ خیز سرگزشت۔
تین دوستوں کا قصہ جن کے عزم و استقلال
سے طوفان شکست کھا گئے تھے۔
لازوال کہانیوں کے خالق
انوار صدیقی
کے پُراسرار قلم سے
دو حصوں میں
حصہ اوّل ۴۵/۰۰ حصہ دوم ۴۵/۰۰
ناشر: مکتبۂ القریش
اردو بازار لاہور

دبکے بیٹھے تھے۔ ان کی تعداد تین سے زیادہ نہیں تھی۔ ان کے گھوڑے عقب میں درختوں سے بندھے ہوئے تھے۔ مجھے حیرت تھی کہ یہ لوگ یہاں یوں دبکے بیٹھے ہیں۔ اگر یہ لٹیرے ہی تھے تو انہیں اب تک ان سات، آٹھ افراد پر حملہ کر دینا چاہیے تھا... تب مجھے دور اُفق پر ایک مدھم ہوتا سیاہ دھبہ دکھائی دیا۔

"اوہ... تو یہ بات ہے۔" میں زیرِ لب کہے بغیر نہ رہ سکا۔ "یہ لٹیرے تعداد میں کم ہیں، جب کہ قافلے والوں کی تعداد زیادہ ہے۔ انہوں نے اپنے ایک ساتھی کو مدد لانے کے لیے بھیجا ہے۔"

جو لٹیرے گھاس میں دبکے ہوئے تھے، انہوں نے سب سے پچھلی گاڑی پر حملہ کر کے اس کے کوچوان کو ہلاک کر دیا تھا اور پھر اسے آگ لگا دی تھی۔ اور اس حملے کا علم آگے والوں کو شاید بہت دیر سے ہوا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ دور کھڑے محض تماشا دیکھ رہے تھے اور لٹیروں کے خوف سے انہیں آگے بڑھنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ اگر انہیں لٹیروں کی تعداد کا علم ہوتا تو شاید وہ یوں خوف زدہ نہ ہوتے۔

میں نے گھوڑے کی زین سے رائفل کھینچی اور گھوڑے کو نشیب میں اُتار کر ایک چیخ ماری۔ اس چیخ سے گھوڑا بدک گیا اور میں چاہتا بھی یہی تھا۔ وہ سرپٹ دوڑنے لگا... پھر میری توقع سے غالباً گھاس میں چھپے ہوئے لٹیروں کو اپنے ساتھیوں کا دھوکا ہوا تھا۔ وہ گھاس میں کھڑے ہو گئے۔

میں نے دوڑتے ہوئے گھوڑے کی پشت سے ان پر فائر کیا۔ ایک لٹیرا ڈھیر ہو گیا۔

دوسرے لٹیروں کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ اس دوران میں ایک اور گولی کھا کر گر چکا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی رائفل فضا میں اُچھلی تھی۔ تیسرے نے مجھ پر فائر کر دیا۔ لیکن اس وقت تک دور کھڑے قافلے والوں میں سے کسی کو ہوش آ چکا تھا۔ اس نے وہیں سے فائر کیا تھا اور وہ مجھ پر گولی چلانے والے لٹیرے سے زیادہ تیز رفتار ثابت ہوا تھا۔ تیسرا لٹیرا بھی گھاس میں غائب ہو گیا... اور اس کی چلائی ہوئی گولی میرے پاس سے گزر گئی۔ میں گھوڑا دوڑاتا ہوا قافلے کے قریب پہنچ گیا۔

"احمقو! تم لوگ یہاں کھڑے کیا اپنی موت کا انتظار کر رہے تھے؟" میں نے ان کو گھورتے ہوئے کہا۔ "شاید تمہیں اُمید تھی کہ فوج یہاں آ کر ان ڈاکوؤں سے تمہیں نجات دلا دے گی۔"

"تم ہمارے لیے کسی فوج سے کم ثابت نہیں ہوئے بیٹے!" ایک بوڑھی عورت نے کہا اور تشکر آمیز انداز میں پہلے آسمان کی طرف اور پھر میری طرف دیکھا... ایک شخص گھوڑے پر سوار ہو کر تیزی سے لاش کی طرف روانہ ہو گیا اور جلد ہی وہ ایک لاش اور ایک زندہ عورت کو لے کر واپس آ گیا۔ یہ غالباً وہی عورت تھی جس کی سسکیاں مجھے سنائی دی تھیں۔

"وہ تعداد میں صرف چار تھے۔" میں نے اطلاعاً کہا۔ "تین تو گھاس میں چھپے ہوئے تھے اور چوتھا اپنے باقی ساتھیوں کو بلانے کے لیے چلا گیا تھا۔"

"ہم تو سمجھے تھے کہ شاید لٹیروں کے پورے گروہ نے حملہ کر دیا ہے۔" ایک رائفل بردار شخص نے کہا... اور پھر وہ حملے کی تفصیل بتانے لگا۔

اس دوران میں میں نے جائزہ لیا۔

چھ مرد تھے۔ دو کم عمر لڑکے جن کی عمریں تیرہ سال سے زیادہ نہیں تھیں۔ تین ہم عمر جوان لڑکیاں تھیں اور سات عورتیں جن میں ایک بوڑھی عورت تھی۔ یہ قافلہ سکوری قصبے جا رہا تھا۔ کسی دور افتادہ علاقے سے آنے والا یہ ایک خوش حال خاندان تھا۔ عورتوں نے علاقائی طرز کے زیورات پہن رکھے تھے۔ چھ مردوں کے پاس رائفلیں موجود تھیں۔ اب تک ان کا ایک آدمی ہلاک ہوا تھا اور جو عورت اب بھی سسکیاں بھر رہی تھی، وہ غالباً مرنے والے کی بیوہ تھی۔

اس وقت قافلہ جس جگہ رکا ہوا تھا، یہ ان کے لیے بے حد خطرناک تھی۔

ان لوگوں کو مصیبت میں دیکھ کر مجھے اپنا خاندان یاد آ گیا۔ جسے فرس خان نے ایک ایک کر کے ہلاک کر دیا تھا۔ عورتوں، لڑکیوں اور بچوں کو دہشت زدہ دیکھ کر مجھے ان پر رحم آ گیا... اس جذبے کی اپنے دل میں موجودگی کا احساس میرے لیے حیرت انگیز تھا۔ میں نے اطراف کا جائزہ لیا... تب میری نگاہ اس چٹان پر پڑ گئی جہاں سے میں اپنا گھوڑا دوڑاتا ہوا ڈھلان میں اُترا تھا۔ اس طرف سے دھول کا بادل سا اُٹھتا نظر آ رہا تھا۔ گویا باقی لٹیرے بھی پہنچ گئے تھے۔

"کیا یہ ساری رائفلیں بھری ہوئی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں، کیوں...؟"

"اوپر جو گرد و غبار نظر آ رہا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بارہ سے زیادہ لٹیروں کا گروہ پہنچ چکا ہے۔ معلوم نہیں ان کے پیچھے اور کتنے ہوں۔ اگر انہوں نے اس وادی کو گھیرے میں لے لیا تو ہم سب لوگ چوہے کی طرح مارے جائیں گے۔ تم لوگ عورتوں اور بچوں کو گاڑیوں کے نیچے چھپا دو اور باقی اطراف میں دبک جاؤ۔ اس دوران میں پوری وادی پر نگاہ رکھنا۔ اوپر کہیں بھی کوئی ہیولہ دکھائی دے تو بے دریغ گولی مار دی جائے۔ اس دوران میں میں اس چٹان تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں۔" میں نے ایک طرف اشارا کیا۔ "اگر میں وہاں تک پہنچ گیا... تو

ٹیروں کی تعداد چاہے کتنی بھی کیوں نہ ہو۔ میں ان سب سے نمٹ لوں گا۔"

"کیوں نہ ایک گاڑی میں عورتوں اور بچوں کو آگے بھیج دیا جائے؟" قافلے کے سردار نے مجھ سے مشورہ طلب کیا۔

"لیکن اس کے لیے بے حد تیز رفتاری کی ضرورت ہے اور میرا خیال ہے ہمارے پاس اب مشورہ کرنے کے لیے بھی وقت نہیں ہے۔" میں تیزی سے اس چٹان کی طرف دوڑا اور دوڑتے دوڑتے میں نے ان سے کہا۔ "تیار ہو جاؤ..."

میرے ہاتھ میں رائفل تھی اور میں چٹان کی طرف دوڑ رہا تھا۔ یہ چٹان خاصی بلندی پر تھی اور اس کے عقبی حصے میں مجھے سرکنڈے نظر آ رہے تھے۔ وہاں سے میں وادی کے بالائی حصے پر آسانی سے نظر رکھ سکتا تھا اور نشیب میں اترنے والا ہر شخص میری گولی کا نشانہ بن سکتا تھا۔

چٹان تک پہنچنے میں مجھے زیادہ وقت نہیں لگا۔

اب تک تو خیریت ہی رہی تھی لیکن میں جیسے ہی چٹان کے بالائی حصے کی طرف بڑھا، اچانک وادی، گولیوں کے دھماکوں سے گونج اٹھی۔ میں رک گیا اور پلٹ کر گاڑیوں کی طرف دیکھنے لگا... تب ہی مجھے ٹھٹک جانا پڑا۔

ایک نوعمر لڑکا میرے پیچھے پیچھے دوڑا چلا آ رہا تھا۔

"احمق... آ" میں چیخ پڑا۔ "تم کیوں آئے ہو؟"

"میں آپ کی رائفل میں گولیاں بھروں گا۔" اس نے بڑی معصومیت سے کہا... اور میری آنکھوں کے گوشے یکایک بھیگ گئے۔ میری آنکھوں میں پاتوش کا معصوم چہرہ گھوم گیا اور میں نے اس لڑکے کا ہاتھ تھام لیا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" میں نے محبت سے پوچھا۔

"ہاشم... ہاشم خان۔"

اسی لمحے ایک بار پھر وادی میں دھماکے گونجنے لگے۔

میں نے گاڑیوں کی طرف دیکھا۔ عورتیں نظر نہیں آ رہی تھیں اور نہ ہی لڑکیوں اور بچوں کو دیکھا جا سکتا تھا۔ میں نے ہاشم خان کا ہاتھ پکڑ کر چٹان کے عقب میں نظر آنے والے سرکنڈوں میں چھلانگ لگا دی۔

خود کو سرکنڈوں میں چھپائے میں لڑکے کا ہاتھ تھامے تیزی سے اس چٹان کے بالائی حصے کی طرف چڑھ رہا تھا۔ اوپر پہنچ کر میں نے اطراف کا جائزہ لیا اور ایک طویل سانس میرے حلق سے نکل گئی۔

ٹیروں نے واقعی وادی کو گھیرے میں لے لیا تھا لیکن وہ اوپر چٹانوں کی اوٹ میں تھے۔ میں جس چٹان پر تھا یہ ان چٹانوں جتنی ہی بلند تھی لیکن یہ وادی کے درمیان واقع تھی۔

ٹیروں نے اوپر سے فائرنگ شروع کر دی تھی۔

اب تک انہوں نے دو بار گولیاں چلائی تھیں جب کہ نیچے کھڑی، قافلے کی گاڑیوں سے ایک بھی فائر نہیں ہوا۔ شاید وہ لوگ میرے اشارے کا انتظار کر رہے تھے یا پھر ابھی تک وہ پوزیشن ہی سنبھالنے میں کامیاب نہیں ہوئے تھے۔

ایک ایسی عورت کی کہانی
جو مردوں کے معاشرے میں
ملکہ بن کر جینا چاہتی تھی
ناگ رانی
دو جلدوں میں
جلد اول =/145
جلد دوئم =/145
مکتبہ القریش سرکلر روڈ اردو بازار لاہور
فون 7668958

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اچانک مشرقی سمت سے تین گھڑسوار وادی میں اتر آئے۔

ان تینوں کے اترتے ہی اوپر سے فائرنگ تیز ہو گئی۔

میں نے رائفل سنبھالی اور ان میں سے پیچھے والے کا نشانہ لیا۔ میری رائفل گرجی۔ ایک دھماکا ہوا اور وہ گھڑسوار گھوڑے کی پشت سے اچھل پڑا۔ ایک لمحے کے لیے وہ فضا میں معلق نظر آیا۔ اسی دوران گھوڑا اس کے نیچے سے نکل چکا تھا۔ وہ گر گیا اور گرد کے اس طوفان میں غائب ہو گیا جو گھوڑوں کی ٹاپوں سے اٹھ رہا تھا۔ میری رائفل کی نال تیزی سے گھومی اور میں نے دیکھا کہ اب دونوں گھڑسوار ساتھ ساتھ گھوڑا دوڑا رہے ہیں۔ سامنے والے کا نشانہ لے کر میں نے لبلبی دبا دی۔

نہ جانے کیسے میرا ہاتھ ذرا سا بہک گیا۔

ہاتھ بہک جانے سے گولی گھوڑے کے لگی۔ وہ زور سے ہنہنا کر اچھلا... اور اس کا سوار لاکھ کوشش کے باوجود نہ سنبھل سکا۔ گھوڑے نے عقبی دونوں ٹانگیں پوری قوت سے اچھالی تھیں اور پھر برابر والے گھوڑے سے اس کی ایک ٹانگ ایسی الجھی کہ وہ گھوڑا بھی لڑکھڑا گیا۔ دوسرا سوار بھی گر گیا۔ اسی لمحے گاڑیوں کی طرف سے دو فائر ہوئے اور وہ دونوں ٹیرے زمین سے اٹھنے کی حسرت لیے وہیں تڑپتے دکھائی دینے لگے۔

شمال کی جانب سے چار گھڑسوار طوفانی رفتار سے وادی میں اترے۔

میں نے رائفل ہاشم کو دے دی۔ لڑکا خاصا سمجھدار تھا اور اسے غالباً رائفلوں سے دلچسپی بھی تھی۔ اس نے جتنی مہارت سے گولیاں بھرنا شروع کیں اس سے میرا جی خوش ہو گیا۔ میں نے اس دوران میں ریوالور سے تین فائر کیے تھے لیکن فاصلے کی وجہ سے ایک بھی گولی کارآمد ثابت نہ ہو سکی۔

لڑکے سے رائفل لے کر میں نے ایک بار پھر فائرنگ شروع کر دی۔

اس بار چاروں ٹیروں کو زمین دکھانے میں میری رائفل کے علاوہ قافلے کی طرف سے چلائی گئی گولیاں بھی کارآمد ثابت ہوئیں۔

"ادھر... ایک ادھر سے آ رہا ہے۔" اچانک لڑکا چیخ پڑا۔

میں نے پلٹ کر دیکھا تو ایک گھڑسوار تیزی سے عقبی ڈھلوان سے اترتا دکھائی دیا۔ میں نے اسے نشانہ بنایا لیکن وہ گھوڑے سے گر کر نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ نہ جانے کیوں مجھے یوں محسوس ہوا کہ میری گولی اس کی زندگی کو چاٹنے میں کامیاب نہیں ہوئی۔ اس کا گھوڑا بدک کر دوڑا اور ایک چٹان سے ٹکرا کر گر گیا۔

میں نے اطراف پر نظر ڈالی۔

اب تک سات ٹیرے کام آ چکے تھے۔

اوپر سے فائرنگ رک گئی۔ البتہ قافلے کی طرف سے اکا دکا گولی چلتی رہی۔ جن ٹیروں نے ایک گاڑی کو آگ لگا کر اس قافلے کو روکا تھا۔ انہوں نے واقعی بڑی ذہانت سے منصوبہ بنایا تھا لیکن اب ان کا یہ ناپاک منصوبہ خاک میں مل گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اپنے سات ساتھیوں کو گنوانے کے بعد ٹیروں کو بھی عقل آ گئی تھی۔ اب تک جتنے بھی سوار وادی میں اترے تھے انہیں یہ غلط فہمی تھی کہ ان کے ساتھی وادی میں موجود ہوں گے... ان کو تو میں وادی میں اترتے وقت ہی ٹھکانے لگا چکا تھا۔

اچانک مجھے یوں لگا جیسے عقب ... شیشے بری طرح ٹوٹنے لگے ہوں۔

ریوالور ہاتھ میں لیے ایک ٹیرا ... سر پر پہنچ چکا تھا۔ میں نے دھکا دے کر لڑکے کو ایک طرف گرا دیا۔

"یہیں دبکے رہو" میں نے سختی سے کہا اور خود بھی بائیں طرف چھلانگ لگا دی لیکن اس وقت تک ٹیرے کا ریوالور شعلہ اگل چکا تھا۔ میں نے گرتے گرتے ریوالور نکال لیا تھا اور گولی بھی چلا دی تھی لیکن نشانہ اندھا ثابت ہوا۔ اس کا صرف یہ فائدہ ہوا کہ وہ ٹیرا ایک لمحے کے لیے ٹھٹک گیا تھا۔

دفعتاً اس کے ہاتھ سے ریوالور نکل گیا۔

اس نے کراہ کر دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

میں نے چونک کر لڑکے کی طرف دیکھا۔ اس نے تاک کر پتھر مارا تھا جو اس ٹیرے کی کھوپڑی پر لگا تھا۔ ٹیرا ایک لمحے کے لیے چکرایا اور پھر سرکنڈوں میں گر گیا۔ میں نے اوپر تلے دو فائر کیے تھے لیکن وہ ڈھلوان پر تھا اور گرتے وقت اس کا وجود ایک بڑے پتھر کی اوٹ میں ہو گیا تھا۔ اس کے ہاتھ سے ریوالور گرتے تو میں دیکھ چکا تھا اس لیے میں تیزی سے اس پتھر کی طرف اترنے لگا۔

جلد ہی میں اس پتھر کی اوٹ میں جا پہنچا تھا۔

پتھر کی دوسری جانب سے ٹیرے کے ہانپنے کی آواز آ رہی تھی۔

میں ریوالور سنبھالے دائیں طرف سے گھوم کر اس کے سر پر پہنچ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا، میں نے گولی چلا دی۔ گولی اس کی کھوپڑی پر پڑی اور اسے پاش پاش کرتی ہوئی نکل گئی۔

"دیکھو..." اچانک لڑکا چیخا اور اسی لمحے مجھے سرکنڈوں کے ہلنے کی آواز سنائی دی۔ میں پھرتی سے پلٹا لیکن فائر کرنے سے

جیسے ہی ریوالور میرے ہاتھ سے نکل گیا۔ لیٹرے کے ہاتھ میں خنجر تھا جسے اس نے دُور ہی سے مار پھینکا تھا۔ اس کا نشانہ اچھا تھا یا محض اتفاق ہی تھا کہ خنجر میرے ریوالور والے ہاتھ کو زخمی کر گیا تو میں نے پھرتی سے بائیں ہاتھ سے اپنا خنجر نکال لیا۔

لیٹرے کی پیٹی سے ایک کلہاڑی بندھی ہوئی تھی۔

اس نے کلہاڑی نکالی اور میری طرف بڑھنے لگا۔

ہم ایک دوسرے سے تین قدم کے فاصلے پر کھڑے ہانپ رہے تھے۔ اس کی آنکھیں غصّے سے دہک رہی تھیں اور اس کے چوڑے چکلے نتھنوں سے سانس کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اس کی باچھوں سے جھاگ کے بلبلے نکل رہے تھے۔

کلہاڑی سنبھالے وہ آہستہ سے میری طرف بڑھا۔

میں خنجر ہاتھ میں لیے اپنی جگہ کھڑا رہا۔

"تم نے ہمیں بہت نقصان پہنچایا ہے خان!" اس نے درشت لہجے میں کہا۔ "لیکن اب تمہارا آخری وقت آ گیا ہے۔"

میں خاموشی سے اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔

اس کی آنکھیں سانپ کی آنکھوں جیسی گول اور غیر متحرک تھیں۔ اس کا چہرہ بھیانک تھا اور جھاگ آلود ہونٹوں سے دانتوں کی خوفناک جھلک اس کے چہرے کی ہولناکیوں میں مزید اضافہ کر رہی تھیں۔

اس نے جس انداز میں کلہاڑی تھام رکھی تھی اس سے مہارت کا اندازہ ہوتا تھا۔ یہ غالباً وہی لیٹرا تھا جو گھوڑے سے سرکنڈوں میں گر گیا تھا اور جس کے بارے میں میرا خیال تھا کہ زندہ ہو گا۔ اس سے پہلے جس ٹیکسٹوں نے ٹھکانے لگایا تھا وہ نہ جانے کہاں سے نکل آیا تھا ممکن ہے وہ پہلے ہی سے وادی میں کہیں چھپا ہوا ہو اور اس نے اپنے ساتھیوں کے مرنے کے بعد خاموشی سادھ لی ہو۔ پھر شاید وہ ہماری نگرانی کرتا رہا تھا اور اس نے مجھے اس چٹان کی طرف بڑھتے دیکھ لیا تھا... تب وہ دبے قدموں ادھر آیا لیکن وہ اس بات سے بے خبر تھا کہ خود اس کی موت دبے قدموں پیچھے چلی آ رہی ہے۔

کلہاڑی بردار نے اچانک حملہ کر دیا۔

میں نے پھرتی سے اس کا وار بچایا اور بائیں طرف جھک گیا۔

کلہاڑی کسی سانپ کی طرح پھنکارتی ہوئی سنسناہٹ کے ساتھ میرے سر سے گزر گئی۔ لیکن اگلے ہی لمحے کلہاڑی واپس آئی۔ اس بار بھی میں نے بڑی پھرتی کا مظاہرہ کیا تھا ورنہ کلہاڑی میری گردن دھڑ سے الگ کر چکی ہوتی۔

دوسرا وار بھی ناکام گیا تو لیٹرا غصّے سے پاگل ہو گیا۔

اس نے اندھا دھند آگے بڑھ کر وار کیا۔

اس بار... مجھے موقع مل گیا۔ میں نے پوری قوت سے لات گھمائی۔ ٹھوکر اس کی رانوں کے درمیان پڑی اور وہ ایک بلند چیخ مار کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس کے لڑکھڑاتے ہی میں نے بڑھ کر اس کی کلائی تھام لی۔ کلہاڑی پر اس کی گرفت خاصی مضبوط تھی۔ ہم دونوں میں زور آزمائی ہونے لگی۔ میرے بائیں ہاتھ میں خنجر تھا۔ سے میں نے دوبارہ آزمایا لیکن لیٹرا میرے وار بچا گیا۔

وہ ایک کڑیل جوان تھا۔ اس کا جسم آہنی تھا اور اس میں کسی چیتے جیسی طاقت تھی... پھر اس کا ہاتھ میری بائیں کلائی پر جم گیا اب دونوں ہاتھوں سے زور آزمائی ہو رہی تھی۔ میں نے اُسے دھکیل کر چٹان سے لگا دیا اور خنجر والے ہاتھ کا دباؤ بڑھا دیا۔ خنجر اس کے جسم سے تھوڑی ہی دور تھا۔ کلہاڑی والے بازو کی کلائی پر پوری توجہ دیتے ہوئے میں نے خنجر والے ہاتھ پر مزید زور لگایا۔

لیٹرے کا وہ ہاتھ کانپنے لگا جو میرے خنجر والے بازو کی کلائی پر جما ہوا تھا۔ اس لیے کلہاڑی کی طرف سے اس کی توجہ ہٹ گئی۔ میں نے اس بازو کو جھٹکا دیا اور کلہاڑی کے دستے پر ہاتھ ڈال

جاسوسی ڈائجسٹ کا مقبول
سرکش
محمود احمد مودی کے شہکار قلم سے
12 حصوں میں شائع ہو گیا ہے
قیمت فی حصہ =/50 روپے
مکمل سیٹ =/600 روپے
مکتبہ القریش سرکلر روڈ اردو بازار لاہور
فون 7668958

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دیا۔ کلائی آزاد ہوتے ہی اس کی توجہ میرے خنجر والے ہاتھ سے ہٹ گئی۔ خنجر اس کے پیٹ میں اتر گیا۔

ایک ساعت کے لیے اس کا چہرہ سفید پڑ گیا۔

وہ جلد ہی سنبھل گیا لیکن اس وقت تک کلہاڑی اس کی گرفت سے نکل چکی تھی۔ میں نے کلہاڑی کو پوری قوت سے گھمایا۔ تیز دھار کلہاڑی اس کی کھوپڑی پر پڑی اور یوں اتر گئی جیسے کھوپڑی کی بجائے کوئی نرم سا خربوزہ رہا ہو۔ وہ اپنی دو حصوں میں بٹی ہوئی کھوپڑی کو دونوں ہاتھوں سے سنبھالے پیچھے ہٹا اور پھر نشیب میں گر کر لڑھکتا چلا گیا۔

ایک دھماکا ہوا اور میرے عقب سے ایک چیخ اُبھری۔

"ہاشم...!" میں دیوانہ وار پلٹا لیکن اسے زندہ سلامت دیکھ کر میں نے ایک طویل سانس لی۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں رائفل تھی جس کی نال سے اس وقت بھی دھواں نکل رہا تھا۔

میں نے اس طرف دیکھا جدھر سے چیخ سنائی دی تھی۔

ایک لیٹرا سینے پر ہاتھ رکھے یوں جھک رہا تھا جیسے دیر سے کھڑا ہو جانے کی وجہ سے دل سنبھالے نہ سنبھلتا ہو۔ اس کے سینے پر ہاتھ کے نیچے سے خون بہہ کر اس کے پیٹ پر گر رہا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ فضا میں بلند تھا اور اس ہاتھ میں غالباً رائفل تھی جو سینے پر گولی کھانے کے بعد اس کے ہاتھ سے نکل گئی ہو گی۔

چند ساعتوں بعد وہ منہ کے بل گر گیا۔

میں نے غور سے سرکنڈوں کی طرف دیکھا۔ سرکنڈے شام کی ہوا میں لہلہا رہے تھے لیکن ان میں کسی متحرک جسم کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ نیچے وادی بھی خاموش اور پُرسکون تھی۔ وادی کے گرد اٹھتی ہوئی چٹانوں کے بالائی حصے پر چاروں طرف گھڑسوار تھے لیکن ان کی رائفلیں بے زبان ہو چکی تھیں۔

... پھر کسی کی للکار سنائی دی۔

اس للکار کے فوراً ہی بعد نیچے وادی سے گولیاں چلنے لگیں۔ چند رائفلیں ایک ساتھ گرج رہی تھیں لیکن وادی میں گولیوں کی وجہ سے ایسی آوازیں پیدا ہو رہی تھیں جیسے ان گنت گولیاں چلائی جا رہی ہوں۔ یہ دھماکوں کی بازگشت تھی جو اوپر والوں کو خوف میں مبتلا کر سکتی تھی۔ میں نے بھی فائرنگ شروع کر دی... اور پھر وادی میں اتنا شور ہوا کہ چٹانیں لرزنے لگیں۔

اوپر کھڑے لیٹروں میں بھگدڑ مچ گئی۔

گھوڑے سرپٹ دوڑنے لگے۔

... پھر کوئی للکارا۔ یہ غالباً ان ڈاکوؤں کا سردار تھا جو اپنے ڈیرے کو فرار ہونے کا حکم دے رہا تھا۔ جواباً نیچے سے گولیاں چلتی رہیں... تھوڑی ہی دیر بعد وادی کے بالائی حصّے میں ایک بھی پرچھائیں باقی نہ رہی۔ تمام ڈاکو فرار ہو گئے تھے اور افق پر گرد و غبار کا بادل سا پھیلتا جا رہا تھا جو دم توڑتی ہوئی دھوپ اور شام کے سایوں میں مل کر عجیب سا رنگ اختیار کر گیا تھا۔

میں نے ہاشم کے کندھے کو تھپ تھپایا۔

"تم ایک بہادر لڑکے ہو۔" میں نے کہا۔ "مجھے اُمید ہے کہ بڑے ہو کر تم اپنے خاندان کا نام روشن کرو گے۔"

وہ انکسار سے مسکرانے لگا۔

"تم نے میری جان بچا کر مجھ پر احسان کیا ہے۔"

"آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔" اس نے ادب سے کہا۔ "اگر آپ نہ آ جاتے تو شاید ہمارے خاندان کا ایک بھی فرد اس وقت زندہ نہ ہوتا۔ نہ جانے یہ لیٹرے میری بہنوں کے ساتھ کیا سلوک کرتے۔"

"آؤ نیچے چلیں... وہ لوگ ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے۔" میں نے کہا اور اس کا ہاتھ تھام کر سرکنڈوں میں راستہ بناتا ہوا ڈھلان پر اترنے لگا۔ لڑکے نے بھی محبت سے میری کلائی تھام لی تھی۔

انکا، اقابلہ، سونا گھاٹ کا پجاری
اور غلام روحیں
کے بعد انوار صدیقی کا ایک
اور شہکار ناول
برہمچاری
قیمت =/150 روپے
مکتبہ القریش سرکلر روڈ اردو بازار لاہور
فون 7668958

"اوہ... آپ تو زخمی ہیں۔" اس نے رُک کر کہا اور تشویش آمیز انداز میں میرے ہاتھ کا جائزہ لینے لگا۔

میرے ہاتھ کی پُشت پر گہری خراش تھی جس سے خون بہہ رہا تھا۔

"معمولی زخم ہے، خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔" میں نے بے پروائی سے کہا اور اُسے آگے بڑھنے کا اشارا کیا۔

ہم نیچے وادی میں قافلے کے پاس پہنچے تو سب لوگ بے چینی سے ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ ایک عورت نے بڑھ کر جلدی سے لڑکے کو لپٹا لیا۔ یہ غالباً اس کی ماں تھی اور اُسے زندہ دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔

"تم ایک اچھے جوان ہو۔" بڑھیا نے میرے کندھے پر محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "ہم تمہارا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھول سکتے۔"

"اس میں احسان کی کوئی بات نہیں..." میں نے مسکرا کر لڑکے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہاشم نے اس احسان کا بدلہ چکا دیا ہے۔"

میں نے انہیں وہ واقعہ سُنا دیا۔ سب لوگ ہاشم کی تعریف کرنے لگے۔ تمام عورتیں اور بچے بھی گاڑی کے نیچے سے باہر آ گئے تھے اور کچھ دیر کے لیے وادی میں ایسا ماحول پیدا ہو گیا تھا جیسے کوئی خاندان اس وادی میں تفریح کی غرض سے آیا ہُوا ہو۔

... پھر سردار کی نگاہ میرے زخمی ہاتھ پر پڑ گئی۔

سب لوگ یوں مجھ پر ٹوٹ پڑے جیسے میری تیمارداری کی بجائے تکہ بوٹی کر دینا چاہتے ہوں۔ ان کے انداز میں والہانہ پن تھا، اور گنواروں کے سے انداز میں وہ مجھے بار بار مختلف قسم کے مشورے دے رہے تھے۔ جلد ہی میرے ہاتھ پر ایک خاتون نے اپنی چادر پھاڑ کر پٹی باندھ دی اور پھر دو آدمیوں نے مجھے یُوں اٹھا کر آرام سے گاڑی میں لٹا دیا جیسے ہاتھ پر یہ خراش آ جانے سے میں چلنے پھرنے سے بھی معذور ہو گیا تھا۔

میں اطمینان سے لیٹ گیا۔

سردار نے فوراً ہی روانگی کا حکم دے دیا۔

گاڑیاں چل پڑیں اور سردار اپنی بوڑھی ماں کے ساتھ میرے پاس آ بیٹھا۔ میں آنکھیں بند کیے لیٹا رہا۔ کچھ دیر بعد میں نے آنکھیں کھولیں اور سردار سے پوچھا: "کیا آپ نے کبھی وادیٔ خوف کا نام سُنا ہے؟"

"وادیٔ خوف؟" بوڑھے سردار کی نحیف و لاغر سی چیخ نکل پڑی۔

"جی ہاں..." میں نے کہنیوں کے بل اٹھتے ہوئے کہا۔

"کیوں۔ تمہیں وہاں کیا کام ہے؟ تم وہاں کیا کرنے جا رہے ہو؟"

"ایک کام ہے..." میں نے سرسری لہجے میں کہا لیکن میں محسوس کر چکا تھا کہ اس محبت کرنے والی بوڑھی عورت کو بہلانا ممکن نہیں ہے۔

"وہ ایک خطرناک بستی ہے۔" سردار نے کہا۔ "میں اپنی زندگی میں صرف ایک بار وہاں گیا تھا۔ وہاں انسان نہیں درندے بستے ہیں۔ کمزوروں کی وہاں بالکل ان ہرنوں کی سی حیثیت ہے جو جنگل میں شیروں کی غذا بن جاتے ہیں۔"

میں خاموش رہا۔

"آخر تم بتاتے کیوں نہیں بیٹے کہ اس خطرناک وادی میں تمہیں کیا کام ہے؟"

میں نے اس ضعیفہ کی طرف دیکھا جو بڑی محبت اور شفقت سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر ممتا کا نُور تھا اور اس کی آنکھوں میں تشویش کے سائے رقص کر رہے تھے۔ اس صورتِ حال سے مجھے اپنے دل میں ایک ٹیس سی اُٹھتی محسوس ہُوئی۔ وہ ان جذبوں کو جگانے کی کوشش کر رہی تھی، دل جن کا مدفن بن چکا تھا۔ ایک عرصے بعد محبت اور یگانگت کے بول میری سماعت سے ٹکرائے تھے اور بار بار میرا جی بھر آ رہا تھا۔ لیکن میں اپنی اس نئی شخصیت کے ہاتھوں بے بس تھا جس نے میری رُوح تک اپنے قبضے میں کر لی تھی۔

ایک بار تو جی میں آیا کہ ان مہربان لوگوں سے سب کچھ کہہ دوں لیکن نئی شخصیت دیوار بن گئی اور میری ساری باتیں سوچ کی بے آواز صداؤں میں تبدیل ہو کر میرے اپنے ہی دماغ میں گونجتی رہ گئیں... زبان پر ایک بھی لفظ نہیں آیا۔

"محترم خاتون!" میں نے خود پر ضبط رکھتے ہُوئے کہا۔ "کیا میں آپ سے درخواست کر سکتا ہُوں کہ اس سلسلے میں مجھ سے کوئی بازپرس نہ کی جائے؟"

"کیوں... آخر کیوں؟" وہ اصرار کرنے لگی۔

"اس لیے کہ میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔" میں نے حتمی لہجے میں کہا۔ "یہ میری مجبوری ہے۔ اس راز کو میں اب کسی کے سامنے بیان نہیں کر سکتا۔ ویسے میرا وہاں جانا بے حد ضروری ہے کیونکہ یہ میری زندگی اور موت کا معاملہ ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔" سردار بولا۔

"جی..." میں جلدی سے اُٹھ بیٹھا۔ "یہ ممکن نہیں۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"کیوں ممکن نہیں؟" اس نے ناگواری سے پوچھا۔

"اس لیے کہ میں آپ کو اپنے لیے کسی خطرے میں نہیں ڈال سکتا۔"

"جب تم ہمارے لیے خطرے میں پڑ سکتے ہو تو ہمیں ایسا کرنے سے کون روک سکتا ہے؟" سردار نے بڑے جوش و خروش سے کہا۔

میں خاموش رہا۔ صورتِ حال قدرے جذباتی سی ہو گئی تھی لیکن یہ سب کچھ مقدر کا لکھا تھا جس سے مفر ممکن نہیں تھا۔ انہوں نے منانے کی کوشش کی لیکن میں پتھر کا بنا لیٹا رہا۔ گاڑی ہچکولے کھاتی ہُوئی مسلسل آگے بڑھ رہی تھی اور گھوڑوں کی ٹاپوں سے فضا گونج رہی تھی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

جب وہ مایوس ہو گئے تو سردار نے ایک طویل سانس لے کر کہا: "ٹھیک ہے بیٹے! اگر تم مجھے ساتھ نہیں لے جانا چاہتے تو میرے کسی آدمی کو لے جاؤ۔ وہاں تنہا آدمی زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہ سکتا۔"

"میں کسی کو ساتھ نہیں لے جاؤں گا۔" میں نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔ "اور مہربانی کر کے آپ زیادہ اصرار نہ کریں کیونکہ میں انکار کرتے ہُوئے بہت دُکھ محسوس کر رہا ہُوں۔"

"اچھا وعدہ کرو کہ تم ہمارے گاؤں مگوری ضرور آؤ گے۔" بوڑھی عورت نے استدعا کی۔

"میں موقع ملتے ہی آؤں گا۔" میں نے جواب دیا۔ "سردار! کیا آپ مجھے اس وادی کے بارے میں کچھ نہیں بتائیں گے؟ ہو سکتا ہے آپ کی فراہم کردہ معلومات سے مجھے وہاں پہنچ کر کوئی فائدہ ہو جائے؟"

سردار نے ایک جھرجھری سی لی اور گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ وادیٔ خوف واقعی کوئی پُراسرار بستی تھی۔ جذبۂ تجسس مجھے بے چین کر رہا تھا لیکن میرے پَر نہیں تھے ورنہ میں اُڑ کر وہاں جا پہنچتا۔ سردار نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور اس زمانے کے حالات سنانے لگا جب اس نے وادیٔ خوف کا سفر کیا تھا۔

میں دیر تک اس کی باتیں سُنتا رہا اور پھر نہ جانے کب اونگھتے اونگھتے گہری نیند سو گیا۔ کتنی سکون کی نیند آئی تھی۔ کوئی خوف، کوئی دھڑکا نہیں تھا۔ اپنائیت بھرا ماحول میرے اعصاب پر اچھا اثر ڈال رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں جب بیدار ہُوا تھا تو خوب تر و تازہ تھا اور طبیعت بھی خاصی ہشاش بشاش تھی۔

مجھے بہترین کھانا دیا گیا۔

قافلے نے اس جگہ پڑاؤ ڈالا تھا، جہاں سے سردار کے بقول ایک راستہ وادیٔ خوف کی طرف جاتا تھا۔ وہاں سے قافلے کی منزل دوسری جانب تھی۔ اس لیے مجھے ان لوگوں سے رُخصت ہو جانا تھا۔ ان لوگوں کے ہنگامے میں کچھ وقت ضائع ہو گیا تھا۔ لیکن فائدہ یہ ہُوا کہ میں نے آرام کر لیا اور سفر بھی کرتا رہا۔ دوسرے حالات میں ظاہر ہے میں گھوڑے کی پُشت پر سوتے ہُوئے تو سفر نہیں کر سکتا تھا۔

جب میں ان سے رُخصت ہو رہا تھا تو منظر خاصا رقّت آمیز ہو گیا تھا۔ وہ لوگ مجھے یوں رُخصت کر رہے تھے جیسے میں ان کا کوئی ایسا عزیز ہُوں جس سے جُدا ہونے کا انہیں کوئی تصور بھی نہیں تھا۔

خاص طور سے ہاشم تو مجھ سے لپٹ کر رو دیا تھا۔

اس نے میرے ساتھ جانے کی ضد بھی کی لیکن میں نے پیار سے اس کا گال تھپک کر منع کر دیا... پھر میں نے جُھک کر اس کا گال چُوم لیا۔ ایک لمحے کے لیے میں نے آنکھیں بند کر لی تھیں اور مجھے یوں لگا تھا جیسے میں اپنے چھوٹے بھائی پاؤشش کا بوسہ لے رہا ہُوں۔ اس بوسے نے میری رُوح تک سرشار کر دی۔

سردار نے مجھے ایک تازہ دم گھوڑا دے دیا جسے میں نے قبول کر لیا۔ میں نے اپنا چرمی تھیلا باندھا اور ان لوگوں سے رُخصت ہو کر اس راستے پر چل دیا جو وادیٔ خوف کی طرف جاتا تھا۔

یہ ایک پُرخطر راستہ تھا۔

رات بھر میں نے قافلے کے ساتھ سفر کرتے ہُوئے گزار دی تھی اور اب نہ صرف صبح ہو چکی تھی بلکہ سورج بھی کافی بلند ہو چکا تھا۔ دونوں طرف سے پہاڑیوں میں گھِرا ہُوا راستہ محض ایک پگ ڈنڈی ہی تھا جس پر گھوڑے کا ذرا سا پاؤں پھسلتا تو میں راستے کے دونوں طرف پہاڑیوں سے اِدھر گہری کھڈ میں بھی گر سکتا تھا اس لیے احتیاطاً میں گھوڑے سے اُتر گیا اور اس کی لگام تھام کر آگے آگے چلنے لگا۔

سورج جیسے جیسے بلند ہو رہا تھا، ماحول جہنم بنتا جا رہا تھا۔ خشک پہاڑیاں تھیں۔ دُور دُور تک ہریالی کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ یُوں لگتا تھا جیسے سُورج نے اپنی تمام تر حرارت اس علاقے پر برسا کر اس کی ایک ایک چیز کو خاکستر کر دیا ہو۔

پگڈنڈی پر چلتے وقت میں بے حد محتاط تھا۔

اب تک دو بار میرا پاؤں پھسلا تھا لیکن گھوڑے کی لگام ہاتھ میں تھی۔ اس لیے مجھے اپنا توازن برقرار رکھنے میں زیادہ دُشواری،

ہوئی۔ میں نے سامنے دیکھا۔ ابھی یہ پگ ڈنڈی کئی میل تک یونہی چلی گئی تھی۔

ایسے پُرخطر راستے پر چلتے چلتے یوں بھی دماغ چکرا جاتا ہے لیکن مجبوراً آگے ہی آگے بڑھنے کی دھن سوار تھی۔ گھوڑا بھی دہشت زدہ تھا لیکن چونکہ اسی علاقے کا گھوڑا تھا اس لیے جیسے تیسے میرا ساتھ دے رہا تھا۔ اگر لگام میرے ہاتھ میں نہ ہوتی اور میں اُسے کھینچ نہ رہا ہوتا... تو شاید اب وہ ایک قدم بھی آگے نہ بڑھتا۔

اس تنگ راستے پر سفر کرتے ہوئے مجھے کئی بار رُکنا پڑا... مجھے حیرت تھی کہ میرے پانچوں دشمن اس راستے سے کیسے گزر سے ہوں گے؟ خدا خدا کرکے یہ پُرخطر راستہ ختم ہوا تو میں نے اطمینان کی سانس لی اور گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ یہ پگڈنڈی غالباً تین میل لمبی تھی اور اس پر چلنے سے میں بے پناہ تھک گیا تھا۔

ابھی میں گھوڑے کی پشت پر سوار ہوا ہی تھا کہ مجھے لگامیں کھینچ لینا پڑیں۔ میں نے گھوڑوں کی ٹاپیں سُنی تھیں۔ جس جگہ میں کھڑا تھا یہاں سے کچھ فاصلے پر ایک وادی تھی اور وادی کے کچے راستے پر مجھے ایک گھوڑا گاڑی نظر آ رہی تھی۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے تین گھڑسوار اس گاڑی کی اوٹ سے نکلے اور گھوڑوں کو دوڑاتے ہوئے ایک طرف بڑھنے لگے۔ گھوڑوں کے سموں سے چٹانوں میں کہرام سا برپا ہو گیا تھا اور کچے راستے سے دھول ہی دھول اُڑ رہی تھی۔

اس علاقے کی مٹی نسواری مائل تھی اس لیے فضا میں جو غبار نظر آ رہا تھا اس سے سامنے کا منظر عجیب سا رنگ اختیار کر گیا تھا۔

میں نے اس نسواری مائل غبار میں ایک بار پھر اُن گھوڑوں کی طرف دیکھا جو ایک طرف دوڑے جا رہے تھے۔ تب مجھے نظر آیا کہ وہ درحقیقت ایک اور گاڑی کا پیچھا کر رہے ہیں۔ گھوڑا گاڑی کا کوچوان گھوڑوں پر بُری طرح چابک برسا کر انہیں دوڑا رہا تھا اور گھوڑے بھی دُم توڑ کر دوڑ رہے تھے لیکن انہیں ایک گاڑی کو کھینچنا پڑ رہا تھا جب کہ گھڑسواروں کے ساتھ ایسا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔

یہ بھی لوٹ مار ہی کی ایک واردات تھی۔

قافلے کے سردار نے مجھے جو راستہ بتایا تھا اس کے مطابق یہ وادی خوف کا آغاز، اس خطرناک پگڈنڈی کے ختم ہوتے ہی ہو جاتا تھا... اور میں اس وادی میں پہلا قدم رکھتے ہی ایک ایسا منظر دیکھ رہا تھا جس میں مجھے مداخلت تو کرنا چاہیے تھی لیکن میں ایسا نہیں کر رہا تھا۔ البتہ میں جہاں تھا گھوڑے کو وہیں روکے سب... کچھ دیکھتا رہا۔

تینوں گھڑسوار اب اس گھوڑا گاڑی کے قریب پہنچ چکے تھے۔ میں نے گاڑی کے کوچوان کی طرف دیکھا۔ اس نے بھی شاید یہ دیکھ لیا تھا کہ گھڑسوار اُس کے سر پر پہنچ چکے ہیں اس لیے اس نے چابک چھوڑ کر جلدی سے اپنی رائفل سنبھال لی۔

کوچوان نے پلٹ کر فائر کیا۔

ایک دھماکا ہوا لیکن نشانہ خطا گیا۔

گھڑسواروں نے اس دوران میں دو فائر کیے تھے۔ ایک کی نال کا رُخ گھوڑے کی ٹانگوں کی طرف تھا اور دوسرے نے کوچوان کو نشانہ بنایا تھا۔ کوچوان تو فائر کرنے بعد فوراً ہی جھک گیا تھا اس لیے اس کی کھوپڑی گولی کی زد سے محفوظ رہی... لیکن گھوڑے کی ٹانگوں میں لگنے والی گولی ضائع نہ گئی۔ گھوڑا پوری قوت سے اُچھلا۔

گھوڑے کے اُچھلنے سے گاڑی ایک پہیے پر اُٹھ گئی۔ کوچوان نے لاکھ سنبھلنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا گرا اور اگلے ہی لمحے اس کے اُوپر سے، عقب میں آنے والا گھوڑا گزر گیا۔ گھوڑے نے اُسے روند ڈالا تھا۔

چند لمحے پہلے وہ ایک جیتا جاگتا انسان تھا لیکن اب وہ خاک اور خون میں لتھڑا ہوا گوشت اور ہڈیوں کا ڈھیر تھا۔ گھوڑا گاڑی اُلٹ گئی اور زخمی گھوڑا، اُٹھ بھاگنے کے لیے زور لگانے لگا۔ دوسرے گھوڑے بھی بُری طرح مچل رہے تھے۔ اُنھوں نے کئی بار دولتیاں چلائیں لیکن آزاد نہ ہو سکے۔ ڈاکو، اس دوران میں گاڑی کے گرد چکراتے ہوئے مسلسل گولیاں برسانے رہے۔

...پھر ایک نسوانی چیخ سُنائی دی۔

بڑی ہی دلدوز چیخ تھی۔ میرے گھوڑے نے کان کھڑے کیے اور زور سے ہنہنایا لیکن لٹیرے اپنے کام میں اتنے مگن تھے کہ اُنھوں نے میری طرف دیکھنے کی کوشش ہی نہیں کی... اور نہ ہی میں نے اب تک مداخلت کی تھی۔

تینوں گھڑسوار زمین پر کود گئے۔

ان میں سے دو تو وانقلیں تھامے باہر ہی رہے جب کہ تیسرا تیزی سے گھوڑا گاڑی کے عقبی حصے میں جا کر غائب ہو گیا۔ فوراً ہی وہ دوبارہ نظر آیا۔ اس نے اندر سے لکڑی کا ایک صندوق نکال کر اپنے ساتھیوں کی طرف بڑھایا جنہوں نے اس صندوق کو گاڑی سے اُتار لیا۔

صندوق کو زمین پر پھینکنے کے بعد ان میں سے ایک نے تالے پر رائفل کی نال رکھ کر گولی چلا دی۔ تالا ٹوٹ گیا اور لٹیرے ڈھکن کھول کر صندوق پر جھک گئے۔ اُنھوں نے اندر سے ایک تھیلی برآمد کی۔ یقیناً اس میں رقم یا زیورات ہی رہے ہوں گے۔

اچانک لٹیرے کی نگاہ اس طرف اُٹھ گئی جہاں میں کھڑا تھا۔

اُس نے بگڑے ہوئے لہجے میں اپنے ساتھی سے کچھ کہا جو فاصلے کی وجہ سے میری سمجھ میں نہ آ سکا لیکن اتنا تو مجھے بھی یقین ہو چکا تھا کہ اُس نے اپنے ساتھیوں کو میری موجودگی سے آگاہ کیا ہے۔

اگلے ہی لمحے اُن میں سے ایک نے پلٹ کر میری طرف فائر کر دیا۔ مجھے بے حد غصہ آیا۔ وہ ذلیل بلاوجہ مجھے مصیبت میں پڑنے کی دعوت دے رہے تھے۔ گولی سنسناتی ہوئی میرے سر سے گزر گئی۔ میرا گھوڑا اُچھل پڑا۔ میں نے جلدی سے خود کو گھوڑے کی پشت پر گرا دیا... اور اس کے ساتھ ہی میری رائفل زین سے نکل کر میرے ہاتھ میں پہنچ گئی تھی۔

میں نے اسی حالت میں نشانہ لیا اور گولی چلا دی۔

ایک اُلٹ کر گرا لیکن دوسرا تیزی سے ایک طرف دوڑا۔ پھر وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہو گیا اور ایک طرف جا کر نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ باقی دونوں میں سے ایک تو میری گولی سے زمین پر لمبا لیٹا ہوا تھا جبکہ تیسرا لٹیرا صندوق میں ہاتھ ڈال کر کوئی اور قیمتی شے تلاش کرنے لگا تھا... اس دوران میں اس لٹیرے نے وقفے وقفے سے مجھ پر تین فائر کیے جن سے بچنے کے لیے مجھے گھوڑے سے کود جانا پڑا... میں نے چٹان پر کودنے کے بعد جیسے ہی خود کو سنبھالا ایک نئی اُفتاد مجھ پر ٹوٹ پڑی۔ میں اس پہلے لٹیرے کو تو بھول گیا تھا جو فائرنگ شروع ہوتے ہی گھوڑے پر سوار ہو کر ایک طرف نکل گیا تھا۔ میں اس وقت یہ سمجھا کہ فرار ہو رہا ہے اس لیے زیادہ توجہ نہیں دی... پھر میں نے دوسروں میں اُلجھ کر اُسے بالکل ہی ذہن سے اُتار دیا تھا۔ وہ گھوم کر میری پشت پر آ گیا اور وہیں سے اُس نے رسّی کا پھندا مجھ پر پھینکا۔

پھندا میرے گلے سے بازوؤں کی طرف ڈھلک گیا۔

پھندے کو محسوس کرتے ہوئے میرے جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ اگر اس وقت مجھ سے ایک لمحے کی بھی غفلت ہو جاتی تو مجھے زندگی بھر پچھتانا پڑتا... لیکن میرے حواس بیدار تھے۔

میں نے پھرتی سے خنجر نکالا — اس سے پہلے کہ پھندا میرے جسم کے گرد تنگ ہوتا میں نے رسّی پر خنجر آزمایا۔ ایک ہی جھٹکے سے ریشمی رسّی کٹ گئی اور میں نے خود کو زمین پر گرا دیا۔ اگلے ہی لمحے میں لڑھکنیاں کھا رہا تھا۔ میرا گھوڑا بدک گیا تھا لیکن وہ دوڑا نہیں اس نے پوری قوت سے دولتی چلائی تھی جس کی وجہ سے لٹیرے کو اس کے قریب پہنچنے کا موقع نہ مل سکا۔

لٹیرے نے مجھ پر فائر جھونک مارا۔

ابھی تک شاید وہ میری پھرتی کی وجہ سے ششدر تھا یا اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے کہ اس کا نشانہ خطا گیا۔

گولی میرے قریب ہی چٹان پر پڑی تھی میں صرف ایک لمحے پہلے اس جگہ تھا لیکن اب میں وہاں سے کئی قدم کے فاصلے پر چت لیٹا ہوا تھا اور میرا ریوالور میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے گھوڑے پر سوار اس ڈاکو پر اوپر تلے تین گولیاں چلائیں۔ پہلی گولی اس کے نرخرے پر پڑی۔ جس نے ایک گول سوراخ بنایا اور گردن سے پار ہو گئی۔ دوسری گولی اس کے پیٹ میں لگی۔

گھوڑے نے اُسے اُچھال دیا اور خود دوڑتا ہوا نشیب میں چلا گیا۔

میں نے کروٹ بدلی اور نشیب کی طرف دیکھا۔

اب صرف ایک لٹیرا باقی تھا۔

اُسے بھی شاید یہ احساس ہو گیا تھا کہ وہ تنہا رہ گیا ہے اس لیے وہ مقابلہ کرنے کی بجائے راہِ فرار اختیار کر گیا۔ اس نے صندوق سے نکالی ہوئی تھیلی اُٹھا کر دور ہی سے چھلانگ لگائی تھی اور اُڑتا ہوا گھوڑے کی پشت پر جا بیٹھا تھا۔ پھر اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور گھوڑا اُسے لے کر چھوا ہو گیا۔ اس بار میں نے اس کی سمت کو ذہن میں محفوظ رکھا تھا کہ کہیں وہ بھی اپنے ساتھی کی طرح گھوم کر میری پشت پر نہ پہنچ جائے۔

وادی پُرسکون ہو گئی۔

میں آہستہ آہستہ اپنے گھوڑے کی طرف بڑھا۔

ہر لمحے مجھے یہی خوف رہا تھا کہ کہیں گھوڑا بدک کر فرار نہ ہو جائے کیونکہ بدکے ہوئے اور بھاگتے ہوئے گھوڑے کو پکڑنا آسان کام نہیں ہوتا۔

گھوڑے کی لگام تھام کر میں کچھ دیر اُسے تھپتھپاتا رہا... پھر اس پر سوار ہو کر نشیب میں دوڑا دیا۔

میں اس گھوڑا گاڑی کے قریب پہنچ کر رُک گیا اور پھر اس کے عقبی حصے کی طرف دیکھ کر بلند آواز میں کہا: "اندر کوئی ہے؟"

کوئی جواب نہ ملا۔

میرے ذہن میں وہ نسوانی چیخ گونج رہی تھی جسے میں نے کچھ دیر قبل سُنا تھا۔ یقیناً کوئی عورت اس گاڑی کے عقبی حصے میں تھی۔ یہ ایک ایسی قسم کی گھوڑا گاڑی تھی اور عموماً انگریز اس قسم کی گاڑیاں استعمال کرتے تھے جو کوچوان گاڑی چلاتے ہوئے ہلاک ہو گیا تھا وہ ایک قبائلی تھا۔ ممکن ہے اس عورت کو صندوق چھینتے وقت میں لٹیرے نے گولی مار دی ہو۔ میں نے سوچا اور گھوڑے کا رُخ موڑنا چاہا کہ اندر سے ایک سسکاری سُنائی دی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اندر کون ہے؟" میں نے ایک بار پھر کہا۔
"چلے جاؤ۔۔ چلے جاؤ۔"

میں خالی خالی نظروں سے اس بند کمرہ نما گاڑی کو دیکھتا رہا۔ جواب انگریزی میں دیا گیا تھا۔ یقیناً وہ کوئی انگریز عورت ہی تھی۔ مجھے حیرت تھی کہ اس علاقے میں یہ عورت کیا کر رہی ہے! وادی خوف میں تو قبائلیوں کا راج تھا اور مقامی لوگ بھی یہاں دہشت زدہ رہتے تھے چہ جائیکہ ایک انگریز عورت ادھر گھوم رہی تھی۔ میں تجسس کی وجہ سے گھوڑے سے اتر آیا۔

"سنو۔۔۔۔" میں نے انگریزی میں کہا۔ "میرا ان لٹیروں سے کوئی تعلق نہیں۔۔ بلکہ میں نے انہیں مار بھگایا ہے۔"

"اب تم میری کوئی مدد نہیں کر سکتے۔" اندر سے آواز آئی۔ میں نے دروازے پر دباؤ ڈالا لیکن دروازہ اندر سے بند تھا۔

"ہو سکتا ہے میں کچھ کارآمد ثابت ہو سکوں۔" میں نے کہا۔
"نہیں۔۔۔ اب کوئی بھی میرے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ تم یہاں سے چلے جاؤ۔۔۔ اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔"

"دروازہ تو کھولو۔" میں نے قدرے سختی سے کہا۔
"نہیں۔۔ نہیں۔۔۔" وہ چیخ پڑی۔

میں اُلجھن میں پڑ گیا۔ عجیب عورت تھی اگر اس احمق کو اپنی زندگی کا اتنا ہی خیال تھا تو وادی خوف کی طرف آنے کی اسے ضرورت ہی کیا تھی۔۔۔ پھر اگر وہ مر بھی رہی تھی تو اُسے آخری دم تک زندگی سے محبت ہونا چاہیے تھی۔

"دروازہ کھولو ورنہ اسے توڑ دوں گا۔"
"پلیز۔۔ چلے جاؤ۔" اس نے استدعا کی۔

اس بات سے چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کا لہجہ عجیب تھا۔ اتنی عجیب سی آواز میں نے زندگی میں پہلے کبھی نہیں سنی تھی کم از کم کوئی انسان تو اپنے منہ سے ایسی آواز نہیں نکال سکتا۔ میں نے دروازہ توڑنے کا فیصلہ کر لیا اور پھر کندھے کی ایک ہی چوٹ سے دروازہ توڑ دیا۔

۔۔۔ اور اس عورت پر نگاہ پڑتے ہی میں ٹھٹک گیا۔

عورت کونے میں سمٹی ہوئی تھی۔ بلاشبہ وہ ایک حسین عورت تھی۔ اس کی عمر بھی کچھ زیادہ نظر نہیں آ رہی تھی خوب بھرا بھرا سا جسم تھا اس نے نہایت شاہانہ انداز کے کپڑے پہن رکھے تھے۔

وہ ایک آئینہ ہاتھ میں لیے بیٹھی تھی۔

مجھے حیرت ہوئی کہ ابھی تو وہ اس قدر خوفزدہ تھی کہ اس نے مجھ سے چلے جانے کی استدعا کی تھی اور اب آئینہ لیے اپنا عکس دیکھنے میں محو ہے۔ تب اس نے آئینہ رکھ دیا اور میرے جسم میں ایک سرد سی لہر دوڑ گئی۔ محض جسم دیکھ کر میں نے اُسے دل ہی دل میں دُنیا کی سب سے حسین اور پُرکشش عورت سمجھ لیا تھا لیکن اس کا چہرہ۔۔۔۔؟

اس کا چہرہ بھیانک تھا۔ اتنا بھیانک جتنا کہ بغیر ناک کے کوئی انسانی چہرہ ہو سکتا ہے۔ میں سمجھ گیا کہ اس کے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا ہو گا۔ جو لٹیرا صندوق لینے کے لیے اندر آیا تھا، اس نے دروازے سے گھستے ہی اندھا دھند گولیاں چلائی تھیں۔ چند گولیاں لکڑی کی دیوار کو چیرتی ہوئی نکل گئی تھیں جبکہ ایک گولی نے اس حسین و جمیل عورت کی ناک اڑا دی تھی۔ گولی اس کے بائیں رُخسار میں لگی تھی اور پھر اس کی ناک کو اُدھیڑتی ہوئی نکل گئی تھی۔ اب ناک کی جگہ سُرخ سُرخ خون آلود گوشت تھا یا اس سے رستا ہوا خون آلود پانی۔

"میں نے تم سے درخواست کی تھی کہ مجھے نہ دیکھنا۔" وہ دیوانگی سے بھرپور انداز میں میری طرف دیکھ کر چیخ پڑی۔

میں نے اس کی جو عجیب سی آواز سُنی تھی اس کا باعث یہی تھا کہ عورت کی ناک اس کے چہرے سے غائب ہو گئی تھی۔

"خیر۔۔۔" میں نے ایک طویل سانس لی۔ "میں اس سے زیادہ خوفناک منظر دیکھ چکا ہوں۔"

اس نے جھلاہٹ میں آئینہ پھینک دیا۔
"گھبراؤ نہیں۔" میں نے اُسے تسلی دینا چاہی۔

اس نے ایک ہاتھ سے وہ حصہ ڈھانپ لیا جہاں کبھی اس کی لمبی ناک تھی جس پر اس نے کبھی مکھی نہیں بیٹھنے دی ہو گی۔ اس کی مخروطی انگلیوں کے نیچے سے اب بھی سُرخ سُرخ زخم جھلک رہا تھا۔ زخم کو ہاتھ کی پناہ میں دینے کے بعد اس نے دیوانگی سے بھرپور انداز میں میری طرف دیکھا۔ اس کی نیلی نیلی آنکھیں بے پناہ حسین لگ رہی تھیں۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ آنکھیں مجھ سے پوچھ رہی ہوں کہ میں اس کی کیا مدد کر سکتا ہوں۔

میں چپ چاپ کھڑا اُسے دیکھتا رہا۔
"بتاؤ۔۔۔ گونگے کیوں ہو گئے؟" اس نے ہذیانی انداز میں کہا۔ "بتاؤ تم میری کیا مدد کر سکتے ہو؟ تم نے باہر سے یہی کہا تھا نا؟"
"مجھے افسوس ہے۔" میں نے جواب دیا۔
"افسوس سے مجھے کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔"
"تم جس قوم سے تعلق رکھتی ہو اُسے ہماری کسی بھی بات سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔" میں نے نفرت سے کہا۔ یکایک وہ نفرت میرے

دل میں عود کر آئی تھی جو اس قوم کے لیے میری نس نس میں بھری ہوئی تھی۔
"تو پھر تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ جاتے کیوں نہیں؟"
"تم بہرحال ایک انسان ہو۔۔۔ اور انسان سے ایسے حالات میں ہمدردی کا اظہار کیا جاتا ہے۔" میں نے اب بھی سپاٹ لہجے میں کہا۔
"مجھے تمہاری ہمدردی کی۔۔۔"
"اگر تم چاہو تو میں تمہیں قریبی بستی تک لے چلتا ہوں۔ مجھے اُمید تو نہیں کہ قبائلیوں میں کوئی ایسا حکیم ہو گا جو تمہارے چہرے پر ایک نئی ناک پیدا کر دے لیکن وہ تمہارے زخم پر مرہم ضرور لگا دیں گے۔"
"سنو۔۔۔ اس کی بجائے تم ایک کام اور کر سکتے ہو۔"

"وہ کیا؟"
"تمہارا نشانہ کیسا ہے؟"
"بُرا نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا۔
"اگر تم مجھے گولی مار دو تو تمہیں اس میں کتنا وقت لگے گا؟"
"کچھ زیادہ نہیں۔"
"بس وہ تھوڑا سا وقت مجھے دے دو۔"
"تم مذاق کر رہی ہو۔" میں نے ہمدردی سے کہا حالانکہ اب بھی میرے دل میں اس کے لیے ذرا سی بھی ہمدردی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ اگر وہ ایک عورت نہ ہوتی تو شاید میں یہ چند لمحے بھی وہاں ضائع نہ کرتا۔
"نہیں۔۔۔ یہ مذاق نہیں ہے۔"

میں نے محسوس کیا کہ وہ صدمے سے ابھی تک ذہنی طور پر ماؤف ہے اس لیے اُسے زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں محسوس ہو رہی۔ ابھی زخم تازہ ہے اور اُسے زخم کی تکلیف کا احساس نہیں ہے کیونکہ اس کے چہرے کا زخمی حصہ شل ہے لیکن جیسے ہی حقیقی تکلیف شروع ہو گی، تب اسے احساس بحال نہیں رہے گا بلکہ یہ کسی دوا کے لیے زیادہ کرنے لگے گی۔

"ناک کا یہ زخم تمہارے لیے جان لیوا تو نہیں۔"
"اسی لیے میں نے تم سے موت کی خواہش کی ہے کاش! ایک گولی میرے دل میں اتر گئی ہوتی۔ اس حالت میں زندہ رہنا کسی عورت کے لیے ممکن نہیں۔ اس سے موت بہتر ہے۔"
"میرا خیال ہے جب تم اپنے ملک واپس جاؤ گی تو لوگ دُور دُور سے تمہیں دیکھنے آئیں گے۔" میں نے زہر میں بجھے ہوئے الفاظ استعمال کیے حالانکہ اس میں میرے ارادے کو کوئی دخل نہیں تھا۔ "تب ان لوگوں کو احساس ہو گا کہ تمہاری قوم جس قوم پر حکومت کرنے کے خواب دیکھ رہی ہے، وہ قوم تمہارا حلیہ کس حد تک بگاڑ سکتی ہے۔"

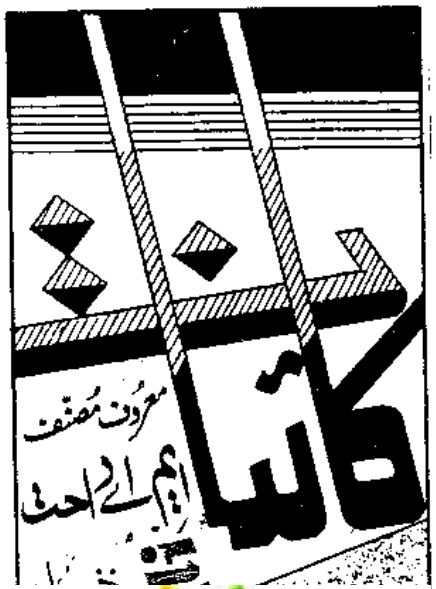

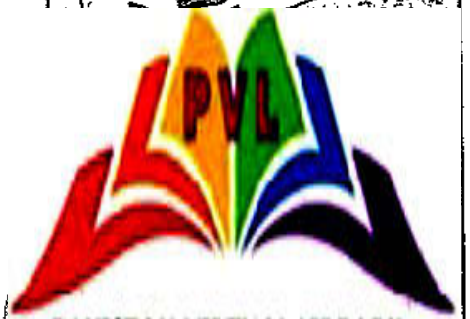

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس کی غزالی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔
ایک عورت کی آنکھیں! اس کے زخمی دل کی غماز تھیں اوران آنکھوں کی استدعا کوئی مرد نہیں ٹال سکتا تھا۔

"خدا کے لیے مجھے گولی مار دو۔"

"میں نے اب تک بہت سی گولیاں چلائی ہیں۔" میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ "اتنی گولیاں کہ مجھے ان کی تعداد بھی یاد نہیں۔ . . . بہت سی زندگیوں سے کھیلا ہے لیکن میں نے کسی کو کبھی بلاوجہ نہیں مارا۔"

"مجھے مارنے کی وجہ موجود ہے . . . اور معقول ہے۔"

"تمہارے لیے ہے، میرے لیے نہیں۔ میں بلاوجہ تمہارا خون اپنی گردن پر نہیں لینا چاہتا۔" میں نے حتمی لہجے میں کہا۔

"کاش! میرے پاس کوئی ریوالور ہوتا۔" اس نے دردناک لہجے میں کہا۔ "ایسی صورت میں میں اپنی منحوس زندگی کو اپنے ہاتھوں سے ختم کرکے اس اذیت سے نجات حاصل کر لیتی۔"

میں خاموش رہا۔

اس عورت نے مجھے بڑے امتحان میں ڈال دیا تھا۔

"صرف ایک گولی . . . اور میں پُرسکون ہو جاؤں گی۔" وہ سسک پڑی۔

اب اس کی سسکاریوں میں کرب اور اذیت بھی شامل ہو گئی تھی۔ غالباً ناک کے زخم نے ٹھنڈے ہونے کے بعد، اس کے پورے جسم میں درد کی لہریں دوڑانا شروع کر دی تھیں۔ اس نے آنکھوں کو سختی سے بند کر لیا۔

میں نے اس کی آنکھیں بند ہوتے ہی زمین پر چھلانگ لگا دی۔

"نہیں . . ." وہ عقب میں چیخ پڑی۔ غالباً میرے کودنے سے پیدا ہونے والی آواز نے اسے احساس دلا دیا تھا کہ میں جا رہا ہوں۔ "مجھے چھوڑ کر مت جاؤ، اجنبی! میں آہستہ آہستہ مرنا نہیں چاہتی . . . میں مرگ آلود زندگی نہیں چاہتی . . . میں زندہ درگور نہیں رہ سکتی۔ مجھے مار ڈالو . . . اس اذیت سے نجات دلا دو۔"

میرے قدم لڑکھڑا گئے۔

چند لمحوں تک میں سوچتا رہا . . . پھر میں آگے بڑھ گیا۔ گھوڑا زور سے ہنہنایا۔ وادی میں ہر طرف خاموشی کا راج تھا۔ عورت بھی خاموش ہو گئی تھی جیسے وہ مجھ سے مایوس ہو گئی ہو۔

میں نے گھوڑے کی طرف بڑھنا شروع کر دیا . . . لیکن میرے پاؤں من من بھاری ہو رہے تھے۔ میں رُک گیا۔ وہ چہرہ میرے ذہن سے چپک کر رہ گیا تھا . . . پھر میں واپس آیا۔ میں نے دروازے میں رُک کر اس کی طرف دیکھا اور گھوڑے کی زین سے رائفل کھینچ کر اس کی طرف پھینک دی۔

"لو۔ میں اس سے زیادہ تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔" میں نے کہا اور پلٹ کر اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر اسے ایڑ لگا دی۔ ابھی میں تھوڑی ہی دُور گیا تھا کہ اچانک عقب سے ایک دھماکا . . . سُنائی دیا۔ کچھ دیر اس دھماکے کی بازگشت سُنائی دیتی رہی . . . پھر خاموشی چھا گئی۔ دھماکے کی وجہ سے میرا گھوڑا بدک گیا تھا . . . اور بُری طرح دوڑنے لگا تھا . . . وادیٔ خوف سے میرا فاصلہ ہر گزرتے ہوئے لمحے کے ساتھ یوں کم ہوتا چلا گیا۔

وادیٔ خوف کی طرف بڑھتے ہوئے مجھ پر دیوانگی سی طاری ہو رہی تھی۔

گھوڑا تیزی سے دوڑ رہا تھا جیسے اس نئی اور خوف و ہراس سے بھرپور وادی میں قدم رکھتے ہی اس میں بھی وہی تبدیلیاں پیدا ہو گئی تھیں جن تبدیلیوں کو خود میں، اپنے آپ میں محسوس کر رہا تھا۔

اس انگریز عورت کا چہرہ بار بار میرے ذہن میں گھوم

ابلیکا

اسلم راہی

جس میں حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک دنیا کی تاریخ پیش کی گئی ہے

سات جلدوں میں مکمل سیٹ۔ /1950 روپے

اردو بازار لاہور

جاتا تھا جس پر بالآخر مجھے رحم آ گیا تھا اور میں نے خودکشی کرنے کے لیے اسے اپنی رائفل دے دی تھی۔ وادیٔ خوف کی طرف سفر کرتے ہوئے یہ چوتھا روز تھا اور ان چار دنوں میں جتنی ہولناکیاں میرے سامنے آئی تھیں، انہوں نے میرے دل میں انتقام کے شعلوں کو سرد کرنے کی بجائے مزید بھڑکا دیا تھا۔ مجھے تو اب یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے میں ایک ایسے ماحول میں زندہ ہوں جہاں ہوا اور دیگر اشیا کی بجائے خون کی لہریں ہی لہریں پھیلی ہوئی ہوں۔ خون کے اس سمندر سے گزر کر مجھے منزلِ مقصود پر پہنچنا تھا اور اس کے بعد . . . ؟ کسے معلوم کہ اس کے بعد کیا ہو۔

گوری جانے والے اس قافلے سے مجھے کھانے پینے کا کافی سامان مل گیا تھا جسے میں نے لٹیروں کے ہاتھوں سے بچایا تھا۔ وہ لوگ صرف ایک آدمی کھو کر باقی سب کو صحیح و سلامت لے کر نکل گئے تھے اور میرے بے حد شکرگزار تھے۔ میں نے اس دوران میں کئی بار اپنے دل کو ٹٹولا کہ ان کی مدد کرنے کی مجھے کیا ضرورت تھی؟ کیا مجھے اُن پر رحم آ گیا تھا؟ اُس انگریز عورت کو ٹھکانے لگانے کی بجائے، میں نے اپنی رائفل کیوں دے دی تھی؟ کیا میں کسی عورت کو قتل نہیں کر سکتا؟ میرے اندر ایک نئی شخصیت جنم لے چکی تھی جس کا تسلط میری رُوح تک تھا۔ میں نے اوّل تو اس نئی شخصیت پر کبھی غور ہی نہیں کیا . . . لیکن اگر کبھی خود سے کوئی خیال آ بھی گیا تو میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

چیریال کی سرائے والی نے مجھے بتایا تھا کہ وہ پانچوں دشمن وادیٔ خوف کی طرف روانہ ہو گئے ہیں۔ وادیٔ خوف میں اُن کی آمد کا کیا مقصد ہو سکتا ہے؟ وہ یوں آگے سے آگے کیوں بھاگے جا رہے ہیں؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ انہیں معلوم ہو گیا ہو کہ شاہیار خان خون کی پیاس بجھانے کے لیے موت کا سایہ بن کر اُن کا تعاقب کر رہا ہے؟

انہی اندیشوں اور خیالوں میں اُلجھا تیزی سے گھوڑا دوڑا تا رہا۔ گھوڑے کی ٹاپوں سے چٹانیں گونج رہی تھیں اور وہاں کی زرد خاک کے بادل اُٹھ رہے تھے۔ اب تک ایک بھی متنفس مجھے دکھائی نہیں دیا تھا حالانکہ جہاں سے مڈبھیڑ ہوئی تھی، وہاں سے میں کافی دُور نکل آیا تھا۔

ایک بار تو مجھے شبہ ہُوا کہ کہیں میں کسی ایسی راہ پر تو نہیں نکل آیا، جو مجھے وادیٔ خوف سے قریب تر لے جانے کی بجائے اس سے دُور کرتی جا رہی ہو؟

میں نے گھوڑے کی لگامیں کھینچ لیں۔

اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔

دُور دُور تک کسی آبادی کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔

ہر طرف چٹانیں تھیں یا پھر کہیں کہیں زرد میدانی جگہ نظر آتی تھی جن میں ہوا کے تیز جھونکوں کی وجہ سے بگولے اُٹھ رہے تھے۔ کاش! میں نے اس ناک کٹی عورت سے ہی وادیٔ خوف کا راستہ معلوم کر لیا ہوتا . . . لیکن اس بے چاری کو تو خود اپنا ہی ہوش نہیں تھا، وہ مجھے کیا بتا سکتی تھی۔

میں پریشان ہو گیا۔

دھوپ میں اب اتنی تیزی آ گئی تھی کہ زیادہ دیر اسے برداشت کرنا ممکن نہیں رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ کچھ دیر کسی چٹان کی اوٹ ہی میں گزار لی جائے۔ کسی ایسی جگہ کی تلاش میں دیر تک میری آنکھیں چکراتی رہیں . . . اور پھر ایک غار کا دہانہ مجھے نظر آ ہی گیا۔

میں نے گھوڑے کا رُخ موڑا اور اسی غار کی طرف چل پڑا۔

غار کشادہ لیکن تاریک تھا۔

غار میں قدم رکھتے ہی ٹھنڈک کا احساس ہُوا۔ میں ایک طرف نیم دراز ہو گیا۔ گھوڑے کے ہانپنے سے سانپ کی پھنکار جیسی آوازیں پیدا ہو رہی تھیں . . . میں نے آنکھیں بند کر لیں اور کچھ دیر سونے کی کوشش کرنے لگا۔

اچانک میرا پورا جسم تناؤ کا شکار ہو گیا۔

میرے عضلات جیسے منجمد ہو گئے۔

مجھے اپنی ٹانگ پر ایک رینگتی ہُوئی چیز محسوس ہُوئی تھی۔ میں نے جسم کو ساکت رکھتے ہُوئے اپنی ٹانگ کی طرف دیکھا اور اس کے ساتھ ہی مجھے یوں لگا جیسے میرا پورا جسم ٹھنڈے ٹھنڈے پسینے میں ڈوبنے لگا ہو۔

وہ ایک سانپ تھا۔

بے حد خوبصورت۔ اس کی کھال اتنی حسین تھی کہ بے اختیار ہاتھ بڑھا کر اسے پکڑ لینے کو جی چاہنے لگا۔ اس کی کھال پر غلنے اور دائرے سے بنے ہُوئے تھے جن میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بے پناہ چمک تھی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ سانپ ہیروں اور موتیوں سے مزین ہو اور یہ ہیرے کئی رنگوں کے تھے۔

اس کی دو شاخہ زبان تیزی سے حرکت کر رہی تھی۔

میں بے حس و حرکت نیم دراز رہا۔

سانپ کی آنکھیں خوفناک تھیں۔ خاصا لمبا اور وزنی سانپ تھا اور بہت ہی آہستہ آہستہ رینگتا ہوا میری پنڈلی سے ران کی طرف آرہا تھا۔ میرا بایاں ہاتھ زمین سے ذرا سا اٹھ گیا۔ اس مقصد کے لیے میں نے صرف بائیں بازو ہی کو حرکت دی تھی اور یہ کوشش کی تھی کہ جسم کے باقی عضو اس حرکت سے متاثر نہ ہوں۔۔۔ پھر میرا ہاتھ آہستہ آہستہ پہلو میں اٹھا اور وہاں تک گیا جہاں سے میرے خنجر کا دستہ قریب ہی تھا۔

گھوڑا ابھی خاموش تھا۔ وہ اس طرف دیکھ رہا تھا جدھر سانپ تھا۔ اگر اس وقت گھوڑا ذرا سا بھی بدحواس ہو جاتا یا کوئی آواز پیدا کر دیتا تو سانپ یقیناً مجھے ڈس لیتا۔۔۔ لیکن وہ یوں کھڑا تھا جیسے اُسے حقیقتاً سانپ ہی نے سونگھ لیا ہو۔ اس کی یہ خاموشی میرے حق میں تھی اور میں دل ہی دل میں دُعا کر رہا تھا کہ وہ کچھ دیر مزید اسی طرح خاموش اور ساکت ہی رہے۔

رفتہ رفتہ میرا ہاتھ خنجر کے دستے پر جم گیا۔

سانپ کا منہ اب میری ران تک پہنچ گیا تھا۔

اس کی دُم ابھی زمین پر تھی لیکن باقی جسم میری دائیں ٹانگ پر تھا۔ اور بے حد وزنی محسوس ہو رہا تھا۔ اس کی حرکت سے مجھے خراش سی محسوس ہو رہی تھی۔ مخمل کے بنے ہوئے اس سانپ کو دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کے کاٹے کا کوئی علاج نہیں۔ بے حد خطرناک اور زہریلا سانپ تھا۔۔۔ وہ اس دوست کی طرح بے حد حسین لگ رہا تھا جو دل میں بُغض کا۔ بھرے ہوئے ہو اور انسان کو اس کی ہلاکت خیزیوں یا تباہ کاریوں کا یقین ہی نہ آتا ہو۔

سانپ کی دو شاخہ زبان حرکت کر رہی تھی تو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ مجھ پر آگ پھونک رہا ہو۔۔۔ بے پناہ گرم پھپھکاریں تھیں۔ میرا ہاتھ خنجر کے دستے پر جم چکا تھا۔

وہ رینگتا ہوا میرے خنجر والے ہاتھ کے متوازی آگیا۔

جسم کو بے حرکت رکھتے ہوئے میں نے بائیں ہاتھ کو غیر محسوس انداز میں حرکت دی اور خنجر کو میان سے کھینچ لیا۔۔ پھر باقی جسم کے عضلات میں ذرا سی بھی حرکت پیدا کیے بغیر میں نے خنجر والے ہاتھ کو گھمایا۔

وار بچا تُلا اور بھرپور تھا۔

مخمل کے بنے ہوئے اس سانپ کی گردن ایک ہی جھٹکے میں کٹ کر دُور جا گری، اس کا جسم بڑے زور سے تڑپا لیکن میں نے نہایت پھرتی سے دونوں ہاتھ استعمال کیے اور اُسے اٹھا کر پھینکا ورنہ وہ میری ٹانگ کے گرد لپٹ جاتا تو میری کھال چھل جاتی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے جسم کو ایک طرف لڑھکا دیا۔ گھوڑا یکایک بدکا اور پھر اس نے اگلی ٹانگیں کھڑی کر دیں۔ وہ اتنی زور سے ہنہنایا کہ غار گونج اٹھا۔

میں جلدی سے سنبھل گیا اور اٹھ کر فوراً ہی اس کی رسی تھام لی۔ ورنہ شاید وہ مجھے ہی دولتیوں پر رکھ لیتا۔ گھوڑا پُرسکون ہوا تو میں نے مخملیں سانپ کی طرف دیکھا۔ اس کا دھڑ اب بھی تڑپ رہا تھا اور یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی نادیدہ ہاتھ اس خوبصورت کوڑے کو زمین پر حرکت دے رہا ہو جس کا دستہ کٹ کر الگ ہو گیا تھا۔

فدا دیر کی ہیجان خیزی تھی لیکن اس سے طبیعت بحال ہو گئی۔ باہر آگ برسنے لگی تھی۔ غار کا ماحول البتہ خنک تھا۔ اسی لیے یہ سانپ بھی کہیں سے رینگتا ہوا غار کی طرف نکل آیا تھا۔ اس قسم کا سانپ پہلے کبھی دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اس لیے میں نے احتیاطاً گھوڑے کو غار کے دہانے پر کھڑا کر دیا اور خود غار کا چپہ چپہ چھان مارا۔

غار میں کوئی بِل نہیں تھا اور نہ ہی کوئی دوسرا سانپ نظر آیا۔ ہر طرف سے مطمئن ہونے کے بعد ایک بار پھر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ گھوڑا غار کے دہانے پر اس انداز میں بندھا ہوا تھا کہ کوئی شخص اس سے نمٹے بغیر اندر نہیں آسکتا تھا جب کہ سانپ یا کسی جانور کو دیکھ کر گھوڑے کا بدکنا ضروری تھا اور یوں میں قبل از وقت کسی بھی مصیبت سے آگاہ ہو سکتا تھا۔

جلد ہی میری آنکھ لگ گئی۔

کبھی کبھار غار کے دہانے سے لُو کے جھلسا دینے والے بھبکے اندر آتے اور ایک لمحے کے لیے یوں محسوس ہوتا جیسے باہر زمین پر سورج اپنی تمام تر حدتوں کے ساتھ اتر آیا ہو۔ گھوڑے کے پاؤں پٹخنے کی آواز بھی سنائی دیتی تو آنکھ کھل جاتی

۔۔۔ پھر میں اس وقت تک آنکھیں بند نہ کرتا جب تک اطراف سے مطمئن نہ ہو جاتا۔۔۔ یوں ہی سوتے جاگتے شام کے سائے ڈھلنے لگے تو میں اٹھ بیٹھا۔ اب بھی گرم ہوا کے جھونکے محسوس ہو رہے تھے لیکن ان میں پہلے جیسی تپش نہیں تھی۔

پیاس لگ رہی تھی۔ میرے گھوڑے کی زین سے جو چھاگل بندھی ہوئی تھی اس میں چند قطرے تھے جن سے صرف حلق ہی تر ہو سکا۔ اس صورتِ حال نے پیاس کو مزید بڑھا دیا تو میں نے غار سے نکل کر پانی کی تلاش میں ادھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ یہ کوئی سراب تھا یا واقعی درختوں کا جھنڈ تھا، جو مجھے دُور اُفق سے کچھ ادھر نظر آ رہا تھا۔ میں نے گھوڑا اسی طرف بڑھا دیا۔

ایک گھنٹے تک پیاس سے نڈھال گھوڑے کو دوڑانے کے بعد جب میں وہاں پہنچا تو یہ دیکھ کر دل مطمئن ہو گیا کہ وہ نہ صرف درختوں کا جھنڈ ہی ہے بلکہ وہاں سے ایک ندی بھی بہتی ہوئی چٹانوں میں گر رہی ہے۔

گھوڑے نے خوب سیر ہو کر پانی پیا۔

میں نے اُسے چرنے کے لیے چھوڑ دیا اور خود ایک درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ دن بھر گرمی کی وجہ سے جتنی تھکن محسوس ہوئی تھی، اب ٹھنڈک کے احساس سے اتنی ہی راحت مل رہی تھی۔ میں نے تھیلے سے کھانے کی چند ٹکیاں نکالیں اور آہستہ آہستہ کھاتا رہا۔ اس دوران میں میری نگاہیں اطراف میں چکراتی رہی تھیں۔ ابھی میں کھانا ختم کر کے فارغ ہوا ہی تھا کہ اچانک یوں محسوس ہوا جیسے قریب ہی ایک چھپاکا سا ہوا ہو۔

میرا ہاتھ فوراً ہی ریوالور کے دستے پر پہنچ گیا۔

آواز ایسی تھی جیسے ندی میں کوئی چیز گری ہو۔

میں نے گھوڑے کی طرف دیکھا جو قریب ہی چر رہا تھا اس نے بھی آواز پر چونک کر کان کھڑے کر لیے تھے۔ گویا یہ میرا وہم نہیں تھا بلکہ واقعی کوئی غیر معمولی آواز تھی۔ میں ریوالور کے دستے پر ہاتھ رکھے چوکتا رہا اور کسی طرف سے مزید آواز یا آہٹ کا انتظار کرنے لگا۔

ایک چھپاکا سنائی دینے کے بعد خاموشی چھا گئی تھی۔

چند لمحوں تک کوئی آواز سنائی نہ دی تو میں نے گردن گھما کر ندی کی طرف دیکھا اور اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ کچھ فاصلے پر، ندی کے کنارے ایک شخص اوندھا پڑا تھا۔۔۔ گھٹنوں کے بل پانی پر جھکا ہوا تھا اس کی حالت خاصی ابتر نظر آ رہی تھی۔ اس کے پیروں میں کچھ نہیں تھا اور اُدھڑے ہوئے تلوے یہ ظاہر کر رہے تھے کہ وہ برہنہ پا سفر کرتا رہا ہے۔

میں ریوالور ہاتھ میں لیے آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھنے لگا۔

وہ بُری طرح پانی پیے جا رہا تھا۔

اس کے عقب میں پہنچ کر میں رُک گیا۔

پانی سے مُنہ اٹھا کر وہ یوں ہانپنے لگا جیسے ایک ہی سانس میں پوری ندی پینے کے بعد اس نے دوسری سانس لی ہو۔ اس کے ہانپنے کی آواز میں دھیمی دھیمی کراہیں بھی شامل تھیں۔

دفعتاً گھوڑا زور سے ہنہنایا۔

وہ شخص بدک کر کھڑا ہو گیا اور بدحواس نظروں سے ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ تب اس کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ میرے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کر اس کا پھٹا ہوا دہانہ مزید کھل گیا اور آنکھیں پھیل گئیں اس نے کانپتا ہوا ہاتھ میری طرف یوں اٹھایا جیسے اگر میں نے گولی چلائی تو وہ اس ہاتھ سے گولی کو روک ہی تو لے گا۔ اس کے چہرے پر ویرانیاں رقص کر رہی تھیں۔ وہ شدید زخمی تھا اور ان زخموں سے چُور چُور نہ جانے کہاں سے مارا مارا پھرتا ہوا بالآخر اس ندی تک آ پہنچا تھا۔ میں نے ریوالور والا ہاتھ ہٹا لیا۔

ریوالور والا ہاتھ ہٹتے ہی اس کی آنکھوں میں بے یقینی کا سایہ سا لہرا گیا۔ وہ اب بھی پھٹی پھٹی نگاہوں سے میری طرف متوجہ تھا البتہ اس کا مدافعت کے لیے اٹھا ہوا بازو بے جان سا ہو کر پہلو میں جھول گیا۔

میں نے اس کے لباس سے اندازہ لگایا کہ وہ ایک متمول آدمی ہے۔ معلوم نہیں وہ کن مصائب میں گھر کر اس حالت کو پہنچا تھا۔ میں توجہ سے اس کی طرف دیکھتا رہا اور منتظر رہا کہ وہ کیا کہتا ہے؟

میری خاموشی اور ریوالور سامنے سے ہٹ جانے کی وجہ سے رفتہ رفتہ اس کا خوف دُور ہوتا چلا گیا۔ حتیٰ کہ وہ خاصا پُرسکون نظر آنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں شک و شبے کی پرچھائیں اب بھی تھیں اور چہرے پر زخموں سے اٹھنے والی ٹیسوں سے بار بار عارضی سلوٹیں اُبھر اُبھر کر تحلیل ہو رہی تھیں۔

وہ ایک ادھیڑ عمر کا شخص تھا۔

قبائلی تھا اس لیے چہرے پر کرختگی تھی۔ اس کے ہونٹ

سفید پڑ گئے تھے جیسے موت نے ایک طویل بوسہ لینے کے بعد اچانک اُسے چھوڑ دیا ہو اور تھوڑی سی زندگی اس کے ہونٹوں پر مچلتی رہ گئی ہو۔

"تم کون... کون ہو... و؟" اس نے پھٹی پھٹی سی آواز میں پوچھا۔

"یہ سوال تو مجھے کرنا چاہیے" میں نے کہا۔

"تم... تم ان لوگوں کے ساتھی ہو؟"

"کن لوگوں کے؟" میں نے پوچھا۔

"وہی بھگوڑے فوجی..."

میں خاموش اس کی طرف دیکھتا رہا۔ بھگوڑے فوجی... یہ الفاظ میرے ذہن میں تیزی سے چکرانے لگے تھے اور میری نگاہوں میں وہ چہرے گھومنے لگے جن کے بارے میں رحیم بابا کے کاغذات سے معلوم ہوا تھا۔ میری دھڑکنیں تیز ہو گئیں اور مجھے یہ احساس ہی نہ رہا کہ میں بے خیالی میں اس شخص کو گھورے جا رہا ہوں۔

میری خاموشی سے وہ شخص ایک بار پھر دہشت زدہ ہو گیا اچانک اس کی آنکھیں چڑھنے لگیں۔

وہ یوں لہرایا جیسے نشے سے جھوم اٹھا ہو۔

میں نے جلدی سے بڑھ کر اُسے سہارا دیا۔ مجھے اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر وہ تیزی سے پیچھے ہٹا تھا لیکن میں نے اسے بروقت دونوں ہاتھوں میں جکڑ لیا ورنہ وہ ندی میں گر گیا ہوتا... اگلے ہی لمحے وہ میری بانہوں میں جھول گیا تھا۔

اُسے نرم نرم گھاس پر لٹا کر میں نے اس کی ہتھیلیاں سہلائیں اور پانی کے چھینٹے چہرے پر مارے۔ کچھ دیر تک وہ بے سُدھ پڑا رہا... پھر اس کے پپوٹوں میں خفیف سی حرکت پیدا ہوئی۔ اس نے آنکھیں کھول دیں لیکن ان آنکھوں میں بے پناہ ویرانی تھی۔

"مجھ سے خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔" میں نے لہجے میں ملائمت پیدا کرنے کی کوشش کی تو مجھے خود اپنی ہی آواز اجنبی لگنے لگی۔ "میں تمہارا دوست ہوں... مجھے بتاؤ تم اس قدر دہشت زدہ کیوں ہو... اور تمہیں یوں زخمی کر کے ان ویرانوں میں کس نے دھکیل دیا ہے؟"

وہ خالی خالی نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا۔

اس کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ ابھی اس کا دماغ ٹھکانے نہیں آیا۔ اس کے حواس ابھی قابو سے باہر تھے اور شاید وہ میری بات بھی توجہ سے نہیں سن پایا تھا۔ میں اس کی ہتھیلیاں کو دوستانہ انداز میں سہلاتا رہا۔

"تم کون ہو...؟" بہت دیر بعد اس نے پھٹی پھٹی سی آواز میں پوچھا۔

"میرا نام شاہیار خان ہے" میں نے مختصراً کہا۔

"وہ فوجی بھگوڑے..." اس نے مدھم آواز میں کہا تو میں فوراً ہی اس کے منہ کی طرف جھک گیا۔ "انہوں نے وادیٔ خوف پر قبضہ کر لیا ہے... سردار ہلاک ہو گیا ہے اور..."

یکایک اس کی آواز ختم ہو گئی۔ چند لمحوں تک ہونٹ بے آواز حرکت کرتے رہے... پھر اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ میں نے اسے پکارا لیکن پپوٹے لرزتے ہوئے بند ہو گئے۔ وہ کسی لاش کی طرح میرے سامنے پڑا تھا اور اس کی گردن ڈھلکی ہوئی تھی۔ میں ایک طویل سانس لے کر اُٹھ گیا۔

میرے ذہن میں اس وقت آندھیاں سی چل رہی تھیں فوجی بھگوڑے... وادیٔ خوف پر قبضہ... سردار کی ہلاکت... یہ مختصر اشارے تھے لیکن انہوں نے میری سوچوں کی دنیا میں بھونچال بھر دیے تھے۔

اچانک اس کے حلق سے خفیف سی کراہ سُن کر میں چونک پڑا۔

اس کی حالت سے پہلے تو میں اُسے مُردہ ہی سمجھا تھا

شعلے کا صحرائی
مصنف طارق اسمٰعیل ساگر
خوبصورت سرورق
دیدہ زیب پرنٹنگ و طباعت
قیمت =/150 روپے
مکتبہ القریش سرکلر روڈ اردو بازار لاہور
فون 7668958

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیکن شاید اس پر غشی طاری ہو گئی تھی۔ میں نے دونوں ہاتھوں کے پیالے میں پانی بھر کر اس کے حلق میں ٹپکایا... پھر میں اس کے زخموں کی طرف متوجہ ہُوا۔

میرے تھیلے میں ایسے زخموں کے لیے تھوڑی سی مرہم موجود تھی۔ یہ مرہم مجھے گوری کے سردار نے اس وقت دی تھی جب اس نے میرے زخمی ہاتھ کا علاج کیا تھا اور پھر قافلے سے رخصت ہوتے وقت اس نے بڑی محبت سے تاکید کی تھی کہ میں اس مرہم کو اس وقت تک استعمال کرتا رہوں جب تک زخم بالکل ٹھیک نہیں ہو جاتا۔

زخموں کو صاف کر کے میں نے مرہم لگا دی۔

بعض زخم گہرے تھے اور ان سے اب بھی خون رس رہا تھا ان زخموں پر میں نے کپڑے کی دھجیاں رکھ کر پٹی باندھ دی پٹیاں بنانے کے لیے میں نے اسی شخص کی قمیص کو... کئی جگہ سے چاک کر دیا تھا۔ شام گہری ہوتی جا رہی تھی اور کچھ ہی دیر بعد تاریکی پھیلنے والی تھی۔ میں جس غار سے نکل کر آیا تھا اس کا فاصلہ کافی زیادہ تھا۔ اس لیے میں زخمی کو لے کر واپس نہیں جانا چاہتا تھا... اور جو معلومات مجھے اس سے حاصل ہوئی تھیں، ان کی روشنی میں آگے بڑھنا بھی میرے لیے خطرے سے خالی نہیں تھا۔ اس لیے میری خواہش تھی کہ وادیٔ خوف اور ان بھگوڑے فوجیوں کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلوم کرنے کے بعد ہی کوئی قدم اٹھایا جائے۔

زخمی جس طرف سے آیا تھا، اُدھر سے ایک پگ ڈنڈی ندی تک آتی دکھائی دے رہی تھی اس لیے میں نے سوچا کہ اس پگڈنڈی سے ہٹ جانا چاہیے۔ ممکن ہے کوئی اس کے تعاقب میں بھی چلا آ رہا ہو۔ زخمی کو اٹھا کر میں ندی کے بہاؤ کی سمت میں بڑھا اور ایک محفوظ جگہ دیکھ کر اُسے دوبارہ گھاس پر لٹا دیا۔ اس کے زخموں سے خون کافی مقدار میں بہہ چکا تھا اس لیے نقاہت کی وجہ سے بار بار اس پر بے ہوشی طاری ہو جاتی تھی۔ پٹیاں بھی خون سے بھیگ چکی تھیں۔

میں نے تھیلے سے کھانے کی چند اشیا نکالیں اور جیسے تیسے اُسے کھلانے لگا۔ میری خواہش تھی کہ وہ جلد سے جلد بات چیت کے قابل ہو جائے لیکن وہ اس قدر بے حال تھا کہ ہر لمحے اس کی رُوح قفسِ عنصری سے پرواز کر جانے کا دھڑکا سا لگا رہا۔ وہ بار بار آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھتا رہا۔

کئی بار اس کے لبوں نے حرکت بھی کی لیکن میں آواز نہ سُن سکا۔

اب اس کے چہرے پر وہ دہشت نہیں تھی جسے میں نے پہلے دیکھا تھا بلکہ وہ مجھے دوست سمجھنے لگا تھا۔ ایک دو بار اس کے ہونٹ اس انداز میں بھی پھیلے تھے جیسے وہ طمانیت کے احساس سے مسکرانا چاہتا ہو... لیکن اگلے ہی لمحے زخموں سے اٹھنے والی کوئی زبردست ٹیس اس کے ہونٹوں سے یہ مسکراہٹ چھین لیتی تھی۔

میں اس کے بارے میں خاصا فکرمند رہا۔

اس کا جسم اب شدید بخار سے تپ اٹھا تھا اور وہ بار بار یوں منہ کھول رہا تھا جیسے کسی مچھلی کو پانی سے نکال کر ساحل پر پھینک دیا گیا ہو۔

تاریکی اچانک ہی پھیل گئی۔

میں ایک طویل سانس لے کر اٹھا اور اس طرف بڑھ گیا جہاں گھوڑا اب بھی چر رہا تھا۔ گھوڑے کو لا کر میں نے قریبی درخت سے باندھ دیا کیونکہ میں نے مزید آگے بڑھنے کا ارادہ ملتوی کر دیا تھا۔ زخمی اب بھی نڈھال پڑا تھا۔

جس جگہ میں نے زخمی کو لٹایا تھا، وہ عام راستے سے کافی ہٹ کر تھی۔ اس کے علاوہ قریب ہی ایک چٹان تھی جس کے نچلے حصّے میں کٹاؤ تھا۔ اس چٹان کی وجہ سے گھوڑے کو اور ہمیں اس وقت تک نہیں دیکھا جا سکتا تھا جب تک کہ کوئی شخص ٹھیک اسی جگہ نہیں پہنچ جاتا۔

میں نے الاؤ روشن کیا اور خود چاروں طرف دُور دُور تک گھوم پھر کر دیکھ لیا کہ کہیں وہ روشنی کسی جگہ سے دکھائی تو نہیں دیتی... رات کی ابتدائی تاریکی چاندنی کی وجہ سے رفتہ رفتہ چھٹ گئی تھی اور یوں لگ رہا تھا جیسے اس سارے علاقے پر غبار سا چھایا ہوا ہو۔ اس چمکیلے غبار میں، الاؤ میں سلگتی ہوئی کسی لکڑی سے اٹھنے والا دھواں البتہ نظر آ رہا تھا۔

واپس آ کر میں نے اس سلگتی ہوئی لکڑی کو پھونکیں مار مار کر بھڑکا دیا اور پھر یہ احتیاط رکھی کہ لکڑیوں سے شعلے بھڑکتے ہی رہیں۔ زخمی سے ملاقات ہوئے ابھی نصف گھنٹہ ہی گزرا تھا۔ میرا خیال تھا کہ نصف شب کے بعد کوئی خطرہ نہیں رہے گا۔ کیونکہ اگر کوئی اس کی تلاش میں تھا تو اس وقت تک یا تو یہاں پہنچ جائے گا یا پھر آگے نکل جائے گا۔

میرے پاس ایسی کوئی دوا نہیں تھی جس سے زخمی کا بخار ٹوٹ جاتا۔ بس میں اتنی ہی کوشش کر سکتا تھا کہ اس کے زخموں سے مزید خون ضائع نہ ہونے پائے۔ اس کوشش میں مجھے اب بڑی حد تک کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ یکایک اس کا جسم ٹھٹھرنے لگا۔ بخار کی شدت کم ہوگئی تو وہ بُری طرح کانپنے لگا۔ جیسے اُسے تپ لرزاں نے آ لیا ہو۔ اپنا کمبل اس پر ڈال کر میں نے الاؤ میں آگ اور تیز کر دی۔

میں اس کے قریب ہی بیٹھ گیا تھا تاکہ اگر وہ کسی وقت کچھ کہے تو میں آسانی سے سُن سکوں۔ اس کے علاوہ الاؤ میں لکڑیاں بھی جلتی رکھوں۔ درختوں کی وجہ سے مجھے خشک شاخیں جمع کرنے میں زیادہ دُشواری نہیں ہوئی تھی۔ میں الاؤ میں بھڑکتے ہوئے شعلوں کو دیکھتا رہا اور سوچتا رہا۔ اَن گنت خیالات تھے، بے شمار اندیشے تھے... اور صرف ایک خواہش تھی! اتنی سی خواہش کہ میں پانوش کے قاتلوں کو سسکا سسکا کر جان سے مار ڈالوں۔

بیکار بیٹھے بیٹھے مجھے بھی اونگھ آگئی۔

شاید میں بیٹھے بیٹھے سو ہی جاتا کہ ایک آہٹ نے مجھے چونکا دیا۔

میں نے سب سے پہلے تو زخمی کی طرف دیکھا۔ وہ خاموش اور بے حرکت لیٹا ہوا تھا اور اس کی چھوٹی چھوٹی سی آنکھیں آسمان کو گھور رہی تھیں۔ اس کے چہرے کی جھریاں ساکت تھیں اور ہونٹ بھی منجمد سے لگ رہے تھے۔ مجھے شبہ ہوا کہ وہ مر چکا ہے۔ میں نے اس کی کلائی تھام لی۔ نبض آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ بے حد خفیف اور مدھم سی دھڑکن تھی جیسے زندگی، موت کے نیچے دبی آخری ہچکیاں لے رہی ہو۔

ویسی ہی آہٹ دوبارہ سنائی دی جسے سُن کر میں چونک پڑا تھا اور میں زخمی کی طرف متوجہ ہونے کی وجہ سے اسے بھول گیا تھا یا پھر فوری طور پر میں یہی سمجھا ہوں گا کہ وہ آہٹ درحقیقت زخمی ہی کی ایک کراہ ہوگی۔

میں نے اطراف میں دیکھا۔

ایک سایہ سا دائیں جانب سے بائیں طرف لپکا تھا۔

میرا ہاتھ برق رفتاری سے ہولسٹر پر جا پہنچا اور اگلے ہی لمحے میں نے ریوالور نکال لیا۔ میری آنکھیں جھاڑیوں اور درختوں کی طرف بھٹک رہی تھیں۔ صرف ایک ہی سمت کھلی تھی جدھر سے کوئی حملہ آور آ سکتا تھا۔ میں سمجھا کہ شاید اس زخمی کا پیچھا کرنے والے ہمارا سُراغ لگانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ اس خیال کے تحت میں پوری طرح تیار ہو گیا۔ زندگی اور موت کے درمیان ایک بار پھر کشمکش شروع ہونے کے آثار پیدا ہو گئے تھے اس لیے میں پوری طرح چوکنا تھا۔ میں موت کو اس وقت تک اپنے قریب نہیں آنے دینا چاہتا تھا جب تک میرے ہاتھوں انتقامی کارروائی پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ جاتی۔

میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کھلی سمت میں دیکھتا رہا۔

وہ کوئی انسانی سایہ تو ہرگز نہیں ہو سکتا تھا۔ کوئی انسان اتنی تیزی سے حرکت نہیں کر سکتا۔ کوئی چیز تھی جو دائیں سے بائیں سمت میں پلک جھپکتے ہی چلی گئی تھی... اور پھر میری نگاہ اُس جھاڑی پر جم گئی جس میں مجھے دو خوفناک اور روشن آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔ بادی النظر میں یہ دونوں آنکھیں دہکتے ہوئے انگاروں جیسی تھیں۔

"اوہ... بھیڑیا..." بے اختیار میں نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔

میں ان آنکھوں کو گھورتا رہا تب مجھے احساس ہوا کہ وہاں ایک دو نہیں کئی بھیڑیے ہیں۔ میں نے رائفل بھی اٹھالی اور خنجر کو بھی میان میں درست کر لیا... پھر میں رائفل ایک ہاتھ میں اور ریوالور دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں جکڑے اس طرف بڑھا جدھر سے بھیڑیئے نظر آ رہے تھے۔ اچانک مجھے رُک جانا پڑا۔

وہ تعداد میں کئی تھے۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ ان بھیڑیوں کو فائرنگ کر کے مار بھگانا چاہیے یا نہیں... نہیں... فوراً ہی

شعلے کا سوامی
مصنف طارق اسمٰعیل ساگر
خوبصورت سرورق
دیدہ زیب پرنٹنگ و طباعت
قیمت =/150 روپے
مکتبہ القریش
سرکلر روڈ اردو بازار لاہور
فون 7668958

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میرے شعور میں جواب اُبھرا۔ فائرنگ رات کے وقت دُور دُور تک سنائی دے سکتی تھی اور آوازیں کسی کو ہماری طرف متوجہ بھی کر سکتی تھیں۔ میں آہستہ آہستہ واپس آیا اور وہیں بیٹھ گیا جہاں میں چٹان سے ٹیک لگائے ہوئے تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اس وقت تک فائر نہیں کروں گا جب تک ویسا کرنا میرے لیے ناگزیر نہ ہو۔

بھیڑیئے غالباً آگ کی وجہ سے قریب نہیں آ رہے تھے۔ یہ دیکھ کر میں نے الاؤ میں مزید سوکھی لکڑیاں پھینک دیں۔ شعلے بھڑک اُٹھے اور اس جگہ مزید اجالا ہو گیا۔ میں خاموش بیٹھا الاؤ میں لکڑیاں جھونکتا رہا اور اس دوران کھلی سمت میں بھی دیکھتا رہا۔ جھاڑیوں میں چھپے ہوئے بھیڑیوں کی آنکھوں میں شعلوں کا عکس لہرانے لگا تھا۔

اچانک ایک بھیڑیا غرّایا اور تیزی سے آگے بڑھا۔

میں نے رائفل کی نال سیدھی کر لی لیکن لبلبی پر انگلی کو پُرسکون رکھا۔

بھیڑیا الاؤ سے کچھ فاصلے پر رُک گیا۔

فوراً ہی اس کے پیچھے تین اور بھیڑیئے نظر آئے۔ ان کی آنکھیں اب مزید خوفناک محسوس ہو رہی تھیں۔ ان کے جبڑے کھُلے تھے اور نوکیلے دانتوں کی قطاروں سے سُرخ سُرخ زبانیں جھول رہی تھیں۔ جن سے ٹپکتی ہوئی رالوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ زخمی کے خون کی بُو سے بے چین ہو رہے ہیں... لیکن الاؤ میں آگ روشن دیکھ کر شاید وہ فیصلہ نہیں کر سکے تھے کہ زخمی ابھی زندہ ہے یا نہیں... پھر میری موجودگی ان کے لیے الگ پریشان کُن تھی۔

ان چاروں کے پیچھے مزید آنکھیں بھی چمک رہی تھیں اور اندازہ ہوتا تھا کہ وہ زیادہ دیر صبر کا مظاہرہ نہیں کریں گے۔ سب سے آگے جو بھیڑیا تھا، وہ کچھ زیادہ ہی بھوکا اور بے چین دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے دونوں عقبی پنجے چٹانی زمین پر جمے ہوئے تھے اور وہ سامنے والے پنجوں سے بار بار زمین کو کھرچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے حلق سے نکلنے والی غرّاہٹیں خوفناک تھیں اور وہ بے حد آہستہ آہستہ آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے نتھنے تیزی سے پھول پچک رہے تھے۔

دفعتاً اس نے جست لگائی۔

وہ الاؤ سے کچھ اور قریب ہو گیا۔

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ مجھے حرکت کرتے دیکھ کر وہ خوفناک انداز میں غرّایا اور دو قدم ہٹ گیا۔ میں آہستہ آہستہ آگے بڑھتا رہا حتیٰ کہ میرے اور اس بھیڑیئے کے درمیان بہت کم فاصلہ رہ گیا۔ تب میں نے رائفل کی نال جھکائی اور ٹریگر سے انگلی ہٹا کر ہاتھ کو آہستہ آہستہ سرکایا... پھر رائفل میرے ہاتھ میں گھوم گئی۔ اب نال پر میری انگلیوں کی گرفت تھی اور رائفل کا کُندا زمین پر تھا۔ نال ہاتھ میں جکڑتے ہی میں نے پوری قوت سے رائفل گھمائی۔ حملہ اچانک تھا۔ رائفل کا کُندا بھیڑیئے کی کھوپڑی پر پڑا۔

اس کے حلق سے تیز خرخراہٹ نکلی۔ وہ تیزی سے اُچھلا تھا لیکن رائفل کا کُندا اپنا کام کر گیا تھا۔ اس کی کھوپڑی چٹخ گئی تھی۔ عقبی تینوں بھیڑیئے غرّاتے ہوئے پیچھے ہٹ گئے۔ میں نے بڑھ کر ایک بار پھر رائفل گھمائی لیکن پہلے بھیڑیئے کے عقب میں بیٹھے ہوئے تینوں درندے جھاڑیوں میں جا کر غائب ہو گئے تھے۔

جھاڑیوں میں اب بھی اَن گنت آنکھیں چمک رہی تھیں یوں لگ رہا تھا جیسے وہ جھاڑیاں اپنی بے شمار آنکھوں سے مجھے گھور رہی ہوں۔ میں نے اس بھیڑیئے کی طرف دیکھا جس کی کھوپڑی پاش پاش ہو چکی تھی۔ اس کا جسم ابھی تک تڑپ رہا تھا کھوپڑی چٹخ کر بہہ رہی تھی۔

میں واپس اُسی جگہ آ بیٹھا۔ جہاں سے اٹھا تھا اور پھر میں جھاڑیوں کی طرف دیکھنے لگا جہاں چمک دار آنکھوں کی تعداد کچھ اور بھی زیادہ ہو گئی تھی۔ میں دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کر رہا تھا کہ بھیڑیئے نہ صرف خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹ گئے تھے بلکہ مجھے فائر کرنے کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔

میں زخمی قبائلی کی طرف متوجہ ہُوا۔

اس کے حلق سے خفیف سی کراہ نکل تھی۔

"بھیڑیئے..." اس کے ہونٹوں سے بہت دیر بعد پہلا لفظ میری سماعت تک پہنچا اور میں خوشی سے جھوم اٹھا۔ اس کا مطلب تھا کہ میری محنت رائگاں نہیں گئی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ کچھ ہی دیر بعد وہ مجھ سے خاطر خواہ گفتگو کے قابل ہو جائے گا۔ دفعتاً مجھے اپنی پشت پر دھیمی سی آواز سنائی دی۔ میں نے رائفل کے کُندے سے پلٹتے ہی حملہ کیا۔

ایک بھیڑیا موقع پا کر نہ جانے کیسے فوراً ہی میرے عقب میں پہنچ گیا تھا۔ رائفل کا کُندا اس کی تھوتھنی پر پڑا اور اس کے کھلے دہانے میں پھنس گیا۔ میں نے پوری قوت سے جھٹکا مارا

لیکن اس کی گرفت غالباً کچھ زیادہ ہی سخت تھی۔ وہ رائفل کے ساتھ ہی گردن کے بل اچھلتا محسوس ہُوا۔ میں نے ایک ٹھوکر پوری قوت سے اس کے پیٹ میں ماری۔ جس کے نتیجے میں وہ فضا ہی میں لڑھکنیاں کھاتا ہوا الاؤ میں جا گرا۔

وہ بڑے زور سے غرایا اور یوں تڑپا کر جلتی ہوئی لکڑیاں منتشر ہوگئیں۔ میں نے جھپٹ کر پھر حملہ کیا لیکن وہ اپنے جھلسے ہوئے جسم کو لے کر فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا۔ اس کی غراہٹوں سے وہاں کا ماحول کانپ گیا۔ جواباً دوسرے بھیڑیئے بھی غرانے لگے۔ ایک ساتھ بہت سے بھیڑیوں کی غراہٹوں سے فضا کانپ رہی تھی اور یوں لگ رہا تھا جیسے میں یکایک کسی ایسے جنگل میں پہنچ گیا ہوں جہاں کے تمام درندے ایک دوسرے پر پل پڑے ہوں۔

بے پناہ شور ہو رہا تھا۔

میں زخمی کے سر کی طرف یوں بیٹھ گیا کہ میری پشت چٹان کی طرف رہی اور میں دائیں بائیں کے علاوہ سامنے کے کھلے حصے کو بھی نگاہ میں رکھ سکتا تھا۔ وہ اب خاصا ہوش میں نظر آ رہا تھا۔

"سنو دوست!" میں نے ہر ممکن دوستانہ لہجے میں کہا۔ "اگر تم ان پانچ بھگوڑے فوجیوں کے بارے میں بتا سکو تو ممکن ہے میں تمہارے لیے مزید کارآمد ثابت ہو سکوں۔ ظاہر ہے سوادی میں تمہارے کچھ ایسے عزیز رشتے دار بھی ہوں گے جن کی زندگی خطرے میں ہوگی۔"

اس کے ہونٹ کانپ گئے۔

وہ نہایت دھیمی آواز میں بولنے لگا۔

"ٹھہرو..." میں نے کہا۔ "میں باری باری ان پانچوں کے حلیے تمہیں بتاتا ہوں۔ اگر میرے بتائے ہوئے حلیے کے مطابق ہی وہ آدمی ہوئے تو تم اثبات میں سر ہلا کر تائید کر سکتے ہو..."

میں نے سب سے پہلے سارجنٹ فرینک کا حلیہ بتایا۔

وہ سوچ میں ڈوب گیا تو میں نے مزید سہولت کے لیے کہا۔ "میری صورت اس سے کافی ملتی جلتی ہے۔ کیا وہی ان کا سرغنہ ہے؟"

اس نے میری طرف دیکھا اور پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔ "اب تم بے فکر ہو کر اُن لوگوں کے بارے میں بتاؤ۔ میں انہیں پہچان چکا ہوں۔ جس شخص کے نقش و نگار مجھ سے ملتے جلتے ہیں، اس کا نام سارجنٹ فرینک ہے۔"

"ہاں... وہ آدمی نہیں درندہ ہے۔" اس نے ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں کہا۔

"وادیٔ خوف یہاں سے کتنی دُور ہے؟"

"پیدل چلیں تو دو دن اور دو راتیں لگیں گی۔"

"اوہ..." میں نے ایک طویل سانس لی اور پچھلی سمت سے آہستہ آہستہ آگے بڑھتے ہوئے بھیڑیوں کی طرف دیکھ کر ٹرائیگر دبا دیا۔ رائفل گرج اٹھی اور بھیڑیئے ایک دوسرے پر گرتے پڑتے واپس دوڑے۔ میں نے اوپر تلے دو تین فائر کیے اور پھر ریوالور نکال کر کھلی جگہ نکل گیا، جہاں میں نے جھاڑیوں میں نظر آنے والی چمک دار آنکھوں پر گولیاں برسانا شروع کر دیں۔

اندھیرے میں اَن گنت بھیڑیوں کے فرار سے جھاڑیاں ٹوٹنے لگیں۔ غراہٹیں اور خرخراہٹیں سُنائی دیں۔ زخمی کی زبان سے یہ سُن کر کہ وادیٔ خوف اتنی دُور ہے، میں نے ہر احتیاط بالائے طاق رکھ دی تھی۔

"تمہارے سردار کا کیا نام تھا؟" میں نے اطمینان کی سانس لے کر زخمی کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔

"تم کون ہو اور ان بھگوڑوں سے تمہارا کیا تعلق ہے؟"

"میرا نام شالیار خان ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "اور میرا ان سے وہی تعلق ہے، جو کسی درندے میں اور کسی انسان میں ہو سکتا ہے۔"

"اوہ... تم ان کے دشمن ہو؟"

نامور مصنف ایم۔ الیاس۔ کے شہکار
قلم سے ایک اچھوتی کہانی
ذلیل
خوبصورت سرورق عمدہ پرنٹنگ کتابت
قیمت =/150 روپے

"خون کا پیاسا ہوں۔" میں نے بے قابو ہوتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے میں عملاً ان میں سے کسی کا خون بھی پی جاؤں گا۔"

وہ بُری طرح کانپ گیا۔ تب مجھے احساس ہُوا کہ میرے لہجے میں بے پناہ سفاکی تھی جس کا وہ زخموں سے چُور چُور شخص ہرگز متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے مسکرانے کی کوشش کی لیکن پہلی بار مجھے ناکامی ہوئی۔ اس کا اندازہ مجھے زخمی کی آنکھوں سے ہُوا وہ دہشت بھرے انداز میں میری طرف دیکھ رہا تھا۔

"بہرحال، میں ان سب کے علاوہ ہر کسی کا دوست ہوں" میں نے لہجے میں نرمی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ یہ نرمی اب میرے لیے خواب و خیال کی سی بات ہو گئی تھی۔ "کیا تم ان سے انتقام نہیں لینا چاہتے؟"

"انتقام...؟" اس نے عجیب سے لہجے میں کہا اور پھر اس کی آنکھوں کے کنارے بھیگ گئے۔ غالباً بے پناہ زخمی ہونے کی وجہ سے وہ خود کو کچھ زیادہ ہی بے بس سمجھنے لگا تھا۔ "نہیں... میں ان سے انتقام نہیں لے سکتا۔ میری صرف ایک بیٹی زندہ ہے... زندہ بھی ہے یا نہیں... میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔"

"اوہ... وہ کہاں ہے؟"

"وہ ان درندوں کے نرغے میں ہے۔ اجنبی دوست! اُسے اُن سے بچا لینا۔ وہ بے حد معصوم ہے۔ اُسے دو روز پہلے تک کسی مرد نے دیکھا تک نہیں تھا۔ وہ اتنی پاک تھی کہ اس کی قسم کھائی جا سکتی تھی لیکن..." وہ سسک پڑا۔

میں بُت بنا بیٹھا اس کی باتیں سُنتا رہا۔

اس نے مجھے سب کچھ تفصیل سے بتا دیا۔ یہ پانچوں بھگوڑے فوجی وادیٔ خوف میں داخل ہُوئے اور انہوں نے وہاں آتے ہوئے قبائلی غنڈوں سے مل کر سازباز کی اور بیشتر لوگوں کو خرید لیا۔ کچھ لوگ جو بکنے سے رہ گئے انہیں یا تو قتل کر دیا گیا یا پھر وہ مجبوراً ان کا اقتدار قبول کرنے پر رضامند ہو گئے۔ جن لوگوں کو قتل کیا گیا ان کے گھروں کو لُوٹ لیا گیا۔ ان کی عورتیں اغوا کر لی گئیں اور بچوں کو ذبح کر کے گلیوں میں پھینک دیا۔ سردار قاسم ایک نیک دل، بہادر اور اچھا آدمی تھا اور بستی کا ہر فرد اس کی عزت کرتا تھا حتیٰ کہ لٹیرے تک وادیٔ خوف کی طرف نگاہ نہیں اُٹھاتے تھے۔

یہ علاقہ قبائلی ڈاکوؤں اور راہزنوں سے بھرا پڑا تھا۔ وادیٔ خوف کے باہر جتنے بھی ویرانے ہیں، اُن میں جا بجا یہ لٹیرے اپنی کمین گاہیں بنا کر رہ رہے تھے... لیکن جیسے ہی ان پانچ بھگوڑے فوجیوں نے وادیٔ خوف پر قبضہ کیا، تمام لٹیرے اور راہزن اس بستی میں گھس آئے جیسے دریا کا بند ٹوٹ جائے تو سیلاب کسی بستی میں داخل ہو جاتا ہے۔

یہ تمام لوگ سارجنٹ فرینک اور اس کے ساتھیوں سے مل گئے۔ وادیٔ خوف کے باشندے بذاتِ خود کوئی شریف لوگ نہیں تھے۔ وہ بارود کی زبان میں بات کرنا زیادہ پسند کرتے تھے لیکن دہشت گردوں نے اُن کی سٹی گم کر دی اور اب ہر شخص کسی خوف زدہ کتے کی طرح دُم دبائے گھومتا نظر آنے لگا تھا۔

زخمی نے مجھے بتایا کہ وادیٔ خوف کے آس پاس چاروں طرف ان ڈاکوؤں اور لٹیروں کی موجودگی درحقیقت ایک بہت پرانے سردار کی چال تھی۔ اس سردار نے وادیٔ خوف میں اسلحہ سازی کا کام شروع کروایا تھا اور پھر یہ اسلحہ یہاں سے ہر اس جگہ تک فروخت ہونے لگا جہاں تک قبائلیوں کے قدم جا سکتے تھے یا جہاں کہیں سے بھی گاہک آسکتا تھا، آ کر اسلحہ لے جاتا تھا۔

وادیٔ خوف میں کئی قوموں کے لوگ موجود تھے لیکن انہیں شناخت کرنا ممکن نہیں رہا تھا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ لوگ برسوں سے یہاں نہ صرف آباد تھے بلکہ انہوں نے مقامی طرز کا رہن سہن بھی اختیار کر لیا تھا... گویا اس پورے علاقے میں وادیٔ خوف ایک امیر ترین بستی تھی جہاں آج کل دہشت پسندوں کا تسلط قائم ہو گیا تھا۔

وادیٔ خوف کے بارے میں تفصیل بتانے کے بعد زخمی نے اپنا دردِ دل بیان کرنا شروع کر دیا۔ دیگر حالات سناتے وقت بھی وہ بار بار اپنے حالات کی طرف بھٹک جاتا تھا لیکن میں ہر بار اسے ٹوک دیتا تھا... اب جب کہ وہ بہت کچھ بتا چکا تھا اس لیے میں نے سوچا کہ اب اسے بھی دل کی بھڑاس نکال لینے دی جائے تو کوئی ہرج نہیں۔

اس نے اپنی دردناک کہانی سُنائی۔ بالکل وہی کچھ ہوا تھا جو ایسے حالات میں طاقت ور اور کمزوروں کے درمیان دُنیا میں ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے۔ میں نے ایک بار پھر پلٹ کر جھاڑیوں کی طرف دیکھا اور چونکے بغیر نہ رہ سکا۔

بھیڑیئے ایک بار پھر جمع ہونے شروع ہو گئے تھے۔

بولتے بولتے زخمی کا حلق خشک ہو گیا تھا۔

اس نے تھوک نگل کر حلق کو تر کرنے کی کوشش کی۔

لیکن اس کی زبان پھول چکی تھی اور اُسے نہ صرف پانی کی شدید ضرورت تھی بلکہ اُسے اب کچھ دیر خاموش بھی رہنا چاہیے تھا۔ میں نے پانی کی بوتل سے اُسے چند گھونٹ پلائے اور بوتل دوبارہ گھوڑے کی زین کے قریب رکھ دی۔ گھوڑا بار بار ہنہنا رہا تھا اور ٹاپیں مار رہا تھا گویا وہ ہمیں بھیڑیوں کی دوبارہ آمد کی اطلاع دے رہا تھا۔

میں نے ایک بار پھر رائفل اٹھائی اور فائر کر دیا۔
گولی کی آواز سے رات کا سناٹا مجروح ہو گیا۔
اس بار بھی جھاڑیوں میں طوفان اٹھا لیکن بھیڑیوں کی چمک دار آنکھیں پوری طرح غائب نہ ہوئیں۔ مجبوراً مجھے جھاڑیوں کی طرف جا کر چند گولیاں ضائع کرنا پڑیں۔ میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ رات آدھی گزر چکی تھی۔ میں نے زخمی کے حلق میں چند گھونٹ پانی ٹپکایا اور الاؤ میں چند خشک لکڑیاں پھینک کر قہوہ چڑھا دیا۔

قہوہ تیار ہُوا تو میں نے قدرے ٹھنڈا کر کے زخمی کو پلایا اور خود بھی پیا... پھر میں اس کے قریب بیٹھ گیا اور بستی کے بارے میں مزید باز پرس کرنے لگا۔ اب میں ان لوگوں کے بارے میں دریافت کر رہا تھا جن کی مجھے معاونت حاصل ہو سکتی تھی۔
زخمی قبائلی کو یقین نہیں تھا کہ ان لوگوں میں سے کون کون زندہ ہوگا لیکن پھر بھی اُسے یقین تھا کہ اگر میں نے اس کے حوالے سے بات چیت کی تو وہ لوگ میری ہر طرح سے مدد کے لیے آمادہ ہو جائیں گے۔ بستی کے اصل باشندے لٹیروں اور غیر ملکیوں کے تسلط کو کسی طرح بھی قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہو سکتے تھے۔ یہ الگ بات تھی کہ وہ وقتی طور پر شدید دباؤ کی وجہ سے خاموش رہنے پر مجبور ہو گئے تھے۔
بہت دُور کہیں سے گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دینے لگیں۔
میں چونک پڑا۔
زخمی کا چہرہ یکایک کفن کی طرح سپید پڑ گیا۔
"کیا تمہارا کسی نے پیچھا بھی کیا تھا؟" میں نے پوچھا۔
"ہاں... لیکن میں بچ نکلا... یہ گھوڑوں کی ٹاپیں ان لوگوں کی نہیں ہو سکتیں۔ میں نے ان سب کو مایوس ہو کر واپس جاتے دیکھا تھا۔"
"پھر یہ کون ہوں گے؟"
"لٹیروں کا کوئی گروہ شاید وادئ خوف کی طرف جا رہا ہے۔"
میں نے اس کھلی سمت میں دیکھا جہاں چمک دار آنکھوں نے ایک بار پھر جمع ہونا شروع کر دیا تھا۔ اب فائرنگ نہیں کی جا سکتی تھی اور میں الاؤ کو بھی روشن نہیں رکھنا چاہتا تھا اس لیے میں زخمی کی طرف متوجہ ہُوا۔
"دلاور خان..." میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ "میرا خیال ہے اب مجھے یہاں سے روانہ ہو جانا چاہیے۔" میں نے گھوڑے کی زین سے ایک رائفل اتار کر اُس کے قریب رکھ دی۔ ناک کٹی انگریز عورت کو اپنی رائفل دینے کے بعد میں نے مُردہ لٹیروں کی دو رائفلیں آتے وقت اٹھائی تھیں۔ ان میں سے ایک تو بہر حال میں اپنے پاس رکھنا چاہتا تھا۔
"خدا حافظ دوست!" اُس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "میں تو ایک زندہ لاش ہوں۔ میری زیادہ فکر نہ کرو۔ جاؤ... اور ہو سکے تو میری بچی کو ان درندوں کے چنگل سے نجات دلا دینا..." اس نے ہاتھ بڑھا کر رائفل اُٹھائی اور پھر اس پر زور آزمائی کرنے لگا لیکن اس کے ناتواں بازوؤں میں اتنی سکت نہیں تھی۔
"کیا کر رہے ہو؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔
"اس میں سے ایک گولی نکال کر مجھے دے دو، دوست!" اس نے آنسوؤں سے بھیگی ہوئی آواز میں کہا۔
میں نے بحث کرنے کی بجائے خاموشی سے اس رائفل میں سے ایک گولی نکال کر اس کی ہتھیلی پر رکھ دی۔ چند لمحوں تک وہ دھندلائی ہوئی آنکھوں سے اس گولی کو دیکھتا رہا... پھر اس نے میرا ہاتھ تھام کر وہ گولی میری ہتھیلی پر رکھ دی۔
"اگر زرینہ زندہ ہو تو..." اس کی آواز رندھ گئی۔ "یہ گولی... میری طرف سے اس کے لیے ہے۔"
میں نے خاموشی سے گولی جیب میں ڈال لی۔
"یہ اُسے وہ سکون دے سکے گی جو میں نہیں دے سکا۔" وہ بھاری آواز میں بول رہا تھا۔ "اُسے زندگی نے جتنے بھی دکھ دیے ہیں یہ گولی ان سے اُسے نجات دلا دے گی۔ میری یہ نشانی اس تک پہنچا دینا، وعدہ کرو دوست!"
"میں کوشش کروں گا۔" میں نے کہا۔ "اب مجھے جانا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چاہیے۔ اگر یہ لوگ وادئ خوف ہی کی طرف جا رہے ہیں تو میں ان سے کچھ فاصلہ رکھ کر ان کے پیچھے پیچھے وہاں پہنچ جاؤں گا اور اس طرح بھٹکنے سے محفوظ رہوں گا۔ خدا حافظ۔"
میں نے گھوڑے پر زین ڈالی اور اُسے لے کر باہر کھلی فضا میں آ گیا۔
گھوڑوں کی ٹاپوں سے بھیڑیوں میں ایک بار پھر بھگدڑ مچ گئی تھی لیکن مجھے معلوم تھا کہ وہ اس فضا سے زیادہ دُور نہیں جائیں گے جس سے انہیں خون کی بُو محسوس ہو رہی تھی۔
میں نے الاؤ جلتا ہی چھوڑ دیا تھا کیونکہ دلاور خان نے مجھے اُسے روشن ہی چھوڑ دینے کے لیے کہا تھا۔ درختوں تلے میں محتاط انداز میں آگے بڑھنے لگا۔ گھوڑوں کی ٹاپیں کافی فاصلے سے سنائی دے رہی تھیں اور ان سے سمت کا آسانی سے اندازہ ہو رہا تھا۔ میں گھوڑے کی لگام تھامے چلتا رہا۔ میرے دائیں طرف جھاڑیوں اور درختوں کا سلسلہ تھا، ان میں بھیڑیوں کا غول اب بھی دوڑ رہا تھا۔
ابھی میں زیادہ دُور نہیں گیا تھا کہ میرے کانوں سے ایک دلدوز چیخ ٹکرائی۔ بلاشبہ یہ دم توڑتے ہوئے دلاور خان کی آواز تھی۔ چند ساعتوں تک اس کی کراہیں سنائی دیتی رہیں پھر وہ نفرت غراہٹوں میں دب گئیں۔ میں اچھل کر گھوڑے کی پشت پر بیٹھ گیا اور درختوں کے ساتھ ساتھ اس انداز میں آگے بڑھتا رہا کہ ہم فاصلے سے کسی کی نگاہوں میں نہ آ سکیں۔
گھوڑے اب ندی سے گزر رہے تھے۔
میں دُور سے ان کے متحرک ہیولوں کو بہ آسانی دیکھ سکتا تھا۔
گھوڑے کی لگامیں کھینچے میں کچھ دیر کھڑا منتظر رہا۔ پھر میں نے جیسے ہی آخری ہیولے کو ندی کے چمک دار پاٹ سے دوسرے کنارے پر چڑھتے دیکھا، گھوڑے کو آگے بڑھا دیا۔ میرا گھوڑا سیاہ تھا اور میں نے سیاہ لباس پہن رکھا تھا اس لیے چاندنی کے باوجود میں ان لوگوں کی نگاہ میں نہیں آ سکتا تھا۔
لٹیروں کا یہ گروہ وادئ خوف کی سمت ہی جا رہا تھا۔ ممکن ہے ان کی منزل بھی وادئ خوف ہی رہی ہو کیونکہ دلاور خان نے وادئ خوف کا جو راستہ بتایا تھا یہ پُراسرار گھڑسوار اسی پر آگے بڑھ رہے تھے۔ جب میں نے ندی کا پاٹ اُسی جگہ سے پار کیا تو مجھے یاد آ گیا کہ دلاور خان اسی طرف سے پانی میں کُودا تھا اور پھر تیرتا ہُوا ندی کے دوسرے کنارے پر آ پہنچا تھا۔
گھڑسواروں کی رفتار زیادہ تیز نہیں تھی۔
وہ آپس میں باتیں کرتے اور قہقہے لگاتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔
ان کے قہقہے گھوڑوں کی ٹاپوں سے بھی زیادہ بلند آہنگ اور گونج دار تھے لیکن وہ جو باتیں کر رہے تھے، ہوا کے دوش پہ اڑتی ہوئی جب میری سماعت تک پہنچ رہی تھیں تو ناقابلِ فہم ہو جاتی تھیں۔ پگڈنڈی پر وہ اب ایک قطار میں آگے بڑھ رہے تھے۔ میں نے ان کے اور اپنے درمیان اتنا فاصلہ رکھا کہ اگر کوئی پلٹ کر دیکھ بھی لیتا تو اُسے مجھ کو دیکھنے میں دُشواری ہی سے کامیابی ہوتی۔
وادئ خوف کے سفر کا اندازہ دلاور خان نے جو بتایا تھا ظاہر ہے میں اس سے کم وقت میں وہاں پہنچ سکتا تھا۔ وہ زخموں سے چُور چُور تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ وہ اس قدر زخمی حالت میں کیسے اتنا طویل سفر کرنے کے قابل ہُوا ہوگا۔ واقعی وہ بے پناہ قوتِ ارادی کا مالک تھا۔ جب اس نے مجھے رخصت کیا تھا تو اُس کی آنکھوں میں کتنا سکون تھا۔ کتنے اعتماد کی نگاہ سے اس نے میری طرف دیکھا تھا۔
میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور میری انگلیاں اُس گولی سے ٹکرائیں جو دلاور خان نے اپنی بیٹی زرینہ کے لیے بھجوائی تھی۔ میری انگلیاں گولی کو ٹٹولتی رہیں اور گھوڑا آہستہ آہستہ پگڈنڈی پر وادئ خوف کی طرف بڑھتا رہا۔
مجھ سے کافی فاصلے پر لٹیروں کے گھوڑے چلے جا رہے تھے اور میں ان کے ہیولوں کا تعاقب کر رہا تھا۔ میں دل ہی دل میں دُعا کر رہا تھا کہ سورج طلوع ہونے سے پہلے پہلے وادئ خوف تک پہنچ جاؤں۔ اگر ان لٹیروں کی منزل بھی وہی تھی تو میں ان میں شامل ہو کر بستی میں داخل ہو سکتا تھا۔ اَن گنت دشمنوں کی بستی میں قدم رکھنے میں مجھے بے پناہ احتیاط کی ضرورت تھی لیکن آئندہ پیش آنے والے خطرات کے خیال سے میری دھڑکنوں میں ذرا سی بھی تیزی نہیں آئی تھی بلکہ میں نے اپنا ذہن دلاور خان کی طرف لگا دیا تھا۔ جو اب تک بوٹی بوٹی ہو کر بھیڑیوں کے پیٹ میں اُتر چکا ہوگا... اور اس کی بچی کھچی ہڈیوں پر بھیڑیئے ایک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دوسرے پر غراتے ہوئے جھپٹ رہے ہوں گے۔

★★

چاندنی میں ایک بستی کے آثار دکھائی دینے لگے۔ صبح ہونے میں ابھی چند گھنٹے باقی تھے۔ میں جن گھڑسواروں کے پیچھے پیچھے اس طرف آیا تھا، وادیٔ خوف ہی ان کی منزل تھی۔ وہ انہی راستوں سے یہاں تک پہنچے تھے جو مجھے دلاور خان نے بتائے تھے۔

آبادی کے آثار نظر آتے ہی ان پُراسرار گھڑسواروں نے اپنے گھوڑوں کو ایڑ لگا دی اور انہیں تیزی سے دوڑانے لگے۔ میں نے گھوڑے کی لگامیں کھینچ لیں۔ اب ان کے پیچھے جانا ٹھیک نہیں تھا۔ پہلے میں نے سوچا تھا کہ خود بھی ان گھڑسواروں میں شامل ہو کر بستی میں گھس جاؤں گا... لیکن ان لوگوں کو یوں آزادانہ آگے بڑھتے دیکھ کر میں یہ فیصلہ کیے بغیر نہ رہ سکا کہ مجھے تنہا جانے میں بھی کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوگا۔ وادیٔ خوف جب لٹیروں اور ڈاکوؤں کے لیے صلائے عام کی حیثیت رکھتی ہے تو مجھے اندر جانے سے کون روکے گا؟

دلاور خان نے مجھے بتایا تھا کہ اسلحہ سازی کی خصوصیت کے پیش نظر اس بستی کی راہ میں ڈاکوؤں اور لٹیروں کے گروہ پُرانے زمانے میں سرداروں کی طرف سے متعین کیے گئے تھے۔ گویا انہیں لوٹ مار کی پوری آزادی دی گئی تھی... لیکن میرا خیال قدرے مختلف تھا۔ درحقیقت یہ گروہ صرف اس لیے ترتیب دیے گئے تھے کہ وہ ہر آنے جانے والے پر نگاہ رکھ سکیں۔ ایسے افراد جن کا بستی میں داخلہ ممنوع ہو یا جن کی وجہ سے وہاں کے معاملات میں رخنہ پڑنے کا اندیشہ ہو، انہیں قتل کر دیا جائے یا خوف زدہ کر کے بھگا دیا جائے اور چونکہ ہر شخص یا قافلے کے ساتھ یہ واقعہ بستی سے بہت دُور ویرانوں میں پیش آتا تھا اس لیے وہ لوگ انہیں لٹیرے اور ڈاکو ہی سمجھنے پر مجبور ہو گئے ہوں گے... پھر یہ بھی ممکن تھا کہ محض دکھاوے کی وارداتیں کرتے کرتے یہ تمام گروہ حقیقی وارداتوں پر اتر آئے ہوں۔ دولت ان کی کمزوری بن گئی ہو اور خون بہانا ان کے لیے ایک پسندیدہ مشغلہ ہو۔

میں گھوڑے کی پشت پر بیٹھا اس گرد و غبار کو دیکھ رہا تھا جس نے چاندنی میلی کر دی تھی اور بستی کے آثار اس میلی چاندنی میں غائب ہو گئے۔ وہ گھڑسوار بھی اب مجھے دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ صرف گھوڑوں کی مدھم ٹاپیں میری سماعت تک پہنچ رہی تھیں اور یہ بھی آہستہ آہستہ معدوم ہوتی جا رہی تھیں۔ چند منٹ بعد افق پر غبار ہی غبار رہ گیا اور ٹاپیں سنائی دینا بند ہو گئیں۔ میں اب بھی وہیں کھڑا غبار کے صاف ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ دلاور خان نے مجھے بستی کا محل وقوع اچھی طرح سمجھا دیا تھا۔ اس لیے ہر چیز میرے ذہن میں محفوظ تھی۔

جب غبار چھٹ گیا اور چاندنی ایک بار پھر نکھر گئی تو میں نے گھوڑے کو آگے بڑھا دیا۔ میری رفتار اب خاصی تیز تھی۔ مجھ سے پہلے جانے والے گھوڑوں کا دُور دُور تک نام و نشان نہیں تھا۔

اچانک گھوڑا بدک گیا اور سرپٹ دوڑنے لگا۔

میں نے لگامیں کھینچیں لیکن گھوڑے کی رفتار کم نہ ہوئی۔ اس کے بدکنے کی وجہ معلوم کرنے کے لیے میں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی تو اسی راستے پر مجھے ایک لمبا سانپ نظر آیا۔ چاندنی میں اس کی کھال چمک رہی تھی اور وہ تیزی سے پگڈنڈی پر سرسراتا ہوا گھوڑے کے پیچھے پیچھے چلا آ رہا تھا۔

سانپ غضب ناک تھا اور گھوڑا بدکا ہوا۔

مجھے احتیاط سے بیٹھنا پڑا۔

کافی فاصلے پر جا کر گھوڑا پُرسکون ہو گیا۔

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ سانپ نظر نہیں آ رہا تھا۔ یہ بھی بالکل ویسا ہی سانپ تھا جیسا کہ غار میں میری ٹانگ پر چڑھ آیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ یہ علاقہ ایسے خطرناک سانپوں سے بھرا ہوا تھا۔ میں نے سکون کی سانس لی اور گھوڑے کی رفتار کم کر دی۔ بستی کے آثار اب واضح طور پر دکھائی دے رہے تھے۔ جس جگہ میں سفر کر رہا تھا، وہاں سے تین میل کا فاصلہ رہا ہوگا۔

معاً گھوڑا لڑکھڑا گیا۔

ایک خفیف سا دھماکا سنائی دیا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کسی کے گلے میں پھندا پڑ گیا ہو... پھر میرا گھوڑا اپنی چاروں ٹانگوں پر چلتے چلتے گر گیا۔ یقیناً یہ ایک گولی ہی تھی جس نے گھوڑے کی کھوپڑی پاش پاش کر دی تھی۔

گھوڑا گرا تو میں اس کی پشت سے اچھل پڑا۔

گولی نے بڑی تیزی سے کام کیا تھا۔ گھوڑا فوراً ہی ہلاک ہو گیا تھا۔ میں اچھلا تو سانس میرے حلق میں اٹک گئی تھی۔ میں نے زمین پر گرتے وقت ایک گہری سانس لی اور ذہن کو حاضر رکھنے کی کوشش کی... پھر میں بھی زمین پر گر گیا۔ گرتے وقت میں نے کوشش کی تھی کہ پہلو کے بل زمین سے ٹکراؤں... اور میں گرتے ہوئے بالکل ایسا ہی انداز اختیار کیے ہوئے تھا جیسے گھوڑے سے گرنے کے بعد میرے اوسان خطا ہو گئے ہوں۔

میں جہاں گرا وہیں ساکت ہو گیا۔ اگر اس وقت کوئی میری نگرانی کر رہا تھا تو مجھے دیکھ کر یقیناً یہی سمجھا ہوگا کہ گھوڑے سے چٹانی زمین پر سر کے بل گرنے سے یا تو میری کھوپڑی چٹخ گئی ہے یا پھر میری گردن ٹوٹ گئی ہوگی۔ فاصلے سے دیکھنے والا مجھے زندہ نہیں سمجھ سکتا تھا۔

گھوڑا مجھ سے کچھ فاصلے پر بے حرکت پڑا تھا۔ اس طرف سے میں گھوڑے کے ڈھیر کی آڑ میں تھا۔ عقب میں میدانی جگہ تھی اور دائیں بائیں چھوٹے چھوٹے ٹیلے تھے۔ گھوڑے پر گولی چلانا اس علاقے میں سب سے گھٹیا جرم سمجھا جاتا تھا اس لیے میں توقع کر رہا تھا کہ اب جو کوئی بھی سامنے آئے گا وہ یقیناً کوئی ایسا ہی شخص ہوگا۔

چھوٹے چھوٹے ٹیلوں کے درمیان اس میدانی جگہ میں کسی لاش کی طرح پڑا تھا... کچھ دیر بعد مجھے چٹانوں کی طرف سے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ حملہ آور یقیناً آس پاس چھپے ہوئے تھے۔ میں انہیں دیکھنے میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔ نہ معلوم وہ تعداد میں کتنے تھے۔ میں ٹیلوں کی طرف سے سنائی دینے والی آہٹوں کو سننے لگا۔

قدموں کی آہٹیں بتا رہی تھیں کہ وہ تعداد میں دو ہیں۔

میں جسم میں خفیف سی حرکت بھی پیدا کیے بغیر پڑا رہا۔

میری آنکھیں بند تھیں۔

خفیف سی جھریاں دونوں پلکوں سے پیدا کر کے میں تیار رہا۔ جس کسی نے بھی گولی چلائی تھی اس کے نشانے کو سراہے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ اس نے گھوڑے کی کھوپڑی اُڑا دی تھی اور کسی چلتے ہوئے گھوڑے کا اس انداز میں نشانہ لینا کسی اناڑی کا کام نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ میرے قریب آ کر رک گئے۔

میں نے پلکوں کی جھریوں سے دیکھا۔ وہ تعداد میں دو ہی تھے۔ کچھ فاصلے پر رک کر وہ غالباً میرے بارے میں اطمینان کر رہے تھے کہ میں واقعی مر چکا ہوں یا بے ہوش ہوں۔ میں انہیں دھوکا دینے کے لیے سانس روکے تو نہیں لیٹا ہوا تھا لیکن اس وقت وہ مجھ سے جتنی دُور کھڑے تھے، اتنے فاصلے پر میں صرف دو لمحوں میں ان دونوں کو گولی کا نشانہ بنا سکتا تھا لیکن اس کے لیے شرط یہ تھی کہ میرا ریوالور ہاتھ میں ہوتا۔ میں اس وقت خالی ہاتھ تھا۔ رائفل تو مُردہ گھوڑے کی زین سے بندھی ہوئی تھی اور ان دونوں دشمنوں کی نگاہ میں آئے بغیر اسے وہاں سے نہیں نکالا جا سکتا تھا۔

میں نے گرتے ہی ہاتھ اِدھر اُدھر گھمائے تھے تو میرا ایک ہاتھ کسی پتھر سے ٹکرا گیا تھا اور پھر میری انگلیاں اس پتھر کے گرد جم گئی تھیں۔ پتھر زیادہ بڑا نہیں تھا اور میری مٹھی میں آسانی سے سما گیا تھا۔ یہ سب کچھ ان چند لمحوں میں ہوا تھا جب میں گھوڑے کی پشت سے زمین پر پہنچا تھا اور اس کے بعد میرا جسم ساکت ہو گیا تھا اور اب جبکہ وہ دونوں میرے قریب کھڑے تھے تو میں ایک ہاتھ میں پتھر دبائے لیٹا ہوا تھا۔

"میرا خیال ہے یہ گرنے کے بعد بے ہوش ہو گیا ہے۔" ایک شخص کی آواز میرے کانوں تک پہنچی۔ اس کے لہجے میں خاصا جوش و خروش تھا۔

"لیکن تمہیں گھوڑے کو نشانہ نہیں بنانا چاہیے تھا۔" دوسرے نے قدرے ناگواری سے کہا۔ "کتنا شاندار گھوڑا تھا۔ کیا تم بھول جاتے ہو کہ اس علاقے میں کسی ایسے آوارہ گرد سے گھوڑا کہیں قیمتی ہے۔" اشارا غالباً میری ہی طرف تھا۔

میں نے آنکھوں کی خفیف سی جھریوں کو ذرا سا کشادہ کیا اور دیکھا۔ اُن میں سے ایک لمبے قد کا آدمی تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں رائفل تھی۔ یہ دیسی ساخت کی رائفل تھی۔ دونوں ہی سیاہ کپڑوں میں تھے۔ دوسرا موٹا اور ناٹے قد کا آدمی تھا۔ اس کا چاند جیسا گول چہرہ گھنی مونچھوں سے سجا ہوا تھا اور ان سجاوٹی مونچھوں کے نیچے سے اس کے ہونٹ دکھائی نہیں دیتے تھے۔

انہوں نے رائفلوں کی نالیں میری طرف اُٹھا رکھی تھیں لیکن انہیں تھامنے کے انداز میں بے پروائی تھی۔ ان کے سینوں پر کارتوسوں کی پیٹیاں آر پار نظر آ رہی تھیں۔ کمر پر جو پیٹی بندھی ہوئی تھی، اس میں انہوں نے پستول بھی اُڑس رکھے تھے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پہلے تو میں یہی سمجھا تھا کہ یہ دونوں بھی انہی ڈاکوؤں کے ساتھی ہیں، جو اس وقت وادیٔ خوف کی طرف بڑھ رہے تھے لیکن ایسا نہیں لگتا تھا۔ اگر ان میں سے کسی کو میرے بارے میں شبہ ہو جاتا تو ایک کے مقابلے میں وہ اپنے دو ایک ساتھی ہرگز چھوڑ کر نہ جاتے بلکہ سب کے سب مجھ پر پل پڑتے۔

"یہ کون ہے گل خان؟" چھوٹے قد کے آدمی نے کہا اور رائفل میری پسلیوں سے لگا دی۔ اس نے رائفل پر دباؤ ڈالا لیکن میرے حلق سے دھیمی سی سسکاری بھی نہیں نکلی۔ "بہرحال اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ یہ کون ہے۔ یہ زندہ ہے یا مردہ۔ اس کا ابھی اندازہ ہو جاتا ہے۔ مردہ حالت میں یہ ہمارے لیے زیادہ آسان ثابت ہوگا۔ کیا خیال ہے؟"

"ایک گولی اس کی پسلی میں اتار دو۔" گل خان نے جارحانہ لہجے میں کہا۔ "اس طرح شک و شبے کی گنجائش ختم ہو جائے گی اور یہ تمہارے لیے آسان بن جائے گا۔" یہ کہہ کر وہ ہنس پڑا جیسے اپنے مذاق سے خود ہی لطف اندوز ہو رہا ہو۔

رائفل میری پسلیوں سے ہٹ گئی۔

دفعتہً مجھے دُور ہوتے ہوئے قدموں کی آہٹ سنائی دینے لگی۔

"اس کی رائفل بڑی شاندار ہے۔" آواز گھوڑے کی طرف سے آئی تھی۔ وہ شخص جو کچھ دیر قبل میری پسلیوں سے رائفل کی نال لگائے کھڑا تھا، میرے گھوڑے کا جائزہ لے رہا تھا۔ "یہ فوجی رائفل ہے۔"

"کہیں یہ کوئی بھگوڑا فوجی تو نہیں؟" لمبے قد کے آدمی نے تبصرہ کیا۔ "بہرحال یہ رائفل میں لوں گا کیونکہ اسے میں نے شکار کیا تھا۔" یہ کہہ کر اس کا ایک پاؤں اٹھا اور میرے اوپر سے گزر کر دوسری طرف پہنچ گیا۔ غالباً ایک بہترین رائفل کے خیال نے اسے میری طرف سے توجہ ہٹانے پر مجبور کر دیا تھا اور وہ مجھے پھلانگ کر اپنے ساتھی کی طرف بڑھنا چاہتا تھا۔

جیسے ہی اس کا پاؤں دوسری طرف پہنچا، میں زمین سے اچھل پڑا۔ اس کی رانوں کے درمیان ایک شدید چوٹ مارتے ہوئے میں نے جھٹکا دے کر زمین پر یوں گرا دیا کہ وہ اپنے ساتھی کے اور میرے درمیان آگیا۔

اس کے حلق سے ایک دل دوز چیخ نکل گئی۔

"کیا ہوا... کیا بات ہے؟" موٹے اور ناٹے جسم کے آدمی نے چیخ کر کہا اور فائر کر دیا لیکن یہ گولی اس نے فضا میں محض دھمکانے کے لیے چلائی تھی۔ وہ میری طرف اس لیے فائر نہیں کر سکا تھا کہ اس کا ساتھی میرے سامنے تھا۔ میں نے پوری قوت سے ہاتھ میں پکڑا ہوا پتھر پھینکا۔

پتھر اس شخص کی کھوپڑی پر جا کر لگا۔

اس کے حلق سے ایک گھٹی گھٹی سی چیخ نکل گئی۔

رائفل اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ اس دوران میں میں اپنا خنجر نکال چکا تھا اور اس سے پہلے کہ میرے قریب گرا ہوا شخص سنبھلتا، میں نے اس کے نرخرے پر وار کیا تھا۔ ایسی آوازیں پیدا ہوئیں جیسے قریب ہی کوئی چشمہ اُبل پڑا ہو۔ اس کے گلے سے خون کا چشمہ اُبلا تھا اور رائفل چھوڑ کر اس نے دونوں ہاتھ اپنے گلے پر رکھ لیے تھے... پھر وہ دیکھتے ہی دیکھتے اندھا ہو گیا اور بُری طرح ٹانگیں چلانے لگا۔ میں نے خنجر پھینکا جو اس ناٹے قد والے آدمی کے سینے میں اتر گیا۔ وہ ایک نشے باز کی طرح اپنی کھوپڑی ہی سنبھال رہا تھا کہ خنجر اس کے سینے میں جا اترا... اور اس کے دونوں ہاتھ تیزی سے خنجر کے دستے پر پہنچ گئے۔

چاندنی میں یہ منظر درندگی کی تسکین کا سامان پیدا کر رہا تھا۔ میرے قریب ہی ایک شخص اپنے حلق سے خون اُگل رہا تھا اور اس سے کچھ فاصلے پر سینے میں پیوست خنجر تھامے ایک شخص ایڑیاں رگڑ رہا تھا... جلد ہی دونوں ساکت ہو گئے۔

میں اس منظر سے زیادہ دیر لطف اندوز نہ ہو سکا۔ کیونکہ

نئے افق کا مقبول سلسلہ
سرفروش
نامور مصنف اظہر کلیم
کے ایڈونچرس قلم سے
دو حصوں میں مکمل سیٹ =/100
مکتبہ القریش سرکلر روڈ اردو بازار لاہور
فون 7668958

ایک پراسرار ایڈونچر ناول
طلسم ۲۰۱۰ء
ایم اے راحت
PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk
...کی داسیوں کی مستیاں، حرص و ہوس کے پجاریوں کے چمتکار
پانچ حصوں میں مکمل سیٹ قیمت =/200 روپے
ناشر: مکتبہ القریش
سرکلر روڈ اردو بازار لاہور نمبر 2
7668958

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چٹانوں کی طرف سے ایسی آواز سنائی دی تھی جیسے کوئی غرّایا ہو۔ میں نے دونوں ہاتھ پانی میں غوطہ لگانے کے انداز میں اٹھائے اور اس مولی جیسی لاش پر کود کر اس کی اوٹ میں پہنچ گیا۔ رائفل اس کے قریب ہی تھی۔ میں نے رائفل اٹھائی اور اُدھر دیکھا جدھر سے غرّاہٹ سنائی دی تھی۔

اس شخص کے ہاتھ میں ریوالور تھا اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے باری باری اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کا چہرہ دہشت سے بگڑ گیا تھا اور اس کی پھیلی پھیلی آنکھوں میں خوف کے سائے لرز رہے تھے۔ اب تک اُسے صورتِ حال کا اندازہ ہی نہیں ہوا تھا ورنہ جیسے ہی میں نے موٹے لٹیرے کی آڑ میں جانے کے لیے چھلانگ لگائی تھی، وہ مجھ پر گولی چلا سکتا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کا نشانہ خطا جاتا کیونکہ جس انداز میں، میں کودا تھا، اس میں میرا نشانہ لینا آسان نہیں تھا۔ پڑھنے والے اُسے کسی غضبناک اور تیز رفتار چیتے کی زقند سمجھ سکتے ہیں۔۔۔ پھر یہ شخص غالباً مطمئن تھا کہ اس کے ساتھیوں نے مجھے نشانہ بنا دیا ہے اس لیے خطرے کی کوئی بات نہیں۔۔۔ میں سوچ رہا تھا کہ ان کے مزید کتنے ساتھی ہوں گے؟ یہ اندازہ تو آسانی سے کیا جا سکتا تھا کہ وہ تعداد میں کافی کم ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ مجھ سے پہلے گزرنے والے ڈاکوؤں کے قافلے کو یوں آسانی سے نہ جانے دیتے۔

...پھر اُس لٹیرے کو جیسے ہوش آ گیا۔

اس نے بڑی پھرتی سے ریوالور میری سمت میں اٹھایا۔

"نہیں دوست!" میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔ "بے حس و حرکت کھڑے رہو ورنہ تم بھی اپنے ساتھیوں سے جا ملو گے۔"

"تت... تم... تم نے گل خان اور فقیروش کو کیسے ہلاک کیا؟" اس کے لہجے میں اب بھی حیرت تھی جیسے اسے ابھی تک اپنے ساتھیوں کی موت کا یقین نہ آیا ہو۔ گویا وہ دونوں اپنے گروہ کے تیس مار خاں تھے جن کے اس انداز میں مرنے کی ان کے ساتھی توقع بھی نہیں کر سکتے تھے۔

"ان کو قتل کرنے کی تفصیل تو نہیں بتا سکتا۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "البتہ انہیں ٹھکانے لگانے کی وجہ ذاتی دفاع کے علاوہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے میرے گھوڑے کو ہلاک کیا تھا۔"

"اب تم کیا چاہتے ہو؟" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"اپنے گھوڑے کا بدلہ۔"

"ہمارے پاس گھوڑے نہیں ہیں۔"

"تمہارے اور کتنے ساتھی ہیں؟" میں نے کہا۔ میری انگلی موٹی لاش پر رکھی ہوئی تھی اور وہ دیکھ رہا تھا کہ ذرا سی غلطی کے باعث، مجھے کوئی نقصان پہنچائے بغیر موت کے منہ میں پہنچ جائے گا۔

"صرف میں باقی بچا ہوں..." اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "کیا تم بھی کوئی ڈاکو ہی ہو؟"

"نہیں... میں ایک مسافر ہوں۔" میں نے یہ کہتے ہوئے لبلبی دبا دی۔ اس کا اٹھا ہوا ہاتھ جھول گیا۔ وہ مجھے باتوں میں لگا کر آگے بڑھ رہا تھا اور اس سلسلے میں مجھ غلط فہمی میں مبتلا کرنے کے لیے اُس نے خالی ہاتھ کو سر سے بلند کر لیا تھا جبکہ دوسرے ہاتھ میں ریوالور بدستور دبا ہوا تھا۔ گولی اس کی ہتھیلی پر پڑی اور اس میں سوراخ ہو گیا۔

ریوالور اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

اس نے بڑی پھرتی سے زخمی ہاتھ کو سنبھالا اور چیخا۔ "آوہ، خدایا!"

میں نے دو فائر کیے۔ ایک گولی اس کے سینے پر اور دوسری کھوپڑی پر پڑی۔ اس کی کھوپڑی یوں بکھر گئی جیسے کسی تربوز پر گولیاں چلائی جائیں تو اس کے ٹکڑے فضا میں بکھرتے ہیں۔

وہ گر گیا۔ میں موٹے لٹیرے کی آڑ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ کچھ دیر میں ادھر اُدھر دیکھتا رہا۔ خصوصیت سے چٹانوں کی طرف متوجہ رہا لیکن اب کوئی آہٹ، کوئی آواز اور... کوئی متحرک سایہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے گھوڑے کی پشت سے اپنا سامان کھولا اور اسے کندھے پر لاد کر آگے بڑھ گیا۔ گھوڑے کی موت کے بعد مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں واقعی اس دنیا میں بالکل تنہا رہ گیا ہوں۔

وادیٔ خوف کے آثار تو نظر آ ہی رہے تھے اور فاصلہ بھی زیادہ نہیں تھا۔ اس لیے گھوڑے کے بغیر گزارا ہو سکتا تھا لیکن اگر یہی حادثہ دُور کہیں پہاڑوں میں پیش آیا ہوتا تو میرے لیے بے پناہ دشواریاں پیدا ہو سکتی تھیں۔ پیدل چلنے میں ایک تو

وقت زیادہ لگتا، دوسرے جسم کو منزلِ مقصود تک پہنچانے میں شدید مشقت سے دوچار کرتا پڑتا۔ تیسرا سانپوں اور چھوٹے موٹے درندوں سے بار بار مڈبھیڑ ہوتی جس کی وجہ سے بارود ضائع ہوتا... اور زندگی ضائع ہونے کے امکانات زیادہ روشن ہوتے... اس علاقے میں گھوڑے کے بغیر بے پناہ دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے... پھر میں جن حالات کا شکار تھا، ان میں تو زندگی کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔

بستی سے کچھ فاصلے پر ایک چوراہا سا بنا ہوا تھا۔ یہاں چار پول ستونوں سے چار پگ ڈنڈیاں آ کر ملتی تھیں۔ وہاں لکڑی کی ایک تختی لگی ہوئی تھی جس پر تازہ رنگ و روغن چاندنی میں چمک رہا تھا۔ بے حد ٹوٹے پھوٹے حروف میں لکھا تھا۔

"وادیٔ گلاب"

میری دھڑکنیں بے ترتیب ہو گئیں۔

یہ میں کدھر نکل آیا تھا۔ وادیٔ خوف کی بجائے یہ وادیٔ گلاب کہاں سے ٹپک پڑی۔ میں وہیں کھڑے سوچتا رہا کہ کہیں مجھ سے کوئی غلطی تو نہیں ہو گئی؟ کہیں میں ان راستوں سے بھٹک تو نہیں گیا جو مجھے زخمی دلاور خان نے بتائے تھے؟ جہاں تک مجھے یاد تھا، میں انہی راستوں پر چلتا رہا تھا... پھر میں وادیٔ خوف کی بجائے وادیٔ گلاب تک کیسے آ پہنچا جس نام کی بستی کا دلاور خان نے تذکرہ تک نہیں کیا تھا۔ اب دو ہی صورتیں میرے سامنے تھیں۔ ایک تو یہ کہ میں کسی غلط سمت میں نکل آیا تھا، دوسرے دلاور خان کے اذیتناک خیالات سے یہ بستی ہی پھسل گئی ہو گی۔ کچھ دیر اسی ادھیڑبن میں رہا... پھر میں نے ایک پگڈنڈی پر چلنا شروع کر دیا اور بستی کے قریب پہنچ کر میں نے ایک سنسان ویران حصے کی طرف پیش قدمی جاری رکھی۔

بستی اس وقت سنسان لگ رہی تھی۔ اگر کہیں کہیں سے گھوڑوں کے ہنہنانے، کتوں کے بھونکنے یا بچوں کے رونے کی آوازیں سنائی نہ دیتیں تو یہی گمان گزرتا کہ اس بستی میں کوئی سرے سے موجود ہی نہیں ہے بلکہ یہ ایک ویرانہ ہے جس کے لیے کسی مسخرے نے وادیٔ گلاب کا نام تجویز کر کے اس کی ویرانی کا مضحکہ اڑایا ہے۔

یہ وادی تین طرف سے پہاڑوں میں گھری ہوئی تھی۔ اس کے جنوبی حصے میں اتنا بڑا پہاڑ تھا کہ اس کی چوٹی آسمان سے چھوتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ گویا یہ آخری قبائلی بستی تھی اور اس کے بعد دُور دُور تک کہیں انسان کا نام و نشان نہیں ہو گا۔

بستی کے ویران حصے کی طرف ایک اندھا کنواں تھا۔

اس کنوئیں کو دیکھ کر میں ٹھٹھک گیا۔

دلاور خان نے وادیٔ خوف کے اس اندھے کنوئیں کے بارے میں مجھے بتایا تھا۔ میں وہاں کھڑے ہو کر بستی کے شمالی حصے کی طرف دیکھنے لگا۔ وہاں وہ بوڑھا برگد بھی صاف نظر آ رہا تھا جس تک مجھے پہنچنے کے بعد ایک قریبی مکان کو تلاش کرنا تھا۔ اس مکان میں عدالت خان نامی ایک اسلحہ ساز رہتا تھا۔ دلاور خان کے بقول وہ وادیٔ خوف کا واحد شخص ہے جو وہاں کا سیاست دان کہلاتا ہے۔ اس نے سارجنٹ فرینک اور اس کے درندہ صفت ساتھیوں سے بظاہر تو میل ملاقات قبول کر لی تھی لیکن درحقیقت وہ سردار قاسم کا قدردان تھا اور وہ سردار قاسم کے قاتلوں کے خلاف ہر قسم کی سازباز میں معاون ثابت ہو سکتا تھا۔

میں سمجھ گیا کہ سارجنٹ فرینک نے وادیٔ خوف کا نام بدل کر وادیٔ گلاب کر دیا ہے۔ تازہ رنگ و روغن بھی اس بات کی گواہی دے رہا تھا۔ میں دیر تک اس اندھے کنوئیں کے قریب کھڑا بوڑھے برگد کی طرف دیکھتا رہا۔ عدالت خان کی حویلی اسی کے آس پاس تھی۔ اس کی نشانیاں میرے ذہن میں محفوظ تھیں اس لیے اُسے ڈھونڈنا میرے لیے کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ میں تو صرف یہ جائزہ لے رہا تھا کہ وہاں کچھ پہرے دار تو موجود نہیں ہیں؟

کوئی انسانی سایہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

میں تن بہ تقدیر ہو کر جھاڑیوں میں گھس گیا۔

جھاڑیوں میں راستہ بناتا ہوا میں اس بوڑھے برگد کی طرف بڑھتا رہا حتیٰ کہ میں اس سے کچھ فاصلے پر رُک گیا تب میری نگاہ برگد کے تنے کی طرف اُٹھ گئی۔ چاندنی برگد کے گھنے پتوں اور شاخوں سے زمین تک پہنچنے میں ناکام تھی اس لیے درخت کے نیچے اندھیرا تھا... لیکن اس تاریکی میں ایک روشن سا نقطہ ٹمٹماتا نظر آ رہا تھا جس سے کبھی کبھی چنگاریاں بھی چھوٹ رہی تھیں۔

کوئی شخص تنے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا اور غالباً چلم پی رہا تھا۔

اس [illegible] نسنے کی آواز سنائی دی... پھر وہ پشتو میں کچھ بڑبڑایا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں جھاڑی میں دُبکا رہا۔ اس دوران میں، میں اچھی طرح جائزہ لے چکا تھا کہ اس ایک شخص کے علاوہ ادھر کوئی نہیں ہے۔ دلاور خان نے واقعی مجھے ایک اچھی سمت کے بارے میں بتایا تھا۔ میں جھاڑی سے نکلا اور کوشش کی کہ میرے قدموں سے خفیف سی آواز بھی پیدا نہ ہونے پائے... پھر میں گھوم کر اس شخص کی پشت پر پہنچ گیا۔

چلم ایک طرف رکھ کر وہ اُٹھ کھڑا ہُوا۔

میں نے تنے کی اوٹ سے نکل کر اس کی پشت سے رائفل کی نال لگا دی۔

"کون ہے؟" وہ کسی درندے کی طرح پلٹا۔ میں نے فائر نہیں کیا ورنہ اس کی اتنی ہی حرکت ہی لبلبی دبانے کے لیے کافی تھی۔ رائفل ذرا سی پیچھے ہٹ گئی۔ میں محتاط تھا اس لیے وہ رائفل پر ہاتھ ڈالنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ جیسے ہی اس کا رُخ میری جانب ہُوا، میں نے رائفل کی نال اس کے سینے پر رکھ کر دباؤ ڈالا اور سخت لیکن دھیمی آواز میں کہا: "حلق سے آواز نکلی تو گولی مار دوں گا۔"

"کون ہو تم؟" اس کا لہجہ درندگی سے بھرپور تھا گویا رائفل کی نال سینے پر محسوس کرنے کے باوجود اس کی سختی گم نہیں ہُوئی تھی۔

"میں ایک دوست ہُوں۔" میں نے کہا۔ "مجھے دلاور خان نے بھیجا ہے۔"

"کیا نام ہے، تمہارا؟"

"شالیار خان۔"

"اس نام کا کوئی آدمی ہماری بستی میں نہیں رہتا۔"

"میں اس بستی کا رہنے والا نہیں ہُوں۔"

"پھر تم کہاں سے ٹپک پڑے ہو؟"

"زیادہ زندہ دل بننے کی کوشش نہ کرو۔" میں نے رائفل کا دباؤ بڑھانے کے ساتھ ساتھ ایک زوردار طمانچہ اس کے منہ پر جڑ دیا۔ "مجھے فوراً عدالت خان کے پاس لے چلو۔"

"اس وقت حویلی میں کوئی بھی داخل نہیں ہو سکتا۔" اس نے جلدی سے کہا۔ اس بار لہجے میں قدرے گھبراہٹ تھی۔

"میرا اُس سے ملنا بہت اہم ہے۔ [illegible] نے میں تھوڑی دیر باقی ہے، اُس وقت تک میں عدالت خان سے ضروری بات چیت کر لینا چاہتا ہوں۔ اس لیے ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔ سمجھ گئے؟ کوئی حماقت نہ کرنا ورنہ تمہیں اپنی اس بیوقوفی پر پچھتانے کی بھی مہلت نہیں ملے گی۔"

"تم اس سے کس سلسلے میں ملنا چاہتے ہو؟"

"میں کہہ چکا ہوں کہ فضول بحث کر کے وقت ضائع نہ کرو۔" میں نے دوسری بار اس کے سینے پر نال کا دباؤ بڑھایا۔ "چلو... جلدی سے حویلی کی طرف چلو۔ تمہارے اطمینان کے لیے اتنا بتا دوں کہ جن لوگوں نے وادیٔ خوف پر قبضہ کر رکھا ہے، میں تم لوگوں کو اُن کی گرفت سے نکالنے کے لیے بھیجا گیا ہوں۔"

"اوہ..." اس نے ایک طویل سانس لی۔ "تم یہیں ٹھہرو..."

"نہیں... میں تمہارے ساتھ جاؤں گا۔" میں نے اس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔ "اب میں تمہیں ایک لمحہ بھی نہیں دے سکتا اور تم کوئی غیر ضروری بات بھی نہیں کرو گے سمجھ گئے۔ چلو آگے بڑھو۔"

وہ خاموشی سے آگے آگے چل دیا۔ حویلی وہاں سے زیادہ دُور نہیں تھی بلکہ بستی کے اس ویران حصے کی پہلی ہی عمارت تھی۔ دروازے پر دو رائفل بردار پٹھان پہرہ دے رہے تھے، میں نے چونکہ اپنے قیدی کو ہاتھ اٹھانے پر مجبور نہیں کیا تھا، اس لیے وہ دونوں پہرے دار اس وقت تک نہیں چونکے جب تک ہم ان کے قریب نہیں پہنچ گئے۔ انہوں نے سنبھلنے میں بڑی پھرتی دکھائی تھی لیکن میری رائفل کو اپنی طرف متوجہ پا کر اُن کے جسم فوراً ہی ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ کرخت چہرے والے یہ دونوں پہرے دار مجھے پھاڑ کھانے والی نظروں سے دیکھ رہے تھے لیکن میرے ساتھ آنے والے شخص نے انہیں مختصر ترین الفاظ میں میرے بارے میں بتایا تو اُن میں سے ایک فوراً ہی حویلی کے دروازے سے اندر چلا گیا۔ میں ایک ایک ساعت کو دھڑکنوں سے ہم آہنگ کر کے اس کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ غالباً میرا دل ایک سو دسویں بار دھڑکا تھا کہ حویلی کا دروازہ دوبارہ کھلتا نظر آیا۔ وہ پہرے دار پہلے باہر آیا... اس کے پیچھے ایک مختصر قد و قامت کا شخص تھا جس پر نگاہ پڑتے ہی پہلے تو مجھے ہنسی آئی لیکن جب میں نے پہرے داروں کو مؤدب ہوتے دیکھا تو خود کو یقین دلانا پڑا کہ وہی عدالت خان ہے۔

اس کی آنکھیں نیند سے بھاری تھیں۔

"کون ہو تم... اور رات کے اس پہر کیا چاہتے ہو؟" عدالت خان نے کچھ فاصلے پر رُک کر میری طرف دیکھتے ہُوئے سوال کیا۔ اس کی آواز قد و قامت کے مقابلے میں بے حد بھاری تھی۔ "کیا تمہیں اپنی زندگی سے بالکل پیار نہیں ہے..."

"عدالت خان!" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "مجھے دلاور خان نے بھیجا ہے۔ وہ اس وقت ندی کے کنارے ایک چٹان کی اوٹ میں مُردہ پڑا ہے۔ وہ مجھے بے حد زخمی حالت میں ملا تھا اور اُسی سے مجھے وادیٔ خوف کی صورت حال معلوم ہوئی تھی۔"

"محض اتنی سی بات پر کسی اجنبی کو قابلِ اعتماد نہیں سمجھا جا سکتا۔"

"تم اطمینان کے لیے اپنے کسی آدمی کو بھیج سکتے ہو۔ اگر بھیڑیوں کے غول نے دلاور خان کو پورا نہیں کھایا تو تھوڑا بہت دلاور خان وہاں ضرور پڑا ہو گا۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔

"ادب ملحوظ رکھو۔" ایک پٹھان رائفل بردار نے بھڑک کر کہا۔ "شاید تم نہیں جانتے کہ کس سے مخاطب ہو۔"

"ٹھیک ہے، عدالت خان!" میں نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔ "اس سلسلے میں تم سے تفصیلاً بات کرتا ہوں۔ شاید ان باتوں سے تمہیں مجھ پر یقین آ جائے... لیکن میرا خیال ہے، یوں باہر کھڑے رہ کر باتیں کرنا مناسب نہیں۔"

عدالت خان چند لمحوں تک غور کرتا رہا... پھر اس نے پلٹتے ہوئے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا جنہوں نے مجھے اس کے پیچھے جانے کی اجازت دے دی۔ اس کے باوجود، دو رائفل بردار نگران میرے پیچھے ہی آئے۔

حویلی میں داخل ہوتے ہی مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے فرش میں خفیف سی لرزش ہے۔ ہلکی سی جھنجھناہٹ پورے ماحول پر چھائی ہوئی تھی جس پر کبھی کبھی ایک گونج دار آواز سبقت لے جاتی... اور پھر لمحاتی سکوت کے بعد دوبارہ جھنجھناہٹ سنائی دینے لگتی۔

عدالت خان مجھے ایک کمرے میں لے آیا۔

اس نے ایک مسلح آدمی کو اشارہ کیا۔ وہ چلا گیا لیکن دوسرا دروازے پر کھڑا رہا۔ اس نے چوکھٹ سے ٹیک لگا لی تھی۔ اگرچہ رائفل کی نال کا رُخ زمین کی طرف تھا لیکن لبلبی پر اس کی انگلی یہ ظاہر کرتی تھی کہ درحقیقت نال کا رُخ میری ہی طرف ہے۔ میری ذرا سی غلط حرکت پر وہ نال کو حرکت دے کر فائر کر سکتا تھا۔ اس کے چہرے سے درندگی ظاہر ہو رہی تھی اور آنکھیں خون آلود لگتی تھیں۔

عدالت خان ایک مُوڑھے پر بیٹھ گیا اور گہری توجہ سے میری طرف دیکھنے لگا۔ "کیا تم نے یہ دُور دراز کا سفر پیدل ہی طے کیا ہے؟" اس نے بھاری آواز میں دریافت کیا اور ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھوں میں ملا جلا شک کے سائے لہرانے لگے۔

"نہیں... کچھ فاصلے پر دو [illegible] نے میرے گھوڑے کو گولی مار کر ہلاک کر دیا تھا۔ اگر تم اپنے آدمیوں کو بھیجو تو ان دونوں کی لاشیں اور میرے گھوڑے کی نعش انہیں مل جائے گی۔"

"تم پر اعتماد کرنے کو جی نہیں چاہتا۔" اس نے صاف گوئی سے کہا۔ "تمہارے چہرے پر انسانوں جیسا کوئی تاثر نہیں... میں نے اپنی زندگی میں بڑے بڑے سنگ دل مرد اور درندوں کو دیکھا ہے... لیکن تم ان سب سے زیادہ خوفناک تاثرات والے چہرے کے مالک ہو۔"

"ہو سکتا ہے... مجھے اپنا چہرہ اچھی طرح دیکھے کافی دن ہو گئے ہیں۔"

اس دوران میں وہی پٹھان چوکیدار واپس آ گیا۔ جسے عدالت خان نے اشارے سے کچھ کہا تھا اور وہ واپس چلا گیا تھا اس کی رائفل کندھے سے لٹکی ہوئی تھی اور اس نے دونوں ہاتھوں پر ایک ٹرے میں قہوے کے برتن اٹھا رکھے تھے۔

قہوہ انڈیلنے کے بعد عدالت خان نے میری طرف دیکھا گرم گرم قہوے نے مجھے بہت سکون دیا اور میں نے اپنی کہانی کا آغاز کر دیا۔ میں نے پانوش کی موت اور سارجنٹ فرینک کی مجرمانہ سرگرمیوں کا احوال تفصیل سے سنایا حتیٰ کہ میں نے دلاور خان سے ملاقات اور وادیٔ خوف میں قدم رکھنے پر آ کر کہانی ختم کر دی۔

"تمہارے باپ کا کیا نام ہے؟ شالیار خان۔" عدالت خان نے پوچھا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سے تاثرات پیدا ہو گئے تھے جیسے وہ میرے ماضی سے تھوڑی بہت واقفیت رکھتا ہو۔

"عبدالرحیم خان میرے والد تھے لیکن وہ اب زندہ نہیں ہیں۔"

عدالت خان ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہُوا۔

"تم کیا کہہ رہے ہو، نوجوان؟" اس کا لہجہ حیرت اور صدمے کے ملے جلے اثرات سے مغلوب تھا۔ "کیا تم اُسی عبدالرحیم خان کی

بات کر رہے ہو جو رد نیال کا سردار ہے اُسے کیا ہُوا؟ کئی سال پہلے جب ہم آخری بار ملے تھے تو وہ ان دنوں کسی گھوڑے کی طرح صحت مند تھا۔"

"تم میرے والد کو جانتے ہو؟" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔۔۔ تو مجھے ایک بار پھر اپنے ماضی کی طرف لوٹ جانا پڑا جہاں میں ایک بے ضرر سا نوجوان تھا اور میرا باپ رد نیال کا سردار اور انگریز دشمن تحریک کا سرکردہ تھا۔

میں نے اپنے دُور کے رشتے دار فرس خان کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا: "اس نے چند غداروں کے ساتھ رد نیال پر حملہ کر دیا اور راتوں رات انگریزی فوج کی مدد سے پورا گاؤں نیست و نابود کر دیا۔ اس جنگ میں میرے والد ہلاک ہو گئے اور فرس خان نے مجھے دھکے دے کر گاؤں سے نکال دیا۔۔۔ اس نے میری منگیتر سے زبردستی شادی رچا لی۔"

"اور تم یہ سب کچھ ہوتا دیکھتے رہے؟" عدالت خان نے غضبناک ہو کر کہا۔ "کیا تمہارے والد نے تمہیں اپنے دوستوں کے بارے میں کبھی نہیں بتایا تھا؟"

"میں نے انتقام کی راہ اختیار نہیں کی کیونکہ میرا چھوٹا بھائی پانوش ابھی زندہ تھا اور وہ ایک ایسی جگہ چھپا ہُوا تھا، جہاں سے میں اسے کسی وقت بھی نکال لے جا سکتا تھا۔۔۔ پھر میں پیشاور میں ایک جھونپڑا بنا کر رہنے لگا۔۔۔ لیکن بالآخر میں نے انگریز سرکار کی ملازمت کر لی۔"

"ہاں۔۔۔ شاید تم نے خود کو دُنیا میں بالکل تنہا سمجھ کر ایسا کیا ہوگا۔ کاش! یہ سب کچھ مجھے بروقت معلوم ہو جاتا۔۔۔ لیکن ان دنوں میں ہندوستان میں تھا۔ کئی سال بعد واپس آیا تو وادیٔ خوف سے نکلنے کا موقع ہی نہ مل سکا اور نہ ہی مجھے کسی دُور دراز کی بستی کے دوستوں کا حال معلوم ہو سکا۔"

وہ ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔

اس کی آنکھوں اور چہرے سے گھبراہٹ ظاہر ہو رہی تھی۔ اس نے پیالی میں مزید قہوہ انڈیلتے ہوئے اُٹھ کر میرا کندھا تھپتھپایا۔ اور پھر اس کی اُنگلیاں میری ریڑھ کی ہڈی پر پھسلنے لگیں۔ کمر پر ایک جگہ اس کا ہاتھ رُک گیا اور وہ وہاں میری ریڑھ کی ہڈی کو ٹٹولنے لگا۔

اس جگہ ایک چھوٹا سا اُبھار تھا۔

"ہاں۔۔۔ تم شالیار خان ہی ہو۔" وہ بڑبڑایا۔ "یہ اُبھار میں نے اس روز دیکھا تھا جب میں ایک تقریب میں شرکت کے لیے رحیم خان کے ہاں ٹھہرا ہُوا تھا۔۔۔ اُف! دُنیا میں کیا کیا ہو جاتا ہے اور انسان پھر بھی غافل رہتا ہے۔" اس کے لہجے میں درد تھا۔

۔۔۔ پھر وہ بیٹھ گیا۔ اس نے دروازے میں موجود نگران کو جانے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا: "جاؤ۔۔۔ اور سب سے کہہ دو کہ مطمئن ہو جائیں۔ شالیار خان میرا بیٹا ہے۔ میں نے اسے پہچان لیا ہے۔"

نگران قبائلی نے مسکرا کر سر کو اوپر نیچے حرکت دی اور دروازے سے ہٹ کر نگاہ سے اوجھل ہو گیا۔ میں نے اطمینان سے آنکھیں بند کر لیں۔ عدالت خان میرے والد اور اپنی دوستی کے قصے سُناتا رہا۔۔۔ اور نہ جانے کب میں اونگھتے اونگھتے گہری نیند سو گیا۔ مدتوں بعد مجھے ایسی پُرسکون نیند آئی تھی۔۔۔ لیکن وہ ڈراؤنے خواب ابھی تک مجھے دکھائی دے رہے تھے، جن کا سلسلہ پانوش کی موت کے بعد سے شروع ہُوا تھا۔

نہ جانے کب میں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔

میں حویلی کے اسی کمرے میں تھا، جہاں عدالت خان مجھے لے کر آیا تھا۔ لیکن اس وقت میں موڑھے کی بجائے چارپائی پر دراز تھا۔ عدالت خان کمرے میں نہیں تھا اور دروازہ بند نظر آ رہا تھا۔ میں نے جلدی سے اُٹھ کر دروازہ کھولا تو وہ آسانی سے کھل گیا۔

اِدھر اُدھر نگاہ ڈالی تو کوئی مسلح نگران نظر نہ آیا۔

میں ایک طویل سانس لے کر دوبارہ چارپائی پر لیٹ گیا۔ حویلی میں اب چہل پہل محسوس ہو رہی تھی اور ہر طرف سویرا پھیل چکا تھا۔ میں اپنے بھاری بھاری سے ذہن کے ساتھ لیٹا چھت کو گھورتا رہا۔

★★

وہ تعداد میں پانچ تھے اور قہوے خانے میں بیٹھے قہقہے لگا رہے تھے۔ ان میں سے دو پٹھان تھے اور دو انگریز۔۔۔ پانچواں سارجنٹ فرینک تھا۔۔۔ وہی جو میرے بھائی پانوش کا قاتل تھا اور جس کے نقش و نگار مجھ سے ملتے جلتے تھے۔ پٹھان اس وقت وردیوں میں نہیں تھے بلکہ انہوں نے قبائلیوں جیسا سیاہ ملیشیے کا لباس پہن رکھا تھا۔ جب کہ دو انگریز سپاہی پتلونیں اور جیکٹ پہنے ہوئے تھے۔ سارجنٹ فرینک اپنی وردی میں تھا۔۔۔ اور اس وقت چرس کے نشے میں یوں قہقہے لگا رہا تھا جیسے اس پر دیوانگی کا دورہ پڑ گیا ہو۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شام کے سائے ڈھل چکے تھے اور میں قہوہ خانے کی جس کھڑکی سے لگا کھڑا تھا، وہ عقبی دیوار میں لگی ہوئی تھی اور میں باہر اندھیرا ہونے کی وجہ سے کسی کی نگاہ میں نہیں آ سکتا تھا۔ قہوہ خانے کے پچھواڑے گندگی تھی اور اندر سے آنے والے چرس کے بادلوں سے بار بار مجھے کھانسی آ رہی تھی جسے میں بڑی مشکل سے ضبط کر رہا تھا۔

دن بھر عدالت خان سے صورتِ حال پر تبادلۂ خیال کرتے گزر گیا تھا۔ وہ اس قدر پُرجوش ہو رہا تھا کہ اس نے اپنی قطعی احتیاط بھی بالائے طاق رکھ دی تھی۔ اس نے اپنے تیس آدمیوں کو فوری طور پر طلب کر لیا تھا اور سارجنٹ فرینک یا اس کے لٹیرے ساتھیوں سے نمٹنے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔۔۔ لیکن میں اس معاملے میں کسی کی مداخلت پسند نہیں کرتا تھا۔ وہ میرے مجرم تھے اور ان سے میں خود ہی اپنے انداز میں نمٹنا چاہتا تھا۔

عدالت خان کو اس بات پر رضامند کرنے کے لیے مجھے بڑے پاپڑ بیلنے پڑے تھے تب کہیں وہ اس بات پر آمادہ ہُوا تھا کہ میں ان پانچوں قاتلوں کو ٹھکانے لگا دوں۔ اس کے پاس تیس جانباز تھے اور میں محسوس کر چکا تھا کہ وہ عدالت خان کے صرف ایک ہی اشارے پر اپنے سر ہتھیلیوں پر رکھ سکتے ہیں۔۔۔ لیکن جو صورتِ حال میرے سامنے آئی تھی، اس سے نمٹنے کے لیے تیس آدمی ناکافی تھے۔

سارجنٹ فرینک اور اس کے چار ساتھیوں کا معاملہ نہیں تھا بلکہ ان کی پشت پر وہ درجنوں لٹیرے اور ڈاکو بھی تھے جنہوں نے سارجنٹ فرینک کے سامنے حلفِ وفاداری اُٹھایا تھا۔ میں فی الحال صرف ان پانچ دشمنوں کو ٹھکانے لگانا چاہتا تھا۔ جن کی تلاش مجھے اس دُور افتادہ وادی تک کھینچ لائی تھی جس کا نام پہلے تو وادیٔ خوف تھا لیکن سارجنٹ فرینک نے اس پر قبضہ کرتے ہی نام تک بدل دیا تھا۔

مجھے یقین تھا کہ ان پانچوں کی موت کے بعد ڈاکو اور لٹیرے ایک بار پھر منتشر ہو جائیں گے اور وادیٔ خوف پر ایک بار پھر کسی ایک سردار کی حکومت قائم ہو جائے گی۔ جس سے نہ صرف علاقے کا سکون لوٹ آئے گا بلکہ عام آدمی کو تحفظ بھی نصیب ہو جائے گا۔ قبائلیوں کی روایات ایک بار پھر جاری ہو جائیں گی اور دشمن جہنم رسید ہو جائیں گے۔

وادیٔ خوف میں سکھوں اور ہندوؤں کے بھی چند گھرانے تھے لیکن وہ قبائلیوں سے الگ تھلگ رہتے تھے۔ انہوں نے آج تک چڑھتے سُورج کی پوجا کی تھی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ قہوے خانے میں دو تین سکھ بھی موجود تھے جو لٹیروں کے ساتھ بیٹھے داد دے رہے اور وحشیانہ انداز میں ہنس رہے تھے۔

اچانک ایک انگریز سپاہی اُٹھ کھڑا ہوا۔

میں کھڑکی پر جھک گیا۔

"تم کہاں چلے، جیکی؟" سارجنٹ نے ہنس کر کہا۔

جواباً جیکی نے ایک طویل انگڑائی لی اور مسکرانے لگا۔ "آج میں نے ایک ایسی چیز دیکھی ہے، باس!۔۔۔ کہ میں اس سے زیادہ دُور نہیں رہ سکتا۔"

"جاؤ۔۔۔ جاؤ عیش کرو۔" سارجنٹ نے بڑی فراخ دلی سے کہا۔ "میری منظورِ نظر تو شاید تین چار روز میں سنبھلے گی، تب اُس سے ملاقات کروں گا۔"

اس کے ساتھی ہنس پڑے اور درندگی سے بھرپور قہقہوں سے قہوہ خانے کے در و دیوار کانپنے لگے۔ میں نے تیزی سے وہ جگہ چھوڑ دی۔ حویلی سے چلتے وقت میں نے وادیٔ خوف کا نقشہ اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔۔۔ پھر میں نے مخصوص قبائلی لباس بھی پہن لیا تھا۔۔۔ البتہ ہتھیار وہی رکھے تھے، جو میرے اپنے تھے۔

فرینک کا ساتھی قہوہ خانے سے باہر آ گیا اور دروازے کے سامنے کھڑا کچھ دیر اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔۔۔ شاید وہ آنکھوں کو تاریکی میں دیکھنے کے لیے تیار کر رہا تھا۔ گلی میں اس وقت اکا دکا آدمی چلتے نظر آ رہے تھے اور بازار سنسان پڑا تھا۔ عدالت خان نے مجھے بتایا تھا کہ وادیٔ خوف کے مشرقی حصے میں ایک قدیم دو منزلہ عمارت ہے۔ اس عمارت میں چند عورتوں کو رکھا گیا ہے۔۔۔ اور یہ وہ عورتیں ہیں جنہیں ڈاکو مختلف علاقوں سے۔۔۔ یا پھر سرحد پار سے اغوا کر کے لائے ہیں۔

جیکی نے ایک قدم گلی میں رکھا اور پھر اس کا رُخ اسی مشرقی حصے کی جانب ہو گیا جہاں وہ دو منزلہ عمارت تھی۔ اس کی آنکھیں تاریکی سے مانوس ہو چکی تھیں، اس کے باوجود وہ بے حد آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ اس کی چال میں ہلکی سی لڑکھڑاہٹ بھی تھی۔ میرے خیال میں وہ چرس کا دھواں اُڑاتا رہا تھا۔ ممکن ہے اس سے پہلے وہ شراب بھی پیتا رہا ہو۔

وادیٔ خوف جس بستی کا نام تھا، وہاں اب سکون تھا۔ اندھیرے نے دن کے تمام ہنگاموں کو نگل لیا تھا اور تاریکی کے لبادے میں لپٹے لوگ اُجالے کے انتظار میں سو کر وقت گزارنے کے لیے

اپنے اپنے گھروں میں دُبک گئے تھے۔ گلیوں میں اب بھی جابجا خون اور کہیں کہیں انسانی جسموں کے ٹکڑے پیروں سے ٹکراتے تھے۔ ان ٹکڑوں سے تعفن اُٹھنے لگا تھا۔

اگر میں انتقام کی آگ میں اتنے عرصے تک جل جل کر راکھ نہ ہو چکا ہوتا تو شاید اندھا دُھند قہوے خانے میں ہی گھس پڑا ہوتا اور پھر وہاں کی فضا میں بارود ہی بارود پھیل جاتا۔ میں خود پر قابو رکھنے میں کامیاب نہ ہوتا... لیکن اب میں ان سب کو نہایت عبرتناک سزائیں دے دے کر موت سے ہمکنار کرنا چاہتا تھا۔ تاکہ میرے اندر کے نئے بہروپ کی بھی تسکین ہو جاتی اور ان ڈراؤنے خوابوں کا سلسلہ بھی ختم ہو جاتا جو پالوش کی لاش سے شروع ہوتے تھے اور میرے ذہن پر مسلسل دیوانگی طاری کیے ہوئے تھے۔

جیکی اور میرے درمیان صرف چند قدم کا فاصلہ تھا۔

میں چاہتا تو اُسے آسانی سے مار ڈالتا۔

...لیکن انہوں نے پالوش کو سرسری انداز میں قتل نہیں کیا تھا۔ انہوں نے اسے سسکا سسکا کر مارا تھا اس لیے ان کا انجام بھی ویسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ چلتے وقت میں کوشش کر رہا تھا کہ میرے قدموں سے خفیف سی آواز بھی پیدا نہ ہونے پائے... لیکن جیکی شاید ذہنی طور پر اس عورت میں کچھ زیادہ ہی اُلجھا ہُوا تھا جس کی کشش اُسے کھینچے لیے جا رہی تھی۔

اچانک اس نے ٹھوکر کھائی۔

اس کے حلق سے کسی درندے جیسی غراہٹ نکلی۔

...پھر وہ سنبھل گیا اور آگے بڑھنے لگا۔ میں اس دوران میں رُک گیا تھا... لیکن اس کے لڑکھڑاتے ہی میرا ہاتھ اپنے خنجر کے دستے پر جا پہنچا تھا اگر اس نے فوراً ہی سنبھل کر چلنا نہ شروع کر دیا ہوتا تو میں کوئی خطرہ مول لیے بغیر ہی اس پر حملہ آور ہو جاتا... لیکن اس کی لڑکھڑاہٹ حقیقی تھی اور اس میں کوئی چال یا ٹیکنک نہیں تھی۔ وہ میری موجودگی سے اب بھی ناواقف ہی تھا... اور اس کا ذہن شاید اس دو منزلہ عمارت میں موجود کسی عورت کے خیالوں میں کچھ زیادہ ہی کھویا ہوا تھا۔

جلد ہی وہ بستی سے نکل کر چھوٹے سے ویران راستے پر پہنچ گیا۔

اس ویران راستے کے اختتام پر وہ دو منزلہ عمارت تھی۔

یہ ایک حویلی نما عمارت تھی... اور شاید یہاں وادیٔ خوف کا وہ سردار رہا کرتا تھا جسے ان لوگوں نے ہلاک کر کے بستی اپنے قبضے میں کر لی تھی۔ حویلی کی نچلی منزل تاریک تھی۔ بالائی منزل کی ایک کھڑکی سے زرد زرد بیمار سی روشنی کو دیکھا جا سکتا تھا۔

میں جیکی کے پیچھے چلتا رہا حتیٰ کہ وہ حویلی کے دروازے پر جب پہنچا۔

اس نے دروازے پر دستک دی۔

"دروازہ کھولو... اُلّو کے پٹھے!" وہ دھاڑا۔

فوراً ہی اندر سے کسی نے گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"کون ہے؟"

"تمہارا باپ... جیکی!" اس نے کرخت لہجے میں کہا۔

دروازہ فوراً ہی کھل گیا اور ایک رائفل بردار پٹھان ڈاکو نظر آیا جس کے عقب میں ایک مدھم روشنی کی لالٹین جل رہی تھی۔ جیکی نے غصے سے بھڑک کر اس کا گریبان تھام لیا۔

"اتنی دیر..." وہ غرایا۔

"اطمینان کرنا بھی تو ضروری تھا، جناب!" نگران نے لجاجت سے کہا اور مسکرانے لگا... لیکن اس کی مسکراہٹ جیکی کے بہکے ہوئے دماغ کو پُرسکون کرنے میں ناکام رہی۔

اس نے پوری قوت سے جھٹکا مارا اور پھر نگران کو اندھیرے میں اُس طرف اُچھال دیا، جہاں تھوڑے ہی فاصلے پر میں ایک جھاڑی کی اوٹ میں دُبکا ہُوا تھا... وہ کسی وزنی پرندے کی طرح اُڑتا ہوا اُدھر آیا تو میں نے لپک کر اُسے سنبھالا اور اگلے ہی لمحے میرا خنجر اس کے نرخرے پر تھا۔

"خاموش رہو!" میں نے دھیمی لیکن غراہٹ آمیز آواز میں کہا۔

وہ ہانپ کر رہ گیا۔

خنجر اس کے نرخرے میں شاید تھوڑا سا اُتر گیا تھا۔

اس کے حلق سے سسکاری نکلی۔

"تمہارے علاوہ اندر کتنے آدمی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"صرف میں ہی تھا۔"

"باقی کہاں ہیں؟"

"قہوہ خانے میں..." اس نے گھبرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ میں نے اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا۔ یہ کپڑا میں نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس کی قمیص کا گھیر پھاڑ کر حاصل کیا تھا... پھر میں نے اس کی شلوار سے ازار بند نکالا اور اس کے دو حصے کیے۔ ہاتھوں کو پشت پر کر کے باندھا اور پھر اس کی ٹانگیں بھی خوب مضبوطی سے باندھ دیں۔

"اگر تم خاموشی سے یونہی پڑے رہے تو زندہ رہو گے... ورنہ خنجر کا ایک ہی وار تمہاری گردن اڑا دینے کے لیے کافی ہو گا۔" میں نے اس کے کان پر جھک کر کہا۔ "میری واپسی تک یونہی ڈھیر بنے پڑے رہو۔ ٹھیک ہے؟"

اس نے اثبات میں سر ہلا کر جواب ظاہر کیا کہ وہ میری ہدایت پر عمل کرے گا۔ اس کی آنکھوں سے دہشت ٹپک رہی تھی اور یکایک چہرہ سپید پڑ گیا تھا۔ ظلم کرنے والے کتنے بزدل ہوتے ہیں۔ اس کا اندازہ مجھے اس ڈاکو کی حالت دیکھ کر آسانی سے ہو گیا تھا۔

نگران کو اسی جھاڑی کی اوٹ میں چھوڑ کر میں تیزی سے دروازے کی طرف لپکا۔ جیکی نے دروازہ بند کرنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔

دروازے سے ڈیوڑھی میں پہنچ کر میں رُک گیا۔

ریوالور نکال کر میں پہلے ہی ہاتھ میں لے چکا تھا۔

چند لمحوں تک میں خاموش کھڑا آہٹ لیتا رہا۔ اوپر والی منزل کی طرف جانے والی سیڑھیوں سے کسی کے قدموں کی بے ترتیب چاپ سنائی دے رہی تھی جو رفتہ رفتہ ختم ہوتی جا رہی تھی... یہ غالباً جیکی ہی تھا جو اوپر جا رہا تھا۔ ڈیوڑھی میں گہری تاریکی تھی لیکن وہاں آس پاس کسی کی موجودگی کا ذرا سا بھی احساس نہیں ہو رہا تھا۔

میں سیڑھیوں کے قریب پہنچ گیا۔

سیڑھیاں لکڑی کی تھیں۔

ان پر چڑھنے سے آواز کا پیدا ہونا ضروری تھا اس کے باوجود میں ہر ممکن کوشش کرتا رہا کہ آواز نہ پیدا ہونے پائے۔ سیڑھیاں چڑھ کر میں ایک بار پھر رُک گیا۔ اب ہر طرف خاموشی تھی۔ کسی کی خفیف سی زیرِ لب بڑبڑاہٹ اس خاموشی میں اُبھری تو میں چونک کر ادھر متوجہ ہو گیا۔

سامنے ایک کمرہ تھا جس کا دروازہ بند تھا۔

آواز اسی کمرے سے آئی تھی۔

میں نے دروازے پر ہلکا سا دباؤ ڈالا۔ دروازہ اندر سے بند نہیں تھا۔ کواڑ کھلتے ہی تیز سانسیں میری سماعت سے ٹکرانے لگیں۔ کمرے میں ایک موم بتی روشن تھی جس کی مدھم روشنی میں ایک عورت نظر آئی۔

وہ بے خبر پڑی سو رہی تھی۔

اس کے جسم پر محض ایک چادر تھی جس سے اس نے جسم کو ڈھانپ رکھا تھا۔ اس عورت کے نقش و نگار بے حد بھونڈے تھے اور اس کی عمر کسی طرح بھی چالیس سے کم نہیں تھی۔ غالباً اس عورت کے ذمے ان عورتوں کی دیکھ بھال کا کام تھا جنہیں اغوا کر کے یہاں لایا جاتا تھا۔

میں نے دروازہ بند کر دیا۔

کسی عورت کی خفیف سی چیخ سنائی دی۔

جواباً ایک قہقہہ گونجا۔

شیطانیت... اور... درندگی سے بھرپور قہقہہ۔

یہ جیکی کے اُسی ساتھی کا قہقہہ تھا جس کا پیچھا کرتے ہوئے میں یہاں تک آیا تھا۔ قہقہے سے اس کی موجودگی کا تعین کرنے میں آسانی ہو گئی۔ میں ایک دروازے کے پاس پہنچا۔ دروازے میں خفیف سی درز تھی۔

"میں اپنے دوستوں کو چھوڑ کر آیا ہوں۔" جیکی کی آواز سنائی دی۔ "جانتی ہو کس لیے...؟"

جواباً لڑکی کی کراہ سنائی دی۔ شاید جیکی نے اس کا ہاتھ زور سے دبا دیا تھا یا اس کے جسم کے کسی حصے میں دانت گاڑ دیے تھے۔

"صرف تمہارے لیے..." جیکی نے کہا اور ہنس پڑا۔ اور مجھ سے اتنا بھی صبر نہیں ہو رہا تھا کہ دروازہ کھلنے کا انتظار کر لیتا... نتیجتاً میں نے نگران کو غصے میں جھاڑیوں کی طرف اُچھال دیا... یہ کہہ کر اس نے ایک بلند آہنگ قہقہہ لگایا جیسے اپنے اس کارنامے سے خود ہی محظوظ ہونا شروع کر دیا ہو۔

اے حمید
کے ایڈونچرس قلم سے
گنگا کے
پجاری ناگ
دو جلدوں میں
جلد اول =/150
جلد دوم =/200
مکتبہ القریش سرکلر روڈ اردو بازار لاہور
فون 7668958

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

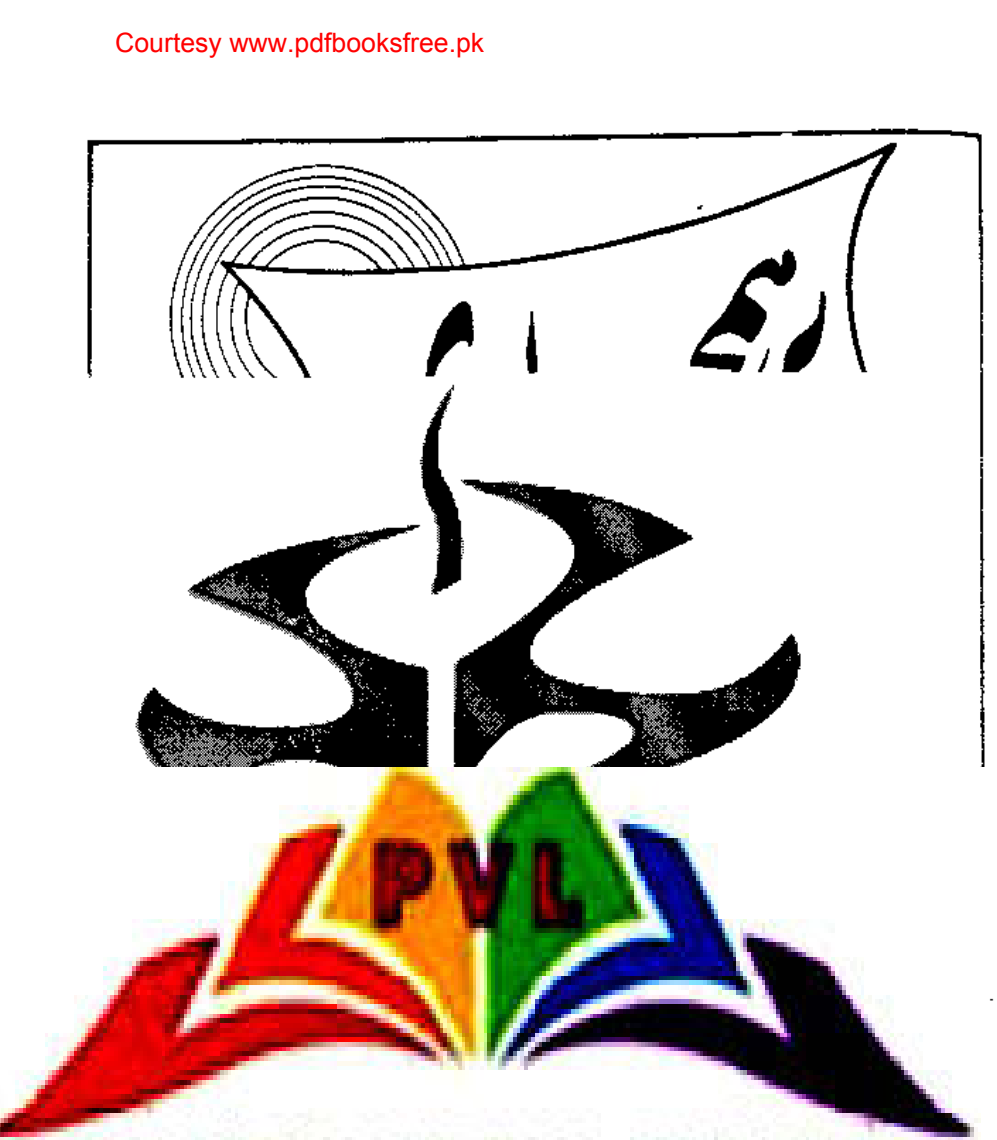

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

خط و کتابت کے لئے
مکتبہ القریش سرکلر روڈ، اُردو بازار، لاہور

میں نے ٹھوکر مار کر دروازہ کھول دیا۔

جیسے ہی میں نے اندر قدم رکھا، جیکی بڑی پھرتی سے پلٹا تھا۔ لیکن وہ خالی ہاتھ تھا۔ پلٹتے وقت اس نے ریوالور نکالنے کی کوشش نہیں کی تھی اور اس کی وجہ صرف یہی ہو سکتی ہے کہ اُسے مجھ جیسے کسی آدمی کے آنے کی توقع نہیں رہی ہوگی۔

"جہاں اور جس حالت میں ہو رُک جاؤ۔" میں نے یخ بستہ لہجے میں کہا۔

لڑکی عُریاں تھی۔ اُس کے رُخساروں پر کاجل آنسوؤں کے ساتھ مل کر پھیلا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں خوف سے پھٹی پھٹی نظر آ رہی تھیں اور وہاں حیرت اور دہشت کی انتہا سے پھیلا ہوا تھا۔ اُس نے جلدی سے ایک چادر گھسیٹ کر اپنے جسم پر ڈال لی۔ اس کی پیشانی پر پسینا تھی اور محسوس ہوتا تھا کہ وہ کوئی ہندو لڑکی ہے۔

جیکی کا چہرہ غصّے کی زیادتی سے سُرخ ہو رہا تھا لیکن اُس کی آنکھیں خوف کی پرچھائیوں کو چھپانے میں کامیاب نہیں ہو رہی تھیں۔ اب تک اس کی نگاہوں سے شناسائی کا اظہار نہیں ہوا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اس نے ابھی مجھے پہچانا نہیں تھا۔

"کون ہو تم اور کیا چاہتے ہو؟" وہ غرّایا۔

"میرا نام شالیا ہے... شالیار خان!" میں نے کہا۔ "کیا یہ نام بھی میری طرح تمہارے لیے اجنبی ہے۔ غلیظ درندے؟"

"ش ش ش... شا... لیار!" وہ ہکلا گیا۔

"ہاں... اور میرے نام کا مفہوم تمہاری موت ہے... ویسی ہی دلدوز موت جیسی تم نے ایک معصوم اور بے ضرر بچّے کا مقدّر بنائی تھی۔" میں نے کہا۔ "میں تمہیں راستے میں بھی ہلاک کر سکتا تھا... لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ جانتے ہو کیوں؟"

وہ دہشت زدہ نقش و نگار سے مجھے گھورتا رہا۔

"جواب دو...!" میں نے ہاتھ لہرا کر کہا۔

"میں... نہیں جانتا!" اُس کی آواز بھرّائی ہوئی تھی۔

"سب سے پہلے تو میں تمہیں یہ موقع دینا چاہتا ہوں کہ تم وہ منظر ذہن میں تازہ کرو... جو تمہاری درندگی کی وجہ سے میرے ذہن پر نقش ہے۔ اس معصوم لڑکے کی موت کو یاد کرو جیکی...!"

"تم... مگر... اُسے میں نے نہیں مارا تھا۔"

"ہاں... لیکن تم اس وقت فرینک کے ساتھ تھے۔" میں نے کہا۔ "اور تم اس بات کے گواہ تھے کہ سیمی سارجنٹ کے ہاتھ ایک بڑی رقم جوئے میں ہار دی تھی...!" میں نے تلخی سے کہا۔ "لڑکی... تم ایک طرف ہٹ جاؤ۔" میں نے لڑکی سے کہا جو اُس کے پیچھے چھپنے کی کوشش کر رہی تھی۔ جیکی نے فوراً ہی اُسے دبوچ کر اپنے سامنے کر لیا... اور اس کا ہاتھ آہستہ آہستہ اپنے ہولسٹر کی طرف رینگنے لگا۔

میں نے گولی چلا دی۔

نشانہ لیتے وقت میں نے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ صرف اس کا ہاتھ ہی زخمی ہو۔ اس نے چیخ کر ہولسٹر سے ہاتھ کھینچ لیا۔ لڑکی بھی دھماکا سُن کر چیخ پڑی تھی... جیکی اس کی آڑ میں دیوار سے جا ٹکا۔ لڑکی اس کی گرفت میں بُری طرح مچل رہی تھی۔

"تم ایک عورت کو میری گولیوں کے سامنے دیوار بنانا چاہتے ہو، جیکی!" میں نے دیوانگی سے چیختے ہوئے کہا۔ "شاید تم نہیں جانتے... اگر تم اس علاقے کے سارے پہاڑ بھی اُٹھا کر سامنے رکھ لو تو وہ میری گولیوں کا راستہ نہیں روک سکتے۔"

اس نے جب ہولسٹر سے ہاتھ کھینچا تھا تو ریوالور کے دستے پر اس کی انگلیوں کی گرفت مضبوط ہو چکی تھی۔ اس لیے جھٹکا لگنے سے ریوالور ہولسٹر سے نکلا اور فرش پر گر گیا... جسے اٹھانے کی، بہرحال، اسے مُہلت نہیں مل سکتی تھی... اس کے زخمی ہاتھ سے خون کی بوندیں ٹپکنے لگی تھیں۔

باہر کسی کے دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز گونجنے لگی۔

بھدّے بھدّے سے قدموں کی تھل تھل کرتی آواز...

اور پھر وہی عورت اندر آ گئی جسے میں سوتی چھوڑ آیا تھا۔ اس کے بھونڈے نقش و نگار میں دہشت کی آمیزش تھی اور وہ عورت کی بجائے بگڑی شکل والی کسی بن مانس کی مادہ لگ رہی تھی۔

میں نے خنجر اس کے سینے سے لگا دیا جبکہ ریوالور والا ہاتھ جیکی کی سمت میں اُٹھا ہوا تھا۔ خنجر دیکھ کر وہ کسی بھینس کی طرح ہانپنے لگی۔ اس کے نتھنوں سے سانسیں، پھنکاروں کی طرح نکل رہی تھیں۔

"منہ پھیر کر کھڑی ہو جاؤ۔" میں نے اُسے حکم دیا۔

وہ تیزی سے پلٹ کر کھڑی ہو گئی۔

میرا ریوالور والا ہاتھ اُٹھا اور فوراً ہی اپنا سابقہ سمت میں واپس آ گیا۔ جیکی کو اس دوران میں ذرا سی بھی مہلت نہیں ملی تھی۔ بھونڈے نقش و نگار والی عورت لہرا کر گری اور اُٹھ نہ سکی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ ایک گھنٹے سے پہلے ہوش میں نہیں آئے گی۔

کچھ دیر میں آہٹ لیتا رہا... لیکن اب باہر سے کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ دوسرے کمروں میں جو لوگ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

موجود ہیں، وہ باہر نہیں آئیں گی۔۔۔ اور نگران کی اطلاع درست ہی تھی کہ اس وقت وہاں اس کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔

"لڑکی کو چھوڑ کر سامنے آجاؤ۔" میں نے کہا۔

اس نے لڑکی کی گردن پر بازو جما دیا۔

"اگر تم نے آگے بڑھنے کی کوشش کی تو میں اس لڑکی کی گردن توڑ دوں گا۔۔۔" وہ چیخ کر بولا۔

"اس کے بعد تم اپنی موت کو مزید اذیت ناک بناؤ گے۔" میں نے خوفناک لہجے میں کہا اور آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔۔۔ پھر میں نے ریوالور کو ہولسٹر میں رکھ لیا۔ میں نے جیسے ہی ریوالور کو ہولسٹر میں رکھا، اس نے تیزی سے لڑکی کو چھوڑا اور اپنے ریوالور کی طرف چھلانگ لگا دی۔۔۔ اسی لمحے میرا دایاں ہاتھ تیزی سے حرکت میں آیا اور ریوالور ایک بار پھر میرے ہاتھ میں آگیا۔۔۔ اس کے ساتھ ہی ایک دھماکا ہوا۔

گولی اس بار بھی جیکی کے اسی ہاتھ پر پڑی تھی جو ریوالور کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ چیخ پڑا اور اس نے زخمی ہاتھ کو دوسرے ہاتھ میں دبا لیا۔۔۔ تب میں نے تیسری گولی چلائی۔

اس کے بار اس کے دونوں ہاتھوں کو نشانہ بنایا تھا۔

جیکی کے حلق سے ایک دلدوز چیخ نکلی اور وہ فرش پر گر گیا۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں سوراخ ہو چکے تھے اور ان سوراخوں سے خون بہہ رہا تھا۔۔۔ پھر میں نے اس کی ٹانگوں کو باری باری نشانہ بنایا اور وہ کسی مفلوج شخص کی طرح میرے سامنے فرش پر پڑا نظر آنے لگا۔

میں نے ریوالور ہولسٹر میں رکھ کر خنجر نکال لیا۔

"سب سے پہلے تم اپنے جسم کے کس حصے سے محروم ہونا پسند کرو گے؟" میں نے اس کی طرف جھکتے ہوئے سرگوشی کی۔

"مجھ پر رحم کرو۔۔۔ خدا کے لیے مجھے مت مارو۔" وہ گڑگڑانے لگا۔

"ایسے پاکیزہ نام کو اپنی غلیظ زبان پر نہ لاؤ جن کا تم نے زندگی میں کبھی احترام نہیں کیا۔" میں نے سفاک لہجے میں کہا۔ "جی تو چاہتا ہے کہ سب سے پہلے تمہاری زبان ہی کاٹ دوں۔۔۔ لیکن مجھے تمہاری آہ وزاری سے سکون محسوس ہوگا۔ اس لیے میں تمہاری زبان ابھی نہیں کاٹوں گا۔۔۔ چیخو۔۔۔ چلاؤ۔۔۔ گڑگڑاؤ۔۔۔ کہ تمہاری یہی فریاد میرے زخموں کا مرہم ہے۔"

میں نے خنجر سے اس کی کلائی پر کسی تلوار کی طرح وار کیا۔ اس کا ہاتھ پہنچے سے کٹ کر گر گیا۔ گولیوں کی وجہ سے زخمی ہونے کے بعد چونکہ اس کے ہاتھ شل ہو گئے تھے اس لیے اُسے تکلیف کا احساس نہ ہوا لیکن ہاتھ کو جسم سے الگ ہو کر فرش پر پڑے دیکھ کر مارے دہشت کے اس کا چہرہ بگڑ گیا اور اس کے نقش و نگار مسخ ہو گئے۔

دوسرا وار اس کی دوسری کلائی پر ہوا۔

تیز دھار دزنی خنجر کسی تلوار کی سی کاٹ رکھتا تھا۔ اس کا دوسرا ہاتھ بھی کٹ گیا اور خون کسی چشمے کی طرح بہنے لگا۔ میں نے کن انکھیوں سے لڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ دیوار سے لگی تصویر حیرت بنی کھڑی تھی۔

جیکی کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔

اس کا حلق خشک ہو گیا تھا اور اب آواز میں کوئی مفہوم ادا کرنے کے قابل نہیں رہ گئی تھیں۔۔۔ محض خرخراہٹیں تھیں لیکن ان آوازوں سے مجھے کتنی تسکین مل رہی تھی۔

"میں تمہارے جسم کے اتنے ہی ٹکڑے کروں گا جتنے حصوں کے نام مجھے آتے ہیں۔۔۔ ہر حصہ الگ ہوگا۔"

میں نے اس کے منہ پر تھوک کر مارتے ہوئے کہا۔

وہ الٹ کر گرا اور اس کی کھوپڑی کا عقبی حصہ فرش سے ٹکرا گیا۔

۔۔۔ پھر میں نے خنجر کی مدد سے اُسے کاٹنا شروع کر دیا جیسے جیسے اس زندہ درندے کے اعضا کٹ کٹ کر فرش پر ڈھیر لگتا جا رہا تھا میری دیوانگی بھی بڑھتی جا رہی تھی۔

اب تک باہر سے کسی قسم کی مداخلت نہیں ہوئی تھی۔۔۔ اور مجھے اس کی پروا بھی نہیں تھی۔ میں جن جذبوں کی تسکین کا سامان کر رہا تھا۔ ان کی راہ میں کوئی بھی چیز حائل نہیں ہو سکتی تھی۔

اچانک مجھے یوں لگا جیسے قریب ہی کوئی چیز گر گئی ہو۔

میں نے چونک کر آواز کی طرف دیکھا۔

وہی ہندو لڑکی دیوار سے ٹیکے ٹیکے لہرا کر فرش پر آ رہی تھی جسے میں نے اس سارے عرصے میں ذہن سے نکال دیا تھا۔ خوف کی زیادتی نے بالآخر اس کے ذہن پر اثر کر ہی ڈالا تھا۔ میں کھڑا ہوا میرے سامنے گوشت اور ہڈیوں کا خون آلود ڈھیر تھا۔

خود میرے کپڑے بھی لتھڑ گئے تھے۔

میرا خنجر اور کہنیوں تک بازو خون آلود تھے۔

لڑکی کے قریب جا کر میں نے کان لگاتے ہوئے اس کی دھڑکنیں سننے کی کوشش کی لیکن اس کا سینہ خاموش تھا۔ ہلکا سا زیروبم بھی پیدا نہیں ہو رہا تھا۔ غالباً انتہائے خوف اس کے لیے

جان لیوا ثابت ہوا تھا اور اس کی حرکت قلب ہی بند ہو گئی تھی۔

میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔

کافی دور بستی نیم تاریکی میں پرسکوت دکھائی دے رہی تھی۔ کہیں کہیں کوئی ٹمٹماتی ہوئی روشنی نظر آتی لیکن کوئی متحرک سایہ نظر نہیں آرہا تھا۔ اگرچہ اس حویلی اور بستی میں کافی فاصلہ تھا لیکن ہو سکے دوش پر سوار آوازیں یہاں تک پہنچ رہی تھیں۔ میں نے اس راستے کی طرف دیکھا جو اس حویلی تک آتا تھا۔ اس پر بھی ویرانی کا تسلط تھا۔

میں نے کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھا۔

اس کمرے میں ایک چراغ روشن تھا، جس کی لَو بار بار بھڑک رہی تھی۔ شاید اس میں تیل ختم ہو رہا تھا۔ میں نے کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھ کر بالآخر ایک بوری تلاش کر لی۔ جیکی کے ٹکڑوں کو اس بوری میں بھرنے کے بعد میں نے اُسے کندھے پر اٹھا لیا۔ اور کمرے سے باہر آگیا۔

یہ بوجھ میرے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔

مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے دل میں بھڑکتے ہوئے ان گنت الاؤں میں سے ایک سرد پڑ گیا ہو۔۔۔ لیکن ذہن میں لگی ہوئی آگ میں ہلکی سی ٹھنڈک اور اعصابی تناؤ میں ذرا سی تخفیف محسوس ہوئی تھی۔

گوشت اور ہڈیوں سے بھری ہوئی بوری اٹھائے میں سیڑھیوں سے نیچے آگیا۔ راستے میں ہر دروازہ مجھے بند ملا۔ خفیف سی آہٹ بھی نہیں سنائی دی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہاں پر موجود ہر عورت نے دم سادھ رکھا ہو۔

حویلی سے باہر آکر میں سیدھا اس جھاڑی کی طرف بڑھا جہاں میں نے نگران کو باندھ کر ڈالا تھا۔ قریب پہنچ کر میں نے دیکھا وہ بالکل بے حرکت پڑا تھا۔ میں نے اسے ٹھوکر مارتے ہوئے کہا۔

"زندہ ہو۔۔۔ یا کسی سانپ نے ڈس کر زندگی سے محروم کر دیا ہے؟"

اس کے جسم میں فوراً ہی حرکت پیدا ہوئی۔۔۔ اور یہی حرکت میرے سوال کا جواب تھی۔ وہ زندہ تھا۔

میں نے بوری ایک طرف رکھ دی اور اسے کھولنے لگا۔

اس کے ہاتھوں اور پیروں کے گرد لپٹے ہوئے ازاربند کی گرہیں کاٹ کر میں نے اس کے منہ سے بھی کپڑا کھینچ لیا۔ وہ بُری طرح ہانپنے لگا تھا۔ اس نے کئی گہری گہری سانسیں لیں اور میری طرف

سلطان نورالدین زنگی

الماس ایم اے   قیمت:=/250

چاہ بابل

دیوتاؤں کے شہر بابل کی کہانی

جسے مصنف نے 35 سال کی ریسرچ کے بعد قلمبند کیا۔

800 صفحات

قیمت=/400

ناشر مکتبہ القریش

اردو بازار لاہور

دیکھنے لگا۔ میں نے ریوالور نکال کر ہاتھ میں لے لیا تھا۔

"چلو۔۔۔ یہ بوری اٹھاؤ۔" میں نے اُسے حکم دیا۔

وہ ایک لمحے کے لیے ہچکچا گیا۔

"اس بوری میں کیا ہے؟" اس نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"اگر تم نے اب مزید باز پرس کے طور پر ایک لفظ بھی کہا تو تم بھی اس طرح ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بوری میں منتقل ہو جاؤ گے جیسے تمہارے سفید آقاؤں میں سے ایک ہو چکا ہے؟"

وہ بُری طرح کانپنے لگا اور پھر جھک کر اس نے بوری اٹھا لی۔

"بستی کی طرف چلو۔۔۔" میں نے حکم دیا۔

وہ خاموشی سے آگے آگے چلنے لگا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"غلام خان...!"

"وہ تو تم صورت ہی سے لگتے ہو، ذلیل!" میں نے اُس کی کنپٹی کو ریوالور کی نال سے چھیڑتے ہوئے کہا۔ "تمھیں زندہ چھوڑنے پر مجھے ہمیشہ افسوس رہے گا!"

"مگر... خان! میں نے تمھارا کچھ نہیں بگاڑا... میں نے تمھیں پہلے کبھی دیکھا تک نہیں..." وہ گڑگڑانے لگا۔

"تمھاری زندگی بچ جانے کی وجہ بھی یہی ہے!" میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "تم لٹیروں کے جس گروہ سے تعلق رکھتے ہو، اُس کا سردار کون ہے؟"

"نتھے خان... لیکن اُسے پرسوں رات انگریز سارجنٹ نے گولی ماردی تھی۔" اُس نے ہانپتے ہوئے جواب دیا۔ وہ زیادہ مضبوط آدمی نہیں تھا۔ اس لیے بوری کے بوجھ نے اُسے جلدی ہانپ جانے پر مجبور کر دیا تھا۔

"کیوں... گولی کیوں ماردی تھی؟"

"کسی لڑکی پہ جھگڑا ہوگیا تھا۔"

"وہ لڑکی بیک وقت اُن دونوں کو پسند آگئی تھی؟"

"ہاں خان...! اور فیصلہ کرنے کے لیے دونوں نے ریوالور نکال لیے تھے۔ نتھے خان کا نشانہ کبھی خطا نہیں گیا تھا لیکن انگریز سارجنٹ کی پھرتی قابلِ دید تھی۔ اس نے نتھے خان کو ریوالور نکالنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔"

"ہوں... اور اس کے بعد تم سب اس سفید سؤر کی غلامی میں چلے گئے۔ تم لوگ کتنے بے غیرت ہو۔ سمندر پار سے آنے والوں کے لیے اپنی صدیوں پرانی روایات اور وقار کا خیال نہیں کرتے...!"

"ہم مجبور ہوگئے تھے، خان... ویسے میرے گروہ کا ایک بھی شخص اُن کو پسند نہیں کرتا!" اُس نے جلدی سے کہا۔

"ایسی صورت میں تمھیں اُن سے بھڑ جانا چاہیے تھا!"

"ہمارے ہتھیار ہم سے چھین لیے گئے ہیں، خان!"

"ایک رائفل تو تمھارے پاس آج رات بھی موجود تھی!"

"اس سے کیا ہوسکتا ہے خان!"

"تمھارے ساتھیوں کی تعداد کیا ہے؟"

"گیارہ ہیں... خان!"

"ہوں... ان سب کو چپکے چپکے بتا دینا کہ ان لوگوں کا ساتھ نہ دیں، موت اب وادئ خوف میں اتر آئی ہے اور جو بھی اُن کے قریب پایا گیا، وہ اُن کا ساتھی قرار دیا جائے گا... اور اُس کا انجام بھی اُن سے مختلف نہیں ہوگا!"

"تم کون ہو، خان؟"

"میں... میں انتقام ہوں..." میں نے کہا۔ "اور بہت دُور سے آیا ہوں... لیکن میں تنہا نہیں ہوں۔ میرے ساتھ بیس آدمی ہیں۔ جو مناسب موقع کے انتظار میں پہاڑوں پر چھپے بیٹھے ہیں!"

"اوہ... کیا تم اس بستی پر قبضہ کرنا چاہتے ہو، خان؟"

"نہیں..." میں نے جواب دیا۔

"پھر... خان؟" اُس نے رک کر کہا۔ "میں تھک گیا ہوں، یہ بوری بہت وزنی ہے، خان!"

"میں اس بستی سے اُن لوگوں کا غلبہ ختم کرکے اسے اصل حق داروں کے حوالے کر دینا چاہتا ہوں... کل رات مجھے بستی کے چند آدمیوں کی طرف سے پیغام ملا تھا کہ ان کی مدد کی جائے مگر اب اس بستی میں کسی بے گناہ کا خون بہایا گیا تو سب کو چن چن کر ختم کر دیا جائے گا... ان میں سے ایک بھی فرار نہیں ہوسکتا، میرے ساتھیوں نے اس علاقے کو چاروں طرف سے گھیرے میں لے رکھا ہے!"

"سنا ہے انگریزی فوج یہاں آنے والی ہے!"

"یہ بات تم سے کس نے کہی تھی؟"

"سارجنٹ کا کہنا ہے کہ تین روز کے اندر اندر فوج یہاں آجائے گی... وادئ خوف کے راستے سے یہ فوج کہیں آگے جانا چاہتی ہے!" غلام خان نے بتایا۔

"چلو... بوری اٹھاؤ، تم نے کافی آرام کر لیا ہے!"

اُس نے جھک کر ایک بار پھر بوری اٹھالی۔

ہم دونوں اسی طرح آہستہ آہستہ چلتے ہوئے بستی کے بازار میں نکل آئے تھے۔ وہاں تاریکی تھی۔ صرف قہوہ خانے کے باہر ایک لالٹین لٹکی ہوئی تھی جو مدھم سی روشنی پھیلا رہی تھی اور اس سے صرف وہیں کا تھوڑا سا حصہ قدرے روشن ہو رہا تھا ورنہ چاروں طرف تاریکی تھی۔

سنسان گلی میں رک کر میں نے غلام خان کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور تحکمانہ لہجے میں کہا۔ "تم یہاں سے سیدھے قہوہ خانے میں جاؤ گے اور یہ بوری سارجنٹ فرینک کی میز پر رکھ دو گے۔ میں یہیں کھڑا ہوں... اور تم ہر وقت میرے ریوالور کی زد پر ہو

گے۔ اگر تم نے کسی طرف فرار ہونے کی کوشش کی تو تمھیں اس مقصد میں کامیابی نہیں ہوگی۔ سمجھ گئے؟"

"ہاں خان... لیکن...!"

"تم سارجنٹ فرینک کو بتاؤ گے کہ یہ ایک ایسے شخص کی طرف سے اُس کے لیے تحفہ ہے، جو اپنا نام 'انتقام' بتاتا ہے۔ جاؤ... اب چلے جاؤ... جلدی!"

میں نے ریوالور سے اس کی گُدی پر ہلکی سی چوٹ لگائی، تو وہ یوں تیزی سے آگے بڑھ گیا جیسے یکایک اس کے جسم میں بے پناہ توانائی آگئی ہو۔ میں ریوالور ہاتھ میں لیے، وہیں کھڑا رہا۔

وہ پہلے تو تیز تیز چلتا رہا... پھر اس کے چلنے کی رفتار قدرے سست نظر آئی۔ وہ رک گیا۔ اس نے شاید پلٹ کر دیکھا تھا... لیکن جب اُس نے مجھے واقعی وہاں موجود پایا تو اس کی ٹانگیں ایک بار پھر حرکت میں آگئیں... پھر وہ اس لالٹین کے قریب پہنچ گیا، جو قہوہ خانے کے باہر روشن تھی۔ میں تیزی سے دائیں طرف دوڑنے لگا۔

گلی میں دوڑتا ہوا میں مکانوں کے پچھواڑے نکل آیا۔ وہاں سے میں ایک بار پھر اسی کھڑکی کے قریب جا پہنچا جہاں سے میں نے فرینک اور اس کے ساتھیوں کو قہوہ خانے میں بیٹھے دیکھا تھا... میں نے اندر جھانکا۔

قہوہ خانے میں دھواں اتنا گاڑھا ہوگیا تھا کہ لوگوں کے چہرے تک دھندلے دھندلے نظر آنے لگے تھے۔ اندر بے پناہ شور تھا۔ ایک طرف دو آدمی ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے، کہنیوں کے بل زور آزمائی میں مصروف تھے۔ سارجنٹ فرینک گڑگڑی کے چشمے سے نکلتا ہوا دھواں اُگل رہا تھا اور اس کے ساتھی بھی کش لگا رہے تھے۔

میں یہاں تک کافی تیزی سے دوڑتا ہوا آیا تھا۔ اس لیے میں نے غلام خان کو بوری اٹھائے قہوہ خانے میں داخل ہوتے دیکھ لیا۔ وہ جیسے ہی اندر آیا۔ یکایک خاموشی چھا گئی۔

"تم کیا لیے گھوم رہے ہو، غلام خان؟" کسی نے ہانک لگائی۔

... لیکن اس شخص کی حالت غیر تھی۔

وہ لڑکھڑاتا ہوا چل رہا تھا۔

بوری ابھی تک اس کے کندھے سے پشت تک لدی ہوئی تھی... اور یوں لگ رہا تھا جیسے کسی بھی لمحے وہ اس بوجھ تلے خود بھی ڈھیر ہوجائے گا۔ وہ اس میز کے قریب آکر رک گیا جس پر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سارجنٹ فرینک اپنے ساتھیوں کے ساتھ بیٹھا ہُوا تھا۔

"تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" فرینک کا ایک ساتھی بھڑک کر اُٹھ کھڑا ہُوا۔ "تمھیں تو اس وقت ڈیوٹی پر چوکی میں ہونا چاہیے تھا!"

"مَیں مجبور تھا...." اس شخص نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور بوری میز پر ڈال دی۔ "ایک شخص نے یہ بوری یہاں پہنچانے کے لیے زبردستی مجھے بھیجا ہے۔"

مَیں نے اس شخص کی حالت دیکھی تو مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کا ازاربند ٹوٹ گیا تھا.... اور اس نے شلوار گرہ دے کر باندھی تھی لیکن راستے میں شاید گرہ کھل گئی تھی.... قمیص کا گھیرا مَیں نے پھاڑ کر اس کے منہ میں ٹھونسا تھا تو وہ بھی اپنی جگہ سے غائب تھا.... اب وہ صرف پچھلے گھیرے والی قمیص پہنے وہاں کھڑا تھا، اور دامن غائب تھا۔ شلوار نہ جانے راستے میں کہاں رہ گئی تھی۔

"کیا تم پاگل ہو گئے ہو؟" فرینک نے گہری نظر سے غلام خان کی طرف دیکھتے ہُوئے کہا۔ "اور یہ تم نے حلیہ کیا بنا رکھا ہے۔ میرا خیال ہے، تم عورتوں کی نگرانی کے لیے سب سے ناموزوں شخص ہو۔"

مَیں خاموش کھڑا اس صورتِ حال سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ ابھی تک کسی نے بوری کی طرف خصوصی توجہ نہیں دی تھی۔ سب غلام خان کی عریانی میں کھو کر رہ گئے تھے.... اور ہر کوئی اپنی ذہنی سطح کے مطابق اس پر طنز و مزاح کے تیر برسانے میں مصروف ہو گیا تھا۔ غلام خان کو اپنی حالتِ زار کا اندازہ ہُوا تو وہ فوراً فرش پر بیٹھ گیا۔

قہوہ خانے میں قہقہوں کا طوفان اُٹھ کھڑا ہُوا۔

"اس بوری میں کیا ہے؟" یکایک فرینک نے دھاڑ کر پوچھا۔

"معلوم نہیں...." غلام خان گھگھیانے لگا۔

"ارے.... اس میں سے تو خون ٹپک رہا ہے!" ایک نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس بوری کی طرف دیکھتے ہُوئے کہا.... اور پھر اس نے جلدی سے بوری کو میز پر الٹ دیا۔

قہقہے دم توڑ گئے۔

قہوہ خانے میں قبرستان کی سی خاموشی چھا گئی۔

مَیں کھڑکی کی جھری میں سے دیکھ رہا تھا۔ جیکی کے ٹکڑے میز پر پھیلے پڑے تھے اور اُن کی پھٹی پھٹی آنکھیں اُن ٹکڑوں کو دیکھ رہی تھیں۔ فرینک اور اس کے ساتھی اُن ٹکڑوں کو دیکھ کر میز سے کئی قدم پیچھے ہٹ گئے۔ اُن کے چہروں سے دہشت ٹپکنے لگی۔

غلام خان تیزی سے وہ سب کچھ دہرانے لگا جو مَیں نے راستے میں اُسے بتایا تھا۔

سب سے اوپر اتفاق سے جیکی کی کھوپڑی تھی۔ مَیں نے اُس کی پیشانی پر پانزش کا نام خنجر کی نوک سے کندہ کر دیا تھا۔ یہ نشان مجھے تو نظر آ گیا.... لیکن دوسرے تمام آدمی ابھی تک لاش کے ٹکڑوں میں اُلجھے ہُوئے تھے۔ انھوں نے شاید اس سے پہلے کبھی کسی انسان کو اتنے حصّوں میں منقسم نہیں دیکھا تھا۔

معاً فرینک کی نگاہ اس نشان پر پڑ گئی۔

وہ تیزی سے آگے بڑھا اور جیکی کی پیشانی پر کندہ نشان دیکھنے لگا۔ اس کے ہونٹ سکڑ گئے۔ اگلے ہی لمحے اس نے اپنے ہولسٹر سے ریوالور کھینچ لیا اور پھر دیوانہ وار غلام خان پر گولیاں برسانے لگا۔ اس کا ریوالور خالی ہوا تو یک سناٹا چھا گیا.... پھر اس سناٹے میں فرینک کی خوفناک آواز اُبھری۔ "بستی کو گھیرے میں لے لو، اور میرا جیکی کے قاتل کو آدمی کو گولی مارنے کے بعد اس کی لاش میرے پاس لے آؤ۔"

قہوہ خانے میں اُن لوگوں کا خوفناک دوڑنے کی طرف جاتا دیا تو مَیں بھی کھڑکی سے ہٹا اور عدالت خان کی حویلی کی طرف دوڑتا چلا گیا۔

عدالت خان نے نہایت صبر و سکون سے میری کہانی سُنی۔

میرا خیال تھا کہ وہ دہشت زدہ ہو جائے گا.... لیکن ایسا نہیں ہوا۔ وہ چہرے سے فکرمند ضرور لگ رہا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں خوف کی معمولی سی جھلک بھی نہیں تھی۔ بلاشبہ وہ اس علاقے کا مانا ہُوا سیاست دان تھا اور اس کی ہر بات میں مصلحت پوشیدہ ہوتی ہو گی لیکن جب مَیں نے اپنی کہانی سنائی تھی، وہ سیاست دان کی بجائے ایک شفیق بزرگ نظر آنے لگا تھا.... کم از کم میرے معاملے میں اس نے کسی مصلحت کو سامنے نہیں رکھا۔ اس کے انداز، اس کی باتوں اور اس کے شو شعلوں سے خلوص جھلکتا تھا جسے مَیں کسی طرح بھی نظرانداز نہیں کر سکتا تھا۔

مَیں قہوہ خانے سے عدالت خان کی حویلی تک دوڑتا ہُوا

منگول
المٰس ایم اے   قیمت:- 150/

آیا تھا۔ اس لیے میری سانس ابھی تک پھولی ہُوئی تھی۔ مَیں نے انہی بے ترتیب سانسوں کے درمیان اُسے جیکی کی عبرتناک موت اور غلام خان کے بارے میں سب کچھ بتایا تھا۔

"مَیں اس سلسلے میں کوئی تبصرہ نہیں کروں گا، شالیار۔" عدالت خان نے اپنی بھاری آواز میں کہا۔ "تم نے جو کچھ کیا ہے، وہ تمہارے حالات کا تقاضا تھا۔ تمہارے دل کی آواز تھی۔ جب مَیں تمہارے کراہوں اور آہوں کے سامنے کوئی پہاڑ کھڑا نہیں کر سکا تو مجھے تمہاری خواہشات کو پامال کرنے کا بھی کوئی حق نہیں.... مَیں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ مجھے ہر حال میں تمہارا ساتھ دینا ہے۔"

"سارجنٹ فرینک اور اس کے حمایتیوں کا ردِ عمل کیسا ہو گا؟"

"وہ دیوانے ہیں.... درندے ہیں.... جانتے ہو بستی میں صرف میری ہی حویلی ایک ایسی جگہ ہے، جہاں اسلحہ موجود ہے ورنہ گاؤں کا ہر آدمی نہتا ہے.... جہاں تک ردِ عمل کا تعلق ہے تو صبح کا سورج بستی میں خون کا سیلاب لے کر طلوع ہو گا۔"

"کیا وہ اتنا ہی احمق ہے کہ بستی کے نہتے لوگوں کا بے دریغ خون بہانا شروع کر دے گا؟" مَیں نے تڑپ کر کہا۔ میرا دل کانپ گیا تھا۔ مَیں اپنی خاطر ان بے گناہوں کا خون بہتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

"میرا خیال ہے کہ ایسا ہی ہو گا۔" عدالت خان کے لہجے میں فکرمندی کی گہری جھلک تھی۔ "اور اگر ایسا نہ ہوا تو مَیں کل کے دن کو اپنی زندگی کا سب سے مبارک دن تصوّر کروں گا۔"

"آپ نے اپنے کسی آدمی کو حالات معلوم کرنے کے لیے نہیں بھیجا؟"

"آدمی جا چکا ہے.... بس آتا ہی ہو گا۔" عدالت خان نے کہا۔ "مَیں نے جنوب میں واقع ایک بستی کے لوگوں کو مدد کے لیے بھی بلا بھیجا ہے۔ اگر وہ لوگ سورج طلوع ہونے سے پہلے پہلے آ گئے تو مَیں یہ بازی اُلٹ دوں گا۔"

"آپ کے پاس کُل کتنے آدمی ہیں؟"

"میرے ساتھ تو پوری بستی ہے.... لیکن مَیں صرف سات آدمیوں پر بھروسا کر سکتا ہُوں۔ باقی لوگ زندگی اور اپنی عزت بچانے کی خاطر کسی وقت بھی دشمنوں کی پناہ میں جا سکتے ہیں۔"

"ہُوں...." مَیں سوچ میں ڈوب گیا.... کچھ دیر بعد مَیں نے خیالوں کے جنگل سے اپنے ذہن کو آزاد کیا اور کہا۔ "اگر آپ ان سات مسلح آدمیوں کو میرے ساتھ کر دیں تو مَیں اسی وقت بازی اُلٹ سکتا ہُوں۔"

"جوانی، نادانی کا دوسرا نام ہے۔ تم نہیں جانتے کہ تمہاری اس بات کا کیا مطلب ہے۔ ابھی کچھ دیر بعد میرا مخبر آ جائے گا تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ اس صورتِ حال کیا ہے.... دو سو سے زائد مسلح آدمیوں کے سامنے سات آدمیوں کی بھلا کیا حیثیت ہو سکتی ہے، شالیار؟" اس نے میری طرف دیکھتے ہُوئے کہا تو بولنے کے انداز میں میرے لیے سرزنش نمایاں تھی۔ "اُٹھو.... نیچے تہ خانے میں چلیں۔ یہاں بیٹھنا خطرناک ہو گا۔"

وہ اُٹھ کھڑا ہُوا۔

مَیں اس کے ساتھ ہی اُٹھ گیا۔

ابھی ہم دروازے کی طرف بڑھے ہی تھے کہ دروازہ ایک دھماکے سے کُھل گیا۔ میرا ہاتھ فوراً ہی اپنے ریوالور کی طرف لپکا لیکن دروازے میں عدالت خان کے ایک آدمی کو دیکھ کر مَیں نے ہاتھ کھینچ لیا۔

"کہو.... کیا حالات ہیں؟" عدالت خان نے اس شخص کو گھورتے ہُوئے کہا۔ "اور تم اس قدر گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟"

"غضب ہو گیا سوار.... انہوں نے پوری بستی کو گھیرے میں لے لیا ہے۔"

"اس کا مجھے پہلے سے اندازہ تھا۔" عدالت خان بڑبڑایا۔

"اور وہ گھر گھر گھس کر تلاشی لے رہے ہیں۔ انہوں نے اعلان کر دیا ہے کہ جس کسی نے بھی قاتل کو پناہ دے رکھی ہے، اُسے اور اس کے خاندان کو زندہ دیوار میں چُن دیا جائے گا۔ اطلاع دینے والے کے لیے انعام بھی مقرر کیا جا رہا ہے۔"

مَیں یہ سُن کر مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

احمق اپنی ہی موت کے دام لگانا چاہتے ہیں۔ مَیں نے دل ہی دل میں کہا اور اس شخص کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ دُھواں دُھواں ہو رہا تھا۔

"کیا وہ اس حویلی کی بھی تلاشی لے سکتے ہیں؟" مَیں نے پوچھا۔

"ان حالات میں تو کچھ بھی ہو جائے کم ہے.... لیکن مَیں انہیں اتنی آسانی سے اندر آنے کی اجازت نہیں دوں گا۔" عدالت خان کے لہجے میں خاصی حرارت تھی۔ "آخر اس حویلی میں خواتین بھی ہیں۔"

"ایسی صورت میں مجھے یہاں رُک کر آپ کو خطرے میں نہیں ڈالنا چاہیے۔"

"احمقانہ باتوں کا اب بالکل وقت نہیں رہا۔ اگر انہوں نے گھر گھر خانہ تلاشی کا کام شروع کیا ہے تو انہیں یہاں تک آنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔"

"لیکن مَیں...."

"خاموش رہو۔" عدالت خان نے مجھے ڈانٹ دیا۔ "وہ بستی کو گھیرے میں لے چکے ہیں تو اس وقت کوئی پنچھی بھی باہر نہیں جا سکتا۔ تمہیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں انہیں سنبھال لوں گا۔" وہ اپنے آدمی کی طرف متوجہ ہوا۔ "بہادر خان اسے تہ خانے میں لے جاؤ اور وہاں کے بارے میں اسے سب کچھ سمجھا دینا۔"

کیا انہیں اس تہ خانے کے بارے میں پتا نہیں چل سکتا؟

عدالت خان بڑے پُراسرار انداز میں مسکرانے لگا۔

"اس تہ خانے کے بارے میں میرے گھر کے افراد اور سات قابلِ اعتماد ساتھیوں اور جانثاروں کے علاوہ کوئی نہیں جانتا... چلو اب مزید وقت ضائع نہ کرو۔ اور سنو۔" اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے تحکمانہ انداز میں کہا۔ "جب تک میں اجازت نہ دوں، تم وہاں سے نہیں نکلو گے..."

"لیکن سردار... میں..."

"کچھ نہیں۔" اس نے حتمی انداز میں ہاتھ لہراتے ہوئے کہا۔ "یہ میرا حکم تمہارے لیے باپ کے حکم کا درجہ رکھتا ہے۔ کیا میں تمہیں ایک وفادار بیٹا سمجھ کر اس معاملے میں تم پر اعتماد کر سکتا ہوں؟"

اس نے میری آنکھوں میں دیکھنا شروع کر دیا۔

اس کی آنکھوں میں نہ جانے کیا تھا کہ مجھے اپنی ضد اور ہٹ دھرمی زائل ہوتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ میں نے نگاہ اس کی آنکھوں کی گرفت سے نکالی اور دھیمی آواز میں کہا۔ "میں کوشش کروں گا کہ آپ کے اعتماد کو مجروح نہ ہونے دوں... لیکن میرا وعدہ حالات کا پابند ہے۔ اگر حالات کا تقاضا یہی ہوا تو میری طرف سے آپ کو مایوسی نہیں ہوگی... دوسری صورت میں آپ اُسے ایک بیٹے کی... زندگی کی آخری خواہش اور ارمان سمجھ کر معاف کر دیجئے گا۔"

عدالت خان نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"مجھے تم سے اسی جواب کی توقع تھی۔" اس نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ "جاؤ... تہ خانے میں چلے جاؤ۔ تمہارا سارا سامان وہیں ہے اور ضروری اشیا بھی بھجوا دی جائیں گی۔"

میں خاموشی سے بہادر خان کے ساتھ کمرے سے نکل آیا۔

وہ مجھے لے کر اندرونی راہ داری میں چلنے لگا۔ یہ راہ داری تاریک تھی۔ اس کے دور افتادہ کونے میں ایک مشعل روشن تھی جس سے چربی جلنے کی بُو یہاں تک محسوس ہو رہی تھی۔ حویلی میں سناٹا چھایا ہُوا تھا۔

خاصی بڑی حویلی تھی۔ پہاڑوں کے بڑے بڑے پتھروں سے بنی ہوئی اس حویلی کو اگر ایک چھوٹا سا قلعہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ یہ حویلی گاؤں کے کنارے واقع تھی اور اس قدر بلند اور محفوظ تھی کہ باہر سے کسی شخص کا داخلہ تو درکنار کوئی آواز تک سنائی نہیں دے رہی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ باہر قیامت کا شور مچا ہوا ہوگا۔ فرنگ کے جانثار بائولے کتوں اور بھیڑیوں کی طرح غرا رہے ہوں گے۔ یہ بات بے بات ان کی رائفلیں اور ریوالور آتشیں زبانیں نکال کر زندگی کو خاکستر کرنے میں مصروف ہوں گی۔ گولیوں کے دھماکے اور انسانی چیخوں سے باہر کا ماحول کانپ رہا ہوگا لیکن حویلی پُرسکون تھی۔

راہ داری میں ہم دونوں کے قدموں کی آہٹیں گونج رہی تھیں۔

بہادر خان نے کمرے سے نکلنے کے بعد مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔

وہ گہری سوچ میں ڈوبا ہُوا تھا۔

میرے ذہن میں فرینک کے وہ الفاظ گھوم گئے جو اس نے اپنے ساتھی جیکی کی لاش دیکھ کر قہوہ خانے میں کہے تھے۔ "بستی کو گھیرے میں لے لو... اور ہر اجنبی یا مشکوک آدمی کو گولی مارنے کے بعد اس کی لاش میرے پاس لے آؤ۔"

میرا خون کھول اُٹھا۔

میں سوچ رہا تھا کہ مجھ سے غلطی ہُوئی۔ مجھے حویلی کی جانب آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ اگر میں بستی سے نکل جاتا تو اچھا تھا۔ اس طرح مجھے اخلاقی طور پر عدالت خان کی پابندی بھی قبول نہ کرنی پڑتی اور میں جب جی چاہتا، بستی میں گھس کر شب خون مار سکتا تھا... لیکن حالات کے ہاتھوں کٹھ پتلی بنا ہُوا انسان بعض اوقات سوچتا کچھ ہے اور اس کے ساتھ ہوتا کچھ ہے۔

ان خیالوں کو ذہن سے جھٹک کر میں اس منظر کو دل میں نقش کرنے لگا جو میں نے قہوہ خانے میں دیکھا تھا۔ جیکی کے ٹکڑے میز پر پھیلے ہوئے تھے اور ان گنت پھٹی پھٹی آنکھیں ان ٹکڑوں کو دیکھ رہی تھیں۔ فرینک ان ٹکڑوں کو دیکھ کر میز سے کئی قدم ہٹ گیا تھا اور اس کے ساتھیوں کے چہرے کفن کی طرح سفید پڑ گئے تھے۔ ان کے چہروں سے ٹپکتی ہوئی دہشت کو یاد کر کے بے پناہ خوشی کسی نوکھے نشے کی طرح محسوس ہو رہی تھی۔

میرے بھائی پانوش کے ساتھ ان درندوں نے جو کچھ کیا تھا، ابھی تو اس کا ایک حصہ ہی بمشکل پورا ہوا تھا۔ میں چاہتا تو ان درندوں سے وہیں قہوہ خانے ہی میں نمٹ لیتا لیکن اس طرح انتقام کی آگ نہیں بجھ سکتی تھی۔ میں ان میں سے ایک ایک کو چُن کر مارنا چاہتا تھا اور ان میں سے ہر ایک کی موت بالکل اسی انداز میں واقع ہونی چاہیے تھی، جیسے پانوش کے ساتھ ہُوا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بہادر خان جلتی ہُوئی مشعل کے قریب رُک گیا۔

اس نے مشعل اتار لی اور راہ داری میں آگے بڑھ گیا۔

میں نے محسوس کیا کہ وہ بڑے محتاط انداز میں چل رہا ہے۔ اس کے قدموں کی حرکت کے ساتھ ساتھ ہونٹ بھی حرکت کر رہے تھے جیسے دھیمے آواز بول رہا ہو۔ گیارھویں قدم پر وہ رُک گیا۔

اس نے راہ داری کی بائیں دیوار کی طرف دیکھا۔

یہاں ایک پتھر قدرے اُبھرا ہُوا لگ رہا تھا۔

بہادر خان نے مشعل میرے ہاتھ میں تھما دی اور خود اس اُبھرے ہُوئے پتھر سے زور آزمائی کرنے لگا۔ دو تین جھٹکے دینے کے بعد وہ پیچھے ہٹ گیا۔ سامنے دیوار میں ایک بہت بڑی سِل دائیں طرف پھیلنے لگی تھی۔ میں حیرت سے اس پھسلتی ہوئی دیوار کو دیکھ رہا تھا۔ زندگی میں پہلے کبھی کسی ایسے تہ خانے میں جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا اس لیے یہ میرے لیے ایک نئی چیز تھی۔

پتھر کی سِل ہٹ جانے سے خاصا بڑا شگاف ہو گیا۔

اس نے میرے ہاتھ سے مشعل لے لی۔

جب وہ شگاف میں داخل ہو گیا تو میں اس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ دیوار کی دوسری جانب تہ خانے کی سیڑھیاں تھیں۔ جب میں نیچے پہنچ گیا تو بہادر خان نے سرکی ہُوئی سِل کو برابر کیا اور سیڑھیاں اترنے لگا۔

اچانک میرے کانوں سے ہلکی سی گونج دار آواز ٹکرانے لگی۔ میں چونک پڑا لیکن تجسس دُور کرنے کے لیے رُکا نہیں یہی آوازیں میں نے حویلی میں داخل ہوتے ہی سُنی تھیں۔

"بہادر خان..." میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ "یہ گونج دار آوازیں کیسی ہیں؟"

"ایک مشین کی آواز ہے۔" اس نے سرسری لہجے میں جواب دیا۔

"مشین..." میں نے حیرت سے دُہرایا۔ "کیسی مشین؟"

"خراد مشین پر اسلحہ تیار ہوتا ہے۔"

"اوہ... کیا یہاں دن رات کام ہوتا رہتا ہے؟"

"کام زیادہ ہو تو راتوں کو بھی مصروفیت رہتی ہے۔"

"ہُوں..." میں نے زیرِ لب کہا۔ "اس کارخانے کے بارے میں تو بستی کے سارے ہی لوگ جانتے ہوں گے؟"

"ہاں... لیکن وہ اس کی نشاندہی نہیں کر سکتے۔"

"سارجنٹ فرینک اور اس کے ساتھیوں کو بھی علم ہوگا؟"

"میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔" اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ "صاحب خاموش رہو کیونکہ ہم جس حصے سے گزریں گے، وہاں ایسے لوگ کام کرتے ہیں جن کو ہماری شکلیں اور آوازیں پہچاننے کا موقع نہیں ملنا چاہیے۔"

"وہ کیوں...؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"اس لیے کہ وہ سب قیدی ہیں۔ اس جگہ کام کرنے والوں کو اب زندگی بھر سورج دیکھنا نصیب نہیں ہوگا۔" بہادر خان کے لہجے میں درندگی اور سفاکی تھی۔ "کارخانے سے گزرتے وقت آنکھوں سے گلے تک کا حصہ ڈھانپ لینا۔"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

سیڑھیاں خاصی گہرائی تک چلی گئی تھیں۔

آخری سیڑھی سے فرش پر اترتے ہی بہادر خان نے سیاہ چادر کے ایک کونے کو نقاب کی طرح منہ پر لپیٹ لیا۔ اس کی پیشانی چلنے سے پہلے ہی ڈھکی ہوئی تھی۔ اب اس کی صرف آنکھوں ہی کو دیکھا جا سکتا تھا۔

میں نے بھی اس کی تقلید میں ایسا ہی کیا۔

اس وقت ہم ایک ایسے کمرے میں تھے جس کی دیواریں، فرش اور چھت چٹانی پتھروں سے تعمیر کی گئی تھی۔ اس تہ خانے میں تین خراد مشینیں تھیں اور کونے میں ایک کولہو تھا... لیکن اس میں جُوا پہنے ہوئے کوئی گھوڑا نہیں تھا بلکہ ایک انسان تھا۔ اس کا بالائی دھڑ برہنہ تھا اور زیریں دھڑ پر چیتھڑے تھے۔

وہ پسینے میں نہایا ہوا تھا۔

کولہو کے بیل کی طرح وہ دائرے میں گھوم رہا تھا اور اس کے گھومنے سے ایک مشین چل رہی تھی۔ اس تہ خانے میں چار نقاب پوش پٹھان تھے جن کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں۔

انہوں نے غالباً ہمارے قدموں کی آہٹ سن لی تھی اس لیے رائفلوں کا رُخ ہماری ہی طرف تھا۔ بہادر خان نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں اپنی شناخت کرائی تو چاروں رائفلوں کا رُخ بدل گیا۔

میں نے تہ خانے میں اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔

کافی کشادہ جگہ تھی۔ یہاں کم و بیش تیرہ آدمی تھے جو غلامی کی نہ جانے کتنی زندگی گزار چکے تھے اور ابھی غلامی کے نہ معلوم کتنے روز باقی تھے۔ ہر ایک خستہ حال تھا۔ ان کی داڑھیاں بڑھی ہوئی تھیں اور چہرے چٹانوں کی طرح سخت اور ویران نظر آ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں ویرانیاں رقص کر رہی تھیں۔ غالباً انہیں پیٹ بھر کر روٹی بھی نہیں ملتی ہوگی۔ تبھی تو بعض ہڈیوں کے پنجر ہو کر رہ گئے تھے۔ اس کے باوجود سخت محنت اور مشقت نے ان کے جسموں کو پتھر بنا دیا تھا۔ ان میں سے کسی نے بھی نگاہ اٹھا کر ہماری طرف نہیں دیکھی۔

یہ خود غرضی اور درندگی کی ایک علیحدہ دُنیا تھی جس کے بارے میں مَیں نے زندگی میں کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا... لیکن معلوم نہیں کیوں ان میں سے کسی ایک کے لیے بھی میری دھڑکنیں بے ترتیب نہیں ہوئیں؟

اس کمرے سے گزرنے کے بعد ہم دوسرے تہ خانے میں نکل آئے۔

یہاں داخل ہوتے ہی تعفن کا احساس ہونے لگا عجیب سی سڑاند تھی۔ میں بمشکل ایک بے ساختہ اُبکائی کو روکنے میں کامیاب ہُوا۔ بہادر خان کے قدم بھی یہاں آنے کے بعد خاصے تیز ہو گئے تھے۔ میں سانس روکے چل رہا۔

جب میرے تہ خانے میں قدم رکھا تو میں نے آہستہ آہستہ سانس لی۔ گھٹن کا احساس تو تہ خانے میں اُترتے ہی ہو گیا تھا لیکن یہاں کچھ زیادہ ہی دم گھٹنے لگا۔ یہاں سے بھی بہادر خان تیز تیز آگے بڑھ گیا۔

... پھر ہم ایک ایسے تہ خانے میں پہنچے، جہاں نہ تو سڑاند تھی اور نہ ہی وہاں گھٹن یا سیلن کا احساس تھا۔ بہادر خان کو چہرے سے چادر کا کونا ہٹاتے دیکھ کر میں نے بھی نقاب کے طور پر لپٹا ہوا کپڑا مُنہ سے ہٹایا اور ایک گہری سانس لے کر اپنے ساتھی کی طرف دیکھا۔

"عجیب دُنیا ہے..." میں نے مسکرا کر کہا۔

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا اور خاموش رہا۔

"ان لوگوں کو غلامی کی زندگی بسر کرتے کتنا عرصہ ہو گیا ہے؟"

"شاید دس سال سے یہ کارخانہ قائم ہے۔ پہلے یہاں آدمیوں کو محض تجارت کے لیے جمع کیا جاتا تھا... لیکن بعد میں سردار نے اسلحہ سازی کا کام شروع کر دیا تو غلاموں کی فروخت بند کر دی اور یہی غلام کام پر لگا دیے گئے۔" بہادر خان نے جواب دیا۔

"اور یہ غلام کہاں سے آتے ہیں؟" میں نے دریافت کیا۔ "کیا اسی بستی کے لوگ ہیں؟"

"نہیں... اس بستی کے تو شاید اکا دکا آدمی ہی ہوں گے۔ زیادہ تر غلاموں کو لٹیروں اور ڈاکوؤں سے باقاعدہ خریدا گیا ہے۔"

"اوہ... تو کیا سردار عدالت خان پہلے غلاموں کا تاجر بھی تھا؟"

"اب بھی ہے۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

"ہوں... اور جن ڈاکوؤں سے غلاموں کو خریدا جاتا ہے ان سے ظاہر ہے سردار کے ذاتی نوعیت کے تعلقات ہوں گے۔"

"تم مجھ سے زیادہ سمجھدار ہو۔ شاہیار خان۔" اس نے قہقہہ لگا کر کہا۔ "لیکن تم اس زیرِ زمین دُنیا کے بارے میں پریشان نہ ہو۔ یہاں نہ جانے کیا کیا ہوتا رہا ہے۔ ہمارے سینے میں دل کی جگہ پتھر ہیں۔"

"کیا عدالت خان کا دل پتھر نہیں ہے؟"

"یقیناً ہے..." اس نے ہنس کر کہا۔ "لیکن تم نے اس پتھر کو بھی دھڑکن سکھا دیا۔ میں نے سردار کو اس سے پہلے کبھی جذباتی نہیں دیکھا۔"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

بہادر خان نے مشعل ایک دیوار کے آنکڑے میں ڈال دی اور خود ایک دیوار کے سامنے جا کھڑا ہُوا۔ غالباً وہ اس دیوار میں بھی راستہ بنانا چاہتا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے ایک سل ہٹائی۔ میں اس کے ساتھ ایک بار پھر سیڑھیوں کے ایک طویل سلسلے پر پاؤں رکھنے پر مجبور ہو گیا۔

"معلوم ہوتا ہے، سردار مجھے پاتال میں چھپانا چاہتا ہے۔" میں نے قہقہہ لگا کر کہا۔

"تم جس تہ خانے میں جا رہے ہو شاہیار خان، وہاں ابھی تک کسی کو بھی قیام کرنے کی سعادت حاصل نہیں ہوئی۔"

"کیا مطلب؟" میں چونکے بغیر نہ رہ سکا۔

"اس تہ خانے کے برابر میں ایک اور تہ خانہ ہے جہاں غلام عورتوں کو رکھا جاتا ہے۔ میرا خیال ہے اس وقت وہاں کم از کم بیس بائیس عورتیں ضرور ہوں گی۔ کیا تم اتنی عورتوں کے درمیان زندگی گزار سکتے ہو؟"

میں نے ایک طویل سانس لی اور چند روز قبل کے واقعات میں کھو گیا۔ نوگی کا سراپا میرے ذہن میں یوں اُتر آیا جیسے سانس حلق سے پھیپھڑوں تک اُتر جاتی ہے۔ میرے حواس پر ایک نشہ سا طاری ہونے لگا۔ وہ یقیناً میرا انتظار کر رہی ہوگی۔

میں نے اس سے ٹھیک دسویں روز ملاقات کا وعدہ کیا تھا۔

سرزمین نیپال کا سچا واقعہ

درندہ

یعقوب جمیل کے ہوشربا قلم سے

دو جلدوں میں

مکمل سیٹ =/300 روپے

مکتبہ القریش سرکلر روڈ اردو بازار لاہور

فون 7668958

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس وقت مجھے یہ توقع نہیں تھی کہ سارجنٹ فرینک اور اس کے ساتھیوں کے پیچھے مجھے وادیٔ خوف تک پہنچ جانا پڑے گا۔ اب واپسی کا راستہ زندگی کے راستے سے ہم آہنگ ہو گیا تھا اور راہِ حیات پر موت ٹہل رہی تھی۔ نوگی کا خیال ذہن سے جھٹک کر میں نے خود کو ان حالات کے حوالے کر دیا جو میرے سامنے دامن وا کیے موجود تھے۔

بہادر خان کن انکھیوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ شاید وہ میری اس خاموشی کا غلط مطلب لے رہا تھا۔

"تم جس تہ خانے میں رہو گے، وہاں سے تمھیں کوئی صورت تو دکھائی نہیں دے گی لیکن تم چوڑیوں کی کھنک اور سُریلی آوازیں ضرور سُن سکو گے... سردار تم پر انتہائی مہربان ہے۔ تم چاہو تو وہ چوڑیاں تمھاری آغوش میں بھی کھنک سکتی ہیں۔"

"میں یہاں عیش و عشرت کی دلدل میں ڈوبنے کے لیے نہیں آیا ہوں، بہادر خان۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "میرے سامنے ایک عظیم مقصد ہے۔ میں اپنے بھائی کے انتقام کی آگ میں جلتی ہوئی پیاسی رُوح اٹھائے گھوم رہا ہوں۔ جب اس کی پیاس بُجھ جائے گی تب میں عام جوانوں کے سے انداز میں سوچنے کے قابل ہو سکوں گا... اس وقت یہ سُریلی آوازیں اور چوڑیوں کی کھنک بھی اچھی لگے گی۔"

"تم شاید بُرا مان گئے۔" اس نے جلدی سے کہا۔

"نہیں... اس میں بُرا ماننے کی بات نہیں۔" میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "بہرحال، یہ بتاؤ کہ ان عورتوں کو بھی اسی ذریعے سے حاصل کیا گیا ہے جس سے غلام مرد یہاں پہنچتے ہیں؟"

"ہاں... لیکن عورتوں سے کوئی ایسی مشقت نہیں لی جاتی۔"

"ظاہر ہے اگر انھیں بھی کولہو کی گائے بنا دیا جائے گا تو وہ کس کام کی رہیں گی۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ "تم لوگوں کو ان سے کیوں دُور رکھا جاتا ہے؟" میں نے اسے بے تکلفی کی خاطر چھیڑنے کی کوشش کی۔

وہ جھینپ کر خاموش ہو گیا۔

یکایک اس کی آنکھوں میں مجھے اُداسی جھلکتی محسوس ہوئی۔

"کیا تم ان تمام عورتوں کو دیکھ چکے ہو؟" میں نے معنی خیز لہجے میں کہا تو وہ چونک کر میری طرف متوجہ ہو گیا۔ انداز سے ایسا ہی محسوس ہو رہا تھا جیسے میں نے اس کے دل کا چور پکڑ لیا ہو۔ "یقیناً تم ان عورتوں میں سے کسی ایک کو دل دے بیٹھے ہو۔"

"مذاق مت کرو خان۔" اس نے ایک سرد آہ بھر کر کہا تو میرے لیے ہنسی ضبط کرنا مشکل ہو گئی۔

وہ جس قسم کے ماحول میں زندگی گزار رہا تھا، اس میں بھی کوئی ایسی ہستی موجود تھی جس نے اس کے پتھر دل کو تڑپا کر رکھ دیا تھا۔ بہادر خان رُک گیا۔ میرے کانوں سے ایک نسوانی قہقہہ ٹکرایا۔ آواز ایسی ہی تھی جیسے دُور کہیں چاندی کی ننھی ننھی سی ان گنت گھنٹیاں بج اُٹھی ہوں۔

بہادر خان نے ایک ایسے تہ خانے کا دروازہ کھولا جس میں قدم رکھنے کے بعد میں سکتے کے عالم میں کھڑا رہ گیا۔ عدالت خان کی حویلی دیکھنے میں بدرُوحوں کا مسکن معلوم ہوتی تھی لیکن اس حویلی میں ایک گوشۂ جنت بھی موجود تھا۔

یہ کوئی تہ خانہ تھا یا کسی بادشاہ کی خواب گاہ؟ میں پہلی نظر میں اس کی زیبائش دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا تھا۔

"اب تم یہاں آرام کر سکتے ہو، شاہیار خان۔" بہادر خان نے کہا۔ "یہاں تک کسی دُشمن کے قدم نہیں پہنچ سکتے۔"

"سُنو..." میں نے اُسے واپس جانے سے روکتے ہوئے کہا۔

وہ رُک کر میری طرف دیکھنے لگا۔

اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلنے لگی۔

"اس ماہ داری کے آخری حصّے میں تمھیں وہ پرستان کا گوشہ مل جائے گا۔" اس نے دیوار کے ساتھ ساتھ نگاہ دوڑاتے ہوئے ایک طرف اشارہ کیا۔

"... پریوں کے دیس کی نہیں، اس راستے کے بارے میں بتاؤ جس کے ذریعے یہاں سے نکلا جا سکتا ہے۔" میں نے قدرے سختی سے کہا۔

"اوہ... اس راستے کے بارے میں تو بتانا بھول ہی گیا۔" اس نے گڑبڑا کر کہا اور خواب گاہ جیسے پُرتکلف تہ خانے کی ایک دیوار کی طرف بڑھ گیا۔ اس دیوار پر ایک چیتے کی کھوپڑی ٹنگی ہوئی تھی اور اس کی خوبصورت کھال دیوار پر چسپاں تھی۔

بہادر نے کھال کا ایک کونہ پکڑ کر اُٹھا دیا۔ یہاں بھی ایک پتھر دیوار سے قدرے نکلا ہُوا دکھائی دیا۔

"اس پتھر کی مدد سے تم بیرونی راستے کو کھول سکتے ہو... لیکن تمھیں یاد ہوگا کہ سردار نے باہر جانے سے منع کیا تھا۔"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

وہ واپس چلا گیا لیکن جاتے جاتے تہ خانے میں موم کی شمع روشن کر گیا۔ میں ایک آرام دہ بستر پر بیٹھ گیا۔ میرے کانوں سے ابھی تک بہادر کی چپل سے پیدا ہونے والی اور تہ خانوں میں گونجتی ہوئی آوازیں ٹکرا رہی تھیں۔ میں نے اُٹھ کر اسی ترکیب سے تہ خانے کا دروازہ بند کر دیا جسے میں بہادر سے سیکھ چکا تھا۔

دیوار کا پتھر اپنی جگہ آ گیا تو بہادر خان کے قدموں کی چاپ سُنائی دینا بند ہو گئی اور خاموشی کے ساتھ تنہائی کے احساس نے میرے

ذہن پر ایک ساتھ حملہ کر دیا۔ میں دوبارہ بستر پر بیٹھ گیا اور موجودہ صورت حال پر غور کرنے لگا۔

آرام دہ بستر پر نیم دراز ہونے کے بعد چند لمحوں تک تو مجھے یوں لگا تھا جیسے میں کوئی چھوٹی سی چٹان ہوں اور میرا چٹانی جسم زلزلوں کا شکار ہونے لگا ہو۔ اُف کتنا وقت گزر گیا تھا اس قسم کے کسی آرام دہ بستر پر ٹیک لگائے ہوئے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے یہ محض چند دنوں کی بات نہیں بلکہ صدیوں کا غم ہو... ایک ایسا دکھ ہو جو میری روح کی تخلیق کے ساتھ ہی پیدا ہوا ہو... اور یہ کرب زندگی بھر اب میرے ساتھ ساتھ رہے گا۔

اچانک مجھے وہ ہندو لڑکی یاد آگئی جس سے میں جیکی کو ٹھکانے لگاتے وقت ملا تھا جس وقت میں نے جیکی کو اذیت ناک موت سے ہمکنار کرنا شروع کیا تھا تو وہ مارے دہشت کے بے ہوش ہو گئی تھی... وہ بے ہوش ہو گئی تھی یا دہشت کی زیادتی اس کے لیے جان لیوا ثابت ہوئی تھی، میں اس سلسلے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا حالانکہ میں نے اس کے دل کی دھڑکن سننے کی بھی کوشش کی تھی جس میں مجھے کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ اس کی موت کا مجھے بہر حال دکھ تھا... بشرطیکہ وہ واقعی مر گئی ہو۔

میرے دماغ میں خیالوں کے آوارہ ہجوم تھے جو آپس میں بار بار ٹکرا جاتے تھے اور ان گڈمڈ خیالوں کو الگ الگ کرنا میرے لیے مشکل ہو رہا تھا... شاید اسی کشمکش میں میری آنکھ لگ گئی تھی۔

نہ جانے میں کب تک پڑا سوتا رہتا کہ اچانک میری حساس سماعت سے ایک بھیانک چیخ ٹکرائی۔ میں چونک کر اٹھ بیٹھا۔

میں چند لمحوں تک متجسس نگاہ سے اِدھر اُدھر دیکھتا رہا لیکن دوبارہ کوئی چیخ سنائی نہیں دی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ چیخ خود میرے ہی دل سے بلند ہوئی ہو اور میرے ذہن میں گونج کر رہ گئی ہو۔

اس سے پہلے کہ میں دوبارہ بستر پر دراز ہوتا، ایک بار پھر چیخ سنائی دی۔ اس بار آواز واضح تھی اور دیواروں کو چیر کر میرے کانوں تک پہنچی تھی۔ یہ وہم یا خواب نہیں تھا۔ میں نے ریوالور نکال کر ہاتھ میں لے لیا۔

تیسری بار بھی ویسی ہی چیخ سنائی دی۔

... پھر کسی کا ہذیانی قہقہہ گونج اٹھا۔

یہ قہقہہ بھی نسوانی تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی عورت دماغی توازن کھو جانے کی وجہ سے کبھی تو حلق سے دلدوز چیخیں نکالتی ہے اور کبھی قہقہے لگانے لگتی ہے۔ آوازیں دیواروں کو چیرتی ہوئی نہ جانے کہاں سے میرے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ نیند اچاٹ ہو چکی تھی اور ان آوازوں نے مجھے تجسس میں مبتلا کر دیا تھا... لیکن میں عدالت خان کے اس عجائب خانے میں کوئی مداخلت نہیں کر سکتا تھا۔

میں چپ چاپ بیٹھا رہا۔

وقفے وقفے سے چیخیں اور قہقہے سنائی دیتے رہے۔

رفتہ رفتہ ان آوازوں نے مجھے اٹھنے پر مجبور کر دیا۔ میری قوتِ برداشت جواب دے رہی تھی اور میں ان پُراسرار آوازوں کا سلسلہ بند کر دینا چاہتا تھا۔ ان چیخوں نے میرے دل کے تار جھنجھنا کر رکھ دیے

ایک نوجوان کی عجیب داستان
جو اپنی یادداشت کھو بیٹھا تھا
گم کردہ
یعقوب جمیل کے قلم سے
خوبصورت سرورق، بہترین طباعت و کتابت
قیمت =/100 روپے
مکتبہ القریش
سرکلر روڈ اردو بازار لاہور
7668958

گنگا کے پجاری ناگ
اے حمید۔ قیمت ۲۵۰/۰۰ روپے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھے اور میں اپنے جسم میں کسی درندے کی تیز ترین پرورش کو محسوس کرنے لگا تھا... یہ درندہ مجھے بے تاب کر گیا جس کے نتیجے میں میں اٹھ کھڑا ہوا اور مخصوص طریقے کو آزما کر باہر آ گیا۔ تہ خانے سے نکل کر میں اس راہ داری میں پہنچ گیا۔ جس کی ایک سمت میں بہادر خان نے انگلی کے اشارے سے بتایا تھا کہ ادھر غلام عورتوں کا تہ خانہ ہے۔

آوازیں اسی سمت سے آتی محسوس ہو رہی تھیں۔

میں آوازوں سے سمت کا اندازہ کرتا ہوا آگے بڑھ گیا... پھر میں نے ایک اُبھرے ہوئے پتھر کو مخصوص انداز میں حرکت دے کر دیوار میں شگاف کر دیا۔ مجھے ٹھٹھک جانا پڑا۔

دیوار میں شگاف ہوتے ہی یوں محسوس ہوا جیسے اس تہ خانے میں آوازوں کا طوفان کھڑا ہو گیا ہو۔

وہاں لگ بھگ اٹھارہ عورتیں تھیں۔ کم عمر بھی اور قدرے بڑی عمر کی بھی... یہ سب کی سب عورتیں فرش پر جھکی ہوئی تھیں اور ان کے ہجوم میں کوئی پھڑپھڑاتا ہوا جسم دکھائی دے رہا تھا۔ آوازیں اسی جسم سے پیدا ہو رہی تھیں۔

دیوار میں پیدا ہونے والے شگاف کی وجہ سے جو ہلکی سی گڑگڑاہٹ فضا میں گونج اٹھی تھی، اُسے سن کر وہ سب عورتیں چونک پڑی تھیں اور سب کی سب شگاف کی جانب ہی دیکھ رہی تھیں۔ چیخنے والی غالباً اس گروہ میں سب سے کم عمر کی لڑکی تھی۔ اس کے جسم پر چیتھڑے جھول رہے تھے اور اس کے جسم پر جابجا دانتوں کے نشانات تھے جیسے ان عورتوں نے اسے بھنبھوڑ ڈالا ہو۔

ایک عورت اب بھی قہقہے لگا رہی تھی۔

غالباً اسی کے ہذیانی قہقہے مجھے اپنے تہ خانے میں بھی سنائی دیے تھے۔

"ہٹ جاؤ..." میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "اس لڑکی کو چھوڑ کر دور ہٹ جاؤ... ورنہ..." میں نے ریوالور والے ہاتھ کو لہرایا۔

قہقہے لگانے والی عورت خاموش ہو کر مجھے گھورنے لگی۔

"لڑکی... اِدھر آؤ۔" میں نے لہجے کو بدستور سخت رکھا لیکن مجھے احساس ہوا کہ میں ان عورتوں کے سامنے اپنے چہرے کو چھپائے بغیر آگیا ہوں۔ یہ ایک غلطی تھی لیکن اب سر پیٹنے سے کوئی فائدہ نہیں تھا جو ہونا تھا وہ میری جلد بازی کے ہاتھوں ہو چکا تھا۔

زخمی لڑکی فرش سے اٹھی اور میری طرف آئی۔

"باہر آ جاؤ۔" میں نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

وہ خاموشی سے باہر آ گئی۔ اس کے انداز میں ذرا سی بھی ہچکچاہٹ نہیں تھی۔ اُسے اپنی برہنگی کا بھی احساس نہیں تھا۔ اس کی آنکھوں میں خوف کے تاثرات منجمد تھے۔ باہر آ کر اس نے پلٹ کر تہ خانے کی طرف دیکھا تو اس کے لبوں پر عجیب سی مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔ فاتحانہ سی مسکراہٹ تھی۔ میں اس وقت یہ نہیں سمجھ سکا کہ لڑکی تہ خانے سے نکل کر یکایک پُرسکون کیوں ہو گئی ہے... لیکن جب میں نے اسے اپنے لیے مخصوص تہ خانے میں لے جا کر اس کی کہانی سنی تو مجھے حیرت کا شدید جھٹکا بھی لگا۔

لڑکی نے بتایا کہ اٹھارہ عورتوں کے اس گروہ میں چار ایسی عورتیں بھی ہیں جن کا عقیدہ ہے کہ کسی پاکیزہ جسم کو داغ دار ہونے سے بچانا، روح کی نجات کے مترادف ہے۔ لڑکی میری شکر گزار تھی۔ اس نے بتایا کہ اگر میں نے بروقت اس کی مدد نہ کی ہوتی تو وہ تمام عورتیں اس کی بوٹی بوٹی کر دیتیں... اور یوں وہ کچھ ہی دیر بعد اُن کے معدوں میں اتر جاتی۔

میں نے غور سے لڑکی کو دیکھا۔

بے حد حسین اور معصوم چہرے والی لڑکی تھی اس کا جسم بھی قیامت خیز تھا۔ میں نے جب سے اس انداز میں لڑکی کا جائزہ لیا تھا، وہ تیر کی طرح میرے دل میں اتر گئی تھی۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا لیکن اس تہ خانے میں کوئی ایسا مرہم نہیں تھا جسے میں اس کے زخموں پر لگا دیتا... میں نے اُسے اپنی آغوش میں چھپا لیا تو وہ سسک پڑی... اور پھر میں نے اپنی محبت بھری باتوں کے مرہم سے اس کے دل کے زخموں کو مندمل کرنے کی کوشش شروع کر دی۔

باہر رات کا سفر جاری تھا۔

حویلی کے باہر اب تک کیا ہو چکا ہوگا، اس کا میں اندازہ تو کر سکتا تھا لیکن ابھی تک مجھے کسی نے صورت حال سے آگاہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

نہ جانے میں کب تک اس لڑکی کی پُرکشش ذات کی بھول بھلیوں میں کھویا رہا کہ اچانک گڑگڑاہٹ کی وجہ سے ہم دونوں ہی چونک پڑے۔

دیوار میں شگاف پیدا ہو چکا تھا اور بہادر خان خاموش کھڑا ہم دونوں کو گھور رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اُبھری... پھر ان پر تناؤ نظر آنے لگا۔ "اس لڑکی کو فوراً واپس اس کے تہ خانے میں بھیج دو، شاہ یار خان۔" اس نے خشک لہجے میں کہا۔ "تھوڑی ہی دیر بعد سردار یہاں آ رہا ہے۔"

لڑکی یکایک گڑگڑانے لگی کہ اُسے واپس اس تہ خانے میں نہ بھیجا جائے لیکن بہادر خان یوں کھڑا رہا جیسے وہ لڑکی کی آواز کی سرے سے سن ہی نہ رہا ہو۔

"بہادر خان!" میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ "کیا اس پاس کوئی خالی تہ خانہ نہیں ہے؟"

"ہے تو سہی... لیکن کیوں؟" اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

"اس لڑکی کو اس خالی تہ خانے میں پہنچا کر واپس آجاؤ تو میں تمہیں ساری کہانی سناتا ہوں۔ جلدی کرو۔" میرے انداز میں تحکم پیدا ہو گیا۔

بہادر خان نے اثبات میں سر ہلایا اور لڑکی کو لے کر ایک طرف روانہ ہو گیا۔ ابھی اُسے گئے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ عدالت خان تنہا وہاں پہنچ گیا۔ میں نے دل ہی دل میں کلمۂ شکر ادا کیا کہ اس نے لڑکی کو نہیں دیکھا۔ اس سلسلے میں میں بہادر خان کا بھی شکر گزار تھا جس نے بروقت آکر مجھے ایک بڑی پریشانی میں مبتلا ہونے سے بچا لیا تھا۔

میں جذبات میں اندھا ہو کر سب کچھ کر تو بیٹھا تھا لیکن عدالت خان کی بزرگی کے سامنے میں چشم بے حیا وا نہیں رکھ سکتا تھا۔ میں نے اپنی پیشانی سے ندامت کے پسینے کی بوندیں پونچھ ڈالیں اور سنبھل کر عدالت خان کی طرف دیکھنے لگا جس کے چہرے پر سلوٹیں اتنی اُبھری تھیں جیسے وہاں کسی تیز دھار خنجر سے خراشیں تو لگ گئی ہوں لیکن ان سے ابھی خون نہ نکلا ہو۔

وہ بے حد فکر مند تھا۔

"آپ کچھ پریشان دکھائی دے رہے ہیں بابا!" میں نے کسی سعادت مند برخوردار کی طرح کہا۔ دراصل میں اب بھی اس جرم کو ذہن سے کھرچ کر پھینکنے میں کامیاب نہیں ہُوا تھا۔

"میں بے حد پریشان ہوں بیٹا۔" عدالت خان کی آواز میں بے پناہ درد تھا۔ "تم نے اس تہ خانے تک آتے ہوئے درندگی اور ظلم کے کئی تماشے دیکھے ہوں گے جن سے تمہیں اندازہ ہو گیا ہو گا کہ میں دل میں کوئی نرم گوشہ نہیں رکھتا... لیکن ایسی بات نہیں ہے جن لوگوں کو تم نے بربادی کی اس منزل پر دیکھا ہے، وہ اسی انجام کے مستحق تھے۔ وہ سب کے سب اپنے کیے کی سزا بھگت رہے ہیں۔"

میں خاموش رہا۔

وہ چپ ہو کر ایک طرف بیٹھ گیا۔

تہ خانے میں ایک طرف تمباکو کا ڈبہ اور پیتل کی چلم رکھی ہوئی تھی۔ میں نے ڈبے سے تھوڑا سا تمباکو نکالا اور اسے ہتھیلیوں سے مسل کر چلم میں بھرنے کے بعد عدالت خان کے سامنے رکھ دیا۔

اس نے چلم سلگائی اور گہرے گہرے کش لگانے لگا۔

چند لمحوں کے لیے دھوئیں کے گاڑھے بادل نے اس کا تفکر

آمیز چہرہ ڈھانپ لیا۔ جب دھوئیں کا بادل چھٹ گیا تو اس نے نگوٹی بنا کر منہ پر رکھتے ہوئے کھانسنا شروع کر دیا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ مجھ سے کوئی خاص بات کہنے کے لیے ذہن میں موزوں ترین لفظوں کو ترتیب دے رہا ہے۔

میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

میرے دل نے شدت سے دھڑکنا شروع کر دیا تھا۔

"کیا بات ہے بابا؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔

اس نے میری طرف دیکھا تو آنکھوں میں ویرانیاں رقص کر رہی تھیں... پھر اس نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ "اس بستی سے مجھے بے حد محبت ہے، شالیار خان... میں یہیں پیدا ہوا تھا اور یہیں میں اپنا بڑھاپا گزار رہا ہوں۔ یہ میرا وطن ہے مجھے اس کی مٹی کے ذرّے ذرّے سے محبت ہے اور میں یہاں کے رہنے والوں کو اپنے ہی جسم کا حصہ سمجھتا ہوں..."

"آخر آپ کھل کر کیوں نہیں کہتے کہ کیا بات ہے؟"

وہ خاموش رہا۔

"اگر میری وجہ سے بستی کے لوگوں کی زندگی خطرے میں پڑ گئی ہے تو آپ اتنی زندگیوں کا میری زندگی سے سودا کر سکتے ہیں بلکہ میں اس سلسلے میں آپ کا سر فخر سے بلند ہوتا دیکھنا چاہتا ہوں۔" میں نے بے حد جذباتی لہجے میں کہا۔

"کبھی تم نے سنا ہے، شالیار... کہ کسی نے اپنے ہاتھوں سے اپنا سینہ چاک کر لیا ہو... اور پھر اپنا دل نکال کر پیش کر دیا ہو، یہ بات قصّے کہانیوں میں ضرور ہو گی لیکن دُنیا میں ایسا شاید ایک بھی حقیقی واقعہ نہیں ہُوا۔ میں ایسا نہیں کر سکتا۔"

"میں نے تو آپ سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ..."

اس نے ہاتھ اٹھا کر میری بات کاٹ دی۔ "اس وقت مجھے اندازہ نہیں تھا... لیکن اب تو میں سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں۔"

میں نے اپنا خنجر نکال کر ہاتھ میں لے لیا۔

"بابا..." میں نے جذبات سے بھاری آواز میں کہا۔ "ابھی ابھی آپ نے کہا ہے کہ دُنیا میں کہیں ایسا حقیقی واقعہ نہیں ہوا کہ کسی نے اپنا سینہ چیر کر دل نکالا ہو... اور کسی کو پیش کر دیا ہو... تو میں دُنیا کا یہ پہلا واقعہ اس تہ خانے میں آپ کے سامنے حقیقت بنا کر پیش کر رہا ہوں..." میں نے خنجر والے ہاتھ کو آہستہ آہستہ اپنے سینے پر جھکانا شروع کر دیا۔

وہ تڑپ کر آگے بڑھا اور اس نے میری کلائی تھام لی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"جوانی حماقت کا دوسرا نام ہے۔" اس کی آواز میں لرزش تھی لیکن اس نے ذہنی طور پر خود کو سنبھال لیا تھا۔

میرے ہاتھ سے خنجر لے کر اس نے بستر کی طرف اچھال دیا۔

"اگر میرا کوئی حقیقی بیٹا ہوتا تو میں نے آج بستی والوں کے لیے قربان کر دیتا..." اس نے ایک بار پھر بھرائی آواز میں کہا۔ "لیکن تم جانتے ہو کہ میری صرف ایک بیٹی ہے اور وہ بھی معذور ہے۔ پرسوں اس کی شادی ہے... میرا خیال تھا کہ میں حالات کو سنبھالنے میں کامیاب ہو جاؤں گا لیکن وہ گورا سارجنٹ شاید پاگل ہو گیا ہے۔ اب تو مجھے یہ محسوس ہونے لگا ہے جیسے میری بیٹی کی بارات قبرستان سے اُٹھے گی۔ یہ بستی سورج طلوع ہونے کے تین گھنٹے بعد تباہ ہو جائے گی۔"

میں نے غصّے سے چیختے ہوئے عدالت خان کے بازوؤں کو سختی سے جکڑ لیا۔ "خدا کے لیے عدالت خان... میرے بابا کی قسم... مجھے بتاؤ ان درندوں نے کیا شرط رکھی ہے۔ میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گا۔"

"گورے سارجنٹ نے اعلان کیا ہے... اگر سورج نکلنے سے تین گھنٹے کے اندر اندر تمہیں اس کے حوالے نہ کیا گیا تو وہ وادیٔ خوف کے بچوں سے لے کر بوڑھوں تک ہر ایک کو گولی مار دے گا۔"

"بستی والوں کا کیا ردِعمل ہے؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"ان نہتّے اور مجبور لوگوں کا کیا ردِعمل ہو سکتا ہے؟"

"کیا آپ بھی اس شرط کی زد میں آتے ہیں؟"

"نہیں... لیکن اگر ایسا ہوا تو پہلی گولی میرے ہی سینے پر لگے گی۔ میں اس وادی کے ایک بھی انسان کو مرنے نہیں دوں گا۔"

"پھر... اب آپ سوچ کیا رہے ہیں؟"

"یہ ایک امتحان ہے۔" اس نے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر کہا۔ "اور مجھے امید ہے کہ خدا مجھے اس امتحان میں سُرخرو کیا کرے گا۔" وہ اب تک گہری نظر سے میرے چہرے کے بدلتے ہوئے تاثرات کا جائزہ لیتا رہا تھا۔ "تم میری جگہ ہوتے تو کیا کرتے شالیار خان؟"

"میں اپنی جگہ رہ کر بھی بہت کچھ کر سکتا ہوں۔" میں نے نرمی سے کہا۔

"ان کی تعداد ایک سو دس ہے، شالیار..."

"خدا کی قسم ان کی تعداد ایک ہزار ہوتی تب بھی میرا یہی جواب ہوتا۔" میں نے تڑپ کر کہا۔ "آپ بتایئے اس وقت آپ مجھے کتنے آدمی اور کتنا اسلحہ دے سکتے ہیں؟"

"اس وقت میرے پاس صرف تین آدمی ہیں البتہ اسلحہ جتنا بھی چاہیے مل سکتا ہے۔" اس نے الجھن سے کہا۔ غالباً وہ یہ سوچ رہا تھا کہ میں

کیا کرنے جا رہا ہوں۔ وہ میری آنکھوں میں دیکھنے لگا۔

"کیا یہ تینوں آدمی بھروسے کے ہیں؟"

"جاں نثار ہیں..." وہ بڑبڑایا۔

"ٹھیک ہے، آپ انہیں میرے حوالے کر دیں۔"

اس نے کوئی جواب نہ دیا بس مجھے گھورتا رہا۔

"میں وعدہ کرتا ہوں، بابا!" میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ "میں آپ کا سر فخر سے بلند کر کے رہوں گا۔ میرا انتقام سرد نہیں ہُوا... لیکن ان حالات میں میں سب کچھ کر گزروں گا۔ میں ان لٹیروں کا مزید کوئی ناپاک ارادہ کامیابی سے ہمکنار نہیں ہونے دوں گا۔"

اس نے مایوسی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"ٹھیک ہے، شالیار، اگر یہ تمہاری ضد ہے تو میں اب تمہیں نہیں روکوں گا... ویسے..." اس نے تہ خانے کے اس حصّے کا رُخ کیا جہاں دیوار پر ایک چیتے کی کھوپڑی آویزاں تھی اور اس کی کھال چسپاں تھی۔ اس نے ایک جھٹکے سے خفیہ دروازہ کھول دیا۔ "اگر تم چاہو تو یہاں سے فرار بھی ہو سکتے ہو۔"

"نہیں... بابا... میں فرار نہیں ہو سکتا۔"

"تم اتنے آدمیوں سے نہیں نمٹ سکتے۔"

"میں سُرخرو ہونا چاہتا ہوں۔ مجھے اس کے لیے اجازت دی جائے۔" میں نے سرد آواز میں مطالبہ کیا۔ "سورج نکلنے میں ابھی کتنی دیر ہے؟"

"سورج نکل چکا ہے۔"

"کیا...؟" میں چونک پڑا اور پھر میں نے اس انداز میں اِدھر اُدھر دیکھا جیسے مجھے اپنی بینائی پر شبہ ہو گیا ہو... تہ خانے میں آنے کے بعد مجھے نہ تو وقت کا احساس رہا تھا... اور نہ ہی باہر سے روشنی کی کوئی کرن اس نیم تاریک پاتال تک پہنچ سکتی تھی۔

اس نے جواباً اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اور شرط پوری ہونے میں کتنا وقت باقی رہ گیا ہے؟"

"صرف آدھا گھنٹہ..."

"اوہ..." میں سوچ میں پڑ گیا۔

جو صورتِ حال سامنے آئی تھی اس کا خیال تک میرے ذہن میں نہیں آ سکتا تھا۔ میں زیادہ سے زیادہ اس بات کی توقع کر رہا تھا کہ بھڑکے ہوئے بھیڑیئے زیادہ سے زیادہ دو چار آدمیوں کو نقصان پہنچائیں گے... لیکن اس وقت وادیٔ خوف کے بچے بوڑھے عورتیں اور مرد... غرضیکہ سب کے سب موت کے دہانے پر پہنچ چکے تھے۔ میں نے عدالت خان سے تین آدمیوں کی درخواست کی تھی کیونکہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس کے پاس بس تین آدمی باقی تھے ممکن ہے اس نے باقی آدمیوں کو کسی کام پر لگا رکھا ہو یا وہ کہیں گئے ہوئے ہوں... یہ بھی ہو سکتا تھا کہ جو لوگ موجود تھے ان میں سے وہ انہی تین آدمیوں پر بھروسا کر سکتا ہو۔

"ٹھیک ہے..." میں نے کچھ دیر غور کرنے کے بعد کہا "یہ کام ان تین آدمیوں سے بھی نکل سکتا ہے۔ اس وقت فرینک اور اس کے آدمی کہاں ہیں؟"

"سب بازار میں جمع ہیں۔ پوری بستی وہیں ہے۔"

"آپ پر کسی قسم کے شبے کا اظہار تو نہیں کیا گیا؟"

"نہیں... فرینک اور اس کے آدمیوں نے اب تک مجھ سے الجھنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ لوگ حویلی کی تلاشی لینے آئے تھے خود فرینک ان کے ساتھ تھا۔ میں نے اس تلاشی پر کوئی اعتراض نہیں کیا تو وہ سرسری سے انداز میں دیکھ بھال کر کے چلے گئے... البتہ جاتے وقت انہوں نے یہ دھمکی ضرور دی تھی کہ تم جس کے ہاں بھی چھپے ہوئے ہو اس کا انجام عبرتناک ہو گا۔" عدالت خان نے وضاحت کی۔

"کیا اس وقت یہاں اتنا اسلحہ موجود ہے جو پوری بستی کے لوگوں میں تقسیم کیا جا سکے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں... لیکن چار پانچ آدمی یہ اسلحہ ان نہتے آدمیوں تک نہیں پہنچا سکتے۔ وہ سب کے سب اس طرح گھرے ہوئے ہیں کہ نہ تو ان میں سے کوئی نکل سکتا ہے اور نہ ہی ان تک کوئی چیز پہنچائی جا سکتی ہے۔"

"ٹھیک ہے... آپ اپنے تینوں آدمی میرے ساتھ کر دیں۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ریوالور نکال کر اس کی گولیاں دیکھیں... پھر بستر سے خنجر اٹھایا۔

عدالت خان کے چہرے پر ہچکچاہٹ تھی۔

اس نے ایک بار پھر مجھے سمجھانے کی کوشش کی لیکن اس بار لہجہ بے حد کمزور تھا گویا اس نے بڑی حد تک خود کو میری مرضی کے مطابق تیار کر لیا تھا لیکن دل اب بھی پس و پیش کر رہا تھا... بہرحال وہ ایسا شخص ہرگز نہیں تھا جس پر جذبات کی حکومت رہی ہو۔

ہم دونوں مختلف راستوں سے ہوتے ہوئے حویلی کے اس حصے میں پہنچ گئے جہاں اسلحے کا ذخیرہ تھا۔ میں نے تین بہترین اسلحوں کا انتخاب کیا اور گولیوں کی خاصی تعداد جیبوں میں منتقل کر لی۔

پھر ہم اسی تہ خانے میں واپس آ گئے جہاں رات بھر میرا قیام رہا تھا۔

عدالت خان نے وہ خفیہ راستہ کھول دیا جس سے نکل کر ہم چند جھاڑیوں کے درمیان پہنچ گئے۔ "تم یہیں ٹھہرو... میں اپنے آدمیوں کو یہیں بھیج دیتا ہوں۔"

"اس کے بعد آپ حویلی ہی میں رُک جائیں۔"

"میں بھی ساتھ جاؤں گا۔"

"نہیں بابا..." میں نے محبت سے اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "آپ کو حویلی میں رہنا چاہیے۔ میں اپنے انتقام کے اس بھیانک کھیل میں آپ کو شامل نہیں کروں گا۔ اگر آپ حویلی سے غائب پائے گئے تو میرا یہ اقدام بیکار بھی ثابت ہو سکتا ہے۔"

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

"تمہاری اس بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ تمہیں ناکامی کی بھی توقع ہے۔" اس نے کہا "اور میرا اصول ہے کہ جس کام میں ذرا سی بھی بے یقینی ہو اس میں ہاتھ ڈالنا ہی نہیں چاہیے... میری اب بھی یہی خواہش ہے کہ..."

"نہیں بابا..." میں نے ٹھوس لہجے میں کہا اور اسے ایک طرف نرمی سے دھکیل دیا۔ "جائیے... وقت پہلے سے بہت کم ہے۔"

وہ با دلِ نخواستہ چلا گیا اور میں جھاڑیوں میں دُبکا ان تین جانثاروں کا انتظار کرتا رہا۔ جس تہ خانے میں مجھے رکھا گیا تھا، وہاں سے یہ راستہ براہِ راست باہر ہی آتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میں حویلی سے کافی دُور ایک ایسی جگہ ہوں جہاں سرِدست کوئی مجھ تک نہیں پہنچ سکتا۔

میں نے اپنی زندگی کا سب سے سنگین فیصلہ کیا تھا۔

کفن سر سے باندھ کر میدان میں اترنے کے ارادے سے میری دھڑکنوں میں ذرا سی بھی بے ترتیبی پیدا نہیں ہوئی... بلکہ میں ایک عجیب سا سکون محسوس کر رہا تھا۔ میری روح کو جیسے چین

دیوتاؤں کے شہر نیپال میں بسنے والے
ایک درندے کی پراسرار داستان
درندہ
یعقوب جمیل کے ہوشربا قلم سے جس کا
قارئین کو برسوں سے انتظار تھا
مکتبہ القریش سرکلر روڈ اردو بازار لاہور
فون 7668958

آ گیا تھا۔ انتقام کی آگ نے ایک اور ہی راہ اختیار کر لی تھی میرے سامنے اس وقت ان گنت معصوم چہرے گھوم رہے تھے۔ میں ان معصوم چہروں کو اپنی خود غرضی کی بھینٹ نہیں چڑھا سکتا تھا۔

اچانک زمین میں ہلکی سی گڑگڑاہٹ پیدا ہو گئی۔

اس تہ خانے کا دروازہ دوبارہ نمودار ہوا اور تین آدمی باہر آ گئے۔ عدالت خان ان کے ساتھ ہی تھا۔ اس نے تینوں کو مجھ سے متعارف کرایا اور حکم دیا کہ اب وہ میری تحویل میں ہیں۔ انہیں میرے ہر حکم کو بجا لانا ہے... اور میرے ایک اشارے پر جان کی بازی لگانے سے بھی دریغ نہیں کرنا چاہیے۔

میں نے باری باری ان تینوں کا جائزہ لیا۔

تینوں کڑیل جوان تھے۔ دو کے چہروں پر تو کسی قسم کا تاثر نہیں تھا البتہ ان کی آنکھیں بے حد چمک دار تھیں۔ تیسرے کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ وہ بار بار اس انداز میں آنکھوں کو پٹپٹا رہا تھا جیسے اندھیرے سے اچانک روشنی میں آنے کے بعد پلکوں کو جھپکایا جاتا ہے۔ اس کا نام گُردو تھا... مجھ سے مصافحہ کرنے کے بعد اس نے کہا "استاد... بڑی مدت بعد کسی ایسے معرکے میں شرکت کی خواہش پوری ہو رہی ہے۔ اس کے لیے میں تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔"

"گُردو مسخرہ ہے۔" عدالت خان نے مسکرا کر کہا۔ "لیکن میدانِ جنگ میں اس کا مسخرہ پن بڑی قیامت ڈھاتا ہے۔" اس نے باقی دونوں ساتھیوں کی طرف دیکھا "ابراہیم اور شالو البتہ سنجیدہ اور کام سے کام رکھنے والے آدمی ہیں۔ یہ تینوں میری زندگی کا سرمایہ ہیں شالیار خان... اور یہ سرمایہ میں تمہارے حوالے کرتا ہوں۔"

"میں اس احسان کا بدلہ کبھی نہیں چکا سکتا لیکن..."

"کوئی ایسی بات نہ کرنا۔" عدالت خان نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ "جس سے بیگانگی کی بُو محسوس ہو۔ تم میرے لختِ جگر ہو شالیار خان... کاش! حالات مختلف ہوتے تو میں تمہیں دکھاتا کہ میری چاہت کیا ہے۔"

کچھ دیر وہ ہمیں کھڑا سمجھاتا رہا۔ بازار میں گھرے ہوئے لوگوں کی تفصیل اور فرینک کے آدمیوں کی ناکہ بندیوں کے بارے میں سب کچھ بتانے کے بعد وہ رخصت ہو گیا اور میں اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"میرا منصوبہ سیدھا سادہ ہے دوستو۔" میں نے کہا۔ "ہم چاروں گھوڑوں پر سوار بستی میں داخل ہوں گے اور انداز ایسا ہی ہو گا جیسے کوئی ہمارا پیچھا کر رہا ہو... اور ہم جان بچا کر اس طرف نکل آئے ہوں۔ گُردو..." میں نے مسخرے ساتھی سے کہا۔ "تم سب سے آگے رہو گے... اور ہم سے پہلے ہجوم کو چیرتے ہوئے فرینک اور اس کے ساتھیوں کے قریب پہنچنے کی کوشش کرو گے... تم انہیں بتاؤ گے کہ..."

"میں کوئی بھی کہانی سنا دوں گا۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "اس سلسلے میں تمہیں مجھ پر اعتماد کرنا چاہیے۔"

"مجھے اعتماد ہے۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

ہم تینوں چند منٹ تک آپس میں صلاح مشورے کرتے رہے... پھر ان گھوڑوں کی طرف بڑھ گئے جو پہلے سے جھاڑیوں کے قریب ایک درخت کے نیچے پہنچا دیے گئے تھے۔ میں نے اپنا چرمی تھیلا قمیص کے نیچے پیٹی میں اڑس رکھا تھا اسے درست کرتے ہوئے میں ایک گھوڑے پر سوار ہو گیا۔

گھوڑوں پر سوار ہونے کے بعد ہم نے اپنے چہروں کو نقابوں سے ڈھانپ لیا اور پھر گُردو نے میرا اشارہ پاتے ہی گھوڑے کو ایڑ لگا دی کچھ فاصلہ برقرار رکھتے ہوئے ہم بھی اس کے پیچھے گھوڑے دوڑانے لگے۔

اس وقت ہم بستی کے مشرقی حصے میں تھے اور ہمارے گھوڑے ہر گزرتے ہوئے لمحے کے ساتھ وادیٔ خوف نامی اس بستی سے قریب ہوتے جا رہے تھے جہاں موت کے سائے ہر طرف لہرا رہے تھے۔

اچانک گُردو نے ایک نعرہ لگایا اور ہاتھ لہرانے لگا۔

اس کا گھوڑا یوں دوڑ رہا تھا جیسے موت منہ پھاڑے اس کے پیچھے پیچھے دوڑ رہی ہو۔ اس کے نعرے اور ہاتھ لہرانے سے ان سات آدمیوں کی رائفلیں پہلے تو ہماری طرف سیدھی ہوئیں۔ پھر انہوں نے ہاتھ اٹھا کر ہمیں رُکنے کا اشارہ کیا۔

... لیکن گُردو نے گھوڑے کو روکا نہیں، وہ ان کے درمیان سے نکلتا چلا گیا۔ یہ سات آدمی مشرقی سمت میں پہرے پر تھے... اور اس کے بعد بستی کے لوگوں کا ہجوم تھا۔ گُردو نے گھوڑا ہجوم میں ڈال دیا اور اسے سرپٹ دوڑاتا رہا۔

لوگ چیختے ہوئے دائیں بائیں دوڑنے لگے لیکن بعض پھر بھی ہمارے گھوڑوں کے قدموں میں روندے گئے۔ گُردو کا گھوڑا اب ہم سے پندرہ بیس قدم آگے آگے دوڑ رہا تھا۔ اس نے واقعی بڑی ذہانت کا ثبوت دیا تھا چونکہ اس نے بستی کے لوگوں کے روندے جانے کی پروا نہیں کی تھی، اس لیے یہ ظاہر ہوتا تھا جیسے ہم واقعی باہر کے کوئی آدمی ہیں اور بستی کے لوگوں سے ہمیں کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ اس بات کو محسوس کرتے ہوئے فرینک کے آدمیوں نے اندازہ لگایا کہ ہم انہی کے آدمی ہیں۔

گُردو کا گھوڑا رُک گیا۔

ہجوم سے نکل کر ہم ایک ایسی جگہ پہنچ گئے تھے جہاں بستی کا

قہوہ خانہ تھا۔ اس قہوہ خانے کے سامنے جرگے کی عمارت تھی اور فرینک اس پختہ مکان کے باہر اپنے ساتھیوں کے ساتھ کھڑا تھا۔ اس نے سخت نظروں سے گرڈو کی طرف دیکھا۔

"کون ہو تم..." وہ غرایا۔

"ہم بگولا سنگھ کے ستائے ہوئے ہیں۔" گرڈو نے چیخ کر کہا۔

"بگولا سنگھ..." ہجوم میں سے کئی آدمی چیخ پڑے اور ہر طرف سراسیمگی پھیل گئی۔ میں اپنے دونوں ساتھیوں کے ساتھ گھوڑے سے اتر کر ان سے کچھ فاصلے پر رُک گیا تھا۔ ہمارے چہرے ابھی تک سیاہ چادر کی نقابوں میں چھپے ہوئے تھے۔

"بگولا سنگھ..." سارجنٹ نے حیرت سے دُہرایا اور اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ "یہ کس بلا کا نام ہے؟"

اس کے کسی آدمی نے وضاحت میں کچھ بتایا۔ آواز اتنی دھیمی تھی کہ میں فاصلے کی وجہ سے کچھ نہ سُن سکا... لیکن میں دیکھ چکا تھا کہ فرینک کی آنکھوں میں تشویش کے سائے لہرانے لگے ہیں۔ غالباً بگولا سنگھ کسی ایسی عفریت ہی کا نام تھا جو اس علاقے کے لوگوں پر خوف بن کر چھائی ہوئی تھی۔ یہ نام میں نے پہلے کبھی نہیں سنا تھا اور نہ ہی مجھے کسی ایسے شخص کے بارے میں پتا تھا... لیکن میں خوش تھا کہ گرڈو نے واقعی بڑی ذہانت سے کہانی کا تانا بانا تیار کیا تھا۔

نقاب اب بھی اس کے چہرے پر موجود تھا۔

فرینک چند لمحوں تک اس کی طرف دیکھتا رہا... پھر وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور گرڈو کے بالمقابل آ کھڑا ہوا۔

"بگولا سنگھ اور اس کے ساتھی یہاں سے کتنی دُور ہیں؟"

"وہ پہاڑوں کے دامن میں ہیں۔" گرڈو نے مشرقی سمت میں پھیلے ہوئے کوہستانی سلسلے کی طرف ہاتھ اُٹھاتے ہوئے کہا۔

"اور ان کی تعداد کتنی ہے؟" فرینک کے لہجے میں بے چینی تھی۔

"ایک ہزار سے زیادہ ہیں۔ انہوں نے مشرق میں واقع ہر بستی کو نیست و نابود کر دیا ہے اور تھوڑی ہی دیر بعد اس طرف نکل آئیں گے۔"

"تم کون ہو... اور تم نے اپنا مُنہ کیوں چھپا رکھا ہے؟"

"مم... میں... میں ہُوں... اور مجھے تم سے شرم آتی ہے۔" گرڈو نے بے حد مسخرے پن سے کہا اور واقعی کسی نوخیز لڑکی کی طرح اُس کا جسم بل کھا گیا۔ فرینک کے ساتھی ہنس پڑے لیکن میں نے فرینک کی آنکھوں میں شبے کی پرچھائیں دیکھ لی تھی۔

اب تک میں ان ٹھکانوں کا جائزہ لے چکا تھا، جہاں جہاں فرینک کے خاص آدمی چھپے ہوئے بستی کے لوگوں کی نگرانی کر رہے تھے۔ انہوں نے واقعی بہترین مقامات کا انتخاب کیا تھا۔ میں ان پانچ مقامات میں سے صرف ایک جگہ پر چھپے ہوئے آدمی کو نشانہ بنا سکتا تھا گویا ایک کے مقابلے میں چار مقامات سے خود میں ان کے نشانے پر تھا۔

میں نے ابراہیم اور شالو کی طرف دیکھا۔

وہ بھی کن انکھیوں سے ایک طرف دیکھ رہے تھے۔

ان کی توجہ کے مقامات مختلف تھے جن سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ بھی میری طرح ایک ایک چھپے ہوئے مسلح آدمی کو تاڑ چکے ہیں اور انہیں آسانی سے ٹھکانے لگا سکتے ہیں گویا صرف دو مقامات ایسے تھے جن سے برسائی گئی گولیاں ہمیں چاٹ سکتی تھیں۔

ان دو مقامات سے بچنے کی بھی ترکیب میری سمجھ میں آ گئی۔

"شالو..." میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ "فائر کرنے کے بعد زمین پر گر جانا اور رینگ کر جتنی جلدی بھی ممکن ہو سکے سارجنٹ کے قریب کھڑے آدمیوں میں گھس جانے کی کوشش کرنا اس طرح چھپے ہوئے مسلح آدمی اندھا دھند گولیاں برسانے سے باز رہیں گے کیونکہ انہیں اپنے ہی آدمیوں کی ہلاکت کا خوف ہو گا۔"

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"چہرے سے نقاب ہٹا دو۔" فرینک غرا رہا تھا۔

"میرا چہرہ نہ دیکھو دوست!" گرڈو التجا کر رہا تھا۔

"بکواس بند کرو۔" فرینک نے چیخ کر پاؤں پٹخا۔ "فوراً نقاب ہٹا دو ورنہ تم سب کو چھلنی کر دیا جائے گا۔ میں نقاب کے پیچھے چھپے چہروں پر اعتماد نہیں کر سکتا۔" اس نے آگے بڑھ کر گرڈو کا نقاب نوچ لینا چاہا۔

اُسی لمحے میں نے اپنے ہدف پر فائر کر دیا۔

ایک دھماکا ہوا اور اس کے ساتھ ہی ایک چیخ گونج اُٹھی۔

میں نے خود کو گرا دیا اور فوراً ہی دو فائر ہوئے۔ دو چیخیں سنائی دیں۔ شالو اور ابراہیم کے نشانے بھی سچے ثابت ہوئے تھے۔ میں نے زمین پر لڑھکتے ہوئے ہر ممکن تیزی سے فرینک کے آدمیوں تک پہنچنے کی کوشش کی تھی۔ فرینک کے ان آدمیوں میں سے جو مسلح تھے۔ وہ ابھی صورت حال سمجھ ہی نہیں پائے تھے کہ ہم تینوں ان کے عقب میں دیوار تک جا پہنچے اور اس کے ساتھ ہی میں نے چیخ کر کہا۔

"کوئی حرکت نہ کرے ورنہ..."

میرا جملہ دو فائروں کی گونج میں دب گیا۔

یہ دونوں فائر ان دو مقامات سے ہوئے تھے جن تک ہماری گولیوں کی رسائی ممکن نہیں تھی لیکن ہم تینوں ان کی زد سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

باہر تھے۔ میں نے بے چینی سے گرڈو کی طرف دیکھا۔ اس مسخرے کی طرف سے مجھے بہت زیادہ فکر تھی کیونکہ وہ فرینک کے قریب تھا... اور پھر میرے جسم میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

اس نے بڑا شاندار کام کر دکھایا تھا۔

ایک تیز دھار خنجر سارجنٹ کے نرخرے پر جما ہُوا تھا۔

فائرنگ شروع ہوتے ہی اس نے فرینک کی ذرا سی غفلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس پر غلبہ پا لیا تھا۔ اس نے یہ کام بجلی کی پھرتی سے کیا ہو گا کیونکہ فرینک اتنا آسان شکار نہیں تھا۔ فرینک کی آنکھیں غصے کی زیادتی سے دہک رہی تھیں لیکن وہ بے بس تھا۔ اس کی ذرا سی غلط حرکت اُسے کٹے ہوئے نرخرے سے نیض یاب کر سکتی تھی۔

میرے ذہن میں عدالت عالیہ کا وہ جملہ گونجنے لگا جو اس نے گرڈو کے بارے میں کہا تھا۔ واقعی اس نے میدان جنگ میں حیرت انگیز کارنامہ کر دکھایا تھا... یہی نہیں بلکہ اس نے خود کو ہر طرح سے محفوظ بھی کر لیا تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ ہماری طرف متوجہ نہ ہونے کے باوجود اس نے ان لوگوں سے کیسے محفوظ رہنے کا بندوبست کر لیا تھا جن سے بچنے کے لیے ہم تینوں نے خود کو ہر ممکن تیز رفتاری سے فرینک کے آدمیوں کی پشت پر پہنچا دیا تھا۔

سارجنٹ فرینک کی بے بسی دیکھنے والی تھی۔

"ان چھپے ہوئے آدمیوں سے کہو کہ رائفلیں پھینک کر سامنے آ جائیں... ورنہ میں تمہاری گردن دھڑ سے الگ کر دوں گا۔" میرے کانوں سے گرڈو کی آواز ٹکرائی۔ وہ فرینک کو حکم دے رہا تھا۔

فرینک نے بے بسی اور جھلاہٹ سے پیروں کو باری باری زمین پر رگڑا جس سے گرد کا ایک بادل سا اس کے پیروں سے اٹھنے لگا۔ پھر اس نے حلق پھاڑ کر کہا۔ "تم دونوں رائفلیں پھینک کر نیچے آ جاؤ۔ کتے کے بچو۔"

کتے کے بچے رائفلیں پھینک کر بازار میں کود گئے۔

"کون ہو تم...؟ اور کیا چاہتے ہو؟" فرینک نے کہا۔

میں نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ "تعارف کی رسم بعد میں ادا ہو جائے گی تم جلدی سے ان آدمیوں کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ... اور ہاں... کوئی حرکت نہ کرے...۔" میں نے فائر جھونک مارا۔ ایک شخص کا ہاتھ خون آلود ہو گیا۔ یہ وہی ہاتھ تھا جو آہستہ آہستہ ریوالور کی طرف بڑھ رہا تھا۔

سب کو دیوار کے ساتھ کھڑے کر کے میں نے شالو کو ان کی نگرانی پر متعین کر دیا۔ اس بدلی ہوئی صورت حال پر بستی کے لوگوں میں شدید ہیجان پیدا ہو گیا تھا اور وہ بار بار نعرے لگا رہے تھے... لیکن ابراہیم نے اپنی رائفل کی زد پر رکھتے ہوئے انہیں خاموش رہنے کا حکم دیا۔

"اپنے تمام آدمیوں کو حکم دو کہ وہ ہتھیار ڈال دیں۔" میں نے فرینک سے کہا۔

وہ گہری نظر سے مجھے دیکھ رہا تھا اور اس کے پپڑی جمے خشک ہونٹ بار بار کانپ رہے تھے۔ میں ابھی تک نقاب پہنے ہوئے تھا ممکن ہے اُس نے آواز سے مجھے پہچان لیا ہو لیکن اس کی آنکھوں میں ابھی تک شناسائی کی جھلک نظر نہیں آ رہی تھی۔

"تو بگولا سنگھ کی داستان محض ایک دھوکا تھا۔" وہ بڑبڑایا۔ جواباً شالو نے پُوری قوت سے اس کے مُنہ پر تھپڑ مارا۔ فرینک کی باچھوں سے خُون کی پتلی سی لکیر بہہ کر تھوڑی تک آ گئی۔

"زبان بند رکھو۔" شالو غرایا۔

فرینک ہونٹ کاٹ کر رہ گیا۔ اس کی حالت کسی باؤلے کتے جیسی تھی۔ وہ غصے سے اندھا ہو رہا تھا۔ ذرا سی غفلت نے بازی پلٹ دی تھی۔ ایسا ہمارے ساتھ بھی ہو سکتا تھا لیکن جب قدرت ساتھ دینے پر آمادہ ہو تو اتنی سادہ سی ترکیب بھی بعض اوقات بڑے بڑے نتائج سامنے لے آتی ہے۔

اب تک وہاں موجود تقریباً تمام آدمی غیر مسلح ہو چکے تھے اگر یہ سب یہاں جمع نہ ہوتے تو ہمیں کامیابی نہیں ہو سکتی تھی۔ ان کے لیے پریشانی کی بات یہ تھی کہ وہ اندھا دھند فائرنگ نہیں کر سکتے تھے۔ اس طرح وہ آپس ہی میں ایک دوسرے کو ہلاکت میں ڈال دیتے۔ یہی قانی ساخذ شہ تھا جس کی وجہ سے وہ چوک گئے ورنہ اب تک ہماری لاشیں تڑپ تڑپ کر سرد بھی پڑ چکی ہوتیں۔

اچانک میں نے محسوس کیا کہ سارجنٹ کی آنکھوں میں میرے لیے شناسائی کی جھلک پیدا ہو گئی ہے گویا وہ مجھے پہچاننے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ میں اس کے سامنے جا کھڑا ہوا اور اپنے چہرے سے نقاب ہٹا دیا۔

اس نے ایک قدم پیچھے ہٹنے کی کوشش کی لیکن عقب میں جرگے کے لیے مخصوص مکان کی دیوار تھی۔ وہ بُری طرح ہانپنے لگا...

"شش... شالیمار..." اُس کے ہونٹوں سے میرا نام نکلا۔

یہ نام سُن کر اس کے ساتھیوں میں سے ایک شاید ذہنی توازن کھو بیٹھا وہ ہر بات کی پروا کیے بغیر چیختا ہوا میری طرف دوڑا۔ اس کا مُنہ کھلا ہوا تھا اور اس کے ہاتھ میری طرف بڑھے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھیں پھٹی پھٹی سی تھیں اور اس کا چہرہ کفن کی طرح سپید نظر آ رہا تھا۔

میں نے تڑپ کر خنجر نکالا اور آگے بڑھا۔

اُسی لمحے شالو نے رائفل کا رُخ اس شخص کی طرف کر دیا لیکن مجھے آگے بڑھتے دیکھ کر اس نے رائفل کی نالی جھکا لی۔ یہ فرینک کے ان ساتھیوں میں سے ایک تھا جو پانوش کی مُوت کے وقت اس کے ساتھ تھے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"شالیار... میں نے تمہارے بھائی کو..." وہ پھٹکا ہوا آگے آیا تو میرے نیچے ہوئے ہاتھ میں دبا ہوا خنجر اس کے سینے میں یوں اُتر گیا جیسے وہ کوئی جیتا جاگتا انسان نہ ہو بلکہ موم کا کوئی پُتلا رہا ہو۔

چند لمحوں تک وہ میرے خنجر پہ ٹنکا رہا۔

اس کی دہشت سے پھٹی پھٹی آنکھیں مجھ پر جمی رہیں...

... پھر اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں لیکن تم مزید ستو نکلا رہا میں نے ایک جھٹکے سے خنجر نکال لیا تھا... وہ لہراتا ہوا گر گیا میں نے اس کو ٹھوکر مار کر دور پھینک دیا اور باقی ماندہ آدمیوں کا جائزہ لینے لگا۔

میں جس شناسا چہرے کو تلاش کر رہا تھا، وہ مجھے قریب ہی نظر آ گیا میری نگاہوں کی تاب نہ لاتے ہوئے اس نے دوسری طرف دیکھنا شروع کر دیا میں نے اسے قریب آنے کا اشارہ کیا۔

وہ گھبرایا ہوا دو قدم آگے بڑھ آیا۔

"کیا تم زندگی چاہتے ہو؟" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اس کی آنکھوں میں بے یقینی اور امید کی چمک پیدا ہوئی۔

"میرے اور قریب آ جاؤ۔" میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

وہ کچھ اور آگے آ گیا۔ اچانک اس نے ایک عجیب حرکت کی مجھے اس حرکت کی توقع نہیں تھی۔ وہ میری طرف بڑھتے ہوئے ابراہیم کے قریب سے گزرا تھا اور جیسے ہی وہ اس کے پہلو میں پہنچا، اس نے جھپٹ کر ابراہیم کے ہاتھ سے رائفل چھیننے کی کوشش کی تھی۔

ابراہیم غافل تھا کیونکہ وہ دوسری طرف دیکھ رہا تھا۔ اسے دو سروں کی نگرانی کرنا تھی اور غفلت کی وجہ یہ تھی کہ اُسے معلوم تھا، میں ذاتی طور پر اس شخص کی طرف متوجہ ہوں۔ شالو بھی ہجوم کی طرف متوجہ تھا جبکہ گڈو خنجر ہاتھ میں لیے فرینک کے سر پہ سوار تھا۔

میں تیزی سے آگے بڑھا لیکن وہ شخص ابراہیم کے ہاتھ سے رائفل چھیننے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے دیوانہ وار رائفل گھمائی۔ کُندا ابراہیم کی کھوپڑی پر پڑا جو دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔

بے حد نازک صورتِ حال تھی۔ جیتی ہوئی بازی ہاتھ سے جا چکی تھی۔ لیکن مجھے یقین تھا کہ شالو اور گڈو اس صورتِ حال میں حواس باختہ نہیں ہوں گے میرے قریب پہنچنے سے پہلے ہی ابراہیم گر گیا تھا اور چونکہ میں تیزی سے اسی سمت سے آگے بڑھا تھا اس لیے گرتے وقت وہ میری راہ میں ایک لمحے کے لیے حائل ہو گیا۔

میں اس سے بُری طرح ٹکرایا اور ہم دونوں گر گئے۔

خنجر اب بھی میرے ہاتھ میں تھا۔

میں نے اٹھنے میں بڑی تیزی دکھائی تھی لیکن پھر بھی مجھے گھٹنوں کے بل زمین پر اسی حالت میں رُک جانا پڑا۔ رائفل کی نال میرے سینے سے لگ گئی تھی۔ میں نے شالو کی طرف دیکھا۔ وہ کن انکھیوں سے ہماری طرف دیکھ رہا تھا لیکن اس کی اصل توجہ ان لوگوں پر تھی جن کی نگرانی کا کام اس نے اپنے ذمے لے رکھا تھا۔

ایک بے بس نوجوان کی حیرت انگیز داستان
جسے اپنی موت کا وقت معلوم ہو گیا تھا
مظلوم
یعقوب جمیل کے ہوشربا قلم سے
جس کا قارئین کو برسوں سے انتظار تھا
مکتبہ القریش سرکلر روڈ اردو بازار لاہور
فون 7668958

"رائفل پھینک کر خود کو مجھے پہ نا دو..." میں نے سخت لہجے میں کہا۔

وہ ہنس پڑا۔ اس کی ہنسی میں خوف کی آمیزش تھی۔ اس نے رائفل کی نال کا رُخ بدستور میرے سینے ہی کی طرف رکھا۔

"بہت خوب... گلاب خان... بہت خوب۔" فرینک کی آواز سُنائی دی۔ وہ اس صورتِ حال سے بے حد پُرجوش نظر آ رہا تھا لیکن اس نے اپنی جگہ سے حرکت کرنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ اس کے نرخرے پر اب بھی گڈو کا خنجر موجود تھا۔

میں نے اس شخص کی طرف دیکھا جس کا نام مجھے معلوم ہوا تھا لیکن اس کے نقش و نگار میرے ذہن میں محفوظ تھے رحیم بابا نے ان دونوں کے حلیے بڑی تفصیل سے لکھے تھے اور انہیں پڑھنے کے بعد میں کبھی نہیں بھول سکتا تھا۔

"اگر صرف تم زندہ رہنا چاہتے ہو تو اپنی زندگی کا سودا کر لو گلاب خان۔" میں نے ٹھنڈے لہجے میں کہا۔ "فرینک تمہاری جگہ ہوتا تو یہی کرتا۔"

"مجھے صرف اپنی زندگی سے دلچسپی ہے۔" گلاب خان بڑبڑایا۔

اس کے انداز میں اب بھی دہشت تھی جس کا مطلب تھا کہ وہ بازی جیت لینے کے باوجود بھی ذہنی طور پر اسے قبول نہیں کر رہا ہے۔ میں نے نہایت آہستہ آہستہ خالی ہاتھ اٹھایا۔ اس نے کن انکھیوں سے میرے اس متحرک ہاتھ کو دیکھا لیکن میرے سینے پر نال کا دباؤ نہیں بڑھا۔ وہ زندگی سے مایوس ہو چکا تھا اور زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا۔ کیونکہ اس کی آنکھیں مجھ سے یہی کہہ رہی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بازی جیتنے کے باوجود شکست خوردہ تھا۔

میرا متحرک ہاتھ آہستہ آہستہ رائفل کی نال پر پہنچ گیا۔ "میں نے اپنے بھائی کا خون معاف کر دیا۔" یہ کہتے ہوئے میں نے ایک جھٹکے سے رائفل کی نال کا رُخ بدل دیا اور اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

"گلاب خان..." میں نے اس کے ہاتھ سے رائفل کھینچتے ہوئے کہا، "میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ میں اپنے بھائی پاوش کی موت کا تم سے بدلہ نہیں لوں گا۔"

"تم ایک بہادر نوجوان ہو، شالیار۔" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "مجھے تمہاری زبان پر اعتماد ہے۔"

"لیکن اس کے باوجود تم زندہ نہیں رہ سکتے۔" میں نے کہا۔ "کیونکہ میں اس وقت جب کہ موت تم سے دور جا رہی تھی، تم نے اپنی حماقت سے اُسے واپس آنے کی دعوت دے دی۔ تم نے میرے ایک جاں نثار کو میرے سامنے ہلاک کر دیا۔ تمہیں اس کی سزا تو ملے گی... اور میں کم سے کم سزا موت کی شکل میں دینے کا عادی ہوں۔"

وہ تیزی سے ایک طرف دوڑ پڑا۔ اس کا رُخ ہجوم کی طرف تھا۔

میں نے رائفل اٹھائی اور گولی چلا دی۔

گولی اس کی پیٹھ کو چھیدتی ہوئی گزر گئی۔

وہ منہ کے بل گر گیا۔ چند لمحوں تک اس کا جسم تڑپا۔ پھر ہمیشہ کے لیے سرد پڑ گیا۔ عقب سے مجھے ہذیانی قہقہہ سُنائی دیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ فرینک دیوانوں کی طرح ہنس رہا تھا۔ اور اس کے نرخرے پر اب بھی خنجر موجود تھا۔ ہنسنے سے اس کے گلے میں جو حرکت پیدا ہو رہی تھی۔ اس کی وجہ سے خنجر کی دھار نے اس کے نرخرے میں خراش ڈال دی۔ خون بہنے لگا لیکن اُسے شاید ابھی اس زخم کا احساس ہی نہیں ہوا تھا۔

"کیا اسے ذبح کر ڈالوں، سردار؟" گڈو کی آواز سُنائی دی۔

"نہیں..." میں نے چیخ کر کہا۔ "اس کا انجام میرے ہاتھوں سے ہو گا... اور میری مرضی کے مطابق ہو گا۔"

اسی دوران ہجوم میں ایک بار پھر بے چینی پھیل گئی۔

ہجوم کے عقبی حصے سے فائرنگ سُنائی دینے لگی۔

لوگ بُری طرح چیخنے لگے "بگولا سنگھ... بگولا سنگھ..." سب اِدھر اُدھر منتشر ہونے لگے اور ذرا سی دیر میں بازار کا راستہ صاف ہو گیا۔ لوگ راستے کے دونوں طرف کھڑے ہو گئے تھے اور پھر ان گنت گھڑ سوار نمودار ہوئے۔

میں نے گڈو کی طرف دیکھا۔

وہ بھی حیرت سے منہ پھاڑے گھوڑوں کو گھور رہا تھا۔ اس کا نقاب گھٹا ہوا میں سانس کی وجہ سے کسی نازک پتے کی طرح حرکت کر رہا تھا۔

میں پلٹ کر ان گھڑ سواروں کی طرف دیکھنے لگا جو اب ہم سے کچھ فاصلے پر پہنچ کر رُک رہے تھے۔

سب سے آگے گھوڑے پر ایک سکھ سوار تھا۔

وہ ایک کرخت چہرے والا شخص تھا۔

اس نے گہری نظر سے میری طرف دیکھا۔ "نقاب اُتار دو... اور یہ رائفل پھینک دو۔"

میں نے خاموشی سے نقاب اُتار دیا اور رائفل پھینک دی۔ بگولا سنگھ گھوڑے سے کود کر نیچے آیا اور مجھ سے کچھ فاصلے پر رُک گیا۔ اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا...

"تم کون ہو؟"

"شالیار خان..." میں نے مختصراً جواب دیا۔

اُسی لمحے عقب سے ایک دلدوز چیخ سُنائی دی۔

میں نے چونک کر پیچھے دیکھا تو میرا دل اچھل کر حلق میں اٹک گیا میرا معجزہ ساتھی دونوں ہاتھوں سے سینہ تھامے زمین پر جھک رہا تھا اُس کے سینے میں وہی خنجر پیوست تھا، جو اس نے فرینک کے نرخرے پر رکھا ہوا تھا۔

گڈو غالباً بگولا سنگھ کی آمد پر اس کی طرف سے بے پروا ہو گیا تھا... اور یہی غافلانہ بے پروائی اُس کے لیے مہلک ثابت ہوئی تھی۔ فرینک موقع کی تاک میں تھا اس نے ذرا سا موقع ملتے ہی اس سے فائدہ اٹھا لیا تھا۔

شالو نے رائفل اٹھائی اور فرینک کا نشانہ لیا۔

فضا میں دو دھماکے ہوئے۔ ایک گولی سنسناتی ہوئی فرینک کے سر سے گزر کر دیوار میں پیوست ہو گئی اور دوسری گولی نے شالو کو چاٹ لیا۔ میں نے کن انکھیوں سے گھڑ سواروں کی طرف دیکھا۔ ایک کی رائفل کی نال سے اب بھی دھوئیں کی باریک سی لکیر نکل رہی تھی۔

"میری موجودگی میں ایسی کوئی جرأت نہیں ہونی چاہیے۔" بگولا سنگھ نے کرخت لہجے میں کہا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا فرینک کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

"تم کون ہو سفید چمڑی والے اور یہاں کیا کر رہے ہو؟" بگولا سنگھ نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "شاید تم موت کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہوئے اس طرف آ نکلے ہو۔"

"میں برطانوی فوج کا سارجنٹ ہوں... اور میں ایک بھگوڑے سپاہی کے تعاقب میں یہاں تک آیا ہوں۔" فرینک نے مسکرا کر کہا۔ وہ مقامی زبان کسی اہلِ زبان کی طرح بول سکتا تھا۔ بگولا سنگھ نے پلکیں جھپکائیں... غالباً اُسے کسی انگریز سے پشتو زبان میں جواب کی توقع نہیں تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

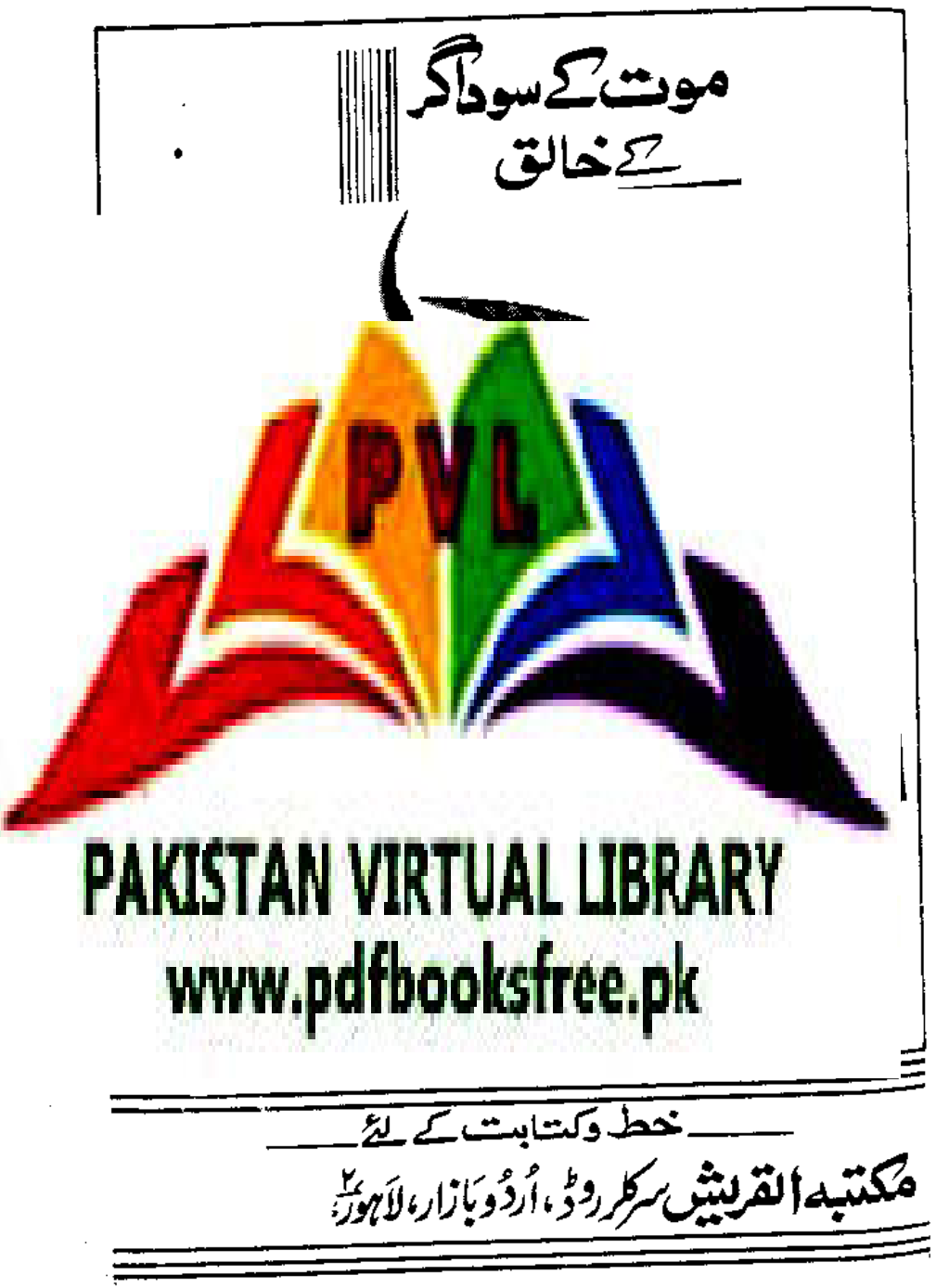

موت کے سوداگر

کے خالق

PVL

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY

www.pdfbooksfree.pk

خط وکتابت کے لئے

مکتبہ القریش سرکلر روڈ، اُردو بازار، لاہور۲

"ہوں... اور تم لوگ کون ہو؟" اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔

"یہی وہ بھگوڑا سپاہی ہے۔" فرینک میرے بولنے سے پہلے ہی بول پڑا۔

بگولا سنگھ یہ سُن کر آگ بگولا ہوگیا۔ اس نے پلٹ کر جوری طاقت دُرگھونسہ بطاری چہرے پر آئنی زور سے مارا کہ مجھے فرینک کا بایاں جبڑا ڈھیلا ہوتا نظر آنے لگا۔ غالباً اس کے جبڑے کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔

"میں نے تم سے کچھ نہیں پُوچھا تھا..." بگولا سنگھ غرّایا... پھر وہ میری طرف متوجہ ہُوا۔ "کیا تم ان ڈاکوؤں کے سرغنہ ہو جنہوں نے نقاب پہن رکھے تھے؟"

"ہم ڈاکو نہیں ہیں..." میں نے کہا اور پھر پوری داستان اُسے سُنا دی۔ بگولا سنگھ نیم وا آنکھوں سے میری طرف دیکھتا رہا اور میری باتیں سُنتا رہا۔ اس کا چہرہ جذبات سے عاری تھا اور اس کی آنکھوں میں بے پناہ چمک تھی۔

میں نے فرینک کی طرف دیکھا۔ وہ ٹوٹا ہُوا جبڑا سنبھالے کھڑا مجھے گھور رہا تھا۔

قسمت نے پے در پے اس کے مُنہ پر کئی طمانچے مارے تھے لیکن ان سے اس کا حلیہ نہیں بگڑا تھا جب کہ بگولا سنگھ کے ایک ہی گھونسے نے اس کے اور میرے درمیان پائی جانے والی قدرتی مشابہت ختم کر دی تھی۔

بگولا سنگھ نے رائفل والا ہاتھ اُٹھایا اور غرّایا۔ "ٹھیک ہے... یہ طاقت کا کھیل ہے کبھی کوئی فاتح ہوتا ہے اور کبھی مفتوح... یہ گورا اپنی ولایتی کھوپڑی کو استعمال کر کے وادیٔ خوف کا حکمران بن گیا تھا... پھر تم نے اس کی قوت کو کچل کر فتح حاصل کر لی... لیکن اب میں یہاں موجود ہوں۔" اس نے ایک خوفناک قہقہہ لگایا۔ "اور مجھے خوشی ہے کہ میں عین اس وقت یہاں پہنچا ہوں جب سارا کھیل پہلے ہی سے ختم ہو چکا ہے اور مجھے دولت کی تلاش میں نہ تو خون بہانا پڑے گا اور نہ ہی مارے مارے پھرنا پڑے گا۔"

اس نے پلٹ کر فرینک کی طرف دیکھا۔

"بتاؤ... تم نے یہاں کے لوگوں سے چھینا ہوا مال کہاں رکھا ہُوا ہے؟"

"کالی حویلی میں سب کچھ موجود ہے۔" فرینک نے کراہتے ہوئے کہا۔ "لیکن میں تم سے ایک سودا کرنا چاہتا ہُوں۔"

بگولا سنگھ کا قہقہہ بے حد گرج دار تھا۔

"چیونٹی پہاڑ کو کاٹ رہی ہے اور سمجھ رہی ہے کہ پہاڑ کھسک پڑے گا۔" بگولا سنگھ نے قہقہہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔ "تمہاری چمڑی جتنی صاف اور گوری ہے، تمہارے خیال اتنے ہی کالے اور ناپاک ہیں... بہرحال، بتاؤ... تم مجھ سے کیا سودا کرنا چاہتے ہو؟"

"اگر میں چاہتا تو یہ راز اپنی ذات تک بھی محدود رکھ سکتا تھا۔" فرینک نے اپنے سودے بازی کی اہمیت جتاتے ہوئے کہا۔ "لیکن میں تم سے تعاون کرنا چاہتا ہُوں..."

"وہ کیوں...؟" بگولا سنگھ نے مضحکہ خیزی سے پُوچھا۔

"تاکہ تمہیں زیادہ سے زیادہ فائدہ ہو سکے۔"

"بہت خُوب... ویسے تم لوگ ایسی سازشوں میں کافی تیز ہوتے ہو۔ میں، تمہیں صاف گوئی سے واضح کر دوں، سفید سؤر کہ مجھے تم سے نفرت ہے اور میں، تمہاری باتوں میں آنے والا نہیں ہوں۔"

"تمہاری مرضی..." فرینک نے کندھے اُچکا دیے۔ وہ یکایک بے حد تلخ اور شخوس نظر آنے لگا۔ اس کے چہرے اور آنکھوں سے بے پناہ عزم و حوصلے کا پتا چلتا تھا۔ اس بات کو میرے علاوہ بگولا سنگھ نے بھی محسوس کر لیا تھا۔ شاید اسی لیے وہ اُس میں دلچسپی لینے پر مجبور ہو گیا تھا۔

"شاید تم خود کو بے خوف ظاہر کر کے مجھے متاثر کرنا چاہتے ہو۔" بگولا سنگھ نے غرّاتی ہُوئی آواز میں کہا۔

"تمہیں کئی ہزار طلائی سکّے مل سکتے ہیں۔" فرینک نے کہا۔ "یہ راز صرف مجھے معلوم ہے کہ وہ کہاں ہیں... اور ان کے بارے میں میں تمہیں اس وقت تک کچھ نہیں بتاؤں گا جب تم اپنے گورو کی قسم کھا کر وعدہ نہیں کرتے..." فرینک کے انداز میں چٹانوں جیسی سختی تھی۔ "میں اپنی زندگی کی ضمانت چاہتا ہوں... اس کے علاوہ شالیار خان کو قیدی بنا کر لے جانا چاہتا ہوں۔ بولو... تمہیں یہ سودا منظور ہے یا نہیں...؟"

بگولا سنگھ نے گہری نظر سے پہلے اس کی طرف دیکھا پھر میری جانب دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں لالچ کی چمک تھی۔ عقب میں وادیٔ خوف کے لوگ سانس روکے کھڑے تھے۔ کبھی کبھی بگولا سنگھ کے گروہ کا کوئی آدمی اپنے کسی ساتھی سے بات کرتا یا گھوڑا زمین پر پاؤں مارتا تو آواز پیدا ہوتی ورنہ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ہر چیز اپنی اپنی جگہ بے حس و حرکت ہو گئی ہو اور وقت بھی ساکت ہو گیا ہو...

"تمہاری زندگی اس وقت بگولا سنگھ کی مُٹھی میں ہے۔" بگولا سنگھ نے بے پناہ غرور سے کہا۔ "اور میں تمہیں کسی حقیر چیونٹی کی طرح مسل سکتا ہُوں... لیکن جب چیونٹی کئی ہزار طلائی سکّوں کا راز دل میں چُھپائے

بُڑے ہو تو اُسے حقیر نہیں سمجھا جا سکتا۔ تمہیں، تمہاری زندگی کی ضمانت دی جاتی ہے۔ میں یا میرا کوئی آدمی تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔"

فرینک کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ اس کا ہاتھ اپنے جبڑے سے ہٹ گیا... پھر اس نے دوسری طرف سے جبڑے پر گھونسہ مار کر ہڈی کو اپنی جگہ بٹھایا اور دیوار سے ہٹ کر آگے آ گیا... وہ گڈو کی لاش کو پھلانگ کر میری طرف بڑھنے لگا۔ اس وقت تک بجولا سنگھ کے چند ساتھی کالی حویلی کی طرف روانہ ہو چکے تھے۔ یہ غالباً اُسی حویلی کا نام تھا جس میں جیکی میرے ہاتھوں ٹکڑے ٹکڑے ہوا تھا۔

فرینک میرے سامنے آ کھڑا ہوا۔

اس کی آنکھیں نفرت سے سکڑی ہوئی تھیں۔

"شالیار خان... تم بجولا سنگھ کے وعدے کے مطابق میرے قیدی ہو۔" اس نے زہر میں بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ "لاؤ... وہ طلائی سکے نکال کر میرے حوالے کر دو تاکہ میں انہیں بجولا سنگھ کی خدمت میں پیش کر سکوں..."

"تم پیچھے ہٹ جاؤ۔" بجولا سنگھ غرایا اور اس نے فرینک کی کمر پر ایک ٹھوکر مارتے ہوئے اُسے ہٹا دیا۔

"لیکن تم نے قسم کھائی تھی کہ..." فرینک نے احتجاج کیا۔

"میں کوئی قسم کھانے کے بعد اپنے وعدے کا پابند ہوں، تمہیں اپنی سانسوں کی آمد و رفت سے اس بات کا یقین ہونا چاہیے۔" بجولا سنگھ نے پلٹتے ہوئے کسی باؤلے کتے کی طرح غرا کر کہا... پھر وہ میرے سامنے آ گیا۔ "نکالو... وہ طلائی سکے کہاں ہیں؟"

میں خاموش کھڑا اسے دیکھتا رہا۔

اچانک بجولا سنگھ کا ہاتھ حرکت میں آیا۔

اس نے ہاتھ گھمایا لیکن اس سے پہلے کہ گھونسہ میرے منہ پر پڑتا، میں نے اس کی کلائی پکڑ لی اور اس کا ہاتھ فضا ہی میں معلق رہ گیا۔ بجولا سنگھ کی آنکھوں میں میری اس جرأت پر حیرت پیدا ہوئی۔

پھر اس نے ایک جھٹکے سے ہاتھ چھڑا لیا۔

وہ واقعی بے پناہ طاقت ور تھا۔

"دولت تمہیں مل جائے گی۔" میں نے کہا۔ "لیکن دولت تمہیں میں دے رہا ہوں۔ یہ سفید سؤر تم سے جس زندگی کی بھیک مانگ رہا ہے تمہیں اس کی طرف توجہ نہیں دینی چاہیے۔ کیا تم سمندر پار سے آئے ہوئے ان آقاؤں کو اپنے دیس کے لوگوں پر فوقیت دے سکتے ہو... میں تمہیں سب کچھ بتا چکا ہوں... لیکن ایک راز ابھی باقی ہے..."

وہ پلکیں جھپکائے بغیر میری طرف دیکھتا رہا۔

میں نے اپنے بھائی پلوش کی دردناک موت اور فرینک کی درندگی کا فسانہ اسے سنایا تو اس کی آنکھوں میں میرے لیے نرمی پیدا ہو گئی۔ اس نے میرا کندھا تھپتھپایا اور مسکرا کر کہا۔ "میں تمھارے جذبے کی قدر کرتا ہوں، نوجوان... لیکن میں اس دولت کو چھوڑ نہیں سکتا کیونکہ میں بجولا سنگھ ہوں، حاتم طائی نہیں ہوں۔"

میں نے پیٹی میں اُڑسا ہوا چرمی تھیلا نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

"تم ڈاکو ہو... لیکن تمھارے جذبات قابلِ قدر ہیں۔" میں نے کہا اور دل میں سوچا کہ یہ رقم میں تم سے کسی اور وقت وصول کر لوں گا۔

"آج میرا اور میرے ساتھیوں کا ستارہ عروج پر ہے۔" بجولا سنگھ نے ہنس کر کہا۔ اس نے فرینک کو ایک ٹھوکر ماری۔ "میں اب بھی اپنی قسم پر قائم ہوں... میں یا میرا کوئی ساتھی تمہیں نہیں مارے گا بلکہ میں تمہیں وادیٔ خوف کے جرگے کے حوالے کر کے جا رہا ہوں۔ وہ لوگ علاقائی قانون کے مطابق تمھاری قسمت کا فیصلہ خود ہی کریں گے۔"

"یہ میرا مجرم ہے... اس سے میں..."

"نہیں نوجوان۔" سردار نے چرمی تھیلے کو تھپ تھپاتے ہوئے کہا۔ "بجولا سنگھ اپنے عدل و انصاف کے لیے دور دور مشہور ہے۔ میں اپنی اس ساکھ کو خراب نہیں کرنا چاہتا۔" اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک پیدا ہو گئی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ خود کو اس صورتِ حال کا شہنشاہ سمجھ رہا ہو... اور اپنی مرضی کے فیصلے کو دوسروں پر ٹھونس کر وہ اپنے دل کی تسکین کا سامان کر رہا ہو۔

"جرگے کے لوگ سامنے آ جائیں..." سردار نے ہجوم کی طرف رُخ کر کے کہا۔ اس کے ایک گھڑ سوار ساتھی نے اس حکم کو بلند آواز میں دُہرایا تو جلد ہی سات آدمی سامنے آ گئے۔ ان میں عدالت خان بھی شامل تھا۔ اس کا چہرہ ویران ویران لگ رہا تھا۔ اس نے قریب آنے کے بعد باری باری شاہو، ابراہیم اور گڈو کی طرف دیکھا اور اس کی آنکھیں زندگی سے محروم ہو گئیں۔ اُسے اپنے جاں نثاروں کی موت کا گہرا صدمہ ہوا تھا۔ ان تینوں کے مرنے کا مجھے بھی دکھ تھا لیکن زندگی اور موت کی جنگ میں ذرا سی چوک ہو جانے کا نتیجہ اکثر ایسا ہی نکلتا ہے۔

فرینک ابھی تک زمین پر پڑا تھا۔ بجولا سنگھ اس کے قریب ہی کھڑا تھا۔ اس نے ایک ٹانگ اٹھائی اور پاؤں فرینک کے سینے پر رکھ دیا۔

فرینک انگریزی میں اسے بُری طرح گالیاں دے کر دل کی بھڑاس نکال رہا تھا اور بجولا سنگھ یوں مسکرا رہا تھا جیسے اپنی زبان میں اس کی شان میں قصیدے پڑھ رہا ہو۔ میں نے کن انکھیوں سے فرینک کی طرف دیکھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میری رگوں میں ایک بار پھر خون جوش کھانے لگا تھا لیکن میں اس صورتِ حال سے بے بس ہو کر رہ گیا تھا۔ بجولا سنگھ نے طلائی سکوں والا تھیلا اپنے ایک ساتھی کی طرف اچھال دیا۔

اسی اثنا میں کالی حویلی سے بھی اس کے ساتھی واپس آ گئے۔

وہ ساز و سامان سے لدے پھندے تھے۔ ان کے ساتھ چند لڑکیاں بھی تھیں۔ یہ غالباً وہی لڑکیاں تھیں جنہیں بستی پر قبضہ کرنے کے بعد حاصل کیا گیا تھا۔ ان کی حالت تباہ تھی اور ان میں سے ہر ایک بے چارگی اور ظلم کی منہ بولتی تصویر تھی۔ میری نگاہ ان سب پر سے پھسلتی ہوئی ایک لڑکی پر جم گئی... اور میرے ذہن میں بھونچال سا آ گیا۔

دلاور خان... ان گنت بھیڑیوں میں گھرا ہوا چیخ رہا تھا اور اس کی چیخوں سے میرے دل و دماغ میں طوفان اٹھ رہے تھے۔ میرا ہاتھ جیب میں رینگ گیا اور میں اس گولی کو انگلیوں سے ٹٹولنے لگا جو امانت کے طور پر میرے پاس موجود تھی۔ مجھے نہ جانے کیوں وہ لڑکی دلاور خان کی بیٹی زرینہ معلوم ہو رہی تھی۔

وہ بے حد حسین تھی۔

اس کے چہرے پر زندگی کے نشانات ثبت تھے۔

اس کا لباس تار تار تھا۔

... لیکن اس کی آنکھوں میں فرشتوں جیسی معصومیت تھی۔ اس کے حسن میں تقدس تھا اور اس کے انداز سے بے بسی کی تہوں میں لپٹا ہوا شاہانہ پن ظاہر ہو رہا تھا۔ میں دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ عدل و انصاف کا پیکر... یہ خونی لٹیرا بجولا سنگھ ان لڑکیوں کے ساتھ نہ جانے کیا سلوک کرے گا۔

میں نے جیب میں پڑی ہوئی گولی کو انگلیوں میں بھینچ لیا۔

"یہ لڑکیاں کون ہیں؟" بجولا سنگھ نے دریافت کیا۔

"لڑکیاں ہیں سردار... انھیں بھی مالِ غنیمت ہی سمجھا جائے۔" کالی حویلی سے آنے والے ایک ڈاکو نے کہا اور ہنس پڑا... لیکن اگلے ہی لمحے اس کا قہقہہ دم توڑ گیا۔ وہ منہ پھیر کر گردن کھجلانے لگا تھا۔

بجولا سنگھ نے اسے قہر آلود نظر سے دیکھا تھا۔

"کیا یہ اسی بستی کی لڑکیاں ہیں؟" بجولا سنگھ نے جرگے کے لوگوں کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا تو ان میں سے تین نے اثبات میں سر ہلا دیے۔ باقی چار مجسموں کی طرح کھڑے بجولا سنگھ کو گھورتے رہے۔

"ٹھیک ہے... لڑکیاں واپس کر دی جائیں۔" بجولا سنگھ نے حکم دیا۔

اس حکم پر اس کے سواروں میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔

"خاموش! کس میں جرأت ہے کہ وہ میرے فیصلے کی مخالفت کرے؟" بجولا سنگھ نے غصے سے پاؤں پٹخا تو فرینک چیخ پڑا۔ اتفاق سے اس نے اُسی پاؤں کو پٹخ دیا تھا جو فرینک کے سینے پر رکھا ہوا تھا۔ فرینک کی چیخ سن کر بجولا سنگھ اس کی طرف یوں متوجہ ہوا جیسے اسے بھول ہی گیا ہو۔

"یہ وادیٔ خوف کا مجرم ہے۔" بجولا سنگھ نے فیصلہ سناتے ہوئے کہا۔ "اس کی قسمت کا فیصلہ علاقائی قانون کے تحت ہونا چاہیے۔ یہ ایک ایسی قوم سے تعلق رکھتا ہے، جس کے لیے میرے دل میں مختلف قسم کے جذبات ہیں... اس کے لیے کیا سزا تجویز کی جا سکتی ہے؟" بجولا سنگھ نے اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے جرگے کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

"سورج طلوع ہوتے وقت پھانسی..." ایک بوڑھے نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔ "یہ صدیوں پرانا قانون ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں اسے تم لوگوں کے حوالے کر رہا ہوں۔ کل صبح کا سورج نکلتے ہی اس کی گردن میں پھندا ڈال دینا۔ خبردار... میرے حکم کی خلاف ورزی نہ ہونے پائے ورنہ پوری بستی کو تہس نہس کر دوں گا... میرا نام بجولا سنگھ ہے اور گرو کی قسم میں عدل و انصاف کا شہنشاہ ہوں۔"

اس نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا۔

لڑکیوں کو فوری طور پر آزاد کر دیا گیا۔ میری انگلیاں اب بھی اس گولی کو ٹٹول رہی تھیں جو میری جیب میں بطور امانت پڑی ہوئی تھی۔ جرگے نے فرینک کی مشکیں کس لیں اور اسے ایک طرف ڈال دیا۔ بجولا سنگھ نے اپنے آدمیوں کی طرف دیکھ کر ایک مخصوص اشارہ کیا جس کے بعد گھڑ سواروں نے اپنے گھوڑوں کو ایڑ لگا دی اور وہ آگے بڑھنے لگے۔

چند لمحوں تک بجولا سنگھ میری طرف دیکھتا رہا... پھر اس کے ہونٹوں پر سفاک مسکراہٹ ابھر آئی۔ "میں تمھاری دلیری کا معترف ہوں، شالیار خان... امید ہے تم سے پھر کبھی ملاقات ہوگی..."

"ضرور ہوگی..." میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہو گیا اور اگلے ہی لمحے آخری گھوڑوں کی قطار بھی دھول کے اس بادل میں چھپ گئی جو تیزی سے جانے والے گھوڑوں کے پیروں سے اٹھ کر فضا میں معلق ہو گیا تھا۔

بازار میں موجود سہمے ہوئے لوگوں میں زندگی کی لہر دوڑ گئی تھی اور ہر کوئی کچھ نہ کچھ کہہ رہا تھا۔ آوازوں کے اس ہجوم میں کسی کی بات کو سمجھنا دشوار تھا۔ میں نے باری باری ان تینوں جاں نثاروں کا جائزہ لیا۔

ان میں سے ایک بھی زندہ نہیں تھا۔

ان کے جسم ابھی گرم تھے لیکن زندگی کی وہ حرارت زائل ہو چکی

تھی جو انسان کو احساس کی دولت سے مالا مال کرتی ہے۔ عدالت خان سوگوار تھا۔ وادیٔ خوف میں اس کا کافی اثر و رسوخ تھا یہی وجہ تھی کہ اب تک اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔ وہ اپنی سرگرمیوں کے اعتبار سے ایک پُراسرار شخص تھا لیکن اس نے میرے بارے میں جس قدر جذباتی ہو کر سوچا تھا، میں اس کے جذبوں کی قدر کیے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔

"مجھے افسوس ہے، بابا!" میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

"انہوں نے اپنا فرض پورا کر دیا۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "مجھے خوشی ہے کہ تم اپنے پیروں پر کھڑے ہو... جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔ جاؤ... تم حویلی چلے جاؤ۔ میں کچھ دیر میں آتا ہوں۔"

جرگے نے فوری طور پر وادیٔ خوف کے لوگوں کو فرائض سونپ کر زندگی کا سلسلہ از سرِ نو بحال کر دیا تھا۔ لاشیں اٹھائی جا رہی تھیں اور زخمیوں کو طبی امداد دینے کی کوشش کی جا رہی تھی۔

میں نے عدالت خان کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"میں ابھی حویلی نہیں جاؤں گا، بابا!"

"کیوں...؟" اس نے چونک کر کہا۔

"ابھی مجھے ایک فرض پورا کرنا ہے۔"

"وہ کیا؟" اس نے جلدی سے کہا۔ انداز سے اس نے انجان بننے کی کوشش کی تھی لیکن وہ میری بات سمجھ گیا تھا۔

میں نے پلٹ کر دیکھا اور بری طرح اچھل پڑا۔

فرینک کو جہاں باندھ کر ڈالا گیا تھا۔ وہ وہاں موجود نہیں تھا۔ غالباً اسے فوری طور پر جرگے کے لیے وقف مکان میں منتقل کر دیا گیا تھا۔

عدالت خان نے میرے کندھے کو تھپتھپایا۔

"جاؤ... حویلی چلے جاؤ... اور سب کچھ ایک بھیانک خواب سمجھ کر بھول جاؤ۔ جرگے کو اپنا کام کرنے دو۔ اس میں مداخلت نہ کرنا!"

"وہ میرا شکار ہے!"

"جرگے کے فرائض میں ٹانگ نہ اڑاؤ۔" اس کا لہجہ سخت ہو گیا۔ "تم نے جو کچھ بھی کرنا تھا، اس کا وقت گزر چکا ہے۔ یہ اس بستی کی خوش قسمتی ہے کہ اچانک ہی جُولا سنگھ ادھر آ گیا... ورنہ یہاں نہ جانے اور کیا کیا ہوتا...!"

"کیا مطلب...؟" میں بھڑک اٹھا۔ "آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ فرینک کو کل صبح پھانسی دی جائے گی اور میں اپنے انتقام کی آگ سرد کرنے میں ناکام رہوں گا؟ یہ ناممکن ہے، بابا...!"

"بستی کے لوگ تمہیں اپنا محسن سمجھنے لگے ہیں شاہ یار۔ اس عزت اور مرتبے کو ضائع نہ کرنا... اگر تم نے اب کوئی ایسی حرکت کی جو علاقائی قانون کے خلاف ہوئی تو شاید میں بھی تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکوں گا۔"

"تو پھر میں حویلی واپس نہیں جاؤں گا۔"

"کہاں جاؤ گے؟"

"جہاں جی چاہے گا...!" میں نے سخت لہجے میں کہا اور قہوہ خانے کی طرف بڑھ گیا جو ویران دکھائی دے رہا تھا... لیکن مجھے یقین تھا کہ وہاں جانے کے بعد مجھے مایوسی نہیں ہو گی۔

★★

مارے غم و غصے کے میری حالت تباہ تھی۔

سرِ شام ہی وادی کی چہل پہل لوٹ آئی تھی۔ عدالت خان نے اپنے اسلحے کے ذخیرے سے بستی کے ہر فرد کو ہتھیار دے دیے تھے اور رات کو سب نے ایک جگہ جمع ہو کر ہمیشہ متحد رہنے کا حلف اٹھایا تھا۔

جرگے نے میری خدمات کو سراہا تھا اور میرا رشتہ عدالت خان سے جڑتے ہوئے انہوں نے اسے جرگے کا سردار مقرر کر دیا۔ فرینک کو نہ جانے کہاں غائب کر دیا گیا تھا۔ اب صرف وہی باقی رہ گیا تھا... اور اس سے نمٹے بغیر میرے دل کو سکون نہیں مل سکتا تھا... جبکہ عدالت خان نے مجھے سختی سے ہدایت کر دی تھی کہ اب میں کوئی ایسا قدم نہ اٹھاؤں جس سے جرگے کے تقدس اور ناموس پر کسی قسم کا کوئی حرف آ سکتا ہو۔

قہوے خانے میں بعد دوپہر کام شروع ہو گیا تھا اور اس کے مالک گلزار خان نے اپنی نوعمر بیٹی کی مدد سے قہوے خانے کی ہر چیز کو از سرِ نو ترتیب دینے کی کوشش کی تھی۔ قہوے خانے کے اوپر دو کمرے تھے اور گلزار خان نے ان میں سے ایک مجھے دے دیا تھا۔

عدالت خان نے حویلی چلنے کے لیے بڑی ضد کی لیکن میں نے صاف انکار کر دیا۔ اس میں عجیب سی تبدیلی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ میرے لیے جتنا جذباتی ہوا تھا، اب اتنا ہی سنگ دل ثابت ہو رہا تھا۔ شاید یہ ان تینوں جانثاروں کی موت کا نتیجہ تھا... یا پھر جرگے کی سرداری ملنے کے بعد سے یکایک اپنے وقار کی زیادہ پروا ہو گئی تھی۔

مجھے ہلکے پھلکے زخم آئے تھے جن کی مرہم پٹی کے لیے جراح آ گیا تھا۔

اس وقت میں اپنی چارپائی پر بیٹھا صورتِ حال پر غور کر رہا تھا کہ گلزار خان کی بیٹی میرے کمرے میں آ گئی... دروازہ کھلا تو پہلی بار میری نظر اس نوجوان پر پڑی جو دروازے کے باہر دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس نوجوان کو میں نے کمرے میں آنے سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ اس کے چہرے پر خوف کے تاثرات تھے۔

دروازہ کھول کر جب گلزار خان کی بیٹی مینو اندر آئی تو اس نے ایک نظر میری طرف دیکھا تھا تب مجھے اس نوجوان کی آنکھوں میں دہشت کے رقص کرتے ہوئے سائے نظر آ گئے تھے اور انہی سے مجھے یہ پتا چل گیا تھا کہ اسے میری نگرانی پر مامور کیا گیا ہے۔

مینو نے میرے دائیں ہاتھ پر پٹی بندھی دیکھی تو اس ہاتھ کو سہلانے لگی۔ "اب تم کافی دنوں تک پستول ہاتھ میں نہیں رکھ سکتے۔" اس نے گویا میرے زخمی ہاتھ کے بارے میں تبصرہ کیا۔

میں سرد مہری سے مسکرا دیا۔ "تمہیں میرے بارے میں زیادہ فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ میں ہر قسم کے ہتھیار اپنے دونوں ہاتھوں سے یکساں طور پر استعمال کر سکتا ہوں۔"

وہ کانپ گئی۔ میری بات پر... یا میرے لہجے پر...

میں نے کن انکھیوں سے دروازے کی طرف دیکھا۔

دروازہ نیم وا تھا اور وہ نوجوان مجھے صاف نظر آ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں اب ایک دیسی ساخت کا پستول تھا جسے وہ بڑی مہارت سے اپنی انگلیوں پر نچا رہا تھا۔ اس بستی میں غالباً وہ سب سے اچھا نشانے باز تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اسے میری نگرانی پر مامور نہ کیا جاتا۔

وہ بار بار پاؤں فرش پر رگڑ رہا تھا۔ اس کی ہر حرکت غیر اضطراری تھی اور مجھے ڈر تھا کہ کہیں کسی اضطراری حرکت ہی کی بنا پر وہ فائر کر کے خود کو زخمی نہ کر لے... پھر ایسے نوجوان عموماً خطرناک بھی ہوتے ہیں جس طرح نادان کی دوستی سے دانا کی دشمنی بہتر ہوتی ہے بالکل اسی طرح ہوش مند دشمن اور گھبرائے ہوئے نگران میں بھی فرق ہوتا ہے۔ گھبرایا ہوا نگران تو کھلی تلوار کی طرح ہوتا ہے جو کسی بھی وقت اس کے ہاتھ سے کسی کو جہنم رسید کر سکتا ہے۔

میں نے دیکھا کہ وہ کم عمر ہے۔ غالباً عدالت خان سمجھ گیا تھا کہ میں فرینک کو ٹھکانے لگائے بغیر نہیں رہوں گا۔ اس لیے یہ نوجوان اس نے میری نگرانی کے لیے بھیجا ہو گا... یا پھر ممکن ہے جرگے کے سخت فیصلے کے بعد ایسا ہوا ہو...

میں نے مینو کی طرف دیکھا۔

وہ محبت پاش نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

"تم نے جن آدمیوں کو ٹھکانے لگایا ہے، ان کو قتل کرنے کی کوئی اور وجہ بھی ضرور ہے؟" مینو نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ غالباً میری آواز مجمع تک نہیں پہنچی تھی میں نے جُولا سنگھ کو جب پاؤتش کی موت اور اپنی انتقامی کارروائی کا احوال سنایا تھا تو بستی کے

اظہر کلیم
دو جلدوں میں
جلد اول =/150 جلد دوم =/150
مکتبہ القریش
سرکلر روڈ اردو بازار لاہور
فون 7668958

کسی شخص تک میری آواز نہیں پہنچی ہو گی۔ شاید اسی لیے قہوہ خانے کے مالک کی یہ بھونڈے نقش و نگار والی لڑکی مینو بے خبر تھی۔

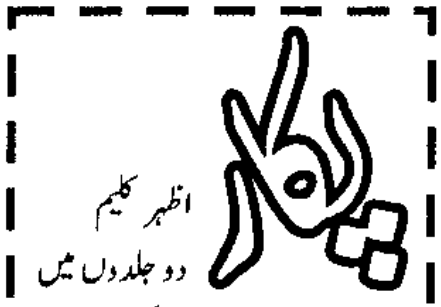

"مجھے اس سلسلے میں یقیناً انعام دیا جائے گا۔" میں نے کہا۔

لڑکی نے سر کو منفی جنبش دی۔ گویا وہ میری بات کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھی۔ وہ واقعی ایک ذہین لڑکی تھی اور اس کے سوچنے کے انداز میں گہرائی تھی ورنہ کوئی عام لڑکی اس معاملے کی تہ تک پہنچنے کی کبھی کوشش نہ کرتی۔

"یہ وجہ... انعام کے لالچ سے کہیں زیادہ بڑی اور شدید ہے، شاہ یار خان۔" اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ "اگر تم بستی والوں کو بچانے کے لیے اس انداز میں نہ کود پڑتے تب بھی تم ان لوگوں کو ضرور قتل کر دیتے۔"

"کسی کے سوچنے پر کون پابندی لگا سکتا ہے؟" میں نے زیرِ لب کہا۔

"اچھا... کل رات جس آدمی کے ٹکڑے بوری میں بھر کر یہاں لائے گئے تھے، وہ کس کا کارنامہ تھا؟"

"مجھے کیا معلوم..." میں نے سخت لہجے میں کہا۔

"وہ تمہارا ہی کام تھا۔" اس نے سرگوشی کی۔

"سنو..." میں نے لہجے میں سختی پیدا کرتے ہوئے اس کی حوصلہ شکنی کرنے کی کوشش کی۔ "میں اس قسم کی باتوں کا جواب دینا پسند نہیں کرتا۔"

وہ مسکرا دی۔ "ہاں... مردوں میں کبھی کبھی ایسی عادت بھی پائی جاتی ہے۔ وہ بعض اوقات اپنے سینے میں بہت بڑے بڑے راز چھپائے رکھتے ہیں اور جب تک خود ان کا جی نہ چاہے وہ اس راز کو افشا

نہیں ہونے دیتے۔"

"میرا کسی جی نہیں چاہتا۔" میں نے کشور لہجے میں کہا۔

"بہرحال... اب وہ گوداوری خوف کا مجرم ہے اور اسے پھانسی دے دی جائے گی۔" مینو نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

اس سے پہلے وہ میرا مجرم ہے پہلے میرے ہاتھوں کو اس کی گردن تک پہنچنا چاہیے۔ میرے جی میں آیا کہ یہ سب کچھ کہہ ڈالوں لیکن میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

"تم اسے پھانسی دینے کی مخالفت کیوں کر رہے ہو؟"

میں خاموش رہا۔

"اس کے لیے موت کی سزا تجویز ہو چکی ہے۔ تم بہرحال اس کی موت ہی چاہتے ہو نا... اسے مر جانے دو... اور بس..." وہ مجھے سمجھانے کے انداز میں بولی۔

"سنو..." میں نے کرخت لہجے میں کہا۔ "فرض کرو کہ تمھاری شادی ہو جاتی ہے اور تمھارا شوہر تم سے محبت کرنے کے قابل ہے... اس کے باوجود کیا وہ کسی سے یہ کہہ سکتا ہے کہ جا کر میری بیوی سے محبت کرو...؟"

"اس بات کا یہ کون سا موقع ہے؟" اس نے حیرت سے کہا۔

"میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جو کام ایک آدمی کر سکتا ہے وہ کام اسی کو کرنا چاہیے۔ بعض افعال ایسے ہوتے ہیں جن کی تکمیل اپنے ہاتھوں کر کے ہی سکون ملتا ہے... اس گورے کی موت کا بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔ میں جب تک اسے اپنے ہاتھوں سے ٹھکانے نہیں لگا دیتا، مجھے چین نہیں ملے گا۔"

"لیکن تم ایسا نہیں کر سکو گے۔" اس نے حتمی لہجے میں کہا۔ اس کے چہرے اور آنکھوں میں حیلے کے ڈورے پھیل گئے تھے... غالباً شوہر اور بیوی والی مثال اب تک اس کے چھوٹے سے ذہن میں چکرا رہی تھی۔

"تو پھر یہ دکھ میری زندگی کا روگ بن جائے گا۔" میں نے زیر لب کہا... لیکن میں احمق نہیں تھا۔ میں نے حویلی میں جانے سے بلاوجہ انکار نہیں کیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اگر میں ایک بار وہاں چلا گیا تو کبھی فرینک کی صورت نہیں دیکھ سکوں گا۔ عدالت خان اس معاملے میں آڑے آ رہا تھا۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید میں اب تک اس معاملے کو نمٹا کر اپنی راہ لگ چکا ہوتا۔

"کبھی کبھی تم کتنی اچھی باتیں کرتے ہو۔" مینو نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔ "اور کبھی یوں محسوس ہونے لگتا ہے جیسے تم انسان نہیں درندے ہو..."

"ان باتوں کو چھوڑو اور مجھے آرام کرنے دو۔"

"بابا نے مجھے تمھارے پاس بھیجا ہے۔"

"وہ کیوں...؟"

"انھیں بھی تم سے بے پناہ ہمدردی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ میں تمھیں سمجھاؤں اور گورے کو اپنے ہاتھوں قتل کرنے سے باز رکھوں۔ اس وقت گاؤں میں تمھاری تعریف کی جا رہی ہے۔ ہر شخص تمھاری دلیری کا معترف ہے۔ کل جرگے میں تمھیں اپنے اس کارنامے کا انعام مل جائے گا لیکن اگر تم نے جرگے کی مخالفت میں گورے کو قتل کرنے کی کوشش کی تو علاقائی قانون کے تحت تم مجرم بن جاؤ گے... اور میں ایسا نہیں چاہتی... کوئی بھی تمھیں مجرم دیکھنا پسند نہیں کرے گا۔"

میں مارے غصے کے اٹھ کھڑا ہوا۔

دروازے میں کھڑے نوجوان کی جھلک نظر آئی۔ اس نے تیزی سے اپنے پستول کی نال کا رخ میری طرف کر دیا تھا۔ مجھے اس نوجوان پر بڑا ترس آ رہا تھا۔ وہ مجھ سے دہشت زدہ تھا لیکن فرض کے ہاتھوں مجبور تھا۔ بھیڑ کو بھیڑیے کی رکھوالی پر مامور کر دیا گیا تھا۔

"میرے معاملات میں دخل اندازی نہ کرو۔"

میں نے پلٹ کر مینو کو گھورتے ہوئے کہا۔

"شالیار... تم اس دنیا میں واحد شخص ہو جسے دیکھ کر میرے دل نے ایک انوکھے انداز میں دھڑکنا سیکھا ہے۔" اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ "میں تمھیں کسی مصیبت میں مبتلا نہیں دیکھ سکوں گی۔"

اس کے لہجے میں چاہت کا طوفان چھپا ہوا تھا۔

میں نے رخ پھیر لیا اور کھڑکی کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

کھڑکی کھول کر میں نے باہر دیکھا۔

سردی بڑھ رہی تھی اور ہوا میں تیروں جیسی چبھن کا اضافہ ہو گیا تھا۔ باہر اب بھی چہل پہل تھی۔ لوگوں کی باتوں کا شور سنائی دے رہا تھا۔ میں نے دور افق کی طرف دیکھا جہاں جھوٹا رنگ پھیل رہا تھا۔ پہاڑوں کی اوٹ میں جیسے آگ سی لگ گئی تھی۔ شام کے سائے گہرے ہو چکے تھے اور بازار میں درجن بھر آدمی ادھر ادھر جا رہے تھے۔

"کیا اس سے پہلے اوڈی خوف میں کسی کو پھانسی نہیں دی گئی؟"

میں نے پلٹ کر دریافت کیا۔

"دو آدمیوں کو پھندا ڈالا جا چکا ہے۔"

"لیکن بستی میں تو ایک بھی درخت نہیں ہے۔ ان دو آدمیوں کو کہاں پھانسی دی گئی تھی؟" میں نے سرسری سے لہجے میں پوچھا۔

"گاؤں سے باہر درختوں کا ایک جھنڈ ہے۔ وہاں ایک قدیم ... ہے۔ وہیں پہلے جرگے کے فیصلے ہوا کرتے تھے... میرا خیال ہے ان

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

درختوں کے گھنے میں اس بار بھی جگہ پھندا ڈالا جائے گا۔"

"میرا خیال ہے بگولا سنگھ لب کبھی اس طرف نہیں آئے گا۔"

"اس کے بارے میں کبھی یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔" مینو نے جواب دیا۔

میں چارپائی پر واپس آ گیا اور لیٹ گیا۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ "جاؤ... اب مجھے آرام کرنے دو۔ صبح مجھے جلد اٹھا دینا... میں اس گورے کی گردن میں پھندا ضرور دیکھوں گا۔ یہ منظر دیکھے بھی عرصہ ہو گیا ہے۔"

مینو نے میری اس بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

میں نے پلکوں میں ہلکی سی درز پیدا کرتے ہوئے اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔ اس کی آنکھوں میں بے یقینی تھی لیکن چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میری بات سے اس نے یہ اندازہ لگایا ہے جیسے میں فرینک کو قتل کرنے کے خیال سے باز آ گیا ہوں... لیکن اس کا دل شاید مطمئن نہیں تھا۔

وہ میرے پاس خاموش بیٹھی رہی۔

تھوڑی ہی دیر بعد میں نے اس انداز میں سانسوں کا اخراج شروع کر دیا جیسے اچانک ہی اعصاب پر تھکن سوار ہو جانے کے باعث گہری نیند میں ڈوب گیا ہوں۔ میں سوتا بن گیا تھا تاکہ وہ چلی جائے اور دروازے پر متعین نوجوان بھی مطمئن ہو جائے۔ میرے سینے میں البتہ الاؤ بھڑک اٹھا تھا۔

تھوڑی دیر تو وہ قریب بیٹھی مجھے گھورتی رہی... پھر اس کے اٹھنے کی آواز آئی۔ اس کے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے قدموں کی چاپ سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ واقعی کمرے سے جا رہی ہے۔

نیم وا دروازہ مزید کھل گیا اور وہ باہر چلی گئی۔

دروازہ بند ہو گیا۔

"اف مینو... یہ شخص کیسا ہے؟" میرے کانوں سے مدھم آواز ٹکرائی۔ یہ اسی نوجوان کی آواز تھی جو دروازے کے باہر پہرہ دے رہا تھا۔ "اب یہ سو رہا تھا تو اس کے چہرے کو دیکھا تم نے... کتنا پرسکون نظر آتا ہے... لیکن یہی شخص گورے اور بگولا سنگھ کے سامنے کیسے چٹان سا جا کھڑا تھا۔"

"ہاں... میں دیکھ چکی ہوں۔ میرا خیال ہے یہ شخص بے حد جذباتی ہے اور جذبات کی رو میں کسی بات کی پروا کرنے کا عادی نہیں ہے۔ یہ جو کچھ چاہتا ہے، کر گزرتا ہے۔ بہرحال، اس نے جو کچھ کیا ہے، وہ عام آدمی کے بس کی بات... کسی مرد سے ممکن نہیں..."

"تم اس سے کچھ زیادہ ہی متاثر ہو..." نوجوان نے ہنس کر کہا۔

"کیا تم نہیں ہو؟" مینو کی دبی دبی سی غراہٹ سنائی دی۔

"ہوں... لیکن میرے متاثر ہونے... اور تمھارے متاثر ہونے میں بہت فرق ہے۔ میں اس کا احترام کر سکتا ہوں لیکن اسے کسی لڑکی کی طرح دل میں نہیں بسا سکتا۔" نوجوان کے لہجے میں شوخی تھی۔

"بکواس بند کرو۔" مینو نے اسے ڈانٹ دیا لیکن لہجے میں خفگی نہیں تھی۔

"بہرحال میں اس کا احترام کرنے کے باوجود اس سے خوف زدہ ہوں۔" نوجوان نے اعتراف کیا۔ "حالانکہ تم جانتی ہو کہ آتشیں اسلحے کے استعمال میں یہاں کوئی بھی میرا مدمقابل نہیں ہے... لیکن یہ شخص میرے بس کا نہیں ہے۔ اگر جرگے کا حکم نہ ہوتا تو میں کبھی اس کی نگرانی کا فرض قبول نہ کرتا۔"

"گھبرانے کی ضرورت نہیں... شالیار ہمارا دوست ہے، دشمن نہیں۔ اب وہ سو گیا ہے۔ تم نے اس کے چہرے پر سکون دیکھا؟ یوں لگ رہا تھا جیسے برسوں بعد اسے سکون کی نیند لینے کا موقع ملا ہو... اس کے باوجود تم محتاط رہنا۔"

"اگر یہ شخص اس گورے کو ہلاک کر دینا چاہتا ہے تو اسے اس بات کی اجازت کیوں نہیں دے دی جاتی... آخر اسے پھانسی دے کر بھی تو مارنا ہی ہے۔"

"بگولا سنگھ نے جو کچھ کہا تھا، شاید تم اسے بھول گئے ہو۔"

"لیکن اسے کانوں کان خبر نہیں ہوگی۔"

"کیا پوری بستی جھوٹ بولے گی؟" مینو نے خفگی سے کہا۔

میں خاموش اور بے حرکت لیٹا ان کی بحث سن رہا تھا۔ نوجوان خاموش ہو گیا تھا۔ شاید اسے مینو کی بات سے اتفاق نہیں تھا۔

"بہرحال، تم خیال رکھنا۔ تمھیں بھی تین آدمی موجود ہیں۔ اگر ذرا سی بھی گڑبڑ محسوس کرو تو ذاتی طور پر الجھنے سے پہلے انھیں آواز دے دینا۔"

شہباز
مصنف اظہر کلیم
دو حصوں میں
مکمل سیٹ =/100 روپے
مکتبہ القریش
سرکلر روڈ اردو بازار لاہور
فون 7668958

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ٹھیک ہے... میں دیکھوں گا ویسے میری خواہش ہے کہ اس سے مجھے اُلجھنا نہ پڑے۔" نوجوان نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

قدموں کی آہٹ ایک بار پھر گونجنے لگی۔

مینو واپس جا رہی تھی۔

نیند میری بند پلکوں میں سمانے کی بجائے مجھ سے بہت دور کہیں بھٹک رہی تھی۔ میں نے اپنی سانسوں کو اس انداز میں استوار رکھا تھا کہ پہرے دار مجھے سوتا سمجھے اور میں اس کی آہٹوں سے بھی آگاہ رہ سکوں۔

وہ کافی دیر خاموش اور بے حرکت کھڑا رہا تھا۔ اس دوران میں، میں نے بھی کروٹ تک نہیں بدلی... پھر اس کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ غالباً اس نے ایک جگہ کھڑے رہنے سے اکتا کر ٹہلنا شروع کر دیا تھا۔

میں مطمئن تھا کہ مینو اور اس نوجوان دونوں کو سنبھالنا میرے لیے کوئی مشکل کام نہیں ہے... لیکن میں اس نوجوان کو قتل کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اپنے بارے میں اس کے جذبات جاننے کے بعد میرے لیے یہ ایک مشکل کام ہوتا... لیکن میں اپنے مقصد کے سامنے کسی جذبے کی دیوار کو بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

میں سوچ رہا تھا کہ سب سے پہلے اس نوجوان کو غیر مسلح کروں گا اور پھر نچلے پہریداران تینوں سے نمٹ لوں گا جنہیں قہوہ خانے میں بٹھایا گیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ مینو بھی رات بھر جاگے گی۔ اس کا بندوبست کرنا بھی ضروری تھا۔ سارا ہی کام نہایت سکون سے ہونا چاہیے تھا ورنہ ان لوگوں کے شور سے چند ہی لمحوں میں وادی خوف کے تمام افراد قہوہ خانے کے سامنے جمع ہو سکتے تھے۔

گورے کو پھانسی دینے کے خیال سے ہر شخص ہیجان میں مبتلا تھا۔ جگلا سنگھ بھی شاید کوئی ذہنی مریض ہی تھا ورنہ وہ میری داستان سننے کے بعد جرگے کو پابند ہرگز نہ کرتا... میں نے تہیہ کر لیا کہ ان پہرے داروں سے خاموشی کے ساتھ نمٹوں گا اور اس وقت تک کوئی انتہائی قدم نہیں اُٹھاؤں گا جب تک ایسا کرنا میرے لیے ناگزیر نہ ہو جائے۔

میں خاموش لیٹا، گہری نیند میں ڈوبا ہوا لگ رہا ہوں گا۔

میرا ذہن بار بار اس خوبصورت نوجوان کی طرف بھٹک جاتا تھا جسے میری نگرانی کا فرض سونپا گیا تھا۔ اس کی گھبراہٹ و اضطراری حالت میرے لیے سب سے زیادہ تشویش کا باعث تھی... مجھے معلوم تھا کہ ایسے نوجوانوں سے غلطی ہو جاتی ہے... اور میں خود کو کسی کی غلطی کا شکار ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

اگر اس نے میرے لیے کوئی تباہ کن راستہ اختیار نہ کیا تو یقیناً زندہ رہے گا... لیکن اگر اس نے پستول استعمال کرنے کی کوشش کی تو میں اپنی جان بچانے کے لیے یقیناً اسے ٹھکانے لگا دوں گا... اور یہ میری زندگی کا سب سے افسوسناک فعل ہو گا۔

وہ اب بھی دروازے کے سامنے ٹہل رہا تھا۔

دروازے کے سامنے چھوٹی سی راہداری تھی اور اس کے خاتمے پر زینہ تھا جو نچلی منزل پر واقع قہوہ خانے پر اترتا تھا۔ میں اطمینان سے لیٹا رہا۔ مجھے توقع تھی کہ وہ جلد ہی تھک جائے گا... اور مطمئن ہوتے ہی وہ غافل ہو جائے گا۔ مجھے اسی غفلت سے استفادہ کرنا تھا۔

میں نے اپنی ریڑھ کی ہڈی پر چھپی ہوئی میان میں شکاری چاقو کی موجودگی پر اطمینان کی سانس لی تھی ورنہ عدالت خان نے مجھے غیر مسلح کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اس نے میرا ریوالور لے لیا تھا اور کمر کی میان سے خنجر بھی حاصل کر لیا تھا۔ اپنی دانست میں اس نے میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں چھوڑا تھا... لیکن میری قمیص کے نیچے پشت پر... ریڑھ کی ہڈی کے اوپر سینے سے بندھی ہوئی پٹی سے منسلک وہ میان اسے نظر نہیں آئی تھی جس میں ایک شکاری چاقو ہر وقت پڑا رہتا تھا۔ میں اس شکاری چاقو کو خاص خاص موقعوں ہی پر استعمال کرتا تھا اور نہانے کے علاوہ کبھی ایک لمحے کے لیے اسے جسم سے الگ نہیں کرتا تھا۔

جو نوجوان پہرے پر تھا، اس کے قدموں کی آہٹ تھکن ظاہر کر رہی تھی۔ پہلے تو اس نے مجھے اور مینو کو باتیں کرتے ہوئے سنا... پھر وہ میرے بارے میں مینو سے باتیں کرتا رہا... اور اب وہ ایک سوئے ہوئے غیر مسلح شخص کو بار بار دیکھ رہا تھا۔ یہ ظاہر ہے ایک بے حد بیزار کن کام تھا۔ اس کام کے لیے اگر وہ کسی بوڑھے کا انتخاب کرتے تو وہ یقیناً میرے لیے پریشانی کا باعث بن جاتا۔

آہٹوں سے جس تھکن کا احساس ہو رہا تھا، اس میں ہر گزرتے ہوئے لمحے کے ساتھ اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ باہر سے اب آوازیں سنائی نہیں دے رہی تھیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ریشمی اندھیرے نے ہر چیز کو نگل لیا ہو۔ ہر آواز ہڑپ کر لی ہو۔

اس نوجوان کو بے بس کرنا اور اس کا پستول حاصل کرنا... یہ کام میرے لیے خاصے مشکل بن گئے تھے لیکن میں ان دونوں کاموں کو ہر حال میں کرنا چاہتا تھا... کیونکہ انہی کی تکمیل سے میرے دل کی پیاس بجھ سکتی تھی۔

رات کا سفر تیزی سے جاری تھا۔

سو رات، لمحات کے مریل کندھوں پر تیزی سے صبح کی طرف دوڑ رہی تھی اور صبح کا اُجالا پھیلنے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا۔ لمحے مر رہے تھے اور میری ہر سانس کے ساتھ ان کا خاتمہ ہوتا جا رہا تھا۔

اچانک قدموں کی آہٹ تھم گئی۔

بالآخر نوجوان تھک گیا تھا۔

میں جس انداز میں لیٹا تھا ویسے ہی لیٹا رہا... بلکہ اب میں نے ہونٹوں سے ہلکے ہلکے خراٹے بھی خارج کرنے شروع کر دیے تھے۔ نوجوان نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ کمرے میں مدھم روشنی تھی اور چراغ کی لو دروازہ کھلنے سے بھڑک اٹھی تھی۔

میں کن انکھیوں سے اسے دیکھتا رہا۔

اس نے اطمینان کی ایک طویل سانس لی اور اثبات میں سر ہلا دیا۔ دروازہ بند ہو گیا اور پھر کھڑکی میں نوجوان کا سایہ نظر آنے لگا۔ وہ وہاں کھڑا چند لمحوں تک مجھے دیکھتا رہا... پھر آہستہ آہستہ سایہ یوں جھک گیا جیسے اس کی ٹانگوں میں جان باقی نہ رہی۔

رات کا بیشتر حصہ اسی انداز میں گزر گیا تھا اور مجھے اندازہ تھا کہ سویرا زیادہ دور نہیں ہے۔ فرینک کو پھانسی دینے کا وقت تیزی سے قریب آ رہا تھا اور میرے دل و دماغ میں طوفان اُٹھنے لگے تھے۔ میں نے اپنے مرحوم بھائی پالوش کی قبر کے قریب جھک کر جو قسم کھائی تھی اسے میں ہر حال میں پورا کرنا چاہتا تھا۔

... اور پھر مجھے اطمینان ہو گیا کہ اب میرے لیے عمل کا وقت آ گیا ہے۔

میں نے چارپائی پر کروٹ بدلی۔

چارپائی چرچرائی۔ میں ساکت ہو گیا۔

اس ذرا سے شور کا ردِعمل میری توقع کے مطابق ظاہر ہوا۔ باہر خاموشی رہی اور کھڑکی میں کوئی سایہ نہیں اُبھرا۔ نوجوان تھک کر نہ صرف بیٹھ گیا تھا... بلکہ نیند کی دیوی نے اسے اپنی آغوش میں بھی لے لیا تھا اگر وہ ہوشیار ہوتا تو چارپائی کے چرچرانے سے یقیناً چونک اُٹھتا...

میں نے ہر ممکن کوشش کی کہ آواز نہ پیدا ہو... اور یوں میں چارپائی سے فرش پر اتر آیا۔ نوجوان کے سائے کو میں کھڑکی سے جھکتے دیکھ چکا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ کھڑکی سے نیچے دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا ہے... اور شاید گہری نیند سو رہا ہے۔

میں پنجوں کے بل کھڑکی کی طرف بڑھا۔

کھڑکی کے سامنے میں چند لمحوں تک کھڑا رہا۔

باہر سے ہلکی ہلکی آوازیں آ رہی تھیں۔ سرسراتی ہوئی آوازیں... جیسے کوئی ہانپ رہا ہو۔ یقیناً یہ اسی نوجوان کی سانس تھی جو اپنی آمد و رفت سے سرسراتی ہوئی آوازوں کو جنم دے رہی تھی۔

میں نے آہستہ آہستہ کھڑکی کو کھولنا شروع کر دیا۔

کھڑکی کے کھلتے ہی ان سرسراتی ہوئی آوازوں میں تیزی آ گئی۔

میرا دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔ اس وقت جو کچھ بھی ہو رہا تھا، اس کی کامیابی پر ہی میرے سارے کھیل کا دارومدار تھا۔ اگر اس نوجوان کو محض راستے سے ہٹانا مقصود ہوتا تو میں نہ جانے کب کا یہاں سے کامیاب ہو کر نکل گیا ہوتا... لیکن پریشانی یہ تھی کہ میں اسے جان سے نہیں مارنا چاہتا تھا... میں سانپ بھی مارنا چاہتا تھا اور لاٹھی کو بھی محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔

راہداری میں تاریکی تھی۔

میں نے کھڑکی سے باہر پہاڑوں کی طرف دیکھا۔

دور پہاڑ کی چوٹی کے اوپر آسمان پر ایک ستارہ چمک رہا تھا اور اس کے پس منظر میں آسمان کا رنگ نیلا نیلا اور نکھرا نکھرا سا لگ رہا تھا گویا وقت بالکل ہی سر پر آ گیا تھا۔ میں نے کھڑکی پوری کھول دی۔

کھڑکی کے کواڑ پرانی لکڑی کے تھے۔ ان کے کھلنے سے بھی آواز پیدا ہوئی لیکن آواز مدھم تھی اور نوجوان کی نیند گہری... اس آواز نے اسے چونکایا نہیں... میں کھڑکی میں جھک گیا۔

اب میں اسے صاف دیکھ سکتا تھا۔

وہ دیوار سے ٹیک لگائے اپنے گھٹنوں پر سر ٹکائے بیٹھے بیٹھے ہی سو گیا تھا۔ اس کی پیٹی پشت سے ذرا نیچے مجھے صاف نظر آ رہی تھی میں نے آہستہ آہستہ اس کی پیٹی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

نوجوان کے انداز میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہوئی۔

اس کا پستول والا ہاتھ جھکا ہوا تھا لیکن ٹریگر پر اس کی انگلی جمی ہوئی تھی۔ احمقانہ انداز تھا۔ بے خیالی میں انگلی سے ٹریگر کبھی بھی دب سکتا تھا اور یوں وہ اپنے ہی ہاتھوں شدید زخمی بھی ہو سکتا تھا۔

میں نے دوسرا ہاتھ اس کے پستول کی طرف بڑھا دیا۔

الف لیلہ ڈائجسٹ کا مقبول سلسلہ

انسان اور شیطان

مصنف محمد فراز

امیر علی خان کی خوفناک آپ بیتی

مکتبہ القریش سرکلر روڈ اردو بازار لاہور

فون 7668958

۔۔۔ پھر میں نے عقاب کی طرح اس پر دونوں پنجے آزمائے تھے۔ ایک ہاتھ اس کی بیلٹ پر اور دوسرا پستول پر پڑا تھا۔

پستول کو گرفت میں لیتے ہی میں نے موڑ دیا اور اس بات کا خیال رکھا کہ اگر انگلی دب جائے تو گولی اُسے یا مجھے زخمی نہ کرنے پائے۔ لیکن پستول آسانی سے نکل آیا۔ نیند میں اس کے ہاتھ کی گرفت کمزور تھی۔۔ پھر میں نے اس کی پٹی کو جکڑتے ہوئے پوری قوت سے جھٹکا دیا۔

وہ میرے طاقتور ہاتھ کے سہارے اٹھتا چلا گیا۔

میں نے اسے پوری قوت سے کھینچا اور پھر خود تیزی سے ہٹ گیا میں نے اس کی پٹی چھوڑ دی۔ وہ کھلی کھڑکی سے اندر آ گرا۔ اگلے ہی لمحے میں نے کھڑکی بند کر دی اور پستول نوجوان کے نرخرے سے لگ گیا۔

"شور نہ مچانا۔۔۔" میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

اس کے گرنے سے ہلکا سا دھماکا ہوا تھا۔

فوراً ہی نیچے سے کسی نے پوچھا۔

"گلباز۔۔۔ کیا بات ہے؟" آواز بھاری تھی۔ غالباً بولنے والا بھی رات بھر جاگنے اور نگرانی کرنے سے تھک گیا تھا۔

"جواب دو۔۔۔ اور کوئی ایسی بات نہ کہنا جو تمہاری موت کا پیغام بن جائے۔" میں نے سفاک لہجے میں کہا۔

"سب ٹھیک ہے۔" نوجوان نے جلدی سے کہا۔ "میرا پاؤں پھسل گیا تھا۔"

میں نے ایک طویل سانس لی۔

نوجوان نے جو کچھ کہا تھا، اس سے نیچے والوں کو اطمینان ہو گیا تھا اور انہوں نے زیادہ تجسس کا مظاہرہ کرتے ہوئے دوبارہ کچھ پوچھنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی تھی۔ نوجوان کے چہرے پر دہشت کا رقص جاری تھا۔ اس کی آنکھیں کچی نیند کے باعث سوزش زدہ لگ رہی تھیں اور اس کی سانس دھونکنی سے نکلنے والی آواز کی طرح سنائی دے رہی تھی۔ اس کا سینہ تیزی سے پھول پھول کر پچک رہا تھا۔

"مجھے قتل نہ کرنا۔۔۔ شاہ یار۔۔۔ میں۔۔۔" اس نے سرگوشی کی جس میں استدعا تھی۔ وہ رحم طلب نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

"جھک جاؤ۔" میں نے سختی سے کہا اور اس کے نرخرے سے پستول کا دباؤ ہٹا لیا۔ "جلدی کرو۔۔۔ میرے پاس وقت بہت کم ہے۔"

وہ میری ہدایت کے مطابق جھک گیا۔

"فرینک کو کہاں رکھا گیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ جرگے کی تحویل میں ہے۔"

"اُسے پھانسی کہاں دی جانے والی ہے؟" میں نے سرگوشی کی۔

"جنوب میں درختوں کا ایک جھنڈ ہے۔۔۔ وہاں۔۔۔"

"کتنی دیر بعد۔۔۔؟"

"سورج نکلتے ہی۔۔۔ میرا خیال ہے جرگے کے لوگ اُسے وہاں لے جانے کی تیاری کر رہے ہوں گے۔۔۔ یا یہاں سے نکل چکے ہوں گے۔۔۔ لیکن اُسے پھانسی اس وقت دی جائے گی جب سورج کی پہلی کرن اس کے چہرے پر پڑے گی۔" وہ یوں بول رہا تھا جیسے اُسے اپنی زبان پر ذرا سا بھی اختیار نہ رہا ہو۔

"ہوں۔۔۔ ٹھیک ہے۔ اب تم آرام کرو میں جا رہا ہوں۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا اور اٹھتے وقت میرا بایاں گھٹنا تیزی سے حرکت میں آگیا۔ گھٹنا اس کے منہ پر پڑا اور اس کے حلق سے ایک دھیمی سی کراہ نکل گئی۔

اس کے ساتھ ہی پستول کا دستہ اس کی کھوپڑی کے عقبی حصے پر لگا۔ گھٹنے کی چوٹ سے وہ عقب میں لہرایا اور پستول کے دستے نے اُسے واپس اوندھے منہ فرش پر گرا دیا۔ وہ چت پڑا تھا اور اس کا جسم بے حس و حرکت نظر آ رہا تھا۔

وہ ایک مضبوط نوجوان تھا لیکن اس کے دل و دماغ پر میری دہشت طاری تھی۔ اس کے علاوہ دونوں چوٹیں اتنی شدید تھیں کہ اس کی کھوپڑی گھوم گئی اور وہ بے ہوش ہو گیا۔

میں چند لمحوں تک اُسے گھورتا رہا۔۔۔

۔۔۔ پھر میں نے جھک کر اس کی کلائی تھام لی۔ نبض بہت آہستہ آہستہ تڑپ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر جہاں گھٹنا ٹکرایا تھا۔ وہاں سوزش نمودار ہو گئی تھی اور اس کی ناک سے خون بہہ نکلا تھا۔ کھوپڑی کے عقبی حصے پر ایک گومڑ دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے اُسے اٹھایا اور چارپائی پر ڈال دیا۔ اس کے منہ سے خون پونچھ ڈالا اور کچھ دیر اس کا جائزہ لینے کے بعد مجھے اطمینان ہو گیا کہ وہ کافی دیر بے ہوش رہے گا۔

مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ میں نے ایک ایسے نوجوان کے ساتھ یہ سلوک کیا جس کے دل میں میری اتنی قدر و منزلت تھی کہ وہ مجھے ہیرو سمجھتا تھا۔۔۔ لیکن میں مجبور تھا۔ وہ تو خیر ہوئی کہ اُسے معمولی سا زخمی اور بے ہوش کرنے سے بات بن گئی تھی ورنہ وہ میرے ہاتھوں ضائع بھی ہو سکتا تھا اگر ایسا ہوتا تو البتہ میرے دل میں زندگی بھر کے لیے ایک پھانس سی اٹک جاتی۔

میں نے پستول کا جائزہ لیا۔

دیسی ساخت کا معمولی سا پستول تھا لیکن کارکردگی کے اعتبار سے قدرے بہتر معلوم ہوتا تھا۔ مقامی ساخت کے پستول استعمال

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

کرنے کا مجھے موقع ملا تھا لیکن میں نے جس بدیسی ریوالور پر قبضہ کیا تھا، اس پر زیادہ اعتماد کر سکتا تھا کیوں کہ اس کی کارکردگی نسبتاً اطمینان بخش تھی۔

بہرحال، اس وقت میرے پاس ایک پستول موجود تھا اور یہی کافی تھا جب کہ میں جو کچھ کر گزرنے کی خواہش میں مبتلا تھا، اس کے لیے محض اپنے شکاری چاقو پر بھی بھروسہ کر سکتا تھا۔ پستول کو خالی ہولسٹر میں ٹھونس کر میں دروازہ کھولتا ہوا کمرے سے باہر آگیا۔

دروازے سے باہر آکر میں زینے کی طرف گیا تاکہ نیچے موجود تین پہرے داروں اور قہوہ خانے کے مالک سے بھی نمٹ سکوں۔۔۔ لیکن سیڑھیوں پر مجھے ٹھٹھک جانا پڑا۔

نیچے سے کسی کی آواز سنائی دی۔

ایک شخص نے جماہی لیتے ہوئے کہا: "میرا خیال ہے جرگے کے لوگ قیدی کو لے کر نکلنے ہی والے ہیں۔"

"ہاں۔۔۔ پھانسی دینے کا وقت قریب آگیا ہے۔"

ایک اور شخص کی بھاری آواز سنائی دی۔

میں چند لمحوں تک کھڑا سوچتا رہا۔۔۔ پھر میں نے باہر جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور محرابی دروازے تک واپس آگیا۔ اس دروازے سے گزرتے وقت میں نے ایک بار پھر اندر دیکھا۔

نوجوان ابھی تک بے ہوش پڑا تھا۔

میں نے بالکونی سے قہوہ خانے کی چھت تک پہنچنے کا راستہ تلاش کیا اور اطمینان سے اوپر پہنچ گیا۔ میں نے خود کو اوندھے منہ چھت پر نرمی سے گرایا اور پھر پستول نکال کر ہاتھ میں جکڑ لیا۔

اس جگہ لیٹے لیٹے میں بازار کا منظر دیکھ سکتا تھا۔

بلندی پر ہونے کی وجہ سے نیچے والوں کو میرا پتا نہیں چل سکتا تھا اس لیے میں اطمینان سے انتظار کر سکتا تھا۔ میں نے یہ سوچا تھا کہ تھوڑی ہی دیر بعد جب فرینک کو جرگے کی عمارت سے نکالا جائے گا تو اس سے یہیں نمٹ لوں گا۔

میں نے اس مکان کی طرف دیکھا۔

اس کی ایک کھڑکی روشن تھی۔

میری نگاہ افق کی طرف اٹھ گئی جہاں اب سپیدۂ سحر نظر

تنے لگا تھا اور ستاروں کی چمک ماند پڑ گئی تھی۔ میرا دل آہستہ آہستہ دھڑک رہا تھا اور میری نگاہ بار بار جرگے کے مکان کی طرف اٹھ رہی تھی۔

... اور پھر اسے باہر لایا گیا۔

فرینک اس وقت بندھا ہوا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ، دو مختلف رسیوں کی مدد سے جکڑے ہوئے تھے۔ اس کے سینے اور پیٹ پر بھی دو مضبوط رسیوں کے پھندے تھے گویا وہ چار مختلف رسیوں کے پھندوں میں چار آدمیوں کے ہاتھوں میں جکڑا ہوا تھا۔

میں نے محسوس کیا کہ وہ خوف زدہ نہیں ہے۔

وہ ایک فوجی آدمی تھا اور اس سے پہلے بھی بارہا موت سے اس کی مڈبھیڑ ہو چکی تھی لیکن وہ اپنی قوت اور ذہانت سے ہمیشہ موت کو شکست دے کر نکلتا ہوا وادیِ خوف تک آ پہنچا تھا...

یہاں وہ بے بس ہو گیا... لیکن خوف زدہ نظر نہیں آ رہا تھا۔

یہ انجام اس کے لیے متوقع رہا ہو گا یا پھر اس نے گزشتہ دن اور رات بھر میں خود کو ذہنی طور پر پھانسی جیسی آسان موت کے لیے تیار کر لیا ہو گا... لیکن وہ بے خبر تھا کہ میں اس کی موت اپنے ہاتھ میں چھپائے، تاک میں بیٹھا ہوا ہوں۔

اس کی گردن میں عجیب سا تناؤ تھا۔ غالباً وہ مقامی لوگوں کو اپنی قوم کی سربلندی کا تاثر دینا چاہتا تھا۔ جرگے کا مکان دائیں طرف تھا اور اسے بازار سے گزر کر بائیں طرف لے جایا جاتا تھا۔ بائیں طرف جاتے وقت اسے قہوہ خانے کے سامنے سے گزرنا تھا اور میری نظریں اسی لمحے کا انتظار کر رہی تھیں۔

بازار میں اب آہستہ آہستہ چہل پہل شروع ہو گئی تھی۔

میں چھت پر اوندھا لیٹا دیکھتا رہا۔

میری انگلیوں کی گرفت پستول پر سخت ہوتی جا رہی تھی۔

چاروں آدمی اسے رسیوں میں جکڑے ہوئے چلنے لگے۔

جرگے کے لوگ شاید اس مقام پر پہنچنے کے لیے گھوڑوں پر روانہ ہو چکے تھے جہاں فرینک کو پھانسی دی جانے والی تھی۔

وقت اب بے حد آہستہ آہستہ گزر رہا تھا۔

بازار میں دونوں طرف بستی کے لوگوں کا ہجوم ہونے لگا لیکن کسی نے ان کے قریب آنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے قہوہ خانے کے سامنے آ گئے۔ میں نے پستول والا ہاتھ اٹھایا۔

"ارے... وہ فرار ہو گیا۔" اچانک ایک چیخ سنائی دی۔

میں نے ایک طویل سانس لے کر پستول والا ہاتھ جھکا لیا۔

آواز اسی نوجوان کی تھی جسے میں بے ہوش کر کے چارپائی پر ڈال آیا تھا... وہ میری توقع سے کافی پہلے ہوش میں آ گیا تھا اور اب کھڑکی سے جھکا نیچے کھڑے لوگوں کو میرے فرار کی اطلاع دے رہا تھا۔

نوجوان کی آواز سن کر وہ چاروں رک گئے جنہوں نے رسیوں کی مدد سے فرینک کو جکڑ رکھا تھا۔

میں نے فرینک کے چہرے پر اس اطلاع کا ردِعمل دیکھنے کی کوشش کی تو میرا دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ اس کے چہرے پر ... میں کروٹیں لینے والا سکون غائب ہو گیا تھا اور وہاں دہشت نے ڈیرے ڈال دیے تھے۔

سرحدی علاقے کی یہ ایک ٹھٹھری ہوئی صبح تھی۔

سرد ہوا کے جھونکوں میں تلوار کی سی کاٹ تھی۔

میرے جسم کے کھلے حصے شل تھے لیکن مجھے کسی بات کا ہوش نہیں تھا۔ میں تو اپنے دشمن پر نگاہ گاڑے ہوئے تھا جس کا انجام بہرحال میرے ہی ہاتھوں ہونا تھا۔

"چلو... جلدی چلو۔" فرینک نے رسیوں پر زور آزمائی کرتے ہوئے کہا۔ "میرے لیے جو سزا تجویز ہوئی ہے، اسی پر عمل ہونا چاہیے۔ جب تک مجھے پھانسی نہیں دے دی جاتی، میری حفاظت کرنا تمہارا فرض ہے۔"

"خاموش رہو..." ایک نے اسے ڈانٹ دیا۔

"شالیار کو مجھ سے دور رکھنا..." فرینک نے دوبارہ کہا۔

"بکواس بند کرو۔" اس بار لہجہ کرخت تھا۔

"اسے دیکھتے ہی گولی مار دینا۔" فرینک چیخ رہا تھا۔

اس بار کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میرے فرار کی اطلاع نے بازار میں موجود لوگوں میں کھلبلی مچا دی تھی اور کچھ لوگ مختلف سمتوں میں دوڑ پڑے تھے۔ غالباً وہ جرگے کے لوگوں کو اطلاع دینا چاہتے تھے۔

اس صورتِ حال کے پیشِ نظر وہ چاروں آدمی بھی رک گئے تھے جنہوں نے فرینک کو جکڑ رکھا تھا۔ رائفل بردار پہرے دار بھی خاموش کھڑے تھے۔ قہوہ خانے سے وہ تینوں آدمی بھی نکل کر بازار میں پہنچ گئے جو رات بھر میری نگرانی کے لیے نیچے بیٹھے رہے تھے۔

... پھر میں نے اسی نوجوان کو دیکھا۔

وہ قہوہ خانے سے نکلا تو اس کا منہ سوجا ہوا تھا۔ جہاں گھونسا لگا تھا وہاں سے میں نے خون تو پونچھ دیا تھا لیکن ہوش میں آنے کے بعد شاید خون دوبارہ جاری ہو گیا تھا۔

"گلباز... تم زخمی ہو؟" کسی نے چیخ کر کہا۔

"ہاں... لیکن اس نے مجھے جان سے نہیں مارا۔ وہ

سے ایسا کر سکتا تھا۔" نوجوان نے کہا اور سر کے عقبی حصے کو ٹٹولنے لگا جہاں ایک تکلیف دہ گومڑا تھا۔

اس نے تفصیل سے لوگوں کو بتایا کہ میں نے کس انداز میں اسے دھوکا دیا اور کیسے اسے اٹھا کر کمرے میں پھینک دیا... پھر کیسے اس پر غلبہ پایا۔

"میں ہوش میں آیا تو چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔" نوجوان کہہ رہا تھا۔ "حالانکہ میں جب بے ہوش ہوا تھا تو کھڑکی کے قریب دیوار سے لگا بیٹھا تھا۔ غالباً اسی نے مجھے اٹھا کر چارپائی پر لٹایا ہو گا۔"

وہ اس انداز میں یہ سب کچھ کہہ رہا تھا جیسے میں نے یہ کارنامہ انجام دے کر اسے تکلیف کی بجائے راحت پہنچائی ہو۔ وہ بڑے پُرجوش انداز میں بول رہا تھا۔

"مجھے یہاں سے لے چلو۔" فرینک چیخنے لگا۔

"خاموش رہو۔ ہم ہدایات کا انتظار کر رہے ہیں۔"

"مجھے جلد سے جلد پھانسی دے دو۔"

"وقت ہو چکا ہے۔" رسی تھامے ہوئے ایک شخص نے کہا۔ "اگر جرگے نے چاہا تو تمہیں گاؤں سے باہر لے جانے کی بجائے یہیں پھانسی دے دی جائے گی۔"

"مجھے اب کہیں اور لے جانا خطرناک ہو گا... وہ فرار ہو گیا ہے۔" فرینک مسلسل چیختے جا رہا تھا۔ وہ بے حد خوف زدہ تھا اور اس کی ہر گزرتے ہوئے لمحے کے ساتھ بگڑتی ہوئی حالت میرے دل کے زخموں کے لیے مرہم ثابت ہو رہی تھی۔

میں چھت پر خاموش لیٹا اس کی حالت سے لطف اندوز ہو رہا تھا... مجھے یقین تھا کہ اب اسے میرے ہاتھوں سے کوئی بھی نہیں بچا سکتا۔

اچانک ایک آدمی تیزی سے ان کے قریب آیا۔ اس کے پیچھے دو بزرگ تھے۔ سفید داڑھیوں والے دو بوڑھے... یہ غالباً جرگے کے ان سات آدمیوں میں سے تھے جنہیں میں کل دیکھ چکا تھا۔ لیکن میں انہیں پہچان نہ سکا۔

انہوں نے آپس میں کچھ دیر صلاح مشورہ کیا۔

"مجھے اس کے ہاتھوں سے بچانا تمہارا فرض ہے۔ میں پھانسی کی موت کو ذہنی طور پر قبول کر چکا ہوں۔" فرینک ایک بار پھر چیخنے لگا۔ "اگر میں اس کے ہاتھ لگ گیا تو وہ مجھے سسکا سسکا کر مارے گا... اور میں ایسی سسکتی ہوئی اذیت ناک موت برداشت نہیں کر سکتا۔"

"خاموش رہو۔" ایک شخص نے اسے جھڑک دیا۔

"میں قانونی موت چاہتا ہوں۔" فرینک سسک پڑا۔

میں اس کی بدلتی ہوئی حالت دیکھ کر کافی لطف اندوز ہو چکا تھا اور اب عمل کا وقت آ گیا تھا۔ نفرت سے میرا جسم سلگ اٹھا تھا اور غصے کی لہر آہستہ آہستہ میرے دماغ کو شل کرتی جا رہی تھی۔ میں نے پانوش کے قاتل کے چہرے پر وہی سب کچھ دیکھ لیا تھا جو مرتے وقت میرے معصوم بھائی کے چہرے پر پیدا ہوا ہو گا۔ فرینک کے رخساروں کا گوشت کانپ رہا تھا۔

وہ بار بار تھوک نگل رہا تھا۔

اس کے ہونٹ خشک پڑ گئے تھے۔

اپنی ویران آنکھوں سے وہ بار بار ادھر ادھر دیکھ رہا تھا جیسے مجھے تلاش کر رہا ہو۔ اس کی زبان بار بار خشک ہونٹوں پر گھوم رہی تھی۔

رفتہ رفتہ اس پر دیوانگی سوار ہو رہی تھی اور اس نے رسی کی بندشوں سے زور آزمائی شروع کر دی تھی جس کے نتیجے میں چاروں آدمی پھیل گئے اور انہوں نے چاروں طرف سے اسے کھینچنا شروع کر دیا۔ فرینک کے دونوں ہاتھ پھیل گئے اور اس کا جسم ساکت ہو گیا۔

میں نے پستول اٹھایا۔

فاصلہ زیادہ نہیں تھا... میں آسانی سے اسے اپنی مرضی کے مطابق ٹھکانے لگا سکتا تھا۔ پہلا فائر ہوا اور اس دھماکے سے یوں محسوس ہوا جیسے ہر چیز جہاں تھی، وہیں ساکت ہو گئی ہو۔

گولی فرینک کے اٹھے ہوئے بائیں ہاتھ پر لگی۔

اس کے حلق سے ایک دلدوز چیخ نکل گئی۔

میں زمین پر اس کی تین انگلیاں دیکھ رہا تھا، جو کسی چھپکلی کی تازہ کٹی ہوئی دُم کی طرح تڑپ رہی تھیں۔

چھپکلی کی تازہ کٹی ہوئی دُم کی طرح تڑپنے والی فرینک کی انگلیاں چند لمحوں کے بعد ساکت ہو گئیں۔ جیسے تڑپتے تڑپتے نڈھال ہو گئی ہوں لیکن فضا میں شور برپا ہو گیا تھا۔ جرگے کے آدمیوں کے شور کے درمیان فرینک کی کربناک چیخوں نے پوری بستی کو سر پر اٹھا لیا تھا۔ وہ اس طرح چلا رہا تھا جیسے جہنم کے ان گنت انگارے اس کے جسم سے چمٹ گئے ہوں۔

اس کے ساتھ ہی وہ جھٹکے دے دے کر خود کو رسیوں سے چھڑانے کی کوشش بھی کر رہا تھا لیکن جن لوگوں نے اس کی رسیاں پکڑ رکھی تھیں، وہ اپنے کام میں بہت مستعد اور بے حد طاقتور دکھائی دیتے تھے۔ انہوں نے ایک لمحے کے لیے بھی اپنی گرفت ڈھیلی نہیں ہونے دی تھی۔

سارجنٹ فرینک کی حالت اس وقت اس گائے جیسی تھی جسے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کسی اناڑی قصاب نے نیم ذبح حالت میں چھوڑ دیا ہو اور وہ اپنے خون اگلتے حلقوم کے ساتھ زمین پر تڑپ کر فرار ہونے کی کوشش کر رہی ہو۔ جرگے کے وہ دونوں سفید داڑھیوں والے بزرگ جو بعد میں آئے تھے چیخ چیخ کر لوگوں کو احکامات دے رہے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ فرینک پر کس طرف سے گولی چلائی گئی ہے۔

میں نے پستول کی نال کو چوم کر آسمان کی طرف دیکھا اور دھیمی آواز میں کہا۔ ”بھائی! ابھی تمہارا انتقام پورا نہیں ہوا ہے... ابھی تو میں نے انتقامی کھیل کا آغاز ہی کیا ہے۔ تم گواہ رہنا کہ میں نے تمہارے خون کا بدلہ لینے میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔“

... پھر میں نے میدان کی طرف نگاہ ڈالی۔

فرینک اب خاموش تھا جیسے اس کے ہونٹ سل گئے ہوں یا چیختے چیختے اس کے پھیپھڑے جواب دے گئے ہوں۔ رسیاں تھامنے والے اب اُسے اور تیزی سے جنگلے کی طرف لے جا رہے تھے اور وہ خود بھی دو مزدوروں کا ساتھ دے رہا تھا۔ شاید پوری انسانی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ کسی پھانسی پانے والے نے ان لوگوں کے ساتھ اتنا تعاون کیا ہوگا جو اُسے تختۂ دار تک لے جا رہے تھے۔ انسان اوّل تو موت کو پسند ہی نہیں کرتا لیکن اگر موت سامنے آ ہی جائے تو آسان ترین موت کی خواہش کرتا ہے۔ پھانسی حالانکہ کوئی آسان موت نہیں ہے۔ اس میں بے پناہ اذیت برداشت کرنا پڑتی ہے لیکن یہ اذیت جسم کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے کی اذیت سے بہرحال بہت کم ہوتی ہے ... اور میں نے تو قسم کھائی تھی کہ فرینک کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا۔

ابھی تک انہوں نے اتنا فاصلہ طے نہیں کیا تھا کہ میرے پستول کی رسائی سے دُور چلے جاتے۔ پھانسی کے پھندے تک جانے کا راستہ اس چھت کے نیچے سے ہو کر گزرتا تھا جس کے اُوپر میں چھپا ہوا تھا ... اور وہ لوگ دوڑتے ہوئے اس طرف آ رہے تھے۔

میں نے ایک بار پھر پستول کی نال سیدھی کی اور ایک گولی داغ دی۔ اس بار میں نے فرینک کی بائیں کہنی کا نشانہ لیا تھا لیکن مجھے اس بات پر افسوس ہوا کہ میں اس کی بائیں کہنی کو اس کے جسم سے الگ نہ کر سکا البتہ وہ کہنی آدھی سے زیادہ ٹوٹ کر کھال کے ذریعے لٹکتی رہ گئی جس طرح کسی درخت سے کوئی شاخ ٹوٹنے کے باوجود نہ گر سکی ہو۔ میں تو قدرے فاصلے پر تھا لیکن مجھے یقین ہے کہ اس کے آس پاس کھڑے ہوئے لوگوں نے ہڈی ٹوٹنے کی آواز ضرور سنی ہوگی۔ اس کے ساتھ ہی فرینک پر جیسے سرسامی کیفیت کا دورہ پڑ گیا۔ اس کے منہ سے جھاگ نکلنے لگی تھی اور وہ زمین پر گر کر لوٹنے لگا تھا۔ رسیاں پکڑنے والے دُور ہٹ گئے اور اس کے ساتھ جانے والے رائفل برداروں نے اپنی اپنی رائفل سیدھی کر لی۔ شاید انہوں نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ میں کہاں چھپا ہوا ہوں اور کسی بھی لمحے گولیوں کی بوچھاڑ ہونے والی تھی۔

اب مزید وقت صرف کرنا میرے لیے بہت نقصان دہ ثابت ہو سکتا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ زیادہ خون بہنے کے سبب فرینک وہیں مر جاتا اور میری حسرت ناتمام ہی رہ جاتی۔ میں نے پستول کی نال پھر سیدھی کر لی۔ اس وقت تک فرینک کھڑا ہو چکا تھا۔ وہ تیزی سے ایک طرف دوڑنے لگا تھا۔ ٹوٹے ہوئے اس کا آدھا کٹا بازو مضحکہ خیز انداز میں آگے پیچھے جھول رہا تھا۔

رسیاں پکڑنے والوں نے بھی اس کے پیچھے دوڑنا شروع کر دیا۔ لیکن دُور رائفل بردار اپنی جگہ کھڑے رہے۔ انہوں نے رائفلوں کا رُخ چھت کی طرف کر دیا۔ دیر ہی سے سہی لیکن انہوں نے مجھے تلاش کر لیا تھا۔ تاہم مجھے ان کی پروا ابھی نہیں تھی۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ میں ان کی طرف توجہ دے سکتا۔ فرینک پھانسی کے پھندے کی طرف دوڑا چلا جا رہا تھا۔ اگر اُسے پھانسی کے ذریعے موت نصیب ہو جاتی تو یہ ایک طرح سے میری شکست ہی ہوتی ... اور میں اس انتقامی کھیل میں ہارنا نہیں چاہتا تھا۔ بازی میرے ہاتھ میں تھی اور میں اسے ہاتھ سے جانے نہیں دے سکتا تھا۔

میں نے اس ہلاکت کے دوڑتے ہوئے قدموں کی رفتار ختم کرنے کا فیصلہ کیا۔ گولی چلی وہ ایک بار پھر دھم سے گر پڑا۔ میں نے اس کے گھٹنے پر فائر کیا تھا۔ یقیناً اس کے گھٹنے کی پیالی شیشے کی طرح کرچی کرچی ہو گئی ہوگی۔ وہ اب ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا سکتا تھا۔

... لیکن اس کے ساتھ ہی دو گولیاں میرے سر کے اوپر سے گزر گئیں۔ رائفل برداروں نے گولیاں چلانا شروع کر دی تھیں۔ شاید اُن کے لیے برداشت کا وقت ختم ہو گیا تھا۔ میں اپنی اس حرکت کے ذریعے انہیں اپنا دشمن بنا چکا تھا۔ میں نے ان کے اصولوں کی خلاف ورزی کی تھی۔ جرگے کے احترام کو پامال کیا تھا۔ لہٰذا میری سزا بھی یہی تھی کہ مجھے موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ چھت پر آنے جانے کے لیے ایک زینہ بنا ہوا تھا اور ایک دروازہ تھا جسے اگر بند کر دیا جاتا تو کوئی بھی زینے کے ذریعے دروازے کو توڑے بغیر چھت پر نہیں آ سکتا تھا۔ اس وقت وہ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اگر میں فرینک کی طرف متوجہ رہتا تو کوئی بھی میرے پیچھے سے آ کر بڑی آسانی سے مجھے بے بس کر سکتا تھا۔ میں کہنیوں کے بل رینگتا ہوا اپنی جگہ سے ہٹنے لگا اور دروازے کے قریب پہنچ کر اُسے کھینچ کر بند کر دیا۔ ابھی تک زینے پر کوئی نمودار نہیں ہوا تھا... لیکن بستی والے کسی بھی لمحے اس

عمارت پر دھاوا بولنے والے تھے۔

دروازے کو بند کرنے کے بعد اسی طرح رینگتا ہوا دوبارہ منڈیر تک پہنچ گیا اور نیچے نگاہ ڈالی تو ایک لمحے کے لیے چکرا کر رہ گیا۔ فرینک وہاں موجود نہیں تھا... اور نہ ہی اس کے محافظ کہیں نظر آ رہے تھے۔ شاید وہ لوگ اسے پیٹھ پر لاد کر اُس جگہ سے دُور لے گئے تھے۔ فرینک کو موجود نہ پا کر میری آنکھیں جل اٹھیں جیسے اُن میں خون اُتر آیا ہو۔

میں نے ادھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔

دُور رائفل برداروں کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی دکھائی دے رہے تھے جن کی رائفلوں کا رُخ سرائے ہی کی طرف تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ان لوگوں نے عمارت کو گھیر کر فرینک تک میرے پہنچنے کے راستے مسدود کر دیے تھے۔

مجھے جو قدم بھی اٹھانا تھا جلد اٹھانا تھا... ورنہ رسّی کے پھندے پر فرینک کی زندگی ختم ہونے کے بعد میری زندگی کا سب سے اہم فرض ادھورا رہ جاتا۔

میں کہنیوں کے بل رینگتا ہوا ایک بار پھر واپس ہوا۔ اس بار میرا رُخ مخالف سمت میں تھا۔

میں نے دوسری منڈیر سے نیچے دیکھا۔ اُس طرف بھی کچھ لوگ کھڑے تھے... یعنی میں چاروں طرف سے گھیر لیا گیا تھا۔

سرائے کی عمارت سے کچھ فاصلے پر ایک درخت تھا۔ گھنا، قدآور اور تناور درخت... جس کی شاخیں چھت تک پہنچ رہی تھیں۔ میں نے نگاہوں ہی نگاہوں میں فاصلے کا اندازہ کیا۔ میرے خیال میں سرائے سے درخت تک کا فاصلہ چار پانچ گز سے کم نہیں تھا۔ اگر میں کسی طرح درخت تک چھلانگ لگا سکوں تو پھر پتوں کی آڑ میں چھپ کر سامنے پہرہ دینے والوں کو اپنے نشانے کی زد پر رکھ سکتا تھا۔ ان لوگوں سے مجھے کوئی دشمنی نہیں تھی لیکن یہ لوگ میرے راستے کی دیوار بن گئے تھے اور میں بازش کے انتقام کی راہ میں کسی دیوار کا تصور بھی برداشت کرنے پر آمادہ نہیں تھا ... میں واقعی ایک بے رحم انسان تھا یا حالات نے مجھے بے رحم بنا دیا تھا ... بہرحال میں وقت پڑنے پر اپنے مقصد کی راہ میں حائل ہر شخص کا خون کر سکتا تھا۔

میں نے پستول کو جیب میں رکھا اور آہستہ آہستہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس طرف نیچے کھڑے ہوئے لوگوں کی نگاہ مجھ تک نہیں پہنچ سکی تھی۔ درخت کے گھنے پتوں نے مجھے اپنی آڑ میں لے لیا تھا۔ چھلانگ لگا کر پہنچنے کے لیے میں نے ایک موٹی سی شاخ کا انتخاب کیا۔ مجھے توقع تھی کہ وہ شاخ میرا بوجھ سہار لے گی۔

اچانک دو گولیاں اور چلیں۔

یہ گولیاں سامنے والوں نے نہیں چلائی تھیں بلکہ میرے عقب میں نیچے کھڑے لوگوں نے چلائی تھیں۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ ان لوگوں نے مجھے دیکھ لیا تھا یا وہ یونہی مجھے ڈرانے کے لیے گولیاں چلا رہے تھے۔ بہرحال اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں اپنی ترکیب پر اسی لمحے عمل کر بیٹھا۔

دراصل میں نے یہ اقدام انتہائی مایوسی کی حالت میں کیا تھا... ورنہ عام حالت میں کوئی بھی ہوش مند ایسی خطرناک ترکیب پر عمل نہیں کرتا۔ اس کوشش میں میری جان جانے کا بھی خطرہ تھا۔ اگر یہ اندازہ ذرا بھی غلط ہو جاتا تو میں بجائے اس شاخ کو پکڑنے کے سیدھا زمین پر ہی گر سکتا تھا۔

یہ ایک اندھی چھلانگ تھی... اندھی اور خطرناک...

میں چند قدم پیچھے آیا اور سانس روک کر دوڑتا ہوا منڈیر تک آیا... پھر یک لخت چھلانگ لگا دی۔ میری قسمت ہی اچھی تھی جو میرا ہاتھ درخت کی اسی شاخ پر پڑا جسے میں نے منتخب کیا تھا۔ میرے دونوں ہاتھوں اور شانوں کو زبردست جھٹکا لگا تھا۔ میری ہتھیلیاں کھردری چھال سے رگڑ کھا کر لہولہان ہو گئیں لیکن میں نے اپنی گرفت مضبوط رکھی۔

نیچے کھڑے ہوئے لوگوں کی توجہ اس بار میری طرف ہو گئی۔ انہوں نے شاید مجھے چھت پر سے درخت پر چھلانگ لگاتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ وہ شور مچاتے ہوئے درخت کی طرف دوڑنے لگے۔ میں نے ایک الٹی قلابازی کھائی اور شاخ پر بیٹھ گیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے پستول بھی نکال لیا تھا۔

درخت کی طرف آنے والے تعداد میں تین تھے۔

میں نے جیب سے پستول نکالا تو یاد آیا کہ اس میں اب صرف تین ہی گولیاں رہ گئی ہیں اور میرے پاس فالتو کارتوس کا ذخیرہ بھی نہیں تھا۔ اگر یہ گولیاں یہیں صرف ہو جاتیں تو فرینک کے لیے کیا باقی رہتا؟

میں نے ایک نظر ان تینوں کی طرف دیکھا۔ وہ اب بہت قریب پہنچ چکے تھے۔

یوں محسوس ہوتا تھا جیسے انہوں نے مجھے دیکھا ہی نہ ہو اور انہوں نے محض اندازہ ہی لگایا تھا کہ میں نے درخت پر چھلانگ لگا دی ہے یا پھر انہوں نے کوئی آواز سن لی ہوگی۔ اگر وہ واضح طور پر مجھے دیکھ چکے ہوتے تو اب تک ان کی رائفلوں نے گولیاں اگلنا شروع کر دی ہوتیں۔

انہیں دیکھ کر میری آنکھیں چمک اٹھیں۔ ان میں سے کسی ایک کی رائفل میرے کام آ سکتی تھی۔ میں نے پستول والے ہاتھ کو پتوں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

...پھر ان میں سے ایک کا نشانہ لیا لیکن کچھ سوچ کر رک گیا۔

ان لوگوں سے میری کوئی دشمنی نہیں تھی۔ انہوں نے میرا کچھ نہیں بگاڑا تھا۔ بلکہ میں نے ہی ان کے اصول کی خلاف ورزی کر کے ان کی توہین کی تھی۔ اس کے علاوہ یہ لوگ عدالت خان کی بستی کے رہنے والے تھے جس نے میرا ساتھ دیا تھا۔ اگر وہ میرا ساتھ نہ دیتا تو بہت ممکن تھا کہ اتنی جلدی میں فرینک تک نہ پہنچ پاتا۔

...لیکن آنے والوں کو روکنا بھی بہت ضروری تھا۔ بعض اوقات اپنی بقا کے لیے اندھا بن جانا پڑتا ہے۔ اس کے باوجود میں نے ان کو ہلاک کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ انہیں محض زخمی کر کے بھی کام نکالا جا سکتا تھا۔

میں نے تیزی سے پستول کی تینوں گولیاں آنے والوں پر استعمال کر ڈالیں۔ کوشش یہی کی تھی کہ ان میں سے کوئی بھی زیادہ زخمی نہ ہو سکے۔۔ اور یہی ہوا۔۔۔ وہ لوگ زیادہ زخمی تو نہیں ہوئے لیکن ان کی رائفلیں ان کے ہاتھوں سے چھوٹ کر زمین پر گر گئیں اور وہ خود گرتے پڑتے ایک طرف دوڑ پڑے۔

میرے لیے اتنی سی مہلت ہی کافی تھی۔

میں اس شاخ سے جست لگا کر دوسری شاخ پر پہنچا۔ یہ شاخ پہلی سے کچھ نیچے تھی لیکن یہ شاخ پہلی کی طرح مضبوط ثابت نہ ہوئی۔ اس سے پہلے کہ میں خود کو سنبھال لیتا ایک تڑاکا ہوا اور وہ شاخ فرینک کے ٹوٹے ہوئے بازو کی طرح جھول گئی۔ میں ہوا میں ہاتھ پاؤں چلاتا ہوا نیچے آگرا تھا۔ چوٹ میری کمر اور پسلیوں میں آئی اور درد بھی اتنی شدید کہ درد کی ایک لہر پورے جسم میں پھیلتی چلی گئی۔

مرنے کی عادت کی دوسری سمت میں لوگوں کے شور کی آوازیں دھیرے دھیرے قریب ہوتی جا رہی تھیں۔ میں نے جلدی سے کھڑے ہونے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ ایک طویل سسکاری سے کراہنے ہونٹوں کو مضبوطی سے بھینچ لیا۔ میرا جسم درد کی شدت سے کانپ کر رہ گیا۔

بازی میرے ہاتھ سے ایک بار پھر نکلی جا رہی تھی اور حالات قدم قدم پر میری راہ میں رکاوٹ ڈال رہے تھے لیکن میں نے تو حالات کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے کا عزم کر رکھا تھا۔ یہ تکلیف مجھے فرینک تک پہنچنے سے نہیں روک سکتی تھی۔۔۔ میں نے ایک بار پھر کوشش کی۔۔۔

اس بار میں کھڑا تو ہو گیا لیکن میری دونوں ٹانگیں بری طرح کانپ رہی تھیں۔ میں اسی طرح آگے بڑھا اور جھک کر زمین سے ایک رائفل اٹھا لی۔ یہ وہ رائفل تھی جو کسی زخمی کے ہاتھ سے نکل کر وہاں گر پڑی تھی۔

اب میری حالت دوبارہ مستحکم ہو چکی تھی اور میں اپنی راہ میں آنے والوں کو کچھ دیر کے لیے رخ بدلنے پر مجبور کر سکتا تھا۔

شور مچانے والوں نے مجھے دیکھ لیا تھا اور ان کے قدم تیز ہو گئے تھے۔ میں نے مضبوطی سے ہونٹوں کو بھینچا اور تکلیف کی پروا کیے بغیر ایک طرف دوڑنے لگا۔ قدم قدم پر میرا جسم احتجاج کر رہا تھا لیکن مقصد پیش نظر ہو تو ایسی تکلیفوں کی پروا کرنے والے بزدل کہلاتے ہیں۔۔۔ اور میں بزدل ہرگز نہیں تھا۔

رفتہ رفتہ میری تکلیف کم ہوتی چلی گئی۔۔۔ یا تو جوش اور غصہ کی وجہ سے مجھے احساس نہیں ہو رہا تھا۔۔۔ یا پھر جسم کا وہ حصہ سن ہو گیا تھا جہاں چوٹ لگی تھی۔

مجھے اندازہ تھا کہ فرینک کو کس طرف لے جایا گیا ہے لیکن ڈر یہ تھا کہ کہیں اسے پھانسی نہ دے دی گئی ہو۔ بستی کے آگے ایک جنگل اور درختوں کے درمیان پہنچنے کے بعد کسی کو ڈھونڈنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس لیے گاؤں کے وہ لوگ جو میرے تعاقب میں تھے آسانی سے مجھے تلاش نہیں کر سکے اور میں اس مقام پر پہنچ گیا جہاں فرینک کو پھانسی دی جانے والی تھی۔ اس قدیم درخت کے بارے میں پہلے ہی معلومات حاصل کر چکا تھا۔

پھانسی کے لیے اس تناور درخت کی ایک شاخ کا انتخاب کر لیا گیا تھا۔ معلوم نہیں یہ درخت کب سے اس مقصد کے لیے استعمال کیا جاتا رہا ہو۔ روایات اور اصولوں کی بات نہ ہوتی تو فرینک کو گاؤں میں بھی پھانسی دی جا سکتی تھی۔ شاخ سے ایک مضبوط رسی لٹکی ہوئی تھی اور پھندا فرینک کی گردن میں ڈالا جا چکا تھا۔ گویا میری خوش قسمتی اور فرینک کی بدقسمتی کہ میں وہاں ٹھیک وقت پر پہنچ گیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے یہ لوگ اس بات کا انتظار کر رہے ہوں کہ میں وہاں پہنچوں تو وہ اپنی کارروائی شروع کریں۔ درخت کے چاروں طرف مسلح محافظ کھڑے تھے۔۔۔ ان میں داڑھی والے دونوں بزرگ بھی تھے۔

فرینک کا ہاتھ اسی طرح جھول رہا تھا۔

اس کی آنکھیں بند تھیں۔ البتہ اس کی سانسیں چل رہی تھیں اور وہ کبھی کبھی کٹے ہوئے مرغ کی طرح پھڑپھڑانے لگتا تھا۔ جس سے اس کے زندہ ہونے کا احساس ہو رہا تھا۔

میں نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ چھپنے کے لیے ایک ایسا موجود تھا جو اس درخت سے کچھ فاصلے پر تھا جس کی شاخ زمین تک لٹک رہی تھی۔

یہ بھی عجیب ستم ظریفی تھی کہ میں ایک ایسے شخص کو پھانسی سے بچانے کی کوشش کر رہا تھا جو میرا سب سے بڑا دشمن تھا۔

میں اسے پھانسی کی بجائے گولیوں کی اذیت ناک موت کے حوالے کرنے والا تھا۔ میرا خیال ہے کسی مرنے والے کے ساتھ کبھی ایسی صورت حال پیش نہیں آئی ہو گی۔

گاؤں والے شور مچاتے ہوئے اب ادھر ہی آ رہے تھے شاید انہیں احساس ہو گیا تھا کہ میرا رخ اسی طرف ہو سکتا ہے۔ میں نے نگاہوں ہی نگاہوں میں اس درخت کا جائزہ لیا جس پر مجھے چڑھنا تھا۔۔۔ پھر رائفل کو شانے سے لٹکا کر میں اس پر چڑھتا چلا گیا۔

درخت پر چڑھتے ہوئے میری تکلیف دوبارہ بیدار ہو گئی لیکن میں نے ہونٹوں کو سختی سے بھینچ رکھا تھا۔ میں نے گھنے پتوں میں خود کو پوشیدہ کر لیا۔ اس کے بعد میں نے اس درخت پر نگاہ مرکوز کر دی جہاں فرینک کو پھانسی دی جا رہی تھی۔

رسی کو جھٹکا دیا گیا اور فرینک فضا میں معلق ہو گیا لیکن اسی لمحے میں نے گولی چلا دی۔ گولی نے رسی کو کاٹ دیا اور وہ دھپ سے زمین پر آگرا۔

نشانہ بے حد سچا ثابت ہوا تھا۔

اس کے گرتے ہی ایک بار پھر کھلبلی سی مچ گئی تھی۔ درخت کے اردگرد کھڑے ہوئے لوگ افراتفری کے عالم میں ادھر ادھر بکھر گئے تھے اور درخت کی جڑ کے قریب زمین پر گرا ہوا فرینک پانی سے نکلی ہوئی مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا۔

میں اس کی حالت سے لطف اندوز ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ زخم پر مرہم رکھنے سے جو سکون ملتا ہے۔ وہ مجھے حاصل ہونے لگا۔

میں نے رائفل کو ایک بار پھر تولا اور دوسری گولی تڑپتے اور چلاتے ہوئے فرینک کے بائیں شانے میں اتار دی۔

وہ خاموش ہو گیا۔۔۔ خاموش اور ساکت۔۔

مجھے اس کی خاموشی پسند نہ آئی۔ میرے پاس رائفل کی ابھی گولیاں موجود تھیں اس لیے میں انتقام کے کھیل کو بھی جاری رکھنا چاہتا تھا۔

ممکن ہے موت اس پر دھیرے دھیرے مسلط ہونے لگی ہو۔۔۔ لیکن میں اس کے مرنے سے پہلے اس کے جسم میں مزید شگاف پیدا کرنا چاہتا تھا۔ وہ اب ایک دو گھڑی کا مہمان دکھائی دے رہا تھا۔

میں نے رائفل والا ہاتھ اٹھایا اور گولیاں اس کے جسم کے مختلف حصوں میں اتار دیں۔ ہر بار گولی کھا کر وہ بری طرح اچھلتا اور فضا میں دھول اڑاتی رہی۔ اس کے محافظ وہاں سے بہت دور چلے گئے تھے۔ شاید انہوں نے کبھی ایسا منظر پہلے نہیں دیکھا تھا۔

...پھر ایک وقت ایسا بھی آیا جب فرینک کا تڑپنا بند ہو گیا۔ وہ ختم ہو چکا تھا۔

"پالوش۔۔۔ میرے بھائی! میں نے تیرا انتقام لے لیا ہے۔" میں نے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔

میرے تصور میں شکستہ پا بھائی تھا۔۔۔ پھر اس کی روح نظر آئی۔ وہ بہت خوش دکھائی دے رہی تھی جیسے میرا شکریہ ادا کر رہی ہو۔۔۔ جیسے اسے سکون مل گیا ہو۔

...پھر کچھ دیر بعد جب میں نے آنکھیں کھولیں تو اپنے آپ کو مکمل طور پر گھرا ہوا پایا۔ مسلح محافظوں اور بستی والوں نے اس درخت کے چاروں طرف گھیرا ڈال دیا تھا جس پر میں چھپا بیٹھا تھا لیکن اس بار صورت حال بہت مختلف تھی پہلے صرف تین آدمی تھے جنہیں میں زخمی کر کے بھاگ آیا تھا لیکن اس بار پوری بستی جمع تھی اور میری رائفل میں ایک بھی گولی باقی نہیں بچی تھی۔

بستی والے مجھے درخت سے اترنے کے لیے کہہ رہے تھے۔ وہ سب بے حد غصے میں تھے۔ میں نے ان کے اصولوں اور روایت کی ایسی خلاف ورزی کی تھی جس نے انہیں میرے خلاف بری طرح بھڑکا دیا تھا۔

اب زندگی میرے لیے ویسے بھی بے معنی ہو چکی تھی۔ انسان اپنے مقصد کے حصول تک زندہ رہتا ہے۔ اس کے بعد ایک طرح سے اس کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ میں نے اپنا مقصد حاصل کر لیا تھا اور اس لیے موت میرے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ میں نے سب سے پہلے رائفل نیچے پھینک دی۔

رائفل گرتے ہی گاؤں والوں نے سمجھ لیا تھا کہ میں نیچے آ رہا ہوں۔ ان کے جوش و خروش میں اضافہ ہو گیا اور وہ زور زور سے چیخنے لگے۔

ایک پراسرار مورتی کے حصول
کے لئے ہونے والے خوفناک
معرکے کا احوال
خبیث
انوار صدیقی کے پراسرار قلم سے
5 حصوں میں مکمل سیٹ =/200 روپے
مکتبہ القریش سرکلر روڈ اردو بازار لاہور
فون 7668958

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے ایک گہری سانس لی اور درخت سے کود گیا۔ اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتا تھا میں درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ میرے پیروں کا درد دوبارہ ابھر آیا تھا۔ جب تک میں جوش اور ولولے سے بھرا ہوا تھا' یہ درد بھی کہیں جا کر سو گیا تھا لیکن اب اس نے دوبارہ مجھ پر حملہ کر دیا تھا۔

بپھرے ہوئے لوگ دھیرے دھیرے میری طرف بڑھنے لگے۔ میں جیسے ہی نیچے اترا' سناٹا چھا گیا۔ گاؤں والوں نے شور کرنا بند کر دیا تھا اور فضا میں ایک عجیب سا سناٹا پھیل گیا تھا۔ ایسا سناٹا جس میں سانس کی آواز بھی محسوس ہوتی ہے۔ میری طرف بڑھنے والے سب ہی مسلح تھے اور ان کے تیور بے حد خطرناک دکھائی دے رہے تھے۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ میرے قریب پہنچتے ہی مجھ پر ٹوٹ پڑیں گے۔

میں نے اب مکمل طور پر خود کو حالات کے رحم و کرم پر

چھوڑ دیا۔

وہ سب میرے قریب آ گئے۔ کچھ دیر تک میری طرف خونخوار نظروں سے دیکھتے رہے... پھر ان میں سے کچھ نے جو سب سے آگے تھے' اپنی رائفلیں ایک طرف پھینکیں اور مجھ پر ٹوٹ پڑے۔

میں بیک وقت اتنے آدمیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔

میرے گریبان پر پڑنے والے جھٹکے مجھے زمین پر لے آئے میں نے خود کو سنبھالنے کی بہت کوشش کی لیکن لوگوں کا سیلاب مجھے بہا لے گیا۔ بپھرے ہوئے لوگوں نے مجھے بری طرح روند ڈالا تھا۔ وہ لوگ یہ بھول گئے تھے کہ میں ان کا نجات دہندہ بن کر آیا تھا۔ غالباً ان کے نزدیک سب سے زیادہ اہمیت اپنی روایات کی تھی۔

میں نے ٹھوکروں اور گھونسوں سے اپنے چہرے کو بچانے کے لیے دونوں ہاتھوں سے اپنے چہرے کو چھپا لیا تھا۔ دو ایک ٹھوکریں اس پیر پر بھی پڑیں جو درخت سے گرنے کے باعث پہلے ہی زخمی ہو رہا تھا۔ میرے تن بدن میں درد کی لہر دوڑ گئی پھر میں نے ٹھوکروں اور گھونسوں کے طوفان کے درمیان ایک آواز سنی... کسی کی تحکمانہ آواز جو بپھرے ہوئے لوگوں کو روک رہی تھی۔ یہ آواز عدالت خان کی تھی جو عین وقت پر مجھے بچانے آ گیا تھا۔

"رک جاؤ۔" وہ زور سے دہاڑا۔

لوگوں نے اپنے ہاتھ اور پاؤں روک لیے۔ عدالت خان کی آواز سن کر وہ سب کئی قدم پیچھے ہٹ گئے تھے۔ میں نے آنکھیں کھول لیں۔ عدالت خان مجھ سے کچھ فاصلے پر کھڑا تھا۔ میں نے اُسے بھی آزمائش میں مبتلا کر دیا تھا۔ میرے جسم کی کھال کئی جگہ سے پھٹ گئی تھی۔ جن سے خون رس رہا تھا۔

"یہ جرگے کا مجرم ہے۔ عدالت خان۔" ایک بوڑھے نے کہا۔

"میں بھی جانتا ہوں۔" اس نے جواب دیا۔ "لیکن ہم اپنے مجرموں کو اس طرح سزا نہیں دیتے۔ یہ حرکت خود جرگے کی روایات کے خلاف ہے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو عدالت خان... لیکن اس نے نہ صرف جرگے کی توہین کی بلکہ ہمارے کئی آدمیوں کو بھی زخمی کر دیا ہے۔" ایک بوڑھے نے کہا۔

"ٹھیک ہے... تو ایسے مجرم کی سزا زندگی کی موت ہے۔ کل صبح اسے بوری میں بند کر کے ندی میں پھینک دیا جائے۔" عدالت خان گرج دار آواز میں بولا۔

میں تلملا کر اٹھ بیٹھا۔ دوستوں اور دشمنوں کے وار میں یہی فرق ہوتا ہے۔ دشمنوں کے پتھر بھی کچھ نہیں بگاڑ پاتے جبکہ دوستوں کے پھینکے ہوئے پھول سے بھی چوٹ لگ جاتی ہے۔ مجھے عدالت خان سے ایسی امید نہیں تھی۔ وہ میرے باپ کا دوست تھا لیکن یہاں اس نے روایت پر برسوں پرانی دوستی کو بھی قربان کر دیا تھا۔

"یہ... یہ تم کہہ رہے ہو...؟" میں نے عدالت خان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

میری آواز سنتے ہی گاؤں والے دوبارہ شور مچانے لگے عدالت خان بجلی کی سی تیزی سے آگے بڑھا اور اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھ سکتا اس نے میرے گال پر ایک طمانچہ رسید کر دیا۔

عدالت خان کے بھاری بھرکم ہاتھ نے میری گردن گھما دی۔ میں نے ایسی توہین کبھی برداشت نہیں کی تھی۔ میرا خون کھول اٹھا۔ احترام اور عزت کے سارے بت پامال ہو گئے۔

میں ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔

اس سے پہلے کہ میں کچھ کرتا۔ عدالت خان غرایا۔ "اسے پکڑ کر عقوبت خانے میں بند کر دو۔ کل اس کا فیصلہ ہو جائے گا۔"

گاؤں والوں نے مجھے عدالت خان کے قریب پہنچنے ہی نہیں دیا تھا۔ نہ جانے کتنے ہاتھ میرے راستے میں حائل ہو گئے تھے۔

وہ مجھے کھینچتے ہوئے گاؤں کی گلیوں سے گزر کر عقوبت خانے تک لے گئے۔ جہاں مجھے قید کر دیا گیا۔ غصے سے میرا برا حال تھا۔ میرے تن بدن میں آگ سی سلگ رہی تھی۔

جہاں مجھے قید کیا گیا تھا یہ صرف ایک کوٹھری تھی... تنگ و تاریک سی... جس میں بستر کے نام پر چار سوکھی گھاس پھوس بچھی ہوئی تھی۔ اس کوٹھری میں کوئی روشن دان نہیں تھا۔ کوئی کھڑکی

تھی۔ سوائے سلاخوں والے ایک دروازے کے جس کے ذریعے مجھے اندر پھینک دیا گیا تھا۔ اندر پھینکنے سے پہلے انہوں نے خوب اچھی طرح میری تلاشی لی تھی۔ میری جیب میں صرف ایک گولی تھی جسے ان لوگوں نے نہ جانے کیسے نظرانداز کر دیا تھا... اور گولی بھی کسی کی نشانی تھی۔

میں غصے کو کم کرنے کے لیے کوٹھری کی دیوار سے ٹیک لگا کر گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ ایسے موقعوں پر جوش سے زیادہ ہوش سے کام لینا چاہیے۔ غلطی خود میں نے ہی کی تھی۔ مجھے اتنی آسانی سے خود کو ان لوگوں کے حوالے نہیں کرنا چاہیے تھا۔ یہ لوگ تو اُجڈ اور وحشی تھے۔ ان کے نزدیک کسی احسان کی شاید کوئی قیمت نہیں تھی۔ جب عدالت خان جیسا آدمی ہی آنکھیں بدل لے تو اور کس پر کیا الزام عاید کیا جا سکتا ہے؟

مجھے کوٹھری میں دھکیل کر اور کوٹھری کے دروازے کو مضبوطی سے بند کرنے کے بعد وہ لوگ جیسے میری طرف سے بالکل بے نیاز ہو گئے... مجھے بھول گئے گویا میرا وجود ان کے لیے کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتا تھا۔ وقت بھی کیسے کیسے کرشمے دکھاتا ہے کل تک میں ان کے لیے باعث صد احترام تھا... لیکن آج...؟

میں دیر تک دیوار کے ساتھ بیٹھا رہا۔ میرا پورا جسم کسی پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ مجھے وقت گزرنے کا کوئی احساس نہیں تھا۔ اس کوٹھری میں تو ویسے ہی اندھیرا تھا۔ میرے ذہن میں نجات کی بھی کوئی ترکیب نہیں تھی۔ مجھے دروازے کی سلاخوں کی مضبوطی کا اندازہ تھا۔ اس وقت میں اگر کچھ کرنا بھی چاہتا تو ناکام ہی رہتا۔ اس کے علاوہ مجھ میں کچھ کرنے کی ہمت بھی تو نہیں تھی۔ میں نے اپنی بساط بھر بہت کچھ کر لیا تھا اور اب تھوڑا سا کام حالات کے سپرد بھی کرنا چاہیے تھا۔

مجھ سے کسی نے کھانے پینے کے لیے بھی نہیں پوچھا۔ کوٹھری سے باہر کسی کے قدموں کی آواز بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میں اُسے آواز دے کر اپنی طرف متوجہ کر سکتا۔

...پھر نہ جانے رات کے کس پہر آہٹ ابھری۔

کوئی شخص کوٹھری کی طرف آ رہا تھا۔

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ جوں ہی کوئی کوٹھری کے اندر آیا۔ میں اس پر ٹوٹ پڑوں گا۔

دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔

میں نے سانس روک لی اور حملہ کرنے کے لیے تیار ہو گیا ...پھر دروازہ کھلا اور ایک جانی پہچانی آواز آئی۔ "شاہیار... شاہیار خان" یہ عدالت خان کی آواز تھی۔ میں نے ہونٹ بھینچ لیے اور عدالت خان پر ٹوٹ پڑا۔

"کیا کر رہے ہو احمق..." وہ غصے سے بولا۔ "میں عدالت خان ہوں..."

"ہاں میں جانتا ہوں۔" میں نے پھنکار کر کہا۔ "میں نے تمہیں اچھی طرح پہچان لیا ہے۔"

"کیا تم پاگل ہو گئے ہو شاہیار؟" اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ میں اُسے چھوڑ کر ایک قدم پیچھے ہٹ آیا۔

"اب یہاں کیا لینے آئے ہو؟" میں نے کہا۔ "کیا صبح سے پہلے ہی ندی میں پھینکنے کا ارادہ ہے؟"

"احمقانہ باتیں مت کرو۔" وہ غصے سے بولا۔ "تم نے یہ نہیں دیکھا کہ اگر میں اس وقت تمہیں گاؤں والوں سے نہ بچاتا تو بپھرے ہوئے لوگ تمہیں ہلاک کر دیتے۔"

میری آنکھوں کے سامنے چھائی ہوئی دھند یک لخت چھٹ گئی۔

عدالت خان کا کہنا درست تھا۔ اس وقت میں واقعی بستی والوں کے رحم و کرم پر تھا۔ اگر عدالت خان کو وہاں پہنچنے میں دیر ہو جاتی تو میرا نہ جانے کیا حشر ہوتا۔

"بیٹے۔ تم نے شاید مجھے غلط سمجھا ہے... میں تمہارا دشمن نہیں ہوں۔ میں نے تمہیں بیٹا کہا ہے۔ تم میرے مرحوم دوست کی نشانی ہو۔ گاؤں کے لوگ میری بے پناہ عزت کرتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ یہاں میری مرضی کے خلاف کچھ بھی نہیں ہو سکتا لیکن ہر بات کی ایک حد ہوتی ہے۔ میں بھی حد سے تجاوز نہیں کر سکتا۔ تمہیں شاید اس بات کا اندازہ نہیں کہ بستی والوں کے نزدیک ان کی روایات اور ان کے اصول کتنی اہمیت رکھتے ہیں۔ اگر میں تمہیں رہا کرنے کی بات کرتا تو وہ لوگ شاید میری بات بھی نہ مانتے۔"

"مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کو غلط سمجھا۔" میں نے ندامت سے کہا۔

"ان حالات میں تم اس کے علاوہ کچھ سمجھ بھی نہیں سکتے تھے۔"

"تو اب وہ صبح ندی میں پھینکنے والی بات تو نہیں ہو گی نا؟" میں نے مسکرا کر پوچھا۔

"وہ تو مجبوری ہے شاہیار۔"

"کیا مطلب؟" میں نے بے ساختہ کہا۔

"ہاں۔" عدالت خان نے ایک گہری سانس لی۔ "شاید یہ میری اور تمہاری آخری ملاقات ہے۔ تم نے ہم لوگوں کے لیے جو کچھ کیا ہے میں اس کا ہمیشہ ممنون رہوں گا لیکن اس نے یہ عمل دانستہ

ہوگا۔ بعض حالات میں اپنے محسنوں کے ساتھ بھی کڑوا سلوک کرنا پڑ جاتا ہے۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ کل مجھے ہر حال میں مرنا ہے۔"

میرا لہجہ زہر آلود ہو گیا۔

"ضروری نہیں۔"

"صاف صاف کہیں کیا بات ہے۔"

"دیکھو شالیار۔ کل تمہیں بوری میں بند کر کے ندی میں پھینک دیا جائے گا لیکن تم بوری کو چیر کر باہر آ سکتے ہو..."

"وہ کس طرح؟"

"میں تمہارے لیے ایک خنجر لیتا آیا ہوں۔ تم اس کی مدد سے بوری کو پھاڑ کر باہر آ سکتے ہو۔ تمہاری تلاشی لی جا چکی ہے۔ اب دوبارہ تلاشی نہیں لی جائے گی۔"

"اوہ" میں نے ایک گہری سانس لی۔

"تم نے فرینک کو ہلاک کر کے جو حماقت کی تھی اس کے نتیجے میں تم بچ کر نہیں نکل سکتے تھے۔ اس ترکیب کے ذریعے تم بوری سے باہر آ کر ندی میں ڈوبنے کی بجائے تیرتے ہوئے دور نکل سکتے ہو۔ تمہاری زندگی محفوظ رہ سکتی ہے۔ پھر بستی والے بھول جائیں گے کہ اس گاؤں میں کوئی شالیار خان بھی آیا تھا۔ ان کی روایتیں زندہ رہیں گی۔"

"اور شاید آپ بھی بھول جائیں گے۔ کیوں؟"

"کاش ایسا ہو سکتا۔" عدالت خان نے ایک گہری سانس لی۔

"خیر یہ لو... یہ خنجر..."

اندھیرے کے باوجود چمکتا ہوا خنجر مجھے نظر آ گیا۔ میں نے اسے عدالت خان کے ہاتھ سے لے لیا۔

"آپ یہاں آئے کس طرح؟" میں نے عدالت خان سے پوچھا۔

"بہت دیر کے بعد تمہیں میری پریشانی کا خیال آیا۔"

"میں آپ سے شرمندگی کا اظہار کر چکا ہوں۔"

"یہ مت پوچھو۔ بس اتنا سمجھ لو کہ مجھے اپنے کچھ ذاتی سوتوں کی قربانی دینی پڑی ہے۔"

بہت دیر تک خاموشی رہی۔ ہم دونوں ہی کچھ نہ کچھ سوچ رہے تھے... پھر عدالت خان نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"میں جا رہا ہوں، شالیار، کیا جاتے ہوئے گلے نہیں لگو گے؟"

عدالت خان کے لوٹے ہوئے لہجے نے میرے اندر ہلچل مچا دی۔ میں بے اختیار آگے بڑھا اور بہت دیر تک ہم ایک دوسرے کے گلے لگے رہے۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے مجھے باپ کی شفقت دوبارہ حاصل ہو گئی ہو۔

عدالت خان کچھ دیر بعد واپس چلا گیا لیکن میں پتھر کی طرح بے حس کھڑا رہا... خالی خالی اور اُجاڑ سا... مجھ سے محبت کرنے والے دھیرے دھیرے مجھ سے جدا ہو رہے تھے... اور میں زندگی گزارنے کے لیے تنہا رہ گیا تھا۔

... لیکن نہیں، میں تنہا نہیں تھا۔

پھولوں جیسی ایک لڑکی میرا انتظار کر رہی تھی۔ نوگی۔

نوگی سے میں نے دس دن کے اندر لوٹ آنے کا وعدہ کیا تھا لیکن اب تک نہ جانے کتنے دس دن گزر گئے تھے۔ نہ جانے وہ کہاں ہو گی؟ کیا کر رہی ہو گی اور کس حال میں ہو گی؟ مجھے اس کی خاطر اپنی زندگی کو بچا کر رکھنا تھا۔ مجھے اس کے پاس واپس جانا تھا اور مجھے زندہ رہنا تھا۔

میں تیزی سے دروازے کی طرف لپکا لیکن سلاخ دار مضبوط دروازہ پہلے کی طرح بند ہو چکا تھا۔ نوگی کے خیال نے ایک بار پھر مجھ میں اتنی جرأت پیدا کر دی تھی کہ اگر وہ دروازہ کھلا ہوتا تو شاید میں اسی وقت مار دھاڑ کر کے بھاگ نکلتا لیکن اب مجھے اس لمحے کا انتظار کرنا تھا، جب وہ لوگ مجھے ندی میں پھینکنے آتے۔ اسی وقت کچھ کیا جا سکتا تھا۔

میں دوبارہ دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا... اور رات آنکھوں میں کاٹ دی۔

صبح چار آدمی مجھے لینے آئے۔ میری طرف تین رائفلیں اٹھی ہوئی تھیں اور چوتھا آدمی دروازے کے قریب کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑی سی بوری تھی۔

"چلو، کھڑے ہو جاؤ۔" ایک رائفل بردار نے حکم دیا۔

میں نے اپنے سر کو جھٹکا دیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

میرے اٹھتے ہی وہ تینوں کچھ پیچھے ہٹ گئے۔ انہیں شاید میری خونخواری کا اندازہ تھا اور وہ مجھے کوئی موقع نہیں دینا چاہتے تھے۔ دروازے پر کھڑے ہوئے آدمی نے بوری فرش پر رکھ دی۔

"چلو، اس میں گھس جاؤ۔" اس نے اشارہ کیا۔

میں نے ان کے چہروں کی طرف باری باری دیکھا۔ وہ مستعد ہونے کے ساتھ ساتھ مجھ سے خوف زدہ دکھائی دے رہے تھے۔ میری ذرا سی حرکت پر وہ گولیوں کی بوچھاڑ بھی کر سکتے تھے۔ میں عدالت خان کے قبیلے کے آدمیوں کو اچھی طرح جانتا تھا۔ یہ چاروں ان میں سے نہیں تھے۔ اس کے علاوہ یہ کوٹھری اتنی تنگ تھی کہ میں زیادہ جدوجہد بھی نہیں کر سکتا تھا۔ جوش اور بہادری کا کھیل ہر جگہ نہیں کھیلا جا سکتا۔ کبھی کبھی آدمی بے بس بھی ہو جاتا ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"جلدی کرو۔" دوسرا رائفل بردار گرج کر بولا۔

عدالت خان کے کہنے کے مطابق میری تلاشی نہیں لی جا رہی تھی۔ میں نے ایک گہری سانس لی اور بوری کے اندر گھس گیا۔ وہ بوری اتنی بڑی تھی کہ میں اس میں بہ آسانی سما گیا... پھر ان لوگوں نے بوری کا منہ بند کر دیا۔ مجھے اپنی بے بسی اور حالات کی ستم ظریفی پر ہنسی آ گئی۔ میں ایک جیتا جاگتا انسان تھا لیکن مجھے کاٹھ کباڑ کی طرح ایک بوری میں ٹھونس دیا گیا تھا۔

... پھر بوری کا اندھیرے میں ڈوبا ہوا سفر شروع ہو گیا۔ یہ میری زندگی کا ایک انوکھا سفر تھا۔ گھپ اندھیروں کا ایسا سفر جس میں میری ذات مفلوج ہو کر رہ گئی تھی۔

وقت کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب آدمی اپنے اطراف کے مناظر دیکھ رہا ہو۔ یہاں تو آنکھوں کے آگے بوری کی پٹی چڑھی ہوئی تھی۔ وقت، مقام اور فاصلہ مجھے ان تینوں میں سے کسی کا بھی اندازہ نہیں ہو سکا۔ البتہ کبھی کبھی پتھر لڑھکنے کی آواز یہ ظاہر کرتی تھی کہ مجھے سنگلاخ چٹانوں کی طرف لے جایا جا رہا ہے جن کے دامن میں وہ ندی تھی جس پر وادی خوف کی زندگی کا دارومدار تھا۔

قدموں کے سوا کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ مجھے اٹھا کر چلنے والوں نے اپنے لبوں کو سی لیا تھا۔ جب ایک شخص میرا بوجھ اٹھائے اٹھائے تھک جاتا تو پھر اس بوری کو بڑی بے دردی کے ساتھ پھینک دیا جاتا۔ میرے زخموں میں نئی ٹیسوں کا اضافہ ہو جاتا... پھر گہری گہری سانسیں لی جاتیں۔ مجھے برا بھلا کہا جاتا اور اس کے بعد میرا بوجھ کسی اور کے شانے پر منتقل ہو جاتا۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ موت کے اس سفر میں کتنے لوگ شریک تھے۔ وہی چار تھے یا ان کے ساتھ اور بھی لوگ شامل ہو گئے تھے؟

نہ جانے کتنی دیر بعد یہ سفر ختم ہوا۔ میں نے سختی سے ہونٹوں کو بھینچ لیا اور اس لمحے کا انتظار کرنے لگا جب مجھے موت سے زندگی کی جنگ کو ایک بار پھر جیتنا تھا۔

تھوڑی دیر بعد بوری کو جھلایا جانے لگا۔ بیک وقت کئی آدمی اس بوری کو آگے پیچھے جھلا رہے تھے۔ میں نے سانس روک لی اور اس کے ساتھ ہی فضا میں معلق ہو گیا۔ بوری کو پہاڑی کی چوٹی سے نیچے ندی میں پھینک دیا گیا تھا۔

میں نے خنجر نکال لیا... میرا ارادہ تھا کہ نیچے گرنے سے پہلے ہی میں بوری کو خنجر سے پھاڑ دوں اور ندی میں پانی کی سطح پر گرتے ہی بوری سے نکل آؤں لیکن میں توقع سے کہیں پہلے ہی ندی میں گر چکا تھا۔ چھپاک کی آواز کے ساتھ ہی میرے بدن کو شدید دھکا لگا اور میں پانی میں اترتا چلا گیا۔

میری زندگی کا انحصار اس بات پر تھا کہ میں کتنی پھرتی اور مہارت کے ساتھ بوری کو کاٹنے میں کامیاب ہوتا ہوں۔

بوری کاٹنے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ میں نے بوری سے باہر آ کر خنجر دانتوں میں دبایا اور پانی کے نیچے نیچے ایک طرف تیرنا شروع کر دیا۔ میں تیرتا ہوا بہت دور نکل جانا چاہتا تھا۔

ندی کا پانی بے حد سرد تھا۔ میرا بدن سن ہو کر رہ گیا... میں نہ جانے کتنی دیر تک تیرتا رہا... پھر کچھ دور نکل آنے کے بعد میں نے سطح پر سر ابھارا۔ میں اس جگہ سے کافی دور نکل آیا تھا جہاں مجھے پھینکا گیا تھا۔ اب مجھ میں مزید تیرنے کی ہمت نہیں رہی تھی۔ میں ہاتھ پاؤں چلاتا ہوا کنارے پر آیا اور ندی کے کنارے لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔

اسی حالت میں نہ جانے کب مجھے نیند آ گئی۔

غالباً میں وہاں دن بھر پڑا سوتا رہا تھا۔ جب میری آنکھ کھلی تو سورج مغرب میں روپوش ہو رہا تھا اور میں بے پناہ نقاہت محسوس کر رہا تھا۔ میں اپنے زخمی بدن، ٹکڑے ٹکڑے لباس اور بڑھی ہوئی داڑھی کی وجہ سے پتھروں کے دور کا کوئی انسان ہی دکھائی دے رہا ہوں گا...

مجھے نہیں معلوم تھا کہ نزدیک ترین ایسی بستی تک جہاں کھانا مل سکتا ہو، میں پہنچنے میں کس طرح کامیاب ہو سکتا ہوں۔ مجھے کچھ کھائے پیے بہت دیر ہو گئی تھی۔

میں بہ مشکل اٹھا اور دھیرے دھیرے ایک طرف چل پڑا۔

اس ہیئت کذائی میں جو بھی مجھے دیکھ لیتا وہ یا تو خوف زدہ ہو کر بھاگ لیتا یا پھر مجھے ہلاک کرنے کی کوشش کرتا۔ میں اب وادی خوف سے نکل کر اس طرف جانا چاہتا تھا جہاں نوگی ایک غار میں میرا انتظار کر رہی تھی۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ جگہ کئی دنوں کی مسافت پر ہے اور میرے پاس کوئی سواری بھی نہیں تھی لیکن مجھے بہر حال وہاں پہنچنا تھا۔ ہر طرف ویرانی تھی... ویرانی اور سناٹا... اور اس ویرانے میں سوائے چٹانوں اور پتھروں کے کچھ بھی نہیں تھا۔

رات دھیرے دھیرے زمین پر اتر رہی تھی اور راستہ معدوم ہوتا جا رہا تھا۔ مجھے رات ہونے سے پہلے غذا اور قیام کا بندوبست کرنا تھا لیکن سوال یہ تھا کہ یہ دونوں ضرورتیں کہاں سے پوری ہوتیں؟

— پھر جیسے اندھیرے میں کوئی کرن چمک جائے تو میلوں دور سے نظر آ جاتی ہے، بالکل اسی طرح وہ چھوٹا سا جھونپڑا بھی اندھیرے میں روشنی کی کرن بن کر نمودار ہو گیا۔ یہ جھونپڑا چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کے دامن میں تھا۔ اس کی کھڑکی کے راستے چراغ کی ہلکی روشنی باہر آ رہی تھی۔

میں آہستہ آہستہ اس جھونپڑے کی طرف بڑھا اور خنجر کو دائیں

ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑ لیا۔

جھونپڑے کا دروازہ بند تھا اور اندر سے کسی کی آواز نہیں آرہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ یا تو اس جھونپڑے کے مکین سو رہے تھے یا پھر کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ میں نے کچھ سوچ کر دروازے پر دستک دی۔

دستک کا جواب کسی نے نہیں دیا۔ میں نے دروازے کو دھکا دیا تو وہ ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ کھل گیا۔

میں نے چند لمحے تک اندر سے کسی ردِ عمل کا انتظار کیا لیکن جب کوئی آہٹ سنائی نہ دی تو میں جھونپڑے میں داخل ہو گیا۔

جھونپڑے میں کوئی نہیں تھا... لیکن چراغ کی لو بتا رہی تھی کہ اس جھونپڑے میں کوئی رہتا ضرور ہے جو شاید حوائجِ ضروریہ کے تحت باہر گیا ہوگا۔ وہ کسی بھی لمحے واپس آسکتا تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔

جھونپڑے میں سامان نام کی گنتی کی چند چیزیں تھیں۔ استعمال کی زیادہ تر چیزیں ہاتھ سے بنی ہوئی تھیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا گویا اس جھونپڑے میں رہنے والا، مہذب بستیوں سے الگ تھلگ اپنی زندگی گزارنے کا عادی ہو۔

جھونپڑے میں ایک پرانا صندوق تھا۔ میں نے اسے کھول کر دیکھا تو خوشی سے جھوم اٹھا۔ اس میں مردانہ کپڑوں کا ایک جوڑا اور ایک رائفل موجود تھی۔ فالتو کارتوس بھی نظر آرہے تھے۔

یہ جھونپڑا اب چاہے کسی کا بھی رہا ہو۔ میرے دو مسئلے بیک وقت حل ہو گئے تھے۔ یعنی لباس اور رائفل... اب مجھے اپنی ناتوانی حل کرنے کے لیے غذا کی ضرورت تھی۔

سوکھے گوشت کے ٹکڑے اور بھنی ہوئی مکئی مجھے طاقچے کے نیچے مل گئی۔ پانی کا برتن اور یہ سامان اٹھا کر میں نے دل ہی دل میں اس شخص کو دعائیں دیں جس نے مجھ جیسے بے خانماں شخص کے لیے راستے میں ایک جھونپڑا بنا کر غذا، لباس اور اسلحے کا بندوبست کر دیا تھا۔ پھر میں باہر جانے کے لیے دروازے کی طرف بڑھا ہی تھا کہ مجھے ٹھٹک جانا پڑا۔

باہر کہیں سے کتے کے بھونکنے کی آواز آرہی تھی۔ جھونپڑے کا مکین لوٹ آیا تھا۔ میری حیثیت اس وقت ایک چور جیسی تھی... میں بہ آسانی اس سے نمٹ سکتا تھا لیکن کوئی خطرہ مول لیے بغیر میں جلدی سے پلٹا اور چراغ بجھا کر کھڑکی سے باہر کود گیا۔

باہر کودتے ہی میں نے دروازہ کھلنے کی آواز سنی تھی۔ میں نے پلٹ کر نہیں دیکھا اور بے تحاشہ ایک طرف دوڑتا چلا گیا۔

...پھر ایک دھماکا ہوا اور گولی میرے سر کے اوپر سے سنسناتی ہوئی گزر گئی۔ میں فوراً ہی زمین پر گر پڑا۔ نہ جانے کیوں مجھے غصہ نہیں آیا بلکہ میں مسکرا دیا تھا۔ اس نامعلوم شخص کو مجھ پر گولی چلانے کا حق حاصل تھا کیونکہ میں نے اس کی تنہائی میں خلل ڈالا تھا۔ اس کے جھونپڑے میں گھس کر چوری کی تھی۔ جنگلوں کے قانون کے تحت وہ مجھے ہلاک کرنے کا حق رکھتا تھا۔

...لیکن اس کی گولیاں مجھے ہلاک نہ کر سکیں۔ میں جب تک دوڑ رہا تھا، اندھیرے کے باوجود اس شخص کو دکھائی دے رہا تھا لیکن زمین پر گرنے کے بعد میں خود بھی اندھیرے کا ایک حصہ بن گیا تھا۔ اس لیے میرا نشانہ لینا ممکن نہیں رہا تھا۔ میری توقع کے مطابق گولیوں کی بوچھاڑ جلد ہی ختم ہو گئی۔ گولیاں چلانے والا اپنی بے سود کوشش کا نتیجہ سمجھ چکا تھا۔

میں بہت دیر تک زمین پر پڑا رہا۔ فوراً ہی کھڑے ہو جانے میں بھی خطرہ تھا۔ اس کے بعد میں اطمینان سے اٹھا اور آہستہ آہستہ ایک طرف چل دیا۔ اب مسئلہ شب بسری کا تھا۔ قدرت نے باقی چیزیں فراہم کر دی تھیں اور شب بسری کے لیے بھی مجھے زیادہ تگ و دو نہیں کرنا پڑی۔ ایک پہاڑی غار نے رات بھر کے لیے مجھے اپنی آغوش میں پناہ دے دی۔

میں مسلسل سفر کرتا رہا۔ آبادیوں اور بستیوں سے گزرے بغیر... سنگلاخ چٹانوں اور بے آب و گیاہ راستوں پر میرا سفر جاری رہا... میں دن بھر چلتا رہتا اور رات گزارنے کے لیے کسی درخت کی مضبوط شاخ یا کسی پہاڑی غار کا انتخاب کر لیتا۔ میرا سفر اسی سمت میں تھا جہاں میں نے نوگی کو چھوڑا تھا۔

نوگی کی طرف یہ سفر، زندگی کا سفر تھا۔ میری زندگی اب اسی کے نام سے وابستہ تھی۔ انسان کے سامنے جب تک مقاصد رہتے ہیں، اس کے بدن کو تھکن اور مایوسی نہیں گھیرتی... پہلے میرا مقصد پالوش کے قاتلوں کو تڑپا تڑپا کر ہلاک کرنا تھا۔ اس کے لیے میرے جذبے جوان رہے۔ میرے بازوؤں کی مچھلیاں تڑپتی رہیں... اب نوگی میری منزل تھی اور میں اسی منزل کی طرف سفر کر رہا تھا۔ میرے تلوے زخمی ہو کر چھٹ چکے تھے اور لباس ایک بار پھر تار تار ہو گیا تھا۔ میرے جسم کی کھال سیاہ پڑ گئی تھی... لیکن میں چل رہا تھا... مسلسل چل رہا تھا۔

بالآخر نہ جانے کتنے دنوں اور راتوں کی مسافت کے بعد میں وہاں پہنچ گیا، جہاں نوگی تھی۔ یوں کہنا چاہیے کہ اس غار تک پہنچ گیا جہاں میں نے نوگی سے ملنے کا وعدہ کیا تھا... لیکن نوگی وہاں نہیں تھی۔

غار خالی تھا۔

مجھ پر دیوانگی سی طاری ہونے لگی۔

میں نے غار کی پتھریلی دیواروں سے سر ٹکرا دیا۔ بلبلا بلبلا کر نوگی کو آوازیں دیں لیکن بے رحم چٹانیں میری ہی صداؤں کو میری طرف

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لوٹاتی رہیں۔ نوگی نے میری پکار کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ قرب و جوار میں کہیں موجود نہیں تھی... یا پھر شاید... میں اس سے زیادہ نہ سوچ سکا۔ اور نڈھال ہو کر غار کے پتھریلے فرش پر گر گیا۔

میرے حوصلے دوبارہ ٹوٹنے لگے۔ زندہ رہنے کی وہ خواہش جو نوگی کے تصور سے دوبارہ بیدار ہو گئی تھی، دھیرے دھیرے دم توڑنے لگی۔ میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ اب اسی غار میں رہ کر نوگی کا انتظار کروں گا... چاہے مجھے زندگی بھر انتظار کرنا پڑے۔ اس نے بھی تو اسی غار میں میرا انتظار کیا ہوگا؟ کیا میں ایسا نہیں کر سکتا؟

وہ رات اسی طرح گزر گئی۔ میں ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سو سکا تھا۔ ہر لمحے یہی گمان ہوتا تھا، شاید اب نوگی آنے والی ہو... لیکن خواہشیں اور امیدیں اتنی آسانی سے بار آور نہیں ہوتیں۔ دوسرے روز کا سورج بھی اپنے ساتھ نوگی کی کوئی خبر نہیں لایا تھا۔

میں یہ سوچ سوچ کر ہلکان ہو رہا تھا کہ وہ کہیں مجھے بے وفا سمجھ کر چلی نہ گئی ہو۔

میں نے سوچا کہ فوجی کیمپ جا کر اس کا پتا چلاؤں... لیکن وہاں جانا موت کے منہ میں جانے کے مترادف تھا۔

اچانک مجھے ایک نسوانی چیخ سنائی دی۔

میں اچھل پڑا۔ فوراً ہی میرا ہاتھ رائفل پر جم گیا۔

نہ جانے اس چیخ میں کون سا اثر تھا کہ اس نے میری روح تک کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ میری دھڑکنیں تیز ہو گئیں اور میں بے چینی سے غار کے دہانے کی طرف دوڑ پڑا۔

غار سے کچھ فاصلے پر میں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔

وہ ایک لڑکی تھی جس کا چہرہ گرد و غبار سے اٹا ہوا تھا۔ اس کے بال الجھے ہوئے تھے اور لباس تار تار تھا۔ وہ دیوانہ وار دوڑ رہی تھی۔ اس کے پیچھے ایک گھڑسوار تھا۔

گھڑسوار پر نگاہ پڑتے ہی میری بھنویں تن گئیں۔

وہ ایک انگریز فوجی تھا۔

لڑکی کے بارے میں، میں کوئی اندازہ نہیں لگا سکا کہ وہ کون بدنصیب ہے اور اس ویرانے میں کہاں سے بھٹکتی ہوئی آپہنچی ہے۔ ان دونوں میں چوہے اور بلی جیسا کھیل ہو رہا تھا جسے میں چند لمحوں سے زیادہ نہ دیکھ سکا۔

لڑکی گھوڑے کی زد سے بچنے کے لیے زمین پر گر کر لڑھکنیاں کھاتی... پھر اٹھ کھڑی ہوتی۔ وہ اس انگریز فوجی سے بمشکل خود کو بچا رہی تھی۔ لڑکی کے ہاتھ میں ایک تھیلا تھا۔ جو اس بھاگ دوڑ میں اس کے ہاتھ سے گر گیا۔

ایک بار اس نے گر کر اٹھنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکی، اس لمحے گھوڑا اس کے سر پر پہنچ گیا۔ وہ نڈھال تھی اور شاید اس کے اعصاب جواب دے گئے تھے۔

انگریز فوجی گھوڑے سے کود گیا۔

میں نے رائفل کی نال اٹھائی اور فائر کر دیا۔

گولی اس کی کھوپڑی پر لگی اور اسے چیتھڑوں میں تبدیل کرتی ہوئی نکل گئی... گولی کی آواز نے لڑکی پر بھی اثر کیا۔ وہ اچھل کر کھڑی ہو گئی اور تیزی سے ایک چٹان کی آڑ میں چلی گئی۔

میں نے چند لمحوں تک فوجی کی لاش کو دیکھا... پھر لپک کر گھوڑے کی لگام تھام لی... گھوڑا ایک درخت سے باندھ کر میں اس چٹان کی طرف بڑھا جس کی اوٹ میں وہ لڑکی چھپ گئی تھی۔

لڑکی کی آنکھیں دھنسی ہوئی تھیں۔

دونوں گال پچک گئے تھے اور تار تار لباس سے جھانکتے ہوئے اس کے جسم میں ذرا بھی شادابی نہیں تھی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ آخر اس لڑکی میں ایسی کیا خاص بات تھی کہ وہ احمق گھڑسوار اس کے پیچھے پڑ گیا تھا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی منہ چھپا کر سسکیاں بھرنے لگی۔

"تم کون ہو، لڑکی؟" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

اس نے چونک کر نگاہ اٹھائی۔

اس کی آنکھوں کی ویرانی دیکھ کر میں کانپ گیا۔

...پھر نہ جانے کیا ہوا... وہ دوڑتی ہوئی میری طرف آئی اور میرے گلے کا ہار ہو گئی۔ اس کے دونوں بازو میری گردن میں حمائل ہو گئے تھے۔

"شالیار... تم... تم کہاں چلے گئے تھے؟" اس کے خشک سے ہونٹوں سے بمشکل آواز نکلی اور پھر اس کی پلکیں پھڑپھڑانے لگیں... اگلے ہی لمحے اس کا بے ہوش جسم میری گردن میں جھول گیا۔ اگر میں نے جلدی سے اسے جکڑ نہ لیا ہوتا تو وہ یقیناً گر جاتی۔

میں نے اسے پہچان لیا... وہ نوگی تھی... میری اپنی نوگی... جس کی خاطر میں نے دوبارہ زندگی سے محبت کی تھی۔ وہ حسن و شباب کا شہکار تھی لیکن غموں نے اسے اس حال کو پہنچا دیا تھا۔ وہ اپنی عمر سے تقریباً بیس برس زیادہ کی دکھائی دے رہی تھی۔

میں اسے اٹھا کر غار میں لے آیا۔

اس کی حالت دیکھ کر میرا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ وفا کی اس دیوی نے میرے انتظار میں بے حد کٹھن دن گزارے تھے...

لیکن اسے کیا معلوم کہ میں نے کیسی کیسی قیامتوں کا سامنا کیا ہے۔

نوگی ہوش میں آگئی تو وہ رات مجھے اس کو سمیٹتے، اُسے تسلی دیتے اور اس کی کہانی سنتے ہوئے گزر گئی۔ وہ بار بار رونے لگتی اور مجھ کو یوں بھینچ لیتی جیسے وہ مجھے دوبارہ کھو دینے کے خیال ہی سے دہشت زدہ ہو۔

اس نے مجھے بتایا کہ میرے جانے کے بعد اس نے بڑے کٹھن اور پریشان کن دن گزارے۔ دس دن تو جیسے تیسے گزر گئے لیکن اس کے بعد کا ہر لمحہ قیامت ہو گیا۔ وہ میری طرف سے مایوس نہیں تھی۔ اُسے یقین تھا کہ میں کبھی نہ کبھی ضرور واپس آؤں گا کیونکہ میں نے واپس آنے کا وعدہ کیا تھا۔ بس وہ اسی اُمید پر زندہ رہی۔

... پھر اُسے رفتہ رفتہ دنوں کا شمار بھی بھولتا گیا۔

وہ سورج نکلنے پر بیدار ہوتی۔ دن بھر اپنے لیے اِدھر اُدھر سے غذا اور پانی فراہم کرتی اور شام ہوتے ہی غار میں آجاتی ...

لیکن آج اس گھڑسوار نے اُسے دیکھ لیا اور اس کے پیچھے پڑ گیا۔ اگر میں عین وقت پر اس کی مدد کے لیے نہ پہنچ جاتا تو نہ جانے اس کا کیا حال ہوتا۔

اس کے رخساروں پر آنسو پھیل گئے۔

میں نے اسے بھینچ لیا۔

"اب میں تمہیں چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا، جان۔" میں نے جذبات سے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "میں تمہارے پاس واپس آگیا ہوں۔"

نوگی نے عہدِ وفا جس انداز میں نبھایا تھا اس کی مثال ملنا مشکل تھی۔ اتنی وفا شعار لڑکیاں بھی بہت کم ہوتی ہوں گی۔ ایک غیر قوم اور غیر ملک کی لڑکی نے مجھ سے وفا کا پیمان باندھا ... اور اسے پورا کر دیا۔

... پھر میں نے اُسے اپنی کہانی سُنائی ... بڑی تفصیل کے ساتھ ... میری کہانی سُن کر یوں محسوس ہوا جیسے وہ اپنی تمام پریشانیاں بھول گئی ہو۔

ہم لوگوں نے وہاں تین چار دن مزید گزار دیے۔ اس دوران میں نے اپنی آئندہ زندگی کے بارے میں خوب غور کر لیا تھا۔ جس گورے نے نوگی کا پیچھا کیا تھا اس کا گھوڑا اب ہمارے قبضے میں تھا اور اس کی لاش کو ویرانے میں غذا کی تلاش میں مارے مارے پھرنے والے جانوروں نے ہڑپ کر لیا تھا۔ ہم نے ایک دوسرے کو زندگی کا احساس دلایا اور یہ سوچنے لگے کہ اب ہمارا اگلا قدم کیا ہونا چاہیے۔

یہ بات تو ظاہر تھی کہ ہم ساری زندگی اسی غار میں نہیں رہ سکتے تھے۔ ہمیں دوسروں کے ساتھ مل کر رہنا تھا۔ زندہ رہنے کے لیے کوئی بستی، کوئی قبیلہ ضرور ہونا چاہیے۔

میں نے نوگی کی یہ تجویز رد کر دی تھی کہ ہمیں لندن چلے جانا چاہیے، وہاں سے ہم امریکا جا سکتے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ میں انگریزوں جیسی گوری چمڑی کا مالک ہوں اس لیے وہاں آسانی سے گھل مل جاؤں گا۔ لیکن اپنا وطن اور اپنی سرزمین کسے پیاری نہیں ہوتی۔

مجھے اس قبیلے کا خیال آگیا جسے میں نے ڈاکوؤں سے بچایا تھا۔ وہ قبیلہ میرا احسان مند تھا۔ اگر ہم لوگ ان ہی کے ساتھ رہنے لگیں تو وہ اس بات کو اپنے لیے بہت بڑا اعزاز سمجھیں گے۔ میں نے جب اپنے اس خیال کا اظہار کیا تو نوگی نے تائید میں سر ہلا دیا۔ اس نے شاید یہ سوچ کر امریکا جانے کے لیے کہا تھا کہ شاید میں دشمنی کی وجہ سے اب یہاں نہیں رہ سکوں گا۔

کچھ دنوں کے بعد جب ہم دونوں کی حالت سنبھل گئی تو ہم نے اپنے سفر کا آغاز کر دیا۔ اس غار میں ہم نے پاس رکھا ہی کیا تھا جسے زادِ راہ کے طور پر لے جاتے۔ نوگی کا ایک تھیلا، پانی کا برتن اور ایک رائفل کے علاوہ ہمارے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔

... اور پھر ہم نے اسی گھوڑے پر سفر کیا جسے میں نے قابو میں کر لیا تھا۔ یہ راستے میرے دیکھے بھالے تھے ... لیکن میں جان بوجھ کر بستیوں سے کتراتا ہوا گزر رہا تھا۔ مجھے قبیلے تک پہنچنا تھا اور میں نوگی کی موجودگی میں کسی اُلجھن کا شکار نہیں ہونا چاہتا تھا۔

سفر کرتے کرتے ہلکان ہو جاتے تو گھوڑے کی پشت سے اتر کر زمین پر لیٹ جاتے اور گھوڑے کو آزاد چھوڑ دیتے۔ وہ بھی ہمارے اردگرد ہی گھومتا رہتا ... انسان کی طرح جانور بھی تو تنہا نہیں رہ سکتے۔ ہمارا سفر زیادہ تر جاری رہتا یا پھر ہم اس وقت گھوڑے کی پشت سے اترتے جب رات راستوں کو دھندلانے لگتی۔ ایسے میں بھی میں خود جاگتا رہتا اور نوگی کی آنکھوں کو نیند سے بھر دیتا۔

اس بیچاری نے میرے انتظار میں بے خوابی کی نہ جانے کتنی راتیں بسر کی تھیں۔

سفر چاہے کتنا ہی طویل اور پُرخطر کیوں نہ ہو، بالآخر ختم ہو ہی جاتا ہے۔ راستے ایک نہ ایک دن کسی مقام پر تھک کر ختم ہو ہی جاتے ہیں۔ یہی ہمارے ساتھ بھی ہوا ... لیکن یہ سفر ہم نے خود ختم نہیں کیا تھا بلکہ کسی انجانی سمت سے آتی ہوئی گولی نے ہماری پیش قدمی میں رخنہ ڈال دیا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گولی ہمارے گھوڑے کو لگی تھی اور وہ قلابازیاں کھاتا ہوا ایک طرف جا گرا تھا۔

مسلسل حادثات نے ہمیں اتنی مہارت تو دے ہی دی تھی کہ ہم خود کو بچا سکیں، لہٰذا ہم دونوں چھلانگ لگا کر ایک طرف ہٹ گئے اور گھوڑا ہمارے سامنے دم توڑنے لگا۔

ہم جس راستے سے گزر رہے تھے، وہ راستہ دونوں طرف سے جھاڑیوں میں گھرا ہوا تھا ... کانٹے دار جھاڑیاں جو صحرائی اور پہاڑی علاقوں میں بکثرت پائی جاتی ہیں ... گھوڑا کچھ دیر بعد ہی ساکت ہو گیا۔

کسی طاقتور رائفل کی طاقتور گولی نے گھوڑے کا کام تمام کیا تھا۔ ہم دونوں زمین سے چپکے لیٹے رہے۔ اس موقعے پر ذرا بھی کوتاہی ہمارے لیے پریشانی کا باعث بن سکتی تھی۔

... پھر اچانک کسی کے ہنسنے کی آواز نے مجھے بُری طرح بوکھلا دیا۔ آواز کسی لڑکی کی تھی۔

کچھ ہی دیر بعد وہ لڑکی بھی ایک طرف سے جھاڑیوں کو ہٹا کر ہنستی ہوئی سامنے آگئی۔

میں غصے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ نوگی بھی کھڑی ہو گئی۔

لڑکی ہمارے سامنے آ کر رک گئی۔ اس کے ایک ہاتھ میں رائفل تھی اور دوسرے ہاتھ میں لوہے کی ایک سلاخ ... اور اس سلاخ میں ایک زندہ گلہری پروئی ہوئی تھی جو اس وقت بھی تڑپ رہی تھی۔

لڑکی نے لباس بھی عجیب سا پہن رکھا تھا۔

وہ ایک مقامی لڑکی تھی لیکن انداز اور لباس سے وہ کوئی لڑکا لگ رہی تھی۔

"تم نے ہمارے گھوڑے کو کیوں ہلاک کیا ہے؟" میں نے غصے سے پوچھا۔

"اچھا ... گولی تمہارے گھوڑے کو لگ گئی؟" وہ اس طرح بولی جیسے اُسے اس بات کا علم نہ ہو ... پھر وہ دھیرے دھیرے چلتی ہوئی گھوڑے کے پاس گئی اور جھک کر اس کے مُردہ جسم پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

کچھ دیر بعد وہ دوبارہ ہمارے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ "مجھے افسوس ہے کہ گولی گھوڑے کو لگ گئی ... ویسے میں نے نشانہ تو تمہارا لیا تھا۔"

"کیا؟" میں نے حیرت اور غصے سے چیخ کر کہا۔ "اگر تم لڑکی نہ ہوتیں تو میں تمہیں ابھی اس بات کا مزا چکھا دیتا۔"

"لڑکی ...!" وہ ہنس پڑی۔ "تم مجھے لڑکی سمجھتے ہو۔ لڑکی تو تمہارے پاس کھڑی ہے ... سہمی سہمی سی ... مظلوم سی ..."

"خاموش رہو۔" نوگی نے اُسے ڈانٹ دیا۔

"دیکھا ..." اس نے میرے سامنے وہ سلاخ لہرائی جس میں گلہری کا جسم اب بھی تڑپ رہا تھا۔ "لڑکی ہونے کی یہی نشانی ہے ... بہت جلد بھڑک اُٹھنا ..."

"تم نے اس گلہری کو کیوں لٹکا رکھا ہے؟" میں نے اس پاگل لڑکی کی توجہ ہٹانے کے لیے پوچھا۔

"گلہریاں مجھے بہت پسند ہیں ..." اس نے ایک گہری سانس لی اور رائفل ایک طرف پھینک کر گلہری کے جسم پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ گلہری نے اب تڑپنا بند کر دیا تھا۔ غالباً وہ دم توڑ گئی تھی۔ میں اُلجھن سے اس کی طرف دیکھتا رہا ...

"تم نے جواب نہیں دیا ..." میں نے دوبارہ پوچھا۔

"دراصل میں گلہریوں سے دُور نہیں رہ سکتی۔" اس نے گلوگیر آواز میں کہا۔ "لیکن گلہریاں مجھ سے دُور بھاگتی ہیں۔"

"اور تم انھیں اس طرح اپنے سے قریب رکھتی ہو۔" میں نے غصے سے کہا۔

وہ جواباً خاموشی سے مجھے دیکھتی رہی ...

"تم کہاں رہتی ہو؟" میں نے اُسے پھر مخاطب کیا۔

"یہ سوال تو میں کرنا چاہتی تھی کہ تم ہمارے علاقے میں کیوں آئے ہو؟"

"زمین کسی کی ملکیت نہیں ... انسان اپنی مرضی سے اس پر جہاں جی چاہے جا سکتا ہے۔" میں نے پہلی بار مسکرا کر کہا۔

اس نے طنز بھرے انداز میں ہونٹ سکیڑے۔ "آدمی جوان ہو ... لیکن تم میں کسی بوڑھے کی رُوح حلول کر گئی ہے۔"

میں ہونٹ چبا کر رہ گیا۔ میں نے ایسی لڑکی پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ بہت ہی اُلجھے ہوئے کردار کی مالک دکھائی دیتی تھی ... یا پھر ممکن ہے پاگل ہی رہی ہو۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" لڑکی نے مجھے مخاطب کیا۔

"کیا کرو گی نام پوچھ کر؟"

"بس یُوں ہی ... مجھے ہر عجوبے کے بارے میں جاننے کا شوق ہے ... اور تم بھی ایسے ہی لگتے ہو۔"

میں اس کی اس بات پر کھول کر رہ گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کے ساتھ کیا سلوک کروں۔

"چلو شالیار ..." نوگی نے میرا بازو تھام کر کہا۔ "یہ لڑکی شاید پاگل ہے۔"

"ٹھہرو ..." لڑکی آگے بڑھ آئی۔ "تمہارا نام شالیار ہے ... شالیار خان؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"کیوں... کیا تم اس نام کے کسی شخص کو جانتی ہو؟"

"میں تو نہیں جانتی... البتہ میرا باپ تمھیں جانتا ہے۔"

"کون ہے تمھارا باپ؟"

"ایک قبیلے کا سردار... اس قبیلے کو ایک بار شاہیار خان نے ڈاکوؤں سے بچایا تھا۔"

"اوہ..." میں نے ایک گہری سانس لی۔ "ہاں میں وہی شاہیار خان ہوں۔ تمھارا باپ مجھے پہچان لے گا۔"

"تو پھر آؤ میرے ساتھ۔ میرا علاقہ اب تمھارا علاقہ ہے... لیکن یہ لڑکی تمھارے ساتھ نہیں جا سکتی۔"

"وہ کیوں؟" میں نے مسکرا کر پوچھا۔ منزل قریب دیکھ کر میں بے حد خوش تھا اس لیے لڑکی کی باتوں کا بُرا ماننے کی بجائے میں اس سے لطف اندوز ہونے لگا۔

"ہمارا قبیلہ صرف شاہیار خان سے واقف ہے۔ اس کے ساتھ آنے والی کسی لڑکی کو ہم نہیں جانتے۔"

"یہ بھی میرے ساتھ ہی جائے گی۔" میں نے سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے کہا۔

"اوہ... اتنا گہرا رشتہ ہے تم دونوں میں... خیر آؤ میرے ساتھ۔ اچھا ہوا کہ میری گولی نے تمھاری کھوپڑی نہیں اڑا دی۔ ورنہ ہمارا قبیلہ اپنے ایک محسن کی خدمت کرنے سے محروم ہو جاتا... جبکہ آج کل محسن قسم کے عجوبے ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتے۔ ہر زمانے میں اس قسم کے لوگوں کی زبردست مانگ رہی ہے۔"

وہ اسی طرح بولتی ہوئی آگے چلتی رہی اور ہم دونوں اس کے پیچھے چلتے رہے۔ وہاں سے کچھ فاصلے پر ایک وسیع میدان تھا اور اسی میدان میں وہ قبیلہ آباد تھا۔

"تمھارا نام کیا ہے لڑکی؟" میں نے پوچھا۔

"ریشم جان..." اس نے جواب دیا۔

"تمھارا نام تو لڑکیوں ہی جیسا ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن تمھاری حرکتیں بہت مختلف ہیں۔"

"مختلف ہونے ہی میں زندگی ہے شاہیار خان۔" اس نے فخر سے جواب دیا۔

میں نے اس دوران محسوس کیا کہ وہ ایک بار بھی نوگی سے مخاطب نہیں ہوئی بلکہ اس کا رویہ ایسا تھا جیسے نوگی وہاں سرے سے موجود ہی نہ ہو۔ ہو سکتا ہے نوگی نے بھی یہ محسوس کر لیا ہو کہ اُسے نظر انداز کیا جا رہا ہے لیکن اس نے زیادہ پروا نہیں کی... اور نہ ہی اس نے ریشم جان سے گفتگو کرنے کی کوشش کی تھی۔

ریشم جان اُسی طرح جھومتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی اور ہم اس کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔

... پھر ہم نے کچھ لوگوں کو دیکھا جو میدان کی طرف سے دوڑتے ہوئے ہماری طرف آ رہے تھے۔

"یہ لوگ میری خاطر آ رہے ہیں شاہیار خان۔" ریشم جان نے فخر سے بتایا۔

"مجھے معلوم ہے۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ "تمھیں جتانے کی ضرورت نہیں تھی۔"

"میں تمھیں اس لیے بتا رہی ہوں کہ یہ لوگ مجھے اتنی جلدی واپس آتے دیکھ کر بہت حیرت زدہ ہیں۔"

"کیا مطلب؟" میں اس کی بات سُن کر چونکے بغیر نہ رہ سکا۔

"میں جب بھی گھر سے نکل کر جاتی ہوں پانچ دنوں سے کم میں واپس نہیں آتی... لیکن آج تمھاری خاطر مجھے فوراً ہی واپس آنا پڑا ہے۔"

"تم گھر سے نکل کر کہاں جاتی ہو؟"

"شکار کھیلنے... تیتلیوں اور گلہریوں کا شکار... پورے قبیلے کو یہ بات معلوم ہے۔"

"کیا تمھارا باپ تمھیں روکتا نہیں ہے؟"

"کس بات پر؟" اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا۔ "تمھیں ایسے سوالات کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اگر تم میرے قبیلے کے محسن نہ ہوتے تو میں تمھیں ایسا جواب دیتی کہ زندگی بھر یاد رکھتے..."

میں نے اس مزاج کی لڑکی پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی جو اتنی درشت اور اکھڑ ہو۔ میں نے ہمیشہ محسوس کیا تھا کہ لڑکیاں مجھے دیکھتے ہی موم ہو جاتی ہیں لیکن یہ پہلی لڑکی تھی جو مجھ سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوئی تھی... بلکہ اپنی باتوں سے اس نے مجھے غصّہ دلا دیا تھا۔

قبیلے کے لوگوں نے ہمیں گھیر لیا۔ ایک شخص نے مجھے پہچان لیا اور "شاہیار..." کہتا ہوا مجھ سے لپٹ گیا۔

یہ اس قبیلے کا سردار اور ریشم جان کا باپ تھا۔

قبیلے والوں نے ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا... مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی تھی کہ وہ لوگ ابھی تک مجھے بھولے نہیں تھے...

گوری قبیلے کا یہ خاندان آج کل وہاں سے نقل مکانی کر کے اس میدانی علاقے میں آیا ہوا تھا۔ بوڑھے سردار اور اس کے ساتھیوں کے چہرے خوشی سے کھلے پڑ رہے تھے۔ انھیں شاید یہ یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ میں کبھی ان سے دوبارہ بھی مل سکتا ہوں۔

"تم، وادئ تورسے کب واپس آئے؟" بوڑھے سردار

قبیلے کی عورتوں نے اُسے ہاتھوں ہاتھ لیا تھا اور ہر وقت اس کی دلجوئی کرتی رہتی تھیں۔

... لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ اس دوران مجھے ریشم جان دوبارہ نظر نہیں آئی۔ ہو سکتا ہے وہ پھر چند دنوں کے لیے کہیں اور چلی گئی ہو۔ وہ ایک سیلانی فطرت کی لڑکی تھی اور سردار نے اُسے مکمل آزادی بھی دے رکھی تھی۔

کچھ دنوں کے بعد قبیلے میں میری اور نوگی کی شمولیت کی باقاعدہ رسم ادا کی گئی۔ یہ رسم کیا تھی۔ قبیلے والوں کا اجتماع تھا۔ درمیان میں آگ روشن کر کے تین بھیڑیں بھونی جا رہی تھیں اور قبیلے کے نوجوان قبائلی گیت گا رہے تھے۔ ایسے گیت جن میں بہادروں کے کارناموں کا ذکر تھا۔ پھر سردار نے کھڑے ہو کر قبیلے میں میری اور نوگی کی شمولیت کا اعلان کیا۔

قبیلے والوں نے فلک شگاف نعرے لگائے اور میرے سر پر ایک کُلاہ رکھ دی گئی۔

ریشم جان بھی اس دوران میرے قریب ہی رہی۔ وہ بے حد پُرجوش دکھائی دے رہی تھی اور بچوں کی طرح اُچھل اُچھل کر تالیاں بجا رہی تھی۔ اُسے دیکھ کر یہ احساس نہیں ہوتا تھا کہ چند روز پہلے وہ اتنے خطرناک رُوپ میں بھی رہی ہو گی۔

ریشم جان کی بچوں جیسی معصومیت کا تاثر زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکا۔ میں نے اس کا ایک ایسا رُوپ دیکھا جس نے مجھے حیرت زدہ کر دیا۔

میں صبح کے وقت بہت جلد اٹھ کر اپنے خیمے سے باہر آتا اور سیر کے لیے بہت دُور تک چلا جاتا۔ آس پاس کا منظر بہت اچھا تھا۔ ہرے بھرے درخت اور درختوں کے درمیان بہتی ہوئی ندی... قبیلے والوں نے یہی چیزیں دیکھ کر اس جگہ کا انتخاب کیا تھا ورنہ اور اجاڑ چٹانوں اور پہاڑوں کے درمیان یہ جگہ جنت سے کم نہیں تھی۔

ایک صبح میں حسبِ معمول جب سیر سے واپس آنے لگا تو میں نے ایک عورت کی چیخ سنی۔ یہ چیخ درختوں کے درمیان سے آئی تھی۔ میں نے اپنی رفتار تیز کر دی اور اندھا دھند درختوں میں گھستا چلا گیا۔ میں نے بہت دنوں بعد ایسی چیخ سنی تھی... درد سے بھری ہوئی... اس چیخ نے میری رگوں میں دوڑنے والے لہو کو ایک بار پھر گرما دیا تھا۔ سکون سے گزارے ہوئے دن اب گراں گزرنے لگے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے میں آہستہ آہستہ زنگ آلود ہوتا جا رہا ہوں۔

چیخ ایک بار پھر سنائی دی۔

اس بار آواز بہت قریب سے آئی تھی۔

نامور مصنف محمود احمد مودی
وہی تحریر اور وہی انداز
کے ساتھ 'اپنے چاہنے والوں
کے لئے ایک نئی سوغات لئے
بہروپ
خوبصورت
طباعت و
قیمت
مکتبہ القریش
سرکلر روڈ اردو بازار لاہور
7668958
Scanned By: Ali Azam

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نے پُوچھا۔

"چند روز ہُوئے..."

"لیکن تم تو کسی اور طرف سے آ رہے ہو۔" ریشم جان نے مداخلت کی تو سردار نے اُسے پیار سے ڈانٹ دیا... اور وہ کسمساتی ہوئی چلی گئی۔

"ناشم کیسا ہے؟" میں نے اس لڑکے کے بارے میں پُوچھا جس نے میری جان بچائی تھی۔ اگر اس روز وہ لڑکا میرے قریب موجود نہ ہوتا تو شاید میں آج ان سے یوں ہرگز نہ مل رہا ہوتا۔

میدان میں اُنہوں نے جو خیمے لگا رکھے تھے اُن میں سے عورتیں اور بچے بھی نکل کر ہمارے گرد جمع ہو گئے۔ سردار کی ضعیف ماں نے میری پیشانی چُومی اور نوگی کو محبت سے گلے لگا لیا۔

"یہ لڑکی کون ہے، شالیار؟" سردار کی ماں نے پُوچھا۔

"ہم دونوں ساتھی ہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "... زندگی کے ساتھی..."

وہ مُسکرانے لگی اور نوگی کو لے کر ایک خیمے میں چلی گئی۔

میں، سردار اور دوسرے لوگوں کے ساتھ ایک خیمے میں آ گیا۔ اُنہوں نے فوراً ہی ہماری خاطر تواضع شروع کر دی...

اور یوں ہی رات ہو گئی۔ رات کے وقت سردار کی رفاقت میں وقت گزارا تو اُس نے ایک بار پھر وادیٔ خوف کی مہم کے بارے میں پُوچھا۔

میں نے بڑی تفصیل سے سب کچھ بتا دیا۔

"تم نے واقعی شیروں کی طرح دن گزارے ہیں۔" سردار نے تعریف کی۔ "لیکن اس خطرناک مہم کا پس منظر کیا ہے؟"

میں نے اس سے کوئی بات نہیں چھپائی۔ پنوش اور اُس کے ساتھ پیش آنے والے حادثے کا ذکر کیا... اور نوگی کے بارے میں بھی سب کچھ بتا دیا۔

میں نے جس زندگی کا تصور کیا تھا وہ سردار کی مدد کے بغیر نہیں گزاری جا سکتی تھی۔ میں ہنگامہ کرتے کرتے بدحال ہو گیا تھا اور سکون کے دن گزارنا چاہتا تھا... اور جب تک پیروں تلے زمین اور سر پر کوئی چھت نہ ہو، زندگی اطمینان بخش نہیں ہُوا کرتی... اور یہ دونوں چیزیں مجھے اس قبیلے میں رہ کر حاصل ہو سکتی تھیں... اس کے علاوہ میں کہاں جا سکتا تھا؟

یہ لوگ بہت مُخلص تھے۔ وسیع سمندر کی طرح ان کے دل تھے۔ یہ لوگ اپنے مہمان... اور وہ بھی ایسے مہمان کے لیے جو اُن کا محسن بھی ہو، سب کچھ کر سکتے تھے۔ ان میں اتنا ظرف تھا کہ زندگی بھر کے لیے اپنے دروازے، میرے اور نوگی کے لیے کھلے رکھ سکتے تھے۔

میں نے بہت سوچ سمجھ کر ہی اِدھر کا رُخ کیا تھا۔

کہانی صرف سردار ہی نے نہیں سُنی تھی بلکہ قبیلے کے معتدد لوگ بھی اکٹھے ہو گئے تھے۔ قہوے کے دَور چلتے رہے اور میں انہیں اپنی کہانی سُناتا رہا... ہر واقعے پر اُن کی آنکھیں چمکنے لگتیں اور وہ میرے حوصلے کی داد دینے لگتے۔

پوری کہانی سُننے کے بعد سردار نے مجھے گلے سے لگا لیا... فرینک سے انتقام لے کر میں نے گویا ان سب کے جذبات کی بھی تسکین کر دی تھی۔ وہ ان گوروں سے بے حد متنفر تھے۔

"آج سے تم اسی قبیلے کے ایک فرد ہو۔" سردار نے میرا شانہ تھپک کر کہا۔

"میں تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں، سردار!"

"غیروں جیسی باتیں مت کیا کرو۔ یہ شکریہ وغیرہ فرنگیوں نے آ کر تمہیں سکھا دیا ہے۔ ورنہ ہم لوگ ان چیزوں سے بے نیاز تھے۔ ویسے اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟"

"میں تمہارے قبیلے پر بوجھ نہیں بنُوں گا، سردار! کچھ نہ کچھ کر کے اپنے دن گزار دوں گا۔"

"میں اس لڑکی کی بات کر رہا ہوں جسے تم اپنے ساتھ لائے ہو۔ وہ نامحرم ہے اور ہماری روایت کے مطابق تم دونوں ایک ہی خیمے میں نہیں رہ سکتے۔"

"میں اُس سے شادی کر لوں گا، سردار! اب میرے لیے یہی ایک خوشی رہ گئی ہے۔"

"بہت خوب!" سردار نے سر ہلایا۔ "بہت جلد تمہاری شادی کا بھی بندوبست ہو جائے گا۔"

سردار نے یہ بات کہہ تو دی تھی لیکن میں نے محسوس کیا جیسے وہ کچھ اُداس ہو گیا ہو۔ میں، سردار کی اُداسی کی وجہ سمجھ گیا تھا۔ اُس نے شاید اپنی بیٹی کے لیے مجھ سے کچھ توقعات وابستہ کر لی تھیں۔

وہ رات اور اس کے بعد کئی راتیں مجھے، سردار کے خیمے میں بسر کرنا پڑیں۔ نوگی سے میری ملاقات دن میں ہوتی تھی اور وہ بھی تھوڑی دیر کے لیے... میں یہ دیکھ کر خوش تھا کہ سکون کے لمحات نے اس کی صحت پر اچھا اثر ڈالا ہے۔

رفتہ رفتہ اس کا حُسن واپس آ رہا تھا۔ رنگ و رُوپ ایک بار پھر نکھرنے لگا تھا۔ غار میں گزارے ہوئے دنوں اور پریشانیوں نے اُسے تباہ کر دیا تھا۔ لیکن اب وہ پُرسکون ہو گئی تھی۔

میرے دائیں جانب درختوں کا ایک جھنڈ تھا۔ میں نے اپنا رُخ اسی طرف کر لیا... پھر اچانک مجھے ٹھٹک جانا پڑا۔

ایک بڑے سے درخت کے نیچے ایک نوجوان لیٹا ہوا تھا اس نے ستر پوشی کے لیے ایک کپڑا کمر پر لپیٹ رکھا تھا اور اس کے سینے پر چیونٹے رینگ رہے تھے۔ میں سُرخ رنگ کے ایسے چیونٹوں کے بارے میں جانتا تھا۔ یہ چیونٹے گوشت خور تھے۔

میں نے سمجھا کہ شاید چیونٹوں نے اُس شخص کے سینے کا گوشت کھا کھا کر وہاں خلا پیدا کر دیا ہوگا۔ لیکن ایسا نہیں تھا وہ زندہ تھا اور ہونٹوں کو سختی سے بھینچے ہوئے تھا۔

وہ کسی گھائل پرندے کی طرح بار بار تڑپ رہا تھا۔ مجھے اس بات پر حیرت تھی کہ آخر وہ اُٹھ کر بھاگ کیوں نہیں جاتا۔ وہ اپنے ہاتھوں کے ذریعے سینے پر رینگنے والے چیونٹوں کو بڑی آسانی سے بھگا سکتا تھا۔

میری آہٹ سن کر اس نے گردن گھمائی اور میری طرف دیکھا... پھر آنکھیں بند کر لیں۔

میں تیزی سے آگے بڑھا اور دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اُسے ایک جھٹکے سے کھڑا کر دیا۔ کچھ چیونٹے اس کے سینے سے پھسل کر نیچے گر گئے لیکن باقی چیونٹے سینے سے اسی طرح چمٹے رہے۔ میں نے ان کو بھی ہاتھوں کی مدد سے نیچے گرا دیا۔

یوں لگتا تھا جیسے اُسے اس مصیبت میں مبتلا ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ اس کے سینے کا گوشت سلامت تھا البتہ پورا سینہ سُرخ ہو رہا تھا۔

"کیا بات تھی؟" میں نے اُسے درخت سے ایک طرف ہٹاتے ہوئے پوچھا۔ "تم یہاں کیسے پھنس گئے تھے؟"

"شالیار خان... تم نے مجھے اُٹھا کیوں دیا؟" اس نے ناگواری سے کہا۔

"کیا مطلب؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔ "مجھے پہچانتے ہو؟"

"اچھی طرح۔" اس نے جواب دیا۔ "میں اسی قبیلے کا فرد ہوں جس سے تمہارا نیا نیا تعلق ہوا ہے۔"

"اوہ..." میں نے ایک گہری سانس لی۔ "لیکن آخر بات کیا ہے؟"

"تم نے بہت بُرا کیا، شالیار خان۔" اس نے کہا۔ "تم نے مجھے ریشم جان کے سامنے ذلیل کروا دیا۔"

"کیا...؟" میں اس کی بات سن کر حیرت زدہ ہو گیا۔ "کیا کہہ رہے ہو؟"

"یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔" ایک طرف سے ریشم جان کی آواز آئی۔ میں نے مُڑ کر دیکھا۔ ریشم جان کچھ فاصلے پر کھڑی تھی۔ وہ شاید اب تک کسی درخت کے پیچھے چھپی رہی تھی اور وہ بہت غصے میں دکھائی دے رہی تھی۔

"تم نے اسے اُٹھا کیوں دیا؟" اس نے غصے سے پوچھا۔

"دیکھتی نہیں، اس کی کیا حالت ہو رہی ہے؟" میں نے کہا۔

"ہُنہ..." وہ دو قدم آگے بڑھ آئی۔ "مجھے پہلے ہی پتا تھا کہ اسے تو بس کوئی بہانہ ہی ہاتھ آنا چاہیے..."

"نہیں... ریشم جان۔" نوجوان نے جلدی سے کہا۔ "اگر شالیار خان نہ آ جاتا تو میں..."

"بس اب تم جاؤ۔" ریشم جان نے اس کی بات کاٹ دی۔ "کچھ دنوں بعد ایک بار پھر تمہارا امتحان لیا جائے گا۔"

وہ شخص کچھ دیر تک ریشم جان کو دیکھتا رہا... پھر مجھ پر ایک نظر ڈالتا ہوا گھنے درختوں کے درمیان غائب ہو گیا۔

"یہ سب کیا چکر ہے ریشم جان؟" میری حیرت اب بھی برقرار تھی۔

"کچھ نہیں..." ریشم جان دھیرے سے ہنس دی۔

وہ ایک بار پھر معصوم دکھائی دینے لگی تھی۔ میں نے اتنی جلدی رنگ بدلنے والی لڑکی پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔

"پھر بھی اس نوجوان کو ہُوا کیا تھا؟" میں نے اصرار کیا۔

"یہ مجھ سے محبت کے دعوے کرتا ہے۔" ریشم جان نے کہا۔ "اور میں ہر دعوے دار کا اسی طرح امتحان لیا کرتی ہوں۔"

"کیا کہہ رہی ہو؟" میں آنکھیں پھاڑے اُسے دیکھتا رہ گیا۔ "تمہیں کسی پر رحم نہیں آتا؟"

"کس بات پر رحم؟" ریشم نے بُرا سا منہ بنایا۔ "ایسے لوگ اسی قابل ہوتے ہیں۔ جب یہ جانتے ہیں کہ میں اپنی ذات میں لڑکی نہیں بلکہ لڑکا ہوں تو پھر یہ مجھے لڑکی سمجھ کر میری طرف متوجہ ہی کیوں ہوتے ہیں۔"

اس کی باتوں نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ مجھے اس کی بے رحمی پر غصہ آنے لگا۔ اس کی ہر حرکت میری سمجھ سے بالاتر تھی۔ نہ جانے سردار نے اس کی پرورش کس انداز سے کی تھی۔

میں اُسے چھوڑ کر تیز قدموں سے قبیلے کی طرف چل دیا۔ اس کی طنزیہ ہنسی بہت دُور تک میرا تعاقب کرتی رہی لیکن میں نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔

اُس واقعے کے ساتویں روز میری اور نوگی کی شادی ہو گئی اور ہماری مضطرب زندگی کو قرار آ گیا۔

ہماری شادی کا انتظام قبیلے والوں نے کیا تھا۔ یہ بھی عجیب شادی تھی۔ ہم دونوں ہی بے سہارا تھے لیکن اب ایک ہو گئے تھے۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے... کبھی نہ بچھڑنے کے لیے... ہزار دشواریوں اور پریشانیوں کے بعد بالآخر ہمیں منزل مل گئی تھی، جہاں سکون ہی سکون تھا۔ میری بپھری ہوئی جولانی طبیعت میں ٹھہراؤ آ گیا تھا۔ میرے شب و روز، نوگی کے ساتھ گزرنے لگے۔ اس کی مہکتی زلفوں کی چھاؤں میں میں ماضی کی ساری تھکن بھول گیا تھا۔

ہم دونوں کو ایک الگ خیمہ دے دیا گیا۔ جہاں قبیلے والوں نے ضرورت کی ہر چیز مہیا کر دی تھی۔ میں نے اس دوران میں کئی بار چاہا بھی کہ کام کاج میں بستی والوں کا ہاتھ بٹاؤں... لیکن ان لوگوں کو یہ بات کسی طور بھی گوارا نہیں تھی۔

زندگی کا ہر پہلو عجیب ہوتا ہے۔ میرے لیے یہ پہلو بھی عجیب تھا۔ میں طوفانوں سے نبرد آزما رہنے والا انسان صرف نوگی کا ہو کر رہ گیا تھا۔ قبیلے کا ہر فرد ہماری بے مثال محبت کو رشک کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ نوگی نے اپنا کھویا ہوا حسن اور شادابی، وقت کے ستم ظریف ہاتھوں سے واپس لے لی تھی۔ اب وہ پہلے جیسی حسین و جمیل تھی... شاداب اور شگفتہ نوگی۔

سوائے ریشم جان کے، ہر عورت نوگی کو پسند کرتی تھی اور اس کی عزت کرتی تھی۔ ریشم جان اُس سے بات بھی نہیں کرتی تھی۔ اُس کا رویہ نوگی کے ساتھ پہلے ہی روز جیسا تھا۔ نوگی نے اس بات کو کبھی اہمیت نہیں دی۔ اُسے میری محبت حاصل ہو گئی تھی اور یہی اُس کے لیے بہت تھا۔ جہاں تک ریشم جان کا تعلق ہے تو اُسے خود میں بھی نہیں سمجھ سکا تھا تو بے چاری نوگی کیا سمجھتی...

اچھے دن ہمیشہ بے حد تیز رفتار ہوتے ہیں۔ وہ وقت کا احساس دلائے بغیر ہی اپنے آپ کو سمیٹ لیتے ہیں۔ یہی میرے ساتھ بھی ہوا۔ میرے اچھے دن بھی، میری طویل زندگی کا ساتھ نہ دے سکے اور پلک جھپکتے ہی گزر گئے... اور نوگی موت کے منہ میں جا پہنچی۔

اُس نے ایک بچے کو جنم دیا اور خود سب سے روٹھ گئی۔ نہ جانے کس طرح اس کے جسم میں زہر پھیل گیا تھا۔ اُس نے میرا ساتھ چھوڑ دیا۔ دُنیا میں کوئی کہاں تک کسی کا ساتھ دے سکتا ہے۔ غم برداشت کرنے کے لیے ہر شخص یہاں تنہا ہی رہ جاتا ہے۔ نوگی نے بھی میرا ساتھ نہیں دیا۔ وہ مجھے تنہا چھوڑ گئی... پہلے کی طرح تنہا اور اُداس... البتہ اُس نے میرے پاس اپنی ایک نشانی چھوڑ دی تھی، جیتا جاگتا، خوبصورت سا ایک بچہ... اگر وہ بچہ نہ ہوتا تو شاید اس کی موت کی خبر سنتے ہی میں بھی زندگی سے منہ موڑ لیتا۔ موت قبول کرنے کے لیے اس سے اچھا موقع کوئی اور نہیں ہو سکتا کہ اُسی کے ہجر میں موت آ جائے جس کو زندگی میں سب سے زیادہ چاہا ہو۔ میں نے نوگی سے بے پناہ محبت کی تھی۔

اس کی موت پر پورا قبیلہ اُداس تھا۔ نوگی نے خود کو ماحول اور ان لوگوں سے ہم آہنگ کر لیا تھا۔ دنوں میں ان کے دلوں میں جگہ بنا لی تھی۔ لوگ اس سے محبت کرنے لگے تھے... سوائے ریشم جان کے... جس نے ابھی تک شاید اس کی حیثیت ہی تسلیم نہیں کی تھی... لیکن کسی کے اداس ہونے سے یا کسی کو غیر ضروری سمجھنے سے جانے والا اپنی راہ کھوٹی نہیں کرتا۔ وہ اپنا سفر جاری رکھتا ہے... یہی نوگی نے بھی کیا تھا۔ اس نے اپنا سفر جاری رکھا لیکن مجھے بے سہارا اور بے منزل چھوڑ کر...

نہ جانے کس طرح اس کی تجہیز و تکفین ہوئی؟ کہاں ہوئی؟ آخری منزل تک پہنچانے والوں میں کون کون شامل تھا؟ یہ سب کچھ مجھے معلوم نہ ہو سکا۔ میں تو اندر سے ٹوٹ پھوٹ گیا تھا... سُن ہو چکا تھا... بے حس، بے حرکت ہو چکا تھا۔ مجھے یہ بھی یاد نہیں کہ میری آنکھیں کھلی ہوئی تھیں یا بند تھیں۔ کتنے لوگوں نے مجھے ہوش میں لانے کی کوششیں کی تھیں۔ سکتے کی حالت کو ختم کرنا چاہا تھا۔ یہ سب کچھ مجھے یاد نہیں۔ کسی کی روح کو اگر دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے تو اُسے کس بات کا احساس رہ جاتا ہے؟

مجھے بعد میں پتا چلا کہ میں تو پتھر کا ہو گیا تھا۔ لوگوں کو مجھ سے اس شکستہ حالی کی اُمید نہیں تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ میں نوگی کی موت کا اس قدر اثر لوں گا۔ وہ مجھے بہادر اور چٹانوں جیسا سخت خیال کرتے تھے لیکن انہیں کیا معلوم کہ ہر شخص اپنے اندر ایک نرم گوشہ بھی رکھتا ہے۔ ہر شخص کی ایک کمزوری بھی ہوتی ہے۔ میرا نرم گوشہ نوگی تھی۔ میری کمزوری یہ تھی کہ میں اُسے خود سے جُدا کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا لیکن جب وہ اچانک مجھ سے جُدا ہو گئی تو پھر میرے لیے کچھ بھی باقی نہ رہا۔ میں ٹوٹ گیا... اور ٹوٹنے کا یہ عمل بہت دنوں تک جاری رہا۔

مجھے سنبھلنے میں بہت دن لگ گئے تھے۔

جب میں پوری طرح اپنے حواس میں آیا تو سب کچھ وہی تھا۔ خیمہ وہی تھا۔ اس میں رکھے ہوئے سامان کی ترتیب بھی وہی تھی البتہ اس خیمے کا ایک مکین کہیں چلا گیا تھا۔ میں اپنے بستر پر لیٹا ہوا تھا اور میرے بدن پر وہی لباس تھا... جو میں اس روز پہنے ہوئے تھا جب عورتیں نوگی کو بچے کی پیدائش کے لیے دوسرے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خیمے میں لے گئی تھیں۔

مجھے سب کچھ رفتہ رفتہ یاد آتا جا رہا تھا۔

یادداشت کی بحالی کے ساتھ ہی نوگی بھی یاد آنے لگی۔ میں نے رونا چاہا لیکن آنسوؤں کے سوتے شاید خشک ہو گئے تھے۔ آنکھیں بُری طرح جلتی رہیں لیکن انہیں تر کرنے کے لیے آنسو کا ایک قطرہ بھی نہ نکل سکا۔

میں اُسی طرح لیٹا رہا۔ قبیلے والوں نے شاید مجھے تنہا چھوڑ دیا تھا تاکہ میں ان کی غیر موجودگی میں خود کو سنبھال سکوں۔

مجھے کسی کی آہٹ سُنائی دی۔

میں نے گردن گھما کر نہیں دیکھا۔

آنے والا یقیناً میرے لیے ہمدردی کے جذبات لے کر اور دُکھ کی تصویر بن کر آیا ہوگا۔ میں ایسے چہروں سے اُکتا گیا تھا۔

"کیسے ہو تم؟" ایک آواز سُنائی دی۔

میں نے پہچان لیا۔ یہ ریشم جان کی آواز تھی۔

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ تنہا نہیں تھی۔ اس کی گود میں ایک بچہ بھی تھا جو گلابی رنگ کی چادر میں لپٹا ہوا تھا۔

"جانتے ہو۔ تم پورے ایک ہفتے تک غافل رہے ہو۔" ریشم جان کچھ اور قریب آ گئی۔

اس نے یہ کہہ کر مجھے وقت کا احساس دلا دیا تھا... ورنہ میرے نزدیک وقت کی اب کوئی اہمیت نہیں تھی۔ چاہے میں جتنے دنوں تک بھی غافل رہتا، اس سے کوئی فرق نہیں پڑ سکتا تھا۔ اگر یہ غفلت زندگی بھر کی ہوتی تو اور بھی اچھا ہوتا... میں خاموشی سے اُسے دیکھتا رہا۔ میں نے ابھی تک کچھ نہیں کہا تھا۔ میرے پاس کہنے کے لیے رکھا ہی کیا تھا۔

"جانتے ہو یہ کون ہے؟" اس نے دوبارہ مخاطب کیا۔

میں اس کی گود میں لیٹے ہوئے بچے کو اچھی طرح جانتا تھا وہ میرا خون تھا۔ نوگی نے اپنی جان کی بازی لگا کر اسے تخلیق کیا تھا۔ وہ خود تو مر گئی تھی لیکن اس کی تخلیق زندہ تھی۔ موت اور زندگی کا کھیل تو سدا سے جاری ہے اور ہمیشہ جاری رہے گا۔

اک ہُوک سی میرے سینے میں اُٹھی اور میں نے لیٹے لیٹے اپنے دونوں بازو پھیلا دیے۔ ریشم جان نے آہستگی سے اس بچے کو میری گود میں دے دیا۔ وہ میری گود میں آتے ہی چہکنے لگا۔ میں نے اُسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ ریشم جان نے منہ پھیر لیا۔ اس وقت وہ ایک بالکل اجنبی لڑکی دکھائی دے رہی تھی۔ ایسی لڑکی جو گویا مجھے جانتی تک نہ تھی... لیکن وہ پہلے جیسی سرکش لڑکی نظر نہیں آ رہی تھی۔ انسان اپنی شخصیت میں کتنے پہلو رکھتا ہے، یہ ایک ایسا بھید ہے جو آج تک کسی پر بھی ظاہر نہیں ہو سکا۔

"لاؤ بچہ مجھے واپس دے دو۔" کچھ دیر بعد اس نے پلٹ کر کہا۔

"کیوں...؟" میں نے حیرت سے کہا۔ "اسے میرے پاس رہنے دو۔"

"کیا تم اس کی پرورش کر لو گے؟" اس نے عجیب لہجے میں پوچھا۔ "ابھی تو تم خود کو بھی سنبھالنے کے قابل نہیں ہو۔ اس کی پرورش میں کروں گی... یہ میرا بیٹا ہے۔" اس کی آواز بھرا گئی۔

میں اس کی بات کا کیا جواب دے سکتا تھا۔

اس نے میری گود سے بچے کو اُٹھا لیا۔ میں نے بچے کو پیار کیا اور اُسے غور سے دیکھا۔

اُس چہرے میں میرے نقش و نگار تھے۔ وہ میری اور نوگی کی محبت کا پیکر تھا۔

ریشم جان اُسے سنبھالتی ہوئی لے گئی۔ اس کے جانے کے بعد میں نے آنکھیں بند کر لیں اور بے خبر ہو گیا۔

جب میری آنکھ کھلی تو سردار میرے پاس کھڑا تھا اور صبح ہو چکی تھی۔ میں حالانکہ ہفتوں کا پیاسا رہا تھا لیکن انہوں نے میرے سکون میں مداخلت نہیں کی تھی۔

اب دنوں کا معمول وہی پہلے جیسا ہو گیا تھا۔

اب مجھے اس بچے کے لیے زندہ رہنا تھا۔ اپنے آپ کو ایک بار پھر سمیٹنا تھا لیکن میری سمجھ میں ریشم جان کا رویہ نہیں آ رہا تھا۔ اس نے اس طرح بچے کو سنبھال رکھا تھا جیسے وہ خود اُسی کی تخلیق ہو... اُسی نے بچے کو جنم دیا ہو۔ لمحے بدلنے والے تاثرات کی مالک اُس لڑکی نے ایک بار پھر مجھے حیران کر دیا تھا۔

کچھ دنوں بعد میری حالت مزید سنبھل گئی تو قبیلے کے لوگوں نے بچے کا نام تجویز کرنے کی رسم پوری کر دی۔ میں نے اس کا نام شہباز تجویز کیا۔ یہ نام سبھی کو پسند آیا۔ ان کے خیال میں میرے بچے کا اس سے بہتر کوئی اور نام نہیں ہو سکتا تھا۔

یہاں پہنچ کر یہ تحریر ختم ہو جاتی ہے... اس طرح جیسے کوئی سفر اچانک ہی ختم ہو جائے... یہ تحریر شنالیا رخان کی تھی جس نے طوفانوں کی گود میں آنکھیں کھولیں اور ہنگاموں میں زندگی

بس کی۔ اس نے یہاں تک اپنی یادداشت بڑی خوبی سے مرتب کی تھی۔ ہر واقعے کو پوری جزئیات سمیت اس طرح لکھا کہ مناظر آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتے تھے۔

اب میں اپنا تعارف کرواتا ہوں۔ میرا نام بہادر خان ہے۔ میں اُسی قبیلے کا ایک فرد ہوں جس قبیلے نے شالیار خان کو پناہ دی تھی لیکن میں بہت دنوں پہلے مہذب شہروں کی طرف چلا گیا تھا کیونکہ مجھے علم حاصل کرنے کا جنون تھا۔ قبیلے کی زندگی مجھے راس نہیں آ سکتی تھی۔ میں ہنگاموں سے دُور بھاگتا تھا جبکہ ہنگامے ایسے آزاد قبیلوں کا مقدر ہوتے ہیں۔

مجھے بے سکونی پسند نہیں تھی۔ میں ایک جگہ رہ کر اپنی شخصیت کو مضبوط بنانا چاہتا تھا جب کہ مسلسل سفر قبیلے کا مزاج ہوتا ہے۔ میں نے علم حاصل کیا۔ کتابیں پڑھنا اور لکھنا سیکھا۔۔ لیکن جب حالات اور وقت نے میرے اعصاب پر تھکن مسلط کر دی تو میں اپنے قبیلے میں لوٹ آیا۔

میں واپس آیا تو شالیار خان قبیلے ہی میں موجود تھا لیکن وہ خود سے بیگانہ ہو چکا تھا۔ وہ زیادہ تر چٹانوں اور جنگلی ویرانوں میں مارا مارا پھرتا تھا۔

اس کے بچے شہباز کی پرورش ریشم جان کر رہی تھی۔ شالیار خان کو دیکھ کر یہ احساس نہیں ہوتا تھا کہ یہ وہی شخص ہے جس کی دلیری کے قصے ہر شخص کی زبان پر تھے۔ اس کی آنکھیں جن میں کبھی شعلے دہکتے ہوں گے، اب بجھ چکی تھیں۔ اس کا لباس تار تار رہنے لگا تھا۔۔۔ اور اس کی وہ زبان جو دلوں کو موہ لیا کرتی تھی اب بالکل خاموش ہو چکی تھی۔

سردار نے مجھے وہ داستان دکھائی جو شالیار خان نے لکھی تھی۔ اس کے آخری الفاظ تھے۔۔۔ "قبیلے والے مجھے زندہ اور باہوش و حواس دیکھنا چاہتے ہیں لیکن۔۔۔"

اس جملے کے بعد کچھ نہیں تھا۔۔۔ شاید یہ سب کچھ لکھتے ہی شالیار خان ذہنی توازن کھو بیٹھا تھا۔

۔ لیکن اس کی تحریر اس کے وجود کا احساس دلاتی تھی۔ میں نے اس کی تحریر کو آگے بڑھانے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ جو چراغ اس نے اپنی تحریر سے روشن کیا تھا وہ گل ہو جائے۔۔۔ سفر کو جاری رہنا چاہیے۔ اس کے علاوہ میرے لیے یہ ایک مشغلہ بھی تھا کہ میں اس کے بقیہ حالات کھوج کر اس کی داستان کو مکمل کر دوں۔

یہ داستان اس نے مسلسل نہیں لکھی تھی۔۔ بلکہ شاید تو گی کی موت کے بعد دل بہلانے کے لیے اپنی یادداشت کو مرتب کیا تھا۔ اس کے لکھے ہوئے صفحات پر آنسوؤں کے دھبے موجود تھے۔ سینوں میں اُتر جانے والی آنکھیں بالآخر قطرہ قطرہ ٹپکنے لگی تھیں۔

میں اس کے مزید حالات جاننے کے لیے اس کی ٹوہ میں لگ گیا۔ میں سایے کی طرح اس کا تعاقب کرتا رہا۔ اس طرح مجھے اس کے مشاغل جاننے کے علاوہ اس بات کا موقع بھی مل گیا تھا کہ کسی موقع پر اسے مدد کی ضرورت ہوتی تو میں اس کے لیے مددگار ثابت ہوتا تھا۔

دوسری طرف میں ریشم جان کو دیکھتا رہا جو اس کے بچے شہباز کی پرورش کر رہی تھی لیکن اس کی پرورش کا انداز سب سے مختلف تھا۔ وہ شاید حقیقی شہباز ہی بنا رہی تھی۔ شالیار خان نے اپنی داستان میں لکھا تھا کہ وہ ریشم جان کو نہیں سمجھ پایا تھا۔ اسی طرح مجھے بھی اعتراف ہے کہ میں اسے سمجھنے کے سلسلے میں کوراہی رہا۔۔۔

ایک روز میں نے ریشم جان کو دیکھا جو شہباز کو گود میں اٹھائے ایک طرف جا رہی تھی اور اس سے کچھ فاصلے پر شالیار خان تھا جو غالباً اپنی ہی جھونک میں کہیں جا رہا تھا یا شاید اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ یہ صورت حال میرے لیے نئی تھی۔ میں نے بھی اپنے قدم تیز کیے اور ان دونوں کے پیچھے چلتا رہا۔

جنگل میں پہنچ کر ریشم جان ایک درخت کے نیچے رک گئی۔ شالیار خان بھی ایک درخت کے پیچھے چھپ گیا۔ شاید وہ ریشم جان کے سامنے نہیں آنا چاہتا تھا جب کہ میں بھی ان دونوں کو نگاہ میں رکھ کر ایک درخت کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔

ریشم جان نے ِادھر اُدھر دیکھ کر شہباز کو اپنی گود سے اُتارا اور ایک درخت کے نیچے، جڑ کے قریب بٹھا دیا۔ اور خود کمر پر دونوں ہاتھ رکھ کر اس کے قریب ہی کھڑی ہو گئی۔

چند لمحے بعد میں نے جو کچھ دیکھا وہ میرے رونگٹے کھڑے کر دینے کے لیے کافی تھا۔ روتے ہوئے شہباز کے جسم پر سُرخ چیونٹیوں کا ایک قطار رینگ رہی تھی اور وہ بُری طرح تڑپ رہا تھا۔ میں نے شالیار خان کو دیکھا۔ اس نے ہونٹ بھینچ رکھے تھے لیکن وہ اپنی جگہ ساکت کھڑا تھا۔۔۔ بے حس و حرکت۔ وہ ریشم جان اور بیٹے شہباز کو گھور رہا تھا۔

میں کانپ گیا۔

شالیار خان کی جو داستان میں نے گوری قبیلے کے خانہ بدوش سردار سے لے کر پڑھی تھی اس سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ شالیار درحقیقت کس فطرت کا مالک ہے۔ اس نے اپنے بھائی پانوش کا انتقام لینے کے لیے جو کچھ کیا، اُسے پڑھ کر دھڑکنیں کسی ڈھول کی تھاپ بن جاتی ہیں۔۔۔ لیکن اس وقت وہی شالیار خان بُت بنا کھڑا تھا اور اس کی پلکیں تک نہیں جھپک رہی تھیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شالیار خان کے ہونٹ سختی سے بھینچے ہوئے تھے۔

اُس کی آنکھیں سُرخ تھیں۔

ان میں دیوانگی دُور سے چمکتی دکھائی دے رہی تھی۔

میں درخت کی اوٹ سے سب کچھ دیکھ رہا تھا اور میرے سینے میں میرا دل دھڑکن اتنی تیزی سے دھڑک رہا تھا جیسے وہ سینے میں شگاف پیدا کرنے کے لیے اندر سے ضربیں لگا رہا ہو۔

ننھا شہباز رو رہا تھا۔

اُس کے جسم میں کسی زخمی پرندے کے پھڑکنے جیسی تڑپ تھی۔

سُرخ چیونٹیوں کی قطار اس کے برہنہ جسم پر رینگ رہی تھی۔ میں ان سُرخ چیونٹیوں کی حرکت دیکھ کر کسی ایسے پتّے کی طرح کانپ رہا تھا جو کسی بھی پل شاخ سے گرنے والا ہو۔ بار بار میرے جسم میں جھرجھری سی آتی اور میری ریڑھ کی ہڈی سنسنانے لگتی تھی۔

۔۔۔ پھر سُرخ چیونٹیاں شہباز کے جسم پر اِدھر اُدھر پھیل گئیں۔ اُس کی پُشت، سینہ، ٹانگیں حتیٰ کہ نازک اعضا پر بھی سُرخ چیونٹیاں تھیں۔ وہ بُری طرح تڑپ رہا تھا اور چیخ رہا تھا۔۔۔ اس کی چیخوں سے دل دہل رہا تھا اور مجھے اپنا جسم پسینے میں بھیگتا محسوس ہو رہا تھا۔

ریشم جان، شہباز سے کچھ فاصلے پر کھڑی عجیب نگاہ سے اُسے دیکھ رہی تھی۔ خود اس کے رُخساروں پر سُرخی تھی۔ گویا کسی اندرونی جذبے سے اُس کے رُخسار تمتما رہے ہوں۔۔۔ اس کی آنکھیں البتہ غم آلود تھیں، جیسے اُسے شہباز کی تکلیف دیکھ کر اذیت کا احساس ہو رہا ہو۔

میں حیران تھا کہ جب اُس سے یہ منظر دیکھا نہیں جا رہا ہے تو اُس نے شہباز کو اس حالت میں کیوں مبتلا کر رکھا ہے؟ یوں لگ رہا تھا جیسے بیک وقت دو جذبوں کی تسکین کر رہی ہو۔

نفرت۔۔۔ اور۔۔۔ محبت کے دو جذبے۔۔۔

جذبے شدید اور مخالف ہوں تو اُن کی بیک وقت تسکین۔۔۔ انسانی ذہن نہیں کہلا سکتا۔۔۔ لیکن میں یہ عمل اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا اور بے بس و مجبور تھا۔ اِدھر شالیار خان کی حالت میرے لیے ناقابلِ فہم تھی۔

وہ خاموش اور بے حرکت کھڑا تھا۔

یوں لگتا تھا جیسے اُسے اپنے لختِ جگر کی حالت دیکھ کر سکتہ ہو گیا ہو۔ مجھے حیرت تھی کہ وہ پدرانہ جذبات سے بے قابو ہو کر شہباز کو اُن سُرخ چیونٹیوں سے نجات کیوں نہیں دلا دیتا؟ اسے اب تک بچے کو اس مصیبت سے نجات دلا دینا چاہیے تھی۔۔۔ لیکن وہ تو خاموش تماشائی بنا کھڑا تھا۔۔۔ جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہو۔۔۔ یا پھر اُس کی آنکھوں کا نور، اس منظر کو اُس کے ذہن تک منتقل ہی نہ کر رہا ہو۔

میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

صورتِ حال میرے لیے ناقابلِ برداشت ہو رہی تھی۔

میں نے چیخ کر ریشم جان کو اس فعل سے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن میرا حلق خشک ہو گیا تھا۔۔۔ اور حلق میں کانٹے سے چُبھ گئے تھے۔ بڑی کوشش کے باوجود آواز تک نہ نکال سکا تو میں نے خود کو درخت کی اوٹ سے نکالنے اور بچّے کو اٹھا لینے کے لیے وہاں سے حرکت کرنا چاہی تب مجھے احساس ہوا کہ ایسا کرنا بھی میرے بس سے باہر ہے۔

کھڑے کھڑے میرا جسم اکڑ گیا تھا۔

۔۔۔ یا پھر منظر کی دہشت نے میری توانائی سلب کر لی تھی۔

اچانک ریشم جان نے کسی چیل کی طرح جھپٹا مارا اور ننھے شہباز کو اٹھا لیا۔ اُس نے جلدی جلدی سُرخ چیونٹیوں کو ہاتھوں کی مدد سے ہٹانا شروع کر دیا۔۔۔ اور جب آخری چیونٹی بھی جسم سے الگ ہو گئی تو اُس نے شہباز کو فرطِ محبت سے بھینچ لیا۔

وہ اسے دیوانہ وار چوم رہی تھی۔

اس کے انداز سے اس قدر والہانہ پن جھلک رہا تھا کہ مجھے اپنی ذہنی صحت پر شبہ ہونے لگا۔ اس سے پہلے جو کچھ ہوا تھا اس پر یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔۔۔ اور جو کچھ اب آنکھیں دیکھ رہی تھیں اُس پر بے یقینی نہیں ٹھہر رہی تھی۔

میں نے شالیار خان کی طرف دیکھا۔

اس کی آنکھیں سختی سے بھینچی ہوئی تھیں۔

اُس کے ماتھے پر پسینہ چمک رہا تھا اور اس کا سینہ تیزی سے پھولتا اور پچکتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ گویا سکون کی سانس نے آمد و رفت شروع کر دی تھی۔ میں دنگ کھڑا تھا۔ ریشم جان بچے کو یوں چوم رہی تھی جیسے وہ اس کا اپنا ہی بیٹا ہو۔

"چُپ ہو جاؤ شہباز۔۔۔ چُپ ہو جاؤ" وہ بڑبڑا رہی تھی۔۔۔ لیکن اُس کی آواز میرے کانوں تک پہنچ رہی تھی، "خاموش ہو جاؤ، میرے بچے! خاموش ہو جاؤ۔۔۔ میں مجبور ہوں۔۔۔ میں دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔۔۔ میرے بس میں ہوتا تو میں کبھی تم پر کوئی آنچ نہ آنے دیتی لیکن میں تمہیں جو کچھ بھی بنانا چاہتی ہوں، اس کے لیے یہ سب کچھ بے حد ضروری ہے۔۔۔ میں مجبور ہوں شہباز۔۔۔ میں مجبور ہوں۔۔۔"

بولتے بولتے وہ یکایک پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

میں نے زندگی میں اس عجیب و غریب لڑکی کو کبھی روتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ وہ ہر ستم سہنے کی عادی تھی بلکہ اب تو ستم ڈھانا اُس کی عادتِ ثانیہ بن چکی تھی۔ وہ جب بچی تھی تو میں نے اُسے اپنی گود میں کھلایا تھا۔۔۔ اور جب وہ بڑی ہو گئی تو بھی میری شفقت کم نہ ہوئی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیکن اب اس کے مزاج میں عجیب عجیب سی تبدیلیاں پیدا ہوگئی تھیں۔ وہ شالیار خان اور نوگی کے بیٹے شہباز سے بے پناہ محبت کرتی تھی اور ہر وقت اُسے ساتھ رکھتی تھی۔ نوگی کے مرنے کے بعد، اب تک دو سال ہوگئے تھے لیکن اس نے شہباز کو ایک لمحے کے لیے بھی اپنی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیا تھا۔ وہ سائے کی طرح اس کے ساتھ لگی رہتی تھی اور سوائے شالیار خان کے وہ بچے کو کبھی کسی کے ہاتھوں میں نہیں دیتی تھی...

شالیار خان اب بھی آنکھیں بند کیے کھڑا تھا۔

پیشانی سے پسینے کی بوندیں اس کے ابروؤں کو تر کرتی ہوئی پلکوں سے گزر کر رخساروں پر بہہ نکلی تھیں۔ اس کی حالت سے مجھے اندازہ ہوگیا کہ آج اس نے جو منظر دیکھا ہے وہ اس کے لیے نیا نہیں ہے۔ اس منظر کو وہ غالباً پہلے بھی دیکھ چکا ہوگا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ بچے کو اتنی اذیت میں دیکھ کر کبھی خاموش نہ رہتا۔

گزشتہ سال بھر سے خود شالیار کا زیادہ تر وقت نوگی کی قبر پر گزرتا تھا... یا پھر وہ ویرانوں میں مارا مارا پھرتا تھا۔ شہباز کی پرورش ریشم جان نے اپنے ذمے لے لی تھی اور بس اسی کام کی ہو کر رہ گئی تھی۔ خود اس کی گھومنے پھرنے کی عادت بھی ختم ہو چکی تھی... اور یوں لگتا تھا جیسے شہباز ہی اس کی زندگی کا محور ہو۔

روتا ہوا بچہ خاموش ہوگیا۔

میری دھڑکنیں بھی رفتہ رفتہ معمول پر آگئیں۔

میں اب اپنے جسم میں وہ توانائی بھی محسوس کر رہا تھا، جس سے جسم کو اپنی مرضی کے مطابق حرکت دی جا سکتی ہے۔

درخت کی اوٹ میں کھڑے کھڑے نہ جانے کتنا وقت گزر گیا تھا۔ شالیار خان اب بھی اپنی جگہ موجود تھا اور اس کی آنکھیں بدستور بند تھیں۔ ریشم جان شہباز کا جسم سہلا رہی تھی۔ سرخ چیونٹیوں نے جہاں جہاں بچے کے جسم کو کاٹنے کی کوشش کی تھی وہاں سے سرخی جھلک آئی تھی۔

وہ اُسے کپڑے پہنانے لگی۔

کپڑے پہنا کر اُس نے شہباز کو اُٹھایا اور دوڑتی ہوئی جھاڑیوں کے درمیانی راستے سے ان خیموں کی طرف چلی گئی، جہاں قبیلہ ان دنوں مقیم تھا۔ میں اب بھی اپنی جگہ کھڑا رہا۔ مجھے شالیار خان کے بارے میں فکر لاحق تھی۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ اب کیا کرتا ہے؟

میری عمر چالیس سال کے لگ بھگ ہے لیکن بے حد حساس ہونے کی وجہ سے شروع ہی سے میری جسمانی صحت قبائلی پٹھانوں کی طرح قابلِ رشک نہیں رہی۔ میں کمزور سا بوڑھا ہوں، اگر میں نے اپنے ساتھیوں اور عزیزوں کی طرح زندگی بسر کی ہوتی تو شاید آج بھی میں ایک کڑیل آدمی ہوتا۔ درخت کی اوٹ میں کھڑے کھڑے جب مجھے بہت دیر ہوگئی تو میں وہاں سے ہٹ آیا۔

میری ٹانگیں اب زیادہ دیر تک میرا بوجھ نہیں سہار سکتی تھیں۔ مجھے آرام کی ضرورت تھی۔ اس لیے میں وہاں سے چلا آیا۔

اپنے خیمے میں آنے کے بعد میں دیر تک اس عجیب و غریب صورتِ حال کے بارے میں غور کرتا رہا... لیکن میری سمجھ میں کچھ بھی نہ آسکا۔ میں نے تھک ہار کر آنکھیں بند کرلیں۔

رات بھر میں ڈراؤنے خواب دیکھتا رہا۔

شہباز کی دلدوز چیخیں میرے ذہن میں گونجتی رہیں۔

شالیار خان کی دیوانگی سے چمکتی ہوئی آنکھیں میرے ذہن سے چپکی رہیں... بار بار میری آنکھ کھل جاتی تھی اور میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا تھا۔

آخری بار جب میری نیند اُچاٹ ہوئی تو پھر سونے کو جی نہ چاہا۔ میرا دل اس عرصے میں جتنی تیزی سے دھڑکا تھا، اس سے مجھے بے پناہ کمزوری محسوس ہونے لگی تھی۔

میں اُٹھا اور اپنے لیے قہوہ تیار کرنے لگا۔

میرا خیمہ خیموں کی اس بستی میں سب سے الگ تھلگ تھا۔ قہوہ تیار ہوگیا تو میں اس کے کڑوے کسیلے گھونٹ لیتا رہا اور اپنے اعصاب کو پُرسکون بنانے کی کوشش کرتا رہا...

...پھر اچانک ایک خیال سے میرا دل بے چین ہوگیا۔

میں شام کو جلد واپس آگیا تھا اور میں نے شالیار خان کو آخری بار اس وقت دیکھا تھا جب اُس نے درخت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کرلی تھیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ وہ واپس بھی آیا ہے یا نہیں؟

بے قراری بڑھی تو میں خیمے سے نکل آیا۔

شالیار خان کا خیمہ سردار کے خیمے کے قریب تھا۔

سردار کے علاوہ ہر کسی کا خیمہ تاریک تھا۔ سردار کے خیمے میں چراغ روشن تھا اور رات بھر روشن رہتا تھا۔ میں آہستہ آہستہ شالیار کے خیمے کی طرف بڑھنے لگا۔

جب میں خیمے کے قریب پہنچا تو مجھے اندر سے بڑبڑاہٹ سُنائی دی۔ آواز شالیار خان کی تھی۔ شاید وہ نیند کی حالت میں بڑبڑا رہا تھا۔ میں ٹاٹ کے دروازے کے قریب کھڑا رہا۔

سرد ہوا کے جھونکے جسم کے برہنہ حصوں پر برچھیوں کی طرح کرتے محسوس ہو رہے تھے۔ میں اپنی ناتوانی کے باعث کانپ رہا تھا۔ شالیار خان کی بڑبڑاہٹ سن کر مجھے اطمینان ہوگیا تھا کہ وہ اپنے خیمے میں موجود ہے۔ میں نے واپسی کے لیے قدم اُٹھایا...

عقاب
ایم اے … قیمت 150/-

... اور پھر میں ٹھٹک گیا۔

سردار کے خیمے کی طرف سے مجھے ایک لہراتا ہوا سایہ دکھائی دیا تھا۔

میں جلدی سے شالیار خان کے خیمے کے پہلو میں دُبک گیا۔

یہ ایک انسانی ہیولا تھا۔

یہ دھندلا سا نسوانی پیکر اچانک ہی خیمے کی طرف لہرایا تھا۔ اس لیے میں اندازہ نہ کرسکا کہ سردار کے خیمے سے برآمد ہوا ہے... یا اس کے عقب میں لگے ہوئے کسی اور خیمے سے آیا ہے۔

مجھے اپنی حماقت کا احساس ہو رہا تھا۔ بے چینی کی وجہ سے میں کمبل اوڑھے بغیر ہی دوڑا آیا تھا۔ شاید لاشعوری طور پر یہ خیال میرے ذہن میں تھا کہ مجھے کون سا زیادہ دیر وہاں رُکنا ہے... غالباً اسی لیے میں نے کمبل لینے کی ضرورت نہیں محسوس کی تھی... اور اب سردی آہستہ آہستہ میری کھال میں جذب ہو کر ہڈیوں کی طرف اُترنے لگی تھی جب کہ مجھے اب واپسی اتنی جلدی ممکن نہیں دکھائی دے رہی تھی ...کیونکہ وہ نسوانی ہیولا شالیار خان کے خیمے کے سامنے رُک گیا تھا۔

کون ہوسکتا ہے؟ میں نے سوچا۔

رات کے اس پہر جب کہ ہر خیمے میں نیند کی سلطنت قائم تھی اور سُنتے تک نہ جانے کہاں دُبکے ہوئے تھے، میں ٹھٹھرتا ہوا، خیمے کی اوٹ میں دُبکا رہا۔ خیمے کے دروازے پر گرے ہوئے ٹاٹ سرکا کر وہ نسوانی ہیولا اندر چلا گیا۔

میرا دل شدت سے دھک دھک کر رہا تھا۔

شالیار خان سے قبیلے کی تقریباً ہر لڑکی کو دلچسپی تھی لیکن وہ ذہنی طور پر جس حالت کو پہنچ گیا تھا۔ اس کے بعد وہ کسی کے خیالوں کا مرکز تو بن سکتا تھا لیکن عملی طور پر اس سے کوئی توقع وابستہ کرنا فضول تھی۔ وہ ایک خوبصورت سنگی بُت تھا جس کے سامنے جتنے جی چاہے جذبے نچھاور کردیے جائیں، وہ ٹس سے مس نہیں ہوتا... اور نہ ہی اس سنگی بُت کا ایک بول آج تک کسی پوجنے والے کو سُنائی دیا ہوگا۔

وہ ایک چلتا پھرتا لاشہ تھا۔

اس کی رُوح نکل گئی تھی اور شاید آسمانوں پر اپنی نوگی کے ساتھ گھوم رہی تھی۔ رُوحوں کے نکل جانے سے جسم خالی ہو جاتے ہیں اور شالیار خان بھی ایک ایسا ہی زندہ لاش تھا جس سے محبت تو کی جا سکتی تھی لیکن اس سے محبت کے ردِعمل یا جواب کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

ایسے میں یہ احمق نسوانی ہیولا آخر اس کے خیمے میں کیا کرنے گیا ہے؟ میں ٹھٹھرتے ہوئے دماغ میں ٹھٹھری ہوئی سوچوں اور اندیشوں کو سنبھالے، کان لگائے کھڑا رہا لیکن اندر سے کوئی آواز سُنائی نہیں دے رہی تھی۔

تجسس حد سے بڑھ جائے، تو انسان ہر خوف اور خطرے سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ میں نے بھی ایک خطرہ مول لینے کی کوشش کی... لیکن اس سے پہلے ضروری تھا کہ میں بھاگ کر کوئی کمبل اوڑھ آتا۔ یہ حرکت میں نے اس لیے کی تھی کہ اس طرح خیمے میں موجود دونوں کو پھلت مل جائے۔ اس مہلت میں وہ کیا کرتے ہیں؟ اس کا علم مجھے چند لمحوں کے بعد ہی ہوسکتا تھا۔ اس لیے میں ہر ممکن تیزی لیکن احتیاط سے اپنے خیمے میں پہنچا اور اُونی کمبل اُٹھا کر اس میں خود کو اچھی طرح لپیٹ لیا۔ مارے کپکپی کے میرے دانت بج رہے تھے۔

میں اپنے ٹھٹھرے ہوئے جسم کو حرارت پہنچانے کے لیے چند لمحوں تک تو بے حس و حرکت رہا... پھر رفتہ رفتہ اُونی کمبل نے سردی کے اس احساس کو جذب کرنا شروع کردیا جو میرے جسم پر اپنے خنک پنجے گاڑ چکا تھا۔

مجھے اپنے خیمے میں واپس آئے اتنی دیر ہوگئی تھی کہ اب میں اطمینان سے واپس جا کر شالیار خان کے خیمے میں کوئی حیران کن منظر دیکھنے کی توقع کرسکتا تھا...

میں اُٹھ کھڑا ہوا۔

کمبل کو اچھی طرح لپیٹ کر میں خیمے سے باہر آیا تو میرے رخساروں پر ہوا کے ٹھنڈے جھونکوں نے وار کیا... میری آنکھیں پانی سے بھر گئیں لیکن میں اتنی ٹھنڈک تو برداشت کر ہی سکتا تھا۔

شالیار کے خیمے کے قریب پہنچ کر مجھے ایک بار پھر ٹھٹک جانا پڑا۔ اس کے خیمے میں روشنی ہو رہی تھی۔ روشنی چھوٹے چھوٹے سوراخوں سے جھلک رہی تھی۔ میں نے ایک ایسے ہی روشن سوراخ سے آنکھ لگادی... اور پھر میرا منہ حیرت سے کھلتا چلا گیا۔

اندر ریشم جان موجود تھی۔

قبیلے کی الھڑ دوشیزہ جس کی ناک کبھی منگنی کے تصور سے بھی آشنا نہیں ہوئی تھی۔ چراغ کی دھیمی دھیمی روشنی میں وہ شالیار خان کے سرہانے بیٹھی بڑی محبت سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اُس کے ماتھے پر پسینے کی بُوندیں چمک رہی تھیں۔

اُس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک کا احساس ہوتا تھا۔

اُس کے لب بھنچے ہُوئے تھے۔

...اور اُس کی اُنگلیاں شالیار خان کے اُلجھے ہُوئے بالوں میں اُلجھ اُلجھ کر انہیں سنوارنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ شالیار خان کی آنکھیں بند تھیں اور چہرہ کرختگی کی کئی سلوٹوں سے بگڑا بگڑا سا دکھائی دے رہا تھا۔

اس کے سینے کے تموج سے اندازہ ہوتا تھا کہ اسے اپنے بالوں میں گھومنے والی ان سُرخ و سپید اُنگلیوں کی حرکت کا ذرا سا بھی احساس نہیں ہے۔ وہ بے سُدھ پڑا سو رہا تھا۔ لیکن اس کے لیٹنے کے انداز سے ظاہر تھا۔

"شالیار خان..." ریشم جان کی دھیمی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ "تم کتنے ظالم ہو... تم نے کبھی میرے دل میں جھانک کر نہیں دیکھا ...مجھے تم سے کتنی محبت ہے؟ اس کا تمہیں کبھی اندازہ نہیں ہو سکتا۔ وہ مر گئی تو میں نے سوچا کہ شاید اب تم مجھے مل جاؤ گے... لیکن جب تک وہ زندہ رہی، تم اُسے چاہتے رہے... اور جب وہ مر گئی تو تم نے اُس کے تصور کو جان کا روگ بنا لیا۔ ہم نے تو اُسے زمین میں بہت گہرا دفن کرنے کی کوشش کی تھی... ہمیں کیا معلوم تھا کہ مرنے کے بعد وہ اپنی لاش لے کر تمہارے دل میں دفن ہو گئی ہے... لیکن مجھے تم سے کوئی شکوہ نہیں... کوئی گلہ نہیں... میں زندگی بھر دھڑکنوں سے تمہاری عبادت کرتی رہوں گی..."

اس کی آواز بھرا گئی۔

میں سُوراخ سے چپکا کھڑا رہا۔

یہ غالباً محویت ہی تھی کہ مجھے آس پاس کا ذرا بھی دھیان نہ رہا... پھر جب میں ہوش میں آیا تو اچانک ایک کُتّا زور زور سے بھونکتا ہُوا میری طرف لپک رہا تھا۔

میں تیزی سے اپنے خیمے کی طرف دوڑ پڑا۔

کُتّے کو روکا جا سکتا تھا... لیکن میں حلق سے آواز نکال کر وہاں اپنی موجودگی ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا۔

دوڑتے دوڑتے میں نے پلٹ کر دیکھا۔

شالیار کا خیمہ ایک بار پھر تاریک ہو چکا تھا۔

غالباً میرے دوڑتے قدموں اور کُتّے کے بھونکنے کی آواز نے... ریشم جان کو چونکا دیا تھا... اور اُس نے پھونک مار کر نہ صرف چراغ بُجھا دیا بلکہ شاید وہ خیمے سے بھی نکل آئی تھی... لیکن میں اس وقت تک اپنے خیمے میں پہنچ چکا تھا۔

کُتّا خیمے کے باہر کھڑا بھونکتا رہا۔

چند لمحے بعد میں نے خیمے کا پردہ ہٹا کر اُسے ڈانٹ دیا اور پھر میں خود بھی خیمے سے باہر آ گیا۔ اس بار میں کمبل اندر ہی چھوڑ آیا تھا اور ایسا تھا جیسے میں کُتّے کی آواز سن کر ہی باہر آیا ہوں...

"کیا بات ہے؟ تم نے کیوں بھونک بھونک کر بستی کو سر پر اُٹھا رکھا ہے؟" میں نے کُتّے کو ایک بار پھر ڈانٹا... اور آواز اتنی بلند بھی کر اگر آس پاس کے لوگ جاگ گئے ہوں تو میری آواز سُن لیں اور مطمئن ہو جائیں۔

کُتّا خاموش ہو کر دُم ہلانے لگا تھا۔

میں نے شالیار خان کے خیمے کی طرف دیکھا۔

وہ تاریکی میں ڈُوبا ہُوا تھا۔

سردار کے روشن خیمے کا پردہ ہٹا کر اچانک ایک ہیولا باہر آیا اور وہیں سے چیخا... "بہار بابا! کیا بات ہے؟" آواز ریشم جان کی تھی۔ میں مُسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

"کُتّے نے شاید پہاڑی بکرے کو دیکھ لیا تھا۔" میں نے جواب دیا۔ اس وقت تک چند اور آدمی بھی اپنے اپنے خیمے سے نکل آئے تھے۔ ہم سب نے مل جُل کر ہر خیمے کا جائزہ لیا... اور سب کو اطمینان ہو گیا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں تو ہر شخص اپنے اپنے خیمے میں واپس چلا گیا۔

میں بھی اپنے خیمے میں واپس آ گیا۔

صبح ہونے میں ابھی کافی دیر تھی... لیکن میں کوشش کے باوجود سو نہ سکا۔ بار بار شالیار خان اور ریشم جان کے چہرے میری آنکھوں کے سامنے آ جاتے تھے اور پھر گڈمڈ ہو کر میری سوچوں میں مزید اُلجھنیں پیدا کر دیتے تھے۔

میرے لیے ریشم جان سب سے زیادہ حیران کُن تھی۔ اُس کے دل نے بھی دھڑکنا سیکھ لیا تھا۔ یہ بات تو میرے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتی تھی۔ میں نے تو ہمیشہ اُسے ایک ایسی مُورتی سمجھا جس کے سینے میں ہیرے جیسا دل تھا جو نوعیت کے اعتبار سے چاہے کتنا ہی قیمتی کیوں نہ رہا ہو لیکن اس میں وہ دھڑکن پیدا نہیں ہو سکتی جو عام لڑکیوں میں جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی پیدا ہو جاتی ہے اور پھر زندگی بھر وہ انہی دھڑکنوں کی تال پر اپنا آپ خرچ کرتی رہتی ہیں۔

اب مجھے شہباز کے ساتھ کیے جانے والے اس ظلم کی وجہ سمجھ میں آ گئی تھی جس کا منظر میں نے شام سے کچھ دیر قبل دیکھا تھا۔ شالیار خان بھی ریشم جان کے ان جذبات سے آگاہ تھا... اسی لیے تو اُس نے شہباز کو بچانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

میں سمجھ گیا کہ ریشم جان، شہباز کو شالیار خان کے بیٹے کی حیثیت سے دل و جان سے چاہتی ہے... لیکن زرگل کے بیٹے کی

حیثیت سے اُسے شہباز سے نفرت بھی تھی۔ جب ایک ہی پیکر دو متضاد جذبوں کا شکار ہوتا ہے تو اس پر کیا گزرتی ہے؟ اس کا احساس صرف ننھے شہباز ہی کو ہو سکتا تھا...

کروٹیں بدلنے کے باوجود نیند نہیں آئی۔

سوچوں پر اندیشوں کا رنگ غالب آ رہا۔

حتیٰ کہ اسی عالم میں سپیدۂ سحر نمودار ہو گیا۔

میں اپنے خیمے سے نکلا اور ٹہلنے چلا گیا۔ دیر تک اِدھر اُدھر بھٹکتا رہا... جب میں واپس آ رہا تھا تو شالیار خان نظر آ گیا۔

وہ اپنے ہی خیالوں میں مگن آہستہ آہستہ چلا آ رہا تھا۔

آمنے سامنے، ہم دونوں رُک گئے۔

میں نے اس کے چہرے پر نگاہ ڈالی تو کانپ کر رہ گیا... وہ دیوانگی کی زندہ تصویر تھا۔ اس کی آنکھیں دہکتے ہُوئے ہیروں جیسی تھیں جن کی چمک سے دوسروں کی آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں اور وہ اپنی تمام تر قوتِ بینائی صرف کر کے بھی ایسی آنکھوں میں زیادہ دیر تک نہیں دیکھ سکتا تھا۔

"شالیار..." میں نے بڑی محبت سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہُوئے کہا۔ اس نے میری طرف دیکھنا جاری رکھا لیکن اس کی پلکیں تک نہیں جھپک رہی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں کوئی تاثر نہیں تھا۔ وہ سوالیہ نگاہ سے میری طرف نہیں دیکھ رہا تھا اور نہ ہی اس کے انداز سے یہ پتہ چلتا تھا کہ وہ چونک پڑا ہے۔

"یہ تم نے کیا حالت بنا رکھی ہے شالیار؟" میں نے کہا حالانکہ یہ جملہ اُسے قبیلے کے ہر فرد نے سینکڑوں بار کہا ہو گا۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

"سُنو شالیار... کیا تم اپنے بیٹے کے لیے بھی ہوش و حواس میں نہیں آ سکتے؟ اسے تمہاری ضرورت ہے۔"

"بیٹا..." اس نے سرگوشی کی۔

یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ اپنے ہی اندر کہیں گہرائی میں بیٹھا بڑبڑا رہا ہو۔ "بیٹا... بیٹا..."

"ہاں... تمہارا بیٹا... تمہاری زرگل کی نشانی۔" میں نے جلدی سے کہا کیونکہ آج وہ ایک عرصے بعد ایک لفظ بولنے میں کامیاب ہُوا تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر وہ اسی طرح بولنے لگے تو اس کے دل سے غم کی چٹان کا بوجھ از خود ختم ہو جائے گا۔

...لیکن یہ محض میرا خیال ہی تھا۔ اس ایک لفظ کے علاوہ شالیار کی زبان سے کوئی لفظ نہیں نکلا۔ وہ بار بار "بیٹا" کہہ رہا تھا اور پھر اسی عالم میں وہ آگے بڑھ گیا۔

میں نے اُسے آواز دے کر روکنا چاہا... لیکن وہ یوں آگے بڑھ رہا تھا جیسے میری آواز اس تک پہنچنے میں کامیاب نہ ہو رہی ہو۔ میں دیر تک کھڑا اُسے دیکھتا رہا حتیٰ کہ وہ جھاڑیوں کی اوٹ میں جا کر میری نگاہ سے اوجھل ہو گیا۔

دفعتاً میرے جی میں آیا کہ ذرا دیکھوں تو سہی یہ دیوانہ ان ویرانوں میں گھومتے ہُوئے کیا کرتا ہے۔ میں تیز تیز قدموں سے اسی طرف بڑھ گیا۔ جھاڑیوں کے قریب پہنچ کر مجھے ٹھٹھک جانا پڑا۔

میرے کانوں سے دھیمی دھیمی ہنسی کی آواز ٹکرائی تھی۔

یہ ایک نسوانی آواز تھی۔

میں چونکے بغیر نہ رہ سکا۔

مجھے حیرت تھی کہ ان جھاڑیوں میں کون لڑکی ہے۔ قبیلے کی تمام لڑکیوں سے میں واقف تھا۔ ان میں سے کسی سے بھی گناہ آلود خواہش کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔

میں دبے قدموں آگے بڑھتا رہا۔

دبے دبے سے نسوانی قہقہے میری سماعت سے ٹکراتے رہے۔

میں اُسی درخت تک پہنچ گیا جہاں چند روز قبل میں نے چھُپ کر ایک خوفناک منظر دیکھا تھا۔ وہی مقام تھا، وہی کردار تھے لیکن منظر اتنا دہشت آمیز نہیں تھا... بلکہ میرے دل میں ہلکی ہلکی سی کسک پیدا ہونے لگی کیونکہ میں ریشم جان اور شہباز کو آپس میں کھیلتے دیکھ رہا تھا۔

شہباز ہنس رہا تھا۔

...اور اس کی مسکراہٹوں پر ریشم جان سو جان سے قربان ہُوئی جا رہی تھی۔ وہ اس سے اس قدر پیار کر رہی تھی اور اس کے پیار میں اتنا خلوص تھا کہ مجھے بے اختیار اپنی آنکھیں بھیگتی محسوس ہونے لگیں۔ اس لڑکی نے بڑی کٹھن راہ اختیار کی تھی۔ اس نے اپنے لیے اس راستے کا انتخاب کیا تھا جس میں نوکیلے کانٹوں اور پتھروں کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہوتا اور جس راستے کے انجام پر مایوسی کی چٹان رکھی ہُوئی ہوتی ہے۔ اس چٹان کی دوسری جانب تنہائیوں اور موت کا اندھیرا ہی اندھیرا پھیلا ہوتا ہے۔

وہ حسین تھی۔

جوان اور بڑی زوردار جوان تھی۔

...لیکن اب اُسے دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے وہ ایک بچّے کی ماں بننے کے بعد بیوہ ہو گئی ہو... ایک ایسی بیوہ جس نے اپنے بچّے کو اپنی زندگی کا مرکز بنا لیا ہو... لیکن ریشم جان، شہباز کی ماں نہیں تھی۔ مجھے سرحد کی اس مریم پر بے حد فخر محسوس ہو رہا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شہباز کی پیدائش سے پہلے وہ ہوا کا ایک آوارہ جھونکا تھی، جدھر جی چاہتا، چلی جاتی اور پھر جب تک گھومتے گھومتے جی نہ بھر جاتا، کبھی واپس نہیں آتی تھی... لیکن شہباز کی پیدائش اور لونگی کے مرنے کے بعد تو جیسے اس کی کایا ہی پلٹ گئی تھی۔

شہباز دو سال کا ہونے کو آیا تھا اور ان دو سالوں میں وہ ایک بار بھی اپنی آزاد طبیعت کے باعث تنہا کہیں نہیں گئی تھی۔ بوڑھے سردار کو اپنی بیٹی کا روگ معلوم تھا لیکن وہ ریشم جان سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر اس نے ریشم جان کی زندگی میں کوئی تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش کی تو وہ زندہ نہیں رہ سکے گی۔ وہ مر جائے گی۔ سب سے منہ موڑ لے گی۔

دونوں کھیل رہے تھے۔

ریشم جان کی آنکھوں میں ممتا کے چراغ روشن تھے۔

اس کے چہرے پر نور ہی نور تھا۔

معصوم شہباز ہنس رہا تھا، مسکرا رہا تھا... لیکن اس کی مسکراہٹ... میں چونک پڑا۔ اس کی مسکراہٹ میں وہ معصومیت نہیں تھی جو بچوں کی مسکراہٹ میں پائی جاتی ہے اور جسے دیکھ کر والدین دُنیا جہان کے غم بھول جاتے ہیں۔ اس کی مسکراہٹ میں سفاکی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ محض ریشم جان کی خاطر مسکرا رہا ہو...

اُسی لمحے مجھے یاد آیا کہ میں تو شالیار خان کا پیچھا کرتا ہوا یہاں تک آیا ہوں۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ تب مجھے شالیار خان بھی نظر آ گیا۔ وہ جھاڑیوں میں چھپا کھڑا تھا۔

اُس کی نگاہ ان دونوں پر جمی ہوئی تھی۔

آنکھیں دیوانگی آمیز چمک لیے ہوئے تھیں اور اس کے ہونٹ حرکت کر رہے تھے... بے آواز حرکت... جیسے وہ دل کی زبان سے کسی کو پکار رہا ہو... لیکن وہ جسے بے آواز پکار رہا تھا، وہ اس وقت ریشم جان کے سُریلے قہقہوں میں زندہ دفن تھا۔

شالیار خان کا یوں چھپ چھپ کر ان دونوں کو دیکھنا اور خاموش رہنا میری سمجھ سے بالاتر تھا۔ اس سے پہلے جب میں نے شہباز کو چیونٹیوں کے بل پر لیٹے دیکھا تھا تب بھی وہ اسی طرح خاموش کھڑا رہا تھا... اور آج بھی وہ درختوں اور جھاڑیوں کے درمیان اُسی طرح بُت بنا کھڑا سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہونٹ جس انداز میں حرکت کر رہے تھے، اس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اب بھی "بیٹا... بیٹا" ہی پکار رہا ہے... لیکن آواز نہیں نکل رہی تھی۔

ایک بار تو اس کے دونوں ہاتھ اُٹھے۔

میں سمجھا کہ وہ جذبۂ پدری سے مجبور ہو کر شہباز کو سینے سے لگانے کے لیے بے چین ہو گیا ہے... لیکن پھر اس کی مٹھیاں بھینچ گئیں اور اس نے پلکوں کو جھکا لیا۔

اس کی چمک دار آنکھیں پلکوں کے غلاف میں چھپ گئیں۔

اس کے ہونٹوں نے حرکت کرنا بند کر دی اور آپس میں سختی سے مل کر بھینچ گئے... اس کے رُخساروں کی ہڈیاں نمایاں نظر آنے لگیں۔ یوں محسوس ہوا جیسے وہ اپنے ہی دل کا خون پی رہا ہو۔ خونِ جگر پینا بڑے دل گُردے والوں کا کام ہوتا ہے۔ میں تو یہ سب کچھ دیکھ کر ہی پسینے میں شرابور ہو گیا تھا اور میرے بدن میں تھرتھری پیدا ہو گئی تھی۔

ریشم جان چند قدم ہٹ جاتی اور ہاتھوں سے شہباز کو اپنی طرف بُلاتی، وہ اس کے ایک اشارے پر کچے دھاگے سے بندھا چلا جاتا اور پھر وہ اُسے سینے سے لگا کر زور سے ہنسنے لگتی تھی۔

کھڑے کھڑے میری پنڈلیوں میں اینٹھن ہونے لگی۔

میں سوچ رہا تھا کہ اب کوئی نئی بات نہیں ہو گی بلکہ یہ پاگل لڑکی اس بچے کے ساتھ اسی طرح کھیلتی رہے گی اور پھر تھک ہار کر اُسے اُٹھائے واپس قبیلے کی طرف چل دے گی... لیکن ابھی میں یہ سوچ کر مطمئن انداز میں وہاں سے ہٹنے ہی والا تھا کہ اچانک فضا پر سکوت طاری ہو گیا۔

ریشم جان کے قہقہے ختم ہو گئے۔

وہ اب شہباز کو گھور رہی تھی۔

اس کے گھورنے کا انداز اس ممتا بھرے انداز کی نفی کر رہا تھا جسے میں نے کچھ دیر قبل دیکھا تھا تو میری آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ اس کے چہرے پر غصہ تھا۔ اس کی آنکھوں میں سفاکی تھی۔

میں ٹھٹک کر اس منظر کو دیکھنے لگا۔

اچانک ریشم جان کا ہاتھ گھوم گیا۔

خاموش فضا میں اس کے تھپڑ کی آواز خاصی بلند تھی۔

اس نے پُوری قوت سے تھپڑ مارا تھا۔ مجھے اپنا گال محض یہ محسوس کر کے ہی جھنجھناتا ہُوا لگا کہ ننھے شہباز نے اس تکلیف کو کیسے برداشت کیا ہو گا۔ میرا خیال تھا کہ وہ چیخ چیخ کر آسمان سر پر اُٹھائے گا... لیکن ایسا نہیں ہُوا۔ وہ چیخا نہیں تھا، صرف اس کے چہرے پر کرب کی لکیریں پیدا ہُوئی تھیں۔ تکلیف البتہ اس کی آنکھوں سے جھلک آئی تھی۔

"مسکراؤ..." ریشم جان نے گرج کر کہا۔

... اور پھر میرا دل جیسے دھڑکنا ہی بھول گیا۔

ننھے شہباز کے ہونٹوں میں وہی کھنچاؤ پیدا ہوتا چلا گیا جو مُسکراتے وقت انسانی لبوں پر نمودار ہوتا ہے۔

اس مُسکراہٹ کو دیکھ کر ریشم جان فاتحانہ انداز میں ہنس پڑی۔ میں درندگی کے اس مظاہرے پر کانپ گیا... اور یہ فیصلہ کیے بغیر نہ رہ سکا کہ اس سلسلے میں پہلے خود ریشم جان سے... اور پھر اس کے باپ سے ضرور بات کروں گا۔ اُسے معصوم شہباز کے ساتھ اس قسم کا سلوک کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ محبت میں ناکامی کا یہ مطلب نہیں کہ وہ کسی ننھی سی جان پر ستم ڈھا کر اپنے دل کی آگ ٹھنڈی کرے۔

میں نے چونک کر شالیار خان کی طرف دیکھا۔

وہ بھی خاموش کھڑا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔

مجھے حیرت ہُوئی کہ وہ یہ سب کچھ کیسے برداشت کر رہا ہے۔ اسے تو بڑھ کر ریشم جان سے نہ صرف اپنے بیٹے کو چھین لینا چاہیے... بلکہ خود ریشم جان کا رشتہ ریشہ الگ کر دینا چاہیے لیکن وہ خاموش تماشائی تھا۔ وہ اپنے لختِ جگر پر ستم ہوتے دیکھ رہا تھا۔

شہباز کا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا۔ اس کے رُخسار پر ریشم جان کی اُنگلیوں کے نشانات تھے... اور وہ مُسکرا رہا تھا۔

اچانک گھوڑے کی ٹاپیں سُنائی دینے لگیں۔

ریشم جان چونک پڑی۔

اس نے لپک کر شہباز کو اُٹھایا اور دوڑتی ہُوئی وہ جھاڑیوں میں ایک طرف چلی گئی۔ گھوڑے کی ٹاپیں چند لمحوں تک سُنائی دیتی رہیں... پھر قریب سے کوئی گھڑ سوار اس طرف جاتا محسوس ہُوا جدھر قبیلے کا پڑاؤ تھا۔ فضا میں گھوڑے کی ٹاپیں ختم ہو گئیں تو میں نے شالیار خان کی طرف دیکھا۔

وہ جھاڑیوں سے نکل کر اس جگہ پہنچ گیا تھا جہاں کچھ دیر قبل اس کا بیٹا دُنیا کی عجیب ترین تربیت حاصل کر رہا تھا۔ وہ اس جگہ زمین پر بیٹھ گیا اور دیر تک ان ننھے ننھے نقشِ پا کے گرد اُنگلی گھما گھما کر لکیریں بناتا رہا جہاں شہباز ننگے پاؤں کھڑا تھا اور گیلی زمین پر اس کے پیروں کے نشان اُبھر آئے تھے۔

میں آہستہ آہستہ اپنی جگہ سے نکل آیا۔

ایک بار پھر میں شالیار خان سے بات کرنا چاہتا تھا۔

"شالیار خان..." میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

اس نے میری آواز پر پلٹ کر نہیں دیکھا۔

"شالیار..." میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا تو وہ یوں چونک کر تڑپ اُٹھا جیسے میں نے محض چھو کر اس کی رُوح تک کو جھنجھوڑ دیا ہو۔

اس نے میری طرف دیکھا تو اُس کی آنکھوں میں دیوانگی کی سُرخی نظر آ رہی تھی۔ میں اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

"تم نے دیکھا، تمہارے بیٹے کے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟"

"کیا ہو رہا ہے؟" اُس نے پُوچھا۔

وہ یُوں بولا تھا جیسے برسوں بعد اُسے قوتِ گویائی ملی ہو لیکن اس کا انداز سرسری سا تھا۔ مجھے اس کے سوالیہ انداز پر حیرت ہُوئی۔ "کیا تم نے ابھی ابھی نہیں دیکھا؟"

"دیکھا تھا۔" وہ بے پروائی سے بولا۔

"پھر... کیا تم ریشم جان کو ایسا کرنے کی اجازت دو گے؟"

"وہ اس کی ماں ہے۔"

"شہباز لونگی کا بیٹا ہے، شالیار۔" میں نے یاد دلایا۔

"ہاں... لیکن لونگی مر چکی ہے۔" اس کی سرگوشی میں نہ جانے کتنی آرزوؤں اور زخمی آسوں کا تاثر تھا۔ میں کانپ کر رہ گیا۔ "لیکن لونگی مر چکی ہے۔" اس نے دوبارہ کہا۔

"تم تو زندہ ہو، شالیار... تم زندہ ہو۔"

"نہیں..." وہ حلق پھاڑ کر چیخ پڑا۔ "میں بھی مر چکا ہُوں... میں بھی زندہ نہیں ہُوں... صرف شہباز زندہ ہے... اور ریشم جان اسے زندہ رہنا سکھا رہی ہے۔ بابا... یہ زندگی بڑی ظالم ہے۔ اسے گزارنے کے لیے انسان کو کسی ٹھوس چٹان کی طرح ہونا چاہیے... ایسی چٹان جس پر مظالم، ہوسوں اور غموں کا اثر نہ ہو۔"

میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس دیوانے کو دیکھتا رہ گیا۔

وہ اُٹھ کھڑا ہُوا اور ایک طرف روانہ ہو گیا۔

میں دیر تک بیٹھا ان نقشِ پا کو دیکھتا رہا جن کے گرد اُس نے بڑی گہری گہری لکیریں ڈال دی تھیں اور ان لکیروں سے ننھے شہباز کے پیروں کے نشانات بے حد نمایاں ہو گئے تھے۔

ان سنسنی خیز مناظر نے مجھ بوڑھے کے اعصاب پر گہرا اثر ڈالا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ شالیار خان پاگل نہیں ہے۔ وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے اور سب کچھ سمجھ رہا ہے... پھر اس کی خاموشی کا مطلب ہے کہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے، اس میں خود شالیار خان کی رضا مندی شامل ہے۔

اُسی شام میں نے ریشم جان کو دیکھا۔

وہ دن بھر قبیلے سے دُور رہی تھی۔

شہباز اس کے کندھے سے لگا سو رہا تھا۔

وہ اُسے اُٹھائے اپنے خیمے میں چلی گئی تو میں بھی دبے قدموں

اُدھر ہی بڑھ گیا۔ میرے قدموں کی خفیف سی آہٹ پر ریشم جان نے پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھا۔

"آؤ بابا... کیسے ہو؟" اس نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"میں تو ٹھیک ہوں تم اپنی سناؤ؟"

"کیوں... مجھے کیا ہوا؟" اس نے اپنے روایتی اکھڑپن سے پوچھا۔

"بیٹے ریشم جان...!" میں نے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "میں جانتا ہوں کہ تم ایک ضدی اور اکھڑ لڑکی ہو لیکن تمہارے دل میں اپنے بزرگوں کے لیے بڑا احترام ہے۔"

وہ مسکرانے لگی۔

اس کے انداز سے یکایک نرمی جھلکنے لگی تھی۔

موم کو جب آگ کا قرب ملتا ہے تو وہ خود بخود پگھل جاتا ہے۔ اسی طرح ریشم جان کے پتھر دل پر پیار بھری ایک ہی بات نے اثر کر کے اسے موم بنا دیا۔ میں نے اسے مسکراتے دیکھا تو نرمی سے کہا۔ "یہ شہباز کا منہ کیوں سوجا ہوا ہے؟"

"اوہ... یہ۔" وہ لمحے بھر کو گڑبڑا سی گئی۔

"ہاں، ہاں۔ بچوں کے گال عموماً دیکھنے میں پھولے پھولے سے ہی لگتے ہیں۔" میں نے جلدی سے کہا تو اس نے سکون کی گہری سانس لی۔ "بہت ہی پیارا بچہ ہے۔ اس سے مجھے بڑی اُمیدیں وابستہ ہیں۔ یہ ہمارے قبیلے کا نام روشن کرے گا اور..."

"بابا...!" اس نے جلدی سے میرا ہاتھ تھام لیا۔ "تم... تم اسے پڑھا دیا کرو نا؟"

"کیا؟" میں نے چونک کر کہا۔ "یہ ابھی دو سال کا ہے، میری بچی۔ ابھی تو اس نے ٹھیک سے بولنا بھی نہیں سیکھا۔"

وہ ہنس پڑی۔

ہنسنے کا انداز مضحکہ اڑانے والا تھا۔

"یہ سب کچھ سمجھتا ہے... اور بولتا بھی ہے، بابا!" اس نے بڑے فخر سے شہباز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو اس وقت گہری نیند میں ڈوبا ہوا تھا۔

"جب یہ چار سال کا ہو جائے گا تو میں اسے ضرور پڑھانا شروع کر دوں گا۔" میں نے ریشم جان کا ہاتھ تھپتھپا کر کہا۔

"لیکن بابا... تم کافی بوڑھے ہو گئے ہو۔"

"پھر...؟" میں نے چونک کر کہا۔

"کہیں دو سال بعد چل بسو...؟"

میں کھسیا کر ہنس پڑا۔ "زندگی اور موت تو خدا کے ہاتھ میں ہے بیٹی!" میں نے مسکرا کر کہا۔ "اگر میں زندہ نہ رہا تو کیا شہباز کا تعلیمی سلسلہ جاری نہ ہو سکے گا؟"

"اس کے لیے مجھے شہر جانا پڑے گا، بابا... اور میں یہیں رہنا چاہتی ہوں۔ میں شہباز کو شہری نہیں بنانا چاہتی۔ یہ چٹانوں کا بیٹا ہے۔ چٹانوں ہی میں پرورش پائے گا... اور یہ چٹانیں اس کے کارنامے گنگنایا کریں گی..." اُمیدوں کے چراغ اس کی آنکھوں میں روشن ہو گئے۔

"ارے یہ کیا؟" میں نے چونک کر شہباز کے ہاتھ کی طرف اشارہ کیا۔

"اوہ کچھ نہیں..." اس نے جلدی سے کہا اور شہباز کے ہاتھ پر ایک کپڑا ڈال دیا۔

میں نے گہری نظر سے ریشم جان کی طرف دیکھا۔ وہ مجھ سے نگاہ چرا رہی تھی۔ میں دیکھ چکا تھا کہ شہباز کے دائیں ہاتھ کی ایک اُنگلی نہ صرف سوجی ہوئی تھی بلکہ اس میں نیلاہٹ بھی نظر آ رہی تھی۔

"کیا ہوا ہے اسے؟" میں نے قدرے سختی سے پوچھا۔

"اس نے اُنگلی منہ میں دبا کر کاٹ لی تھی۔"

"لیکن نیلاہٹ...؟"

"میں نے دوا لگائی ہے۔"

"دوا کہاں سے آگئی؟" میں مزید چونک پڑا۔

"جنگل جڑی بوٹیوں سے بھرا پڑا ہے، بابا!" اس نے ہنس کر کہا۔ "میں نے اس کے ہاتھ پر ایک بوٹی کا عرق نکال کر لگا دیا تھا۔"

"تم نے ان جڑی بوٹیوں کے بارے میں کس سے سیکھا؟"

"حاجی بابا سے...!"

"ہوں...!" میں کچھ سوچتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ "اچھا، میں اب چلتا ہوں۔ اس کا خیال رکھا کرو بیٹی! یہ ہمارے پاس اجنبی مہمان کی امانت ہے۔"

"اور تم بھی اپنا وعدہ یاد رکھنا، بابا!"

"ہاں، ہاں۔ مجھے یاد رہے گا۔"

میں یہ کہتا ہوا خیمے سے باہر آ گیا لیکن میری دھڑکنیں بے ترتیب تھیں اور میرا جسم پسینے میں شرابور تھا۔ شہباز کی اُنگلی پر نیلاہٹ نے مجھے پریشان کر دیا تھا۔

وہاں سے میں سیدھا حاجی بابا کے خیمے میں پہنچا اور اس سے معلوم کیا کہ ریشم جان نے حال ہی میں اس سے کن جڑی بوٹیوں کے بارے میں پوچھا تھا... اور جب مجھے معلوم ہوا تو میں ہانپتا ہوا بیٹھ گیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"کیا کہا... بچھوؤں کے کاٹے کا علاج کرنے والی جڑی بوٹیاں؟" میں نے حیرت اور خوف سے دریافت کیا تو حاجی بابا نے مثبت میں سر ہلا دیا۔

"کیوں، کیا بات ہے، تم کچھ پریشان ہو گئے ہو؟" حاجی بابا نے میری بدلتی ہوئی حالت دیکھ کر تشویش سے کہا۔ "تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے، خان؟"

"ہاں... میری طبیعت تو ٹھیک ہے... لیکن میں حیران ہوں کہ ریشم جان کو بچھو کے کاٹے کی دوا کے بارے میں معلوم کرنے کی کیوں ضرورت پیش آگئی؟"

"اوہ... وہ... وہ شاید باقاعدہ علاج معالجے کے بارے میں سیکھنا شروع کر چکی ہے۔" حاجی بابا نے ہنس کر کہا۔ "اس لڑکی میں عجیب سی تبدیلیاں پیدا ہوتی جا رہی ہیں؟"

"شاید، تم ٹھیک ہی کہتے ہو۔" میں نے ایک طویل سانس لے کر کہا اور جانے کے ارادے سے اٹھ کھڑا ہوا۔

اس رات مجھے ٹھیک سے نیند بھی نہ آئی۔

تھوڑے تھوڑے وقفے سے سو جاتا تو ایسے بھیانک خواب دکھائی دینے لگتے کہ میں گھبرا کر اٹھ جاتا۔ کبھی شالیار خان کی دیوانگی سے بھرپور آنکھیں نظر آتیں اور کبھی ننھے شہباز کے ہونٹوں پر پھیلی ہوئی وہ مسکراہٹ میرے اعصاب کو جھنجوڑ ڈالتی جسے میں نے دیکھا تھا تو میرے جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی تھی۔

میں ابھی ابھی ایک بھیانک خواب دیکھ کر بیدار ہوا تھا۔

میرا جسم پسینے سے بھیگا ہوا تھا حالانکہ خیمے کے اندر کی فضا میں ہر شے ٹھٹھری ہوئی تھی۔ باہر ویرانوں میں بھٹکتی ہوئی سرد ہوا کے پاگل جھونکے سرسرا رہے تھے اور مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے خیمے کے گرد ان گنت سانپوں نے ڈیرہ ڈال رکھا ہے اور وہ وقفے وقفے سے پھنکارنے لگتے ہیں۔

اچانک مجھے گزشتہ رات کا واقعہ یاد آ گیا جب ریشم جان، شالیار کے خیمے میں گئی تھی۔ اس منظر کو یاد کر کے میرے تجسس نے ایک بار پھر مجھے اُکسانا شروع کر دیا اور میں اپنی بوڑھی ہڈیوں والے ڈھلکے ہوئے جسم کو سردی سے بچانے کے لیے کمبل میں لپیٹ کر اپنے خیمے سے نکلنے پر مجبور ہو گیا۔

باہر اندھیرا تھا۔

ہوا تیز تھی۔ آسمان پر بادلوں کا بسیرا تھا اس لیے چاند اور ستارے دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ ہوا میں نمی محسوس کر کے مجھے یقین ہو گیا کہ کسی بھی وقت بارش شروع ہو سکتی ہے۔

میں اپنے خیمے کے باہر کھڑا رہا۔

میری نگاہ شالیار خان کے خیمے پر جمی ہوئی تھی۔

خیمے میں مدھم روشنی تھی۔ میں نے دوسرے خیموں کی طرف دیکھا۔ ہر خیمہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اچانک مجھے قریب ہی ہلکی سی حرکت کا احساس ہوا۔ میں نے فوراً کتے کو دھیمی آواز میں پکارا۔ وہ میری آواز پہچان کر میرے قدموں میں لوٹنے لگا۔

میں نے سردار کے خیمے کی طرف دیکھا۔ وہاں روشنی کی ہلکی سی بھی کرن نہیں تھی۔ اچانک شالیار خان کے خیمے کے دروازے پر پڑا ہوا پردہ ہٹا اور وہ مجھے وہاں کھڑا دکھائی دینے لگا۔ میں نے خیمے سے باہر آتے وقت چراغ بجھا دیا تھا اس لیے تاریکی کے باعث وہ مجھے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

میں جہاں تھا، وہیں کھڑا شالیار خان کو دیکھتا رہا۔

اس کے ہاتھ میں کچھ نہیں تھا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر ایک تاریک خیمے کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے سانس روک لی۔ وہ ریشم جان کے خیمے کی طرف جا رہا تھا۔ قبیلے کے رسم و رواج کے مطابق کسی غیر شادی شدہ لڑکی کو یوں تنہائی میں ملنا نہ صرف جرم تھا بلکہ خطرناک بھی تھا۔ میری بجائے کسی اور کے علم میں یہ بات آ جاتی تو شالیار کی زندگی خطرے میں بھی پڑ سکتی تھی۔ میں چونکہ شہروں میں گھوم پھر آیا تھا اس لیے قبیلے کے رسم و رواج کی چھاپ مجھ پر اتنی گہری نہیں تھی۔ اس کے علاوہ میں شالیار اور ریشم جان کے جذبات کو بھی اچھی طرح سمجھتا تھا اس لیے میرے نزدیک ان کے ملنے جلنے میں کوئی عیب بھی نہیں تھا۔

شالیار خان تاریک خیمے کے باہر رک گیا۔

اس کا سایہ چند لمحوں کے لیے بے حرکت رہا... پھر میں نے اسے خیمے میں داخل ہوتے دیکھا۔ میں آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ میرا دل شدت سے دھڑک رہا تھا اور مجھے حیرت کے ساتھ خوف کا بھی احساس ہو رہا تھا کہ آخر شالیار خان، ریشم جان کے خیمے میں کیوں گیا ہے؟

ابھی میں چند قدم ہی آگے بڑھا تھا کہ مجھے ٹھٹھک جانا پڑا۔ شالیار واپس آ رہا تھا۔ اس بار اس کے ہاتھوں میں کوئی چیز تھی جسے اس نے بھینچنے کے سے انداز میں سینے سے لگا رکھا تھا۔

وہ جیسے ہی اپنے خیمے میں گیا، میں تیزی سے اس کے خیمے کے پاس جا پہنچا اور اسی سوراخ سے آنکھ لگا دی جس سے میں ایک شب پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔

وہ اپنے بستر پر بیٹھا تھا اور بستر پر مجھے شہباز لیٹا نظر آ رہا تھا۔

جرم اور پوریٹر
پروفیسر محمد اشرف قیمت -/90

میں دل مسوس کر رہ گیا۔

وہ جذبات کے ہاتھوں دیوانہ ہو کر اپنے بیٹے کو ریشم جان کے خیمے سے اُٹھا لایا تھا۔ . لیکن وہ شہباز کو گھور رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ تھی لیکن آنکھوں سے سختی کا احساس ہوتا تھا۔ اس نے بچّے کو لپٹا لیا۔ نیند میں کھویا ہُوا شہباز کسمسانے لگا . . . لیکن وہ اس سے بے پروا اپنے بیٹے کو پیار کرتا رہا۔

میں نے شہباز کو عام بچّوں کی طرح روتے ہُوئے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کی عادتیں شروع ہی سے عجیب تھیں . . . ان عادتوں میں ریشم جان کا ہاتھ تھا یا اُس خون کا اثر تھا جس سے اس کی تخلیق ہُوئی تھی۔ اس سلسلے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا کیوں کہ یہ تینوں کردار بہرحال میرے لیے ناقابلِ فہم تھے . . . اور میں انھی پر تحقیق کر رہا تھا۔

اچانک مجھے خیمے کی دوسری جانب آہٹ محسوس ہُوئی۔

میں وہیں دُبکا رہا۔

جس حصّے کے سُوراخ سے میں خیمے میں جھانک رہا تھا اس طرف تاریکی تھی اس لیے کوئی مجھے آسانی سے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں نے آنکھ سُوراخ سے چپکائے رکھی اور دروازے کی طرف دیکھتا رہا۔ دروازے کا پردہ ہٹا کر اندر آنے والی ہستی ریشم جان کے علاوہ کون ہو سکتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں نیند تھی لیکن اُسے اپنے پہلو میں شہباز کی غیر موجودگی کا احساس ہو گیا تھا اور وہ اُسے تلاش کرتی ہُوئی یہاں تک آ گئی تھی۔

وہ دروازے میں چُپ چاپ کھڑی رہی۔

جیسے ہی اس نے شالیار خان کی گود میں بچّے کو دیکھا اس کے ہونٹوں پر ممتا بھری مُسکراہٹ اُبھر آئی۔ وہ واقعی بے حد عجیب لڑکی تھی۔ میں جب قبیلے سے شہر چلا گیا تھا تو اس وقت وہ چھوٹی سی تھی . . . لیکن ان دنوں بھی وہ ایسی ہی اکھڑ، ایسی ہی دلیر اور ایسی ہی بے باک ہوتی تھی۔

سردار چونکہ اولادِ نرینہ سے محروم تھا اس لیے اس نے ریشم جان کی پرورش بالکل لڑکوں کے سے انداز میں کی تھی۔ جب میں کچھ عرصے کے لیے شہر سے قبیلے میں واپس آیا تھا تو ریشم جان کو دیکھ کر میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ وہ حُسن کی دیوی تھی لیکن ایک ایسی دیوی جس کے قدموں میں قبیلے کا ہر جوان اپنی جان نچھاور کرنے پر آمادہ تھا . . . اور وہ اُن سب سے بے نیاز اپنی ہی دُھن میں مگن تھی۔

اس کے انداز سے کبھی محبت کا وہ تاثر ظاہر نہیں ہُوا تھا جو جوان لڑکیوں کی حیا آلود آنکھوں میں جھلکتا رہتا ہے . . . اور جیسے ہی اس تاثر کو کوئی جام ملتا ہے تو وہ چھلک کر اس میں گرنے کے لیے بے تاب ہو جاتا ہے . . . ریشم جان ایک چٹان تھی۔ خوب صورت چٹان جس سے سر ٹکرا کر پھوڑا تو جا سکتا تھا لیکن اس سے محبت کا چشمہ پھوٹنے کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔

ریشم جان کی تربیت کے لیے قبیلے کے ان تمام لوگوں کی خصوصی خدمات حاصل کی گئی تھیں جن کو کسی نہ کسی فن میں مہارت حاصل تھی۔ وہ بہترین خنجر زن تھی۔ گھڑ سواری میں تو قبیلے کے جوان بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے . . . اس کے علاوہ رائفل سے نشانہ لگانا تو اس کا معمول تھا۔ میں نے نشانے بازی کے جتنے بھی مظاہرے دیکھے تھے، ان میں ریشم جان کی رائفل سے نکلی ہُوئی گولی شاید ہی رائگاں جاتے دیکھی ہوگی۔

میں حیران تھا کہ سردار اس کی موجودہ حالت کو کیوں کر نظر انداز کر رہا ہے۔ معاملہ چونکہ شالیار کا تھا جس سے قبیلے کے بچّے بچّے کو محبت تھی، شاید اسی لیے لوگ ریشم جان کے اس اقدام پر دل ہی دل میں خوش تھے۔ اس طرح ایک فائدہ یہ بھی ہُوا تھا کہ ان لڑکیوں کی از خود جاں بخشی ہو گئی تھی جو ریشم جان کی نت نئی شرارتوں سے بے حد پریشان رہتے تھے۔

. . . اور معاملہ چونکہ ایک معصوم زندگی کا تھا . . . ایک ایسی زندگی کا جس نے خود انھی کے درمیان جنم لیا تھا اس لیے سب کو شہباز سے بھی بے پناہ محبت تھی۔ میں نے عورتوں سے جو اُڑتی اُڑتی سی باتیں سُنی تھیں ان سے مجھے اندازہ ہوتا تھا کہ بعض عورتیں دل ہی دل میں ریشم جان سے حسد بھی کرتی ہیں۔ غالباً شہباز کو گود لینے کی خواہش تھی جسے ریشم جان نے پُورا نہیں ہونے دیا تھا۔

بیٹھے بیٹھے مجھے اپنی پنڈلیوں میں اینٹھن محسوس ہونے لگی۔ مجھے اپنی حالت پر ہنسی آئی کہ میں بیٹھے بٹھائے کس سُراغ رسانی میں پڑ گیا ہُوں . . . لیکن تجسس انسانی فطرت کا تقاضا ہے اور اس کی تسکین بالکل اسی انداز میں ضروری ہے جس طرح بھوک لگنے پر غذا کو پیٹ میں پہنچانا لازمی ہوتا ہے . . . یہ تجسس ہی تھا جس نے مجھ جیسے کمزور بوڑھے کو اتنی ٹھنڈی رات میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بستر سے نکلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ میں اس سوراخ سے آنکھ لگائے لگائے تھکن محسوس کرنے لگا تو ایک لمحے کے لیے ہٹ کر میں نے آنکھوں سے بہتے ہُوئے پانی کو چادر کے کونے سے صاف کیا اور محتاط انداز میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

آس پاس کوئی بھی نہیں تھا۔

ان دونوں کی طرف دیکھتی رہی۔ . . پھر اُس نے بڑھ کر شالیار کی گود سے شہباز کو جھپٹ لیا۔ اگلے ہی لمحے وہ اُسے لے کر تیزی سے باہر چلی گئی۔

شالیار نے اُسے روکنے کی کوشش نہیں کی تھی اور نہ ہی شہباز کو یوں چھین کر لے جانے میں کسی قسم کی رُکاوٹ ڈالی تھی۔ وہ البتہ بے بسی سے دروازے پر لٹکے پردے کو ضرور گھور رہا تھا جس کی اوٹ میں تاریکی ہی تاریکی پھیلی ہُوئی تھی۔

رات کا باقی حصّہ میں نے اپنے خیمے میں آنے کے بعد کروٹیں بدلتے ہُوئے گزارا . . . پھر میں نے یہ سوچ کر آنکھیں بند کر لیں کہ سُورج طلوع ہونے کے بعد ریشم جان پر گہری نگاہ رکھوں گا۔ شہباز کے ہاتھ پر سوزش اور نیلاہٹ مجھے بُری طرح پریشان کر رہی تھی۔

اگلے روز میں خیمے سے کافی دُور ایک چٹان کی اوٹ میں جا کر بیٹھ رہا۔ اس جگہ سے اُس میدانی جگہ کو آسانی سے دیکھا جا سکتا تھا جہاں قبیلے والوں کا پڑاؤ تھا۔

میں بے چینی سے ریشم جان کا انتظار کر رہا تھا۔

وہ کسی بھی لمحے ان جھاڑیوں کی طرف جا سکتی تھی جہاں جانے کے بعد وہ بچّے سے عجیب و غریب کھیل کھیلتی تھی۔ قبیلے کی دوسری جوان لڑکیوں نے ریشم جان کا مذاق بھی اُڑانا شروع کر دیا تھا لیکن وہ کسی کی سُنتی ہی کب تھی۔ وہ ہر بات کو خاموشی سے سہہ جاتی جیسے یہ زخم کھانے کے لیے اس کے سینے میں بے پناہ وسعت پیدا ہو گئی ہو۔

بیٹھے بیٹھے کافی دیر ہو گئی۔

اب تک تو اُسے خیمے سے نکل آنا چاہیے تھا۔

میں تھکن محسوس کرنے لگا۔ جب کچھ وقت اور گزر گیا تو مجھے مایوسی ہونے لگی۔ ریشم جان ابھی تک خیمے سے نہیں نکلی تھی۔ شاید آج وہ باہر نہ آئے۔ میں نے سوچا اور ایک بار پھر میرے ذہن میں شہباز کے ننّھے سے ہاتھ کی سوزش اور نیلاہٹ تازہ ہو گئی۔

ابھی میں اُٹھنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ مجھے ریشم جان نظر آ گئی۔ وہ شہباز کو اُٹھائے جنگل کی طرف جا رہی تھی۔ میرے جسم سے تھکن کافور ہو گئی اور میں بے چینی سے پہلو بدلنے لگا۔ وہ تیزی سے انہی جھاڑیوں کی طرف جا رہی تھی۔ شہباز کو اُٹھائے جب وہ جھاڑیوں میں جا کر میری نگاہ سے اوجھل ہو گئی تو میں نے ایک بار پھر اِدھر اُدھر دیکھا۔

شالیار خان صبح سے کہیں دکھائی نہیں دیا تھا۔

وہ یا تو مُنہ اندھیرے ہی اپنے خیمے سے نکل گیا تھا یا پھر ابھی تک خیمے میں پڑا سو رہا تھا۔ میں تیز تیز اُن جھاڑیوں کی طرف چلنے لگا . . . اور پھر میں اُسی درخت تک جا پہنچا جس کی اوٹ سے میں انھیں پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ شہباز کو زمین پر بٹھا کر وہ اس کے سامنے بیٹھی تھی اور کچھ کہہ رہی تھی۔ آواز دھیمی تھی۔ میں نے ننّھے شہباز کو ایک بار پھر مُسکراتے ہُوئے دیکھا۔ وہی مُسکراہٹ جس نے گزشتہ روز میرے اعصاب کو جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا . . . اور جسے کسی طرح بھی کسی بچّے کی معصوم مُسکراہٹ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

ریشم جان کچھ کہتی رہی . . . پھر وہ ہنس پڑی۔

میں نے جھاڑیوں کے اس حصّے کی طرف دیکھا جہاں میں نے دو بار شالیار کو کھڑے دیکھا تھا۔ آج وہ موجود نہیں تھا۔ ہنسی پر قابو پانے کے بعد ریشم جان نے شہباز کے قریب ہی رکھا ہُوا ایک مٹی کا برتن اُٹھا لیا . . . . یہ برتن وہ ساتھ لائی تھی یا پہیں کہیں چھپا

جاسوسی ڈائجسٹ کے مقبول سلسلے
ناگ
اقلیم علیم
30 روپے
سنگ
Scanned By: Azam & Ali

مکتبہ القریش سرکلر روڈ اردو بازار لاہور
فون 7668958

رکھا تھا اس کے بارے میں مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کیونکہ میں اسے پہلی بار دیکھ رہا تھا۔

یہ برتن مٹی کی ہنڈیا جیسا تھا۔

اس کے منہ پر کپڑا لپیٹ کر باندھ دیا گیا تھا۔

ننھے شہباز کا ایک ہاتھ مٹھی کی شکل میں بند تھا اور اس میں مٹی بھری ہوئی تھی۔ اس نے مٹی کو ریشم جان کی طرف اچھال دیا اور ہنسنے لگا... پھر دوبارہ زمین پر پنجہ گاڑ دیا اور مٹھی کو مٹی سے بھرنے لگا۔

اس دوران میں ریشم جان اس سے بے خبر اپنے کام میں مصروف رہی۔ اس نے ہنڈیا کا منہ کھول کر کپڑا ہٹا دیا تھا اور پھر ہنڈیا کو اٹھا کر کھڑی ہو گئی تھی۔ چند لمحوں تک وہ ادھر اُدھر دیکھتی رہی... پھر اس نے ایک طرف چلنا شروع کر دیا۔

وہ جھاڑیوں میں جا کر میری نگاہ سے اوجھل ہو گئی۔

میں درخت سے ٹیک کر کھڑا ہو گیا۔

مجھے حیرت تھی کہ یہ ستم ایجاد اب نہ جانے کس ارادے سے بچے کو تنہا چھوڑ کر گئی ہے۔ ابھی میں انہی خیالوں میں ڈوبا کھڑا تھا کہ اچانک میری سماعت سے شہباز کی کلکاری ٹکرائی۔

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

...اور میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

میں نے زور سے چیخنا چاہا لیکن بدحواسی اور دہشت کی وجہ سے میرا حلق خشک ہو گیا۔ ذرا سی بھی آواز تک نہ نکل سکی۔ وہ ایک مٹیالے رنگ کا پتلا سا سانپ تھا جو جھاڑیوں سے رینگتا ہوا نکلا تھا اور آہستہ آہستہ شہباز کی طرف بڑھ رہا تھا۔

میرا خیال تھا کہ شہباز اسے دیکھ کر چیخ پڑے گا... لیکن ایسا نہیں ہوا۔ وہ تو اسے دیکھ کر یوں خوش ہو رہا تھا جیسے سامنے سے کوئی جیتا جاگتا سانپ نہیں بلکہ کوئی کھلونا حرکت کرتا ہوا چلا آ رہا ہو۔

میں اپنی جگہ سے نکل آیا۔

تیزی سے آگے بڑھا اور ایک پتھر اٹھا لیا۔

اس دوران میں میں نے ایک دو بار چیخ کر ریشم جان کو آواز دینے کی بھی کوشش کی لیکن میرے حلق سے آواز نہ نکل سکی۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں اس وقت بے پناہ دہشت میں مبتلا ہو گیا تھا اور میری پنڈلیاں بُری طرح کانپنے لگی تھیں۔ میرا وہ ہاتھ جس میں پتھر تھا، بے جان سا ہو رہا تھا... اور مجھے یقین نہیں تھا کہ میرا پھینکا ہوا پتھر سانپ کو مار ڈالے گا یا نہیں... سانپ اب شہباز کے بالکل سامنے تھا۔

میں شہباز کی پشت پر تھا اس لیے پتھر پھینکنا بھی ممکن نہیں رہا تھا۔ میں نے ہانپتے ہوئے پہلو میں جھک کر سانپ کی طرف دیکھا۔

شہباز کا ہاتھ آہستہ آہستہ سانپ کی طرف بڑھ رہا تھا۔

...اور پھر شہباز نے ہاتھ بڑھا کر سانپ کو گردن سے پکڑ لیا۔

سانپ بڑے زور سے پھنکارا۔

مارے کپکپاہٹ کے میں زمین پر گر گیا۔

میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس احمق لڑکی نے ایک ننھے بچے کی زندگی خطرات میں ڈال دی تھی اور اب وہ موت سے دوچار ہونے والا تھا۔ پھنکار سنائی دی تو میں یہی سمجھا کہ سانپ نے شہباز کو ڈس لیا ہوگا... لیکن جب شہباز کی چیخ سنائی نہ دی تو مجھے حیرت ہوئی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھول دیں۔

ایک بار پھر میرے سامنے جو منظر تھا اس پر مجھے کسی بھیانک خواب کا گمان ہونے لگا۔ شہباز نے سانپ کو مٹھی میں دبا رکھا تھا... اور سانپ اس کے ہاتھ میں اینٹھ کر پورے جسم سے لہرا رہا تھا... کسی کوڑے کی طرح حرکت کرتا ہوا وہ شاید اس کے جسم سے لپٹ پڑنے کی فکر میں تھا۔

شہباز کی مٹھی سے سانپ کی سُرخ سُرخ نکلی ہوئی تھی اور اس کی دوشاخہ زبان مجھے صاف نظر آ رہی تھی لیکن گرفت غالباً اتنی مضبوط تھی کہ وہ شہباز کو ڈس لینے میں کامیاب نہیں ہو پا رہا تھا۔ اس کا منہ کھلا تھا اور اس کی دوشاخہ زبان بار بار غضبناک انداز میں حرکت کر رہی تھی۔ جسم اب بھی لہرا رہا تھا۔

مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ اس کے جسم یا بازو سے لپٹ نہ جائے ایسے میں بچے کی ہڈیاں تک ٹوٹ سکتی تھیں... لیکن وہ اُسے اچھا جکڑے خود سے دُور رکھے ہوئے تھا۔

اچانک شہباز کے حلق سے دھیما سا قہقہہ نکل گیا۔

یہ کسی دو ڈھائی سالہ بچے کا قہقہہ نہیں ہو سکتا تھا۔ ایک لمحے کے لیے تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے ننھے سے وجود پر کوئی شیطانی رُوح حلول کر گئی ہو۔ اس نے قہقہہ لگانے کے بعد ہاتھ کو ذرا سا موڑا اور پھر سانپ کا منہ زمین سے لگا دیا۔

یہ سب کچھ اس سے نادانستگی میں ہو رہا تھا یا یہ بھی یوسف شاہ کی تربیت کا اثر تھا۔ میں اس سلسلے میں کوئی قیاس آرائی کرنے سے قاصر ہوں۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ شہباز نے سانپ کے منہ کو زمین سے رگڑ ڈالا تھا۔

سانپ بُری طرح تڑپ رہا تھا۔

زمین سے اس کی دُم ٹکرا کر کسی کوڑے جیسی آواز پیدا کر رہی تھی... اور پھر سانپ کو موقع مل گیا۔ اس نے شہباز کے بازو کو لپیٹنا شروع کر دیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شاید شہباز نے اس کا منہ کچھ زیادہ ہی زور سے رگڑ دیا تھا کہ لپٹنے کے بعد سانپ کا زور ختم ہو گیا تھا۔ میں نے اب بھی بچے کے حلق سے رونے یا چیخنے کی آواز نہیں سُنی۔

میں اس منظر سے اس قدر متاثر ہُوا تھا کہ مجھے گرد و پیش کا بھی ہوش نہ رہا۔ یہی وجہ تھی کہ جب ریشم جان واپس آئی تو میں اس کے قدموں کی آہٹ تک نہ سُن سکا۔ وہ مجھے دیکھ کر حیرت سے چیخ پڑی۔

"تم یہاں کیا کر رہے ہو بابا؟" اس نے پوچھا۔

"میں ادھر سے گزر رہا تھا کہ جھاڑیوں میں ایک سانپ سرسراتا ہُوا نظر آیا۔ تب ایک بچے کے چیخنے کی آواز سنائی دی تو میں دوڑتا ہُوا یہاں پہنچا اور..."

"اور پھر بچے کی مدد کرنے سے پہلے ہی گر کر بے ہوش ہو گئے۔"

اس نے مضحکہ اُڑانے والے انداز میں میرا جملہ مکمل کر دیا۔

"تم شہباز کو تو دیکھو کہیں..."

"اوہ..." وہ چونک کر بچے کی طرف متوجہ ہو گئی۔

میں اب تک خود کو سنبھالنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

ریشم جان نے شہباز کے بازو سے لپٹے ہُوئے سانپ کو ہٹایا اور پھر اس کے مُردہ جسم کو دُور پھینک دیا۔ سانپ مر چکا تھا۔ شہباز نے اس کا منہ بُری طرح زمین سے رگڑ دیا تھا۔

میں نے اس کے بازو کا جائزہ لیا۔

دُم توڑتے ہُوئے سانپ نے بھرپور انداز میں لپٹنے کی ناکام کوشش کی تھی۔ شہباز کے بازو کو کوئی قابلِ ذکر نقصان نہیں پہنچا تھا۔ وہ اب بھی مُسکرا رہا تھا اور ریشم جان اُسے بُری طرح چوم رہی تھی۔

"تم نے دیکھا بابا..." اس نے فخر سے کہا۔

"ہاں... میں دیکھ رہا ہوں۔" میں نے سنجیدگی سے کہا "لیکن ریشم جان تمہیں یہ سب کچھ کرنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔"

"کیا مطلب؟" وہ چونک پڑی۔

"میں آج ہی سردار سے بات کروں گا کہ وہ شہباز کی نگرانی کا کام کسی تجربہ کار عورت کو سونپ دے۔"

"بابا..." وہ دیوانگی کے عالم میں چیخ پڑی۔

"تم پاگل ہو گئی ہو۔ آخر تم یہ سب کچھ کیوں کر رہی ہو احمق لڑکی؟" میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

اس کے لہجے میں طغیانی تھی۔

اس کی آنکھیں یکایک دہک اٹھی تھیں۔

نہ جانے اس نے اچانک ہی کہاں سے ایک چاقو نکال لیا

...مجھے اس سے اس بات کی توقع نہیں تھی۔ میں ایک ناتواں بوڑھا تھا اور میرے لیے یہ سب کچھ ناقابلِ برداشت ہوتا جا رہا تھا۔ اس لیے میں نے اُسے دھمکی دے دی تھی... لیکن مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ اس دھمکی کا کیا نتیجہ نکلے گا... اور اب نتیجہ میرے سامنے تھا۔

ریشم جان کے انداز میں درندگی تھی۔

اس کی آنکھوں میں حیا اور احترام کا وہ تاثر نہیں تھا، جسے میں نے اپنے لیے ہمیشہ اس کی آنکھوں میں پایا تھا۔ وہ میرے سامنے اجنبی بنی کھڑی تھی... صرف اجنبی ہی نہیں... میرے خون کی پیاسی بھی...

آہستہ آہستہ اس نے میری طرف بڑھنا شروع کر دیا۔

میں نے پیچھے ہٹنے کی کوشش کی تو میری ایڑی کسی پتھر سے ٹکرا گئی اور میں پشت کے بل گر گیا۔ اسی لمحے وہ چیتے کی بپھری ہوئی مادّہ کی طرح مجھ پر جھک گئی۔ اس کا ایک ہاتھ میرے نرخرے پر جم گیا۔

"تم ایسا کرنے کے لیے زندہ نہیں رہو گے۔" اس کے حلق سے غراہٹ نکلی۔

"ریشم جان! میں تمہارا بزرگ ہوں اور..."

"تم کوئی بھی ہو۔ جو کچھ جانتے ہو اپنی ذات تک محدود رکھو ورنہ میں تمہارا خون پی جاؤں گی۔" اس کے لہجے میں اتنی درندگی تھی کہ میں کانپ گیا۔ میں نے سر کو مثبت جنبش دے کر حامی بھرلی کہ میں اپنی زبان بند رکھوں گا تب کہیں وہ مجھ سے دُور ہٹ کر کھڑی ہوئی۔

"تم اپنی زبان بند رکھو گے نا؟"

میں نے ایک بار پھر سر کو اثبات میں ہلا دیا۔

"اگر تم نے اس سلسلے میں کسی سے ایک لفظ بھی کہا تو سمجھ لینا کہ وہ تمہاری زبان سے نکلے ہُوئے آخری الفاظ ہوں گے۔"

"جب کہ تم یہ چاہتی ہو کہ میں شہباز کو زیورِ تعلیم سے بھی آراستہ کروں۔" میں نے خود کو مزید سنبھالتے ہُوئے اپنی اہمیت جتائی۔

اس کے چہرے پر فوراً ہی ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔

میں نے اتنی تیزی سے کسی کے چہرے کے تاثرات کو بدلتے ہُوئے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کی قوتِ فیصلہ واقعی بے پناہ تھی۔ اس نے فوراً ہی اپنی درندگی سے تمتمائی ہُوئی رنگت پر مسکراہٹ کا لبادہ چڑھا دیا۔

"میں تو تمہیں ڈرا رہی تھی بابا۔" اس نے ہنس کر کہا۔

"میں جانتا ہوں۔" میں بھی ہنس پڑا لیکن میری دھڑکنیں اب بھی بے ترتیب تھیں۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ اپنے انداز میں یکایک تبدیلی پیدا کرنے پر کیوں مجبور ہو گئی ہے۔ بلاشبہ اس وقت میری جگہ

کوئی اور ہوتا تو شاید اس کا ہاتھ کبھی نہ رُکتا۔

اس صورتِ حال سے مجھے ریشم جان کے جذبات کی شدت کا اندازہ ہوگیا۔ وہ اس معاملے میں انتہائی حد تک سنجیدہ تھی۔ وہ شہباز کی پرورش منفرد انداز میں کرکے اُسے نہ جانے کیا بنانا چاہتی تھی کہ دو ڈھائی سال کی عمر سے ہی اس نے معصوم شہباز کو اذیتوں کا عادی بنانا شروع کر دیا تھا۔

"تم اس بچے سے ایسا سلوک کیوں کر رہی ہو، ریشم جان؟" میں پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

"میں اسے ایک لافانی کردار بنانا چاہتی ہوں۔"

"کیا تمہیں اس سے محبت نہیں ہے؟"

"محبت..." اس نے مسکرا کر کہا۔ "تم کیا جانو بابا کہ محبت کیا ہوتی ہے۔ تم نے اپنی زندگی کا زیادہ حصہ غیروں میں رہ کر گزارا ہے۔ تم نے کئی شہروں میں زندگی بسر کی ہے اس لیے تمہارے خیالات اور تمہارے جذبات میں بھی انتشار ہے۔ محبت کوئی بکھرا ہُوا جذبہ نہیں ہے۔"

"لیکن آدمی کو غیر معمولی نہیں ہونا چاہیے۔ اس طرح وہ انسان ہونے کی لذّت سے محروم ہو جاتا ہے۔"

"انسان..." وہ ہنس پڑی۔ "یہ انسانوں کا زمانہ نہیں ہے بابا... یہ درندوں کا زمانہ ہے۔ انسانوں کا زمانہ تو شاید زمین پر ازل سے نہیں رہا۔ ہر دَور میں اور ہر وقت میں درندے ہی غالب رہے ہیں۔ میں شہباز کو ایک ایسا درندہ بنانا چاہتی ہوں، جو انسان نُما درندوں کو کچا کھا جایا کرے گا۔" اس نے مُٹھیاں بھینچ کر بڑے جوش و خروش سے کہا۔

میں اس کی باتوں سے متاثر تو ضرور ہُوا تھا۔ وہ ایک اعتبار سے ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ شہباز کے باپ دادا کے ساتھ جو مظالم ہوئے تھے۔ ان کی روشنی میں شہباز کی اس انداز میں پرورش ناگزیر تھی... لیکن پھر بھی میں ریشم جان جیسی لڑکی سے اس بات کی توقع نہیں کر رہا تھا۔

"تم اسے کب سے پڑھانا شروع کر رہے ہو بابا؟"

"کیا یہ باتیں کر سکتا ہے؟"

"ہاں..." اس نے بڑے فخر سے کہا۔ "آؤ... میں تمہیں اس کی باتیں سنواؤں۔" اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور ہم شہباز کے قریب ہی زمین پر بیٹھ گئے۔ بچہ میری طرف دیکھ رہا تھا اور اس کی پلکیں تک نہیں جھپک رہی تھیں۔

"شہباز..." ریشم جان نے کہا۔ "میں کون ہوں؟"

"ماں... ماں..."

"اور تم میرے کیا لگتے ہو؟"

"بیٹا... بیٹا..."

"تم نے ابھی ابھی کس چیز کو پکڑ لیا تھا؟"

"سس... سا... نپ..."

"اوہ!" میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ میں نے بے یقینی سے پہلے شہباز اور پھر ریشم جان کی طرف دیکھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اس نے سانپ کو نادانستگی میں نہیں بلکہ دانستہ پکڑ لیا تھا... اور پھر اسے ہلاک کر دیا تھا۔ میں نے اس بات کی تصدیق کے لیے پوچھا۔ "تم نے سانپ کو کیسے مارا تھا؟"

اس نے مٹھی میرے سامنے بند کی اور پھر اُسے زمین پر رگڑنے لگا۔

اس کی آنکھیں یکایک چمک اُٹھی تھیں۔

"اگر وہ سانپ تمہیں ڈس لیتا تو...؟"

"ماں..." شہباز نے ریشم جان کی طرف انگلی سے اشارہ کیا اور زور سے ہنس پڑا۔ اس کا صاف مطلب تھا، اُسے ریشم جان پر اتنا بھروسہ تھا کہ وہ سانپ کے کاٹنے سے بھی خوف محسوس نہیں کرتا تھا۔

"ذرا اپنا ہاتھ تو دکھاؤ۔" میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

اس نے اپنا ہاتھ بے دھڑک میرے ہاتھ میں دے دیا۔ تب میں نے پہلی بار دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں بچوں جیسی نرمی اور لچک نہیں ہے۔ اس کا ہاتھ سخت تھا اور اُسے دباتے ہوئے مجھے طاقت لگانی پڑ رہی تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

"ٹھیک ہے۔ میں اسے پڑھاؤں گا۔ جو کچھ میں نے سیکھا ہے اسے سکھاؤں گا۔" میں نے کہا اور اُٹھ کھڑا ہُوا... تبھی میں نے چونک کر شہباز کے اس ہاتھ کی طرف دیکھا جس پر مجھے کل سوزش اور نیلاہٹ کا احساس ہُوا تھا۔ وہ ہاتھ اب بھی سُوجا ہوا تھا لیکن نیلاہٹ کم ہو گئی تھی۔

"اس ہاتھ میں کیا ہُوا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"بچھو نے کاٹا تھا۔" ریشم جان نے جواب دیا۔

میں آنکھیں پھاڑ کر رہ گیا۔ "وہ کیسے؟"

"یہ بچھو کو پکڑ کر مار بھی سکتا ہے، بابا۔" ریشم جان نے بڑے فخر سے بتایا اور شہباز کی طرف دیکھنے لگی۔ "ٹھیک ہے، نا شہباز؟"

شہباز کی آنکھوں میں چمک نظر آنے لگی۔ جیسے اس کا پسندیدہ موضوع چھڑ گیا ہو۔ اس کے ہونٹ اُسی خوفناک مسکراہٹ کے انداز میں پھیل گئے۔ جسے دیکھ کر میرے بدن میں سنسنی دوڑ جاتی تھی۔

میں نے ریشم جان کی طرف دیکھا۔

"کیا تم اس منظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتے ہو، بابا؟" اس نے میری آنکھوں میں تجسّس کی جھلک دیکھتے ہوئے کہا۔

تب مجھے اس ہنڈیا کا خیال آیا جو اُس کے قریب ہی رکھی ہُوئی تھی۔ میں نے دیکھا کہ ہنڈیا کے مُنہ پر کپڑا ڈال کر اُسے ایک طرف سے گرہ لگا دی گئی تھی حالانکہ جب ہنڈیا لے کر وہ جھاڑیوں کی طرف گئی تھی تو کپڑا اُس نے پہلے ہی ہٹا لیا تھا۔

"اس میں کیا ہے؟" میں نے بے ترتیب ہونے والی سانسوں پر بمشکل قابو رکھتے ہُوئے دریافت کیا۔

"تین بچھو..."

میں آنکھیں پھاڑتا رہ گیا۔ مجھے اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں نے دُنیا دیکھی تھی اور ہر قسم کے لوگوں سے مل چکا تھا۔ میں توہم پرست بھی نہیں تھا.. لیکن جو کچھ مجھے گزشتہ چند دنوں سے نظر آ رہا تھا، اس پر یقین کرنے کی کوئی دانش مندانہ دلیل میرے پاس نہیں تھی۔

"تم ان بچھوؤں کو کہاں سے لائی ہو؟"

"ندی کے کنارے، پتھروں کے نیچے سے..."

"کیا یہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاتے؟"

وہ ہنس پڑی۔ "بچھو کیسے نقصان نہیں پہنچاتا، بابا... اس کی تو عادت ہی ڈنک مارنا ہے۔ یہ جس سے محبت کرتا ہے، اس کو بھی ڈنک مارتا ہے اور جس سے اُسے دُشمنی ہوتی ہے، اس کے جسم میں زہر اُتارنا تو بہرحال اس کا کام ہی ہے۔ بچھو کی فطرت سے کون واقف نہیں ہے۔"

"پھر تم انہیں کیسے پکڑ لیتی ہو؟"

"یہ بھی ایک فن ہے جس پر میں نے بہت محنت کی تھی، بابا۔" اس نے جواب دیا اور ہنڈیا پر لپٹا ہُوا کپڑا کھولنے لگی۔

میں چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔

کپڑا ہٹانے کے بعد اس نے ہنڈیا کو اُلٹ دیا۔

اس میں سے ایک بچھو زمین پر گر گیا۔ باقی دو غالباً اندر ہی چپکے رہ گئے تھے کہ ریشم جان نے جلدی سے ہنڈیا کے مُنہ پر کپڑا ڈال کر اُسے دوبارہ بند کر دیا۔ میں نے کن انکھیوں سے شہباز کی طرف دیکھا وہ بڑے غور سے بچھو کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ بچھو کی دہشت مجھے اپنی رگ و پے میں محسوس ہو رہی تھی... لیکن بچہ اُسے یُوں دیکھ رہا تھا جیسے مہلک بچھو کی بجائے کوئی من پسند کھلونا دیکھ رہا ہو۔ میں نے ہانپتے ہُوئے، بچھو اور بچے دونوں کی طرف دیکھنا جاری رکھا۔ اس دوران میں ریشم جان خاموش اور بے حس و حرکت بیٹھی ہُوئی تھی۔

"سانس روک لو بابا... ہانپتے ہوئے تم اپنی موجودگی کا اعلان کر رہے ہو۔" ریشم جان نے سرگوشی کی۔

میری اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی کیونکہ بچھو نے آہستہ آہستہ میری ہی طرف بڑھنا شروع کر دیا تھا۔ میری سانس رُک گئی تو بچھو یُوں رُک گیا جیسے اچانک ہی اس کی بینائی متاثر ہو گئی ہو۔ یہ میرے لیے ایک انکشاف تھا۔ میں نے ننھے شہباز کی طرف دیکھا۔ اس کے نرخرے کے قریب ایک ننھی سی رگ بار بار تڑپ رہی تھی۔ اس کے نتھنے بے حرکت تھے اور ہونٹوں پر کھنچاؤ تھا۔ یُوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس نے بھی سانس روک رکھی تھی۔

بچھو نے ڈنک اُبھار رکھا تھا۔

اس نے اچانک، اُسی جگہ گھومنا شروع کر دیا۔

موت کا رقص تھا... زہر میں بجھی ہُوئی حرکات تھیں۔

میرا جسم ٹھنڈے پسینے سے بھیگ رہا تھا۔ گزشتہ چند دنوں میں میرے سامنے جتنے ناقابلِ یقین مناظر آئے تھے اور مجھے جتنی حیرتوں سے دوچار ہونا پڑا تھا، ان سے میرے دل و دماغ پر گہرا اثر ہُوا تھا... اور میں سوچ رہا تھا کہ اگر میں اسی طرح خوف و دہشت میں چند روز مزید مبتلا رہا تو شاید میری حرکتِ قلب ہی بند ہو جائے گی۔

شہباز کا ہاتھ رفتہ رفتہ آگے بڑھنے لگا۔

مجھے اپنا دم گھٹتا محسوس ہُوا۔

میں نے ایک طویل اور گہری سانس لے کر سینے میں روک لی اس دوران میں شہباز کا ہاتھ بچھو کے اوپر فضا میں معلق ہو چکا تھا... پھر وہ کسی شہباز ہی کی طرح بچھو پر جھپٹ پڑا۔

ایک لمحے میں یہ سب کچھ ہو گیا۔

میں نے آنکھیں سختی سے بند کر لیں۔

میرا خیال تھا کہ بچھو نے شہباز کے ہاتھ پر ڈنک مار دیا ہو گا اور وہ زمین پر لیٹا تڑپ رہا ہو گا... لیکن ایسا نہیں تھا۔ میں نے جب آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں تو زمین پر بچھو بے حرکت پڑا تھا... اور شہباز کے ہاتھ کا ریشم جان جائزہ لے رہی تھی۔

"دیکھو... دیکھو بابا..." ریشم جان نے چہک کر کہا۔ "شہباز کے ہاتھ پر کوئی نشان نہیں ہے۔ اس نے اتنی پھرتی سے اُسے اُٹھا کر انگلیوں سے مسلتے ہُوئے زمین پر پھینک دیا تھا کہ بچھو کو ڈنک مارنے کا موقع ہی نہیں مل سکا... اور میں اسے ایسا ہی بنانا چاہتی ہوں کہ کوئی اسے ابھی نقصان پہنچانے کا ارادہ ہی کر رہا ہو

لیکن شہباز اس پر حاوی ہو جائے۔ کیا یہ غلط اقدام ہے، بابا؟"

"یہ غیر فطری۔۔۔ اوہ۔۔۔ غیر معمولی ہے۔"

"انسان کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔" اس نے ہٹ دھرمی سے کہا۔

"لیکن یہی بچھو اسے شاید کل کاٹنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔"

"ہاں۔۔۔ جب انسان لاپروائی کرتا ہے تو اسے اس کی سزا بھی بھگتنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔"

"لیکن یہ بھی تو دیکھو کہ شہباز ابھی بچہ ہے۔"

"ہاں۔۔۔ لیکن تم جیسے بوڑھے اور تجربہ کار آدمی سے زیادہ دلیر اور پھرتیلا ہے۔ تم نے تو یوں آنکھیں بند کر لی تھیں جیسے بچھو کی بجائے کوئی ایسی گولی ہو جو ہاتھ لگتے ہی پھٹ پڑے گی۔" اس نے میرا مضحکہ اڑاتے ہوئے شہباز کو اٹھا لیا۔ "ابھی اس ہنڈیا میں دو بچھو باقی ہیں۔ بس ان سے نمٹ لینے کے بعد شہباز کا آج کا کام ختم ہو جائے گا۔۔۔ باقی کل دیکھیں گے۔" وہ یہ کہہ کر ایک بار پھر ہنڈیا کی طرف متوجہ ہو گئی۔

شہباز کو گود سے اتارنے کے بعد اس نے ہنڈیا کا کپڑا۔۔۔ کھول کر ایک اور بچھو کو نکالا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے شہباز نے اسے بھی جھپٹ کر مار دیا۔ اسی طرح ریشم جان نے تیسرے بچھو کو بھی ٹھکانے لگوا دیا۔

ریشم جان نے جھپٹ کر شہباز کو گود میں اٹھا لیا اور میری طرف دیکھ کر فخریہ انداز میں مسکرانے لگی۔ اس وقت وہ ممتا کے جذبے سے سرشار ایک ایسی ہی ماں نظر آ رہی تھی جس کی اولاد نے اس کی ساری تمنائیں پوری کر کے اسے سرخرو کر دیا ہو۔ ایک ریشمی جسم والی لڑکی اتنی سنگلاخ زمین سے ایک ایسی ہستی کو ابھارنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں یہ سوچ سوچ کر بالکل بجھا جا رہا تھا۔

واپسی میں وہ میرے ساتھ ہی قبیلے کی طرف چلتی رہی۔

"شالیار خان کہاں ہے، ریشم؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے کیا پتہ۔" وہ بھڑک کر بولی۔

"اس میں ناراض ہونے کی کیا بات ہے؟" میں نے حیرت ظاہر کی۔

"مجھ سے سوائے شہباز کے اور کچھ نہ پوچھا کرو۔" اس نے سختی سے جواب دیا۔ "اور ہاں۔۔۔ کل سے اسے پڑھا رہے ہو نا؟"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اگلے روز سے میں نے شہباز کو پڑھانا شروع کر دیا۔ وہ واقعی ایک غیر معمولی بچہ تھا۔ اتنی کم عمری ہی میں اسے خاصی سوجھ بوجھ تھی۔ وقت یونہی پر لگا کر اڑتا رہا اور دن تیزی سے گزرتے رہے۔ اس دوران میں، میں نے شہباز اور ریشم جان کا بارہا پیچھا کیا اور ایسے ایسے دل دہلا دینے والے مناظر میرے سامنے آئے کہ میں اپنی ناتواں جان سے کانپ کانپ جاتا تھا۔

سانپوں اور بچھوؤں سے لے کر درندوں تک ریشم جان نے شہباز کو ہر چیز سے آشنا کر دیا تھا۔ وہ تھا بھی بڑا بہادر اور نڈر۔۔۔ ریشم جان کے ایک اشارے پر آنکھیں بند کر کے عمل کر ڈالتا تھا، چاہے اسے کتنی ہی جسمانی اذیت کیوں نہ برداشت کرنا پڑے۔ وہ بے پناہ قوتِ برداشت والا لڑکا ثابت ہوا۔ ذہین اتنا تھا کہ ایک بار اسے جو سکھا دیا جاتا۔۔۔ وہ تو گویا اس کے ذہن پر ہمیشہ کے لیے نقش ہو جاتا تھا۔

جب وہ سات سال کا ہوا تو میری صحت اتنی گر گئی تھی کہ میں صاف دیکھنے کے قابل بھی نہیں رہ گیا تھا۔ میں نے ایک روز اس کے گال کو سہلاتے ہوئے کہا: "شہباز۔۔۔ تمہیں اپنے باپ سے محبت ہے؟"

"ہاں بابا۔۔۔ بہت زیادہ۔" اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

"اپنی ماں سے بھی زیادہ؟"

اس بار شہباز نے فوراً ہی جواب نہیں دیا۔ میں نے اسے جذباتی امتحان میں ڈال دیا تھا۔ اس کی پیشانی پر الجھن کی سلوٹیں نظر آنے لگیں تو میں نے ہنس کر کہا: "ارے چھوڑو بھی۔۔۔ تم کس سوچ میں پڑ گئے۔ میں نے تو یونہی پوچھ لیا تھا۔"

"یہ ایک ایسا سوال ہے، بابا۔۔۔ جس کا جواب خود مجھے بھی معلوم نہیں۔" اس نے اداس ہوتے ہوئے کہا۔ "یہ سوال میں نے اپنے آپ سے بھی بارہا کیا ہے۔۔۔ لیکن کوئی جواب نہیں سوجھتا۔"

میں نے اسے لپٹا لیا۔

شالیار خان کی صحت بہت گر گئی تھی اور اب وہ پوری طرح پاگل ہو گیا تھا یا پھر شاید وہ اپنے آپ میں گم رہنے والا دیوانہ تھا۔ کسی سے کچھ نہیں کہتا تھا، کسی کی سنتا بھی نہیں تھا۔۔۔ اور اب تو اس نے شہباز سے بھی بات چیت بند کر دی تھی۔ وہ اسے دیکھ کر سہم سا جاتا تھا جیسے اسے خوف ہو کہ اگر اس سے دل لگایا تو کہیں یہ متاعِ حیات بھی اس سے چھن نہ جائے۔

پانچ سال کا عرصہ جیسے پلک جھپکتے ہی گزر گیا۔

سات سالہ شہباز زیادہ لمبے قد کا نہیں تھا لیکن اس کے لڑکپن میں ایک وقار تھا۔ اچھا خاصا آدمی اس سے بات کرتے ہوئے ہچکچاہٹ محسوس کرنے لگتا تھا۔ اس نے پڑھنے کی طرف خاص توجہ دی تھی اور جو کچھ میں جانتا تھا، وہ مجھ سے سیکھ چکا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیکن اس کا ذہنی رجحان زیادہ تر ہتھیاروں کی جانب تھا۔ گھڑ سواری اور رائفل سے نشانہ لگانے میں تو قبیلے کا کوئی بھی چھوٹا بڑا اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا، حالانکہ وہ بغیر سہارے کے گھوڑے پر سوار نہیں ہو سکتا تھا۔

یہ پانچ سال بڑے سکون سے گزرے۔۔۔ پھر سردار نے فیصلہ کیا کہ بھیڑ بکریوں کا ریوڑ تیار ہو گیا ہے اس لیے چند آدمیوں کو شہر جانے کے لیے تیار ہو جانا چاہیے۔۔۔ اس سال سردی اتنی زیادہ پڑی تھی کہ چٹانی علاقے میں کہیں کہیں پیدا ہونے والی فصلیں بھی جوان نہ ہو سکیں۔ قحط سا پڑنے لگا تھا اس لیے سردار کے اس فیصلے کو سبھی نے قبول کر لیا۔ بھیڑ بکریوں کو حالانکہ سال کے اس حصے میں فروخت نہیں کیا جاتا تھا لیکن قحط کے ڈر سے ایسا کرنا پڑ رہا تھا۔

ریوڑ کو لے کر قبیلے کے سات جوان اور خود سردار روانہ ہوا۔ اس نے جاتے وقت ہدایت کر دی کہ تمام لوگ اب اپنے گاؤں منگوری کی طرف روانہ ہو جائیں کیوں کہ موسم گرما میں ہی وہاں رہائش ممکن تھی۔ سردیوں میں وہاں اتنی برف پڑتی تھی کہ انسانی زندگی کا تصور ہی ممکن نہیں رہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ قبیلے کو سرما شروع ہوتے ہی نچلے چٹانی علاقے میں آ جانا پڑتا تھا۔

سردار اور قبیلے کے جوان چلے گئے تو خیمے اداس اداس محسوس ہونے لگے۔ یوں بھی قبیلے میں زیادہ آدمی نہیں تھے۔ اکثریت عورتوں اور بچوں کی تھی۔ اسی شام ریشم جان شدید بیمار پڑ گئی۔

گزشتہ پانچ سالوں میں اس کے بالوں میں سفیدی آ گئی تھی اور اس کے سرخ و سپید رخسار مرجھا کر رہ گئے تھے۔ کوئی غم تھا جو اسے اندر ہی اندر گھن کی طرح کھائے جا رہا تھا۔۔۔ لیکن وہ شہباز کے لیے زندہ تھی۔ وہ اس کے لیے ہنستی تھی اور اسی کے لیے رلتی تھی۔ شالیار خان تو بس ایک چلتی پھرتی لاش ہی تھا جس کا کام آسمان کی وسعتوں میں نگاہ گاڑے رکھنے کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔

ریشم جان کو بخار نے ایسا دبوچا کہ اسے ہڈیوں کا پنجر بنا کر رکھ دیا۔ قبیلے میں غذائی قلت کے باعث اسے ڈھنگ کا کھانا بھی نہیں ملتا تھا۔ شہباز کوئی شکار کر لاتا تو قبیلے میں جشن کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی۔ سردار اور اس کے ساتھیوں کے آنے میں ابھی پورا ایک ہفتہ باقی تھا کہ ایک روز ریشم جان نے شہباز کی آنکھوں میں آنسو بھر دیے۔ وہ مر گئی۔ ماں کی موت پر شہباز کی بھیگی بھیگی آنکھیں دیکھ کر محسوس ہوتا تھا جیسے کسی چٹان کے آنسو نکل آئے ہوں۔۔۔ جیسے پتھر رو پڑا ہو۔۔۔ شالیار کی آنکھوں سے مزید ویرانی جھلکنے لگی تھی اور قبیلے پر سکتہ سا طاری ہو گیا تھا۔ کسی کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ ریشم جان مر گئی ہے۔۔۔ لیکن وہ واقعی دنیا سے منہ موڑ چکی تھی۔ شہباز سات سال کا تھا لیکن اسے دیکھ کر پتہ چلتا تھا کہ ریشم جان اسے جو کچھ بنانا چاہتی تھی، وہ ویسا ہی بن چکا ہے۔۔۔ اگر وہ اور زندہ رہتی تو شاید شہباز پر مزید توجہ بھی دیتی۔۔۔ لیکن زندگی اور موت کی ازلی جنگ میں، ریشم جان کے سلسلے میں زندگی شکست کھا گئی تھی۔

شالیار خان بھی چلتی پھرتی لاش ہی تھا۔

جس مرض نے ریشم جان کو پہلا شکار بنایا تھا، اس مرض نے بعد میں قبیلے کے کئی اور افراد بھی چاٹ لیے۔۔۔ جس سے گھبرا کر قبیلہ نقل مکانی کے لیے مجبور ہو گیا۔ شہباز اب زیادہ تر میرے ساتھ رہتا تھا۔ میں نے اس کو ورثے میں ملنے والی اشیا ایک چرمی تھیلے میں بند کر کے محفوظ کر لی تھیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ جب وہ جوان ہو جائے گا تو یہ چیزیں اسے دے دوں گا۔

قبیلہ مسلسل سفر کر رہا تھا حتیٰ کہ ایک جگہ پانی اور ہریالی دیکھ کر پڑاؤ ڈال دیا گیا۔ منگوری قصبے کی طرف سفر کا یہ شاید پانچواں روز تھا۔ میں نے شہباز کو اپنے قریب ہی لٹا دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ دن بھر کی تکان نے جلد ہی میری آنکھوں میں نیند بھر دی اور میں بے خبر سو گیا۔

میری داستان کو آپ نے اب تک تین مختلف حصوں میں پڑھا۔ پھر سب سے پہلے میں نے اپنے بابا شالیار خان کے بوڑھے ملازم کی زبانی آپ کو سب کچھ سنایا۔ اس کے بعد جو کچھ میرے بابا شالیار خان نے لکھا، وہ بھی انہی کی زبانی سنا ڈالا۔۔۔ اور بابا کے اوراق جہاں ختم ہو گئے، وہاں سے میں نے قبیلے کے ایک تعلیم یافتہ بوڑھے بہار خان کی تحریر کو پڑھ کر من و عن سنا دیا۔۔۔ اب آخر میں، میں اپنی ہی زندگی کے وہ حالات آپ کو سناؤں گا، جنہیں پڑھ کر شاید آپ دہشت زدہ ہو جائیں اور شاید اسے ایک فرضی کہانی سمجھ کر خود کو بہلانا شروع کر دیں۔۔۔ لیکن اس کہانی کو منظرِ عام پر لانے کا صرف ایک ہی مقصد ہے، وہ یہ کہ انسان کی زندگی میں ایسے ایسے حادثات بھی ہوتے ہیں، جن پر یقین نہیں آتا۔۔۔ لیکن اگر انسان ثابت قدم رہے تو بالآخر فتح و کامرانی اسی کو ملتی ہے۔

بوڑھے بہار خان کی لکھی ہوئی کہانی سے اپنی کہانی کا سلسلہ ملاتے ہوئے میں ذہن پر زور ڈالتا ہوں۔۔۔ تو مجھے اپنے ذہن میں ایک سات سالہ بچے کا پیکر دکھائی دیتا ہے۔ یہ خود میرا ہی پیکر ہے جو میں نے ایک بلندی سے پرسکون پانی کی سطح پر دیکھا تھا اور تب سے میرے ذہن پر نقش ہے۔

ہمارا قبیلہ منگوری قصبے کی طرف سفر کر رہا تھا اور ایک جگہ ہم نے پڑاؤ ڈال کر رات گزارنے کا ارادہ کیا تھا کہ قبیلے پر ایک اور قیامت ٹوٹ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پڑی تھی۔

موسم سرما ختم ہو رہا تھا اور دن کے وقت چٹانیں تپ کر دہکنے لگتی تھیں جب کہ رات کو خاصی ٹھنڈک رہتی تھی۔ میں بوڑھے بہار خان کے قریب لیٹا ہوا تھا اور اُس گھوڑے کے بارے میں سوچ رہا تھا جس پر قبیلے کا شہ زور اطلس خان سواری کرتا تھا۔ یہ گھوڑا مجھے بے حد پسند تھا اور میں نے کئی بار اُس پر سواری بھی کی تھی۔۔۔ لیکن یہ گھوڑا اطلس خان کی ملکیت تھا۔

میرے شوق کو دیکھتے ہوئے ایک روز اطلس خان نے کہا تھا کہ جب میں بڑا ہو جاؤں گا تو اس کی جگہ مجھے مل جائے گی۔ میں قبیلے کا شہ زور کہلاؤں گا تب وہ گھوڑا مجھے مل جائے گا۔ اس ایک بات نے میرے دل و دماغ میں طوفان برپا کر دیا تھا۔ پہلے تو میں جلد از جلد بڑا ہونے کی کوئی ترکیب سوچنے لگا لیکن جب کوئی ایسی ترکیب میری سمجھ میں نہ آئی۔۔۔ تو میں بوڑھے بہار خان سے پوچھ بیٹھا۔

میری بات سن کر وہ ہنستے ہنستے اور کھانستے کھانستے دُہرا ہو گیا۔

مجھے اندازہ ہو گیا کہ بڑا ہونے کے لیے وقت درکار ہوتا ہے اور اس سلسلے میں مجھے کئی سال تک انتظار کرنا ہو گا۔ میں اطلس خان کے شاندار گھوڑے اطلس کے خواب دیکھتا ہوا بوڑھے بہار خان کے پہلو ہی میں سو گیا لیکن رات بھر اس گھوڑے نے میرے خوابوں کو پریشان رکھا جسے اطلس خان نے اپنے نام کی مناسبت سے اطلس ہی پکارنا شروع کر دیا تھا۔ رات کو سونے سے کچھ دیر پہلے میں اطلس خان کے پاس گیا تھا اور اس سے اطلس کی باگ لے کر اسے ایک کھونٹے سے باندھ دیا تھا۔

۔۔۔ لیکن صبح اچانک میری آنکھ کھل گئی۔

ابھی سورج طلوع نہیں ہوا تھا۔

قبیلے کے لوگ اِدھر اُدھر بکھرے سو رہے تھے۔

میں نے کہنیوں کے بل اٹھتے ہوئے اس طرف دیکھا جہاں میں نے رات اطلس کو باندھا تھا۔۔۔ اور یہ دیکھ کر میرا دل اچھل کر حلق میں اٹک گیا کہ گھوڑا اپنی جگہ موجود نہیں تھا۔

میں بے چینی سے اٹھ بیٹھا۔

اطلس کہاں ہے؟ اطلس کہاں گیا؟

میرے ذہن میں یہ خیال تیزی سے چکرا رہا تھا۔ ساتھ ہی میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ جب میں نے گزشتہ رات اطلس کی باگ ہاتھ میں لی تھی تو اسے باندھنے لگا تھا تو اطلس خان نے مسکرا کر کہا تھا۔ "شہباز، تم اس گھوڑے کو کہیں ضائع نہ کر دینا۔"

میں نے پاگلوں کی طرح اِدھر اُدھر دیکھا لیکن دُور دُور تک اطلس کا کہیں نام و نشان تک نہیں تھا۔ میں خود کو گھوڑے کی گمشدگی کا ذمے دار خیال کرنے لگا۔ میں پریشان تھا کہ اطلس خان کو کیا منہ دکھاؤں گا۔۔۔ لوگوں کے بیدار ہونے سے پہلے پہلے اطلس کو ڈھونڈ کر واپس لانا میرے لیے محال تھا۔۔۔ لیکن میں نے فیصلہ کر لیا کہ کوشش ضرور کرنی چاہیے۔

میں اٹھ کھڑا ہوا۔

آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر جب میں نے اِدھر اُدھر دیکھا تو دُور اُفق پر مجھے ایک سیاہ ہیولا دکھائی دیا۔ یہ گھوڑے ہی کا خاکہ تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ اطلس کی گمشدگی سے مجھے اطلس خان کے سامنے نادم ہونا پڑے گا۔ یہ خیال میرے لیے بڑا ہی جان لیوا تھا۔ ندامت، شکست اور خوف۔ یہ تین ایسے الفاظ تھے جن سے مجھے نفرت کرنا سکھائی گئی تھی۔ اور میرے ذہن میں یہ تینوں الفاظ جب بھی آتے تھے، نہ جانے کیوں مجھ میں توانائی اور حوصلے کی ایک نئی شخصیت خود بخود ابھرنے لگتی تھی۔

میں بڑی احتیاط سے اٹھا تھا اور پھر میں ہر ممکن طور پر بے آواز چلتا۔۔۔ قبیلے کے سوئے ہوئے لوگوں میں سے نکل جانے کی کوشش کرنے لگا۔ رُخ اسی طرف تھا جدھر میں نے گھوڑے کا خاکہ دیکھا تھا۔

میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔

کہیں کہیں ستارے ٹمٹما رہے تھے۔

اس کا مطلب تھا کہ صبح زیادہ دُور نہیں تھی۔

۔۔۔ اور مجھے ہر حال میں گھوڑے کو لے کر واپس آجانا چاہیے تھا اس سے پہلے پہلے کہ کسی کو اطلس نامی اس گھوڑے کی گمشدگی کا علم بھی ہوتا۔

دبے قدموں قبیلے کے لوگوں میں سے گزرنے کی ایک وجہ فاطمہ بھی تھی۔ اس لڑکی کو نہ جانے مجھ میں کیا کشش محسوس ہوتی تھی کہ میں جہاں کہیں بھی جاتا تھا، یہ ہمیشہ سائے کی طرح میرے ساتھ ہی لگی رہتی تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں اس کی آنکھ کھل گئی اور اس نے مجھے کہیں جاتے ہوئے دیکھ لیا تو فوراً میرے پیچھے دوڑ پڑے گی۔ اس کو ساتھ لے جانے میں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں تھا لیکن مصیبت یہ تھی کہ وہ باتیں بہت کرتی تھی۔۔۔ اور سوال کرنے کی تو اُسے ایسی عادت تھی کہ ہر وقت کوئی نہ کوئی اُلٹا سیدھا سوال اس کی نوکِ زبان پر دھرا ہی رہتا تھا۔

بوڑھے بہار خان کے پہلو سے اٹھتے وقت میں نے پانی کا وہ برتن ساتھ لے لیا تھا جسے ایک تسمے کی مدد سے کندھے پر لٹکایا جا سکتا تھا۔ اس علاقے میں یا تو ندیوں اور چشموں کی بہتات تھی یا پھر دُور دُور تک بنجر زمین اور جنگل یا چٹانیں پھیلی ہوئی تھیں۔ اس لیے مالِک کا یہ جملہ مجھے فوراً یاد آگیا۔ "اگر ویرانوں کو شکست دینا ہو تو ہمیشہ پانی

کا بندوبست کر کے چلو۔"

میرے پاس ایک شکاری چاقو ہمیشہ رہتا تھا۔ اس چاقو کے بارے میں ماں ریشم جان نے بارہا کہا تھا۔ "شہباز، اس سے زیادہ وفادار دوست تمہارا کوئی نہیں ہو سکتا۔ اسے کبھی اپنے آپ سے جُدا نہ کرنا۔"

میں اب ہر طرح سے تیار تھا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا لوگوں کے قریب سے گزر کر کچھ فاصلے پر پہنچ چکا تھا۔ بے آواز چلنے کی مجھے ماں نے بہت مشق کروائی تھی۔ میں نے اس طرف دیکھا جدھر اطلس کا خاکہ نظر آیا تھا۔ دُور اُفق پر اب وہ سیاہ ہیولا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔۔۔ لیکن مجھے یقین تھا کہ میں اطلس کو نہ صرف ڈھونڈ نکالوں گا۔۔۔ بلکہ اُسے واپس بھی لے آؤں گا۔

قافلہ جس طرف سے گزر کر آیا تھا، اُدھر راستے میں ایک جگہ ہری بھری گھاس تھی۔ اطلس بھوک سے بے چین ہو کر یقیناً اسی طرف گیا تھا۔ میں نے آہستہ آہستہ اُدھر ہی چلنا شروع کر دیا۔۔۔ لیکن اگلے ہی لمحے مجھے ٹھٹھک جانا پڑا۔

عقب سے کسی کے قدموں کی مدھم چاپ سُنائی دی تھی۔

میں نے پلٹ کر دیکھا اور ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔

یہ فاطمہ تھی۔۔۔ ننھی فاطمہ جسے قبیلے کے لوگ شہباز کا سایہ کہنے لگے تھے۔ مجھے حیرت ہونے لگی کہ اس قدر محتاط رہنے کے باوجود اس نے اس کی توجہ کیسے حاصل کر لی؟ کیا اس کی کوئی ایسی پُراسرار آنکھ بھی ہے، جو ہر وقت میری نقل و حرکت ہی کا جائزہ لیتی رہتی ہے؟

"فاطمہ۔۔۔!" میں نے قدرے سختی سے کہا۔

"ہُوں۔۔۔!" اس کی مہین سی آواز آئی۔

"فوراً واپس چلی جاؤ!"

"کیوں؟" اس نے ناک چڑھائی۔

"اگر تمہاری ماں کو پتہ چل گیا کہ تم اتنی صبح گھر سے نکل گئی ہو تو کیا ہو گا؟ اس وقت تمہارا اپنی ماں کے پاس رہنا ہی بہتر ہے۔" میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"اگر اُسے یہ پتہ چل گیا کہ میں تمہارے ساتھ تھی تو وہ مجھے کچھ نہیں کہے گی!" فاطمہ نے فوراً جواز تلاش کر لیا۔

"میں کہتا ہوں، تم فوراً واپس چلی جاؤ!"

"تم کہاں جا رہے ہو؟"

"میں اطلس کی تلاش میں جا رہا ہوں!"

"ٹھیک ہے!" اس نے کہا۔ "اطلس بہت پیارا گھوڑا ہے۔ اگر وہ گم ہو گیا ہے تو میں بھی اُسے تلاش کرنے میں تم سے پیچھے نہیں رہ سکتی!"

میں سوچ میں پڑ گیا۔ اسی جھگڑے میں ہم پڑاؤ سے خاصے دُور نکل آئے تھے اور جھٹپٹے میں اُسے اتنی دُور تنہا واپس بھیجنا بھی خطرے سے خالی نہیں تھا۔ دراصل مجھے یہ ڈر تھا کہ کہیں وہ واپسی میں کھو نہ جائے۔۔۔ اس کے علاوہ فاطمہ سے یہ توقع بھی کی جا سکتی تھی کہ وہ گھوم کر مجھ سے آگے آگے چلنا شروع کر دے۔ اس طرح بھی اس کے گم ہو جانے کا خدشہ تھا۔ وہ پہلے بھی کئی بار اس انداز میں مجھے چکمہ دے چکی تھی اس لیے میرا اس انداز میں سوچنا بھی جائز تھا۔ میں نے اسے قدرے خوف زدہ اور اپنے اثر میں رکھنے کے لیے بالآخر کہا۔ "ٹھیک ہے، اگر تم میرے ساتھ چلنا چاہتی ہو تو ضرور چلو۔۔۔ لیکن اپنی چونچ کو بند رکھنا!"

"وہ کیوں؟" اس نے بظاہر بڑی معصومیت سے پوچھا۔

"اس لیے کہ یہ علاقہ چوروں اور ڈاکوؤں سے بھرا ہوا ہے۔ اگر کسی نے تمہاری آواز سن لی تو ہم دونوں کو کچا ہی چبا ڈالیں گے۔" میں نے خوف ناک لہجے میں کہا۔

اس بار وہ خاموش رہی۔

شیروں اور ڈاکوؤں سے بہت ڈرتی تھی۔

ہم خاموشی سے آگے بڑھتے رہے۔ ویرانہ تھا کہ ختم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ تب کچھ ہی دیر بعد مجھے احساس ہو گیا کہ فاطمہ کی رفاقت نہ ہوتی تو میں خاصا بد مزہ ہو جاتا۔ تنہائی کا احساس ہوتا اور پریشان کُن خیالات الگ ستانے لگتے۔

اطلس خان اور قبیلے کے دوسرے افراد کا کہنا تھا کہ یہ علاقہ میلوں تک ویرانہ ہی ویرانہ ہے اس لیے اس علاقے میں ڈاکوؤں اور لٹیروں کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہو سکتا۔۔۔ یہ بات صرف میں نے سُنی تھی اور اسے صرف اپنی ذات تک اس لیے محدود رکھا تھا کہ لٹیروں کی دھمکی وقتاً فوقتاً فاطمہ کو خوف زدہ کرنے میں کام آئے گی۔

چڑھائی ختم کر کے ہم رُک گئے۔

دوسری طرف گہرائی میں ایک سرسبز وادی تھی۔

یہیں وہ گھاس تھی جس کی کشش نے اطلس کو رسّہ تڑوا کر فرار ہونے کے لیے مجبور کر دیا تھا۔ دُور ہی سے مجھے گھوڑا نظر آگیا۔ اس نے بھی غالباً ہمارے قدموں کی آہٹ سُن لی تھی کیوں کہ میں دیکھ رہا تھا کہ اس نے چرتے چرتے گردن اٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھا تھا اور پھر اس کے کان حرکت کرنے لگے تھے۔

مجھ پر نظر پڑتے ہی اطلس نے پہچان لیا۔

وہ زور سے ہنہنایا اور پھر آہستہ آہستہ ہماری طرف آنے لگا۔ اس کے گلے میں رسّی اب بھی موجود تھی۔۔۔ اور رسّی کے سرے پر وہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گھونٹی بندھی اب بھی گھسٹ رہی تھی جسے زمین میں گاڑ کر میں نے اطلس کو باندھا تھا۔

گھوڑے کے کان اب بھی متحرک تھے اور اس کے نتھنوں میں بار بار پھیلاؤ پیدا ہو رہا تھا۔ جیسے وہ کسی خطرے کو سونگھنے کی کوشش کر رہا ہو۔

میں بھی آہستہ آہستہ گھوڑے کی طرف بڑھتا رہا۔ فاطمہ میرے ساتھ ساتھ لگی رہی۔ ہمارے عقب میں اب ایک چٹان تھی جس کے عقب میں وہ وادی چھپ گئی تھی جہاں پڑاؤ ڈالا گیا تھا۔ میرا خیال ہے دو میل کا فاصلہ تو ہم نے یقیناً طے کر لیا تھا۔

"تم بالکل احمق ہو اطلس!" میں نے رسی پکڑتے ہوئے کہا۔

"گھوڑے احمق نہیں ہوتے!" فاطمہ نے جلدی سے کہا۔

"شش... " میں نے سرگوشی میں اسے ڈانٹ دیا۔ "میں اسے ڈانٹ رہا ہوں۔ ایسا نہ ہو یہ پھر بھاگ جائے۔"

فاطمہ نے ہونٹوں کو سختی سے بھینچ لیا۔

میں نے گھوڑے کی طرف دیکھا۔

"اطلس! میں نے تمہیں کو ذرا برہم رکھا۔ تم اکیلے اتنی دور کیوں نکل آئے تھے؟ اگر ہم تمہیں چھوڑ کر چلے جاتے تو تم کیا کرتے؟"

وہ ایک جسیم اور طاقت ور گھوڑا تھا... لیکن تھا تو پالتو ہی... اس گھوڑے نے قبیلے ہی میں جنم لیا تھا اور ہم دونوں ایک دوسرے کو عرصے سے جانتے اور سمجھتے تھے۔ جب قرب طویل ہو تو جانور بھی انسان کو سمجھنے لگتے ہیں... پھر اطلس ایک سمجھ دار گھوڑا تھا۔ وہ بے زبان تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ میری ایک ایک بات اس کی سمجھ میں آتی تھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ فوراً ہی میرا ہاتھ چاٹنے لگتا۔

میں نے اس کا پیٹ تھپ تھپا دیا کیوں کہ میرا ہاتھ وہیں تک پہنچتا تھا۔ اس نے گردن جھکا لی اور دوبارہ میرا ہاتھ چاٹنے لگا تو میں نے اس کے منہ پر پیار سے ہاتھ پھیرا... اور سوچنے لگا کہ مجھے اب کیا کرنا چاہیے۔ مسئلہ یہ تھا کہ میں اس گھوڑے پر خود سے سوار نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ مجھ سے کہیں اونچا تھا۔ فاطمہ کی مدد قبول نہیں کر سکتا تھا اس لیے سوچا کہ فاطمہ کو سہارا دے کر گھوڑے کی پشت پر بٹھا دوں اور خود رسی تھام کر واپس چل دوں۔

"شہباز...!" اچانک فاطمہ زور سے چیخی... "ادھر دیکھو... یہ نظر آ رہے ہیں نا؟"

میں نے اس کی انگلی کی سمت میں دیکھا... اس طرف جھاڑیاں موجود تھیں اور ان میں پکے پکے سُرخ بیر دُور ہی سے نظر آ رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، فاطمہ تیزی سے دوڑتی ہوئی جھاڑیوں کی طرف چلی گئی اور بیر توڑ کر کھانے لگی۔

"بہت میٹھے ہیں شہباز، آجاؤ!" اس نے چیخ کر کہا۔

میں اطلس کی رسی تھامے اس کے قریب جا پہنچا اور پھر ایک ہاتھ سے گھوڑے کو تھامے دوسرے ہاتھ سے بیر توڑنے لگا۔ ان جھاڑیوں پر قبیلے والوں کی نگاہ نہیں پڑی تھی ورنہ وہ کے جانے کی

اے حمید کے ایڈونچر قلم سے

شیوسینا کے دہشت گرد

چار جلدوں میں مکمل سیٹ =/700 روپے

ناشر: مکتبہ القریش

اردو بازار لاہور

پراسرار اور خوفناک کہانیاں جنہیں پڑھتے ہوئے آپ چونک اٹھیں گے

انوار صدیقی کے پراسرار قلم سے

آسیب زدہ قیمت =/110

دستک قیمت =/100

مکتبہ القریش سرکلر روڈ اردو بازار لاہور

فون 7668958

بجائے یہیں پڑاؤ ڈال دیتے۔

سپیدۂ سحر نمودار ہو چکا تھا اور روشنی پھیل چکی تھی اس لیے سب کی نظروں سے چھپ کر واپس پہنچنے کا وقت تو ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں بیروں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس دوران میں میں یہ سوچ رہا تھا کہ بیروں کا تحفہ پا کر قبیلے کے سبھی لوگ خوش ہو جائیں گے اور کوئی ہم سے اس غیر حاضری کے سلسلے میں باز پرس نہیں کرے گا۔ مجھے سب سے زیادہ جھجک اطلس خان سے محسوس ہوتی تھی کیوں کہ وہ مجھے اپنے بیٹوں کی طرح چاہتا تھا۔ اس کی ذہنی اذیت سے عموماً میرا مزاج برہم ہو جاتا تھا، ویسے اس کی ذہنی سمجھ بھی آتی تھی۔

اچانک میرے حساس کانوں تک ایک عجیب سی آواز پہنچی اور میں چونک کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ مجھے یوں لگا جیسے کسی بچے کی تیز چیخ میرے کانوں سے ٹکرائی ہو... یا پھر ممکن ہے یہ کسی جانور کی آواز ہو۔ میں نے مزید توجہ سے سننے کی کوشش کی لیکن ویسی آواز دوبارہ نہیں سنائی دی۔

میں دوبارہ بیروں کی طرف متوجہ ہو گیا۔

دیر تک میں محظوظ ہوتا رہا پھر میرے منہ میں پانی بھر آیا۔ جب میں بیروں سے بھر گئی تو میں نے فاطمہ سے واپس چلنے کے لیے کہا۔

بیر منہ میں ہونے کی وجہ سے اس کی زبان زیادہ نہیں چل رہی تھی۔ اس نے اپنی قمیص کا دامن بیروں سے بھر لیا تھا۔ جھولی اتنی بھاری تھی کہ اس کے لیے ان بیروں کو سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا لیکن وہ ان کی تعداد تیزی سے کم کر رہی تھی۔ اس کا منہ بڑی تیزی سے چل رہا تھا۔

میں نے اس کو سہارا دیا اور وہ میرے ہاتھوں پر پاؤں رکھ کر گھوڑے پر سوار ہو گئی۔ گھوڑے اطلس کی لگام تھام کر میں آہستہ آہستہ چڑھائی پر چڑھنے لگا۔ اتنی دور پیدل چلنے سے مجھے ذرا بھی تھکن محسوس نہیں ہو رہی تھی کیوں کہ ماں زیتم نے مجھے بھی مشقوں کا عادی بنا کر رکھ دیا تھا۔

وادی سے جب ہم چٹان پر پہنچے تو میں رُک گیا۔

میں نے نیچے دوسری وادی کی طرف دیکھا، جہاں قبیلے کا پڑاؤ تھا، وہاں سے دھواں اٹھتا محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے سمجھا کہ شب بیدار ہونے کے بعد پکانے کھانے میں مصروف ہو گئے ہیں... لیکن اگلے ہی لمحے مجھے چونک جانا پڑا۔

محض کھانا پکاتے وقت تو کبھی اتنا دھواں نہیں پیدا ہوتا۔ اس دھوئیں نے مجھے تشویش میں مبتلا کر دیا۔

مجھے وہ آواز پریشان کرنے لگی جسے میں نے بیر توڑتے وقت سنا تھا۔ اس وقت لمحے بھر کے لیے مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے میں گھوڑوں کی ٹاپیں بھی سن رہا ہوں... لیکن میں نے ان آوازوں کو زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔ ویرانوں میں بعض اوقات موسمی وجوہ کے تحت بھی ناقابلِ فہم آوازیں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔

... لیکن اب اس جگہ دھواں ہی دھواں نظر آ رہا تھا جہاں قبیلے نے گزشتہ شب پڑاؤ ڈالا تھا۔

میں نے فاطمہ کی طرف دیکھا۔

"کیوں... تم نے گھوڑے کی ٹاپیں سنی تھیں؟"

"ہاں..." اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"کب؟" میں پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

"ابھی کچھ دیر پہلے۔" اس نے بیر کا بیج تھوکتے ہوئے جواب دیا۔ "اور جب تم چلو گے تو دوبارہ سنائی دینے لگیں گی۔"

میں نے پلٹ کر غصیلی نگاہ سے اس کی طرف دیکھا۔

"میں اطلس کی ٹاپوں کا تذکرہ نہیں کر رہا ہوں۔ بلکہ دوسرے گھوڑوں کی بات کر رہا ہوں۔"

"نہیں... اور تو کسی گھوڑے کی آواز سنائی نہیں دی۔"

میں نے ایک بار پھر اس دھوئیں کی طرف دیکھا جو وادی میں اٹھ رہا تھا... پھر میری نگاہ اس گاڑی پر جم گئی جس پر موٹے کپڑے کا سائبان بنا ہوا تھا۔ گاڑی تو موجود تھی لیکن اس کا سفید سائبان نظر نہیں آ رہا تھا۔ یہ سائبان تو میلوں دُور سے نظر آ جانا چاہیے تھا۔ میری تشویش گزرتے ہوئے لمحے کے ساتھ بڑھتی جا رہی تھی۔

میں نے گھوڑے کے پیٹ تک پہنچ کر فاطمہ کا پاؤں تھام لیا۔ "سنو فاطمہ۔" میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ "تم دونوں یہیں ٹھہرو۔ میں قبیلے میں جا رہا ہوں۔"

"نہیں اور اطلس یوں نہیں۔" اس نے حیرت سے کہا۔

"سنو... اگر تم نے اس وقت میری بات نہ مانی تو میں قسم کھاتا ہوں کہ آئندہ تم سے کبھی بات بھی نہیں کروں گا۔"

اس نے جھک کر حیرت سے میری طرف دیکھا۔ "لیکن میں ماں کے پاس جانا چاہتی ہوں۔"

"تم یہیں بیٹھی رہو گی، سمجھیں؟" اس بار میرے لہجے میں

اتنی سخت تھی کہ اُس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ لیکن میں نے صرف ایک لمحے کے لیے اس کی طرف دیکھا اور پھر تیزی سے ڈھلان پر دوڑنے لگا۔ میرا دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔ قبیلے میں کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہو گئی تھی۔ بار بار میرے حلق میں کوئی چیز اٹک جاتی تھی جسے دوڑتے دوڑتے میں نگلتا ہوا آگے ہی آگے بڑھتا رہا... اور جب میں پڑاؤ کے قریب پہنچا تو مجھے ٹھٹھک جانا پڑا۔

زندگی میں پہلی بار مجھے یوں لگا جیسے کوئی تیز دھار چیز میرے سینے سے اتر کر دل میں پیوست ہو گئی ہو۔ میرے حلق سے ایک گھٹی گھٹی سی چیخ نکل گئی۔ قبیلے پر ڈاکوؤں کا حملہ ہو چکا تھا اور سب کے سب مارے گئے تھے۔

سب سے پہلی لاش اطلس خان کی تھی۔

میں گھٹنوں کے بل اُس کے قریب بیٹھ گیا۔

میرے قبیلے کا شہ زور مر چکا تھا۔ اُس کے چہرے پر بہت بڑا گھاؤ تھا۔ یہ تلوار کا گھاؤ لگتا تھا۔ غالباً کسی نے اُس کے چہرے پر وار کیا تھا۔ اُس کا چہرہ بھیانک ہو گیا تھا اور اس کے دو حصے نظر آ رہے تھے۔ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اُس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ میں کبھی یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اطلس خان جیسے شہ زور کا یہ انجام بھی ہو سکتا ہے۔

عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کے علاوہ گنتی کے چند جوانوں کی لاشیں جا بجا بکھری ہوئی تھیں۔ میرے سامنے میرے اپنے ہی قبیلے کے لوگوں کی لاشوں کا کھیت تھا۔ خون ہی خون تھا... کٹے پھٹے چہرے اور ٹوٹے پھوٹے جسم ہی جسم تھے۔ میں اس منظر کو دیکھتا رہا... ایک بار میں اپنی ماں ریشم کی موت پر رویا تھا۔ لیکن قبیلے کے اتنے سارے لوگوں کو ایک ساتھ موت کے گھاٹ اترے دیکھ کر تو آنسو نہ جانے کہاں سے اُمنڈ پڑے تھے... اور اتنی بُری طرح اُمنڈے تھے کہ میں لاکھ ضبط کے باوجود ان آنسوؤں کو پینے میں کامیاب نہیں ہو رہا تھا۔

... پھر اچانک مجھے ہوش آ گیا۔

میں باری باری ایک ایک لاش کی طرف بڑھتا رہا... ایک ایک کے منہ سے کان لگاتا رہا۔ لیکن کسی کی سانس محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ ابھی میں ایک عورت کی لاش کے پاس سے اٹھ ہی رہا تھا کہ اچانک مجھے ایک کراہ سنائی دی۔ میں اُس کراہنے والے کی طرف لپکا۔

بوڑھا بہار خان خون میں لت پت پڑا تھا۔

"بابا... یہ کیا ہو گیا بابا...؟" میں نے چیخ کر پوچھا۔

نامور مصنف محمود احمد مودی
وہی تحریر اور وہی انداز
کے ساتھ، اپنے چاہنے والوں
کے لئے ایک نئی سوغات لئے
تلاش
دو جلدیں جلد اول =/150
جلد دوئم =/150
خوبصورت سرورق، بہترین
طباعت و کتابت، سفید کاغذ
مکتبہ القریش
سرکلر روڈ اردو بازار لاہور
7668958

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اُس کی آنکھیں بند تھیں۔

وہ اکھڑی اکھڑی سانسیں لے رہا تھا۔

"بابا..." میں نے تڑپ کر اُس کا ہاتھ تھام لیا۔

ایک لمحے کو اُس کی آنکھیں پھڑپھڑائیں۔ اُس نے آنکھیں کھول دیں اور اوپر آسمان کو گھورنے لگا۔ پہلے تو میں یہ سمجھا کہ وہ بھی مر گیا ہے... لیکن پھر اُس کے ہونٹ حرکت کرتے نظر آئے۔

میں اُس کے ہونٹوں پر جھک گیا۔

"شہباز... ڈاکو... سب... سب مارے... گئے۔" اُس نے اٹک اٹک کر کہا۔ آواز اتنی دھیمی تھی کہ میں بمشکل اُس کی بات سمجھ پا رہا تھا۔

اُس نے اپنی ٹوٹی پھوٹی آواز میں مجھے بتایا کہ شمال کی جانب سے آنے والے ایک ڈاکوؤں کے گروہ نے حملہ کر دیا تھا۔ حملہ اچانک ہی ہوا تھا۔ سب لوگ ابھی سو ہی رہے تھے کہ انہوں نے قافلے کو گھیرے میں لے لیا اور جب لوگوں کی آنکھیں کھلیں تو آدھا قبیلہ خون میں نہا چکا تھا۔

"شہباز... بیٹے..." بہار خان نے میرا ہاتھ ٹٹول کر تھام لیا۔ "میرے پاس تمہاری ایک امانت ہے۔ خدا نے تمہیں زندگی دی بیٹے اپنی امانت لے لو۔"

اُس نے اپنا گریبان چاک کر ڈالا۔

بوڑھے بہار خان کے سینے پر ایک چرمی تھیلا تھا۔ چپٹا سا یہ تھیلا میں نے دیکھا تو میرے جسم پر کپکپی طاری ہو گئی۔ اس میں ایک گول سوراخ تھا جس سے خون رِس رہا تھا۔

"اس میں کاغذات..." اس کا جملہ ادھورا ہی رہ گیا اور وہ بُری طرح ہانپنے لگا۔

میں نے اس چپٹے تھیلے کو اُس کے سینے سے اٹھا لیا۔

وہ نیچے سے خون میں تھڑا ہوا تھا۔ اُس کے سینے میں گولی لگی تھی۔ شاید دل محفوظ رہ گیا تھا، ورنہ وہ اتنی دیر ہرگز زندہ نہ رہتا۔

"بابا..." میں نے تھیلا زمین پر رکھتے ہوئے کہا۔ "وہ ڈاکو کس طرف گئے ہیں؟"

وہ میری طرف دیکھنے لگا۔ ایک لمحے کو اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ "تم ابھی بہت چھوٹے ہو بیٹے... ڈاکو... بہت بڑے... ہیں... سردار اور دوسرے ساتھیوں کا انتظار کرو۔ قبیلے کی طرف جاؤ۔" اُس نے ایک طرف اشارہ کرنے کے لیے ہاتھ اٹھایا۔

اس کا ہاتھ کانپ کر پہلو میں گر گیا۔

اس کی گردن ڈھلک گئی۔

میں نے اس کا ہاتھ تھام کر ہونٹوں سے لگا لیا۔ جھریوں سے بھرا ہوا یہ ہاتھ نہ جانے کتنی بار میرے سر پر شفقت سے گھوم چکا تھا۔ ان انگلیوں نے نہ جانے کتنی مرتبہ میرے گالوں کو پیار سے تھپتھپایا تھا۔

میرے آنسوؤں سے اس کا ہاتھ بھیگنے لگا۔

میں دیر تک روتا رہا۔

روتے روتے میری نگاہ ایک طرف اٹھ گئی۔

فاطمہ کا باپ بھی مر چکا تھا۔ اس کی بیوی، شوہر کے قدموں میں گری ہوئی تھی۔ اس کی پشت پر تین سُرخ سُرخ نشان تھے، جن سے خون نکل کر جم گیا تھا۔ اُسی لمحے ایک خیال طوفان کی طرح میرے دماغ میں آیا اور میں دیوانہ وار ایک ایک لاش کو دیکھنے لگا۔

"بابا... بابا..." میں نے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لیے اور آسمان کی طرف منہ اٹھا کر چیخ پڑا۔

وادی میں میری آواز دیر تک گونجتی رہی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے سینکڑوں شہباز بیک وقت تقسیم ہو کر چیخ اٹھے ہوں... میں چیختا رہا اور روتا رہا... لیکن ان بکھری ہوئی لاشوں میں میرے بابا شایان خان کا زخمی، مُردہ یا زندہ کسی بھی حالت میں... جسدِ خاکی موجود نہیں تھا۔

میں نے ایک بار پھر غور سے ہر لاش کو دیکھا۔

بعض لاشیں بُری طرح مسخ ہو گئی تھیں۔ ان میں میرے بابا کی لاش نہیں تھی۔ وہ جس بھی حالت میں ہوتا، میں اُسے یقیناً پہچان لیتا۔ مجھے حیرانی ہوئی کہ بابا کہاں چلا گیا ہے؟ اُسے ڈاکو اپنے ساتھ لے گئے ہیں یا وہ خود ہی کہیں چلا گیا ہے؟ میں نے جب سے ہوش کی آنکھ سے دُنیا کو دیکھا تھا، بابا کا قرب مجھے کبھی حاصل نہیں ہوا۔ بوڑھا بہار خان... اس کی میرے لیے محبت کے بارے میں کبھی کبھی تذکرہ کرتا تھا تو میں دل ہی دل میں خوشی سے جھوم اٹھتا تھا لیکن مجھے کبھی اظہار کرنے کی ضرورت نہیں محسوس ہوئی تھی۔

بوڑھے بہار خان کے قریب ہی پڑے ہوئے اس چرمی تھیلے کو میں نے اٹھا کر کھولا تو اس میں کاغذات تھے۔ جن پر پشتو اور انگریزی کے علاوہ ٹوٹی پھوٹی اُردو میں بعض تحریریں تھیں۔ میں نے ان کو پڑھے بغیر ہی دوبارہ تھیلے میں رکھ لیا اور اُسے بند ہی کرنے جا رہا تھا کہ کاغذات میں اٹکی ہوئی کوئی چیز زمین پر گر گئی۔

میں نے جھک کر اس چیز کو اٹھا لیا۔

یہ رائفل کی ایک گولی تھی۔

میں نے اسے بھی تھیلے میں رکھ لیا اور سرِ دست بلندی کی طرف دیکھا جہاں فاطمہ اور گھوڑا اطلس موجود تھا۔ وہ مجھے محض سائے

ہی دکھائی دے رہے تھے۔ اسی فاصلے کی وجہ سے میں وہاں سے پڑاؤ کی صورتِ حال نہیں دیکھ سکا تھا۔

مجھ پر عجیب سی حالت طاری تھی۔ میں نے موت کو پہلے بھی دیکھا تھا لیکن موت اتنے آدمیوں کو بیک وقت بھی شکار کرتی ہے، یہ منظر میری زندگی کا وہ پہلا منظر تھا۔ جس نے مجھے دہشت زدہ کر دیا... لیکن دہشت پر نفرت اور غصے کے علاوہ انتقام کے جذبے غالب تھے۔

میں نے ان لاشوں کے درمیان گھومنا شروع کر دیا۔ وہاں جو بھی کارآمد چیزیں تھیں، میں انہیں اپنے قبضے میں کر لینا چاہتا تھا... لیکن کام کی چیزیں تو سب ڈاکو ہی لوٹ کر لے جا چکے تھے۔ میں ایک ریوالور اور غذا کا متلاشی تھا۔ چند ڈبوں میں تھوڑی سی غذا تو مجھے مل گئی لیکن ریوالور نہ ملا۔ غالباً قبیلے والوں کا سارا اسلحہ ڈاکو سمیٹ لے گئے تھے۔

ایک نیم سوختہ تھیلا مجھے مل گیا۔ ڈبوں کو اور ایک دو دوسری ضروری چیزوں کو اس تھیلے میں ڈال کر میں نے کندھے سے لٹکا لیا۔ اب میری منزل مگوری گاؤں تھا... جہاں سردار اور دوسرے آدمیوں کو شہر سے واپس پہنچنا تھا۔

میرا دھیان ایک بار پھر بابا شالیار کی طرف چلا گیا۔ وہ پُراسرار انداز میں غائب ہو گیا تھا... لیکن مجھے نہ جانے کیوں دلی طور پر اطمینان سا محسوس ہُوا کہ بابا زندہ ہے اور جہاں بھی ہے، خیریت ہی سے ہوگا۔

میں نے آہستہ آہستہ اس طرف چلنا شروع کر دیا، جدھر فاطمہ اور اطلس موجود تھا۔ میرے پاؤں من من بھاری ہو رہے تھے اور میں شدت سے تنہائی محسوس کر رہا تھا۔

جب میں فاطمہ کے پاس پہنچا تو وہ بے چینی سے میرا انتظار کر رہی تھی۔ میرے جانے کے بعد وہ گھوڑے کی پشت سے کُود کر ایک پتھر پر بیٹھی ہُوئی تھی۔ میں جھکے جھکے سے انداز میں اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

"اب ہمیں تنہا ہی سفر کرنا پڑے گا۔" میں نے کہا۔

"وہ کیوں؟"

"ڈاکوؤں نے قبیلے پر حملہ کر دیا تھا۔"

"پھر..." اس کی آنکھیں پھیلنے لگیں۔

"سب لوگ ان سے چھپ کر مگوری کی طرف چلے گئے ہیں۔ اس لیے ہمیں گاؤں کی طرف تنہا ہی اپنا سفر جاری رکھنا پڑے گا۔" میں نے کہا۔ یہ ایک جھوٹ تھا۔ میں جھوٹ نہیں بولنا چاہتا تھا لیکن

مصنف مظہر کلیم
شہباز
دو حصوں میں
مکمل سیٹ =/100 روپے
مکتبہ القریش
سرکلر روڈ اردو بازار لاہور
فون 7668958

میں حیران تھا کہ فاطمہ سے اور کیا کہتا؟ شاید میں نے یہ سب کچھ اُس سے اس لیے چھپایا تھا کہ میں اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھنا چاہتا تھا... بلکہ مجھے یقین تھا کہ وہ "موت" کے لفظ اور اس کے معنی سے بھی واقف نہیں تھی۔

میرے ذہن میں بس ایک ہی سودا سمایا ہُوا تھا کہ ہمیں جتنی جلدی بھی ممکن ہو مگوری کی طرف ہی بڑھتے چلے جانا چاہیے۔ میں نے فاطمہ کی طرف دیکھا اور کہا "فاطمہ... اب ہمیں چلنا چاہیے۔"

اس نے میری طرف ایسی نگاہ سے دیکھا جس میں شک و شبہے کے سائے رقص کر رہے تھے۔ اس سے پہلے فاطمہ نے میری کسی بات پر کبھی یوں بے یقینی ظاہر نہیں کی تھی۔

"میں ماں کے پاس جانا چاہتی ہوں۔" اس نے منہ پھلا کر کہا۔

"ہمیں خاموشی سے نکل جانا چاہیے۔" میں نے رازداری کا لہجہ اختیار کیا۔ "سب لوگ یہاں سے بھاگ گئے ہیں۔"

"کیا ہمیں بھی بھاگنا پڑے گا؟"

"ہاں... ہمیں ڈاکوؤں سے چھپ چھپ کر آگے بڑھنا ہوگا۔"

اُس کی آنکھیں گول گول سی نظر آنے لگیں۔ "شہباز... کیا یہ کوئی کھیل ہے۔ آنکھ مچولی؟"

"ہاں... یہ آنکھ مچولی ہی ہے۔" میں نے تلملا کر کہا۔ "لیکن یہ زندگی اور موت کے درمیان آنکھ مچولی ہے۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ ڈاکوؤں سے آنکھ مچولی میں مزہ بھی آئے گا۔ وہ لوگ بے ایمانی تو نہیں کرتے نا؟"

میں خاموش ہو گیا۔ اب میں اسے کیا سمجھاتا کہ کیا کچھ ہو چکا ہے... اور کیا ہو سکتا ہے۔ میں اُٹھ کھڑا ہُوا اور دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو اُلجھا کر اسے اشارہ کیا کہ وہ میرے ہاتھوں پر پاؤں رکھ کر اطلس پر سوار ہو جائے۔ جب وہ گھوڑے کی پُشت پر بیٹھ گئی تو میں نے اطلس کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

منہ پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا: "چلو اطلس... ہمارا سفر بے حد طویل اور کٹھن ہے۔"

ہم تنہا تھے۔ ہمارے آس پاس ویرانے ہی ویرانے تھے۔

میں نے گھوڑے کی رسّی تھام لی تھی اور وہ میرے پیچھے پیچھے خاموشی سے چلا آ رہا تھا۔ جس طرف قافلے کا رُخ تھا، میں نے وہی سمت اختیار کی تھی۔ میں نے سامنے دیکھا۔ آسمان اور زمین ایک جگہ ملتے دکھائی دے رہے تھے اور اس مقام تک کوئی زندہ یا متحرک سایہ تک دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ دائیں بائیں چٹانوں کا طویل سلسلہ تھا۔

آسمان صاف تھا۔ بادلوں کا دُور دُور تک نام و نشان بھی نہیں تھا۔ ہم جیسے جیسے آگے بڑھ رہے تھے، راستہ دشوار گزار ہی ہوتا جا رہا تھا۔ اس علاقے میں کوئی ایسا نشان نہیں تھا جس سے منزل کا تعین ممکن ہوتا... پھر میری عمر ہی کیا تھی... لیکن خدا تعالیٰ نے مجھے حوصلے بڑے جوان دیے تھے اور حالات نے مجھے آہنی عزم کا مالک اور سختیاں جھیلنے والا بنا دیا تھا۔ اس لیے میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا جا رہا تھا۔ اندیشے اور وسوسے میرے دل و دماغ میں رینگ رہے تھے لیکن میری دھڑکنیں معمول پر آ چکی تھیں۔

آج جبکہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں اور میرے جسم کا ہر بال سفید ہو چکا ہے تو مجھے اپنے ماضی میں جھانکتے ہوئے تکلیف ہو رہی ہے لیکن میری یہ کہانی کئی ایسے لوگوں کے لیے ہے جن کے حوصلے ٹوٹ چکے ہیں۔ اگر میری داستان سے ایک بھی ٹوٹا ہُوا حوصلہ بحال ہو گیا اور ایک بھی زندگی سنور گئی تو میں سمجھوں گا کہ اپنے زخموں کو کریدنے کا مجھے معاوضہ مل گیا ہے۔

فاطمہ گھوڑے پر سوار تھی اور اطلس کی رسّی میرے ہاتھ میں تھی۔ میں آہستہ آہستہ مسلسل آگے بڑھ رہا تھا۔ سورج نکل چکا تھا اور اس کی کرنوں میں تمازت آ چکی تھی۔

رفتہ رفتہ دھوپ اتنی تیز ہوتی چلی گئی کہ سفر جاری رکھنا دشوار ہو گیا۔ میں نے فاطمہ کی طرف دیکھا۔ وہ گھوڑے کی پُشت پر بیٹھی نڈھال نظر آ رہی تھی۔

ایک چٹان کی اوٹ میں گھوڑے کو روک کر میں نے اُسے اُترنے میں مدد دی اور تھیلا کھول کر پانی کا برتن نکالا۔ گرمی کی وجہ سے پانی بھی گرم ہو گیا تھا لیکن اس سے حلق میں پڑنے والے کانٹوں کی تکلیف دُور ہو گئی تھی۔

پانی کا گھونٹ پینے کے بعد فاطمہ نے میری طرف دیکھا اور پُوچھا۔ "شہباز... ماں اب اور کتنی دُور ہے؟"

"میرا خیال ہے، آج شام تک اس سے ملاقات نہیں ہو سکتی۔"

وہ خاموش ہو گئی۔

اس کا ننھا سا چہرہ اُداس تھا۔ اس کی آنکھوں میں ہلکی ہلکی سی تیرگی تھی۔ اس بار ہم آگے بڑھے تو اس نے اطلس پر سوار ہونے سے انکار کر دیا اور میرے ساتھ چلنے لگی۔ میں نے بارہا اپنے ذہن سے ان لاشوں کو جھٹکنے کی کوشش کی جنہیں ہم بہت پیچھے چھوڑ آئے تھے لیکن بار بار کسی نہ کسی کا چہرہ میری نگاہوں میں گھوم کر مجھے تڑپا جاتا تھا۔

چلتے چلتے جب فاطمہ تھک گئی تو میں نے اُسے دوبارہ گھوڑے پر سوار کر دیا اور خود پیدل ہی چلتا رہا۔ دن بھر اسی طرح رُک رُک کر سفر ہوتا رہا حتیٰ کہ سورج نے اپنی منزل پُوری کر لی اور وہ پہاڑوں کی اوٹ میں غروب ہو گیا۔ شام کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چلنے لگی۔

اندھیرا پھیلنے سے پہلے پہلے ہم ایک وادی میں پہنچ گئے۔ یہاں ہریالی تھی۔ دن بھر کا تھکا ہارا اطلس گھاس چرنے لگا اور ننھی فاطمہ کے ساتھ ایک طرف بیٹھ گیا۔ اطلس کو بھی غالباً صورتِ حال کا احساس تھا۔ شاید اسی لیے وہ ہمارے قریب ہی رہ کر چر رہا تھا۔ اس نے زیادہ دُور جانے کی کوشش نہیں کی۔ اس لیے میں نے بھی اسے باندھنا مناسب نہ سمجھا۔

پاس ہی ایک پہاڑی سے پانی گر رہا تھا۔ یہ ایک چشمہ تھا جس کا پانی ٹھنڈا اور میٹھا تھا۔ ہم نے خوب سیر ہو کر پانی پیا اور میں نے کھا کر پیٹ بھر لیا۔ فاطمہ مسلسل خاموش تھی۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہُوئی تھی... لیکن اس کا ننھا سا دماغ اس کی سوچوں کا دائرہ زیادہ وسیع نہیں ہونے دے رہا تھا۔

اچانک قریب ہی سے تیز سرسراہٹ سنائی دی۔

میں نے چونک کر اپنے شکاری چاقو پر ہاتھ ڈال دیا۔ اس آواز سے فاطمہ بے حد خوف زدہ ہو گئی۔ اگر میں فوراً ہی اس کا ہاتھ تھپ تھپا کر اسے مطمئن نہ کر دیتا تو وہ بُری طرح چیخ پڑتی۔

"گھبراؤ نہیں... ہوا سے سرکنڈے ہل رہے تھے۔" میں نے چشمے سے کچھ فاصلے پر سرکنڈوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

وہ خاموش رہی... لیکن خوفزدہ نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیر تک دیکھتی رہی۔ تب کہیں اس کے چہرے پر سکون کی علامات ظاہر ہوئیں۔

میں نے گھاس پھونس جمع کر کے ایک نرم سا بستر تیار کیا اور فاطمہ سے کہا کہ وہ سو جائے۔ ہمارے پاس صرف ایک ہی کمبل تھا جس میں دونوں نے خود کو اچھی طرح لپیٹ لیا اور گھاس کے بستر پر لیٹ گئے۔ فاطمہ اب کچھ زیادہ ہی دہشت زدہ ہو رہی تھی۔ غالباً اسی وجہ سے اس کی زبان بھی بند تھی ورنہ وہ کچھ نہ کچھ بولتی ہی رہتی...

شکاری چاقو کھول کر مَیں نے قریب ہی رکھ لیا تھا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ اس علاقے میں کس قسم کے جانوروں سے ہمیں پالا پڑ سکتا ہے... لیکن اپنے طور پر مَیں ہر خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ اس علاقے میں بھیڑیے تو یقیناً موجود تھے۔ مَیں نے شام کے وقت جھاڑیوں میں اُن کی چمکتی ہوئی آنکھیں دیکھی تھیں۔

اگرچہ اس علاقے میں جہاں جہاں جنگل پھیلا ہوا تھا وہاں شیر بھی پائے جاتے تھے، ریچھ بھی کبھی کبھی دیکھنے کو مل جاتا تھا۔ لیکن جس جگہ ہم نے رات گزارنے کا ارادہ کیا تھا، یہاں کے بارے میں یقین سے کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا کیونکہ سوائے بھیڑیوں کے اب تک کوئی خطرناک جانور نظر نہیں آیا تھا۔

شام کا پھیکا غبار رفتہ رفتہ ختم ہو رہا تھا۔

جلد ہی تاریکی گہری ہو گئی اور ستارے نکل آئے۔

اطلس قریب ہی گھاس چر رہا تھا۔ اس کے چرنے کا دائرہ زیادہ وسیع نہیں ہو رہا تھا اس لیے مجھے اطمینان تھا کہ وہ ہمیں چھوڑ کر نہیں جائے گا۔ مجھے اس کا اندازہ نہیں تھا کہ گوری قصبے تک پہنچنے میں اور کتنے دن لگیں گے لیکن میں یہ سوچ سوچ کر ضرور اُلجھ رہا تھا کہ فاطمہ اور مَیں وہاں پہنچ بھی گئے تو کیا کریں گے، ظاہر ہے قصبہ بالکل ویران اور خالی ہو گا... لیکن وہاں پہنچنے میں صرف ایک ہی فائدہ تھا کہ ایک دو ہفتوں کے بعد سردار اور وہ لوگ وہاں پہنچ جائیں گے جو شہر گئے ہوئے تھے۔

فاطمہ ہونٹ بھینچے لیٹی ہوئی تھی۔

مَیں نے اس کی آنکھوں کے زاویے پر دیکھا۔ وہ آسمان پر روشن ستاروں کو گھور رہی تھی جو اس وقت بیکراں اندھیرے میں ننھے ننھے چراغوں کی طرح ٹمٹما رہے تھے۔

تاریکی کے ساتھ ساتھ ٹھنڈک بھی بڑھنے لگی۔

فاطمہ تھوڑی ہی دیر بعد سو گئی۔

مَیں جاگتا رہا... لیکن کب تک؟ دن بھر کا تھکا ماندہ تھا... پھر میرے اعصاب پر خاصا بوجھ پڑا تھا جس کی وجہ سے نیند خود بخود میرے ذہن پر سوار ہو گئی تھی... نہ جانے کون سا وقت تھا کہ مَیں چونک کر بیدار ہو گیا۔ نیند اُچاٹ ہونے کی وجہ اطلس کی بے چینی تھی۔ اس کی سانسوں میں تیزی آ گئی تھی۔ وہ ہمارے قریب ہی بیٹھ گیا تھا اس لیے سانسوں کی یہ بے ترتیبی مجھے نیند کے باوجود محسوس ہو گئی۔ مَیں نے آنکھیں کھول دی تھیں لیکن اُٹھنے کی کوشش نہیں کی... کیونکہ مَیں لیٹے ہی لیٹے جان لینا چاہتا تھا کہ کیا معاملہ ہے؟

رات کے سناٹے میں بیلوں کی آواز سرسرا رہی تھی۔

... پھر ایسی آواز میرے کانوں سے ٹکرانے لگی جیسے قریب ہی کوئی جانور شڑاپ شڑاپ کی آوازیں نکالتا ہوا پانی پی رہا ہو۔ مَیں نے آہستہ آہستہ خود کو ایک کہنی کے سہارے اٹھایا۔

مَیں نے ندی کی طرف دیکھا۔

ایک سیاہ جسم دکھائی دے رہا تھا۔

یہ کالا کالا جسم پانی پر جھکا ہوا تھا اور گردن پیٹھ سے بے نیاز تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے پانی کی چمکیلی سطح سے منہ اٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ مَیں نے ایسا جانور پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا... شاید یہ جنگلی بھینسا تھا۔ اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد بھینسا دوبارہ پانی پینے لگا۔

پانی پینے کے بعد اس کا جسم ندی کے کنارے کنارے متحرک ہو گیا۔ مَیں نے اطمینان کی سانس لی اور دوبارہ چت لیٹ گیا۔ میرا سر نیند اچاٹ ہو جانے کی وجہ سے بھاری بھاری تھا اس لیے مَیں جلدی دوبارہ سو گیا۔

صبح جب آنکھ کھلی تو سورج کی تیز کرنوں سے پورا علاقہ نہا گیا تھا اور فاطمہ کے چہرے پر زرد زرد دھوپ چمک رہی تھی۔ وہ ابھی تک بے سُدھ پڑی سو رہی تھی۔

گھوڑا اب پھر اُٹھ کر اِدھر اُدھر گھوم پھر کر سبزے پر منہ مار رہا تھا۔ رات پھر ایک ہی کمبل میں فاطمہ اور مَیں سکڑتے رہے تھے۔ لیکن تھکن کے باعث سوتے ہی رہے... یہ الگ بات ہے کہ بڑی ہی بے چین نیند رہی تھی۔

مَیں نے کچھ خشک لکڑیاں جمع کیں... لیکن آگ جلاتے جلاتے رہ گیا کیونکہ رات بھی مَیں نے اس لیے الاؤ روشن نہیں کیا تھا کہ کہیں ڈاکوؤں کی نگاہ میں نہ آ جائیں۔ اس علاقے میں دھوئیں کو دُور ہی سے دیکھا جا سکتا تھا۔

چاقو کی مدد سے ایک ڈبہ کھول کر مَیں نے خود بھی کھایا اور فاطمہ کو بھی کھلایا۔ کل رات ہی سے وہ چپ چپ سی تھی جیسے اس کا ننھا سا دل اس تنہائی سے سہما ہوا ہو۔

گھوڑا ندی سے پانی پی کر اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔

مَیں نے پانی پیا اور برتن کو تازہ پانی سے بھر لیا۔

فاطمہ نے اس دوران میں اپنی ماں کا ایک بار بھی ذکر نہیں کیا تھا۔ مَیں نے اِدھر اُدھر دیکھا لیکن کوئی ایسی جگہ نظر نہ آئی جس پر چڑھ کر مَیں اطلس کی پشت پر سوار ہو سکتا۔ مجبوراً مجھے فاطمہ ہی کو اس پر سوار کرا دینا پڑا، اور مجھے پیدل ہی سفر کرنا پڑا۔

مَیں نے ڈاکوؤں کے خوف سے ایسے راستوں کا انتخاب کیا تھا جہاں ہم زیادہ سے زیادہ چھپے رہ سکیں۔ اس مقصد کے لیے مجھے عام

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

راستے سے کچھ ہٹ کر لیکن راستے کو نگاہ میں رکھتے ہوئے چلنا پڑ رہا تھا۔

جیسے جیسے سورج بلند ہوتا جا رہا تھا، فضا میں حدت بڑھتی جا رہی تھی۔ مَیں بار بار فاطمہ کی طرف دیکھ رہا تھا اور مجھے یہی دھڑکا تھا کہ کہیں وہ رونا نہ شروع کر دے... لیکن وہ ضبط کا دامن تھامے ہوئے تھی۔ مَیں اطلس کی لگام تھامے آہستہ آہستہ چلتا رہا۔

اچانک مجھے ایک ہرن دکھائی دیا۔

میرے پاس رائفل نہیں تھی اس لیے مَیں ایک طویل سانس لے کر ہی رہ گیا۔ یہ ہرن شکار ہو جاتا تو کافی حد تک غذا کا مسئلہ حل ہو جاتا... لیکن میرے پاس چرمی تھیلے میں صرف ایک گولی تھی... وہی گولی جو تھیلے کے کاغذات سے گری تھی اور مَیں اب تک کئی بار اس کے بارے میں سوچ چکا تھا لیکن اس کی اہمیت میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

کبھی کبھی جنگلی جانور بھی نظر آ جاتے۔ وہ رُکتے، ایک نظر ہم تینوں کی طرف دیکھتے اور پھر جھاڑیوں میں جا کر غائب ہو جاتے۔ شاید وہ دو بچوں اور ایک گھوڑے کو دیکھ کر حیران ہو رہے تھے کیونکہ اس علاقے میں یوں بے سروسامانی کے عالم میں سفر کرنا موت کے منہ میں جھانکنے کے مترادف تھا۔

چلتے چلتے مَیں بار بار اطلس کی طرف بھی دیکھ لیتا تھا کیونکہ مجھے یہ تربیت دی گئی تھی کہ ایسے علاقے میں سفر کرتے وقت ہمیشہ گھوڑے کی طرف متوجہ رہنا چاہیے۔ حیوانوں میں انسان سے پہلے خطرے کو محسوس کرنے کی فطری صلاحیت ہوتی ہے۔ اس بنیاد پر گھوڑا خطرات کو قبل از وقت دیکھنے کا بہترین قدرتی آلہ ہوتا ہے۔

سورج اپنا سفر آسمان پر اور ہم زمین پر... طے کر رہے تھے۔ سورج کی منزل قریب آ رہی تھی اور وہ ڈھلن پھر ڈھلتا اور جھلسا تا ہوا مغرب کی ٹھنڈی گود میں اُتر رہا تھا جبکہ ہماری منزل ابھی دُور تھی۔ اتنی دُور کہ ہم اسے دیکھ بھی نہیں سکتے تھے۔

راستے میں ایک جگہ گھنی جھاڑیاں تھیں لیکن ہم وہاں زیادہ دیر نہیں رُکے کیونکہ شام ہونے سے پہلے پہلے مَیں کسی ایسی جگہ پہنچ جانا چاہتا تھا جہاں پانی موجود ہو۔ پانی ہمارے پاس ختم ہو چکا تھا۔ فاطمہ نے تو حد ہی کر دی تھی۔ اس نے بار بار پانی پینا شروع کر دیا تھا۔ اس کی رنگت میں جلدی جلدی زردی آ گئی تھی اور اس کا چہرہ پھیکا پھیکا سا ہو گیا۔

... پھر ایک جگہ ہم نے پڑاؤ ڈال دیا۔

بچا کھچا کھانا کھانے اور ٹھنڈا پانی پینے کے بعد مَیں نے گھاس کا بستر تیار کیا اور ہم دونوں کمبل اوڑھ کر لیٹ گئے۔ اندھیرا پھیل رہا تھا۔ فاطمہ مسلسل خاموش تھی۔ اس کا جی بہلانے کے لیے مَیں ایک آدھ بات کرتی دیتا تو وہ ہُوں ہاں میں جواب دے کر خاموش ہو جاتی۔

دن بھر کی تھکان نے جلد ہی ہماری پلکوں پر بوجھ بٹھا دیا اور ہم گہری نیند سو گئے۔ اطلس اس دوران میں ہمارے قریب ہی بیٹھ گیا۔

مَیں نے اپنا شکاری چاقو اپنے ہاتھ کی رسائی میں رکھا ہوا تھا۔ ابھی ہمیں سوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ اچانک گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دیں۔

مَیں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے آس پاس کا سارا علاقہ گھوڑوں کے قدموں تلے روندا جا رہا ہو۔ مَیں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھا اور پھر فاطمہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس کا منہ آہستہ آہستہ کھل رہا تھا اور آنکھیں پھٹی پھٹی سی تھیں۔ ہم دونوں ہی اُٹھ بیٹھے تھے۔ اطلس بھی نتھنے پھیلا رہا تھا۔

... اور پھر اس سے پہلے کہ فاطمہ کی دلدوز چیخ سے پوری وادی گونج اٹھتی، مَیں نے اس کا منہ دبا لیا اور اسے گھاس کے بستر پر گرا کر خود بھی اس کے قریب ہی گر گیا۔

ٹاپوں کی دھمک مجھے اپنی کھوپڑی میں محسوس ہو رہی تھی۔

اگر مَیں ذرا سا بھی غیر محتاط ہوتا تو فاطمہ کی چیخ سے پوری وادی گونج اٹھتی اور وہ گھڑسوار ہماری موجودگی سے آگاہ ہو جاتے جن کی وجہ سے ہم تینوں میں خوف و ہراس کی لہر دوڑ گئی تھی۔ ممکن تھا کہ فاطمہ اتنی زور سے نہ چیخ پاتی کہ آواز ان گھڑسواروں تک پہنچ جاتی... لیکن صورت

بغداد کی رات

قمر اجنالوی

الف لیلیٰ کی ایک ہزار راتوں سے زیادہ حسین و رنگین رات' دجلہ اور نیل کے دامنوں میں لپٹی ہوئی رات' جسے بے شمار کتابوں کے حوالوں سے آراستہ کیا گیا ہے

1200 سے زائد صفحات

قیمت:۔ /600

ناشر: مکتبہ القریش
اردو بازار لاہور

حالانکہ ایسی بھی کہ میں اس وقت معمولی سا بھی خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔

میں نے اطلس کی طرف دیکھا۔

وہ اب بھی نتھنے پھیلا رہا تھا۔

اس کے کان چاروں طرف گھوم رہے تھے جیسے وہ خطرے کی سمت کا اندازہ لگا رہا ہو۔ میرا ہاتھ اب بھی فاطمہ کے منہ پر جما ہوا تھا اور وہ اس دباؤ تلے بُری طرح کسمسا رہی تھی... لیکن میں نے اس کے منہ سے ہاتھ پھر بھی نہ ہٹایا۔

یہ میرے ہاتھ کے دباؤ کا اثر تھا یا بے انتہا خوف کی وجہ کہ فاطمہ کے چہرے پر کفن جیسی سفیدی جھلک آئی تھی۔ اس کی آنکھیں اُبلی اُبلی سی تھیں۔ بالکل اس چھپکلی کی آنکھوں کی طرح جسے میں نے ایک بار کھوپڑی سے پکڑ کر مسل دیا تھا تو اس کی آنکھیں نکل آئی تھیں۔

فاطمہ سر کو بے بسی سے دائیں بائیں پٹخنے لگی۔

میں نے اس کی طرف جھکتے ہوئے سرگوشی کی... "سنو فاطمہ! معلوم نہیں یہ کون لوگ ہیں لیکن مجھے شبہ ہے کہ یہ ڈاکو ہیں۔ اگر یہ ڈاکو ہی ہیں تو یقین کر لو کہ تمہاری آواز سُن کر یہ لوگ نہ صرف ہماری طرف متوجہ ہو جائیں گے بلکہ ہم دونوں کو قتل بھی کر دیں گے اور اطلس کو لے جائیں گے۔"

اس نے میری طرف دیکھا۔

اس کی آنکھوں میں شکایت تھی۔

... پھر وہ سر کو دائیں بائیں حرکت دینے لگی۔ جیسے یہ یقین دلانا چاہتی ہو کہ اب وہ ہرگز نہیں چیخے گی۔ میں نے مطمئن ہو کر اس کے منہ سے ہاتھ ہٹا لیا۔

اب میں فاطمہ اور گھوڑے اطلس، دونوں ہی کی طرف سے مطمئن تھا۔ میرا ہاتھ اپنے شکاری چاقو کی طرف بڑھ گیا۔ چاقو ہاتھ میں لے کر میں دبے قدموں اس جھاڑی کی طرف بڑھ گیا جہاں چھپ کر میں پوری وادی کا جائزہ لے سکتا تھا اور کسی کی مجھ پر نگاہ نہیں پڑ سکتی تھی۔

میں نے رات کو بستر لگاتے وقت اس جگہ کا خاص طور سے انتخاب کیا تھا۔ یہ جگہ بلندی پر تھی اور یہاں چاروں طرف گھنی جھاڑیاں تھیں۔ یہ جھاڑیاں زیادہ اونچی تو نہیں تھیں لیکن مجھ جیسے سات سالہ بچے اور فاطمہ جیسی چھوٹی سی بچی کو چھپانے کے لیے موزوں تھیں۔ اطلس کے بارے میں، میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اُسے نیچے وادی سے دیکھا جا سکتا تھا یا نہیں۔

آدھی رات کے بعد مطلع صاف ہو گیا تھا اور چاند نکل آیا تھا۔ پوری وادی چاندنی میں یوں نہائی ہوئی تھی کہ میں نیچے وادی میں موجود ایک ایک چیز کو صاف دیکھ سکتا تھا۔ نرم نرم سی دھوپ جیسی اس چاندنی میں وہ گھڑسوار بے حد خوفناک دکھائی دے رہے تھے جنہیں میں نیچے وادی میں متحرک دیکھ رہا تھا۔

یہ گھڑسوار تعداد میں چھ تھے۔

انہوں نے چشمے کے بہتے ہوئے پانی... کے قریب گھوڑوں کو روک لیا اور کود کر یوں پانی کی طرف لپکے جیسے برسوں سے پیاسے رہے ہوں۔ نہ جانے یہ کون لوگ تھے اور کہاں سے آئے تھے۔ ان کی منزل معلوم نہیں کون سی تھی۔ اگر ان کا رُخ اسی جانب ہوتا جدھر ہم جا رہے تھے تو شاید میں اُن سے ملنے کا خطرہ مول لے لیتا... لیکن وہ مخالف سمت سے آئے تھے اور اسی جانب جا رہے تھے جدھر سے ہم نے یہ لامتناہی سفر شروع کیا تھا۔

ان چھ گھڑسواروں میں سے ایک لمبے قد کا آدمی تھا۔

وہ اتنا طویل قامت تھا کہ گھوڑے کی پشت پر بیٹھا ہوا عام آدمی کے قد جتنا لگتا تھا۔ وہ سب سے آخر میں ندی کی طرف گیا تھا۔ اس کے انداز سے محتاط فطرت کا اظہار ہو رہا تھا۔ اس نے پانی پینے کے سلسلے میں اپنے ساتھیوں جیسے بے صبرے پن کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔

اس نے گھوڑے سے اُتر کر اِدھر اُدھر دیکھا۔

چند لمحوں تک اس کی نگاہ اُس سمت میں جمی رہی جہاں ہم تینوں چھپے ہوئے تھے۔ معلوم نہیں اُسے کچھ دکھائی دیا یا نہیں... لیکن وہ ہماری جانب دیکھتا ضرور رہا... پھر وہ آہستہ آہستہ ندی کی طرف گیا اور گھٹنوں کے بل جھک گیا۔

نہ جانے کیوں مجھے یہ شبہ ہو رہا تھا کہ وہ ہماری موجودگی سے آگاہ ہو چکا ہے۔ اب چھ آدمی اور چھ گھوڑے ندی کے ٹھنڈے پانی کو اپنے اپنے پیٹ میں اتار رہے تھے۔ آدمی بھی جانوروں کی طرح ہی پانی پینے میں مصروف تھے۔ وہ تعداد میں چھ تھے لیکن ان کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے وادی یوں گونج اٹھی تھی جیسے کوئی لشکر جرار وہاں گھس آیا تھا۔ ممکن ہے یہ تاثر میں نے اس لیے لیا ہو کہ میری نیند اچاٹ ہو گئی تھی۔ بہرحال ان گھڑسواروں کی وجہ سے ہم تینوں میں بے چینی پھیل گئی تھی۔

اچانک مجھے اپنی گردن پر کسی کی تیز نگاہوں کا احساس ہوا۔ ماں ریشم جان نے جس انداز میں میری تربیت کی تھی، اس سے مجھ میں جنگلی جانوروں جیسی حسیات پیدا ہو گئی تھیں۔ میں ایسی آوازیں نکالنے پر قادر ہو گیا تھا کہ خطرناک ترین درندہ بھی ان آوازوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ کسی کی نگاہ کا احساس بھی انہی حسیات میں سے ایک کے تحت ہوا۔

میں نے پلٹ کر دیکھا۔

یہ فاطمہ تھی جو میرے پیچھے اکڑی ہوئی سی تھی۔

وہ اس وقت ایک ایسی اُداس گڑیا نظر آ رہی تھی جس سے اس کا پیار اگمڈا روٹھ گیا ہو... اور وہ پریشان ہو کر اُسے کیسے منائے۔ وہ میری پشت پر کھڑی جھاڑیوں میں سے اُن گھڑسواروں کی طرف دیکھنے لگی جو جانوروں کی طرح جھکے پانی سے منہ لگائے ہوئے تھے۔

"یہ کون لوگ ہیں شہباز؟" اس نے پوچھا۔ اس کی آواز بے حد دھیمی تھی... اور جس کانپتی ہوئی آواز میں اس نے مجھ سے سوال کیا تھا اس سے پتہ چلتا تھا کہ اس کا ننھا سا دل کسی نازک پتے کی طرح کانپ رہا ہے۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور پلٹ کر اطلس کی طرف دیکھنے لگا جو اب بھی خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے کان ابھی تک متحرک تھے گویا وہ خطرے کی طرف سے اب تک مطمئن نہیں ہوا تھا۔

"یہ کون لوگ ہیں، شہباز؟" فاطمہ نے اپنا سوال سرگوشی میں دُہرایا تو میں اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"میرا خیال ہے، یہ ڈاکو ہی ہیں۔" میں نے کہا۔

"ڈاکو بچوں کو کچھ نہیں کہتے، نا؟"

"خاموش رہو۔" میں نے دھیمی آواز میں اسے ڈانٹ دیا۔ "ڈاکو قتل کرتے وقت چھوٹوں اور بڑوں کا خیال نہیں کرتے۔" یہ کہتے ہوئے میرے ذہن میں وہ منظر گھوم گیا جسے میں نے پڑاؤ میں دیکھا تھا۔ ڈاکوؤں نے بچوں، بوڑھوں اور عورتوں تک کو ذبح کر دیا تھا اور انہوں نے کسی کا بھی لحاظ نہیں کیا تھا۔

میں دوبارہ ندی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

وہ لوگ اب بھی پانی پر جھکے ہوئے تھے۔ انہیں غالباً پیاس نے نڈھال کر رکھا تھا۔ اس سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ جس سمت میں ہم بڑھ رہے ہیں، اُدھر کافی فاصلے تک پانی کی ایک بوند بھی نہیں ملے گی۔ پانی پینے کے بعد ان میں سے دو ایک نے شاید اپنے سر ندی میں ڈال دیے تھے اور یوں وہ سفر کی گرمی کو پانی کی ٹھنڈک سے دُور کر رہے تھے۔

طویل قامت شخص نے سب سے پہلے پانی کی چھاگل بھری

سے سر اُبھارا۔ وہ گیلے بالوں کو جھٹکاتے کر نرمی سے کئی قدم دُور ہٹ گیا۔ پھر وہ ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔

اس کے متجسس انداز کو محسوس کر کے مجھے یقین ہو گیا کہ اُس کا شبہ ابھی تک دُور نہیں ہوا۔ غالباً اُس نے کوئی معمولی سی آہٹ ہی سن لی تھی۔ ایسی آہٹ جس سے اُسے پتہ چل گیا تھا کہ آس پاس کوئی چھپا بیٹھا ہے۔ اگر میرا یہ خیال درست تھا تو اس شخص کے احساسات واقعی شدید تھے۔ ایسے حسّاس آدمی ہمیشہ خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔

پتھر پر بیٹھ کر اُس نے جیب سے کوئی چیز نکالی اور پھر اس کے چہرے کے سامنے ایک شعلہ سا لپک گیا۔ اس نے تمباکو نوشی شروع کر دی تھی۔ میں شکاری چاقو ہاتھ میں لیے خاموش بیٹھا رہا۔

وہ آہستہ آہستہ دُھواں اُگلتا رہا اور مسلسل انہی جھاڑیوں کی طرف دیکھتا رہا جن میں ہم تینوں چھپے ہوئے تھے۔ اس کے باقی ساتھیوں نے پانی پی لیا اور منہ ہاتھ دھونے کے بعد ترو تازہ ہو گئے تو ہر ایک اپنے اپنے گھوڑے کی پشت پر سوار ہو گیا۔ تب وہ بھی اُٹھا اور اس انداز میں گھوڑے پر سوار ہُوا جیسے وہ طوعاً و کرہاً ہی ایسا کر رہا ہو۔

ندی سے گزر کر اُن کے گھوڑے جلد ہی ہماری نگاہ سے اوجھل ہو گئے لیکن اس طویل قامت شخص کا ہیولہ میرے ذہن میں چپک کر رہ گیا تھا۔ اس نے گھوڑے پر سوار ہونے کے بعد بھی ہماری طرف دیکھا تھا۔

ہم خاموش بیٹھے ان کے گھوڑوں کی ٹاپیں سُنتے رہے... پھر یہ آوازیں ختم ہو گئیں تو میں نے اطلس کی طرف دیکھا۔ اس کے کان اب بھی متحرک تھے۔ گویا وہ اب بھی بعض ایسی دھیمی آوازوں کو سُن رہا تھا جو ہمیں سنائی نہیں دے رہی تھیں۔

میں نے فاطمہ کی طرف دیکھا۔

"تم اب سو جاؤ..." میں نے نرم لہجے میں کہا۔

"مجھے بھوک لگ رہی ہے شہباز!" اس نے یوں ڈرتے ڈرتے کہا جیسے خدشہ ہو کہ میں اس بات پر اُسے ڈانٹ دوں گا۔ لیکن میں نے خاموشی سے جو کچھ میسّر تھا، نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔

کھانے کے بعد اُسے پیاس لگی۔

میں نے پانی کا برتن اس کی طرف بڑھا دیا۔

جب وہ سو گئی تو میں نے اطلس کی طرف دیکھا۔ وہ اب پُرسکون تھا۔ اس کے کان کھڑے نہیں تھے۔ گویا آس پاس اب کوئی خطرہ نہیں تھا۔ نیند کی کمی اور تھکن کی وجہ سے میری آنکھیں جلنے لگی تھیں اس لیے میں بھی فاطمہ کے پہلو میں لیٹ گیا۔

آسمان پر نِکھرے دُھلے سے چمکدار ستارے بکھرے ہُوئے تھے۔ میں اُنہیں گھُورتا رہا... حتیٰ کہ میری آنکھیں خود بخود ہی نیند سے بھاری ہو کر بند ہو گئیں۔

❁

پہلے کو جو حادثہ پیش آیا تھا، اس کے بعد سے آج چوتھا روز تھا کہ ہم ایک موہوم سی منزل کی طرف سفر کر رہے تھے۔ فاطمہ نے گزشتہ رات کے بعد سے ایک بار بھی اپنی ماں کے بارے میں مجھ سے نہیں پوچھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ابھی کبھی نمی ضرور تیرنے لگتی تھی لیکن اب اس کے چہرے سے وہ زردی ختم ہو رہی تھی جس نے مجھے بے حد پریشان کر رکھا تھا۔ میں اُس کی ہر طرح سے مدد کر سکتا تھا۔ اس کی حفاظت بھی میری ہی ذمے داری تھی لیکن اگر وہ بیمار پڑ جاتی تو میں اس کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔

ہمارے پاس کھانے کی تمام اشیا ختم ہو گئی تھیں۔

برتن میں تھوڑا سا پانی تھا جسے میں بہت احتیاط سے استعمال کرنا چاہتا تھا۔ ایک جگہ ہری ہری گھاس نظر آئی تو اطلس کو چرنے کے لیے چھوڑ کر ہم دونوں ایک طرف بیٹھ گئے۔

وہ اطمینان سے اپنا پیٹ بھرتا رہا۔

مجھے بھی بھوک ستانے لگی تھی لیکن ماں ریشم جان نے مجھے شاید پتھر بنا دیا تھا۔ مجھے اپنی بھوک کی اتنی پروا نہیں تھی البتہ میں فاطمہ کے لیے ضرور پریشان تھا۔

"شہباز..." چار دنوں میں پہلی بار فاطمہ نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "اگر ہم بھی گھوڑے ہوتے تو کتنا اچھا ہوتا!"

"کیا مطلب؟" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہم بھوک لگنے پر گھاس چر سکتے تھے۔"

"گھاس چرنا چاہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" میں نے کہا۔ "گھاس چرنے کے لیے گھوڑا ہونا ضروری نہیں..."

"پھر کیا ہونا ضروری ہے؟"

"گدھے بھی تو گھاس ہی چرتے ہیں۔"

وہ ہنس پڑی۔ میں نے ایک طویل سانس لی۔ اس ننھی سی بچی کے ساتھ کیا حادثہ پیش آ چکا تھا، اگر اُسے ذرا سا بھی احساس ہوتا تو شاید اس کا ننھا سا دل غم کی شدت سے پھٹ گیا ہوتا۔

"کیا تمہیں واقعی بہت بھوک لگ رہی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں... شہباز..."

"لیکن یہاں تو آس پاس پتھروں کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے کہا۔ "اگر تم کہو تو کوئی نرم سا پتھر ڈھونڈ کر لا دوں؟"

وہ ایک بار پھر ہنس پڑی۔

اس ہنسی نے میرے دل سے کافی بوجھ ہلکا کر دیا اور میرا ذہن پہلی بار سوچنے سمجھنے کے قابل ہُوا۔ میں اُٹھ کھڑا ہُوا اور متلاشی نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ دُور چند درخت نظر آ رہے تھے۔ فاصلے کی وجہ سے اندازہ نہ ہو سکا کہ وہ کس چیز کے درخت ہیں۔

"تم کوئی شکار کیوں نہیں کرتے، شہباز؟"

"یہاں شکار کہاں ہے؟" میں نے کہا۔

"تم خرگوش کی بولی تو بول لیتے ہو نا؟ بولنا شروع کر دو۔ شاید کوئی خرگوش جھاڑیوں میں سے نکل کر سامنے آ جائے۔"

"یہاں جھاڑیاں نہیں ہیں اس لیے خرگوش بھی نہیں ہوں گے۔" میں نے کہا۔

"تم بولو تو سہی۔" اس نے اصرار کیا۔

میں سمجھ گیا کہ وہ اس وقت خرگوش کی آواز میرے مُنہ سے سُننا چاہتی ہے۔ میں نے اُسے خوش کرنے کے لیے ہونٹوں کو مخصوص انداز میں سیٹا اور زبان کی نوک دانتوں میں دبا کر مُنہ سے آواز نکالنا شروع کر دی۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"اب راستے میں درخت مل گئے تو میں شکار کرنے کے لیے ایک تیر کمان تیار کر لوں گا۔" میں نے کہا۔ "کیا تم جانتی ہو شکار کر کے جانوروں کو کیسے بھونا جاتا ہے؟"

"تم کسی جانور کو مارو گے شہباز!" وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگی اور مجھے فوراً خیال آ گیا کہ اس کے سامنے شکار بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اُسے جانوروں سے اتنی محبت تھی کہ ان کا خون دیکھ ہی نہیں سکتی تھی۔

"میں تو یونہی تمہیں چھیڑ رہا تھا۔" میں نے ہنس کر کہا اور اطلس کو پکارنے لگا۔ "اطلس... اطلس..."

اُس نے ہری ہری گھاس سے مُنہ اُٹھا کر میری طرف دیکھا۔

"بس اب آ جاؤ... ہمیں شام سے پہلے پہلے کسی محفوظ جگہ پہنچنا ہے اور کچھ کھانے کے لیے بھی تلاش کرنا ہے۔"

قریب ہی ایک اتنی اونچی چٹان تھی کہ میں اس پر چڑھنے کے بعد اطلس پر سوار ہو سکتا تھا۔ میں نے پہلے فاطمہ کو سوار کرایا... پھر خود بھی بیٹھ گیا۔ اطلس نے قدم قدم آگے بڑھنا شروع کر دیا۔

گزشتہ رات میں نے جس دراز قامت گھڑ سوار کو دیکھا تھا، اس کا خیال اب بھی مجھے بار بار ستا رہا تھا۔ میں نے بار بار پلٹ کر بھی دیکھا لیکن دُور و نزدیک کسی انسان کا نام و نشان تک نہیں تھا۔

دن بھر بھوکے پیاسے ہم اطلس کی پُشت پر سوار چلتے رہے۔

ابھی تک کسی آبادی کے آثار نظر نہیں آئے تھے۔

ہر طرف ویرانی ہی ویرانی تھی۔

شام تک اطلس نے ہمیں ایک ایسی جگہ پہنچا دیا جہاں صاف پانی کا ایک چھوٹا سا چشمہ تھا بلکہ وہاں مختلف جانور بھی نظر آ رہے تھے۔ میں نے اطلس کی پُشت سے کُود کر فاطمہ کو اُترنے میں مدد دی اور پھر شکاری چاقو نکال کر ایک درخت کی طرف بڑھ گیا۔

یہ شہتوت کا درخت تھا لیکن موسم نہ ہونے کی وجہ سے شہتوت نہیں لگے تھے۔ میں نے ایک لمبی سی لچکدار شاخ چاقو کی مدد سے کاٹ لی اور اسی شاخ کی چھال اُکھاڑ کر اسے کمان تیار کرنے میں استعمال کر لیا۔ پتلی پتلی چند شاخیں لے کر میں نے ان کے تیر بنا لیے۔

اگرچہ تیر کمان تیار ہو گیا تھا لیکن یہ کارکردگی کے اعتبار سے اتنا اچھا نہیں تھا، جتنا کہ ماں ریشم جان بنایا کرتی تھی... تاہم اس سے کام تو نکالا ہی جا سکتا تھا۔

ابھی ہمیں وہاں رُکے زیادہ دیر نہیں ہُوئی تھی کہ اچانک ہی مطلع ابر آلود ہو گیا۔ ہوا میں فوراً ہی خنکی پیدا ہو گئی۔ اور چند ہی لمحوں کے بعد چھینٹے پڑنے لگے۔

ایک برگد کے نیچے میں نے فاطمہ کو بٹھایا اور اُس کے گرد وہ کمبل لپیٹ دیا جو سردی سے بچاؤ کے لیے ہمارے پاس واحد سہارا تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اطلس قریب ہی چر رہا تھا اور اس پر ایک بلبل میٹھی میٹھی آواز میں بول رہی تھی۔

"تم یہیں بیٹھو... میں ابھی آتا ہوں۔"

میں نے فاطمہ کو ہدایت کی۔

"میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔"

"پھر تم نے ضد شروع کر دی۔" میں نے خفگی سے کہا۔

میرے لہجے سے غالباً اُسے صدمہ پہنچا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے اُسے لپٹایا اور محبت سے کہا۔ "دیکھو نا بارش ہو رہی ہے۔ بھیگ جاؤ گی تو بیمار ہو جاؤ گی۔"

"کیا تم نہیں بھیگو گے؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"میری بات اور ہے۔ میں برداشت کر لیتا ہوں۔" میں نے اسے سمجھا بجھا کر بٹھا دیا اور خود تیر کمان لیے ایک طرف نکل گیا۔ اطلس عقب سے ہنہنایا... لیکن میں نے ہاتھ لہرا دیا۔ اگر میں یہ اشارہ نہ کرتا تو وہ یقیناً میرے پیچھے پیچھے ہی چل دیتا۔

درختوں سے گزر کر میں اس طرف بڑھتا رہا جہاں گھنی جھاڑیاں نظر آرہی تھیں۔ میں مختلف جانوروں کی آوازیں نکالتا ہوا دیر تک ان جھاڑیوں میں بھٹکتا رہا... لیکن کوئی شکار نہ ملا۔

مایوس ہو کر لوٹنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ اچانک میری نگاہ ایک درخت کی طرف اٹھ گئی۔ اخروٹ کا سوکھا ہوا درخت تھا... میں تیزی سے ادھر بڑھ گیا اور درخت کے نیچے اگی ہوئی گھاس میں اخروٹ تلاش کرنے لگا۔ کافی تلاش کے بعد صرف پانچ عدد اخروٹ مل گئے۔

میں انہیں سنبھال کر واپس چل دیا۔

اگرچہ ان پانچ اخروٹوں سے میرا اور فاطمہ کا پیٹ نہیں بھر سکتا تھا لیکن وہ کافی دیر تک کم از کم اپنے منہ کو مصروف ضرور رکھ سکتی تھی۔ اس خیال کے تحت میں نے واپسی کی رفتار تیز کر دی۔

... لیکن چند قدم چلتے ہی مجھے ٹھٹھک جانا پڑا۔

اطلس بڑے زور سے ہنہنایا تھا۔

اس کے فوراً ہی بعد فاطمہ کی دلدوز چیخ نے سناٹے کے ساتھ ساتھ میرے دل کو بھی مجروح کر دیا۔ میں اندھا دھند دوڑ پڑا... اور جب میں اس برگد کے قریب پہنچا، جس کے گھنے پتوں کے سائبان تلے میں فاطمہ کو چھوڑ کر گیا تھا تو مجھے چونک کر رک جانا پڑا۔

ایک لمحے کے لیے تو مجھے یقین ہی نہیں آیا کہ میں جو کچھ دیکھ رہا ہوں وہ حقیقت ہے یا محض میرا وہم ہے... پھر مجھے یقین کرنا ہی پڑا۔ اس چھوٹے سے جنگل میں ریچھ بھی ہو سکتے ہیں، یہ تو میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ فاطمہ بری طرح چیخ رہی تھی اور اطلس زور زور سے زمین پر پاؤں مار کر غصے کا اظہار کر رہا تھا۔

اگرچہ شام ہو رہی تھی اور آسمان پر بادل بھی تھے لیکن ابھی اتنا اندھیرا نہیں ہوا تھا کہ چند قدم کے فاصلے کی چیزیں نہ دکھائی دیتیں میں جہاں تھا، وہیں رکا رہا۔

شلوار میں اڑسا ہوا چاقو میرے ذہن میں تھا لیکن میں اتنے بڑے ریچھ سے محض شکاری چاقو کے ذریعے مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ ماں ریشم جان نے مجھے ریچھ کے بچوں سے کشتی ضرور کروائی تھی لیکن اتنے بڑے ریچھ کو پہلے کبھی دیکھنے کا اتفاق ہی نہیں ہوا تھا۔

ریچھ آہستہ آہستہ اطلس کی طرف بڑھ رہا تھا۔

اطلس ایک بار پھر زور سے ہنہنایا۔

اس نے اگلی ٹانگیں زمین پر تھوڑی سی جھکائیں جیسے وہ ریچھ کے حملے کا جواب دینے کے لیے تیار ہو گیا ہو۔ ریچھ نے فاطمہ کی چیخیں سنیں تو اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ فاطمہ کو دیکھ کر اس کے انداز میں عجیب سی تبدیلی پیدا ہوئی۔ چند لمحوں تک تو وہ غور سے اسے دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھیں بری طرح چمک رہی تھیں ... پھر اس کا دہانہ کھل گیا اور اس کے خوفناک دانت نمایاں ہو گئے وہ عقبی ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا اور یوں فاطمہ کی طرف بڑھنے لگا۔ جیسے کوئی درندہ صفت انسان کسی کمزور و ناتواں ہستی کی طرف بڑھتا ہے... اور اپنی جسمانی طاقت و توانائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پیش قدمی کرتا ہے۔

ریچھ کو فاطمہ کی طرف بڑھتے دیکھ کر میں بوکھلا گیا۔ اگرچہ ریچھ اپنی تمام تر خوفناکیوں سے مجھ پر اثر انداز نہیں ہو سکا تاہم مجھے فاطمہ کی وجہ سے خوف محسوس ہونے لگا تھا... خوف اور شکست جیسے الفاظ مجھے نہیں آتے تھے کیونکہ ماں نے ان لفظوں سے مجھے نفرت کرنا سکھایا تھا... لیکن فاطمہ جیسی ننھی اور پیاری سی بچی کے لیے میرا دل اسی انداز میں دھڑک اٹھا تھا جیسے کسی کا دل خوف سے دھڑکتا ہے۔

شاید اطلس کو بھی ریچھ کے ارادے کا احساس ہو گیا تھا۔

اس نے زور سے ہنہنا کر ٹاپیں ماریں۔

ریچھ اس شور کو سن کر رک گیا۔

اس نے پلٹ کر اطلس کی طرف دیکھا۔ اس کے انداز سے پتہ چلتا تھا، وہ اطلس کے بارے میں اندازہ لگا رہا تھا کہ پہلے اس سے نمٹ لے یا بچی کو جا دبوچے؟... پھر غالباً اس نے پہلے اطلس ہی سے دو دو ہاتھ کرنے کا ارادہ کر لیا۔

وہ آہستہ آہستہ پلٹا اور یوں آگے بڑھنے لگا جیسے اطلس کو اپنے خوفناک ناخنوں اور دانتوں کے ذریعے ادھیڑ ہی تو ڈالے گا۔ اس نے ایک جست لگائی لیکن اسی لمحے اطلس اچھل کر ایک جانب کو کود گیا۔ یوں کودتے وقت اطلس نے کمال ہی تو کر دیا۔ وہ ایک لمحے کے لیے اپنی سامنے کی ٹانگوں پر جھکا اور پھر جلدی سے گھوم گیا۔

اس کا یوں گھومنا ریچھ کے لیے بے حد خطرناک ثابت ہوا۔

اطلس نے جیسے ہی اس کی طرف پشت کی، اس کی عقبی دونوں ٹانگیں تیزی سے اٹھیں اور پھر اس کی دولتی نے ریچھ کو لڑکھڑا دیا۔ چوٹ ریچھ کے کندھے پر لگی تھی۔

اطلس جیسے طاقتور گھوڑے کی دولتی کو برداشت کرنا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ وہ لڑکھڑایا لیکن فوراً ہی سنبھل گیا۔ اس کی آنکھیں اچانک ہی غصے سے دہک اٹھیں۔ لڑکھڑاتے وقت اس کے حلق سے بھیانک آواز نکلی تھی۔ میں جہاں تھا، وہیں کھڑا رہا۔

ریچھ کے سنبھلتے سنبھلتے اطلس نے ایک بار پھر یہی حرکت کی۔ اس بار بھی وہ عقبی ٹانگوں سے ریچھ کے اسی کندھے پر چوٹ لگانے میں کامیاب ہو گیا جس پر پہلے بھی ایک ضرب لگ چکی تھی۔ اس بار کندھے کی شاید ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ میں نے ریچھ کے نتھنے سے خون نکلتے دیکھا۔

اپنی اس کامیابی پر سرشار اطلس نے حریف کے گرد ایک چکر لگایا۔ ریچھ نے اپنا زخمی کندھا نوچ ڈالا اور آسمان کی طرف منہ اٹھا کر اتنی زور سے چیخا کہ زمین کانپتی محسوس ہونے لگی... پھر اس نے اطلس کی طرف دیکھ کر پنجہ اس انداز میں اٹھا لیا جیسے وہ ایک ہی وار میں اطلس کی گردن توڑ ڈالنا چاہتا ہو۔ ایسی حالت میں اگر وہ اطلس پر وار کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو جہاں بھی چوٹ لگتی، یقیناً گھوڑے کے جسم کا وہ حصہ ناکارہ ہو جاتا... میں جانتا تھا کہ ریچھ نے اب جو انداز اختیار کیا ہے۔ اطلس اس کی وجہ سے نقصان اٹھائے گا۔ وہ اب بھی تیسری دولتی مارنے کے لیے ریچھ کے گرد چکرا رہا تھا۔

اس صورت حال نے میرے جسم میں سنسنی کی لہر سی دوڑا دی۔ فوراً میں نے کندھے سے وہ کمان اتار لی جسے میں نے شہتوت کی شاخ اور چھال کی مدد سے تیار کیا تھا۔ میں نے اس تیر کا جائزہ لیا جو میں نے ایک پتلی سی شاخ کو پتھر پر گھس کر بنایا تھا۔

یہ ایک معمولی سا تیر تھا... لیکن اگر یہ پوری قوت سے صحیح نشانے پر بیٹھتا تو ریچھ کے ارادے خاک میں مل سکتے تھے۔ ریچھ اور میرے درمیان کافی فاصلہ تھا۔ کمزور کمان سے تیر کو بہت پر زور سے پھینکنا ممکن نہیں تھا اس لیے میں آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔

اس کی گردن پر مجھے ایک سفید سا نشان نظر آیا۔ میں نے اسے ذہن میں محفوظ کر لیا اور موقع کا انتظار کرنے لگا۔ اسی لمحے ریچھ گھومتا ہوا اس انداز میں سامنے آیا کہ مجھے اس کا گلا دکھائی دینے لگا۔ اسے نشانہ بنانے کے لیے یہ ایک بہترین موقع تھا۔

میں نے اس کے نرخرے کا نشانہ لے کر پوری قوت سے تیر پھینکا۔ تیر کمان سے کسی ایسے پرندے کی طرح نکلا جسے ایک عرصے بعد رہائی نصیب ہوئی ہو اور سیدھا ہدف کی طرف گیا۔ جتنی قوت سے تیر پھینکا تھا اس سے مجھے امید تھی کہ ریچھ کو نقصان ضرور پہنچے گا۔

تیر اس کے گلے سے جا ٹکرایا۔

ریچھ زمین سے اچھل پڑا۔

اس کی آواز سے چٹانوں کے دل بھی کانپ گئے ہوں گے۔

میں نے دیکھا کہ تیر اس کے نرخرے سے کچھ ہٹ کر پیوست ہوا ہے۔ اس کے دونوں ہاتھ فوراً ہی اپنے گلے پر پہنچ گئے۔ تیر کو ہاتھ میں لے کر اس نے پوری قوت سے جھٹکا مارا تو شاخ ٹوٹ گئی اور وہ حصہ نکل سکا جو اس کے گلے میں پیوست ہو گیا تھا۔

اس نے میری طرف بڑی خونخوار نگاہ سے دیکھا۔

میں اس وقت ایک درخت کے قریب ہی کھڑا تھا۔ میں نے فاطمہ کی طرف دیکھا۔ وہ خاموش ہو گئی تھی اور میری ہی جانب متوجہ تھی۔ اس نے مجھے تیر چلاتے اور تیر کو ریچھ کے گلے میں پیوست ہوتے دیکھ لیا تھا۔ اس کے حلق سے خوشی کی ایک چیخ نکل گئی اور وہ میری طرف دوڑ پڑی۔

یہ غلطی تھی لیکن وہ ریچھ سے پہلے ہی مجھ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئی۔ اس وقت تک اطلس ایک بار پھر ریچھ کی پشت پر پہنچ چکا تھا۔ اس نے پوری قوت سے ایک اور دولتی ماری۔

اس مرتبہ دولتی نے ریچھ کی پشت پر قیامت توڑ دی تھی۔ وہ اپنے سامنے والے پنجوں کے بل زمین سے ٹکرا گیا۔ میں نے فاطمہ کو سہارا دیا۔ "جلدی سے درخت پر چڑھ جاؤ۔" میں نے کہا۔

وہ درخت پر چڑھ گئی۔ میں ابھی درخت کے نیچے ہی تھا کہ ریچھ نے مجھ پر جست لگا دی۔ میں اسی لمحے اچھلا تھا۔ درخت کی ایک شاخ میرے ہاتھ میں آگئی اور میں نے خود کو اوپر اٹھا لیا۔

اطلس دوڑتا ہوا ایک بار پھر اس کے قریب آگیا تھا اس لیے ریچھ نے میرا خیال چھوڑ کر گھوڑے کی طرف توجہ دی۔ غالباً اسے احساس ہو گیا تھا کہ اطلس کی دولتیوں سے بچ کر ہی وہ زندگی کو محفوظ رکھ سکتا ہے۔ میں اس وقت تک شاخ کے سہارے درخت پر چڑھ کر اس کی دسترس سے دور پہنچ چکا تھا۔

اپنی کامیابیوں پر گھوڑے کو شاید اپنے بارے میں کچھ زیادہ ہی خوش فہمی ہو گئی تھی۔ اس بار وہ ریچھ کے کافی قریب پہنچ گیا اور جیسے ہی اس نے اچھل کر دولتی مارنا چاہی، ریچھ کا دایاں پنجہ تیزی سے حرکت میں آگیا۔

اگر اس کا یہ ہاتھ گھوڑے کو لگ جاتا تو یقیناً اس کا سینہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چاک ہوگیا ہوتا... لیکن اطلس نے بروقت دوسری جانب چھلانگ لگا دی تھی اس کے باوجود ریچھ کا پنجہ اس کے جسم پہ ایک گہری خراش ڈالتا ہوا نکل گیا۔ خراش فوراً ہی خون سے بھر گئی۔

ریچھ کا مارے غصے کے عجب حال ہوگیا۔

وہ دیوانہ نظر آنے لگا۔

اس نے رُک کر ایک نظر درخت کی طرف دیکھا اور پھر گھوڑے کی طرف متوجہ ہوگیا جو اس کے پنجے سے خراش کھانے کے بعد اب قدرے محتاط اور اس سے دُور دُور تھا۔ گھوڑے نے اس کے سامنے کچھ فاصلہ برقرار رکھتے ہوئے مسلسل اِدھر سے اُدھر دوڑنا شروع کر دیا تھا۔

اپنی جسامت کے بل بوتے پر وہ ایک بار پھر کامیاب ہوگیا۔ اس بار بھی دولتی ریچھ کو زمین سے اٹھا کر پھینکنے کے لیے کافی ثابت ہوئی۔ ریچھ اب کافی زخمی ہوگیا۔ اس کے گلے میں تیر ابھی تک پیوست تھا اور اس سے خون ٹپک رہا تھا۔

عام حالات میں اس قسم کے جنگلی ریچھ اور گھوڑے سے مقابلہ بہتر نتائج کا حامل نہیں ہوتا لیکن ریچھ کے گلے میں پیوست تیر اور تیزی سے ضائع ہونے والا خون اطلس کو کامیابیوں سے قریب تر لانے میں مددگار ثابت ہو رہا تھا۔ ریچھ کے کندھے سے بھی کافی تیزی سے خون بہہ رہا تھا۔

وہ زمین پہ بیٹھ گیا۔

اطلس نے فاتحانہ انداز میں ہنہناتے ہوئے اس کے گرد ایک چکر لگایا اور اسی لمحے ریچھ نے ایک خوفناک جست لگائی۔ گھوڑا اس وقت ریچھ کے پیچھے تھا۔ وہ اس کی پشت پہ گرا۔ گھوڑے نے خود کو زمین سے اچھالا لیکن وہ ریچھ کو پشت سے گرانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ وہ بُری طرح اس کی پشت سے چمٹ گیا تھا۔

گھوڑے کے حلق سے ایسی آوازیں نکلنے لگیں جیسے وہ اس صورتِ حال سے خوف زدہ ہوگیا ہو۔ "اطلس..." میں زور سے چیخ پڑا۔ یہ آواز صرف اُسے یہ احساس دلانے کے لیے تھی کہ وہ میدان میں تنہا نہیں ہے۔ میری آواز سنتے ہی گھوڑا ایک بار پھر زور سے اچھلا اور اس نے خود کو پہلو کے بل زمین پر گرا دیا لیکن ریچھ ہوشیار تھا۔ وہ اس کے پیٹ کی طرف کھسک گیا۔

میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

اطلس کو اب ریچھ کے... پنجے سے کوئی نہیں بچا سکتا تھا میں گھوڑے کی کربناک آواز سننے کا انتظار کر رہا تھا کہ اچانک ایک دھماکہ ہوا اور ماحول گولی کی گونج سے کانپ گیا۔ درختوں پر بیٹھے ہوئے ان گنت پرندے اس دھماکے کی وجہ سے شور مچاتے اور پر پھڑپھڑاتے ہوئے شاخوں سے اُڑ گئے اور ایک چھوٹے سے جنگل میں کہرام مچ گیا۔

آنکھیں کھول کر دیکھا تو مجھے حیرت کا جھٹکا سا لگا۔

ریچھ گھوڑے کے اوپر پڑے پڑے بڑے زور سے اچھلا۔ ایک لمحے کے لیے وہ فضا میں معلق نظر آیا۔ اس دوران میں اطلس تیزی سے اٹھا اور اس نے پلٹ کر دونوں عقبی ٹانگوں کو پیچھے پھینکا۔

ریچھ کو یہ دولتی بہت دُور تک اچھال گئی۔

وہ زمین پر گرا اور پھر نہ اُٹھ سکا۔

میں درخت پہ بیٹھا اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ فاطمہ کی آنکھوں میں دہشت کے سائے تیر رہے تھے۔ غالباً اس دھماکے نے اس کے ننھے سے دل میں بھی طوفان اٹھا دیا تھا۔

"کون ہے... شہباز؟" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"شش..." میں نے اسے ڈانٹ دیا۔ "خاموش رہو۔"

گھوڑا رُک کر اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔

اس کے کان متحرک تھے۔

گولی ریچھ کی کھوپڑی پر لگی تھی اور اس کے چیتھڑے اُڑ گئے تھے۔ گھوڑے نے اس کی طرف دیکھا اور پھر محتاط قدموں سے آگے بڑھا۔ اس کے نتھنے تیزی سے پھیلنے اور سکڑنے لگے جیسے وہ یہ اندازہ کرنا چاہتا ہو کہ ریچھ واقعی مر گیا ہے یا مکر ہی کر رہا ہے۔

کچھ دیر وہ اسے سُونگھتا رہا... پھر اس نے آسمان کی طرف منہ اٹھا کر عجیب سی آواز نکالی۔ ایسی آواز میں نے پہلے کبھی اطلس کے حلق سے نکلتی نہیں سنی تھی۔ شاید فتح و کامرانی کا نعرہ تھا۔

جس کسی نے بھی گولی چلائی تھی وہ ابھی تک سامنے نہیں آیا تھا۔ میں اپنی بے ترتیب دھڑکنوں پر قابو رکھ کر اس کی تلاش میں اِدھر اُدھر دیکھتا رہا... لیکن جب کوئی نظر نہ آیا تو میں نے فاطمہ کو درخت ہی پر بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا اور خود نیچے کود گیا۔

ریچھ کو گولی کا نشانہ بنانے والا کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

فائر چونکہ ریچھ پر کیا گیا تھا اس لیے میں توقع کر رہا تھا کہ وہ کوئی ایسا راہگیر ہوگا جسے گھوڑے کی بے بسی پر ترس آگیا ہوگا... لیکن جب میں نے عقب میں سرسراہٹ سنی تو چونک کر پلٹ پڑا... اور پھر مجھے یوں لگا جیسے میرے دل نے حلق کی طرف سفر کرنا شروع کر دیا ہو۔

میرے سامنے وہی طویل قامت شخص کھڑا تھا۔ جسے میں نے گزشتہ رات چشمے کے کنارے دیکھا تھا۔ میرے سامنے وہ اپنے پانچ ساتھیوں کے ساتھ مخالف سمت میں چلا گیا تھا... لیکن اسے سامنے دیکھ کر مجھے یقین کر لینا پڑا کہ اس نے ہمیں دھوکا دیا تھا... اور اس دھوکا دہی میں اسے ناکامی بھی نہیں ہوئی تھی۔

وہ ہمارا پیچھا کر رہا تھا۔

"اوہ... یہ تو ایک چھوٹا سا بچہ ہے۔" اس نے کہا اور پلٹ کر دیکھا۔ میں نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھا تو دو اور آدمی کھڑے دکھائی دیے۔ ان دونوں کی طرف وادی میں زیادہ توجہ نہیں دی تھی اس لیے میں یہ اندازہ نہ کر سکا کہ اس کے وہی ساتھی ہیں یا کوئی اور ہیں۔

"شہباز..." درخت کے اوپر سے فاطمہ چیخ پڑی۔

میں نے قہر آلود نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا لیکن وہ بول کر خود کو ظاہر کر چکی تھی۔ طویل قامت شخص غور سے میری طرف دیکھ رہا تھا پھر اس نے درخت کی طرف دیکھا اور بڑبڑایا۔ "ایک چھوٹی سی بچی..."

اس کا ایک ساتھی تیزی سے آگے بڑھا۔

"نیچے آجاؤ، لڑکی۔" اس شخص نے سخت لہجے میں فاطمہ سے کہا۔

اس کا لہجہ اتنا خوفناک تھا کہ فاطمہ مارے خوف کے رو پڑی۔ مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں وہ خوف کی وجہ سے درخت سے گر کر ہاتھ پاؤں نہ تڑوا لے۔

"تمہیں بچی کے ساتھ نرمی سے بات کرنی چاہیے۔" میں نے طیش کے عالم میں کہا تو وہ شخص چونک کر میری طرف دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے سے سخت گیری جھلک رہی تھی۔ اس کی آنکھیں لال لال تھیں جیسے وہ کوئی تیز نشہ کرنے کا عادی رہا ہو۔ چند لمحوں تک وہ میری آنکھوں میں دیکھتا رہا... پھر حقارت آمیز انداز میں ہنس پڑا۔

"بہت اچھا بڑے میاں۔" اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا اور اس کے قہقہے سے میرا خون کھول اٹھا۔ بے اختیار میرا جی چاہا کہ نیفے سے چاقو نکال کر اس کے نرخرے میں گھونپ دوں... لیکن پھر خیال آیا کہ کہیں یہ لوگ مجھ سے میرا چاقو نہ چھین لیں اس لیے میں نے یہ ارادہ ملتوی کر دیا۔

اس شخص نے دوبارہ فاطمہ کو نیچے اترنے کا حکم دیا۔

فاطمہ ڈرتی ڈرتی نیچے آگئی۔

وہ بُری طرح کانپ رہی تھی۔

مجھے اس پر غصہ آرہا تھا اور رحم بھی محسوس ہو رہا تھا۔ اگر وہ نہ بولتی تو ان لوگوں کو اس کے بارے میں پتہ بھی نہ چلتا اور وہ محفوظ رہتی... لیکن شاید اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ ہر حالت میں میرے ساتھ ہی رہے گی۔

"کیوں..." اس شخص نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ "کیا تم اس لڑکی کو گھر سے بھگا کر لائے ہو؟"

"نہیں..." میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔ "ہم میر کے لیے نکلے تھے اور پھر واپس نہیں جا سکے۔"

اس نے میری بات پر زوردار قہقہہ لگایا اور میں حیرت سے اس کی صورت دیکھتا رہ گیا، میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر اس میں ہنسنے کی ایسی کیا بات تھی۔

"تم دونوں کون ہو... اور یہ شاندار گھوڑا کس کا ہے؟" طویل قامت شخص نے میری طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ اگرچہ اس کا لہجہ بھی اچھا نہیں تھا لیکن اس کے انداز میں سنجیدگی تھی جو مجھے پسند آئی۔

میں نے اُسے مختصراً اپنے قبیلے اور ان لوگوں کے ساتھ پیش آنے والے حادثے کے بارے میں بتایا۔ "میرے بابا مجھے تلاش کر رہے ہیں۔"

"ہوں... تمہارے بابا کا کیا نام ہے؟"

"شالیار خان۔"

طویل قامت شخص کا چہرہ یکایک زرد پڑ گیا۔

"کیا نام بتایا تم نے، لڑکے؟" اس نے سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا اور جھپٹ کر میرے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

"شالیار خان..." میں نے پُروقار لہجے میں بتایا۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہوگیا۔ "یہ بچے بڑے کام کے نکلے ہیں۔" اس نے اطلس کی طرف دیکھ کر اشارہ کیا۔ "خاص طور سے ان کا گھوڑا تو بہت ہی شاندار ہے۔ میں نے کل رات تم سے غلط تو نہیں کہا تھا، دلاور کہ میں نے کسی گھوڑے کی جھلک دیکھی ہے؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جو شخص فاطمہ کا ہاتھ تھامے کھڑا تھا، اسے لمبے قد والے نے دلاور کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ اس نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے مجھے گھورنا جاری رکھا: "لیکن یہ لڑکا مجھے بے حد خطرناک لگتا ہے۔"

"یہ سات آٹھ سال کا بچہ ہے، اس سے تمہیں اتنا خوفزدہ نہیں ہونا چاہیے۔" طویل قامت شخص نے کہا: "او، کافی اندھیرا ہوگیا، چلو اب واپس چلو۔ کہیں آگ نہ بجھ گئی ہو، سردی بڑھ رہی ہے۔"

اس نے میرا ہاتھ تھام لیا اور چلنے لگا۔ فاطمہ کا ہاتھ دلاور کے ہاتھ میں تھا، وہ اسے پکڑے ہمارے پیچھے چلنے لگا۔ تیسرا تیزی سے اطلس کی طرف بڑھا لیکن اطلس بدک کر دور بھاگ گیا۔ وہ اسے پچکارتا رہا اور آگے بڑھتا رہا لیکن اطلس اس سے اتنا ہی دور ہوتا چلا گیا۔

"آجاؤ، نادر..." طویل قامت شخص نے ہنس کر کہا "یہ کوئی عام گھوڑا نہیں ہے۔ اگر میں نے اس کی موجودگی محسوس نہ کر لی ہوتی تو کبھی اتنا لمبا سفر نہ کرتا۔ یہ خود بخود آجائے گا۔"

"گھوڑا بھاگ جائے گا، ابراہیم۔" نادر نے چیخ کر کہا۔

"نہیں... تم دیکھ لینا، یہ ان بچوں کے پیچھے خود ہی آجائے گا۔" طویل قامت ابراہیم نے مسکرا کر کہا۔ مجھے حیرت ہونے لگی کہ اس گھوڑے کے بارے میں بات کرتے وقت اس کا لہجہ فخریہ کیوں ہوگیا ہے: "اگر تم اسی طرح اس کے پیچھے دوڑتے رہے تو تمہیں رات بھر دوڑنا پڑے گا اور تم اس کی گرد کو بھی نہیں پا سکو گے۔"

نادر بڑبڑاتا ہوا واپس آگیا۔

میں نے فاطمہ کی طرف دیکھا۔ وہ ایک بار پھر سہمی سہمی سی اور زرد نظر آنے لگی تھی۔ بالکل ویسی ہی جیسی دو روز قبل تھی۔ میں خاموشی سے ان لوگوں کے ساتھ چلتا رہا اور سوچتا رہا۔ ابھی ہم کچھ ہی دور گئے تھے کہ عقب سے اطلس کی ٹاپیں سنائی دینے لگیں۔

"دیکھا... میں نہ کہتا تھا۔" ابراہیم نے قہقہہ لگا کر کہا۔

نادر نے جواباً ایک گالی دی۔ معلوم نہیں اس طویل قامت شخص کو یا گھوڑے کو... چونکہ ابراہیم نے اس گالی پر کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا تھا اس لیے میں سمجھ گیا کہ اس نے اطلس کو گالی دی ہے۔

"یہ تم کس کو گالیاں دے رہے ہو؟" میں نے پوچھا

"تم سے مطلب، الو کے پٹھے۔" اس نے غصے سے کہا اور میرے گال پر زور سے تھپڑ مارا۔

میرا گال جل اٹھا۔ غصے سے میرا خون کھولنے لگا۔ اگر میرا ہاتھ طویل قامت ابراہیم کے ہاتھ میں نہ ہوتا تو اس تھپڑ کے زور سے یقیناً زمین پر گر گیا ہوتا۔

"بڑوں سے بات کرتے وقت محتاط رہنا چاہیے لڑکے۔" ابراہیم نے مجھے تنبیہ کی: "نادر جیسے آدمی سے تو یوں بھی ادب سے بات کرنی چاہیے کیونکہ اس کی زبان کم اور ہاتھ زیادہ چلتا ہے۔"

میں خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔

ان کے ساتھ ہم ایک ایسی بلند جگہ پہنچ گئے جہاں ایک الاؤ روشن تھا۔ میں توقع کر رہا تھا کہ وہاں ان کے باقی ساتھی بھی موجود ہوں گے لیکن ایسا نہیں تھا۔ ان لوگوں نے غالباً طویل قامت شخص کی باتوں میں آکر یہاں رخ نہیں موڑا تھا۔

رات تیزی سے گہری ہوتی جا رہی تھی۔

اطلس ہمارے پیچھے ہی پیچھے آرہا تھا لیکن اس نے زیادہ قریب آنے کی کوشش نہیں کی۔ نادر بار بار اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے پتہ چلتا تھا کہ وہ اطلس پر قابو پانے کے لیے بے چین ہے۔

انہوں نے ہمیں کچھ گوشت کھانے کے لیے دے دیا۔

بھوک سے فاطمہ تو بالکل ہی نڈھال ہوگئی تھی۔ اس نے جلدی جلدی گوشت کھانا شروع کر دیا۔ ان تین پُراسرار گھڑسواروں میں سے جس کا نام دلاور تھا، قریبی چشمے سے پانی لے آیا۔

"اب تم دونوں بچے..." ابراہیم نے ہماری طرف دیکھتے ہوئے کہا: "یہ کمبل لپیٹ لو اور آرام سے سو جاؤ۔ ہم تمہارے بارے میں کل صبح کوئی فیصلہ کریں گے۔"

"اور سنو..." نادر نے مجھے گھورتے ہوئے کہا: "زیادہ ہوشیار بننے کی کوشش نہ کرنا۔ رات کو اٹھ بھاگنا بھی بیکار ہے۔ میں معمولی سی آہٹ پر گولی چلا دینے کا عادی ہوں۔"

میں خاموش رہا۔

اس نے میرا کان پکڑا اور اسے زور سے مروڑ دیا۔

میرے منہ سے ہلکی سی سسکاری تک نہ نکلی۔

"نہ جانے یہ لڑکا کس مٹی کا بنا ہوا ہے۔" وہ بڑبڑایا، پھر کھسیا کر ہنسنے لگا: "میرے طمانچے سے تو ایک جوان آدمی بے ہوش ہو سکتا ہے جب کہ اس نے اُف تک نہیں کی۔"

"اسے بچہ نہ سمجھو۔" تیسرا ساتھی کھلکھلا کر ہنستے ہوئے بولا: "یہ اسی عمر میں لڑکیوں کو بھگانے کے چکر میں پڑ گیا ہے۔ اسی سے اندازہ لگا لو کہ کیسا مرد کا ہے۔"

میں حیران تھا کہ وہ بار بار فاطمہ کو بھگانے کی بات کر رہے ہیں جب کہ ہم دونوں بھاگ کر نہیں بلکہ نہایت اطمینان

سے چلتے ہوئے قبیلے کے پڑاؤ سے دور نکل گئے تھے۔

میں نے خاموشی سے وہ کمبل سنبھالا جو ان لوگوں نے مجھے دیا تھا اور ایک طرف لیٹ گیا۔ ننھی فاطمہ بھی میرے ساتھ ہی تھی۔ ہم دونوں چمٹ کر لیٹ گئے۔ کچھ دیر بعد فاطمہ نے سرگوشی کی:

"میں ان آدمیوں سے نفرت کرتی ہوں۔"

"شش..." میں نے کہا: "میں خود بھی ان آدمیوں کو پسند نہیں کرتا۔ جب یہ سو جائیں گے تو ہم یہاں سے بھاگ جانے کی کوشش کریں گے۔" میں نے کمبل کو ذرا سرکا کر دیکھا۔

اطلس کچھ فاصلے پر کھڑا تھا۔

ان تینوں کے پاس تین گھوڑے تھے لیکن میں نے دیکھا کہ اب صرف دو گھوڑے قریب ہی بندھے ہوئے تھے۔ اطلس نے ان گھوڑوں کے قریب بھی جانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ وقفے وقفے سے ہنہنا رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ ان لوگوں کو اس نے بھی پسند نہیں کیا۔

تھکن کی وجہ سے میرا برا حال تھا۔

فاطمہ جلد ہی سو گئی۔

میں نے جاگتے رہنے کی بہت کوشش کی لیکن نہ جانے کب آنکھ لگ گئی۔ بھوک کا بندوبست ہوگیا تھا۔ شاید اسی وجہ سے نیند غالب آگئی تھی۔ میں ان تینوں کے بارے میں سوچنے لگا۔ طویل قامت شخص خاص طور سے میری سوچوں کا مرکز تھا۔ رات کے کسی پہر اچانک میری نیند اچاٹ ہوگئی۔

میں نے کمبل سے منہ نکال کر دیکھا۔

وہ لوگ الاؤ کے گرد ہمارے قریب ہی بیٹھے تھے اور باتیں کر رہے تھے۔ میں توجہ سے ان کی باتیں سننے لگا۔ نادر کہہ رہا تھا "سنو ابراہیم۔ ان بچوں کے بارے میں کوئی بھی نہیں جانتا۔ میرا خیال ہے انہیں ٹھکانے لگا کر ہمیں واپس چل دینا چاہیے۔"

"لیکن ہم گھوڑے کو لینے آئے ہیں۔" ابراہیم کے لہجے میں ناگواری تھی: "دن نکلنے تک گھوڑا بھی کچھ مانوس ہو جائے گا تب لڑکے سے کہیں گے کہ وہ اسے قریب بلائے۔ ایک بار میں اس کی پشت پر سوار ہوگیا تو پھر اسے آسانی سے سنبھال لوں گا۔"

"اور ان ڈاکوؤں کے بارے میں کیا خیال ہے؟" دلاور کہہ رہا تھا۔

"بکواس... میرا خیال ہے اس نے بلاوجہ کی ایک کہانی گھڑ لی ہے... پھر ہم سے بڑا ڈاکو کون ہو سکتا ہے۔" نادر نے قہقہہ لگا کر کہا۔

میں سمجھ گیا کہ یہ تینوں بھی ڈاکو ہی ہیں۔ ان کی باتوں سے مجھے اچھی طرح اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ ہم دونوں کو قتل کر دینا چاہتے ہیں۔ اطلس کی کشش انہیں ہمارے پیچھے لے آئی تھی... اطلس تھا بھی ایسا ہی گھوڑا کہ اس کی ملکیت اختیار کرنے کے لیے کوئی بھی شخص ایسی حرکت کر سکتا تھا۔

"لیکن اگر کسی نے بعد میں گھوڑے کو پہچان لیا تو ہمارے لیے پریشانی کھڑی ہو سکتی ہے۔" دلاور نے کہا۔

"گھوڑے کے بارے میں کچھ بھی کہا جا سکتا ہے۔" ابراہیم غرایا: "یہ گھوڑا ہمیں وادی میں چرتا ہوا مل گیا تھا اور آس پاس کسی ذی روح کا نام و نشان تک نہیں تھا اس لیے ہم نے اس پر قبضہ کر لیا۔ بہتر ہوگا کہ اب تم ہر خدشہ اپنے ذہن سے جھٹک کر سو جاؤ۔"

نادر بڑبڑاتا ہوا اٹھا۔

اس نے ہماری طرف دیکھا۔

میں نے اس کے اٹھتے ہی آنکھیں بند کر لی تھیں... لیکن پلکوں میں خفیف سی جھری رکھ کر اسے دیکھتا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خوفناک چمک تھی۔ مجھے احساس ہوا کہ میں نے تلخ کلامی کر کے اسے بلاوجہ اپنا دشمن بنا لیا ہے... لیکن میں بھی کیا کرتا۔ اس نے فاطمہ کو جس انداز میں مخاطب کر کے رُلا دیا تھا اس پر میں غصے کو قابو میں نہیں رکھ سکا تھا۔

مجھے اپنی وہ اشیا یاد آگئیں جو پڑاؤ سے چلتے وقت میں ساتھ لے کر چلا تھا۔ وہ تھیلا جو مجھے میرے باپ کی نشانی کہہ کر دیا گیا تھا۔ ان چیزوں کو میں نے اسی درخت کے قریب جھاڑیوں میں چھپا دیا تھا جس کے نیچے فاطمہ کو چھوڑ کر شکار کے لیے گیا تھا... اور پھر میں نے اسے وہاں سے نکالنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

میں نے دیکھا کہ وہ تینوں الاؤ کے قریب ہی لیٹ گئے ہیں۔

جلد ہی میں نے محسوس کیا کہ وہ سو گئے ہیں۔

میں آہستہ آہستہ گھٹنوں کے بل اٹھا۔

اچانک مجھے گھورتی ہوئی آنکھوں کا احساس ہوا۔ میں نے اطلس کی طرف دیکھا جو کچھ دور کھڑے کھڑے ہانپ رہا تھا۔ اس کی نگاہ اسی طرف جمی ہوئی تھی جہاں ہم دونوں لیٹے ہوئے تھے لیکن مجھے جن گھورتی ہوئی آنکھوں کا احساس ہوا تھا، وہ اطلس کی آنکھیں نہیں تھیں بلکہ میں نے دیکھا کہ نادر بڑے خونخوار انداز میں ہماری طرف دیکھ رہا ہے۔

میں دوبارہ لیٹ گیا۔

شخص بیدار ہوتا نظر آیا تھا۔۔۔ لیکن وہ سو نہیں رہا تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں۔ گویا وہ ہماری نگرانی کے لیے جاگ رہا ہے اس خیال نے مجھے بے چین کر دیا۔

"سو جاؤ۔۔۔" اچانک ابراہیم کی آواز سنائی دی۔ شاید اس نے بھی محسوس کر لیا تھا کہ نادر جاگ رہا ہے۔

"میں ان دونوں پر نگاہ رکھوں گا۔"

"یہ بچے ہیں۔ رات کے اس پہر کہیں نہیں جا سکتے۔" ابراہیم نے جھلا کر کہا اور کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔

میں جاگتا رہا۔ کافی دیر بعد میں نے دوبارہ اٹھ کر دیکھا لیکن نادر کو جاگتے ہی پایا۔ میں نے دو تین بار یہ کوشش کی اور جب دیکھا کہ وہ مسلسل نگرانی کر رہا ہے تو میں سمجھ گیا کہ ایسی صورت میں فرار ممکن نہیں ہے۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

صبح تک نیند بھی پوری کر لینا ضروری تھا کیونکہ سورج طلوع ہونے کے بعد جو حالات پیش آنے والے تھے، ان کا میں ابھی سے تصور کر سکتا تھا۔ حالات یقیناً بے حد ناخوش گوار ہوں گے۔۔۔ عین ممکن ہے یہ تینوں ہمیں قتل ہی کر دیں۔ میں نے فاطمہ کی طرف دیکھا۔

میرا قرب پا کر شاید وہ ہر فکر سے بے نیاز ہو گئی تھی۔ وہ گہری نیند میں ڈوبی ہوئی تھی۔

میں نے بھی آنکھیں بند کر لیں۔ رات کے وقت یہاں سے فرار کا میں نے ارادہ کیا تھا۔ اس میں ناکامی ہی ہوئی تھی۔۔۔ جلد ہی میری آنکھ لگ گئی اور میں گہری نیند سو گیا۔

صبح انہوں نے بغیر دودھ کا تیز کڑوا قہوہ تیار کیا۔ فاطمہ چند گھونٹ لے کر رہ گئی جب کہ میں نے خوب قہوہ پیا۔ کڑوے کسیلے قہوے نے میرے منتشر اعصاب کو خاصا سکون دیا اور سوچیں ایک مرکز پر جمع ہو گئیں۔ میں نے ہر وسوسے کو دل سے نکال پھینکا اور صرف یہ سوچنے لگا کہ ان تینوں سے نجات کیسے ممکن ہے؟

اطلس اب بھی اس پڑاؤ سے محفوظ فاصلے پر بیٹھا ہوا تھا اور ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بے بسی تھی شاید اسے بھی احساس ہو گیا تھا کہ ہم دونوں کو قیدی بنا لیا گیا ہے۔۔۔ لیکن وہ ہماری مدد نہیں کر سکتا تھا۔ ریچھ سے مقابلے کے دوران اُسے دو ایک زخم آئے تھے۔ معلوم نہیں اس کا کیا حال تھا۔ ناخنوں کا زہر خطرناک بھی ثابت ہو سکتا تھا۔

رات ان تینوں کے درمیان جو بات چیت ہوئی تھی، اس سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ ہم دونوں کو قتل کر دینا چاہتے ہیں۔ میں حیران تھا کہ اگر وہ اطلس کو لے جانا ہی چاہتے ہیں تو اس کے لیے مجھے یا فاطمہ کو قتل کرنا کیوں ضروری ہے؟

اس بات کا کوئی جواب میرے پاس نہیں تھا۔ میں صرف یہ اندازہ لگا سکتا تھا کہ ان کا یہ اقدام محض خوف کی وجہ سے ہی ممکن ہے۔ دراز قامت ابراہیم نے قہوے کا برتن رکھتے ہوئے میری طرف دیکھا۔

"تمہارا نام شہباز ہے۔" اس نے کہا۔

"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"کل اس لڑکی نے غالباً تمہیں اسی نام سے پکارا تھا۔"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"یہ گھوڑا تم سے بے حد مانوس ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اسے پکڑ کر کھڑے ہو جاؤ۔ یہ بھاگنے نہ پائے ورنہ۔۔۔" اس نے اپنے موزے سے ایک تیز دھار خنجر کھینچ لیا اور اس کی دھار کو انگوٹھے پر آزمانے لگا۔ "میں اس خنجر سے لڑکی کو ذبح کر دوں گا۔"

میں کانپ گیا۔ میں نے فاطمہ کی طرف دیکھا۔

وہ سہمی ہوئی نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

میں نے نفرت سے ابراہیم کی طرف دیکھا۔

"بولو۔۔۔ تمہیں بات منظور ہے یا نہیں؟" اس نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے ایک طویل سانس لے کر جواب دیا۔

"اور سنو۔۔۔ اگر تم نے گھوڑا لے کر فرار ہونے کی کوشش کی تو عقب سے گولی مار دی جائے گی۔" اس نے دوسری دھمکی دی۔

میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اس طویل قامت شخص کا علاج میرے ذہن میں آ گیا تھا۔ اطلس کی بعض عادتوں سے میں اچھی طرح آگاہ تھا۔ اس لیے میں نے سوچا کہ اس کی ایک عادت سے استفادہ کرنا چاہیے۔

"میں اسے قریب جا کر پکڑتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "تم پیچھے سے ایک دم اس پر کود جانا۔ میں اس کا منہ سیدھا رکھوں گا تاکہ اس کی تم پر نگاہ نہ پڑ سکے۔"

"تم ایک ذہین لڑکے ہو۔" اس نے ہنس کر کہا۔ "چلو جاؤ اسے پکڑو۔ ہمیں واپس بھی جانا ہے۔"

میں آہستہ آہستہ اطلس کی طرف بڑھ گیا۔

اطلس نے میرے قدموں کی آہٹ سنی تو اس نے منہ اٹھا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں تیز چمک پیدا ہو گئی، وہ زور سے ہنہنا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

میں اس کے قریب جا پہنچا۔

اس نے بھاگنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

میں نے اس کے منہ پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور پھر اس کے گرد گھوم پھر کر اس کے زخموں کا جائزہ لیا۔ اس کے پیٹ پر ریچھ کے پنجے سے جو خراش آئی تھی اس پر کھرنڈ جم گیا تھا اور پشت کے زخموں پر بھی کھرنڈ نظر آ رہے تھے۔ میں نے پیٹ کے زخم پر انگلی پھیری۔ اس کی کھال تیزی سے سٹ گئی۔

پیپ نہیں پڑی تھی لہٰذا زخم خراب ہونے کا خطرہ نہیں تھا۔ زخموں کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں نے ایک بار پڑاؤ کی طرف دیکھا۔ ابراہیم نے فاطمہ کو پکڑ رکھا تھا اور اس کے دائیں ہاتھ میں تیز دھار خنجر چمک رہا تھا۔ فاطمہ رو نہیں رہی تھی البتہ دہشت سے اس کے نقش و نگار بدلے بدلے سے دکھائی دے رہے تھے۔

میں نے اطلس کا منہ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور اُسے پیار کرنے لگا۔ وہ زبان نکال کر میرے ہاتھوں کو بار بار چاٹنے لگتا تھا۔ کچھ دیر بعد میں نے ہاتھ سے ابراہیم کو اشارہ دے دیا کہ وہ اب گھوڑے کی پشت پر سوار ہو سکتا ہے۔

میرا دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔ میں نے ابراہیم کو سزا دینے کا جو طریقہ سوچا تھا، اس میں بچت کی ایک صورت بھی تھی کہ اگر میرا منصوبہ ناکام ہو گیا تو مجھ پر الزام نہیں آئے گا۔۔۔ منصوبہ سیدھا سا تھا وہ تھا اطلس کا کان کھینچا جائے تو وہ پوری قوت سے عقب میں ٹانگیں اچھال دیتا تھا۔

میں نے فیصلہ کیا تھا کہ جیسے ہی وہ اطلس کی عقبی ٹانگوں کی زد میں آئے گا، چپکے سے اطلس کا کان کھینچ دوں گا۔ اس وقت تک وہ، ابراہیم کی، اپنے پیچھے موجودگی سے آگاہ ہو چکا ہو گا۔ اس لیے دولتی اپنا کام کر جائے گی۔

میرے اس منصوبے کی کامیابی کا دارومدار اطلس کی تیز رفتاری اور نشانے کے صحیح لگنے پر تھا۔ ابراہیم نے فاطمہ کو اپنے ساتھی نادر کی طرف دھکیل دیا اور آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ وہ خالی ہاتھ تھا کیونکہ اس نے گھوڑے کی پشت پر سوار ہو کر اس کی لگاموں کو تھام لینا تھا۔

وہ اطلس سے کچھ فاصلے پر رک گیا۔

میں گھوڑے کے منہ پر ہاتھ پھیرتا رہا۔

اس دوران میں اطلس نے بھی شاید ابراہیم کی موجودگی محسوس کر لی تھی۔ اس نے قدرے بے چینی کا اظہار کیا لیکن میں نے اسے پچکارنا شروع کر دیا۔ میرا ایک ہاتھ اس کے منہ میں پڑی ہوئی لگام پر تھا اور دوسرے ہاتھ سے میں اس کے منہ کو سہلا رہا تھا۔

جس ہاتھ سے میں اس کے منہ کو سہلا رہا تھا وہی آہستہ آہستہ سرکتا ہوا اطلس کے کان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میری نگاہ ابراہیم پر بھی ہوئی تھی، جو آہستہ آہستہ بڑھتا چلا آ رہا تھا۔

اچانک اس کا پاؤں ایک پتھر پر پڑا۔

وہ لڑکھڑا گیا۔

یہ قدرت کی طرف سے ایک امدادی کارروائی تھی۔ میں نے فوراً ہی اطلس کا کان کھینچ دیا۔ وہ زور سے ہنہنایا اور پھر اس نے اپنی گردن کو جھٹکا دیا۔ لگام میرے ہاتھ میں مضبوطی سے جکڑی ہوئی تھی اس لیے یہ جھٹکا مجھے بھی گرانے کا باعث بنا۔ اطلس نے نہ صرف مجھے گرا دیا تھا بلکہ وہ اپنی عقبی ٹانگوں کو بھی اُچھال چکا تھا۔

میں نے گرتے گرتے دیکھا۔

دولتی اپنا کام کر گئی تھی۔

ابراہیم کے حلق سے ایک دلدوز چیخ نکل گئی اور میں نے اس کے جسم کو زمین سے بلند ہوتے دیکھا۔ وہ کچھ دُور جا کر ایک دھماکے سے گر گیا۔ گرتے وقت بھی صورت حال اس کے خلاف رہی۔ اس کی کھوپڑی ایک پتھر سے ٹکرا گئی تھی۔ دولتی اس کی پیشانی پر پڑی تھی اور اس کا چہرہ خون میں نہا گیا تھا۔

پتھر سے سر ٹکرانے کی وجہ سے اس کی کھوپڑی پھٹ گئی اور میں نے کھوپڑی میں پڑی ہوئی دراڑ سے خون کو اُبلتے ہوئے دیکھا۔ میں جہاں تھا، وہیں پڑا رہا۔۔۔ اطلس اس دوران میں ایک طرف دوڑتا چلا گیا۔

ابراہیم کے دونوں ساتھی حیرت سے گنگ کھڑے اس کی لاش دیکھ رہے تھے۔ اس خوفناک منظر کو دیکھ کر فاطمہ دہشت سے چیختی ہوئی بے ہوش ہو چکی تھی۔

کچھ دیر بعد میں زمین سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

میں نے خوف زدہ انداز میں نادر کی طرف دیکھا جس کی آنکھوں میں میرے لیے کینہ توزی بڑھ گئی تھی۔ دلاور بے حد خوفزدہ ہو گیا تھا۔ اس کے ہونٹ متحرک تھے لیکن آواز نہیں نکل رہی تھی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اپنے ساتھی کے لیے خاموش دعا کر

کر رہا ہو۔

"ادھر آؤ..." نادر خان نے جارحانہ انداز میں ہاتھ لہراتے ہوئے مجھ سے کہا۔ میں اس کی طرف خوف زدہ نگاہوں سے دیکھتا ہُوا آگے بڑھنے لگا جو خوف میں نے اس وقت اپنے چہرے پر طاری کر رکھا تھا، وہ سو فی صد مصنوعی تھا۔ میرا دل تو ابراہیم جیسے خطرناک دشمن کے خاتمے پر بلّیوں اچھل رہا تھا لیکن میں مصلحت کے تقاضوں کو نبھانے کے لیے چہرے پر خوف کے تاثرات سجانے پر مجبور تھا۔

میں نادر خان کے سامنے جا کھڑا ہُوا۔

"میں تم سے اپنے ساتھی کی موت کا انتقام لوں گا۔"

اس نے پاؤں پٹخ کر کہا "اس کو تم نے قتل کیا ہے۔"

میں نے دلاور کی طرف دیکھا۔ وہ اخلاقی اعتبار سے کچھ مختلف محسوس ہُوا تھا۔ "یہ غلط ہے۔" میں نے کہا "تم دونوں ہی دیکھ رہے تھے کہ اسے گھوڑے نے ہلاک کیا ہے۔"

"لیکن یہ تمہاری ایک سازش تھی۔" وہ غرّایا۔

"چھوڑو، نادر..." دلاور نے دھیمی آواز میں کہا "تم بلا وجہ اس بچّے سے الجھ رہے ہو۔ ابراہیم کو یہ گھوڑا اتنا پسند آیا تھا کہ بالآخر اس نے اسی کے ہاتھوں ہلاک ہو جانا قبول کر لیا میں نے اسے کتنا سمجھایا تھا لیکن یہ سُنتا بھی تو کسی کی نہیں تھا۔"

"لیکن اب میں اس گھوڑے کو حاصل کر کے رہوں گا۔" نادر نے حتمی لہجے میں کہا۔ میں نے کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھا اس نے اپنا ریوالور نکال لیا تھا۔ "اگر میں اسے حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا تو اسے جان سے مار ڈالوں گا۔"

"میں تمہیں بھی یہی مشورہ دوں گا۔" دلاور نے کہا۔ "اس گھوڑے کا خیال ذہن سے نکال دو۔ اس قسم کے جانور کو صرف محبت سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ زبردستی کرو گے تو نقصان اُٹھاؤ گے یا اسے ضائع کر دو گے۔"

"بکواس بند کرو۔" نادر چیخ پڑا۔

دلاور خاموش ہو گیا۔

میں نے صاف محسوس کیا تھا کہ دلاور کو اس کا یہ انداز پسند نہیں آیا۔ اس نے بمشکل خود پر ضبط کیا تھا اور اس کی بھی شاید یہ وجہ تھی کہ اس نے محسوس کر لیا تھا، نادر خان اس وقت غصّے اور جھلاہٹ سے پاگل ہو رہا ہے۔

میں فاطمہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

وہ ایک طرف بے ہوش پڑی تھی۔

میں آہستہ آہستہ چلتا ہُوا اُس کے قریب پہنچا اور پھر اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ پھول جیسی اس بچّی کا مارے خوف و غم کے بُرا حال ہو گیا تھا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اگر وہ مسلسل اسی قسم کی دہشتناکیوں میں مبتلا رہی تو اس کا ننھا سا دل دھڑکنا بند کر دے گا اور یہ مر جائے گی۔ مجھے چاہیے کہ اسے ہر حال میں جلد از جلد یہاں سے نکال لے جاؤں... لیکن کیسے؟

اب میرے سامنے دو دشمن تھے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

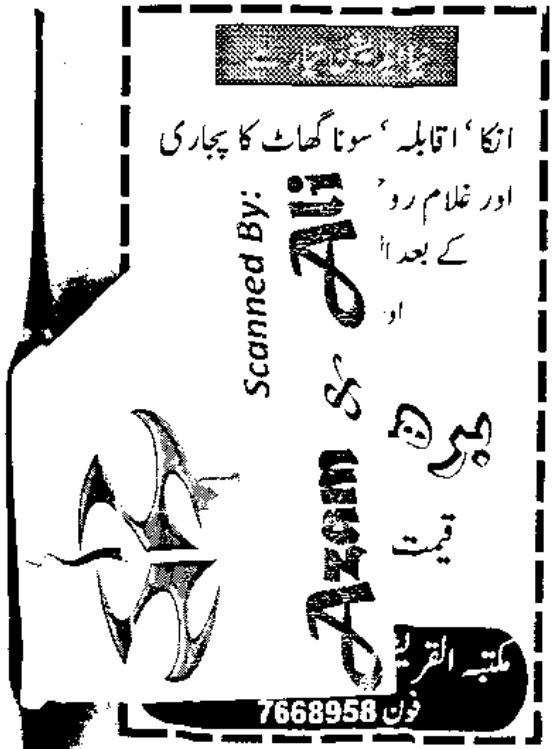

ان دونوں سے میں تنہا نہیں نمٹ سکتا تھا۔

ان کو اسی طرح باری باری ٹھکانے لگانا پڑے گا۔

میں نے سوچا اور پانی کا برتن اپنی طرف کھسکا کر فاطمہ کے چہرے پر چھینٹے مارنے لگا۔ اس کا چہرہ دھل گیا لیکن وہ ہوش میں نہ آئی۔

میں نے اس کے گالوں کو تھپ تھپایا۔

کافی دیر بعد اس نے آنکھیں کھولیں اور ویران ویران نظروں سے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں میرے لیے شناسائی کا تاثر نہیں تھا۔ وہ سکتے کی سی حالت میں تھی۔

"فاطمہ..." میں نے سرگوشی کی۔

اس کی پتلیوں میں خفیف سی حرکت پیدا ہُوئی۔

"فاطمہ... ہوش میں آؤ۔"

اس کے ہونٹوں نے بے آواز حرکت کی۔ اس کا مُنہ تھوڑا سا کھلا تو میں نے اس کی نوکِ زبان اور ہونٹوں پر پیاس محسوس کر لی۔ میں نے پانی کے برتن سے اس کے خشک حلق میں پانی ٹپکانا شروع کر دیا۔

پانی پینے کے بعد وہ قدرے ہوش میں نظر آنے لگی۔

اس کی آنکھوں میں اب بھی خوف و دہشت کے سائے پھیل رہے تھے اور ان میں پانی تیر رہا تھا۔ میرا دل اس کے لیے بھر آیا مگر میں تنہا کسی ایسی صورتِ حال کا شکار ہوتا تو نہ جانے کیا کچھ کر گزرا ہوتا... لیکن مجھے فاطمہ کے لیے خود کو روکنا پڑ رہا تھا۔

تنہا میں فرار بھی ہو سکتا تھا لیکن فاطمہ میرے ساتھ نہیں بھاگ سکتی تھی۔ میں نے ادھر اُدھر دیکھا۔ اطلس اب کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ ایک حسّاس جانور تھا۔ میں نے سوچا کہیں وہ مجھ سے ناراض نہ ہو گیا ہو۔ میں نے اُسے پکڑ ولنے کی کوشش کی تھی... لیکن میں جانتا تھا کہ اطلس ہمیں چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتا۔ وہ جہاں کہیں بھی ہو گا۔ ہمارے ہی بارے میں فکر مند ہو گا۔

فاطمہ کی حالت قدرے سُدھر گئی تو میں نے اُسے کمبل پر لٹا دیا۔

نادر اور دلاور کچھ فاصلے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ دونوں ہی اپنی اپنی جگہ سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ نادر خان اب بھی کبھی کبھی میری طرف دیکھ لیتا تھا۔ اس کی آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں۔

میں نے سوچا کہ سب سے پہلے اسی سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ دلاور کے بارے میں میں نے محسوس کر لیا تھا کہ اُس میں نادر خان جیسی سفاکی نہیں ہے۔ وہ بھی لالچی تھا لیکن اس میں سُوجھ بُوجھ کی کمی نہیں تھی۔

نادر خان کو ٹھکانے لگانے کے لیے کیا کیا جائے؟

میں فاطمہ کے قریب بیٹھا اسی سلسلے میں غور کر رہا تھا۔ فاطمہ اب بھی آسمان کی طرف گھُور رہی تھی۔ اس کا چہرہ دھلی ہوئی چادر کی طرح سفید پڑ گیا تھا اس کے نازک نازک ہونٹ بار بار کانپنے لگتے تھے۔ نادر خان کو قتل کرنے کی کوئی صورت سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

اچانک میری نگاہ ایک بچھو پر پڑی۔

یہ بچھو آہستہ آہستہ رینگتا ہُوا فاطمہ کی طرف بڑھ رہا تھا اس کا خوفناک سیاہ ڈنک اُٹھا ہوا تھا۔

بچھو کو دیکھتے ہی میں اچھل پڑا۔

اس بچھو سے وہ کام لیا جا سکتا تھا جسے میں اپنے ہاتھوں سے نہیں کر سکتا تھا۔ یہ بہترین آلۂ قتل ثابت ہو گا۔ میں نے سوچا اور پھر میں فاطمہ کے پہلو میں لیٹ گیا۔

میں نے دیکھا کہ نادر کسی گہری سوچ میں مُبتلا ہو گیا ہے۔

"ہمیں اس لاش کو دفن کر دینا چاہیے۔" دلاور کی آواز سُنائی دی۔

نادر خان نے کوئی جواب نہیں دیا۔

دلاور خود ہی اُٹھا۔ اس نے اپنے گھوڑے کی زین سے جھُولتا ہوا ایک اوزار نکالا اور زمین کھودنے لگا۔ جس جگہ وہ کھُدائی کر رہا تھا، وہاں زمین نرم تھی۔ نادر خان اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس کی نگاہ جیسے ہی ہٹی، میں نے بچھو کی طرف دیکھا وہ رُک گیا تھا۔

اس کا ڈنک اب بھی اُٹھا ہُوا نظر آیا۔

میں نے کروٹ بدل لی۔

... پھر میرا ہاتھ سرسری انداز میں، فاطمہ کے اوپر سے ہوتا ہُوا اس کی پسلیوں پر رُک گیا۔ میں نے آہستہ آہستہ ہاتھ کو سرکایا۔ حتّٰی کہ میرا ہاتھ بچھو سے کچھ ہی فاصلے پر پہنچ گیا۔ بچھوؤں کے سلسلے میں میری معلومات خاصی وسیع تھیں اس وقت جو بچھو نظر آ رہا تھا، اس کے ڈنک مارنے کے بعد کسی انسان کا لمحوں میں ہلاک ہو جانا معمولی بات تھی۔

بچھو نے بھی شاید میرے ہاتھ کو محسوس کر لیا تھا۔

وہ تیزی سے آگے بڑھا۔

فاطمہ اور بچھو کے درمیان میرا ہاتھ حائل تھا۔
بچھو اب فاطمہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا۔
اس طرح میں اُسے نہ صرف فاطمہ تک پہنچنے سے روک سکتا تھا بلکہ اُسے نادر خان سے نجات حاصل کرنے کے لیے بھی استعمال کیا جا سکتا تھا... وہ اچانک ہی اچھلا لیکن اس وقت تک میرا ہاتھ اپنا کام کر چکا تھا۔
میں اسے اس انداز میں پکڑنے میں کامیاب ہو گیا کہ وہ مجھے ڈنک نہیں مار سکتا تھا۔ میں اُسے پکڑنے کے بعد آہستہ آہستہ اُٹھ کھڑا ہوا اور پانی کے برتن کی طرف بڑھ گیا۔
نادر خان نے اب دلاور کی جگہ سنبھال لی تھی۔
وہ تیزی سے کھدائی میں مصروف تھا۔
میں نے برتن سے دو گھونٹ پانی پینے کے بعد دلاور اور نادر دونوں کی طرف پشت کر کے بچھو کو پانی میں چھوڑ دیا۔ واپس اپنی جگہ آ کر میں لیٹ گیا اور انتظار کرنے لگا۔
یہ بچھو ان دونوں میں سے اس شخص کی ہلاکت کا سامان تھا جسے پہلے پیاس لگے گی... میں دل ہی دل میں دُعا کر رہا تھا کہ پہلے نادر خان ہی کو پانی پینے کی ضرورت محسوس ہو۔ اس سے مجھے زیادہ خطرہ تھا۔ اس لیے پہلے اُسی کی موت میری آرزو تھی۔
"فاطمہ..." میں نے اس کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔
"ہوں..." وہ بڑبڑائی۔ اُس کی آواز بے حد نحیف تھی۔
"خود کو سنبھالنے کی کوشش کرو، فاطمہ!" میں نے سرگوشی کی۔
"اطلس نے اس شخص کو ہلاک کر دیا۔" وہ بڑبڑانے لگی۔
"ہاں... اور ابھی کچھ دیر بعد ان دونوں میں سے ایک اور بھی ہلاک ہونے والا ہے۔ تم خوف زدہ تو نہیں ہو؟"
"مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"
"حالانکہ تم ایک بہادر بچی ہو۔"
وہ خاموش رہی۔ میں نے اس برتن کی طرف دیکھا جس میں، میں نے بچھو کو چھوڑ دیا تھا۔ بچھو کو پانی مل گیا تھا۔ اس لیے وہ شاید ابھی تک تیر تیر کر لطف اندوز ہونے میں مصروف تھا... اُسے باہر آنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔ میں نے اطمینان کی سانس لی اور نادر خان کی طرف دیکھنے لگا جس کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں ہی بوندیں چمک رہی تھیں۔

برہچاری
نواز صدیقی
قیمت ۵۰/۰۰ روپے

اس نے وہ اوزار پھینک دیا اور دلاور کی طرف دیکھا۔
"آؤ، اب تم کھدائی کرو۔ میرا خیال ہے، اس قبر کو تھوڑا سا اور گہرا کر دو تو بات بن جائے گی۔"
دلاور خاموشی سے اُٹھا اور اوزار اُٹھا کر گھٹنوں گھٹنوں گہری قبر میں اُتر گیا۔ نادر قریب ہی بیٹھ گیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ وہ ابھی پانی کی طرف جائے گا... لیکن وہ وہیں بیٹھا لمبے لمبے سانس لیتا رہا۔ اس کے ہانپنے کی آوازیں مجھے صاف سُنائی دے رہی تھیں...
دلاور تیزی سے مٹی کھود کھود کر قبر سے باہر پھینک رہا تھا۔
میں نے کن انکھیوں سے برتن کی طرف دیکھا۔
بچھو اب بھی برتن کے منہ پر نظر نہیں آیا تھا۔
میں دل ہی دل میں دُعا کرنے لگا کہ وہ کم بخت پیاس محسوس کر کے پانی کے برتن کی طرف جائے... لیکن شاید میری دُعاؤں کی مقبولیت کا ابھی وقت نہیں آیا تھا۔ نادر خان نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ مجھے محویت سے اپنی جانب متوجہ پا کر اس کی بھنویں چڑھ گئیں۔
"اِدھر آؤ۔" اُس نے جارحانہ لہجے میں کہا۔
میں خاموشی سے اُٹھ کر اس کی طرف بڑھ گیا۔
"چلو، قبر میں اُتر جاؤ اور ہاتھوں سے مٹی باہر پھینکنا شروع کر دو۔" اس کا لہجہ تحکمانہ تھا اور آنکھوں سے کینہ توزی جھلک رہی تھی۔ "تم باہر آ جاؤ، دلاور!" اس نے اپنے ساتھی سے کہا۔
دلاور بھی بُری طرح ہانپ رہا تھا۔
وہ قبر سے باہر آ گیا۔
میں نے قبر میں کُود کر دونوں ہاتھوں سے مٹی باہر پھینکنا... شروع کر دی۔ یہ قبر اب خاصی گہری ہو گئی تھی۔ اس لیے مجھے اپنے قد کی وجہ سے مٹی پھینکنے میں کافی دُشواری ہونے لگی... لیکن میں پھر بھی اس کام میں لگا رہا۔
دلاور نے جتنی کھدائی کی تھی، اُس کی مٹی پھینکتے ہوئے مجھے کافی دیر ہو گئی تو اچانک ایک دلدوز چیخ سے ماحول کانپ گیا...

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میرے ہاتھ رُک گئے اور میں نے پنجوں کے بَل کھڑے ہو کر قبر سے باہر دیکھا۔
میری دھڑکنیں بے ترتیب ہو گئی تھیں۔
پہلے تو میں یہی سمجھا کہ نادر پانی پیتے ہوئے بچھو کے ڈنک کا شکار ہو گیا ہے... لیکن میں نے دیکھا کہ یہ شکار نادر نہیں بلکہ دلاور تھا۔ میں نے کناروں پر ہاتھ رکھا اور قبر سے باہر آ گیا۔
دلاور زمین پر پڑا بُری طرح تڑپ رہا تھا۔
نادر نے ریوالور نکال لیا اور بچھو پر فائرنگ شروع کر دی۔
اس کا نشانہ واقعی بے داغ تھا۔ پہلی ہی گولی نے بچھو کو زمین سے فضا میں تحلیل کر دیا... لیکن نادر پر شاید دیوانگی طاری ہو گئی تھی۔
وہ اب بھی گولیاں برسا رہا تھا۔
جب ریوالور کی آخری گولی بھی نال سے نکل گئی تو اس نے پوری قوت سے ریوالور کو زمین پر دے مارا اور گھٹنوں کے بَل دلاور کے قریب جُھک گیا۔
دلاور اب بھی تڑپ رہا تھا۔
میں قریب جا کھڑا ہوا اور چہرے پر حزن و ملال کی کیفیت طاری کر لی۔ دلاور کا چہرہ تیزی سے نیلا پڑتا جا رہا تھا۔ زہریلے بچھو نے اس کے بالائی ہونٹ پر ڈنک مارا تھا کیونکہ پانی پیتے ہوئے اس کا یہی ہونٹ برتن کے اندر گیا ہو گا۔
جس جگہ بچھو نے اسے کاٹا تھا، وہاں پر سوزش پیدا ہو گئی تھی اور اس کا بالائی ہونٹ اس حد تک پھول گیا تھا کہ اس کی وجہ سے دلاور کے چہرے کی ساخت ہی بدل گئی تھی۔ اُس کا چہرہ بے حد بھیانک نظر آنے لگا۔ نادر خان پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُسے گھور رہا تھا۔
"دلاور..." اُس نے چیخ کر کہا۔
جواباً دلاور نے کچھ کہنا چاہا۔
اُس کا صرف نچلا ہونٹ ہی خفیف سی حرکت کرنے کے قابل ہوا۔ بالائی لب کو حرکت دینا، اُس کے بس سے باہر تھا۔ اُس کے چہرے پر بھی نیلاہٹ نظر آنے لگی تھی۔ اُس نے سر کو دائیں، بائیں پٹخنا شروع کر دیا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور اُس کے نتھنوں سے سانس کی آمد و رفت کے ذریعے ہلکی سی خرخراہٹ پیدا ہو رہی تھی۔
اس کا جسم کچھ دیر بعد اکڑنے لگا۔
تشنج کی سی حالت میں اُس نے مٹھیاں بھینچ لیں... پھر اُس کی گردن ڈھلک گئی اور آنکھیں کھل گئیں۔ اُس کی گھورتی

ہوئی آنکھوں کو دیکھ کر میں نے ایک جھرجھری سی لی اور دوسری طرف دیکھنے لگا۔ اگر اس وقت نادر میری طرف دیکھ رہا ہوتا تو اُسے میری آنکھوں میں فاتحانہ چمک ضرور نظر آ جاتی۔
میں نے اپنے دو دُشمنوں کو ہلاک کر دیا تھا... لیکن اس انداز میں کہ مجھ پر الزام عائد نہیں کیا جا سکتا تھا۔
"اسے کیا ہوا ہے؟" میں نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔
جواباً نادر خان نے مجھے گالی دی اور دھکا دے... کر پھینک دیا۔
میں نے اس کے انداز میں جھنجلاہٹ محسوس کر لی تھی۔ یہ اُس کی شکست کی پہلی علامت تھی۔ میرا جی چاہا کہ فاتحانہ نعرہ لگا کر فتح کا رقص شروع کر دوں لیکن نادر خان ابھی زندہ تھا... اور ابھی مجھے اس سے بھی نمٹنا تھا۔ یہ آخری دُشمن تھا جس سے نمٹنے کے بعد میں، فاطمہ اور اطلس آزاد ہو سکتے تھے۔ میں نے خود کو زمین سے اُٹھایا۔
نادر سے نمٹنے کے لیے بھی کوئی نہ کوئی ترکیب جلد ہی میرے ذہن میں آ جائے گی۔ میں نے یہ سوچ کر خود کو مطمئن کر لیا۔
گرنے سے میری کہنی ذرا سی چھل گئی تھی۔
میں نے کہنی کو سہلایا اور پلٹ کر دیکھا۔
دلاور کی لاش نیلی ہو چکی تھی۔ اکڑی ہوئی لاش کی آنکھیں اب بھی کھلی تھیں... جیسے وہ اپنی رُوح کو آسمانوں کی طرف محوِ پرواز دیکھنے میں مصروف ہو۔ نادر خان اُس کی طرف یوں دیکھ رہا تھا جیسے اُسے یقین نہ آ رہا ہو کہ دلاور مر چکا ہے۔
ابراہیم کی موت پر وہ اتنا دل گرفتہ نہیں ہوا تھا... لیکن دلاور کے مرتے ہی جیسے اس کی ساری اکڑفوں نکل گئی ہو۔ میں نے فاطمہ کی طرف دیکھا۔ وہ خاموش اور بے حرکت بیٹھی تھی۔ اُس کے چہرے پر وہی تاثرات منجمد تھے جنہیں میں کچھ دیر پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔
میں خاموشی سے اس کے قریب جا بیٹھا۔
خود کو بے حد سہما سہما سا ظاہر کرنے میں مجھے اب قدرے دُشواری ہو رہی تھی کیونکہ میں زندگی میں پہلی بار، دو ایسی کامیابیوں سے ہمکنار ہوا تھا جن کی ملک ریشم جان کو ہمیشہ سے خواہش رہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر آج وہ زندہ ہوتیں تو میرے اس کارنامے پر انہیں کتنی خوشی ہوتی۔
تبھی بابا شالیار کا خیال میرے ذہن میں رینگ آیا۔
وہ نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔

ہوش سنبھالنے کے بعد جب مجھے یہ پتہ چلا تھا کہ وہ میرا باپ ہے تو مجھے حیرت اور خوشی کا ایک ساتھ تجربہ ہُوا تھا۔ وہ اور لوگوں جیسا نہیں تھا۔ اُسے مجھ سے بے پناہ محبت تھی لیکن اُس نے کبھی مجھ سے اس محبت کا اظہار نہیں کیا تھا۔ یہ صرف احساس کی قوت تھی جس سے مجھے اس بے پایاں محبت کا پتہ چل گیا تھا۔

اچانک مجھے نادر خان کے قدموں کی آہٹ سُنائی دی۔ اس سے پہلے کہ میں پلٹ کر اُس کی طرف متوجہ ہوتا، مجھے اپنے پیٹ میں ایک زبردست ٹھوکر برداشت کرنا پڑی۔ مارے تکلیف کے میں دُہرا ہو گیا لیکن میرے حلق سے چیخ نہیں نکلی تھی۔ اس قسم کی چوٹوں کے لیے مجھ میں بے پناہ قوت برداشت تھی۔

"تم کس مٹی کے بنے ہُوئے ہو، سُور کے بچّے؟" اُس نے چیخ کر کہا۔

"مجھے کیوں مار رہے ہو؟" میں نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔

"تم منحوس ہو۔" وہ غرّایا۔

"یہ میرا قصور تو نہیں جناب!" میں نے مسکرا کر کہا اور اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ میری مُسکراہٹ نے اُسے ٹھٹک جانے پر مجبور کر دیا۔

اس کا غصّے سے سُرخ چہرہ رفتہ رفتہ معمول پر آتا گیا... اور پہلی بار میں نے اس کی آنکھوں میں سوچ کے سائے رقص کرتے دیکھے۔ وہ اب غور سے میری طرف دیکھ رہا تھا جیسے میری شخصیت کے بارے میں اُس نے جو اندازہ لگایا تھا، اس پر نظرِ ثانی کر رہا ہو۔

"یقیناً تم میں کوئی خبیث رُوح حلول کر گئی ہے..." وہ بڑبڑایا۔

میں نے جواباً کچھ نہیں کہا۔

"چلو... ایک قبر اور کھودو۔" اُس نے حکم دیا۔

"ذرا بڑی کھودوں؟" میں نے معصومیت سے سوال کیا۔

"وہ کس لیے؟" اُس نے چونک کر پوچھا۔

"یونہی پُوچھ رہا تھا۔" میں نے بے پروائی سے کہا اور اس اوزار کی طرف بڑھ گیا جو زمین پر پڑا تھا اور جس سے ابراہیم کی قبر کھودی گئی تھی۔ میں نے اسے اُٹھایا اور پہلی قبر کے پہلو میں دوسری قبر کھودنے میں مصروف ہو گیا۔

اگرچہ میں نے اس انداز کی کھُدائی کا کام پہلے کبھی نہیں کیا تھا لیکن میرے ہاتھ اتنے نازک نہیں تھے کہ میں ایک قبر بھی نہ کھود پاتا... میرے بازوؤں میں کسی عام جوان جیسی مضبوطی تو تھی لیکن مجھ میں جو قوتِ ارادی اور خود اعتمادی کا خزانہ تھا، وہ میری عمر کے بچّوں میں تو ناممکن ہی ہوتا ہے۔ جب کہ بیشتر نوجوان بھی اس سے محرُوم ہوتے ہیں۔

میں قبر کھودتا رہا۔

میری پیشانی پر پسینے کی بوندیں نمُودار ہونے لگیں۔ صبح سے مختلف ہنگاموں میں وقت گزر رہا تھا۔ اس لیے یہ احساس ہی نہ ہُوا کہ دوپہر ہو چکی ہے۔ میں نے اس اوزار سے زمین کھودتے کھودتے رُک کر سانس درست کرتے وقت، اُس طرف دیکھا جہاں دلاور کی لاش پڑی تھی۔

لاش نیلی پڑ چکی تھی۔

نادر ایک پتھر پر خاموش بیٹھا تھا۔

اس کی نگاہ مجھ پر جمی ہُوئی تھی۔

مجھے رُکتے دیکھ کر اُس نے ہاتھ لہرایا۔ "جلدی کرو۔ اس کے بعد مجھے تم سے اور بھی کام لینا ہیں۔"

غُصّے کی لہر میرے جسم میں پیدا ہُوئی اور میرے قلب و ذہن میں بھونچال سا آ گیا تھا۔ میں کسی جرائم پیشہ شخص کو خود پر حکم چلانے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا... لیکن اس وقت تو میرے لیے ایک مصرُوفیت نکل آئی تھی اور میں اس کام کو مکمل بھی کرنا چاہتا تھا کیونکہ کسی انسانی لاش کو جنگلی جانوروں کے پیٹ کی بجائے، قبر ہی میں دفن ہونا چاہیے۔

میں خاموشی سے دوبارہ کھُدائی کے کام میں لگ گیا۔

فاطمہ اب اُٹھ بیٹھی تھی اور اس نے میری طرف اس انداز میں دیکھنا شروع کر دیا تھا جیسے وہ میرے قریب آنا چاہتی ہو۔ میں نے ہاتھ روک کر، اُسے پُکارا۔ "فاطمہ... یہاں، میرے پاس آ جاؤ۔"

فاطمہ نے نادر کی طرف دیکھا۔ نادر نے مُنہ پھیر لیا۔

نادر کو خاموش دیکھ کر فاطمہ سمجھ گئی کہ اُسے کوئی اعتراض نہیں۔ وہ اُٹھی اور دوڑتی ہُوئی میرے قریب آ گئی۔

"یہ تم کیا کر رہے ہو، شہباز؟" اس نے ہانپتے ہُوئے پوچھا۔

"قبر کھود رہا ہُوں۔"

"کس کی...؟" اس کے لہجے میں حیرت تھی۔ شاید اُس نے ابھی تک دلاور کی لاش نہیں دیکھی تھی۔ وہ، ابراہیم کی قبر کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ میں نے اس نیلی لاش کی طرف اشارہ کر دیا جو کچھ فاصلے پر پڑی تھی۔

اُس نے لاش کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں مزید حیرت اُبھر آئی۔ وہ ابھی تک صُورتِ حال کو سمجھ نہیں سکی تھی...

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پھر میں نے سرگوشیوں میں اُسے حالات کے بارے میں بتایا اور یہ بات راز ہی رکھی کہ پانی کے برتن میں بچھو، میں نے ڈالا تھا۔

میں نے کن انکھیوں سے نادر کی طرف دیکھا۔

وہ کسی گہری سوچ میں ڈُوبا ہُوا تھا۔

جب سے دلاور کی موت واقع ہُوئی تھی، اس کے تاثرات بڑے عجیب اور ناقابلِ فہم ہو گئے تھے۔ کبھی تو وہ بالکل پاگل لگتا اور کبھی غصّے کی زیادتی سے مجھے گالیاں دینے لگتا تھا۔ مجھے اُس کی حالت پر ہنسی آ رہی تھی لیکن ایسی حالت میں ہنس کر میں، فاطمہ یا اپنی موت کو دعوت نہیں دینا چاہتا تھا۔

فاطمہ کو دوبارہ چُپ سی لگ گئی تھی۔

میں بھی خاموشی سے قبر کھودتا رہا۔

قبر تیار ہو گئی تو میں نے اوزار پھینک دیا اور گڑھے سے باہر آ گیا۔ میں نے نادر کی طرف دیکھا اور اُسے بتایا کہ وہ اپنے ساتھی کو دفن کر سکتا ہے۔ میری آواز سُن کر وہ خیالوں کی دُنیا سے نکل آیا۔

اُس نے قبر کا جائزہ لیا اور میری طرف دیکھ کر بولا۔ "اتنا کام کرنے سے تمھیں تھکن کا احساس نہیں ہو رہا ہے؟"

"ہو تو رہا ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "لیکن میں تمھیں ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے مسلسل کام کرتا رہا۔"

اس نے ایسی نگاہ سے میری طرف دیکھا جیسے میری بات پر اُسے یقین نہ آیا ہو... پھر اس کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ پیدا ہو گئی۔ میں نے اسے... شاید پہلی بار مُسکراتے دیکھا تھا... لیکن اُس کی مُسکراہٹ انسانوں جیسی نہیں تھی بلکہ اس میں درندگی کا تاثر غالب تھا۔

"اپنے ہاتھ دِکھاؤ۔" اُس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہُوئے کہا۔

میں نے دونوں ہاتھ سامنے کر دیے۔

"کیا یہ کسی سات سال کے بچّے کے ہاتھ ہو سکتے ہیں؟" وہ بڑبڑایا۔

میں خاموش رہا۔

وہ چند لمحوں تک مجھے ایسی نگاہوں سے دیکھتا رہا جیسے یکایک میری شخصیت اس کے لیے بے حد پُراسرار اور ناقابلِ فہم ہو گئی ہو... پھر وہ دلاور کی لاش کی طرف بڑھا اور اُسے اُٹھا کر قبر تک لے آیا۔ لاش کو قبر میں ڈالنے کے بعد، اُس نے میری اور فاطمہ کی طرف دیکھتے ہُوئے حکم دیا۔ "چلو... مٹّی ڈالنا شروع کر دو۔"

"فاطمہ کو رہنے دو۔ میں تنہا ہی یہ کام کر دیتا ہُوں..." میں نے کہا۔

"نہیں... یہ بھی کام کرے گی۔" وہ غرّایا۔

فاطمہ اس کے لہجے سے خوف زدہ ہو کر جھک گئی اور قبر میں مٹّی ڈالنے لگی لیکن میں نے جلدی سے اس کے ہاتھ تھام لیے۔ "نہیں... تم کوئی کام نہیں کرو گی۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔

نادر خان نے پوری قوت سے لات گھُمائی۔

ٹھوکر میری پُشت پر لگی اور میں لڑکھڑا گیا۔ میں نے سنبھلنے کی بہت کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا اور اسی قبر میں اوندھے مُنہ گر گیا، جس میں دلاور کی نیلی لاش پھینکی گئی تھی۔ لاش پر گرنے کے بعد میرے جذبات عجیب سے ہو گئے۔ نادر جھُک کر دیکھنے لگا۔ شاید اسے توقع تھی کہ میں مارے خوف کے چیخ پڑوں گا لیکن ایسا نہیں ہُوا۔ یہ بات اس کے لیے حیرت ہی کا نہیں، شدید غصّے کا باعث بھی بن گئی۔

میں جیسے ہی باہر آیا، اُس نے میرے دائیں گال پر ایک زوردار تھپّڑ رسید کر دیا۔ میرا رخسار جھنجھنا گیا۔ یہ اس کا دُوسرا تھپّڑ تھا۔ اس سے پہلے بھی ایک بار وہ مجھ پر ہاتھ اُٹھا چکا تھا۔ میں نے دو قدم پیچھے ہٹ کر دوڑ لگا دی۔ میرا سر جھُکا ہُوا تھا... اور پھر میری ٹکر اس کی رانوں کے درمیان اس زور سے لگی کہ وہ گر گیا۔

وہ جیسے ہی گرا، میں اس کے سینے پر سوار ہو گیا۔

اس نے مجھے اُچھال پھینکنے کی کوشش کی لیکن اس وقت تک میں اپنا شکاری چاقو نکال چُکا تھا۔ میرے ہاتھ میں چاقو دیکھ کر اُس نے پوری قوت سے جھٹکا دیا اور مجھے دُور پھینک دیا۔ میں ابھی سنبھل بھی نہ پایا تھا کہ وہ اُٹھ کھڑا ہُوا۔ اُس کے ہاتھ میں خوفناک ریوالور تھا اور اس کی آنکھیں بے حد ڈراؤنی ہو گئی تھیں۔ اس نے ریوالور والے ہاتھ کو حرکت دیتے ہُوئے کہا۔ "چاقو، میری طرف پھینک دو ورنہ گولی مار دوں گا۔"

میں نے چاقو کو اپنے ہاتھ ہی میں یوں گھُما لیا کہ اس کی نوک میری اُنگلیوں میں دب گئی اور دستہ لٹک گیا۔ میں نے اُس پر چاقو کھینچ مارنے کا ارادہ کیا تھا... لیکن وہ ہوشیار تھا۔ اس نے جھپٹ کر فاطمہ کو پکڑ لیا اور ریوالور، اُس کی کنپٹی سے لگا کر غرّایا...

"چاقو زمین پر پھینک دو ورنہ اس بچّی کی کھوپڑی کے چیتھڑے اُڑا دوں گا۔"

میرے ہاتھ سے شکاری چاقو خود بخود گر گیا۔

"اسے پاؤں سے آگے بڑھا دو۔" اُس نے مزید حکم دیا۔

میں نے ایک ٹھوکر مار کر چاقو، اُس کی طرف پھینک دیا... ایک ہاتھ میں ریوالور تھامے اور دوسرے ہاتھ سے فاطمہ کو سنبھالے وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔

چاقو کے قریب رُک کر وہ جلدی سے جھُک گیا... لیکن

چاقو کو زمین سے اٹھاتے وقت بھی اس کی نگاہ مجھ پر جمی رہی تھی۔ چاقو پر قبضہ کرنے کے بعد اس نے ایک طویل سانس لی اور فاطمہ کو ایک جھٹکے سے دور پھینک دیا۔ وہ زمین پر گری اور رونے لگی۔ اس کے رونے سے نہ جانے میرے دل کو کیا ہونے لگا تھا۔

"میرا خیال ہے، تمہارا زندہ رہنا میرے لیے خطرناک ہوگا۔" اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ "نہ جانے کیوں مجھے یقین ہوتا جا رہا ہے کہ ابراہیم کی موت اور دلاور کی ہلاکت میں بھی تمہارا ہی ہاتھ ہے۔"

"یہ غلط ہے۔" میں نے احتجاج کرنا چاہا۔

"خاموش۔" وہ چیخا۔ "میرا خیال تھا کہ تم اس قیمتی گھوڑے کو قابو کرنے میں میری مدد کرو گے۔۔۔ لیکن اب میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ گھوڑے کو حاصل کرنے کے لیے صرف یہ لڑکی ہی کافی ہے۔ دلاور نے تجویز پیش کی تھی کہ تمہیں یہاں سے اغوا کر لیا جائے اور کہیں فروخت کر دیا جائے۔۔۔ لیکن وہ احمق تھا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ تم جیسے لڑکے کو تو ایک لمحے کے لیے بھی زندہ نہیں رکھنا چاہیے۔"

اس نے ریوالور والا ہاتھ آہستہ آہستہ اٹھایا۔

میں نے سانس روک لی۔

بالآخر میری بغاوت موت کے روپ میں سامنے آکھڑی ہوئی تھی۔ اگر میں موقعے کی تلاش میں اس کی دو ایک زیادتیاں مزید بھی برداشت کر لیتا تو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔۔۔ لیکن میں بھی کیا کرتا۔ عادت سے مجبور تھا۔ وہ جس انداز میں فاطمہ سے سلوک کر رہا تھا، اُسے برداشت کرنا میرے بس میں نہیں تھا۔

ریوالور کی نال کا رُخ میری جانب ہو گیا۔

"اطلس۔۔۔" میں نے ایک طرف اشارہ کیا۔

وہ چونک کر اُدھر متوجہ ہو گیا لیکن ریوالور کا رُخ میری ہی جانب رہا۔ گھوڑے کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں بے پناہ چمک پیدا ہو گئی اور ایک لمحے کے لیے مجھے یُوں محسوس ہُوا جیسے وہ مجھ کو بھول ہی گیا ہو۔

میں آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔

"رُک جاؤ۔" وہ چیخ پڑا۔ "اگر تم نے ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو میں فوراً گولی چلا دوں گا۔" اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہُوئے کہا۔ "سنو۔۔۔ کیا تم زندہ رہنا چاہتے ہو؟"

میں نے سادگی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اور اس بچی کو بھی زندہ دیکھنا چاہتے ہو؟"

اس بار بھی میں نے تائید میں گردن کو حرکت دی۔

"تو پھر جاؤ اور گھوڑے کو پکڑ کر اس کی لگام کو درخت سے باندھ دو۔" اس نے ایک قریبی درخت کی طرف اشارہ کیا۔ "اگر اس دوران میں تم نے کوئی شرارت کرنے کی کوشش کی تو میں سب سے پہلے اس بچی کو ہلاک کر دوں گا۔" اس نے جھپٹ کر فاطمہ کی کلائی تھام لی اور اُسے اپنی طرف گھسیٹ لیا۔

میں نے بے بسی سے فاطمہ کی طرف دیکھا۔

اس لڑکی نے مجھے بڑے عذاب میں ڈال دیا تھا۔

اگر میں اسے اتفاقاً اپنے ساتھ نہ لے لیتا تو یقیناً یہ بھی ان ڈاکوؤں کے ہاتھوں ہلاک ہو چکی ہوتی جنہوں نے قبیلے کے باقی لوگوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح کر دیا تھا۔۔۔ اور ساتھ ہی میں ان پریشانیوں میں پھنس گیا تھا۔ میرے ذہن میں بار بار میاں رشیم جان کا یہ جملہ گھوم رہا تھا "کمزور کی رفاقت، طاقت ور کو بھی کمزور بنا دیتی ہے۔" اس وقت میں بھی ایسی ہی صورتِ حال کا شکار تھا۔ فاطمہ کی کمزوری نے مجھے بھی کمزور بنا دیا تھا۔

اچانک میرے ذہن میں ایک ترکیب آ گئی۔

میں نے اسی لمحے ایک خطرناک فیصلہ کر لیا۔

"جاؤ۔۔۔ جلدی اس گھوڑے کو پکڑ کر درخت سے باندھ دو۔" وہ ریوالور والا ہاتھ لہرا کر غرانے لگا۔

میں خاموشی سے اطلس کی طرف بڑھ گیا۔

اطلس نے بر وقت آکر میری جان بچا دی تھی ورنہ شاید اس بار وہ مجھے گولی مارے بغیر نہ رہتا۔ اطلس نے مجھے اپنی طرف آتے دیکھا تو اس نے عقبی دونوں ٹانگوں کے سہارے اچھل کر سامنے والی دونوں ٹانگوں کو زمین سے اُٹھاتے ہُوئے حرکت دی اور زور سے ہنہنایا۔

میں رُک گیا۔

وہ غصّے کا اظہار کر رہا تھا۔

ایسے میں اطلس کے قریب جانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ میں نے رُک کر عقب میں دیکھا۔ نادر خاموش تھا۔ اس کے ریوالور کی نال اب بھی میری ہی طرف اُٹھی ہُوئی تھی۔ اطلس جس جگہ کھڑا تھا وہاں آس پاس جھاڑیاں تھیں اور عقب میں جنگل پھیلا ہوا تھا۔

"اطلس۔" میں نے چیخ کر کہا۔ "یہ کیا بدتمیزی ہے۔ میں تمہارا دوست ہُوں۔ کیا تم مجھ سے بھی اسی انداز میں پیش آؤ گے؟"

گھوڑے کی سامنے والی ٹانگیں زمین پر واپس آ گئی تھیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیکن وہ اب بھی مطمئن نہیں ہُوا تھا اس لیے میں اسے مخاطب کر کے باتیں کرتا ہُوا اُس کی طرف بڑھنے لگا۔

وہ رفتہ رفتہ پُرسکون ہوتا گیا۔

میں اس کے قریب جا پہنچا۔

درخت کی ایک شاخ اس کے پیٹ سے لگی ہُوئی تھی۔ اس جھکی ہُوئی شاخ کو تھام کر میں نے عقب میں دیکھا۔ نادر اتنے فاصلے پر تھا کہ اس کا ریوالور میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ میں جلدی سے اس شاخ کے سہارے لٹک گیا اور خود کو اوپر اُٹھا کر گھوڑے کی پُشت پر سوار ہو گیا۔ گھوڑا ہنہنایا لیکن اس نے مجھے گرانے کی کوشش نہیں کی۔

میں نے کچھ آگے بڑھ کر اس کی گردن سے جھکتے ہُوئے لگاموں کو تھام لیا اور پھر بائیں جانب لگام کو جھٹکا دیا۔ وہ تیزی سے گھوما اور اُسی لمحے میری دونوں ایڑیاں اس کے پہلوؤں میں لگیں۔ اگلے ہی لمحے وہ سرپٹ دوڑنے لگا۔

عقب سے فاطمہ کی دلدوز چیخ سُنائی دی تھی جسے سُن کر مجھے اپنا دل حلق میں دھڑکتا محسوس ہونے لگا لیکن میں رُکا نہیں بلکہ گھوڑے کو دوڑاتا ہُوا وہاں سے دُور نکل گیا جب میں نے اندازہ کر لیا کہ اب نادر کی دسترس سے دُور پہنچ گیا ہوں تو میں نے گھوڑے کو روکا اور اسے تھپ تھپانے لگا۔

اس کے حلق سے ایسی آوازیں نکلنے لگیں جیسے وہ میرے اس فرار سے مطمئن ہو لیکن وہ پلٹ پلٹ کر بھی دیکھ رہا تھا۔ گویا مجھ سے پُوچھ رہا ہو کہ فاطمہ کب آئے گی اور میں نے اُسے چھوڑ کر راہِ فرار کیوں اختیار کی ہے؟

"فاطمہ کے بارے میں فکر نہ کرو۔" میں نے اس کی گردن تھپ تھپاتے ہُوئے کہا۔ "وہ اُسے کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔"

میں نے اس کا رُخ موڑا اور جنگل میں اسی طرح ایک طرف بڑھتا رہا۔ وہ سوگوار انداز میں قدم بڑھاتا رہا حتیٰ کہ ہم درختوں سے نکل آئے۔ سامنے وہ راستہ تھا جسے قافلے سفر کے لیے استعمال کرتے تھے۔ میں نے اسی راستے پر دونوں طرف نگاہ دوڑائی۔

سورج سر کے اوپر سے ڈھل کر مغرب کی طرف جُھکنے لگا تھا اور ماحول میں دُھوپ کی تمازت سے گرم گرم لہریں دوڑتی محسوس ہو رہی تھیں۔ میں دیر تک اس راستے کے دونوں طرف دیکھتا رہا اور پھر مجھے دُھول کا بادل سا اُٹھتا نظر آیا۔

میں نے عقب میں دیکھا۔

قریب ترین درخت کی طرف گھوڑے کو موڑ کر میں نے اسے تنے کی اوٹ میں روک دیا۔ یہاں میں ان راہگیروں کی نگاہ سے محفوظ رہ سکتا تھا جو اس راستے پر چلے آ رہے تھے۔ چونکہ مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ کون ہیں اس لیے میں دُور رہ کر جانے بغیر ان کے سامنے نہیں آنا چاہتا تھا۔ گرد و غبار کا بادل آہستہ آہستہ قریب آتا جا رہا تھا۔

میں نے شدّت سے دھڑکتے ہُوئے دل کے ساتھ دُعا کی کہ کاش آنے والے ڈاکو نہ ہُوں۔ میں نے لمبے قد والے سوار کے ساتھ وادی میں پانچ آدمی دیکھے تھے اس لیے آنے والے اس کے باقی ماندہ دو ساتھی بھی ہو سکتے تھے۔۔۔ لیکن قدرت کو شاید مجھ پر رحم آ ہی گیا تھا۔

جب یہ سوار قریب پہنچے تو میں نے دیکھا کہ وہ تعداد میں تین ہیں اور پھر میری گرفت لگاموں پر سخت ہو گئی۔ سب کے آگے آگے ایک گھڑسوار تھا جو اپنے گھوڑے کو بُری طرح دوڑا رہا تھا۔ اس کے عقب میں دو سوار تھے۔ ان کے گھوڑے بھی تیزی سے دوڑ رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے میں گھوڑ دوڑ کا کوئی مقابلہ دیکھ رہا ہوں۔

اور پھر وہ پہلا سوار میرے سامنے سے گزرنے لگا۔

میں نے حیرت سے دیکھا۔

وہ کوئی مرد نہیں تھا بلکہ ایک قبائلی لڑکی تھی۔

اس کا انداز ہذیانی تھا۔ وہ بُری طرح چیخ رہی تھی اور گھوڑے کو تیز تر دوڑانے کے لیے بار بار گھوڑے کے پیٹ میں ایڑیاں مار رہی تھی۔ اس کا پیچھا کرنے والے کرخت چہروں کے لوگ تھے۔

میں ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔

جس سے مجھے مدد کی توقع تھی، وہ تو خود مصیبت کی ماری ایک ایسی لڑکی نکلی جو ان درندوں سے بچنے کے لیے اندھا دُھند اپنے گھوڑے کو بھگا رہی تھی۔ اُسے تو خود کسی کی مدد درکار تھی لیکن میں اس کی کیا مدد کر سکتا تھا۔

لڑکی کا چہرہ مجھے چند لمحوں کے لیے دِکھائی دیا تھا۔ اس کی آنکھیں پھٹی پھٹی سی تھیں اور چہرہ سُرخ ہو رہا تھا۔ وہ ایک بے حد حسین لڑکی تھی۔ پیچھا کرنے والے دونوں سوار اُسے زندہ ہی پکڑنا چاہتے تھے، شاید اسی لیے انہوں نے لڑکی پر گولی نہیں چلائی تھی۔ ورنہ وہ آسانی سے اُسے مار گرا سکتے تھے۔

میں نے اطلس کی گردن پر ہاتھ پھیر کر اُسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور ان گھڑسواروں کی طرف دیکھتا رہا جنہیں کا فاصلہ لڑکی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جاسوسی ڈائجسٹ کا مقبول ترین سلسلہ

سنگتراش

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

کے گھوڑے سے کم ہوتا جا رہا تھا۔

دفعتاً ایک اور واقعہ رونما ہوا جس نے میرے دل و دماغ میں آندھیاں سی چلا دیں۔ لڑکی جس رستے پر گھوڑے کو ہذاقی بھگائی آگے لے جا رہی تھی، اس پر آگے ایک شخص ریوالور ہاتھ میں لیے کھڑا تھا۔

میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

وہ نادر تھا۔

فاطمہ کہیں نظر نہ آئی تو میں بے چین ہو گیا۔

میرے دل میں اندیشے ہی اندیشے بھر گئے۔

کیا اس نے فاطمہ کو ہلاک کر دیا ہے؟ یہ سوال ایک ہی لمحے میں نہ جانے کتنی بار میرے ذہن میں گونج گیا۔ وہ ریوالور ہاتھ میں لیے رستے میں کھڑا تھا۔ اچانک ہی اس نے گولی چلا دی۔

میں نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں۔

میرا خیال تھا کہ اس نے گھڑسوار لڑکی کو گولی کا نشانہ بنایا ہے لیکن جب میں نے فوراً ہی آنکھیں کھول کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ گولی لڑکی پر نہیں بلکہ گھوڑے پر چلائی گئی تھی۔

لڑکی کا گھوڑا گولی کھا کر زور سے اُچھلا۔

وہ اس کی پُشت پر توازن برقرار نہ رکھ سکی اور دائیں طرف لڑھک گئی۔ عقب سے آنے والے دونوں گھڑسوار بھی رُک گئے اور اُنہوں نے اپنے اپنے گھوڑے سے کودتے وقت ماحول پر کپکپی طاری کر دینے والے نعرے لگانے شروع کر دیے۔

نادر کسی عقاب کی طرح گھوڑے سے گرنے والی لڑکی پر جھپٹ پڑا تھا۔ میں نے سمجھا کہ لڑکی کا تعاقب کرنے والے اب نادر پر ٹوٹ پڑیں گے اور مار مار کر اس کی چمڑی اُدھیڑ دیں گے۔۔۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ وہ تو قہقہے لگا رہے تھے اور نادر بھی ہنستا ہوا لڑکی کو جکڑ کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ لڑکی اس کی گرفت سے اپنا بازو چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اُسے کامیابی نہ ہوئی۔

مجھے اس لڑکی پر بے حد ترس آیا۔۔۔ لیکن میں اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا کیوں کہ میرے ذہن میں فاطمہ کا خیال کسی بھنور کی صورت اختیار کر کے مسلسل چکرانے لگا تھا۔ فاطمہ، نادر کے ساتھ نہیں تھی اس کے دو ہی مطلب نکالے جا سکتے تھے۔ وہ فاطمہ کو پڑاؤ ہی میں چھوڑ کر میری اور اطلس کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا تھا یا پھر۔۔۔

میں اس سے زیادہ نہ سوچ سکا اور میرے جسم نے فاطمہ کی موت کے خیال ہی سے کانپنا شروع کر دیا تھا۔

"اطلس۔۔۔ واپس چلو۔۔۔ وہیں، جہاں ہم فاطمہ کو چھوڑ کر آئے تھے۔" میں نے کہا اور گھوڑے کو موڑ کر اسے ایک بار پھر سرپٹ دوڑانا شروع کر دیا۔

یہ علاقہ اور یہ مختصر سا جنگل میرے لیے مانوس نہیں تھا لیکن اطلس جیسے تربیت یافتہ گھوڑے کے لیے راستوں کو یاد رکھنا کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ مجھے جو موٹی موٹی دو چار نشانیاں یاد تھیں، وہ واپسی پر بھی دکھائی دیں۔ ان سے مجھے اندازہ ہوا کہ اطلس اُسی راستے پر واپس جا رہا ہے، جس پر وہ مجھے لے کر آیا ہوا تھا۔

"اور تیز۔۔۔ اطلس۔۔۔ اور تیز۔۔۔" میں نے اس کے پیٹ میں ایڑیاں مارتے ہوئے کہا۔

اطلس کی رفتار بے حد تیز ہو گئی۔ میں خود کو بمشکل اس کی پُشت پر متوازن رکھنے میں کامیاب ہو رہا تھا۔ نادر کو تنہا دیکھ کر مجھے ایک موہوم سی اُمید ہو گئی تھی کہ فاطمہ اس کے پڑاؤ میں موجود ہو گی۔۔۔ اب یہ اس کے مقدر پر منحصر تھا کہ وہ کس حال میں ملتی ہے۔

پڑاؤ میں پہنچ کر میں نے اطلس کو اُسی درخت کے نیچے روک دیا جس کی ایک جھولتی ہوئی شاخ کو تھام کر میں گھوڑے پر سوار ہوا تھا۔

"یہیں ٹھہرو۔۔۔ اطلس۔۔۔" میں نے پیار سے اس کے مُنہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا اور تیزی سے پڑاؤ کی طرف دوڑنے لگا۔ فاطمہ مجھے دُور ہی سے دکھائی دے رہی تھی لیکن وہ زمین پر پڑی تھی۔ میرا دل پنجرے میں بند کسی زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑا رہا تھا۔ "فاطمہ۔۔۔ فاطمہ۔۔۔" میں نے دوڑتے دوڑتے اُسے آواز دی۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

دوڑتے دوڑتے مجھے اپنی پنڈلیوں میں شدید تکلیف کی محسوس ہونے لگی۔ اندیشوں نے ایک بار پھر میری توجہ کو نگل لیا تھا۔ میں اندھا دُھند دوڑتا ہوا اس کے قریب پہنچا اور زمین پر گر گیا۔

وہ چت لیٹی ہوئی تھی۔

اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔

میں نے اس کے سینے پر کان رکھ دیا۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ میں نے بے چینی سے اس کے سر کے زخم کو ٹٹول کر دیکھا۔ ایسا کرتے ہوئے میرا دل بیٹھا جا رہا تھا لیکن جب میں نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کوئی سوراخ نہ دیکھا تو اطمینان کی ایک طویل سانس میرے حلق سے نکل گئی۔ نادر نے غصے میں آ کر اس کے سر پر ریوالور کے دستے سے وار کیا تھا۔

"اطلس۔۔۔ اطلس۔۔۔" میں نے گھوڑے کی طرف دیکھ کر ہاتھ لہرایا۔ وہ زور سے ہنہنایا اور دوڑتا ہوا جلد ہی قریب پہنچ گیا۔ میں نے فاطمہ کو دونوں ہاتھوں پر اٹھایا اور اسے گھوڑے کے منہ کے قریب لے گیا۔

اطلس نے پہلے تو اسے سونگھا۔۔۔ پھر محبت سے چاٹنے لگا۔

"اسے اٹھالو۔۔۔ اسے اٹھالو اطلس۔۔۔" میں نے بے تابی سے کہا اور فاطمہ کی قمیص اس کے منہ سے لگا دی۔ اطلس نے قمیص کو دانتوں میں جکڑ لیا۔

فاطمہ کو اٹھا کر کہیں لے جانا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ اس لیے یہ انداز اختیار کرنا پڑا۔ میں نے گھوڑے کی لگام تھامی اور تیزی سے دوڑنے لگا۔ اس دوران میں یہ دھڑکا بھی لگا رہا کہ کہیں فاطمہ کی قمیص، دانتوں کی تیزی اور جسم کے بوجھ سے پھٹ نہ جائے۔ ایسے میں وہ گر بھی سکتی تھی۔۔۔ درخت تک پہنچنے کے بعد میں نے قمیص کا جائزہ لیا۔ کپڑا مضبوط تھا اور دانتوں کی وجہ سے اس میں ابھی سوراخ بھی نہیں ہوئے تھے۔

اسی شاخ کے ذریعے میں اطلس پر سوار ہو گیا اور ایک بار پھر ہم پڑاؤ سے دور ہوتے چلے گئے۔ کافی آگے جانے کے بعد میں نے گھوڑے کا رخ موڑا اور اسے پہاڑی کی طرف لے کر بڑھنے لگا۔ چٹانی علاقے میں جھاڑیاں بکثرت تھیں۔ میں گھوڑے سے کود کر ان جھاڑیوں میں جا گھسا۔

کچھ دیر میں جھاڑیوں میں بھٹکتا رہا۔۔۔ پھر مجھے ایک غار کا دہانہ نظر آیا۔ مجھے کسی ایسی ہی کھوہ کی تلاش تھی۔ میں نے دہانے کے قریب منہ لے جا کر گیدڑ کی آواز نکالی۔

کوئی جواب نہ ملا۔

اس کا مطلب تھا کہ کھوہ خالی تھی۔

میں جلدی سے واپس اطلس کے پاس پہنچا تو وہ فاطمہ کو زمین پر ڈال چکا تھا اور اس کا رخسار چاٹ رہا تھا۔ میں نے فاطمہ کو اٹھایا اور پنڈلیوں کی اکڑن یا اس کے بوجھ کی پروا کیے بغیر دوبارہ جھاڑیوں میں گھس گیا۔ میں نے جس کھوہ کو تلاش کیا تھا وہ خاصی کشادہ تھی۔ اس کے قریب ہی فاطمہ کو لٹا کر میں ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل کھوہ میں گھس گیا۔

میرا اندازہ درست تھا۔ کسی بھی ہنگامی صورت میں ہم دونوں آسانی سے اس کھوہ میں پناہ لے سکتے تھے۔ اسے وہیں چھوڑ کر میں تیزی سے واپس اطلس کے پاس پہنچا اور ادھر ادھر دیکھا لیکن گھوڑے پر سوار ہونے کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔۔۔ درخت اونچے تھے اور ان کی کوئی زمین تک جھکی ہوئی شاخ بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

مجھے پانی کی تلاش میں کافی دور تک پیدل ہی بھٹکنا پڑا۔ پانی مل گیا تو اسے فاطمہ تک لے جانے کی مشکل پیدا ہو گئی۔ میں کسی ایسی چیز کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھتا رہا۔۔۔ پھر ایک درخت کے بڑے بڑے پتے دیکھ کر میں خوشی سے جھوم اٹھا۔ پتوں سے پیالہ سا بنا کر میں نے پانی بھر لیا اور آہستہ آہستہ واپس چل دیا۔

میں جھاڑیوں کے پاس واپس پہنچا تو فاطمہ کے رونے کی آواز سن کر بے چین ہو گیا۔ اطلس جھاڑیوں کے قریب ہی کھڑا بے چین نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ ہنہنانے لگا۔۔۔ پھر میرے ہاتھ میں پانی دیکھ کر وہ تیزی سے آگے بڑھا لیکن میں نے پلٹ کر گھوڑے کی طرف پشت کر لی۔ اس نے پہلے اس پتوں کے بنے ہوئے پیالے پر منہ مارنا چاہا لیکن اس وقت تک میں جھاڑیوں میں گھس چکا تھا۔

اطلس سے پانی کو بچانے کی میں نے جو کوشش کی تھی اس میں نصف کے قریب پانی چھلک کر زمین میں جذب ہو گیا۔

میں، فاطمہ کے پاس پہنچا تو رو رو کر اس کی ہچکیاں بندھ چکی تھیں۔ اس نے جیسے ہی مجھے دیکھا تو ایک چیخ مار کر میری طرف دوڑی اور مجھ سے لپٹ گئی۔ میں نے پانی کو بچانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ دیوانہ وار مجھ سے لپٹی تھی اور میں اسے روکنے میں ناکام رہا تھا۔ میرے ہاتھ، اس کے سر سے بلند ہو گئے تھے لیکن جب وہ [illegible] سے چمٹ گئی تو میں لڑکھڑا گیا۔

پانی چھلک کر ضائع ہو گیا۔

میں اس کے یوں بے ساختہ چمٹ جانے سے [illegible] گیا تو وہ میرے اوپر ہی آ گری۔ وہ بری طرح کانپ رہی تھی۔ [illegible] نے اسے چمٹاتے ہوئے، اس کی پیٹھ کو تھپکنا شروع کر دیا۔

کافی دیر بعد جب اس کی سسکیاں ختم ہوئیں تو میں [illegible] خود سے الگ کیا اور ایک بار پھر اس کے سر کے زخم کا جائزہ [illegible] خون اب بھی رس رہا تھا۔۔۔ لیکن زخم خطرناک نہیں تھا۔ [illegible] زندہ و سلامت اپنے سامنے دیکھ کر مجھے دلی خوشی ہو رہی تھی۔ [illegible] تک میں نے جتنی بھی بھاگ دوڑ کی، اس کا مجھے احساس [illegible]

ہو رہا تھا۔

سہ پہر ہو چکی تھی اور سورج نے تیزی سے مغرب میں اپنا سفر مکمل کرنا شروع کر دیا تھا۔ بھوک اور پیاس بھی محسوس ہو رہی تھی۔۔۔ لیکن بھوک کا میرے پاس کوئی علاج نہیں تھا۔ البتہ پانی سے پیاس ضرور بجھائی جا سکتی تھی۔ میں نے فاطمہ کا ہاتھ تھام کر اسے اٹھایا۔

"چلو۔۔۔ قریب ہی ایک چشمہ ہے۔ وہاں چل کر پیاس بجھائیں۔" میں نے کہا اور جھاڑیوں سے نکل آیا۔

فاطمہ میرے ساتھ تھی۔ اسے دیکھ کر اطلس ہنہنانے اور ٹاپیں مارنے لگا۔ میں نے فاطمہ کو بتایا کہ وہ کس حالت میں کہیں پڑی ملی تھی اور اطلس نے کس طرح اسے اٹھایا تھا۔ اس نے اطلس کا منہ چوم لیا۔۔۔ پھر ہم تینوں ہی چشمے کی طرف روانہ ہو گئے۔

چشمے پر پہنچ کر میں نے ٹھنڈے پانی سے فاطمہ کے سر کا زخم دھویا تو خون بند ہو گیا۔ اطلس پانی پینے کے بعد درختوں کے نیچے گرے ہوئے پتوں کو سونگھ سونگھ کر کھانے لگا۔ کہیں کہیں گھاس بھی نظر آ رہی تھی۔۔۔ لیکن یہ سب کچھ اطلس جیسے لمبے چوڑے گھوڑے کے لیے ناکافی تھا۔

"میں تو تم سے ناراض ہو گئی تھی، شہباز!" کافی دیر بعد، فاطمہ نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"وہ کیوں؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"تم مجھے چھوڑ کر بھاگ کیوں گئے تھے؟"

میں نے اپنے منصوبے کی وضاحت کر دی تو اس کی آنکھوں میں جھلکنے والی شکایت کے تاثرات یکایک ہی معدوم ہو گئے۔ اس نے اپنی روداد سناتے ہوئے کہا کہ میں جیسے ہی اطلس کی پشت پر سوار ہو کر وہاں سے بھاگ نکلا تھا، نادر غصے سے پاگل ہو کر ہمارے پیچھے دوڑ پڑا تھا۔۔۔ لیکن جب اطلس اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تو وہ دندناتا ہوا واپس پہنچا اور اس نے آتے ہی ریوالور کا دستہ فاطمہ کے سر پر دے مارا۔ وہ چکرا کر گری اور بے ہوش ہو گئی۔ نادر کو بچوں کے سلسلے میں شاید زیادہ تجربہ نہیں تھا۔ یا پھر اس نے جو چوٹ لگائی تھی وہ اس کے سلسلے میں پُر اعتماد تھا کہ یقیناً فاطمہ کا کام تمام ہو گیا ہو گا۔

"جب وہ ہمارے پیچھے دوڑا تھا تو تم بھی وہاں سے فرار کیوں نہ ہو گئیں؟" میں نے پوچھا۔ "تم آسانی سے بھاگ سکتی تھیں۔"

"مجھے یقین نہیں آیا تھا کہ تم یوں چھوڑ کر بھی جا سکتے ہو۔" اس نے کہا۔ "شہباز! اماں سے کب ملاقات ہو گی؟"

"بہت جلد۔۔۔" میں نے کہا اور اسی لمحے فاطمہ کی ماں کی لاش میرے ذہن میں گھوم گئی۔ اس لاش نے مجھے وہ خوبصورت لڑکی بھی یاد دلا دی جسے میں فاطمہ کی فکرمندی میں بھول گیا تھا۔

دو جلدیں
قیمت: ۲۰۰/- روپے
تاریک وادی

میں بے چین ہو گیا۔

نادر نے میرے سامنے اس لڑکی کو دبوچ لیا تھا۔۔۔ نہ جانے وہ اس لڑکی کے ساتھ کیا سلوک کر رہا ہو گا۔ میں نے سوچا اور فاطمہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ "سنو، فاطمہ! تمہیں بھوک لگ رہی ہے نا؟"

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"ٹھیک ہے، تم یہیں ٹھہرو۔ میں کھانے کے لیے کوئی چیز تلاش کر کے لاتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔ اکیلے میں مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔"

"نہیں۔۔۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "اگر ہم اس بار اس شخص کے ہاتھ لگ گئے تو وہ واقعی ہمیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

وہ سہم کر بیٹھ گئی۔

میں نے اطلس کو بھی وہیں چھوڑا اور تیزی سے اس طرف بڑھ گیا جہاں نادر نے پڑاؤ ڈالا ہوا تھا۔ بار بار مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ اگر میں نے اسے قتل کر دیا ہوتا تو وہ خوبصورت سی لڑکی یقیناً اس کے ہاتھ نہ لگتی۔ اس بار آتے ہوئے میں نے راستے کو خاص طور سے ذہن میں محفوظ رکھا تھا اس لیے مجھے پڑاؤ تک پہنچنے میں کوئی دشواری نہ ہوئی۔

جب میں وہاں پہنچا تو کوئی بھی دکھائی نہ دیا۔

میں دائیں جانب کی جھاڑیوں میں دبکا، اس پڑاؤ کا جائزہ لیتا رہا۔ ان لوگوں کو اب تک یہاں پہنچ جانا چاہیے تھا۔۔۔ اس لیے پڑاؤ پر کسی کو موجود نہ پا کر میرے ذہن میں فوراً ہی یہ شبہ پیدا ہوا کہ کہیں یہ بھی نادر کی کوئی چال تو نہیں ہے؟

سامنے دو قبریں تھیں۔ ایک کا منہ کھلا ہوا تھا۔ یہ وہی قبر تھی جس میں مٹی ڈالنے پر ہمارے درمیان جھگڑا شروع ہو گیا تھا۔۔۔

لیکن مجھے قبروں سے زیادہ، ان اشیا کی فکر تھی جو سامنے نظر آ رہی تھیں۔ اسی لمحے مجھے اپنے شکاری چاقو کا بھی خیال آیا لیکن جہاں میں نے اسے گرایا تھا، وہ وہاں موجود نہیں تھا۔

اب مجھے اس پڑاؤ سے کھانا چرانا تھا۔ مجھے چوری سے نفرت تھی لیکن ماں ریشم جان نے مجھ سے ایک بار کہا تھا: "جنگ میں ہر حربہ اور ہر چیز جائز ہے"... اور ہمارے درمیان بھی تو ایک جنگ ہی ہو رہی تھی۔

جھاڑی سے نکلنے سے پہلے ہی ہر چیز کا اچھی طرح اندازہ کر لیا کہ مجھے کتنی تیزی سے کس چیز تک پہنچنا ہے اور کتنی چیزیں وہاں سے حاصل کر لینی ہیں۔ قہوہ، گوشت اور سوکھے پھل یہ میری توجہ کے خاص طور سے مرکز تھے۔

میں نے جلدی جلدی ہر ضروری چیز سمیٹی اور اپنے شکاری چاقو کو تلاش کرنے لگا۔ چاقو تو نہیں ملا البتہ ایک تھیلے میں مجھے پتلی سی نال والا ایک وزنی ریوالور ضرور مل گیا۔ میں نے اس سے پہلے اتنا وزنی ریوالور کبھی دیکھا تھا اور نہ ہی اُسے استعمال کرنے کی نوبت آئی تھی لیکن میں اس سلسلے میں تذبذب کا شکار نہیں رہا... بلکہ میں نے اس تھیلے میں یہ ریوالور بھی ٹھونس لیا جس میں دوسری چیزیں رکھی تھیں۔

اچانک جھاڑیوں میں کہیں سرسراہٹ سی ہوئی۔

اگلے ہی لمحے میں تھیلا اٹھا کر دوڑ پڑا۔

میں یہاں اس گھڑسوار لڑکی کے سلسلے میں آیا تھا لیکن جب میں نے میدان صاف پایا تو سوچا کہ چلو کچھ چیزیں ہی وہاں سے اٹھا لوں۔ میں تھیلا اُٹھائے تیزی سے دوڑتا رہا۔

چلتے چلتے اچانک ہی ایک جگہ مجھے رُک جانا پڑا۔

میرے کانوں سے گھوڑے کی ٹاپیں ٹکرانے لگی تھیں۔

میں غور سے ان آوازوں کو سنتا رہا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ یہ آوازیں اُسی راستے سے آ رہی ہیں جس پر میں نے دو گھڑسواروں کو ایک لڑکی کا پیچھا کرتے ہوئے دیکھا تھا۔

ایک موہوم سی اُمید کے سہارے میں اس راستے کی طرف دوڑتا چلا گیا اور ایک درخت کی اوٹ سے اس گھڑسوار کی طرف دیکھنے لگا۔ جس کی ٹاپیں سن کر میں ادھر متوجہ ہوا تھا۔

یہ تنہا سوار تھا۔

مجھ سے کافی فاصلے پر اس کا گھوڑا ٹھوکر کھا کر گر گیا تو سوار لڑھکنیاں کھاتا ہوا دُور تک چلا گیا۔ میں نے دیکھا کہ اس نے ملیشیا کا لباس پہن رکھا ہے اور اس کے سینے پر پیتل کے حروف چمک رہے ہیں۔

میں نے ایک بار کسی فوجی کو اس لباس میں دیکھا تھا۔

اسے دیکھ کر میں خوشی سے جھوم اٹھا۔

یہ فوجی ہمارے لیے رحمت کا فرشتہ ثابت ہو سکتا تھا۔

میں نے صرف پانی کا برتن ہاتھ میں رکھا اور تھیلا وہیں چھوڑ کر تیزی سے گرے ہوئے سوار کی طرف بڑھنے لگا۔ گھوڑے سے گرنے کی وجہ سے شاید اُسے سر میں کوئی چوٹ آ گئی تھی اور وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔

قریب جا کر دیکھا تو مجھے اپنا اندازہ درست ہی معلوم ہوا۔ میں نے پانی کے برتن سے اس کے چہرے پر چھینٹے ملے اور اس کا منہ کھول کر اس کے حلق میں پانی ٹپکانے لگا۔

جلد ہی اس نے کراہ کر آنکھیں کھول دیں۔

جیسے ہی اس کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ وہ اچھل کر بیٹھ گیا۔

"کیا آپ کوئی فوجی ہیں؟" میں نے ادب سے پوچھا۔

چند لمحوں تک تو وہ مجھے یوں دیکھتا رہا جیسے میری بات ہی اس کی سمجھ میں نہ آئی ہو... پھر اس کی نگاہ اپنے سینے پر چمکتے ہوئے پیتل کے حروف پر پڑی۔

وہ مسکرانے لگا۔

"تم کون ہو، برخوردار؟" اس نے نرمی سے کہا: "میں زخمی ہوں۔ گھوڑا ٹھوکر کھا کر گرا تو میں بھی گر گیا... اور گرنے سے مجھے خاصی چوٹ آئی جس سے میں بے ہوش ہو گیا تھا۔ تم نے میری مدد کی ورنہ میں معلوم نہیں کب تک یہاں پڑا رہتا۔ اس دوران میں کوئی زہریلا سانپ یا بچھو بھی مجھے ڈنک مار سکتا تھا۔ میں تمہارا یہ احسان ہمیشہ یاد رکھوں گا... کیا تم یہیں قریب ہی کہیں رہتے ہو؟"

"نہیں..." میں نے جواب دیا اور پھر اُسے تفصیل سے اپنے اور فاطمہ کے بارے میں بتانے لگا۔

اس نے قریب ہی گری ہوئی اپنی رائفل سنبھالی اور غور سے میری کہانی سنتا رہا۔ اس دوران میں کئی بار اُس کے چہرے کے تاثرات بدلے اور کئی مرتبہ اس کی آنکھوں میں خونخواری کی جھلک پیدا ہوئی۔ غالباً وہ ڈاکوؤں کی سرگرمیوں پر تاؤ کھا رہا تھا۔

میں نے اسے پینے کے لیے مزید پانی دیا۔ یہ دوسرا اور آخری برتن تھا جسے میں نادر کے پڑاؤ سے اٹھا لایا تھا۔ پہلا برتن تو دلاور کے ہاتھوں سے اس وقت گر کر ٹوٹ گیا تھا جب اُس کے بالائی لب پر بچھو نے ڈنک مارا تھا۔ ملیشیا کی وردی والے

شخص نے میری باتیں سن کر اثبات میں سر ہلایا اور پھر رائفل کا کُندا زمین پر ٹیک کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

"تم جس گھوڑے اور بچی کا تذکرہ کر رہے تھے وہ دونوں کہاں ہیں؟" اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے سوال کیا۔

"وہ ایک چشمے کے پاس ہیں۔ یہاں سے کافی دُور..."

"اور وہ پڑاؤ کہاں ہے، جہاں سے تم ابھی آ رہے ہو؟"

"وہ زیادہ دُور نہیں ہے۔"

"کیا تم ان ڈاکوؤں کے نام بتا سکتے ہو۔ جب وہ آپس میں باتیں کرتے ہوں گے تو انہوں نے ایک دوسرے کو نام لے کر تو یقیناً مخاطب کیا ہو گا۔" وہ میرے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔

"ان میں سے صرف ایک زندہ بچا ہے اور اس کا نام نادر ہے۔"

"نادر..." وہ بڑبڑایا۔

اس نے رائفل کندھے پر رکھی اور مجھے اس پڑاؤ کی طرف چلنے کا اشارہ کیا۔ میں نے نفی میں سر ہلا دیا: "نہیں... میں وہاں نہیں جاؤں گا۔ نادر مجھے دیکھتے ہی گولی مار دے گا۔"

"میری موجودگی میں ایسا نہیں کر سکتا۔"

"لیکن فاطمہ کو بہت زور کی بھوک لگ رہی ہو گی۔"

"پہلے تم مجھے اس پڑاؤ تک پہنچاؤ تاکہ اس لڑکی کی خبر لی جا سکے، جسے تمہارے بقول نادر نے پکڑ لیا تھا۔"

میں نے سوچا کہ واقعی اس لڑکی کی قسمت ہی اچھی ہے جو ایک فوجی کا ادھر سے گزر ہوا ہے... لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ وہ زخمی ہے۔ میں نے سوچا کہ کیا وہ اس حالت میں تین ڈاکوؤں کا مقابلہ کر سکے گا؟

اس نے گھوڑے کی لگام تھام لی اور کچھ دُور تک لنگڑاتا ہوا میرے ساتھ چلتا رہا... پھر اُس نے مجھے اُٹھایا اور گھوڑے پر بٹھا دیا۔ میں دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا کہ اتفاق سے یہ شخص عین بر وقت مل گیا۔

... مجھے حیرت تھی کہ پڑاؤ سے وہ سب لوگ کہاں غائب ہو گئے۔ میں وہاں سے ضرورت کی چیزیں اڑا لانے میں کامیاب ہو گیا اور کسی نے مجھے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ لوگ آس پاس موجود نہیں تھے۔ راستہ بھی دونوں طرف ویران دکھائی دے رہا تھا۔

میرا دل ایک بار پھر شدت سے دھڑک اُٹھا۔

یہ اندیشہ دھیرے دھیرے ہی میرے ذہن میں سر ابھار رہا تھا کہ کہیں وہ لوگ بکھر کر جنگل میں ہمیں تو ڈھونڈنے نہیں نکل گئے؟ میں نے بے چینی سے اس شبے کا اظہار کر دیا۔ زخمی فوجی نے میری بات پر غور کیا... پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل گئی۔ اس نے مجھے اطمینان دلایا کہ اگر صورتِ حال ایسی بھی ہوئی تو وہ اسے سنبھال لے گا۔

وہ ایک بہادر آدمی لگتا تھا۔

بغداد کی رات

قمر اجنالوی

الف لیلیٰ کی ایک ہزار راتوں سے زیادہ حسین و رنگین رات، دجلہ اور نیل کے دامنوں میں لپٹی ہوئی رات، جسے بے شمار کتابوں کے حوالوں سے آراستہ کیا گیا ہے

1200 سے زائد صفحات

قیمت:۔ 600/-

ناشر: مکتبہ القریش اردو بازار لاہور

نامور مصنف ایم۔ الیاس۔ کے شہکار قلم سے ایک اچھوتی کہانی

ذلیل

خوبصورت سر ورق عمدہ پرنٹنگ کتابت

قیمت =\150 روپے

مجھے ایسے لوگوں سے مل کر واقعی بے حد خوشی ہوئی تھی۔

میں اُسے پڑاؤ کی طرف لے جا رہا تھا تو پڑاؤ سے قریب پہنچنے پر ایک تیز نسوانی چیخ سنائی دی... پھر تین مردانہ قہقہے گونج اُٹھے۔ اُسی لمحے ہمارا گھوڑا درختوں سے نکل کر پڑاؤ میں داخل ہو گیا۔ قہقہے دَم توڑ گئے اور لڑکی پھٹی پھٹی آنکھوں سے ہمیں دیکھنے لگی۔

اچانک نادر کی نگاہ مجھ پر پڑی۔

اس کا ہاتھ فوراً ہی اپنے ریوالور کی طرف بڑھا... اور پھر میرے جسم میں ایک سرد سی لہر دوڑ گئی۔ نادر اور اس کے دونوں ساتھیوں نے نعرہ لگایا تھا اور میرے ساتھ آنے والا شخص بھی اسی انداز میں نعرہ لگاتا ہوا آگے بڑھا... اور پھر وہ باری باری سب سے بغل گیر ہونے لگا جیسے برسوں بعد پرانے جگری یاروں سے ملاقات کر رہا ہو۔

میرا جسم ٹھنڈا ٹھنڈا پسینہ اُگلنے لگا۔

نادر سُرخ سُرخ آنکھیں مجھ پر جمائے آہستہ آہستہ میری طرف بڑھتا چلا آ رہا تھا اور میرے پاس فرار کا ایک بھی راستہ نہیں تھا۔

نادر خان کی آنکھوں میں درندگی تھی۔

وہ ریوالور ہاتھ میں لیے میری طرف بڑھ رہا تھا۔ میں نے دائیں بائیں دیکھا لیکن فرار کا کوئی راستہ نہیں تھا... اور جس پر تکیہ کر کے میں بے دھڑک اس پڑاؤ تک چلا آیا تھا، اس کے قہقہے میرے کانوں کے پردے پھاڑ رہے تھے۔ وہ اُنہی کا ساتھی تھا۔

میں نے اس لڑکی کو دیکھا جسے وہ لوگ زبردستی پکڑ لائے تھے۔ وہ گٹھڑی بنی ایک طرف بیٹھی تھی۔ اس نے قہقہوں کے شور پر اپنا جھکا ہوا چہرہ اُٹھایا اور تب ہی اس کی نگاہ میری طرف اُٹھ گئی۔

اس نے نادر خان کو ریوالور لیے میری طرف بڑھتے دیکھا تو اس کے حلق سے ایک گھٹی گھٹی سی چیخ نکل گئی... لڑکی کی اس چیخ نے نہ صرف نادر خان کو ٹھٹھک جانے پر مجبور کر دیا بلکہ نووارد اور اس کے ساتھیوں کا شور بھی ختم ہو گیا۔

سب پلٹ کر لڑکی کی طرف دیکھنے لگے۔

پھر لڑکی کی میری طرف گھورتی ہوئی خوف زدہ آنکھوں کے تعاقب میں نووارد اور اس کے دو ساتھیوں کی نگاہیں مجھ پر مرکوز ہو گئیں۔ نووارد کی آنکھوں میں پہلے تو حیرت اُبھری... پھر وہ دوڑتا ہوا نادر کے قریب آ گیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"یہ کیا ہو رہا ہے نادر خان؟" اس نے حیرت سے پوچھا "تم نے اس بچے پر ریوالور کیوں تان رکھا ہے؟"

"یہ بچہ نہیں..." نادر خان غرّایا۔

"پھر کیا ہے؟" نووارد کے لہجے میں اُلجھن تھی۔

"یہ شیطان کا بچہ ہے" نادر خان کی آواز میں دیوانگی تھی۔ "اس نے دلاور اور ابراہیم کو قتل کیا ہے۔"

"میرا خیال ہے تم گھاس چر گئے ہو" نووارد نے قہقہہ لگا کر کہا "ان دونوں کی موت کا احوال میں اس لڑکے کی زبانی سُن چکا ہوں۔ وہ دونوں حادثے کا شکار ہوئے ہیں۔ کیوں دوستو؟" اس نے اپنے دونوں ساتھیوں کی طرف دیکھتے ہوئے رائے طلب کی "کیا یہ بچہ کسی کو قتل کر سکتا ہے۔ نادر خان بُزدل ہو گیا ہے۔"

اس پر ان دونوں نے چٹانوں پر کپکپی طاری کر دینے والے قہقہے لگائے اور نادر خان نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے مجھے گھورتا رہ گیا۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے نووارد نے لے لیا تھا۔ وہ بے بسی سے قہقہے لگانے والوں کی طرف دیکھنے لگا... پھر اس نے دیوانہ وار آگے بڑھ کر لات گھمائی۔

میں اُس سے کسی ایسی حرکت کے لیے توقع کر رہا تھا اس لیے فوراً ہی ایک طرف چھلانگ لگا کر اس کی ٹھوکر کی زد سے نکل گیا۔ وہ اپنے ہی زور میں لڑکھڑایا اور پھر یوں گرا کہ جس ٹانگ پر وہ کھڑا تھا، اس ٹانگ نے دُہری ہو کر اس کے گرتے ہوئے جسم کو سنبھال لیا... اور جسم کے اس بوجھ نے اس کی ٹانگ پر یوں بوجھ ڈالا کہ اس کی دُہری ہونے والی ٹانگ ٹخنے سے ٹوٹ گئی۔ ہڈی کے چٹخنے کی آواز خفیف تھی لیکن میں نے اُسے صاف سُن لیا تھا۔

میں نے فوراً چہرے پر معصومیت اور بھولپن پیدا کر لیا کیوں کہ نادر خان کے حلق سے دلدوز چیخ نکل گئی تھی۔ نووارد پہلے تو اس کی حالت پر پیٹ پکڑے ہنستا رہا، اس کے ساتھیوں کا بھی مارے ہنسی کے بُرا حال تھا... لیکن نادر خان کی چیخ سُن کر سب ہی سنجیدہ ہو گئے۔

نووارد نے جھک کر نادر کی طرف دیکھا۔

نادر کے چہرے پر اتنی سُرخی تھی جیسے جسم کا سارا خون مارے غصّے اور تکلیف کے، اس کے چہرے پر سمٹ آیا ہو۔ نووارد اجنبی نے اس کی دُہری ہو جانے والی ٹانگ کو سیدھی کرنے کی کوشش کی تو نادر کی چیخیں سُننے والی ہو گئیں۔ وہ کسی ذبح ہونے والے بکرے کی طرح چیخ رہا تھا۔

"حاتم..." وہ چیخا "میری ٹانگ ٹوٹ گئی... تم نے دیکھا اس خنزیر کی اولاد کو...؟"

"اس میں بھلا میرا کیا قصور ہے؟" میں نے معصومیت سے کہا۔

نادر خان میری آواز سُن کر پاگل ہو گیا۔ اگر اس وقت ریوالور اس کے ہاتھ میں ہوتا تو وہ یقیناً مجھے گولی مار دیتا... وہ تو اچھا ہوا کہ ریوالور اجنبی نے اس سے پہلے ہی چھین لیا تھا۔ نادر نے مجھے اتنی گالیاں دیں کہ میرا خون کھول اُٹھا... لیکن مجھے اپنے غصّے پر قابو رکھنے کی خاص تربیت دی گئی تھی اس لیے میں جواباً مسکراتا رہا۔

میری مسکراہٹ نے نادر خان پر مزید دیوانگی طاری کر دی۔ وہ بال نوچ نوچ کر اپنے ساتھیوں کو اور مجھے بُرا بھلا کہنے لگا۔ اجنبی خاصے ضبط و تحمّل والا آدمی لگتا تھا۔ اس نے کچھ دیر بعد نادر خان کو تھپکی دیتے ہوئے خاموش رہنے کی تلقین کی۔

"حاتم... میری ٹانگ ٹوٹنے کی ذمّے داری تم پر ہے" نادر غرّایا "اگر تم مجھے نہ روکتے تو میں اس حرامی کو جان سے مار ڈالتا اور میری ٹانگ محفوظ رہتی۔"

"لیکن دوست، قصور تمھارا ہے۔ تم نے غصّے سے اندھے ہو کر لات چلائی تھی، خود ہی گرے اور ٹانگ تڑوا بیٹھے... لڑکے نے صرف اپنے دفاع میں دوسری طرف چھلانگ ہی تو لگائی تھی" حاتم نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"ٹھیک ہے۔ تم لوگوں کو جلد ہی پتہ چل جائے گا" نادر نے دونوں ہاتھوں سے اپنی ران کو تھام کر کہا۔ ان کے دونوں ساتھی جھک کر اس کی ٹانگ کا جائزہ لینے لگے۔

نادر خان کی چیخوں سے بار بار ویرانہ گونج اُٹھتا تھا۔ وہ کسی کو ٹانگ پر ہاتھ ہی نہیں رکھنے دے رہا تھا۔ میں آہستہ آہستہ کھسکتا ہوا اس لڑکی کے قریب چلا گیا جو بڑی توجہ سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

"تم کون ہو؟" اس نے سرگوشی میں پوچھا۔

"شہباز..." میں نے جواب دیا۔

"کہیں قریب ہی رہتے ہو؟"

"نہیں... اس علاقے میں دُور دُور تک کوئی آبادی نہیں ہے" میں نے جواب دیا۔

"اوہ..." اس کے ہونٹ سکڑ گئے "تو پھر بھاگ جاؤ۔ اس وقت یہ سب اس درندے کی طرف متوجہ ہیں۔"

میں نے اپنے بائیں ہاتھ میں جکڑے ہوئے تھیلے کی طرف

دیکھا۔ اس میں ایک لمبی نال کا ریوالور موجود تھا۔ میں نے جلدی سے ریوالور نکال کر لڑکی کے حوالے کر دیا اور خود تھیلا سنبھال کر پوری قوت سے جھاڑیوں کی طرف دوڑ پڑا۔ میرے قدموں سے خفیف سی آہٹ بھی پیدا نہیں ہو رہی تھی کیوں کہ جانوروں کے اس مخصوص انداز میں دوڑنے کی مجھے شروع ہی سے تربیت دی گئی تھی۔

"پکڑو۔ . . وہ رہا۔ . ." اچانک ایک دھاڑ سنائی دی۔

آواز خاصے فاصلے سے آئی تھی۔ میں نے رفتار اور تیز کر دی۔

اچانک عقب سے لڑکی نے چیخ کر کچھ کہا۔ میں نے خود کو زمین پر گرا دیا اور پیٹ کے بل پھسلتا ہوا جھاڑیوں تک پہنچ گیا۔ لڑکی کے چیختے ہی ایک دھماکا ہوا۔ . . لیکن بروقت گرنے کی وجہ سے گولی میرے اوپر سے گزر گئی۔ جھاڑیوں میں پہنچ جانے کے بعد میں محفوظ ہو گیا تھا۔ . . بلکہ اب تو ان ڈاکوؤں کا باپ بھی مجھے نہیں پکڑ سکتا تھا۔

میں نے دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنیں۔

غالباً نادر خان کے تینوں دوست افراتفری کے عالم میں میرے پیچھے دوڑ پڑے تھے۔ . . لیکن ان جھاڑیوں میں وہ قیامت تک میرا سراغ نہیں لگا سکتے تھے۔ میں نے جھاڑیوں میں گھٹنوں کے بل آگے بڑھتے ہوئے اچانک ایک پھنکار سنی تو رک گیا۔ یہ ایک پتلا سا مٹیالے رنگ کا سانپ تھا۔

میں نے بچھوؤں اور سانپوں کو پکڑنے میں خاصی مہارت حاصل کر رکھی تھی اس لیے سانپ کو دیکھتے ہی میں نے اسے قابو میں کر لیا۔ اسے تھیلے میں ڈالنے میں مجھے ذرا سی دشواری ہوئی کیوں کہ میں ساتھ ساتھ دوڑتا بھی جا رہا تھا۔ اب مجھے جھاڑیوں کے ٹوٹنے کی آوازیں سنائی دینے لگی تھیں، اس کا مطلب تھا کہ وہ لوگ جھاڑیوں میں گھس آئے ہیں۔

مجھے اس بھاگ دوڑ میں اب مزا آنے لگا تھا۔

شروع میں تو میں فاطمہ کی وجہ سے مجبور تھا ورنہ میں ان ڈاکوؤں کے ہاتھ کبھی نہ لگتا۔ . . اور اگر وہ مجھے پکڑ بھی لیتے تو زیادہ دیر تک اپنی گرفت میں نہیں رکھ سکتے تھے۔ . .

"پھیل جاؤ۔ . . اور تلاش کرو۔" ایک دھاڑ سنائی دی۔

یہ اسی اجنبی کی آواز تھی جس کا نام نادر نے حاتم لیا تھا اور جسے میں فوجی سمجھ کر ساتھ لے آیا تھا۔ . . اس شخص کی عیاری حماقت سے میں نے جو دھوکا کھایا تھا اس کی وجہ سے میری زندگی موت کے دہانے تک جا پہنچی تھی لیکن میں بال بال بچ گیا تھا۔ . . اور اب مجھے اس سے شدید نفرت ہو گئی تھی۔ میرے قلب و ذہن اس سے انتقام کے لیے بے چین ہو رہے تھے۔

میں نے حاتم کی آواز سے اندازہ لگایا تھا کہ وہ میرے یوں فرار ہو جانے پر خاصا فکرمند ہو رہا ہے۔ میں مزید گھنی جھاڑیوں میں گھسنے لگا۔ ان جھاڑیوں میں جانور آسانی سے گھس جاتے ہیں اور کسی عام آدمی کے لیے ان میں گھس کر کسی جانور کو پکڑنا مشکل ہو جاتا ہے۔ . . لیکن اس وقت میں انسان ہوتے ہوئے بھی جانوروں کی طرح ان دشوار گزار جھاڑیوں میں گھس رہا تھا۔ . . حتیٰ کہ ایک جگہ میں رک گیا۔

میں تھیلا سنبھالے دیر تک وہیں بیٹھا رہا۔

وہ مجھے آس پاس کی جھاڑیوں میں تلاش کرتے رہے پھر تھک ہار کر بڑبڑاتے ہوئے واپس چلے گئے۔ میں دل ہی دل میں دعا مانگ رہا تھا کہ اس عرصے میں وہ لڑکی بھاگ نکلی ہو تو کتنا اچھا ہو۔ ظاہر ہے اس وقت پڑاؤ میں لنگڑے نادر کے علاوہ کوئی بھی نہیں تھا۔ باقی تینوں تو میرے پیچھے دوڑ پڑے تھے اور انہوں نے خاصی دیر تک مجھے تلاش کیا تھا۔ نادر خان کے پاس ریوالور نہیں تھا اس لیے وہ لڑکی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ وہ ان کے گھوڑے پر بھی فرار ہو سکتی تھی اور اس کے پاس اب وہ لمبی نال کا رائفل نما ریوالور بھی تھا جسے میں تھیلے سے نکال کر اس کے حوالے کر آیا تھا۔

اچانک ایک دھماکا سنائی دیا۔

دھماکا پڑاؤ ہی کی طرف سے میرے کانوں تک پہنچا تھا۔

کیا لڑکی نے کسی کو گولی مار دی ہے یا۔ . . خود لڑکی ہی کو کسی نے نشانہ بنا دیا ہے؟ میں بے چین ہو گیا۔ لڑکی کی پیاری صورت میرے دل میں اتر گئی تھی اور میں کسی ایسی لڑکی کو درندہ صفت ڈاکوؤں کے نرغے میں نہیں چھوڑ سکتا تھا۔

میں تیزی سے باہر آیا اور چھدری جھاڑیوں میں دوڑنے لگا۔

اس بار میں نے اوپر سے گھوم کر دوسری جانب سے پڑاؤ کا جائزہ لینے کا ارادہ کیا تھا۔ اس طرف کی جھاڑیاں گھنی تھیں اور وہ لوگ کوشش کے باوجود مجھے نہیں دیکھ سکتے تھے۔

میں نے پڑاؤ کے قریب پہنچ کر جھاڑیوں میں دبک کر دیکھا۔ لڑکی مجھے کھڑی نظر آئی۔ اس کے ہاتھ میں لمبی نال والا ریوالور تھا اور حاتم خان کا ایک ساتھی زمین پر اوندھے منہ پڑا تڑپ رہا تھا۔ ریوالور کی نال سے دھواں اٹھ رہا تھا۔

حاتم خان نے آگے بڑھ کر ریوالور لڑکی سے چھین لیا۔

لڑکی نے ریوالور کا رخ اس کی طرف کر کے ٹریگر دبایا تھا لیکن اس بار کوئی دھماکا نہیں سنائی دیا تھا۔ . . گویا اس ریوالور میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

صرف ایک ہی گولی تھی۔ میں نے ایک طویل سانس لی۔

نادر خان ہذیانی انداز میں ہنس رہا تھا۔

اس کی ہنسی میں تکلیف کی چیخیں بھی شامل ہو جاتی تھیں۔

"خاموش رہو۔" حاتم خان ڈپٹ کر بولا۔

"دیکھا تم نے اس بچے کو۔ . . تم اسے بچہ سمجھتے رہے۔ . . اور وہ تمہارے دو ساتھیوں سے نمٹ کر غائب بھی ہو گیا۔ . . اب تم دونوں کی زندگی بھی خطرے میں ہے۔ وہ تمہیں بھی مار ڈالے گا۔ . ."

"چپ رہو خنزیر۔ . ." حاتم نے غصے سے اسے ایک ٹھوکر مارتے ہوئے کہا۔ "میں اس کا خون پی جاؤں گا۔ وہ حاتم خان سے واقف نہیں۔ میں جتنا رحم دل ہوں، اتنا ہی سفاک بھی ہوں۔"

"تم اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔" نادر خان نے قہقہہ لگا کر کہا۔

وہ بالکل دیوانہ سا لگتا تھا۔ اس کے چہرے کے نقش و نگار میں تکلیف اور دیوانگی کی وجہ سے کافی تبدیلی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے اس کے بدلے بدلے سے چہرے کو دیکھا۔ اسی لمحے میرے ہاتھ میں جکڑے ہوئے تھیلے میں سانپ بڑے زور سے پھنکارا۔

سانپ کی پھنکار غالباً ان لوگوں نے بھی سن لی تھی۔ وہ ادھر ادھر دیکھنے لگے لیکن اس وقت تک میں نے تھیلے کا منہ مزید دبا کر پکڑ لیا۔ بے خیالی میں مبتلا میرے ہاتھ میں قدرے ڈھیلا پڑ گیا تھا اس لیے سانپ کو حرکت کرنے کی مہلت مل گئی تھی۔

"تمہیں یہ ریوالور کہاں سے ملا تھا؟" حاتم نے لڑکی سے پوچھا۔

لڑکی خاموش رہی۔

"بتاؤ۔" حاتم نے رائفل کا کندا اس کی گردن پر رکھتے ہوئے کہا۔

"یہ پہلے سے میرے پاس موجود تھا۔"

"بکواس۔ . ." نادر خان نے چیخ کر کہا۔ "یہ ریوالور میرے پاس تھا اور مجھے یقین ہے کہ وہ لڑکا اسے چرا کر لے گیا تھا۔ . . پھر اس نے جانے سے پہلے اسے لڑکی کے حوالے کر دیا ہو گا۔"

"ہوں۔ . ." حاتم نے تفکر آمیز انداز میں کہا۔

"حاتم۔ . ." نادر خان بولا۔ "اگر تم اور کالا خان اپنی جان بچانا چاہتے ہو تو اس لڑکے کو ڈھونڈ کر مار ڈالو۔ . . اس کے ساتھ ایک چھوٹی سی بچی بھی ہے جسے وہ اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتا ہے یا پھر اس بچی اور گھوڑے کو پکڑ لو تو وہ خود ہی تمہارے پاس آنے کے لیے مجبور ہو جائے گا۔ اسے قتل کر دو۔ . . ورنہ تم دونوں حرام موت مارے جاؤ گے۔ . . یہاں وقت ضائع نہ کرو۔"

حاتم نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھا۔

کالا خان نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"ٹھیک ہے۔" حاتم بولا اور اس نے ایک رائفل نادر خان کو تھما دی۔ "تم لڑکی کا خیال رکھنا۔ ویسے مجھے افسوس ہے، میں اس حرامی لڑکے کو غلط سمجھا تھا۔"

"دیر ہو گئی۔ . . بہت دیر ہو گئی۔ . . تم نے اسے بہت دیر بعد سمجھا۔ . . اس وقت سمجھا جب وہ دو آدمیوں کو ناکارہ کر گیا۔ . . کاش تم اس وقت میرے ہاتھ سے ریوالور نہ لے لیتے۔ . . اُف۔ . ." اس نے دونوں ہاتھوں سے ٹانگ تھام لی۔

حاتم نے اپنے ساتھی کو اشارہ کیا۔

دونوں مخالف سمت کی جھاڑیوں میں جا گھسے اور نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ میں کچھ دیر تو جہاں تھا، وہیں دبکا بیٹھا رہا۔ . . پھر میں نے پڑاؤ سے فاصلہ کم کرنا شروع کر دیا۔ میرا ایک دشمن ادھوری موت کا شکار میرے قریب ہی موجود تھا اور میں اس کی موت کی تکمیل چاہتا تھا۔

لڑکی اب بھی کھڑی تھی۔ . . لیکن وہ بھاگ نہیں سکتی تھی کیوں کہ نادر خان نے رائفل کی نال کا رخ اس کی طرف کر رکھا تھا۔ اس کے چہرے پر جو تاثرات تھے، ان سے پتہ چلتا تھا کہ وہ لڑکی کو کسی بھی لمحے قتل کر سکتا ہے۔ . . اور اس بات کا شاید لڑکی کو بھی احساس ہو گیا تھا۔ میں نے اس کی پیاری صورت پر زردی پھیلتی دیکھی۔

میں فاطمہ اور اطلس کے لیے بھی بے چین تھا۔

مجھے خدشہ تھا کہ کہیں فاطمہ پریشان ہو کر میری تلاش میں نہ نکل کھڑی ہو۔ . . ایسے میں وہ ان ڈاکوؤں کے ہاتھ لگ سکتی تھی جو میری تلاش میں نہ جانے کس طرف نکل گئے تھے۔ غصے اور خوف کی وجہ سے ان لوگوں کی عقل نے شاید کام کرنا ہی چھوڑ دیا تھا ورنہ وہ ایک لڑکے اور ایک بچی کی بھی تلاش میں مارے مارے پھرنے کی بجائے اپنے گھوڑوں پر سوار ہو کر اس پیاری سی لڑکی کو ساتھ لے کر بھاگ بھی سکتے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھے۔۔۔ لیکن نادر خان شاید اپنا انتقام لینا چاہتا تھا اس لیے اُس نے حاتم اور کالا خان کو نہ صرف بھڑکا دیا بلکہ یہ بات بھی ان کو ذہن نشین کرا دی کہ میری موت ہی ان کی زندگی کا پیغام بن سکتی ہے۔

میں نے دیکھا کہ نادر خان دائیں کروٹ لیٹا ہوا ہے۔ اس کی بائیں ٹانگ ٹوٹی تھی اس لیے وہ دائیں ٹانگ کے سہارے یوں لیٹا تھا کہ رائفل سے لڑکی کو نشانے پر رکھ سکے۔ میں نے اس کی پشت سے آگے بڑھنے کا ارادہ کیا۔۔۔ لیکن پھر میں نے سوچا کہ زیادہ آگے جانا خطرناک ہوگا۔

نادر اس وقت باؤلا ہو رہا تھا۔

یہ پاگل اندھا دھند گولی چلائے گا۔ ضروری نہیں تھا کہ وہ مجھے ہی گولی مارتا، اس گولی سے لڑکی بھی مر سکتی تھی۔۔۔ اور میں اس پیاری پیاری سی مظلوم لڑکی کو ہر حال میں بچانا چاہتا تھا۔

میں اس وقت گھنی جھاڑیوں کے جس حصے میں تھا، وہاں سے لڑکی اور نادر خان کی پشت ہی دیکھی جا سکتی تھی میں نے تھیلا زمین پر رکھا اور پھر اس کا مُنہ کھول دیا۔۔۔ سانپ غضب ناک ہو رہا تھا۔

وہ لہراتا ہوا باہر آیا۔

میں نے سانس روک لی۔

تھیلے سے باہر آنے کے بعد اس کی دوشاخہ زبان دُہری دھار کے خنجر کی طرح تیزی سے حرکت کرنے لگی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اس زہر میں بجھی ہوئی کٹار سے اپنے راستے کی ہر چیز کو ڈس لینا چاہتا ہو۔

میں نے مخصوص انداز میں جھپٹا مار کر اس کی کھوپڑی کو انگلیوں میں دبوچ لیا اور پھر اس سے پہلے کہ سانپ کا کوڑے جیسا جسم میرے بازو سے لپٹ کر میری کھال ادھیڑ دیتا، میں نے ایک جھٹکے سے اُسے نادر خان کی پشت کی طرف اچھال دیا۔

سانپ اُڑتا ہوا اس کی طرف بڑھا اور پھر لمحے بھر کو مجھے یوں لگا جیسے میرا دل سینے کی بجائے حلق میں اٹک کر دھڑک رہا ہو۔ سانپ اس کی پشت پر گرنے کی بجائے اپنے ہی زور میں اُڑتا ہوا نادر خان اور لڑکی کے درمیان جا گرا تھا۔

میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس غضب ناک سانپ کی تباہ کاری سے میں خوب واقف تھا۔

لڑکی دہشت سے چیخ اٹھی۔ سانپ نے زمین پر گرتے ہی

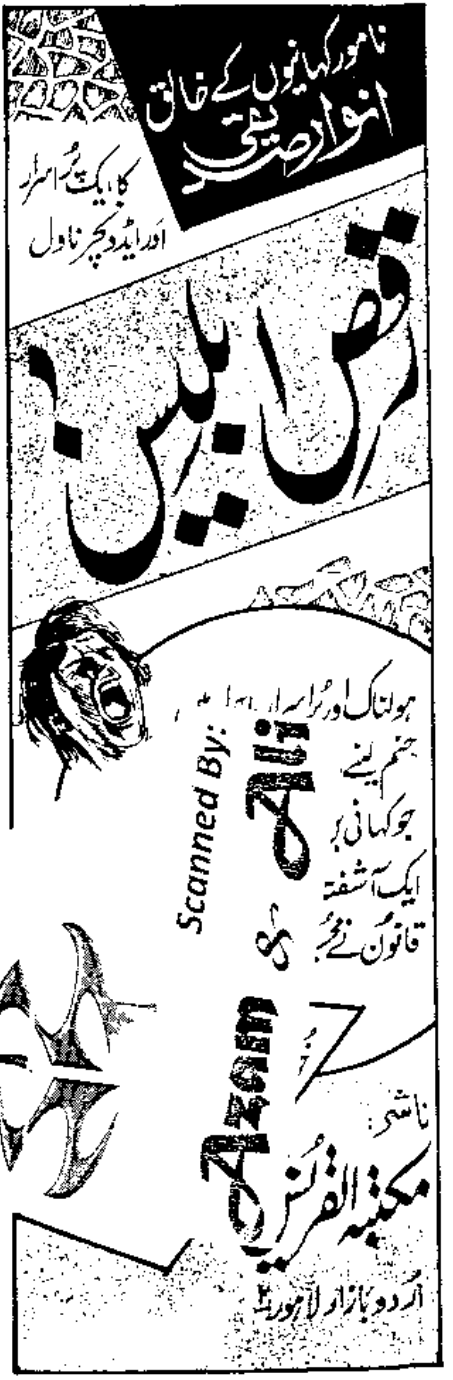

زبردست پھنکار ماری تھی۔ میں چیخ کر اسے کوئی ہدایت بھی نہیں دے سکتا تھا کیونکہ اس طرح نادر خان میری موجودگی اور سمت سے آگاہ ہو سکتا تھا۔ اگر لڑکی چیخنے کی بجائے بے حس و حرکت ہو جاتی تو سانپ اس کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتا تھا۔۔۔ لیکن وہ بُری طرح کانپ رہی تھی۔

میں نے جھاڑیوں میں بے آواز چلنا شروع کر دیا۔

اب میرے پاس کچھ نہیں تھا۔

میں نے سانپ کو ایک زہریلے ہتھیار کے طور پر استعمال کرنا چاہا تھا لیکن جلد بازی اور اندازے کی ذرا سی غلطی سے لڑکی ہی کی زندگی خطرے میں پڑ گئی تھی۔ میں نے جھاڑیوں میں ایک جگہ رُک کر وہاں سے نادر کی طرف دیکھا۔ اس نے رائفل کی نال سیدھی رکھی تھی۔ سانپ اس کے نشانے پر تھا۔۔۔ لیکن اس کے پاس جو رائفل تھی، اس سے وہ صرف ایک ہی گولی چلا سکتا تھا دوسری گولی اسے رائفل میں بھرنا پڑتی۔۔۔ اور میں دیکھ رہا تھا کہ وہ ذرا سی بھی حرکت کرنے کے قابل نہیں ہے۔

سانپ جہاں گرا تھا، وہیں غصے سے چکرا رہا تھا۔

اس کا فاصلہ لڑکی سے کم اور نادر خان سے زیادہ تھا اس پہ یہی امکان تھا کہ وہ لڑکی ہی کی موت کا پیغام بن جائے گا۔۔۔ میں سوچ رہا تھا لیکن کوئی ترکیب سمجھ میں نہ آئی۔ اس سانپ کو نادر خان سے قریب کرنے یا نادر خان کے ہاتھ میں جکڑی ہوئی رائفل کی گولی کو ضائع کرانے کی کوئی ترکیب نہیں سوجھ رہی تھی۔

میں نے اس تھیلے کی طرف دیکھا جو اب بھی میرے ہاتھ میں ہوا تھا اس میں کھانے کی جتنی چیزیں بھی رکھی تھیں وہ اب بیکار ہو گئی تھیں کیونکہ میں نے اسی تھیلے میں سانپ کو بند کر دیا تھا۔ ان چیزوں کو کھانا نقصان دہ ہو سکتا تھا اس لیے میں نے ماسوائے بند ڈبے کے باقی اشیاء کو تھیلے ہی میں رہنے دیا اور تھیلا گھما کر قوت سے نادر خان کی طرف پھینک دیا۔

تھیلا زیادہ وزنی نہیں تھا لیکن اس کی ٹوٹی ہوئی ٹانگ پر لگا تو اس کے حلق سے ایک دلدوز چیخ نکل گئی۔۔۔ اور اس کے ساتھ ہی رائفل کا گھوڑا اُس کی انگلی سے دب گیا۔

لڑکی دھڑام سے زمین پر گری تو میری سانس رُک گئی۔ میں سمجھا کہ گولی اُسے لگ گئی ہے۔۔۔ لیکن جب تھوڑی دیر بعد میں نے غور سے صورت حال دیکھی تو میرا دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ گولی اُسے نہیں لگی تھی۔ وہ دھماکا سن کر بے ہوش ہو کر گری تھی۔۔۔ اور سانپ بھی محفوظ تھا۔ گولی نہ جانے کدھر نکل گئی تھی۔

میں نے جھاڑیوں سے نکل کر ادھر دوڑ لگا دینے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ مجھے خود کو روک لینا پڑا۔ اگر میں صرف ایک لمحے کے لیے بھی بے قابو ہو جاتا تو اس وقت بے بس ہو گیا ہوتا۔ اسی لمحے جھاڑیوں سے حاتم اور کالا خان دوڑتے ہوئے نکلے تھے اور ان کا رُخ پڑاؤ کی طرف ہی تھا۔

نادر خان پر تکلیف اور دہشت کا دورہ پڑ گیا تھا۔ وہ بُری طرح حلق پھاڑ پھاڑ کر چیخنے لگا۔ وہ کیا کہہ رہا تھا یہ تو میں بھی نہیں سمجھ سکا اور اس کے دونوں ساتھی کچھ فاصلے پر رُک کر لڑکی کو یوں گھور رہے تھے جیسے اُنھیں اپنی آنکھوں پر یقین نہ آ رہا ہو۔

وہ دونوں شاید ابھی سانپ کی موجودگی سے آگاہ نہیں ہوئے تھے۔ اُنھیں تو غالباً لڑکی کی فکر لاحق ہو گئی تھی جیسے ان کی دانست میں نادر خان نے گولی مار دی تھی۔

کالا خان آہستہ آہستہ لڑکی کی طرف بڑھنے لگا۔

چلتے چلتے وہ یکایک ٹھٹھک گیا۔

۔۔۔ لیکن اس کا یوں ٹھٹھک جانا اب بعد از وقت تھا۔ وہ سانپ کے اتنا قریب پہنچ چکا تھا کہ بخیریت واپسی ممکن نہیں رہ گئی۔ میں نے سانپ کو اُٹھا کر جب پھینکا تھا تو اس کی کھوپڑی اپنی انگلیوں میں دبالی تھی۔۔۔ شاید دباؤ کچھ زیادہ رہا تھا جس کی وجہ سے سانپ کے حواس ہی مختل ہو گئے تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ ایک ہی جگہ چکرانے کی بجائے اب تک نادر خان یا اس لڑکی کو یقیناً ڈس چکا ہوتا۔

"حاتم۔۔۔ بس۔۔۔ سانپ!" وہ ہکلایا۔

سانپ نے اس کی آہٹ پا کر غصے سے ایک پھنکار ماری تھی اور پھر تڑاک سے اس کی طرف لپکا تھا۔ کالا خان نے بوکھلاہٹ اور گھبراہٹ میں اسے پاؤں سے کچل ڈالنے کے لیے پاؤں مارا لیکن اس کا پاؤں سانپ کی کھوپڑی کو نہ کچل سکا۔۔۔ اور سانپ اس کی ٹانگ سے لپٹ گیا۔ ایک خوفناک پھنکار کے ساتھ سانپ نے اپنی دوشاخہ زبان اس کی پنڈلی میں کسی جگہ گاڑ دی۔

کالا خان کے حلق سے ایک دلدوز چیخ نکل گئی۔

مٹیالے رنگ کا یہ سانپ خاصا زہریلا تھا۔۔۔ لیکن اس سے بڑھ کر کالا خان کا خوف تھا جس نے فوری طور پر شاید اس کی حرکتِ قلب بند کر دی تھی۔

وہ لہرا کر گر گیا۔

کالا خان بُری طرح تڑپ رہا تھا۔

قریب ہی نادر خان بُری طرح چیخ رہا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حاتم یوں کھڑا تھا جیسے اُسے سکتہ ہوگیا ہو۔ لڑکی اب بھی بے ہوش پڑی تھی۔ میں جھاڑیوں میں دُبکا اس صورتِ حال سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔۔۔ اور ڈاکوؤں کے اس عبرت ناک انجام پر میرا دل خوشی سے جھوم رہا تھا۔

پہلے سے مٹیالے رنگ کے اس سانپ نے کالا خان کی ٹانگ سے لپٹ کر اُسے ڈھیر کر دیا ہوگا۔۔۔ پھر اس کا زہر تیزی سے پھیلا تھا۔ میں نے کالا خان کو گرنے کے بعد صرف چند لمحوں کے لیے تڑپتے دیکھا۔۔۔ اور پھر وہ لاش بن گیا۔

ادھر نادر خان بھرائی ہوئی آواز میں چیخ رہا تھا۔ اس کے حلق سے بے معنی آوازیں نکل کر یہ تاثر دے رہی تھیں جیسے کوئی بہت بڑا سا مینڈک بڑی مشکل سے ٹرّا رہا ہو۔ جب حالات اس قسم کے ہو جاتے ہیں کہ انسان ان کو سمجھنے سے قاصر رہے تو عموماً بہت سے لوگ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کھو بیٹھتے ہیں اور ان پر دیوانگی کا دورہ پڑ جاتا ہے۔۔۔ کچھ ایسا ہی حال اس وقت حاتم کا بھی ہو رہا تھا۔ اس نے رائفل سیدھی کی اور سانپ کا نشانہ لے کر گولی چلا دی۔

ایک دھماکا ہوا۔

ویرانہ اس دھماکے سے دُور دُور تک گونج اُٹھا۔

سانپ اس کے ایک ساتھی کی ٹانگ سے لپٹا ہوا تھا۔ گولی سے سانپ تو مر گیا لیکن کالا خان کی ٹانگ کے بھی چیتھڑے اُڑ گئے۔ اس دھماکے سے نادر خان کا ذہنی توازن مزید بگڑ گیا اور اس کی مینڈک کی طرح ٹرّانے جیسی بھرّائی بھرّائی سی آواز شدید ہوگئی۔

"چُپ ہو جاؤ۔۔۔" حاتم نے گرج کر کہا۔

جواباً وہ اسی طرح نہ جانے کیا بکتا رہا۔

حاتم نے پلٹ کر اس کی کھوپڑی پر رائفل کا کُندا دے مارا۔ شاید اس نے نادر خان کو بے ہوش کرنے کے لیے ہلکی سی چوٹ لگانا چاہی تھی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس کا اندازہ غلط ثابت ہوا۔ مجھ تک جو آواز پہنچی تھی وہ ایسی تھی جیسے کسی نے تربوز پر پوری قوت سے گھونسہ مار کر اُسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہو۔

نادر خان کی کھوپڑی چٹخ گئی تھی۔

خون تیزی سے بہہ نکلا تھا۔

اس خون نے حاتم پر نہ جانے کیا اثر کیا کہ وہ مارے دہشت کے چیختا ہوا ایک گھوڑے کی طرف بڑھا۔۔۔ اور پھر اس نے گھوڑے پر زین کسنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی۔ وہ گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر سوار ہوگیا اور اسے ایڑ لگا دی۔

ویرانہ گھوڑے کی ٹاپوں سے گونج اُٹھا۔

میں دیر تک جھاڑیوں میں دُبکا ان ٹاپوں کو سنتا رہا۔ جب یہ آوازیں معدوم ہوگئیں تو میں آہستہ آہستہ باہر آگیا۔ حاتم خان جس بدحواسی کے عالم میں بھاگا تھا اس سے مجھے توقع بندھ گئی تھی کہ وہ کبھی اس طرف واپس نہیں آئے گا۔

باہر آکر سب سے پہلے میں دوڑتا ہوا لڑکی کے قریب پہنچا۔ وہ بے ہوش پڑی تھی۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ پڑاؤ میں اب پانی کا کوئی برتن نہیں تھا۔

میں نے سب طرف سے مایوس ہونے کے بعد وہ رائفل اُٹھائی جو کالا خان کے ہاتھ سے گری تھی۔ اس رائفل کو سنبھال کر میں لڑکی کے قریب ہی بیٹھ گیا اور اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کرنے لگا۔ ماں ریشم جان نے مجھے بعض جڑی بوٹیوں کے بارے میں بتایا تھا لیکن اس سلسلے میں ابھی مجھے زیادہ مہارت نہیں تھی اس لیے میں نے کوئی ایسی ترکیب کرنے سے اجتناب ہی کیا۔

لڑکی بے سُدھ پڑی تھی۔ میں نے اس کی پیاری پیاری صورت پر نگاہ گاڑ دی۔ اس کا چہرہ بے حد پُرکشش تھا۔ اس کے گال کچوریوں کی طرح پھولے پھولے سے تھے لیکن ان پر سُرخی کی بجائے زردی پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے گالوں پر ایسے نشانات بھی تھے جیسے کسی نے انھیں دانتوں سے بُری طرح کاٹا ہو۔۔۔ یہ پُرانے زخم تھے۔ اس کی گردن سفید تھی اور اس پر بھی ایسے ہی نشانات تھے۔

کافی دیر بعد اس کے پپوٹوں میں حرکت پیدا ہوئی۔

"سُنو۔۔۔!" میں نے دھیمی آواز میں پکارا۔

اس نے آنکھیں کھول دیں۔

چند لمحوں تک تو وہ مجھے ایسی نگاہ سے دیکھتی رہی جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو لیکن اسے ناکامی ہوئی ہو۔۔۔ پھر ان آنکھوں میں شناسائی کی جھلک پیدا ہوگئی۔

وہ جلدی سے اُٹھ بیٹھی۔

"شہباز۔۔۔" اس نے سرگوشی کی۔

"گھبراؤ نہیں۔۔۔ تم سے!" میں نے مسکرا کر کہا۔ "اس وقت یہیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔"

لڑکی نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اس کی نگاہ سب سے پہلے کالا خان پر گئی جس کی لاش قریب ہی پڑی تھی۔۔۔ پھر اس کی ٹانگ سے لپٹے ہوئے مُردہ سانپ کو دیکھ کر اس کی آنکھیں آہستہ آہستہ پھیل کر کافی بڑی بڑی ہوگئیں۔

سب سے آخر میں اس نے نادر خان کی طرف دیکھا۔

اس کی چٹخی ہوئی کھوپڑی سے خون بہہ بہہ کر جم چکا تھا۔ اس کی صورت انتہائی بھیانک لگ رہی تھی۔ نادر خان کو دیکھنے کے بعد وہ اِدھر اُدھر متلاشی نگاہوں سے دیکھتی رہی۔۔۔ پھر میری طرف متوجہ ہو کر بولی۔ "اور وہ کہاں گیا؟"

"کون۔۔۔ حاتم خان؟"

"ہاں۔۔۔ اس کی لاش کہیں نظر نہیں آرہی۔"

"اس کی لاش گھوڑے پر بیٹھ کر فرار ہوگئی ہے۔" میں نے مسکرا کر کہا تو وہ کھِل کھِلا کر ہنس پڑی۔ اس نے مجھے دونوں بانہوں میں لے کر سینے سے بھینچ لیا۔

اس کی آغوش میں مجھے کس قدر سکون ملا۔ مجھے اپنی ماں ریشم جان یاد آگئی جو مجھے اسی طرح بھینچ لیا کرتی تھی تو بعض اوقات میرے لیے سانس لینا مشکل ہو جاتا تھا۔

"تم واقعی بہت بہادر ہو۔" اس نے کہا۔

"آؤ چلیں۔" میں نے اس کی بانہوں کے حصار سے نکلتے ہوئے کہا۔ "فاطمہ اور اطلس میری وجہ سے پریشان ہو رہے ہوں گے۔"

"یہ دونوں کون ہیں؟"

"ایک بچی ہے اور ایک گھوڑا ہے۔"

"اوہ۔۔۔ کہاں ہیں وہ دونوں؟"

"یہاں سے کچھ فاصلے پر۔۔۔" میں نے کہا اور پڑاؤ کا جائزہ لینے لگا۔ مجھے جو جو کارآمد اشیا نظر آئیں میں نے انھیں ایک جگہ جمع کر لیا اور پھر لڑکی نے ان کی ایک گٹھڑی باندھ دی۔

میرا شکاری چاقو بھی مل گیا۔ یہ چاقو نادر خان کی جیب میں تھا۔ دونوں لاشوں کی تلاشی لینے کے بعد کچھ طلائی و نقرئی سکّے اور روپے بھی ملے جنھیں میں نے گٹھڑی میں ڈال دیا اور رائفل اُٹھالی۔ گٹھڑی لڑکی نے اُٹھالی تھی۔

ہم دونوں تیزی سے چلنے لگے۔

نادر خان اور اس کے ساتھیوں کے پاس جتنے گھوڑے تھے، اُن میں سے صرف ایک گھوڑا زخمی حالت میں تھا۔ یہ وہی گھوڑا تھا جس پر لڑکی سوار تھی اور جسے نادر خان نے گولی چلا کر گرا دیا تھا۔ باقی گھوڑوں میں سے ایک پر حاتم خان فرار ہوگیا تھا جب کہ تین گھوڑے، پڑاؤ سے کچھ فاصلے پر درختوں کے نیچے موجود تھے۔

لڑکی نے ایک گھوڑے پر زین پھینکی اور اُچک کر اس پر سوار ہوگئی۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنی گود میں بٹھا لیا اور گٹھڑی میرے ہاتھوں میں دے دی۔ اس نے گھوڑے کو ایڑ لگا دی اور ہم، اس منحوس پڑاؤ سے لحظہ بہ لحظہ دُور ہوتے چلے گئے۔

راستہ میرے ذہن میں محفوظ تھا۔

میں، لڑکی کی رہنمائی کرتا رہا اور لڑکی بہ ممکن تیز رفتاری سے گھوڑے کو دوڑاتی رہی۔ ابھی تک اس لڑکی کے بارے میں مجھے کچھ معلوم نہیں ہو سکا تھا۔ میں اُس کے بارے میں جاننے کے لیے بے چین تھا لیکن یہ ساری باتیں بعد میں بھی ہو سکتی تھیں اس لیے میں خاموش رہا۔

جس جگہ میں نے فاطمہ اور اطلس کو چھوڑا تھا، جب ہمارا گھوڑا وہاں پہنچا تو ان دونوں میں سے کوئی بھی دکھائی نہیں دیا۔

میں پریشان ہوگیا۔

اِدھر اُدھر دیکھا لیکن وہ کہیں دکھائی نہ دیے۔

"کہاں ہیں، تمھارے ساتھی؟" لڑکی نے پوچھا۔

میں نے ایک بار پھر متلاشی نگاہ سے چاروں طرف دیکھا۔۔۔ پھر میں حلق پھاڑ پھاڑ کر فاطمہ اور اطلس کو آوازیں دینے لگا۔ فوری طور پر کوئی جواب نہ ملا۔ ان حالات میں اندیشے اور وسوسے انسان کی سوچوں کا حصہ بن جاتے ہیں۔ چند لمحوں میں ان گنت دہشت ناک خیالوں نے میرے ذہن کو جکڑ لیا تھا۔ میں ان دونوں کو آوازیں دیتا رہا۔۔۔

کافی دیر بعد مجھے کسی گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز۔۔۔ سُنائی دی۔

"اطلس۔۔۔!" میں چیخ پڑا۔

وہ جھاڑیوں سے نکل کر سامنے آیا تو اس کے بعد فاطمہ

Scanned By

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بچنا بہرا گئی۔ انہوں نے غالباً ہمارے گھوڑے کی ٹاپیں سُن لی تھیں... اور دہشت میں مبتلا ہو گئے تھے۔ یہی وجہ تھی فاطمہ نہ صرف خود چھپ گئی تھی بلکہ اس نے اطلس کو بھی ان بلند اور گھنی جھاڑیوں میں گھسیٹ لیا تھا، جن میں اسے دیکھا نہیں جا سکتا تھا۔

وہ جھاڑیوں سے نکل کر سامنے آئی۔ پہلے تو اس نے غور سے میری طرف دیکھا... پھر اُلجھن سے لڑکی کو دیکھنے لگی۔ وہ دوڑتی ہوئی آئی اور مجھ سے لپٹ گئی۔

اطلس اور دوسرا گھوڑا، ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر کھڑے تھے... اور ان کے انداز میں دوستانہ جھلک نہیں تھی۔

میں نے اطلس کی تھوتھنی پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ یہ دونوں ہمارے دوست ہیں۔"

اطلس نے میرا ہاتھ چاٹنا شروع کر دیا۔

لڑکی گھوڑے سے کود کر نیچے آ گئی۔

اُس نے فاطمہ کو گود میں اُٹھا لیا اور اُسے پیار سے گلے لگاتے ہوئے چومنے لگی۔ فاطمہ مسکرانے لگی۔ اس کا چہرہ زرد تھا اور آنکھیں خوف سے پھیلی ہوئی تھیں... لیکن لڑکی کے خلوص اور پیار نے جلد ہی اُسے مسکرانے پر مجبور کر دیا تھا۔

... پھر وہ، لڑکی کی گود سے اُتر کر میرے قریب آ گئی...

"یہ لڑکی بہت اچھی ہے شہباز! تم اسے کہاں سے لائے ہو؟" اس نے سرگوشی کی۔

"یہ مجھے راستے میں مل گئی تھی۔"

"مجھے بھوک لگ رہی ہے۔" فاطمہ نے چونک کر کہا۔ جیسے اُسے یکایک ہی بھوک کا خیال آ گیا ہو۔ وہ میری طرف شکایت آمیز نگاہ سے دیکھنے لگی جیسے کہہ رہی ہو کہ کھانا لانے میں اتنی دیر کر دی۔

میں نے گٹھری میں سے کچھ چیزیں نکال کر اُسے دیں... جنہیں وہ جلدی جلدی کھانے لگی۔

لڑکی نے گھوڑے کو درخت سے باندھ دیا تھا اور خود اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ شاید اُسے شدت سے پیاس ستا رہی تھی۔ میں نے دیکھا، اس کے ہونٹ خشک ہو گئے ہیں اور ان پر سپڑیاں سی جم گئی ہیں۔

"شہباز... یہاں قریب کہیں پانی بھی ہے؟" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں... ! تم یہاں بیٹھو۔ میں پانی لاتا ہوں۔" میں نے گٹھری میں سے ایک برتن نکالا اور ندی کی طرف دوڑ پڑا۔

پانی لے کر واپس آیا تو وہ ایک کمبل بچھائے بیٹھی ہوئی تھی اور فاطمہ سے باتوں میں مصروف تھی۔ پانی پینے کے بعد اس نے چند لقمے کھائے اور دوبارہ پانی پینے لگی۔ نہ جانے اُسے کتنی پیاس لگی ہوئی تھی۔

سہ پہر ہو چکی تھی۔

ویرانہ خاموش تھا۔

گھوڑے ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر خاموش کھڑے تھے۔ اگرچہ وہ آپس میں مانوس نہیں ہوئے تھے تاہم انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر غصے کا اظہار کرنا بند کر دیا تھا۔

"شہباز... اِدھر میرے قریب آ جاؤ۔" لڑکی نے کہا۔ "میں تم سے بہت سی باتیں کرنا چاہتی ہوں۔"

میں نے فاطمہ کی طرف دیکھا جو کھانے کے بعد غنودگی سی محسوس کرنے لگی تھی اس لیے میں سوچ رہا تھا کہ باتوں کا سلسلہ اس کے سو جانے کے بعد ہی شروع ہو تو اچھا ہے۔

"فاطمہ... تمہیں نیند آ رہی ہے تو سو جاؤ۔" میں نے لڑکی کو کوئی جواب دینے کی بجائے فاطمہ سے کہا۔

لڑکی نے فاطمہ کو اپنی طرف گھسیٹ لیا اور اُسے گود میں لٹا کر تھپکنے لگی۔ فاطمہ کی نیند سے بھاری پلکیں جلد ہی جھک گئیں اور تھوڑی ہی دیر بعد وہ سکون کی گہری نیند میں ڈوب گئی۔

اس وقت تک میں گٹھری کھول چکا تھا۔

ضرورت کی چیزوں کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کے بعد میں نے اُن کی دو گٹھڑیاں تیار کر دیں... پھر میں نے ایک گٹھری اس لڑکی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اس میں تمہاری ضرورت کی چیزیں رکھ دی ہیں۔ باقی چیزوں کی ہمیں ضرورت پڑے گی۔"

"بیٹھ جاؤ شہباز... اور ان چیزوں کو بھول جاؤ۔" لڑکی نے بڑی محبت سے کہا۔ "میں نے اپنی پوری زندگی میں تم جیسا بہادر بچہ نہیں دیکھا۔ تم نے جس حکمت عملی سے اُن درندوں سے مجھے بچایا ہے، وہ کسی عام بچے سے کبھی ممکن نہ ہوتا۔ مجھے تو اب بھی یوں لگتا ہے جیسے خدا نے تمہیں میرے لیے رحمت کا فرشتہ بنا کر بھیجا ہے۔"

میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

"تم صرف ظاہری حالت میں 'ایک بچے لگتے ہو'" لڑکی میری تعریف میں کہہ رہی تھی... اور مجھے اپنی تعریف سُن کر نہ جانے کیوں شرم سی آنے لگی تھی۔ "لیکن تم ایک مکمل مرد ہو... یہ تو بتاؤ

دونوں بچے محض ایک گھوڑے کے ساتھ، اس ویرانے میں پھر رہے ہو، جہاں دُور دُور کسی بستی کا نام و نشان تک نہیں ہے؟"

میں نے کن انکھیوں سے فاطمہ کی طرف دیکھا۔

وہ گہری نیند سو رہی تھی۔

میں اس کے سامنے کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا... لیکن جب مجھے اطمینان ہو گیا کہ وہ ہماری باتیں نہیں سُن رہی ہے تو میں نے اس خونی صبح کا تفصیل سے احوال، لڑکی کو سُنا دیا جب ہمارے قبیلے کو موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا تھا۔

لڑکی میری باتیں سُن کر یوں بیٹھی رہی جیسے اُسے سکتہ ہو گیا ہو۔ اس کی آنکھوں میں آنسو مچل رہے تھے۔ اُس نے محبت سے فاطمہ کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ "بے چاری بچی!"

میں اس کی محبت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

"اس کا مطلب ہے کہ پورے قبیلے میں سے صرف تم دونوں ہی زندہ رہے ہو؟" کچھ دیر بعد لڑکی نے ایک آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"نہیں... کچھ اور لوگ بھی ہیں۔"

"وہ کہاں ہیں؟"

میں نے اُسے بتایا کہ سردار اور اس کے ساتھ شہر جانے والے زندہ ہوں گے۔ ان کے جانے کے بعد ہی قبیلے پر یہ افتاد آن پڑی تھی۔ "لیکن میں حیران ہوں..." میں نے کہا۔ "اُن لوگوں نے اطلس خان جیسے شہ زور کو بھی موت سے ہمکنار کر دیا۔"

"موت بڑے بڑے شہ زوروں کو پچھاڑ دیتی ہے۔" لڑکی نے دُکھ بھرے لہجے میں کہا۔ "موت سے بڑا شہ زور کون ہو سکتا ہے؟" یہ کہتے ہوئے گہری سوچ میں ڈوب گئی۔

"لیکن اب تم دونوں کہاں جا رہے ہو؟" اُس نے کچھ دیر خیالوں سے نکل کر چونکتے ہوئے پوچھا۔

"ہمارا رُخ اپنے گاؤں گوری کی طرف ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "سردار نے شہر جانے سے پہلے قبیلے کو حکم دیا تھا کہ اب لوگ واپس گاؤں کی طرف سفر شروع کر دیں۔"

"گوری... ! یہ کس طرف ہے؟"

"اس طرف..." میں نے ایک سمت میں اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "پہاڑوں پر... بڑی ہی خوبصورت اور سرسبز وادی ہے۔ اب چونکہ برف پگھلنے لگی ہے اس لیے گوری میں رہنا ممکن ہے۔ قبیلہ موسم سرما گزارنے کے لیے نیچے میدانوں میں گزارتا ہے۔"

لڑکی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"لیکن... ! تم کہاں جاؤ گی؟"

"میں تم دونوں کے ساتھ رہوں گی۔"

"سچ..." میں نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ "لیکن..."

"میرا نام زرینہ ہے۔" اُس نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔ "اور میرا خاندان وادیٔ خوف میں رہتا ہے۔ معلوم نہیں، ان میں سے کوئی زندہ بھی ہے یا نہیں..."

"لیکن تم تو گھوڑے پر سوار، اس طرف چلی جا رہی تھیں؟" میں نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"میری کوئی منزل نہیں ہے۔ میں تو ان درندوں سے بچ نکلی تھی اور پناہ کی تلاش میں بھاگ رہی تھی... لیکن مجھے کیا پتہ تھا کہ کوئی درندہ، میری تاک میں پہلے سے یہاں موجود ہے۔" باتیں کرتے کرتے، وہ یوں خیالوں میں کھو جاتی تھی جیسے بہت کرید کرید کر اور سوچ سوچ کر باتیں کرنا، اُس کی عادت ہو۔

"مجھے وادیٔ خوف سے اغوا کیا گیا تھا اور میں... پہلے فرنگیوں کی قید میں تھی۔" اس نے کچھ دیر بعد سسک کر کہا۔

"فرنگی... وادیٔ خوف..." میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے دُہرایا۔

"ہاں... وادیٔ خوف ایسی جگہ ہے جہاں عام آدمی نہیں پہنچ سکتا اور وہاں جانے کے بعد عموماً کوئی واپس نہیں آ سکتا... لیکن ایک روز چند فرنگیوں اور بے ضمیر لوگوں نے پورے قبیلے پر قبضہ کر لیا۔ انہوں نے فرنگیوں کی خوشنودی کے لیے اپنے ہی بھائیوں کے گلے کاٹ ڈالے اور اپنی عزتوں کو پامال کر دیا۔"

اس کی زیادہ تر باتیں میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں لیکن اس کا اندازِ بیان اتنا متاثر کن تھا کہ میں اس کی باتوں کے غمناک سحر میں ڈوب کر رہ گیا۔

"بستی کی چند عورتوں اور لڑکیوں کو اغوا کیا گیا تھا، اُن میں، میں بدنصیب بھی شامل تھی۔" اُس نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ کر ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔ "نہ جانے میرے بابا کا کیا حال ہو گا؟ وہ تو میرے غم میں پاگل ہو گیا ہو گا... کیا تمہارا باپ بھی شہر جانے والوں کے ساتھ ہے یا...؟" اُس نے آنسوؤں سے بھیگی ہوئی آنکھیں میری طرف اُٹھا کر سوال کیا۔

"میں اپنے بابا کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکتا۔" میں نے دل گرفتہ ہوتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب ...؟" وہ حیران ہوگئی۔ "کیا وہ شہر نہیں گئے؟"

"نہیں ... میرے بابا پاگل ہیں۔" میں نے کہا۔

"اوہ ... لیکن ..."

"جس وقت میں اطلس کی تلاش میں نکلا تھا تو مجھے یقین ہے کہ وہ قبیلے کے باقی لوگوں کے ساتھ ہی تھے ... لیکن جب میں واپس آیا تو وہ، اُن میں موجود نہیں تھے۔"

"اس کا مطلب ہے، تمھیں اُن کی لاش نہیں ملی؟"

"ہاں ... میں نے ایک ایک لاش کو غور سے دیکھا لیکن اُن میں سے کوئی بھی میرے بابا کی لاش نہیں تھی۔"

"کہیں حملہ آور اُنہیں ساتھ تو نہیں لے گئے؟"

"معلوم نہیں ..."

"یا پھر ممکن ہے، وہ خود ہی کہیں چلے گئے ہوں۔"

"ہوسکتا ہے ... بابا کے بارے میں کوئی بھی یقین سے کبھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔" میں نے پُراسرار لہجے میں کہا۔

"اُن کا نام کیا ہے؟" زرینہ نے پُراشتیاق لہجے میں پوچھا۔

"شالیار خان ..."

"ش ش ش ... شا ... لیا ر ... خان؟" وہ چیخ پڑی۔

زرینہ اتنی تیز آواز میں چیخی تھی کہ میں گھبرا گیا۔ فاطمہ بھی چیخ مار کر اُٹھ گئی اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ اطلس بڑے زور سے ہنہنایا تھا اور اُس نے زور زور سے زمین پر پاؤں مار کر بے چینی ظاہر کرنا شروع کردی تھی۔

"کیا تم، شالیار خان کے بیٹے ہو؟" وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ لیکن مجھے اُلجھن تھی کہ آخر وہ میرے بابا کا نام سُن کر یوں چیخ کیوں پڑی ہے؟ میں سوالیہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھتا رہا ... لیکن زرینہ شاید اپنے حواس ہی کھو بیٹھی تھی۔

"اُف ...!" اُس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

"کیا بات ہے، تم میرے بابا کا نام سُن کر ...؟"

"تمھارے بابا زندہ ہیں، شہباز!" اُس نے سرگوشی کی۔

"اوہ ... کہاں ...؟" میں خوشی سے چیخ پڑا۔

"لیکن اُنہیں فرنگیوں نے قید کرلیا ہے۔"

"کیوں؟ ... کب؟" میں خوف اور حیرت سے بولا۔

"میرا خیال ہے، فرنگیوں کا ایک دستہ، اُنہیں گرفتار کرکے کوئل لے گیا ہے۔ وہاں فرنگیوں کی آخری چوکی ہے۔"

"تمھارا مطلب ہے، ہمارے قبیلے کو ڈاکوؤں نے نہیں بلکہ فرنگیوں نے قتل کیا ہے۔" میں نے غصے سے مٹھیاں بھینچ کر کہا۔ مجھے، فرنگیوں سے بے پناہ نفرت تھی کیونکہ ماں ریشم جان نے اُن کے بارے میں مجھے بہت کچھ بتایا تھا۔

"نہیں ... اُن لوگوں کو تو ڈاکوؤں ہی نے لُوٹا تھا، پھر سب کو قتل کردیا۔" زرینہ نے کہا۔ "مجھے یاد ہے، جن لوگوں نے مجھے اغوا کیا تھا، وہ شالیار خان کے بارے میں باتیں کررہے تھے۔"

فاطمہ ایک بار پھر سوگئی تھی۔

اطلس بھی پُرسکون ہوگیا تھا۔

... لیکن زرینہ نے میرے دل و دماغ میں آندھیاں سی چلادی تھیں ... اور میں یوں محسوس کررہا تھا جیسے میرے سینے میں کوئی ننھا سا پرندہ بُری طرح پھڑپھڑانے لگا ہے۔

"جن ڈاکوؤں نے قبیلے پر حملہ کیا تھا، اُن میں سے ایک نے شالیار خان کو پہچان لیا تھا۔ شالیار خان کی گرفتاری کے لیے حکومتِ برطانیہ نے بہت بڑا انعام مقرر کیا تھا۔ اس لیے اُسے قتل نہیں کیا گیا اور ڈاکو اُسے ساتھ لے گئے ... پھر انہوں نے اُسے، فرنگیوں کے حوالے کردیا ... اور فرنگی تمھارے بابا کو اپنی چوکی پر لے گئے ہیں، جہاں سے اُنہیں، نہ جانے کہاں لے جائیں۔"

"اوہ ..." میں نے غصے سے دانت پیس کر کہا۔ "یہ کوئل کہاں ہے؟"

"بہت دُور، ننھے لڑکے ... بہت دُور ... تمھاری پہنچ سے بہت دُور۔" وہ سسکیاں بھرتے ہوئے بولی۔

"میں وہاں جانا چاہتا ہوں۔"

"تم وہاں کبھی نہیں پہنچ سکتے۔"

"کیوں نہیں پہنچ سکتا؟" میں چیخ پڑا۔

زرینہ نے فاطمہ کو کمبل پر لٹا دیا اور میرا ہاتھ تھپتھپانے لگی۔ اُس نے دیر تک مجھے سمجھایا اور قائل کرنے کی کوشش کی کہ اپنے بابا کو فرنگیوں کی قید سے رہا کرانا ایک ناممکن کام ہے۔ اُس نے مجھے یہ اُمید بھی بندھائی کہ چونکہ میرے بابا پاگل ہیں، اس لیے ہوسکتا ہے کہ فرنگی اُنہیں چھوڑ دیں ... لیکن میں ان باتوں سے بہلنے والا نہیں تھا۔ فرنگیوں کے مظالم کی جو داستانیں میں نے ریشم جان سے سُنی تھیں، اُن کی روشنی میں، میرے دل کو یہ بات کسی طرح بھی نہیں لگتی تھی کہ میرے بابا پر رحم کھا کر اُنہیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چھوڑا بھی جاسکتا ہے۔

جب سے زرینہ نے مجھے بابا کے بارے میں بتایا تھا، میرے دل پر غم کی ایک چٹان سی بیٹھ گئی تھی جس نے میرے دل کو بُری طرح کچلنا شروع کردیا تھا ... مجھے سانس لینے میں بھی دشواری ہورہی تھی۔ بار بار حلق خشک ہوجاتا تھا اور کانٹوں کی چبھن مجھے بے حال کرنے لگتی تھی۔ میں بُری طرح تڑپ رہا تھا ... لیکن بے بس تھا۔

ڈاکوؤں اور فرنگیوں سے نفرت شروع ہی سے میرے دماغ میں جڑ پکڑ چکی تھی۔ ان باتوں نے مجھے غم و غصے سے دیوانہ بنا دیا۔ میں نے آنکھیں سختی سے بھینچ لیں اور دل ہی دل میں عہد کیا کہ میری پوری زندگی، فرنگیوں اور ڈاکوؤں کے خون سے ہولی کھیلتے ہوئے گزرے گی۔

شام کے سائے ڈھل رہے تھے۔

یہ ایک پُرسکون جگہ تھی۔ اس لیے ہم نے رات یہیں گزارنے کا ارادہ کرلیا تھا ... زرینہ دیر تک مجھے، فرنگیوں اور ڈاکوؤں کے مظالم کی داستانیں سُناتی رہی ... اور پھر نہ جانے کب وہ بولتے بولتے خود ہی اُونگھ گئی۔ میں جاگتا رہا ... اور آسمان اپنی روشن آنکھوں سے میری بے قراری کو رات بھر دیکھتا رہا۔

* * *

اگلے روز صبح ہی سے مطلع ابر آلود ہوگیا۔

دن بھر سفر کرتے رہے۔ بادلوں کی وجہ سے ہم دھوپ کی شدت سے تو محفوظ رہے لیکن ہر لمحے یہی سوچ سوچ کر دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوتی رہیں کہ طوفان آگیا تو یہاں دُور دُور تک ہمیں سر چھپانے کی بھی جگہ نہیں ملے گی۔

زرینہ بے حد فکر مند تھی۔

فاطمہ البتہ چہک رہی تھی۔ زرینہ کی آمد کے بعد سے اس کے چہرے کی زردی ڈھل گئی تھی اور وہ بے پناہ باتیں کرنے لگی تھی ... لیکن چونکہ یہ ساری باتیں زرینہ سے ہورہی تھیں، اس لیے مجھے ذرا بھی بُرا نہیں لگ رہا تھا ... بلکہ مجھے تو خوشی تھی کہ اس کی وحشت دُور ہوگئی ہے۔

بادلوں کی وجہ سے ہوا میں خنکی تھی۔

اندھیرا پھیلنے تک خاصی ٹھنڈ ہوگئی۔ اچانک اطلس ہنہنایا۔ زرینہ کا گھوڑا بھی اس کی تقلید میں ہنہنایا تو میں نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ کچھ فاصلے پر ہریالی تھی اور درختوں کا ایک جھنڈ نظر آرہا تھا۔

درختوں اور ہریالی کو دیکھ کر دونوں گھوڑوں کی بھوک چمک اُٹھی تھی۔

درختوں کی موجودگی سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہاں پانی بھی یقیناً موجود ہوگا۔ میں اطلس پر سوار تھا۔ زرینہ نے مجھے اٹھا کر اس پر سوار کرایا تھا۔ فاطمہ اس کے ساتھ گود میں بیٹھی تھی۔ میں نے اطلس کا رُخ ان درختوں کی طرف موڑ دیا۔

جھاڑیوں اور درختوں کا یہ سلسلہ پہاڑیوں میں تھا اور مجھے چٹانوں میں کسی قدرتی غار کی تلاش تھی ... لیکن مجھے جو جگہ دکھائی دی، اس پر نظر پڑتے ہی میں خوشی سے اچھل پڑا۔

میرے سامنے جو غار تھا اُسے دیکھ کر احساس نہیں ہوتا تھا کہ اُسے کسی انسان نے بنایا ہوگا۔ اس کا چونکہ دروازہ بھی تھا۔ اس لیے یہی سمجھا جاسکتا تھا کہ کوئی وہاں رہتا رہا ہے۔ اس غار کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اسے عام راستے سے نہیں دیکھا جاسکتا ہے۔ جن دنوں میں درخت پتّوں سے لد جاتے ہیں، ان دنوں میں تو یہ انسانی آنکھ سے بالکل ہی اوجھل ہوجاتا ہوگا۔

اس غار کو دیکھ کر زرینہ نے اطمینان کی گہری سانس لی۔

اس کے چہرے پر اب بھی حزن و ملال کے تاثرات تھے لیکن ان میں پہلے جیسی سختی اور انجماد نہیں تھا۔ میری اور فاطمہ کی موجودگی نے اسے بڑا سہارا دیا تھا۔ رات جو باتیں ہوئی تھیں، ان کے بعد اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ بھی ہمارے ساتھ ہی گھوری جائے گی۔

اسے رات بھر دھڑکا لگا رہا تھا کہ کہیں حاتم خان واپس نہ آجائے۔ وہ جس انداز میں فرار ہوا تھا، اُسے ذہن میں رکھتے ہوئے میں نے سوچا تھا کہ وہ واپس آنے کی ہمت نہیں کرے گا ... لیکن جرائم پیشہ لوگوں کے بارے میں کوئی بات بھی تو یقین سے نہیں کی جاسکتی۔ وہ اپنے ساتھیوں کو لے کر ہمارے تعاقب میں آسکتا تھا ... لیکن گزشتہ رات اور آج کا پورا دن بیت گیا اور میں نے اطلس یا دوسرے گھوڑے کو ذرا سی بھی بے چینی ظاہر کرتے نہیں دیکھا تھا۔ گویا کوئی ہمارا تعاقب نہیں کررہا تھا اور آس پاس کوئی خطرناک چیز بھی موجود نہیں تھی۔

تربیت کے دوران میں ریشم جان نے مجھے بہت سی باتیں سکھائی تھیں۔ مثال کے طور پر میں صحرا یا ویرانے میں سفر کرتے ہوئے آسانی سے اندازہ لگا سکتا تھا کہ پانی کہاں مل سکتا ہے اور پانی کی تلاش کے لیے کس پرندے کا تعاقب کرنا چاہیے۔ شہد کی مکھیاں عموماً پانی کے آس پاس ہی رہتی ہیں۔ اس کے علاوہ درندوں سے نمٹنے کے لیے تو مجھے خاص طور سے تربیت

دی گئی تھی۔ سانپ، بچھو اور دوسرے زہریلے کیڑوں کا مقابلہ کرنا میرے لیے کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ اس کے علاوہ مجھے چند ایسی جڑی بوٹیوں کے بارے میں بھی بتایا گیا تھا جن سے ان زہریلے جانوروں کے کاٹے کا علاج کیا جا سکتا تھا۔

میں نے غار کا دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔

اندر کوئی نہیں تھا۔

کچھ سامان موجود تھا جسے دیکھ کر یہ اندازہ ہو گیا کہ یہاں کوئی سیاح مقیم رہا ہے۔ ممکن ہے وہ کوئی فرنگی ہی رہا ہو۔ کیونکہ جو برتن نظر آ رہے تھے انہیں میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس غار میں ایک طرف آتش دان بھی بنا ہوا دکھائی دیا جس سے غار کی چھت میں اس انداز میں پتھر جمائے گئے تھے کہ وہاں موجود دھوئیں کے لیے سوراخ نظر نہیں آتا تھا۔

ایک چھوٹی سی کلہاڑی اور چند خشک لکڑیاں بھی وہاں موجود تھیں۔ میں نے غار کا جائزہ لینے کے بعد آس پاس کے علاقے کا گہری نگاہ سے جائزہ لیا۔ دُور دُور تک کسی متنفس کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ میں واپس آیا تو زرینہ غار کو صاف کر چکی تھی اور اس نے کونے میں پڑی ہوئی خشک گھاس کا بستر بھی تیار کر دیا تھا۔ آتش دان میں خشک لکڑیاں رکھ کر اس نے آگ جلا دی تھی جس سے ٹھٹھری ہوئی غار میں حرارت کی لہر دوڑ گئی تھی۔

چونکہ کافی اندھیرا ہو گیا تھا اس لیے میں کوئی جانور شکار نہ کر سکا ورنہ یہاں اطمینان سے گوشت بھون کر کھایا جا سکتا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا کہ اگر طوفانی کیفیت ختم نہ ہوئی تو میں ان دونوں کو یہاں مزید ایک دو روز رکنے کے لیے کہوں گا۔ میرا خیال تھا کہ اس سے بہتر پناہ گاہ ہمیں کہیں اور نہیں مل سکے گی۔

اطلس اور دوسرے گھوڑے کو غار کے باہر چھوٹی سی میدانی جگہ باندھ دیا لیکن ان کی رسیاں اتنی ڈھیلی رکھیں کہ وہ اطمینان سے چر سکتے تھے۔ بادلوں کی وجہ سے شام ہوتے ہی اندھیرا پھیل گیا تھا اور پھر ہلکی ہلکی بوندا باندی بھی شروع ہو گئی۔

نادر خان کے پڑاؤ سے چلتے وقت جو کچھ ہاتھ لگا تھا اس میں غذائی ضرورت کی اشیا بس اتنی ہی تھیں کہ آج رات ہی گزاری جا سکتی تھی۔ میں مطمئن تھا کہ یہاں آس پاس شکار مل جائے گا اس لیے اس سلسلے میں کسی کو بھی تشویش نہ ہوئی۔ پانی بھی موجود تھا اور اطلس کے لیے ہریالی کی بھی کمی نہیں تھی۔

آتش دان میں جو لکڑیاں جل رہی تھیں ان کے چٹخنے سے بعض اوقات بڑی عجیب عجیب آوازیں پیدا ہوتی تھیں۔ فاطمہ اب بھی زرینہ ہی کے قریب بیٹھی تھی۔ غار میں چند پرانے کپڑے بھی پڑے تھے، جنہیں زرینہ نے بستر بنانے میں استعمال کر لیا تھا۔

دن بھر سرد ہوا سے ٹھٹھرنے کے بعد پہلی بار قدرے حرارت نصیب ہوئی تو میں بھی اونگھنے لگا۔ کبھی کبھی دروازے کے نیچے سے ٹھنڈی ہوا کا کوئی جھونکا اندر آ جاتا تو وہ خوش گوار لگتا تھا کیونکہ ہم گرم ہو چکے تھے۔

"ہم اپنے گاؤں کب پہنچیں گے، شہباز؟" فاطمہ کی آواز سن کر میں اونگھتے اونگھتے چونک پڑا۔ میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک بار پھر فکرمندی پیدا ہو گئی تھی۔

"بہت جلد..." میں نے جواب دیا۔

"ماں وہاں ہوگی، نا... شہباز؟"

"میرا خیال ہے، وہ وہاں پہنچ چکی ہوگی۔" میں نے جواب دیا اور یہ جھوٹ بولتے ہوئے مجھے بے پناہ دکھ ہو رہا تھا کیونکہ اس بے چاری کو معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ بھری دنیا میں بالکل تنہا رہ گئی ہے۔

زرینہ نے میری طرف دیکھا۔

میں نے منہ پھیر لیا۔

زرینہ نے اُسے چمٹا لیا اور تھپک تھپک کر سلانے کی کوشش کرنے لگی: "سو جاؤ! باہر طوفان آ رہا ہے۔" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ غالباً وہ بھی دل گرفتہ ہو گئی تھی۔

ریشم جان نے مجھے ہدایت کی تھی کہ کبھی عورت کے آنسوؤں سے متاثر نہیں ہونا چاہیے... لیکن زرینہ اور فاطمہ کے آنسو دیکھ کر نہ جانے کیوں خود میرا بھی رونے کو جی چاہنے لگتا تھا... لیکن میں اپنی آنکھ میں آنسو نہیں آنے دے سکتا تھا۔ اس سلسلے میں ریشم جان نے مجھے ہمیشہ سخت سزائیں دی تھیں۔

باہر واقعی طوفان آ گیا تھا۔

تیز ہوا کی تیز سیٹیاں سنائی دینے لگی تھیں۔

میں پریشان ہو کر اٹھ بیٹھا۔ مجھے اطلس کا خیال آ گیا جو باہر طوفان میں کھڑا تھا۔ میں نے ادھر اُدھر دیکھا لیکن غار میں اتنی گنجائش نہیں تھی کہ کوئی گھوڑا اس میں داخل ہو سکتا۔

باہر آ کر میں نے اطلس کی طرف دیکھا۔

اس نے میری موجودگی پر کان کھڑے کیے اور دھیمی سی ہنہناہٹ کے بعد زمین پر پاؤں مارنے لگا۔ میں نے قریب جا کر اس کے منہ پر ہاتھ پھیرا۔ جب وہ مطمئن ہو گیا تو میں غار میں واپس آ گیا۔ دن بھر کی تھکی ماندی زرینہ اور فاطمہ گہری نیند سو چکی تھیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے سونے کی بہت کوشش کی لیکن نیند میری آنکھوں سے کوسوں دُور تھی۔ میں اپنے بابا کے بارے میں سوچ رہا تھا جو اس وقت فرنگیوں کی قید میں تھے۔ نہ جانے یہ سفید چمڑی والے ان کے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہوں گے۔

میں دیر تک نہ جانے کیا کیا سوچتا رہا۔

نیند نہیں آ رہی تھی اور باہر ہوا ان گنت سانپوں کی طرح پھنکارتی ہوئی آوازوں کے ساتھ چل رہی تھی۔ کافی رات گئے اچانک مجھے اطلس کی دھیمی سی ہنہناہٹ سنائی دی۔

میں چونک کر اٹھ بیٹھا۔

وہ بے چین تھا۔

نہ جانے کیا بات ہے، میں نے سوچا۔ وہ طوفان اور بارش کی وجہ سے پریشان ہو رہا ہے یا کوئی دوسری بات ہے؟ میں نے دیوار کی طرف دیکھا جہاں رائفل رکھی ہوئی تھی۔ اس رائفل کو زرینہ نے نادر خان کے پڑاؤ سے فرار ہوتے وقت اٹھایا تھا۔

رائفل اٹھا کر میں اٹھ کھڑا ہوا۔

دروازہ کھولنے کے بعد میں باہر آ گیا۔ باہر ہوا اتنی تیز تھی کہ آنکھیں کھولنا مشکل ہو رہی تھیں۔

اطلس نے ایک بار پھر زمین پر پاؤں مارے۔

میں نے قریب پہنچ کر اُسے تھپتھپایا۔

"ہمت سے کام لو اطلس..." میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ "تم ہم سے زیادہ بڑے اور طاقت ور ہو۔ اس لیے ایسے طوفانوں کا آسانی سے مقابلہ کر سکتے ہو۔ اندر اتنی جگہ نہیں ہے کہ تمہیں بھی وہاں رکھا جا سکے۔ اس گھوڑے کو دیکھو۔ ذرا بھی بے چینی نہیں ظاہر کر رہا ہے۔"

میں نے قریب پہنچ کر اُسے تھپتھپایا۔

وہ یوں ساکت و جامد کھڑا تھا جیسے گوشت پوست کا نہیں بلکہ مٹی کا گھوڑا ہو۔ ڈاکوؤں کے ساتھ رہ کر غالباً وہ ایسے موسموں کا عادی ہو چکا تھا۔ اس لیے اسے کوئی خاص فرق نہیں پڑ رہا تھا۔

ابھی میں اطلس کے قریب کھڑا اس کے منہ پر پیار سے ہاتھ ہی پھیر رہا تھا کہ اچانک اس نے گردن اُٹھائی۔ اس کا انداز چونکنے والا تھا۔ میں بھی چونکے بغیر نہ رہ سکا۔

میں نے ادھر اُدھر دیکھا۔

کوئی چیز نظر نہیں آ رہی تھی۔

اطلس کے کان کھڑے ہو گئے تھے اور اس نے وقفے وقفے سے گھومنا شروع کر دیا تھا جیسے وہ کوئی خاص آواز سننے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے اس کے چونکنے پر حیرت ہو رہی تھی کیونکہ ہواؤں کے شور اور بارش کی وجہ سے کوئی اور آواز سنائی دینا ممکن ہی نہیں تھی۔ کم از کم مجھے تو کوئی ایسی آواز نہیں آ رہی تھی۔

"کچھ نہیں ہے، دوست۔ اطمینان سے آرام کرو۔" میں نے دوبارہ اس کے منہ پر پیار سے ہاتھ پھیرا... اور پھر اس کی رسی تھوڑی سی اور ڈھیلی کر دی۔

اچانک میں نے بھی وہ آواز سن لی جسے مجھ سے پہلے شاید اطلس نے بھی سن لیا تھا۔ میرا ہاتھ رائفل پر سخت ہو گیا۔ خوب گھنے درخت کے نیچے یہ ایک چھوٹی سی میدانی جگہ تھی جسے غار میں رہنے والے نے غالباً اصطبل کے لیے ہی تیار کیا تھا۔ یہاں بارش کی بوندیں تھوڑی تھوڑی ٹپک رہی تھیں۔

میں رائفل ہاتھ میں لیے کھڑا رہا۔

آتے وقت میں غار کا دروازہ بند کر آیا تھا تاکہ زرینہ اور فاطمہ بے آرام نہ ہوں۔ وہ آواز اب سنائی نہیں دے رہی تھی۔ جب کوئی دیر تک اس آواز کو دوبارہ نہ سنا تو مجھے شبہ ہونے لگا کہ کہیں میں نے ہوا کی آوازوں سے دھوکا تو نہیں کھایا۔

...لیکن یہ دھوکا نہیں تھا۔

میں نے آواز یقیناً سنی تھی۔

میری نگاہ اطلس پر جم گئی۔ اس نے یقیناً اسی لیے گردن اُٹھائی تھی اور کان کھڑے کیے تھے جب میں نے وہ آواز سنی تھی۔ وہ آواز ایک بار پھر سنائی دی۔

یہ آواز چونکہ بہت دُور سے آئی تھی اس لیے بے حد مدھم تھی۔ نہ جانے یہ آواز نکالنے والا یہاں سے کتنے فاصلے پر تھا۔ بہرحال ہوا کے تیز جھونکوں پر سفر کر کے آواز ہم تک پہنچ گئی تھی۔ دوسری بار آواز سنائی دی تو مجھے یقین ہو گیا کہ آس پاس کوئی بھیڑیا موجود ہے۔

اس بار جیسے ہی بھیڑیے کی آواز سنائی دی، اس کے فوراً ہی بعد ویسی ہی ایک آواز دوسری سمت سے بھی آئی جیسے کسی بھیڑیے نے پہلی آواز کا جواب دیا ہو۔ میں یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ کہیں ان بھیڑیوں نے گھوڑوں کے قدموں کی بو سونگھ سونگھ کر اس غار کی طرف تو نہیں بڑھنا شروع کر دیا؟

بھیڑیوں کے سلسلے میں مجھے ریشم جان نے خصوصی تربیت دی تھی۔ میں ایسی آوازیں نکال سکتا تھا کہ بھیڑیے خوف زدہ ہو کر دُور بھاگ جاتے... لیکن اس کا انحصار بھیڑیوں کی تعداد پر تھا۔ اگر یہ ان کا کوئی غول ہے تو میری آوازیں انہیں خوف زدہ نہیں کر سکتیں۔ میں یہ سوچ کر پریشان ہو گیا۔

میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔

میں حیران تھا کہ اگر بھیڑیوں کا غول حملہ آور ہو گیا تو کیا ہو گا۔ ایک دو رائفلوں سے بھیڑیوں کے غول کا مقابلہ کرنا کسی پہاڑ کو سر سے ٹکرا کر گرانے کے مترادف تھا۔ میں نے دوڑ کر غار کے دروازے کا جائزہ لیا۔ اس دروازے کو اگر اندر سے مضبوطی کے ساتھ بند کر دیا جائے تو خاصا مضبوط دروازہ تھا۔ بھیڑیے غار میں داخل نہیں ہو سکتے تھے... لیکن دونوں گھوڑوں کو ان کی دسترس سے دُور رکھنا ممکن نہیں تھا۔

دو چار بھیڑیوں کی بات ہوتی تو میں زیادہ پروا نہ کرتا کیونکہ اطلس ان سے نمٹ سکتا تھا... پھر اس کی مدد کے لیے دُوسرا گھوڑا بھی موجود تھا۔ دونوں مل کر ان کا مقابلہ کر سکتے تھے... لیکن غول در غول آنے والے بھیڑیے کسی ایسے سیلاب کی طرح ہوتے ہیں جو راستے کی ہر چیز کو تہس نہس کر کے چلا جاتا ہے۔

بھیڑیے زیادہ تعداد میں ہوں تو اُن کو خوف زدہ کرنا بھی ممکن نہیں ہوتا۔ ان کا مقابلہ کرنا تو دُور کنار، اُن کے سامنے چند لمحے ٹھہرنا بھی موت کو دعوت دینے کے مترادف ہوتا ہے۔ اگر یہ غول حملہ آور ہو گیا تو اطلس اور دوسرے گھوڑے کی زندگی کی ضمانت نہیں دی جا سکتی تھی۔

میں یہ سوچ کر ہی اداس اور پریشان ہونے لگا کہ اطلس کے بغیر ہم لوگ اپنا سفر کیسے جاری رکھیں گے؟ اس طرح تو بعد میں ہمیں بھی ایڑیاں رگڑ رگڑ کر یہیں مرنا ہو گا۔

اطلس بے چین تھا۔

اس کی بے چینی بجا تھی لیکن میں نے اس کے منہ پر تھپکی دیتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا: "پریشان ہونے کی ضرورت نہیں اطلس! یہ بھیڑیے تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ میں ان کے لیے کوئی ترکیب سوچنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

گھوڑا میرے ہاتھ کو چاٹنے لگا جیسے اُسے اطمینان ہو گیا ہو کہ میں اس کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کر گزروں گا۔ میں دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ وہاں رُک کر میں نے پھر کوئی آواز سننے کی کوشش کی لیکن اب صرف تیز جھکڑوں کی سائیں سائیں ہی سماعت تک پہنچ رہی تھی۔ کسی بھیڑیے کی آواز دوبارہ سنائی نہیں دی۔

میں نے سرِ شام ہی کچھ خشک لکڑیاں بھی جمع کر لی تھیں اور انہیں میں نے آتش دان کے قریب ہی ڈال دیا تھا۔ میں نے چند موٹی موٹی لکڑیاں آتش دان میں ڈال دیں اور ان کے جلنے کا انتظار کرنے لگا۔

فاطمہ سو رہی تھی۔

زرینہ کی آنکھیں بھی بند تھیں لیکن اس کے چہرے پر فاطمہ جیسا سکون نہیں تھا۔ وہ سوتے میں بار بار ہونٹ بھینچ رہی تھی جیسے مارے خوف کے اس کے لبوں پر کپکپاہٹ طاری ہو گئی ہو۔ یا پھر وہ کوئی ایسا خواب دیکھ رہی تھی جس کا تعلق ماضی کے ان مظالم سے تھا جو اُس جیسے انسانوں نے اپنی طاقت اور درندگی کے باعث اس پر ڈھائے تھے۔

اس نے اپنے بارے میں مجھے بہت سی باتیں بتائی تھیں لیکن میں بیشتر باتوں کو نہیں سمجھ سکا تھا۔ میں نے اس سے دو چار مرتبہ یہ بھی پوچھا کہ آخر ڈاکو خوبصورت لڑکیوں کو کیوں اٹھا لے جاتے ہیں۔ اس سوال کے جواب میں اُس نے کچھ نہیں کہا۔ بس آنکھیں سختی سے بھینچ لی تھیں اور کانپنا شروع کر دیا تھا۔

میں نے آتش دان میں جو لکڑیاں ڈالی تھیں، انہوں نے آگ پکڑ لی تھی اور ان کی وجہ سے غار میں نہ صرف اُجالا پھیل گیا تھا بلکہ گرمی بھی بڑھ گئی تھی۔ میں نے دیوار پر رقص کرتے ہوئے ان سایوں کو دیکھنا شروع کر دیا جو شعلوں کی وجہ سے پیدا ہو رہے تھے۔

ان سایوں کا رقص بے حد بھیانک محسوس ہو رہا تھا۔ میں دیر تک انہیں گھورتا رہا۔ اس دوران میں بار بار میرے ذہن میں بابا شاہ یار کا خیال آیا۔ جب بھی اُس کا خیال میرے دل میں کچوکا لگاتا میں ایک بار پھر نئے عزم کے ساتھ یہ عہد کرتا کہ فرنگیوں اور ڈاکوؤں سے ہمیشہ نفرت کرتا رہوں گا... اور ان سے انتقام بھی لوں گا۔ ایک مسلسل انتقام... ایسا سوچتے ہوئے میری مٹھیاں بھینچ جاتی تھیں اور میں مارے غصے کے کانپنے لگتا تھا۔

باہر سے اطلس کی ٹاپیں سنائی دینے لگیں۔

وہ ہنہنانے لگا۔

میں نے غار کے دروازے کی طرف دیکھا اور پھر رائفل کو ہاتھ میں لے لیا۔ خاصی وزنی رائفل تھی لیکن میں اسے استعمال کر سکتا تھا۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ زرینہ اور فاطمہ کو بھی جگا دوں اور انہیں بتا دوں کہ بھیڑیوں کا خطرہ بڑھتا جا رہا ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیکن پھر یہ سوچ کر خاموش ہو رہا کہ جب ایسا ہو گا، تب دیکھا جائے گا۔ فی الحال تو انہیں اطمینان سے سوتے رہنے دیا جائے۔

رائفل ہاتھ میں لیے میں باہر آیا۔

دروازہ بند کر کے میں نے اطلس کی طرف دیکھا۔

اطلس کے حلق سے ایسی آوازیں نکل رہی تھیں جیسے وہ بے حد غصے میں ہو۔ میں نے ادھر اُدھر دیکھا اور پھر میرا دل شدت سے دھڑکنے لگا۔ اب میں انہیں واضح طور پر دیکھ سکتا تھا۔

بھیڑیے وہاں پہنچ گئے تھے۔

میں نے غور سے دیکھا۔ یہ بہت بڑے بڑے بھیڑیے تھے۔ ان میں سے ایک تو زیادہ سے زیادہ تیس قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ اس کی روشن آنکھیں اسی طرف گھور رہی تھیں جہاں گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔ اطلس نے بھی اس کی موجودگی کو نہ صرف محسوس کر لیا تھا بلکہ وہ بھیڑیوں کے ارادوں سے بھی آگاہ ہو چکا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ جواباً غصے کا اظہار کر رہا تھا۔

اس کی سانسیں پھنکاروں جیسی تھیں۔

وہ بار بار سامنے والے پیروں کو زمین پر پٹخ رہا تھا۔

میں سوچ رہا تھا کہ ان بھیڑیوں کو خوف زدہ کر کے بھگا دینا چاہیے۔ اس کے لیے میرے پاس دو تین ذرائع تھے لیکن ان میں سے ایک بھی ذریعہ ایسا نہیں تھا جس پر زیادہ دیر تک انحصار کیا جا سکتا۔ مجھے بھیڑیوں کی خصلت معلوم تھی اس لیے میں ان کی طرف سے خاصا فکر مند ہو گیا تھا۔

بھیڑیوں کو گھوڑوں پر حملہ کرتے ہوئے میں دو ایک بار دیکھ چکا تھا۔ جب یہ غول در غول ہوں تو کسی خوف کا شکار نہیں ہوتے اور اگر ان کی تعداد کم ہو تو دو تین بھیڑیے گھوڑے کی پشت سے آگے بڑھتے ہیں، وہ اُس سے اتنا فاصلہ برقرار رکھتے ہیں کہ گھوڑا دولتی نہ مار سکے... لیکن وہ اس سے دُور رہنے کے باوجود موقع پا کر جھپٹ پڑنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ اسی دوران دو تین بھیڑیے گھوم کر سامنے سے آتے ہیں۔ گھوڑے کو بیک وقت سامنے اور عقب سے حملہ کرنے والوں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے اس لیے عموماً وہ اسی جلد بازی یا کوتاہی کے باعث مارا جاتا ہے۔

جو بھیڑیے سامنے سے آتے ہیں، وہ عموماً گھوڑے کی گردن اور گلے کو بھنبھوڑ ڈالنے کا موقع تلاش کرتے ہیں۔ یوں سامنے یا عقب سے آنے والوں میں سے جس کسی کو بھی موقع ملتا، وہ گھوڑے کی توجہ حاصل کر لیتا اور دوسرے بھیڑیے اچانک ہی گھوڑے پر پل پڑتے ہیں۔

میں نے رائفل کی نال اٹھا دی۔

ایک گولی چلائی جا سکتی تھی۔

اس سے ایک یا دو کو مارا جا سکتا تھا اور باقی دھماکے سے خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹ سکتے تھے لیکن یہ تاثر زیادہ دیر تک برقرار نہیں رہ پاتا۔ میرے پاس زیادہ گولیاں نہیں تھیں۔ یہ رائفل بھی ایسی تھی کہ اس سے ایک وقت میں صرف ایک ہی گولی چلائی جا سکتی تھی۔

میں نے حلق سے بھیڑیوں کی وہ مخصوص آواز نکالنا شروع کر دی جو انتہائی خوف اور خطرے کی حالت میں ان کے حلق سے نکلتی ہے۔ یہ آواز سُن کر اطلس بڑی زور سے اچھل پڑا۔ اگر میں ہوشیار نہ ہوتا تو شاید میں اس کی دونوں عقبی ٹانگوں کا شکار ہو گیا ہوتا۔

میری آوازوں پر آس پاس موجود بھیڑیوں میں بھگدڑ مچ گئی اور وہ تیزی سے اسی انداز میں چیختے ہوئے پلٹ کر دوڑنے لگے۔ تھوڑی ہی دیر میں میدان صاف تھا۔

میں نے اطلس کے قریب جا کر اس کے منہ کو پیار سے سہلانا چاہا لیکن وہ بدکا ہوا تھا اس لیے بُری طرح اچھلنے کودنے لگا۔ دوسرا گھوڑا بے حد خوف زدہ تھا۔ اس کے حلق سے ایسی گھٹی گھٹی آوازیں نکل رہی تھیں جیسے ابھی کوئی پل میں اُسے ذبح کیا جانے والا ہو۔ اس کی آوازوں کا اطلس پر بُرا اثر پڑ رہا تھا اس لیے میں نے اطلس کے قریب جانے کا خطرہ مول نہیں لیا بلکہ دُور کھڑا اُس سے باتیں کرتا رہا۔

وہ کافی دیر تک بھڑکا رہا۔ میرے منہ سے بھیڑیوں کی آوازیں اس کے لیے تشویش آمیز رہی تھیں... لیکن میری باتوں نے بالآخر اسے رام کر ہی لیا۔ وہ انسانی زبان تو نہیں سمجھتا تھا لیکن اس میں لہجے سے مفہوم سمجھنے کی صلاحیت تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اطلس ایک قیمتی اور نایاب گھوڑا تھا۔ ڈاکو اس کے لیے یوں ہی تو پریشان نہیں ہو گئے تھے۔ اس کو حاصل کرنے کے لیے انہوں نے جس بے قراری کا اظہار کیا تھا، وہ فطری تھا۔ ایسا گھوڑا اگر کسی جرائم پیشہ شخص کے پاس ہو تو اس سے بہتر ساتھی شاید کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ خود ہماری زندگی کا دارومدار زیادہ تر اطلس ہی پر تھا۔ وہ نہ ہوتا تو شاید ہم کسی ویرانے میں بھوک پیاس سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر رہے ہوتے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اطلس قدرے سنبھل گیا تو میں آہستہ آہستہ اس کے قریب چلا گیا۔ اس بار اطلس نے مجھ کو نہیں پہچانا۔ میں نے اُسے پُرسکون کر دیا لیکن میری بے چینی ختم نہیں ہوئی تھی۔

گھوڑا پھر ہنہنانے لگا۔

دُوسرے گھوڑے کے حلق سے بھی گھُٹی گھُٹی آوازیں نکلنے لگیں۔

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔

بھیڑیے واپس آ گئے تھے۔

ایک بھیڑیا تو کافی قریب آ چکا تھا۔ اس نے شاید دُوسرے گھوڑے کی ڈری ڈری آوازیں سُن لی تھیں اور اُن سے غلط فہمی میں مبتلا ہو گیا تھا۔ وہ اسی گھوڑے کی پُشت پر آیا اور لگے ہی لمے گھوڑے نے ہنہنا کر جو دو لتی ماری تو بھیڑیا حلق سے دم توڑتی ہوئی آوازیں نکالتا ہُوا فضا میں بلند ہو گیا اور کافی فاصلے پر جا کر دو بھیڑیوں کے قریب ایسے گرا کہ پھر نہ اُٹھ سکا۔

اس دوران میں میری پُشت سے دو بھیڑیے آئے لیکن وہ اپنے ساتھی کا انجام دیکھ کر نہ صرف رُک گئے۔۔ بلکہ اس کی آواز سُن کر چند قدم پیچھے ہٹنے پر بھی مجبور ہو گئے۔

ابھی تک صورتِ حال غالباً ان کی سمجھ میں نہیں آئی تھی اس لیے وہ دُور ہی دُور تھے۔ وہ اس غار کے قریب محض گھوڑوں کی اور ہماری بُو سُونگھ کر پہنچے تھے ورنہ محض دیکھ کر ہمارا پتہ چلانا جھاڑیوں کے اس پار سے مشکل ہی نہیں ناممکن بھی تھا۔

چٹان کے اردگرد میدانی جگہ سے بھیڑیوں کے ہیولے غائب ہو گئے۔ وہ اب تک دو بار پسپا ہوئے تھے۔ ایک بار میرے حلق سے آوازیں سُن کر اور دُوسری بار اپنے ایک ساتھی کی موت کا منظر دیکھ کر۔۔۔ لیکن انھیں زیادہ دیر تک خوف سے دُور نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ بھیڑیوں کا یہ غول بھوکا تھا اور بھوکے بھیڑیے تو یُوں بھی اندھا دھند ٹوٹ پڑنے کے سلسلے میں بدنام ہوتے ہیں۔

میں نے آسمان کی طرف دیکھا درختوں کی گھنی شاخوں اور پتّوں کی وجہ سے آسمان نظر نہیں آ رہا تھا۔ غار کے قریب جا کر میں نے اُوپر دیکھا تو اکا دُکا ستارہ ٹمٹماتا ہُوا نظر آیا۔ بادل تیزی سے چھٹ رہے تھے لیکن ابھی تک بُوندیں برس رہی تھیں۔

صبح ہونے میں ابھی نہ جانے کتنے گھنٹے باقی تھے۔

میرا دل بار بار گھوڑوں کے خیال سے کانپ جاتا تھا۔ ان کی حفاظت کرنا مشکل ہوتی جا رہی تھی۔ کاش! جلدی سے صبح ہو جائے۔ میں نے دل ہی دل میں دُعا کی لیکن قدرت کے نظام

میں محض اس پہ کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی تھی کہ شہباز کے گھوڑوں کو بھیڑیوں سے خطرہ لاحق تھا۔ اگر ایک طرف جانوروں کی جان پر بن آئی تھی تو دوسری طرف سے ماندہ بھوکے بھیڑیوں کے پیٹ بھی تو بھر سکتے تھے۔

آخر دن کے وقت بھیڑیے کیوں حملہ آور نہیں ہوتے؟

اس خیال نے میرے ذہن میں ہلچل سا پیدا کر دیا اور میں ایک خاص نتیجے پر پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔

میرے حلق سے فاتحانہ نعرہ نکل گیا۔ میں نے اطلس کا مُنہ چُومتے ہوئے کہا: "گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ میں ان بھیڑیوں کا بندوبست کرتا ہُوں۔ ایک ترکیب میری سمجھ میں آ گئی ہے۔"

اسی دوران ایک بھیڑیا آہستہ آہستہ مجھ سے کچھ فاصلے پر عقب میں پہنچ چکا تھا۔ اس کے حلق سے نکلنے والی غُراہٹ میں نے واضح طور پر سُن لی تھی اور اطلس کی بے چینی سے مجھے خطرے کا احساس ہو گیا تھا۔ میں نے پھُرتی سے پلٹ کر اس بھیڑیے کی طرف دیکھا۔

اس کی سُرخ سُرخ آنکھوں میں بھوک کا سمندر تھا۔ وہ غُصّے اور نفرت سے جلتی ہوئی آنکھوں سے مجھے گھُور رہا تھا۔ غالباً اس نے گھوڑوں کے مقابلے میں ایک چھوٹے بچے کو آسان شکار سمجھ کر مجھ پر حملہ کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔

وہ سامنے والے پنجے چٹان پر جمائے، پیٹ زمین سے لگائے آہستہ آہستہ آگے آ رہا تھا لیکن اس کی پیش قدمی اُنک گئی۔ ایک دھماکا ہُوا۔ رائفل کے جھٹکے سے میں گر گیا۔ گولی اس کی کھوپڑی پر پڑی تھی اور وہ زمین سے اُچھل پڑا تھا۔

وہ دوبارہ زمین پر گرا تو بے جان ہو چکا تھا۔

میں جہاں گرا تھا، وہ جگہ اطلس سے زیادہ دُور نہیں تھی۔ اطلس تیزی سے میرے قریب آیا اور مجھے سُونگھنے لگا۔۔۔ پھر اس نے میرا گال چاٹنا شروع کر دیا۔ میں نے اس کی تھوتھنی کو پیار سے سہلایا تو وہ خوشی سے ہنہنانے لگا۔

دھماکا سُن کر وہ تمام بھیڑیے تیزی سے پیچھے ہٹ گئے تھے جو قریب آ گئے تھے اور حملہ کرنے کے لیے تُلے ہُوئے تھے۔۔ لیکن دھماکا ہوتے ہی اندر دروازے کو زور زور سے دھڑدھڑایا گیا تھا۔ شاید دھماکا اندر غار میں بھی سُن لیا گیا تھا اور زرینہ جاگ گئی تھی وہ مجھے پکارنے لگی۔

"شہباز۔۔ شہباز۔۔۔ شہباز۔۔۔!"

اس کی آواز میں بے پناہ تشویش تھی۔ میں جلدی سے اُٹھ

کھڑا ہُوا۔ دروازے کے باہر میں نے ایک پتھر کو سرکا کر رکھ دیا تھا تاکہ ہوا سے دروازہ نہ کھل سکے۔ زرینہ نے اندر سے زور لگایا لیکن پتھر کچھ اس طرح رکھا ہُوا تھا کہ وہ دروازے کو کھول نہ سکی۔

میں تیزی سے دروازے کی طرف دوڑا۔

پتھر ہٹایا تو وہ شاید اندر سے اب بھی دروازے کو دھکیل رہی تھی۔ دروازہ ایک دھماکے سے کھُل گیا اور مجھے سامنے پا کر اس نے جھپٹ کر سینے سے لگا لیا۔

"تم خیریت سے ہو۔۔۔ اوہ۔۔۔ خُدا کا شکر ہے۔"

میں اس کے سینے سے لگا ہُوا تھا۔ اُف کس قدر سکُون کا احساس ہو رہا تھا مجھے۔۔۔ بشیر جان کے بعد کسی نے اب تک اتنی شدّت سے مجھے سینے سے نہیں لگایا تھا۔ اس کی دھڑکنیں مجھے صاف سنائی دے رہی تھیں۔

میں اس کی دھڑکنوں میں اپنے پیار کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہُوا سمندر محسُوس کر رہا تھا۔ وہ دیر تک مجھے لپٹائے رہی جیسے کوئی گمشدہ لختِ جگر ایک عرصے بعد ماں کو مل جاتا ہے۔ میں اس کی آغوش میں اتنا بے خود ہو گیا کہ کافی دیر تک مجھے آس پاس کا احساس تک نہیں ہُوا۔

دفعتاً اطلس زور سے ہنہنایا۔

وہ چونک پڑی۔

میں بھی اس آواز کو سُن کر لمحاتی بدحواسی کا شکار ہو گیا۔

دھماکا سُن کر جو بھیڑیے فرار ہو گئے تھے، وہ پھر واپس آ رہے تھے۔ اس بار ان کے ارادوں میں خطرناک حد تک استحکام محسُوس ہو رہا تھا۔ وہ تین تین اور چار چار کی ٹولیوں میں چاروں طرف سے آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہے تھے۔

اطلس نے بُری طرح اُچھلنا کُودنا شروع کر دیا۔

دُوسرا گھوڑا بھی عجیب عجیب آوازیں نکال کر دولتیاں چلانے لگا۔ مجھے خدشہ ہُوا کہ کہیں اس انداز میں اُچھل کُود سے رسیاں نہ ٹوٹ جائیں۔ ایسے میں بدحواس ہو کر بھاگ جانے والے گھوڑے کی واپسی عموماً کبھی نہیں ہوتی۔ اطلس کے بارے میں تو مجھے یقین تھا کہ وہ واپس آ جائے گا لیکن دُوسرا گھوڑا ایک بار فرار ہو گیا تو اس کی واپسی کا خیال ہی ہمیں دل سے نکالنا پڑے گا۔

"اندر چلو۔۔۔ اندر چلو" میں نے تیزی سے کہا۔

اس نے میرے ہاتھ سے رائفل جھپٹ لی۔

ہم نے غار میں آ کر دروازہ بند کر لیا۔ وہ جلدی جلدی رائفل میں گولی بھرنے لگی۔ فاطمہ بے سُدھ سو رہی تھی۔ اس شور و غل سے بھی اس کی نیند اُچاٹ نہیں ہُوئی تھی۔

میرے ذہن میں جو ترکیب آئی تھی، میں نے فوری طور پر اس کو آزمانے کا ارادہ کر لیا۔ زرینہ رائفل بھرنے کے بعد کسی چٹان کی طرح دروازے کے سامنے جم گئی تھی۔ اس کے چہرے سے فکرمندی جھلک رہی تھی لیکن اس کی آنکھوں میں عزم کی چمک تھی جیسے وہ تہیہ کر چکی ہو کہ بھیڑیے اس کی لاش سے گزر کر ہی آگے آ سکیں گے۔

میں نے آتش دان میں جو موٹی موٹی لکڑیاں ڈالی تھیں، وہ اب شعلوں سے جل رہی تھیں۔ میں نے جلدی سے دو لکڑیاں کھینچ لیں اور جلتی ہوئی ان لکڑیوں کو سنبھالے غار کے دروازے کی طرف بڑھا لیکن زرینہ راہ میں حائل ہو گئی۔

"احمق نہ بنو۔ لکڑیاں واپس رکھ دو۔ ہم ان بھیڑیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔" اس نے سخت اور تحکمانہ لہجے میں کہا۔

"تم ہٹ جاؤ۔ یہ درندے آگ سے خوف زدہ ہو جاتے ہیں۔" میں نے چیخ کر کہا: "جلدی سے ہٹ جاؤ ورنہ وہ اطلس کو چیر پھاڑ ڈالیں گے۔"

وہ سامنے سے نہیں ہٹی۔

میں بے چین ہو گیا۔ اطلس کی آوازیں اب ظاہر کر رہی تھیں کہ وہ بھیڑیوں سے خوف زدہ ہو چکا ہے۔ غالباً انھوں نے اسے گھیرے میں لے لیا تھا اور آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہے تھے۔

"لکڑیاں پھینک دو شہباز۔ ہم گھوڑوں کے بغیر بھی زندہ رہ سکیں گے۔" زرینہ نے ایک بار پھر مجھے روکنے کی کوشش کی۔۔۔ لیکن میں دیوانہ وار آگے بڑھ چکا تھا۔ اگر وہ جلدی سے ہٹ نہ جاتی تو جلتی ہُوئی لکڑیوں کی وجہ سے اس کے کپڑوں میں آگ لگ گئی ہوتی۔

اس نے سامنے سے ہٹ کر عقب سے مجھے پکڑنا چاہا لیکن اس وقت تک دروازہ میری ٹھوکر سے کھُل چکا تھا۔

میں نے جھٹکا مار کر خود کو چھڑا لیا۔

باہر آ کر میں رُک گیا۔

اگر مجھے چند لمحوں کی بھی دیر ہو جاتی تو اطلس کی بجائے اس کی چیتھڑوں میں بدلی ہُوئی لاش ہی میرے سامنے ہوتی۔ چار بھیڑیے عقب سے اور تین سامنے سے حملہ آور ہونے والے تھے جبکہ بائیں جانب سے ایک بھیڑیا جست لگانے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ میرے ہاتھوں میں جلتی ہُوئی لکڑیاں دیکھ کر باقی بھیڑیے تو چیختے ہُوئے ہٹ گئے لیکن جست لگانے والا بھیڑیا، اطلس کی پُشت پر سوار ہو چکا تھا۔

گھوڑے کا پُورا جسم کانپ گیا اور وہ زمین پر پھُرتی سے

گر پڑا۔ اس کا یوں گرنا ہی اس کے لیے کارآمد ثابت ہوا کیونکہ اسی لمحے دوسرے گھوڑے نے بدحواسی میں عقبی ٹانگوں کو چلا دیا تھا۔ اس کی دولتی کام کر گئی لیکن بھیڑیا زیادہ زخمی نہیں ہوا۔ اس کے باوجود اس نے چھلانگ لگائی اور میدانی حصے سے دوڑتا ہوا نکل گیا۔

چاروں طرف سے بھیڑیوں کی سرخ سرخ آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں۔ میں نے اس سوکھے ہوئے درخت کی طرف دیکھا جو غار کے گرد پھیلی ہوئی جھاڑیوں میں ایستادہ تھا۔ اس درخت کا خیال مجھے اچانک ہی آگیا تھا۔

میں تیزی سے اس درخت کی طرف دوڑنے لگا۔۔ ساتھ ہی ساتھ میں نے حلق سے خوف زدہ بھیڑیئے جیسی آوازیں بھی نکالنا شروع کر دی تھیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سرخ آنکھوں والے درندے مزید پیچھے ہٹ گئے۔

اسی لمحے زرینہ نے ایک گولی بھی داغ دی۔

آگ خوف کی چیخیں گھوڑوں کی زبردست ہنہناہٹ اور ٹاپوں کی آوازیں۔۔۔ یہ سب کچھ بھیڑیوں کو پسپا کرنے کے لیے کافی تھا اور پھر گولی کا دھماکا صورت حال کو مزید مؤثر بنا گیا۔ بھیڑیئے کافی دور ہٹ گئے تھے اور مجھے سوکھے درخت تک پہنچنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی تھی۔

میں نے اس درخت کے نیچے پڑی شاخوں کو جلدی جلدی جمع کر کے ان لکڑیوں پر پھینکنا شروع کر دیا جنہیں میں اندر آتش دان سے نکال کر لایا تھا۔

بارش کی وجہ سے شاخیں گیلی ہو گئی تھیں اور وہ ٹنڈ منڈ درخت بھی گیلا تھا لیکن میں کوشش کرتا رہا۔ دہکتے کوئلوں سے قریبی شاخیں فوراً ہی خشک ہو کر سلگنے لگی تھیں اور دھواں تیزی سے بڑھ رہا تھا گرم گرم دھوئیں نے بھی شاخوں کو خشک کرنا شروع کر دیا۔

میں ایک بار پھر غار کی طرف دوڑا۔

آتش دان سے مزید لکڑیاں لا کر میں نے ان شاخوں پر ڈال دیں۔ ہوا میں اب پہلے جیسی تیزی نہیں تھی۔۔۔ پھر بھی اتنی تیز ضرور تھی کہ مجھے آگ بھڑکانے کے لیے پھونکیں مارنے کی ضرورت نہیں پڑی۔

میں جانتا تھا کہ ایک بار شعلہ بھڑک اٹھا تو پھر یہ تمام شاخیں پلک جھپکتے میں آگ پکڑ لیں گی۔ اس دوران میں بھیڑیوں نے دو بار قریب آنے کی کوشش کی لیکن زرینہ نے دونوں ہی مرتبہ گولیاں چلا کر انھیں پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔

"یہاں آجاؤ شہباز۔۔" وہ چیخ کر بولی۔

میں شاخوں کی طرف متوجہ رہا۔ دھواں خاصا گاڑھا ہو گیا تھا لیکن ابھی تک آگ نہیں بھڑکی تھی۔ میں چند لمحے تو وہاں کھڑا رہا۔ پھر میں دوڑتا ہوا زرینہ کے قریب جا کھڑا ہوا۔ ہم دونوں کی نگاہ اس خشک درخت پر جمی ہوئی تھی جو اس وقت دھوئیں کی لپیٹ میں آچکا تھا لیکن ابھی تک اسے آگ نہیں لگی تھی۔

ہوا کے جھونکے دھوئیں کو منتشر کر رہے تھے۔

میں نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں الجھا لیں۔

یہ ایک ہیجان خیز مرحلہ تھا۔ ہماری زندگیوں کا انحصار اس آگ پر تھا لیکن آگ تھی کہ بھڑکنے ہی نہیں پا رہی تھی۔ میں نے اطراف کا جائزہ لیا۔ بھیڑیئے آہستہ آہستہ پھر آگے بڑھنے لگے تھے ان کی سرخ سرخ آنکھیں انگاروں کی طرح چمک رہی تھیں اور وہ بھوک سے بے چین ہو رہے تھے۔ میں نے ان انگارہ آنکھوں کی طرف دیکھا تو مجھے جھرجھری سی آگئی۔

اچانک ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا۔

دھواں ایک لمحے تو جیسے اڑ گیا اور پھر ایک چھپاکا سا ہوا۔ خشک شاخوں نے آگ پکڑ لی تھی۔ شعلے بھڑک اٹھے تو بھیڑیوں میں بھگدڑ سی مچ گئی مجھے ریشم جان کا وہ جملہ یاد آگیا جو اس نے بارہا کہا تھا "آگ سے جنگل کے تمام جانور دہشت زدہ ہو جاتے ہیں۔"

"میں کچھ اور شاخیں ڈال کر آتا ہوں۔" میں نے پرجوش لہجے میں کہا۔

زرینہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

وہ بے حد حیرت زدہ تھی۔

اس کی آنکھوں میں اپنے لیے تعریف کی چمک دمک دیکھ کر میرا دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ ریشم جان بھی میری کسی بات پہ خوش ہوتی تھی تو اس کی آنکھوں میں بھی ایسی ہی چمک پیدا ہو جاتی تھی۔

میں نے اوپر پہنچ کر جلدی جلدی اور شاخیں سمیٹیں اور انھیں آگ پر ڈالتا چلا گیا۔

یہ شاخیں بارش کی وجہ سے بھیگ گئی تھیں لیکن گیلی شاخوں کے مقابلے میں یہ بہرحال کارآمد تھیں کیونکہ ان میں پانی جذب نہیں ہوتا۔ آگ لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی جا رہی تھی۔

ہوا کی وجہ سے یہ آگ تیزی سے بھڑک رہی تھی اور میں دیکھ رہا تھا کہ وہ ٹنڈ منڈ درخت بھی اب سلگنے لگا ہے۔ اس پر جتنا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پانی تھا وہ تیزی سے خشک ہو رہا تھا اور نیچے سے خشک لکڑی آگ پکڑتی جا رہی تھی۔

میں واپس زرینہ کے پاس آگیا۔

ہم دونوں دیر تک وہاں کھڑے رہے۔

شاخیں چٹخ چٹخ کر جلتی رہیں حتیٰ کہ درخت نے آگ پکڑ لی۔ اس پورے حصے میں دن جیسی روشنی پھیل گئی تھی۔ شعلے رقص کر رہے تھے۔ زندگی سے بھرپور رقص اور ہم دونوں یوں خوش ہو رہے تھے جیسے زرینہ بھی سمٹ کر چھوٹی سی بچی بن گئی ہو اور میرے ساتھ اس کارنامے پر تالیاں بجانے لگی ہو۔

اطلس پرسکون ہو گیا۔

دوسرا گھوڑا بھی منہ لٹکائے کھڑا تھا۔

آگ ان سے کافی فاصلے پر تھی اس لیے مجھے یقین تھا کہ اس کی وجہ سے گھوڑوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ اب دور دور تک بھیڑیوں کا نام و نشان تک دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ آگ سے دہشت زدہ ہو کر بھاگ گئے تھے۔ اس قسم کی آگ سے جنگلی جانور عموماً میلوں دور بھاگتے ہیں اس لیے مجھے اطمینان تھا کہ اب وہ سپیدۂ سحر نمودار ہونے تک اس علاقے کے قریب بھی نہیں آئیں گے۔ مطمئن ہو کر ہم غار میں آگئے۔

قدرت ہماری مدد کر رہی تھی۔

میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا جس نے مجھے اتنی ہمت دی تھی کہ میں بے شمار بھیڑیوں کو شکست دینے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

آنکھیں بند کر کے میں تصور ہی تصور میں اس منظر کو دہرا کر اپنا جی خوش کرنا چاہتا تھا لیکن نیند نے مجھے خوابوں کی وادی میں پھینک دیا۔

نہ جانے کب مجھے نیند آگئی۔

گہری۔۔۔ اور پرسکون نیند۔۔۔

دن چمک دار تھا اور دھوپ میں چبھن تھی۔

ہمیں غار سے نکل کر اپنی منزل کی طرف سفر کرتے کرتے کئی گھنٹے ہو گئے تھے اور خدا کا شکر ہے کہ کوئی ناخوش گوار حادثہ پیش نہیں آیا۔ اطلس پرجوش تھا۔ وہ بار بار تیز دوڑنے کی کوشش کرتا لیکن میں نے لگامیں کھینچ رکھی تھیں اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ ساتھ چلنے کی کوشش کر رہا تھا۔

زرینہ نے فاطمہ کو رات کا واقعہ بڑی تفصیل سے سنایا تھا اور فاطمہ حیران ہو ہو کر مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں سدا کی شکایت بھی ناچنے لگی کہ میں نے اس موقع پر اسے کیوں نہیں جگایا تھا۔

میں منہ پھیر کر مسکراتا رہا۔

دھوپ خاصی تیز اور ناگوار تھی لیکن رات بھر ہونے والی بارش کی وجہ سے ہوا میں خنکی تھی۔ شام ہوتے ہوتے ہم ان پہاڑوں تک پہنچ گئے جہاں سے بستیوں کا آغاز ہوتا تھا۔ میں نے اطمینان کی سانس لی۔ خطرناک علاقہ اب بہت پیچھے رہ گیا تھا۔

یہ راستے میرے دیکھے بھالے تھے اس لیے ہم نے کہیں رک کر رات گزارنے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور سفر جاری رکھا۔

گوری پہنچنے کے بعد میرے دل کو دھکا سا لگا۔

پوری بستی ویران تھی۔

اکا دکا گھروں سے زندگی کا پتہ چلتا تھا ورنہ ہر طرف قبرستان کے سے سناٹے کی سلطنت تھی۔

"یہاں تو پوری بستی میں ایک دو گھروں کے علاوہ سب طرف خاموشی ہے شہباز۔" زرینہ نے سرگوشی کی۔

"ہاں۔۔۔" میں نے دل گرفتہ ہو کر کہا۔ "اور ان دو گھروں میں بھی وہ لوگ ہیں جنھیں سردار کے حکم کے مطابق یہاں رہنا پڑ گیا تھا۔ اگر یہ لوگ بھی میدانوں میں نکل جاتے تو آج یہ گھر بھی ویران ہوتے۔"

"ماں کہاں ہے شہباز؟" فاطمہ نے بے چینی سے پوچھا۔

"وہ لوگ شاید ابھی تک نہیں پہنچے۔"

"آہا۔۔۔" وہ تالیاں بجا بجا کر گانے لگی۔ "ہم لوگ ان سے پہلے یہاں پہنچ گئے۔"

میں نے زرینہ کی طرف دیکھا۔

اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

میں نے منہ پھیر لیا۔ عورت کے آنسو۔۔۔ ریشم جان بھی تو ایک عورت تھی۔ اس کی آنکھوں میں میں نے صرف ایک بار آنسو دیکھے تھے۔۔۔ اور وہ بھی اس وقت جب وہ مجھ سے جدا ہو رہی تھی۔۔۔ ہمیشہ کے لیے مجھ سے دور جا رہی تھی۔ ممکن ہے یہ میرا وہم ہی رہا ہو۔ اس وقت بھی اس کے آنسو نہ رہے ہوں۔۔۔ بلکہ کسی وجہ سے آنکھوں میں پانی بھر آیا ہو۔۔۔ اس کا فیصلہ میں آج تک نہیں کر سکا کہ وہ ریشم جان کے آنسو تھے یا پانی کے معمولی قطرے۔۔۔؟

میں نے اطلس کو ایک لیپے گھر کے سامنے روک دیا جس میں روشنی ہو رہی تھی۔ گھوڑوں کی ٹاپیں غالباً ان لوگوں نے بھی سن لی تھیں۔ وہ جاگ رہے تھے یا گھوڑوں کی ٹاپوں سے ان کی نیند اچاٹ ہو گئی تھی بہرحال۔ چار مضبوط و توانا آدمی گھروں سے باہر

آگئے۔

انھوں نے مجھے اور فاطمہ کو ایک اجنبی لڑکی کے ساتھ دیکھا تو ان کی آنکھیں بے چینی سے ہمارے عقب میں دُور تک جاتے ہوئے راستے پر بھٹکنے لگیں... لیکن انھیں قبیلے کا قافلہ نظر نہیں آیا۔

"باقی لوگ کہاں ہیں شہباز؟" ایک مرد نے بے تابی سے سوال کیا۔

مَیں خاموش رہا۔

"تم بولتے کیوں نہیں۔" دُوسرا چیخ پڑا۔

"بہتر ہوگا کہ آپ لوگ سکون سے بچوں کو اندر لے چلیں... راستے میں ہمیں جن حادثات سے دوچار ہونا پڑا ہے ان کی وجہ سے سب کے اعصاب تھک گئے ہیں... پھر فاطمہ کے سامنے یہ انداز اختیار نہ کرو۔ یہ دہشت زدہ ہو جائے گی۔"

زرینہ نے نرم لہجے میں اُن لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کی۔

ان چاروں نے ایک دُوسرے کی طرف ایسی نگاہوں سے دیکھا جیسے کوئی بات ان کی سمجھ میں نہ آئی ہو اور وہ ایک دُوسرے سے استفسار کر رہے ہوں کہ آخر معاملہ کیا ہے۔

ایک مرد فاطمہ کو گھر میں لے گیا۔

زرینہ بھی ان کے پیچھے اندر چلی گئی۔

جب مَیں تنہا رہ گیا تو باقی تینوں نے تشویش سے میری طرف دیکھا "شہباز... بتاؤ، باقی سب لوگ کہاں ہیں؟"

"سردار چند ساتھیوں کے ساتھ شہر گیا ہوا ہے۔" مَیں نے سنبھل سنبھل کر کہنا شروع کیا "میرا خیال ہے وہ لوگ آج کل میں یہاں پہنچ جائیں گے۔"

"اور قبیلے کے باقی لوگ؟"

"وہ یہاں نہیں آئیں گے۔"

"آخر کیوں؟" وہ چیخ پڑا۔

"اس لیے کہ وہ مر چکے ہیں۔"

"سب کے سب؟" اس نے دہشت سے پوچھا۔

مَیں نے سوگوار انداز میں گردن ہلا دی۔ ان تینوں کے چہرے یکایک یوں ہو گئے جیسے ان کے جسم کا سارا خون اس منحوس خبر نے پی لیا ہو... اور ان کی نس نس سوکھ گئی ہو۔

"کیسے... یہ سب کچھ کیسے ہوا؟" ایک نے سنسناتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

مَیں نے انھیں مختصراً قبیلے پر ہونے والے حملے اور لوگوں کے مرنے کا حال سنایا اور خود پر بیتنے والے واقعات بھی سنا ڈالے۔

وہ دیر تک خاموش کھڑے رہے جیسے انہیں سکتہ ہو گیا ہو۔

چوتھا آدمی اندر سے آیا تو اُسے بھی صورتِ حال سے آگاہ کر دیا گیا... ان کی حالت دیکھ کر میرے لیے وہاں کھڑے رہنا دشوار ہو گیا۔ مَیں اندر چلا گیا۔

قہوہ تیار تھا۔

فاطمہ اور زرینہ خاتونِ خانہ کے ساتھ بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ مَیں خاموشی سے ایک طرف بیٹھ گیا... اور پیالی سے ہلکی ہلکی چسکیاں لینے لگا۔ میرا ذہن تفکرات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔

ایک ایسی عورت کی کہانی
جو مردوں کے معاشرے میں
ملکہ بن کر جینا چاہتی تھی
ناگ رانی
دو جلدوں میں
جلد اول =/145
جلد دوئم =/145
مکتبہ القریش سرکلر روڈ اردو بازار لاہور
فون 7668958

لالہ رخ
قمر اجنالوی
قیمت =/200

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گموری قصبے میں وہ دن یومِ سیاہ کی طرح منایا گیا، جب سردار اور اس کے ساتھی شہر سے واپس آئے تھے۔ انہیں پڑاؤ پر ہونے والے حملے اور بکھری ہوئی مسخ شدہ لاشوں کے بارے میں بتایا گیا تھا تو باقی ماندہ افراد کی حالت ایسی ہو گئی تھی جیسے غم و غصے نے ان کا ذہنی توازن ہی چھین لیا ہو۔ وہ لاشوں کی طرح جیتے چلے جا رہے تھے۔

اس حادثے کی خبر آس پاس کے ہر گاؤں تک پہنچ گئی تھی۔ دُور و نزدیک سے عزیزوں اور رشتے داروں کی آمد و رفت شروع ہو گئی اور گموری قصبے کی گلیاں سسکیوں اور آہوں سے گونج اٹھیں... وقت تو جیسے تھم سا گیا تھا ایک سو سے زائد گھرانے نیست و نابود ہو گئے تھے۔

یومِ سیاہ منایا گیا تو معزز سردار نے آنسوؤں سے بھیگی ہوئی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ایک ایسی تقریر کی جس سے گموری کی چٹانیں تک کرب سے چیخ اٹھیں۔ قبیلے کے باقی ماندہ افراد نے ازسرِنو زندگی شروع کرنے سے پہلے یہ عہد کیا کہ وہ زندہ صرف اس مقصد کے لیے زندہ رہیں گے کہ ان قاتلوں سے خون کا بدلہ لیا جائے جنہوں نے بچوں، عورتوں اور بوڑھوں کو زندگی سے محروم کر دیا تھا۔

سردار کو شروع ہی سے مجھ سے بے حد محبت تھی لیکن اب وہ مجھے ایک لمحے کے لیے بھی اپنی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتا تھا۔ میں اس کی آنکھوں میں ایسی امیدوں کے چراغ روشن دیکھتا جنہیں وہ صرف اور صرف میری ذات سے وابستہ کر چکا تھا۔

"شہباز..." ایک روز اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا "اب میری زندگی کا محور صرف تمہاری ذات ہے۔ ریشم جان نے تمہاری جس انداز میں تربیت کی ہے اس سے تم سونا بن گئے ہو... لیکن تمہیں کندن میں بناؤں گا۔ میں بوڑھا ہو چکا ہوں لیکن میری دُعا ہے کہ خدا میری زندگی اتنی دراز کر دے کہ اپنی آنکھوں سے تمہیں دشمنوں کے خون سے ہولی کھیلتے ہوئے دیکھوں... وعدہ کرو شہباز، تم اس قوم ٹوٹے ہوئے قبیلے کا نام روشن کرو گے؟"

مَیں نے پیار اور احترام سے سردار کا ہاتھ تھام کر چوم لیا اور اس سے عہد کیا کہ میں اس کی امیدوں کو ہر حال میں پورا کروں گا۔ ڈاکوؤں، جرائم پیشہ لوگوں اور فرنگیوں کے علاوہ ایسے تمام لوگوں کو بھی اپنا دشمن تصور کرتا رہوں گا جو انسان ہوتے ہوئے بھی انسانوں سے بے انصافی کرتے ہیں۔ میں عدل و انصاف، شجاعت اور نیکی کی علامت بن کر زندہ رہوں گا۔ میں باطل کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لیے اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہا دوں گا۔

سردار نے مجھ پر زیادہ سے زیادہ توجہ صرف کرنی شروع کر دی۔ اس نے مجھے ہر ممکن تربیت دی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میرا جسم بھی چٹانوں کی طرح ٹھوس ہوتا جا رہا تھا اور میں ہر وقت اپنے عہد کو دُہراتا رہتا تھا... وہی عہد جو بہت عرصہ پہلے میں نے پہلے تو خود اپنے آپ سے کیا اور بعد میں سردار کا ہاتھ تھام کر سب کے سامنے کیا تھا۔

میرے بابا شالیار خان کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ملی۔ میں جب جوان ہوا تو بابا کی یاد اکثر مجھے ستاتی رہتی تھی... میں اُسے تلاش کرنے کے لیے بے چین رہتا تھا لیکن سردار کی محبت اور نگرانی نے میرے پیروں میں بیڑیاں ڈال دی تھیں۔

بہار اور خزاں کے موسم آتے رہے، گموری قصبے پر برف کی تہیں جمتی اور پگھلتی رہیں۔ چند افراد پر مشتمل قبیلہ رفتہ رفتہ پھر بڑھتا رہا حتیٰ کہ ایک بار گموری واپس آتے ہوئے پشاور کے علاقے میں لگنے والے مشہور میلے میں مجھے ایک مقابلے میں شریک ہونے کا موقع ملا۔ اس مقابلے میں پہلی بار گموری کے کسی فرد نے حصہ لیا... اور وہ فرد تھا شہباز...

شہباز کی شخصیت پایۂ تکمیل کو پہنچ چکی تھی اس لیے میں آسانی سے نہ صرف شہ زوری کے اس مقابلے میں جیت گیا بلکہ میری شہرت بھی قبائلیوں میں دُور دُور تک پھیل گئی۔

زرینہ کی ایک نوجوان سے شادی ہو گئی تھی اور اس کے تین ننھے منّے بچے بھی ہو گئے تھے۔ میری جوانی بڑی منہ زور تھی لیکن اس جوانی پر بچپن کے عہد کا سایہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں فاطمہ کی طرف بھی زیادہ توجہ نہیں دیتا تھا حالانکہ یہ بات میرے علم میں تھی کہ وہ مجھے دل و جان سے چاہتی ہے۔ مجھے اس سے محبت تھی لیکن میں نے اس محبت پر فرض کا حصار قائم کر رکھا تھا جو مجھے بھٹکنے نہیں دیتا تھا۔

میں جوان ہو گیا۔ گموری ایک بار پھر خوشحال قصبہ بن گیا لیکن میرے دل میں ایک کانٹا ہمیشہ چبھتا رہتا تھا... یہ ایک یاد کا کانٹا تھا جس کی کسک مجھے بے چین رکھتی تھی۔ اپنے بابا شالیار کی یاد آتے ہی مجھے یوں لگتا تھا جیسے میری ذات ادھوری ہو...

اسی دوران جب مجھے قبیلے کے شہ زور کا خطاب دیا گیا تو مارے خوشی کے، میں جھوم اٹھا تھا کاش! اس وقت بابا یہاں موجود ہوتے تو وہ مجھ پر کتنا فخر کرتے!

میں جانتا تھا کہ کچھ ہی دنوں بعد سردار بھیڑ بکریوں کا ریوڑ لے کر شہر جانے والا ہے۔ . . مجھے یقین تھا کہ اس بار میں اس کے ساتھ شہر ضرور جاؤں گا تو وہاں جا کر اپنے بابا کو تلاش کرنے کی مزید کوشش کروں گا۔ میں جب بھی بابا شالیار کے بارے میں سوچتا تھا تو مجھے نہ جانے کیوں یقین ہو جاتا تھا کہ وہ زندہ ہے۔ . . اور زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر ضرور میرے سامنے آ جائے گا۔

میں اکثر اپنے دائیں ہاتھ کے اس نیلے نشان کو غور سے دیکھتا رہتا تھا جہاں پہلی بار ریشم جان نے مجھے بچھو سے کٹوایا تھا۔ یہ نشان باقی رہ گیا تھا۔ . . یہ میرے بچپن کی وہ نشانی تھی، جسے قدرت نے کسی زیور کی طرح میرے دائیں ہاتھ کی پشت پر سجا دیا تھا۔

. . . پھر وہ دن آ گیا جب قبیلے کے لوگ میدانی علاقے سے منگوری کی طرف روانہ ہو گئے اور میں چند ساتھیوں کی ہمراہی میں سردار کے ساتھ شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔ شہر میں سردار اور دوسرے لوگ تو منڈیوں میں گھومتے رہے اور میں اپنے بابا کی تلاش میں مارا مارا پھرتا رہا۔ میں چونکہ پہلی بار شہر آیا تھا اس لیے سردار نے مجھ پر کوئی پابندی نہیں لگائی تھی۔ . . حتیٰ کہ جب وہ لوگ واپس جانے لگے تو میں ایک تماشا دیکھنے کے لیے رُک گیا۔ بابا شالیار کا کوئی سُراغ نہیں ملا تھا۔ میرے دل میں خلش باقی تھی۔ شاید میں اسی غم کو غلط کرنے کے لیے تماشا دیکھنے میں محو ہو گیا تھا۔ سردار نے مجھے واپس چلنے کے لیے کہا تو میں نے کچھ دیر کی مہلت مانگی۔ وہ مُسکراتا ہُوا چلا گیا۔ تماشا ختم ہُوا تو مجھے اپنی حماقت کا احساس ہُوا۔ تب میں گھوڑے پر سوار ہو کر تیزی سے اس راستے پر چل دیا جدھر کافی دیر پہلے سردار اور دوسرے گھڑسوار گئے تھے۔

ہر طرف دُھوپ میں سُلگتے ہُوئے سیاہ پہاڑوں کی یلغار تھی۔ اوپر آسمان کا رنگ تانبے جیسا ہو رہا تھا اور دوپہر کا سورج آگ برساتا ہُوا سر پہ آ پہنچا تھا۔

میری نگاہ پُرانے گرد آلود راستوں پر بھٹک رہی تھی لیکن تا حدِ نگاہ بوڑھے سردار کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ میرے کان دوپہر کے سنّاٹے میں ہر آواز کو سکوتِ نیم شب کی طرح سُن

ایک نوجوان کی عجیب داستان
جو اپنی یادداشت کھو بیٹھا تھا
گم کردہ
یعقوب جمیل کے قلم سے
خوبصورت سرورق، بہترین طباعت و کتابت
قیمت =/100 روپے
مکتبہ القریش
سرکلر روڈ اردو بازار لاہور
7668958

رہے تھے لیکن میرے اپنے گھوڑے کی ٹاپوں سے پیدا ہونے والی بازگشت کے سوا کسی اور صدا کا وجود نہ تھا۔ جو سردار کی چھپا میں ان راستوں سے نہ جانے کتنی بار گزر رہا تھا... لیکن سردار کی رفاقت میں قبیلے کے شہ زور کی حیثیت سے لوگوں کی امانت کی نگرانی کے لیے پہلی بار شہر گیا تھا... یہی وجہ تھی کہ میں سردار اور قبیلے کے ان تین آدمیوں سے پیچھے رہ گیا جو میرے ساتھ شہر آئے تھے لیکن یہ سوچ کر چل دیے تھے کہ میں اپنے تیز رفتار گھوڑے کی وجہ سے جلد ہی اُن سے آ ملوں گا۔

بار بار مجھے وہ وقت یاد آ رہا تھا جب رسم کے مطابق سردار نے اپنی رائفل میرے حوالے کرتے ہُوئے کہا تھا: "مجھے یقین ہے کہ تم نہ صرف اپنی حفاظت کر سکتے ہو بلکہ قبیلے کی حفاظت بھی کر لو گے۔ تمہیں دوست اور دشمن کی خوب پہچان ہے۔ مجھے تمہارے نشانے پر فخر ہے لیکن میری ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا، اس رائفل سے نکلنے والی گولی کا نشانہ دشمن کا سینہ ہونا چاہیے پیٹھ پر وار کرنا تمہارے اجداد کی روایت کبھی نہیں رہی..."

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میری عمر بائیس سال ہو چکی تھی اور میں تاریخ کے ہر ورق پر لہو سے لکھی جانے والی شجاعت و ہمّت اور غیرت و حمیّت کی داستان سے واقف تھا۔ یہ رائفل بھی ایک فرنگی کا تحفہ تھی جس نے ہماری آزادی میں مخل ہونے اور ہم پر اپنی حاکمیت قائم کرنے کے ساتھ ساتھ ہماری غیرت مند روایات کو مٹانے کے لیے اپنی عسکری قوت کا سہارا لے کر اس مقدّس زمین پر اپنے ناپاک قدم رکھنے کی جسارت کی تھی۔ ان کے مُردہ جسم تاجِ برطانیہ کے نمائندے وائسرائے کو ارسال کر دیے گئے تھے لیکن وہ اسلحہ اب ہمارے پاس تھا جس پر انہیں ناز تھا اور جو خود اُن کی حفاظت نہیں کر سکا تھا۔

گھوڑا اچانک زور سے ہنہنایا۔

میں نے جلدی سے باگ کھینچ لی۔

یہ گھوڑا گزشتہ چار برسوں سے میرا رفیق تھا۔ یہ اطلس کا ہم پلہ تھا، اس لیے میں نے اطلس کی موت کے بعد اس کا نام اطلس ثانی رکھ دیا تھا... لیکن اسے اطلس ہی کہہ کر پکارتا تھا۔ ہم ایک دوسرے کے مزاج کو بہت سے انسانوں کے مقابلے میں بہتر طور پر سمجھتے تھے۔

میرا ضمیر بڑی دیر سے مجھے ملعون کر رہا تھا کہ شہر سے واپسی پر محض ایک تماشے میں پڑ کر میں نے سردار اور تینوں ساتھیوں کو تنہا آگے بھیج کر غلطی کی ہے... لیکن میں خود کو یہ سمجھا کر مطمئن بھی کر رہا تھا کہ فکر مند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ بلا شبہ سوار سب بھی جوانوں سے کم نہیں ہے۔ عمر نے اس کو تجربے کی وہ سند عطا کر دی تھی جو عزم و ہمّت سے بھی بڑھ کر سرمایہ ہوتی ہے۔ جسمانی طور پر بھی وہ صحت مند تھا۔ اس کی نگاہ عقاب کی طرح تیز تھی اور وہ ہوا کا رُخ دیکھ کر خطرے کی بُو سونگھ لیتا تھا۔ مشہور تھا کہ سردار کی رائفل سے نکلنے والی گولی کبھی رائگاں نہیں گئی۔

...لیکن وقت کے ساتھ ساتھ دشمن ہی نہیں، دشمنی کے آداب و اطوار بھی بدل رہے تھے۔ سامنے آ کر مردانہ وار مقابلہ کرنے اور رشتوں کی آبرو پر جان دینے والے لوگوں میں وہ کم ظرف اور کمینے لوگ بھی شامل ہو گئے تھے جو رشتوں کے تقدّس کو پامال کرتے تھے اور لوٹ مار جن کا پیشہ تھا۔ یہ لوگ نہتے لوگوں کو بے خبری میں یا چھپ کر مارنا اپنی بہادری پر محمول کرتے تھے۔

بنجر زمین پر خون کی سُرخی بے حد نمایاں تھی۔

بے اختیار میرا ہاتھ اپنی رائفل پر گیا اور میں نے آہستہ آہستہ رائفل کی نال کے ساتھ ساتھ سر گھما کر غور سے دیکھا۔

ہر طرف خاموشی تھی۔

میری نظر خون کے ان دھبّوں پر جم گئی جو ایک خطِ مستقیم بناتے ہُوئے دُور تک چلے گئے تھے۔ یہ لکیر پہاڑی کے دامن تک جاتی دکھائی دے رہی تھی۔

انسانی قدموں کے تازہ نشان زیادہ واضح تو نہیں تھے لیکن پھر بھی میری نگاہ نے ہر نقشِ پا کو بھی اسی سمت میں اشارہ کرتے دیکھ لیا... جدھر خون کے دھبّے رہنمائی کر رہے تھے۔ گھوڑا اپنے زخمی سوار کو چھوڑ کر مخالف سمت میں نکل گیا تھا۔

میرے اندیشے اب یقین کی صورت اختیار کر رہے تھے اور میں بے ترتیب دھڑکنوں کے ساتھ لہو کی لکیر کا تعاقب کر رہا تھا۔ لہو کسی کا نام لے کر تو نہیں پُکارتا۔ خون اپنا ہو یا پرایا، اس کا رنگ وہی رہتا ہے... مگر وہ غیبی قوت جو عقل کی رہنما ہوتی ہے مجھے بتا رہی تھی کہ یہ خون کس کا ہے۔ معاً میری سماعت سے کسی کے کراہنے کی آواز ٹکرانے لگی... اور میری رائفل کا رُخ اس آواز کی طرف ہو گیا۔ اگلے ہی لمحے میرے حلق سے ایک دلدوز چیخ نکل گئی اور میں اندھا دُھند دوڑتا چلا گیا۔

اس کراہ کو سُن کر مجھے یوں محسوس ہُوا تھا جیسے میرے دل میں کوئی تیز دھار خنجر دستے تک اُتر گیا ہو۔ میں آواز کی سمت کا تعین کر چکا تھا اس لیے اندھا دُھند دوڑتا رہا۔

دم توڑتی ہُوئی زندگی کراہتی ہُوئی مجھے پکار رہی تھی۔

یہ ایک آگ برساتی ہُوئی دوپہر تھی۔

میں نے پہاڑی کی اوٹ میں پہنچ کر جو کچھ دیکھا، اس نے میرے دل و دماغ میں انگارے سے بھر دیے۔ میں نے بوڑھے سردار کو دیکھا جو ایک بڑے سے پتھر کی اوٹ میں ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس کے قریب تین لاشیں پڑی تھیں۔ یہ وہی بدنصیب تھے جو منگوری سے ہمارے ساتھ شہر آئے تھے۔

گنگا کے پجاری ناگ
اے حمید ○ قیمت ۳۵۰/۰۰ روپے

ان کی آنکھیں درد کی زیادتی سے پھٹ گئی تھیں جیسے زخموں کی ساری تکلیف ان کی آنکھوں میں سمٹ آئی تھی اور پھر موت کی سرد لہر نے اُسے ان کی آنکھوں ہی میں منجمد کر دیا تھا۔

سردار کے ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں اور کہیں کہیں سے اس کے ہونٹ پھٹ گئے تھے جن سے خون رسنے لگا تھا۔ وہ کبھی کبھی کراہ اُٹھتا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ گردوپیش سے بے نیاز تھا۔ اس نے میرے قدموں کی آہٹ بھی نہیں سُنی تھی ورنہ آنکھیں ضرور کھول کر دیکھ لیتا۔

میں دوڑتا ہُوا واپس گیا اور گھوڑے کو پکڑ کر ساتھ لے آیا۔ میں نے اپنی زین سے بندھی ہوئی بوتل سے پانی سردار کے ہونٹوں سے لگا دیا جسے اس نے بڑی بے تابی سے گھونٹ گھونٹ لیتے ہوئے پینا شروع کر دیا۔ سردار کا گھوڑا کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ ۔ ۔ اور نہ ہی ان لوگوں کے گھوڑے دکھائی دے رہے تھے جنہیں بے دردی سے گولی ماری گئی تھی۔

پانی پینے کے بعد سردار نے آنکھیں کھول دیں۔

چند لمحوں تک تو وہ میری طرف ایسی نظروں سے دیکھتا رہا جیسے میں اس کے لیے اجنبی رہا ہوں۔ ۔ ۔ پھر اس کی آنکھوں میں شناسائی کی چمک پیدا ہو گئی۔ اس کے خون آلود جسم اور چہرے کو دیکھتے ہی میں سمجھ گیا تھا کہ اس کا آخری وقت آ پہنچا ہے۔ موت کا ویران آسیب زدہ سایہ اس کی آنکھوں میں اُتر آیا تھا ۔ ۔ لیکن مجھے پہچاننے کے بعد اس کے زخمی اور خون آلود ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی تھی۔

"چاچا۔ ۔ ۔" میں نے جذبات سے رُندھی ہُوئی آواز میں کہا اور گھٹنوں کے بل اس کے قریب ہی جُھک گیا۔ "یہ تم نے کیا حالت بنا رکھی ہے؟"

"مجھے کچھ نہیں ہُوا بیٹے۔ ۔ ۔ اور نہ ہی میں نے کوئی حالت بنائی ہے۔ موت تو ایسے ہی آتی ہے شہباز۔ ۔ ۔ اس حالت کو موت کا استقبال کرنے سے پہلے ہر انسان کو خود پر طاری کرنا پڑتا ہے۔" وہ رُک رُک کر بولنے لگا۔

میری دھڑکنیں تیز ہوتی جا رہی تھیں۔

غم و غصّے نے مجھ سے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی چھین لی تھی۔

"زندگی جس کی امانت ہے۔ ۔ ۔ وہ کسی وقت بھی اسے واپس لے لیتا ہے۔ ۔ ۔ لیکن مجھے مرنے سے پہلے تمھیں سب

نامور مصنف محمود احمد مودی
وہی تحریر اور وہی انداز
کے ساتھ ' اپنے چاہنے والوں
کے لئے ایک نئی سوغات لئے
بہروپ
خوبصورت سرورق ' بہترین
طباعت و کتابت ' سفید کاغذ
قیمت =/180
مکتبہ القریش
سرکلر روڈ اردو بازار لاہور
7668958

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کچھ بتا دینا چاہیے۔"

"میں تمھیں مرنے نہیں دوں گا چاچا!" میں نے کہا۔

"انسان کتنا ہی بڑا شہ زور کیوں نہ ہو جائے، موت سے بڑھ کر شہ زور نہیں ہو سکتا۔"

"باتیں نہ کرو چاچا!" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "تمھاری ٹانگ میں جو گولی لگی ہے اس سے ٹانگ ٹوٹ گئی ہے اور دوسرا خطرناک زخم اسی حصّے میں آیا ہے۔ میں پہلے اس ٹانگ کو دیکھتا ہوں۔"

"وقت ضائع نہ کرو۔ تم مجھے مرنے سے نہیں روک سکتے۔ ۔ لیکن ان لوگوں کو ضرور روک سکتے ہو جو ہمارے قبیلے کا سارا اثاثہ چھین کر لے گئے ہیں۔"

"اس وقت مجھے تمھاری زندگی سے زیادہ کوئی چیز عزیز نہیں ہو سکتی۔" میں نے ضدی لہجے میں کہا اور ٹانگ کا جائزہ لینے لگا۔

سردار مجھ سے نہ جانے کیا کیا کہتا رہا لیکن میں اس کی ٹانگ کے زخم کا جائزہ لینے کے بعد اُسے ٹھیک کرنے کی جدوجہد میں مصروف تھا۔ میں نے ایک قریبی درخت سے چند شاخیں کاٹیں اور ان کی کھپچیاں سی بنا کر ٹانگ کو سیدھی کرکے باندھ دیا۔ زخم کو دھو کر میں نے چاقو کی نوک سے گولی نکال دی تھی اور اس پر پگڑی سے ایک ٹکڑا پھاڑ کر مضبوطی سے پٹی باندھ دی۔ پھر ادھر اُدھر متلاشی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ ایک درخت کے علاوہ دُور دُور تک ہریالی کا نام و نشان تک نہیں تھا۔

میں سوچ رہا تھا کہ اگر کوئی ٹھنڈی جگہ اور وافر مقدار میں پانی۔ ۔ ۔ میسر آ جائے تو سردار کے سر پر منڈلانے والی موت رخصت دی جا سکتی ہے۔ اچانک مجھے اپنے گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز سُنائی دی۔

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

وہ ایک طرف دیکھتا ہُوا ہنہنا رہا تھا اور سامنے والے کھُر زور زور سے پتھریلی زمین پر مار رہا تھا۔ میں نے اس کے متحرک کانوں کو دیکھ کر اس سمت میں نگاہ دوڑائی جدھر وہ متوجہ تھا۔

سردار کا گھوڑا کچھ فاصلے پر کھڑا ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔

اسے دیکھ کر فوری طور پر میرے دل میں آیا کہ سردار کو یہاں سے کسی محفوظ جگہ لے جانا آسان ہو جائے گا۔ میں تیزی سے گھوڑے کی طرف بڑھا لیکن گھوڑا شاید دہشت میں مبتلا تھا۔ مجھے اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر اس نے تیزی سے ایک طرف دوڑنا شروع کر دیا۔

میں کچھ دُور تک تو اس کے پیچھے دوڑتا رہا۔ ۔ ۔ پھر مجھے رُک جانا پڑا۔ اس گھوڑے کے پیچھے یوں دوڑ دوڑ کر تو میں اسے قیامت تک نہیں پکڑ سکتا تھا۔ گھوڑا کچھ دُور رُک کر عقب میں دیکھنے لگا تھا۔

اس انداز سے مجھے سوچنا پڑا کہ آخر گھوڑا دوڑ دوڑ کر بار بار رُک کیوں جاتا ہے؟ وہ جس طرح عقب میں دیکھ کر دوڑنے لگتا تھا۔ اس سے مجھے یقین ہو گیا کہ وہ کسی خاص جگہ تک میری رہنمائی کرنا چاہتا ہے۔ ۔ ۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا اور تیزی سے واپس سردار کی طرف چل دیا۔ سردار کی طرف سے مطمئن ہوئے بغیر میں کہیں بھی نہیں جا سکتا تھا۔

واپس آتے وقت میں نے دیکھا کہ گھوڑا بھی آہستہ آہستہ میرے پیچھے پیچھے چلنے لگا ہے۔ میں نے سردار کو اُٹھایا اور اسے اپنے گھوڑے پر ڈال کر اس طرف چلنا شروع کر دیا جدھر گھوڑا مجھے لے جانا چاہتا تھا۔ گھوڑے نے ہمیں اپنی طرف بڑھتے دیکھا تو اس نے ایک بار پھر دوڑنا شروع کر دیا۔

"شہباز۔ ۔ ۔ تم ایک لاش کو زندگی دینے کی ناکام کوشش کر رہے ہو۔" سردار نے دھیمی آواز میں کہا۔

میں خاموش رہا۔ اس وقت میں کچھ سُننا نہیں چاہتا تھا۔ جس شخص نے مجھے اس عمر تک تربیت دے کر جوان کیا تھا اور جس نے میری خوشیوں کے لیے ایک ایک سانس لی تھی۔ اسے میں کراہتے ہوئے چھوڑ کر ایسے افراد کے پیچھے نہیں جا سکتا تھا جن کو تلاش کرنے کے لیے میرے پاس پوری زندگی پڑی تھی۔

سورج غروب ہونے سے کچھ ہی دیر پہلے ہم ایک ایسی ندی کے کنارے پہنچنے میں کامیاب ہو گئے جہاں درخت بھی موجود تھے اور اس کے بعد جنگل شروع ہو جاتا تھا۔ یہ دو تین قدم چوڑی اور ٹخنوں ٹخنوں گہری ندی تھی لیکن اس کا پانی ٹھنڈا اور میٹھا تھا۔

میں نے سردار کو گھوڑے سے اُتار کر نرم نرم گھاس پر لٹا دیا۔

ذرا سی حرکت سے اس کی چیخیں نکل جاتی تھیں۔

ان چیخوں کو سُن کر میرا دل ڈوبنے لگتا تھا۔

میں نے ندی سے بوتل کو بھرا اور سردار کے پاس آ بیٹھا۔ ٹھنڈے پانی کے حلق سے اُترتے ہی اس کے چہرے پر کچھ رونق آ گئی اور آنکھوں کی ویرانی بھی کم ہو گئی۔ ۔ ۔ لیکن کرب کی سلوٹیں اب بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ اس کی حالت قدرے بہتر محسوس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کر کے میں نے سوچا کہ بدکے ہوئے گھوڑے کو پکڑ کر باندھ لوں۔ وہ اب تک ہماری نگاہ میں تھا لیکن ہم سے دُور دُور رہا تھا۔

"میں گھوڑے کو پکڑ لاؤں، چاچا!" میں نے کہا۔ "اندھیرے میں کسی سانپ یا بھیڑیئے کی وجہ سے بدکا تو پھر اسے تلاش کرنا ممکن نہ ہوگا۔"

سردار نے کوئی جواب نہ دیا۔

اس نے بے پناہ نقاہت سے آنکھیں بھینچ رکھی تھیں۔

میں اُٹھ کھڑا ہُوا۔

دراصل سردار کی حالت قدرے اطمینان بخش محسوس کرنے کے بعد میرے دل میں جذبۂ تجسس کروٹیں لینے لگا تھا... کہ آخر یہ گھوڑا مجھے کہاں لے جانا چاہتا ہے۔ میں نے اپنا گھوڑا ایک درخت سے باندھ دیا اور سردار کے گھوڑے کی طرف بڑھ گیا۔

میرے قدموں کی آہٹ پر گھوڑے نے فوراً ہی کان کھڑے کیے اور ایک طرف دوڑنے لگا۔ اس کا رُخ اب بھی اسی جانب تھا، جدھر وہ پہلے جا رہا تھا۔ میں نے اس کا پیچھا کرنا شروع کر دیا۔

کافی دیر تک میں اس کے پیچھے دوڑتا رہا۔

ایک جگہ گھوڑا رُک گیا۔

میں نے اس جگہ کا جائزہ لیا۔ یہاں کچھ دیر پہلے چند لوگ موجود تھے۔ وہاں ایک دم توڑتی ہُوئی آگ والا چولہا تھا جس پر غالباً انہوں نے قہوہ بنا کر پیا ہوگا۔ گھوڑا یہاں آ کر رُک گیا تھا... میں آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھا۔ اس بار گھوڑے نے بھاگنے کی کوشش نہیں کی جس سے مجھے اندازہ ہوگیا کہ گھوڑا مجھے یہیں لانا چاہتا تھا اور یہاں وہ لوگ موجود تھے جنہوں نے سردار اور دوسرے آدمیوں کو گولی کا نشانہ بنایا ہوگا۔

گھوڑے کی لگام تھام کر میں اس کی پشت پر سوار ہوگیا۔

واپس آتے ہُوئے میں سوچ رہا تھا کہ زندگی بھی کتنی عجیب ہوتی ہے۔ ایک ہی لمحے میں اس کا دھارا اپنا رُخ بدل لیتا ہے۔ سردار کو جہاں لٹا کر گیا تھا، وہ وہیں بے حس و حرکت لیٹا ہُوا تھا۔

میں نے گھوڑے کو درخت سے باندھ دیا اور سردار کے قریب آگیا۔

سردار نے کچھ دیر بعد آنکھیں کھولیں تو اس کی آنکھوں میں ویرانی بڑھ چکی تھی۔ اس نے میری طرف بڑی زخمی سی نگاہ سے دیکھا۔

"چاچا... ہمیں مگوری واپس چلنا چاہیے" میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

"احمقانہ بات ہے" اس نے بے حد دھیمی آواز میں جواب دیا۔ "یہاں سے پُورے سات دن کا سفر ہے اور میں چند گھنٹوں کا مہمان ہُوں۔ قریب ترین آبادی تین روز کی مسافت پر ہے۔ تم مجھے زندہ وہاں تک نہیں پہنچا سکتے اس لیے وقت برباد نہ کرو۔"

میں خاموش ہوگیا۔

سردار ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔

"شہباز..." سردار کی بوڑھی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔ "میرے پاس قبیلے کے لوگوں کے بیس ہزار روپے تھے۔ یہ رقم امانت تھی۔ یہ رقم ان لوگوں کا کُل سرمایہ تھی جس سے انہوں نے اپنے قرضے چُکانے تھے... بیٹیوں کی شادیاں کرنی تھیں... اور گھر بنانے تھے... لیکن میں بدنصیب اس امانت کی حفاظت نہ کر سکا۔"

میں خاموش رہا۔ میرے وجود میں آتش فشاں اُبلنے لگا تھا اور میری آنکھیں یوں جل رہی تھیں جیسے جسم کا سارا خون آنکھوں میں اُتر آیا ہو۔

"میں اس رقم کے بغیر ان لوگوں کے سامنے نہیں جا سکتا!" اس نے درخت کی شاخوں کو گھورتے ہُوئے بات جاری رکھی۔ "میں ان کا قرض اپنی رُوح پر لے کر جا رہا ہوں... شہباز... یہ قرض تمھیں اُتارنا ہے، بیٹے۔"

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"تمھارے بے گناہ خون کی قسم۔ میں صرف تمھارا قرض ہی نہیں اُتاروں گا بلکہ ان لوگوں سے تمھارا انتقام بھی لوں گا... ایسا انتقام جسے لوگ رہتی دُنیا تک یاد رکھیں گے۔"

"انہوں نے مجھ پر چھُپ کر وار کیا" سردار کی آواز ڈوبنے لگی۔ "وہ بے ضمیر اور ظالم ہیں... شیر خان... بہرام... اور گل زمان..." یہ کہتے ہُوئے سردار نے اُٹھنے کی کوشش کی مگر اب جسمانی طاقت اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ اس کے خون سے میرے کپڑے بھی سُرخ ہوگئے تھے... اور شاید خون بہنے کے ساتھ ساتھ زندگی کی آخری رمق بھی ختم ہو رہی تھی۔ وہ اُٹھنے کی کوشش میں دوبارہ گر گیا۔

"میرا قرض... میرا... قرض... شہباز..." وہ بڑبڑایا اور پھر اس کے لبوں سے نکلنے والی آواز دم توڑتی چلی گئی۔

میں سردار کے ہونٹوں پر جُھک گیا۔

کوئی آواز میرے کانوں سے نہیں ٹکرائی۔

اس کی کوئی سانس بھی مجھے اپنے رُخسار پر نہیں محسوس ہو رہی تھی۔ میں اس کی لاش سے لپٹ گیا اور میرا دل بار بار بھر آنے لگا... لیکن میری آنکھیں خشک رہیں کیوں کہ ان آنکھوں کو رونے کی اجازت نہیں تھی۔ ان پر میری ماں ریشم جان کے حکم کا پہرہ تھا۔ اس نے کہا تھا "شہباز، حالات چاہے کچھ بھی کیوں نہ ہو جائیں، تمھاری آنکھوں میں آنسو نہیں آنے چاہئیں اگر کبھی ایسا ہُوا تو یاد رکھنا، قبر میں میری لاش اور آسمانوں پر میری رُوح بے چین ہو جایا کرے گی۔"

میں نے سردار کی کھُلی آنکھوں کو انگلیوں کے پوروں سے بند کر دیا اور اپنی آنکھیں سختی سے بھینچ لیں۔ بلاشبہ زندگی کے معاملے پر تقدیر کا تصرف ہے اور موت کا ایک دن معیّن ہے... مگر مجھے دُکھ تھا تو صرف اس بات کا کہ جب سردار دُشمن کے گھیرے میں تھا تو میں وہاں موجود نہ تھا۔ ہم نے طویل اور دُشوار گزار راستوں پر ایک ساتھ سفر کیا تھا لیکن وہ آخرت کے سفر پر تنہا روانہ ہوگیا۔ ہم نے موسموں کی سختیاں جھیلی تھیں لیکن وہ خود ان سختیوں سے دُور نکل گیا تھا۔

بار بار میں خود کو سردار کی موت کا ذمے دار سمجھ کر تڑپ رہا تھا۔ بدمعاش، سردار سے اس کے اعتماد کا سرمایہ اور زندگی دونوں ہی چھین لے گئے تھے۔ میں جب سردار تک پہنچا تھا تو مجھے دو گھنٹے کی تاخیر ہوگئی تھی اور یہ دو گھنٹے کا فرق، زندگی اور موت کا فرق بن گیا تھا۔ سردار اتنا آگے نکل گیا تھا کہ لوٹ کر نہیں آ سکتا تھا۔ ڈاکو اجل کے نامہ بر بن کر اس کی راہ میں حائل ہُوئے تھے تو اس کی پکار تک میرے کانوں میں نہیں پہنچ سکی۔

میں نے سردار کی لاش کو دفن کرنے کے لیے قبر کھودنی شروع کر دی۔ اسے دفن کر کے فارغ ہُوا تو اندھیرا اچھل چکا تھا۔ میں نے سردار کے گھوڑے کو کھول دیا۔ "تم آزاد ہو... جاؤ... جہاں بھی چاہے چلے جاؤ" میں نے دُکھ بھرے لہجے میں کہا اور اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر اس مقام کی طرف چل دیا جہاں میں نے سردار کو زخمی حالت میں پایا تھا۔

رات کا باقی حصہ میں نے اسی مقام پر گزارا... اور ان لاشوں کی تدفین میں لگا رہا جنہیں میں جاتے وقت یوں ہی چھوڑ گیا تھا۔ صبح جب سورج کی پہلی روشن اُنگلی نے زمین کی طرف اشارہ کیا تو میں اُٹھ کھڑا ہُوا۔ میں نے اس حصے کا گہری نگاہ سے جائزہ لیا۔

کچھ دیر بعد میں نے تین گھوڑوں کے سُموں سے بنے ہُوئے نشانات تلاش کر لیے۔ یہ نشان شمال مشرقی پہاڑوں کی طرف جا رہے تھے۔ ان راستوں پر نقشِ قدم دیکھتے ہُوئے کسی کا پیچھا کرنا کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ آزاد علاقے کے رہنے والے اپنے جانشینوں کو صدیوں کی تابندہ روایات کو زندہ رکھنے اور اپنی روایات کے مطابق زندہ رہنے کی تربیت اسی طرح دیتے ہیں کہ وقت آنے تو اُن کی نظر اور اُن کا نشانہ غلطی نہ کرے۔

تازہ نشانات بالکل واضح تھے۔

مجھے توقع تھی کہ مجرم میری دسترس سے باہر نہیں جا سکتے۔ بس مجھے مستقل مزاجی سے ان کے پیچھے چلتے رہنا ہوگا۔

شیر خان اور اس کے دونوں ساتھیوں کی سرگرمیاں دن بدن لوگوں کے لیے پریشانی کا باعث بنتی جا رہی تھیں اور متعدد وارداتوں میں ملوّث ہونے کی وجہ سے اب وہ کسی گروہ کی حیثیت سے بدنام ہو گئے تھے۔

ان تینوں کی عمریں تقریباً برابر تھیں۔ شیر خان البتہ ان میں دراز قد اور مضبوط جسم کا مالک تھا چنانچہ اسے از خود سرغنہ کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔ شیر خان کے خاندان کو میں خوب جانتا تھا۔ اس کا باپ بھی کوئی شریف آدمی نہیں تھا۔ وہ ایک بدنام عورت کے چکر میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ ماں اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وقت مر گئی تھی جب شیر خان ابھی بچہ ہی تھا چنانچہ اُسے دُور کے رشتے داروں سے ملنے والی خیرات کے ٹکڑوں پر زندہ رہنا پڑا تھا۔ وہ ان کی اُترن پہن پہن کر جوان ہُوا اور گھر گھر سے ملنے والی ذلت و رُسوائی نے اُسے منفی قسم کے انتقامی ردِّ عمل میں مبتلا کر دیا تھا۔

اس نے انہی گھروں پر ہاتھ صاف کرنے سے ابتدا کی تھی جہاں اُسے پناہ دینے کے بعد نوکروں کی طرح کام لیا جاتا تھا اور بات بے بات اُسے گالیاں کھانے کو ملا کرتی تھیں۔ یوں وہ ایک گھر سے نکالا گیا تو تھوڑے ہی دنوں میں دوسرے گھر میں بھی حالات اس کے خلاف سازش کر لیتے تھے۔ اب وہ کسی کا نہیں تھا اور اس کے کرتوت دیکھ کر رشتے داروں نے اس سے ہر تعلق ختم کر دیا تھا۔

گل زمان کی زندگی بھی ایسے ہی حالات میں گزری تھی۔

اس کا باپ نشے کا عادی تھا اور اس نے دوسری شادی کر لی تھی چنانچہ وہ دل برداشتہ ہو کر خود ہی گھر سے نکل آیا تھا۔ اس گھر میں رہنا یوں بھی ممکن نہیں ہوتا جہاں سوتیلی ماں کی آنکھوں میں وجود کانٹے کی طرح کھٹکتا ہو اور باپ کو نشے کی وجہ سے خود اپنا ہی ہوش نہ ہو۔

بہرام البتہ ایک شریف گھرانے سے تعلق رکھتا تھا لیکن اُسے گل زمان اور شیر خان کی صحبت لے ڈوبی تھی۔ بیوہ ماں نے اُس سے عملاً قطع تعلق کر لیا تھا اور وہ اس کے کسی قول و فعل کی ذمے داری قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہوتی تھی۔ وہ چرس کا عادی تھا اور یہ علت اس نے چھوٹی عمر ہی سے پال لی تھی جس کی وجہ سے وہ جسمانی طور پر کمزور تھا۔ اس بدنام ٹکون کا سب سے کمزور حصہ بہرام ہی تھا۔ وہ شاید اپنی جسمانی کمزوری کے احساسِ کمتری میں مبتلا تھا اس لیے اس نے شیر خان جیسے مضبوط و توانا شخص کے ساتھ مل کر کارہائے نمایاں انجام دینے کی خواہش پر سرِ تسلیم خم کر دیا تھا۔

اس سے پہلے بھی ان کی وارداتوں کا حال میرے کانوں تک پہنچتا رہتا تھا۔۔ لیکن ان کے جرائم بھیڑ بکریاں، گھوڑے یا اسی قسم کی چھوٹی موٹی چوریوں تک محدود تھے اور اکا دُکا مسافروں کو لوٹ لینا ان کے لیے آسان سا کام تھا لیکن انہوں نے کبھی کوئی ایسی واردات نہیں کی تھی جس کے لیے انہیں جرگے کے سامنے جواب دہ ہونا پڑتا۔ اب تک انہوں نے کوئی قتل نہیں کیا تھا۔۔ لیکن اب ان کے حوصلے اتنے بڑھ گئے تھے کہ انہوں نے اپنے ہی علاقے کے بوڑھے سردار اور اس کے ساتھیوں کو ہلاک کر کے لوٹ لیا تھا۔

انہوں نے سات یوم کی مسافت طے کر کے اس جگہ پڑاؤ ڈالا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ ہم لوگ شہر سے واپسی پر اسی راستے سے گزریں گے۔ اس کا مطلب تھا کہ انہوں نے لوٹ مار کا منصوبہ بناتے وقت مجھے بھی نظر انداز کر دیا تھا۔ یہ سوچتے ہُوئے میرے جبڑے غصے سے بھنچ گئے۔

شاید ان کا خیال ہوگا کہ ان کے اس گھناؤنے فعل کی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوگی۔ کوئی چشم دید گواہ نہ ہونے کی وجہ سے واردات کو نامعلوم رہزنوں سے منسوب کر دیا جائے گا۔۔۔ پھر واردات گھوری سے اتنے فاصلے پر ہُوئی تھی کہ کسی کا ان کی طرف دھیان جا بھی نہیں سکتا تھا۔ میں یہ سوچ کر تلخی سے مُسکرا دیا کہ وہ بے خوف و خطر اس مالِ غنیمت پر عیش کرنے کے منصوبے بنا رہے ہوں گے۔ اگر وہ ایسا سمجھ رہے ہیں تو بڑی غلطی پر ہیں۔ وہ سردار کو مُردہ سمجھ کر چھوڑ گئے تھے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ سردار میرے پہنچنے تک نہ صرف زندہ رہا ہے۔۔ بلکہ اس نے ان کے جرم کو بے نقاب بھی کر دیا ہے۔

میں گھوڑوں کے سُموں کے نشانات کے سہارے مسلسل آگے بڑھتا رہا۔ دُھوپ میں رفتہ رفتہ تیزی آتی جا رہی تھی۔

دوپہر کو میں ایک چٹان کے سائے میں رُک کر ستانے لگا۔

گھوڑا پسینے سے شرابور ہو رہا تھا۔

میرے پاس بوتل میں تھوڑا سا پانی تھا۔ چند گھونٹ لینے کے بعد میں نے گھوڑے کے مُنہ میں کچھ پانی اُنڈیل دیا۔ شام کے سائے ڈھلنے لگے تو میں دوبارہ آگے بڑھ گیا۔

شام ہو گئی لیکن میں مسلسل آگے بڑھتا رہا۔

مُجرموں کو فرار ہونے کے لیے کافی وقت مل گیا تھا اور وہ نہ جانے کہاں سے کہاں نکل گئے ہوں گے۔۔۔ اور اب اس گزرے وقت کی لگامیں کھینچ کر میں مُجرموں کے اور اپنے درمیان فاصلہ کم کرنے کی ہر ممکن کوشش کر رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں آرام کرنے میں کم سے کم وقت ضائع کر رہا تھا۔

سُورج غروب ہونے سے کچھ پہلے مجھے ایک پہاڑ کے دامن سے دُھوئیں کا بَل کھاتا ہُوا بادل سا اُٹھتا نظر آیا۔

میں نے گھوڑے کی لگامیں کھینچ لیں اور غور سے اس طرف دیکھنے لگا۔ دُھوئیں کا غبار سا بلند ہو رہا تھا اور یہ کسی انسان کی موجودگی کا نشان تھا۔ اس علاقے میں آبادی کا دُور دُور نام و نشان تک نہیں تھا اور یہاں کسی خانہ بدوش قبیلے

کے قیام کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کیوں کہ قرب و جوار میں تو کہیں بھی پانی نہیں تھا۔

میں نے گھوڑے کی لگام کھینچی اور اس کا رُخ پہاڑ کی طرف کر دیا۔ گھوڑا پتھروں پر قدم جماتا آگے بڑھتا رہا۔ پتھر سے آہنی نعلوں کے ٹکرانے کا شور اس خاموشی میں دُور تک سُنا جا سکتا تھا۔

تین معمولی نسل کے گھوڑے میں نے دُور ہی سے دیکھ لیے۔ جس جگہ سے دُھواں اُٹھ رہا تھا، وہاں تھوڑا سا ہموار سرسبز قطعہ زمین تھا۔ اچانک مجھے ایک اور گھوڑا دکھائی دیا۔۔ فاصلے کے باوجود میں اس گھوڑے کو آسانی سے پہچان گیا۔

یہ سردار کا وہی گھوڑا تھا جسے میں نے سردار کی تدفین کے بعد آزاد کر دیا تھا۔ اس نے آزادی ملتے ہی ایک بار پھر اپنے مالک کے قاتلوں کی طرف رُخ کیا تھا اور بالآخر مجھ سے پہلے ہی وہاں جا پہنچا تھا۔ کتے کے بعد انسان سے وفاداری نبھانے والا جانور صرف گھوڑا ہی ہے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے سردار کا گھوڑا اپنے مالک کے ساتھ ہونے والے ظلم و بربریت کے نظارے پر شرمندہ ہو۔

میرے سامنے تین آدمی تھے۔ ان میں سے دو کو تو میں نے دُور ہی سے پہچان لیا لیکن تیسرا شخص میرے لیے اجنبی تھا۔ وہ آلتی پالتی مارے شاید جُوا کھیلنے میں مصروف تھے۔ میں بے چین ہو گیا کیوں کہ ان میں شیر خان کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔

میں نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ وادی میں کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جہاں کوئی کسی کی گھات میں بیٹھ سکتا اس لیے میں یہی سمجھنے پر مجبور ہو گیا کہ شیر خان آگے جا چکا ہے۔ ممکن ہے ان لوگوں نے احتیاطی کارروائی کے طور پر ایسا کیا ہو۔ غالباً انہیں یقین ہوگا کہ لاشیں دیکھنے کے بعد میں قاتلوں کی تلاش میں ضرور نکلوں گا۔۔۔ ایسے میں اگر وہ لوٹ کی رقم کے ساتھ میرے ہاتھ لگ گئے تو میں انہیں ہرگز زندہ نہیں چھوڑوں گا۔

وہ زور زور سے باتیں کر رہے تھے اور ان کے قہقہوں سے بار بار وادی گونج اُٹھتی تھی۔ میں گھوڑے پر بیٹھا رہا اور آہستہ آہستہ آگے بڑھتا رہا۔ قریب پہنچ کر میں نے دیکھا کہ ان کے درمیان نوٹوں کا چھوٹا سا ڈھیر لگا ہُوا ہے اور وہ جُوا کھیلنے میں مصروف ہیں۔

مارے غصے کے میری کنپٹیاں سُلگ اُٹھی تھیں۔ نہ جانے یہ وہی رقم تھی جسے انہوں نے سردار سے چھینا تھا۔۔۔ یا کوئی اور رقم تھی۔۔ یہ ان کی زندگی کی سب سے بڑی کامیابی تھی۔ کسی نے انہیں جُرم کا مرتکب ہوتے نہیں دیکھا تھا۔۔۔ اور بیس ہزار روپے قارون کے خزانے سے کم نہیں ہوتے۔

ان میں ایک اجنبی کو دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ صرف ان تینوں نے ہی یہ منصوبہ نہیں بنایا تھا بلکہ انہوں نے اور لوگوں کو بھی شریک کر لیا ہوگا۔۔ لیکن شیر خان کہاں گیا؟

اس کی عدم موجودگی مجھے اُلجھن میں ڈال رہی تھی۔

ان کے تینوں گھوڑے زور سے ہنہنائے۔ تب انہوں نے قہقہے اور باتیں روک کر میری طرف دیکھا۔ اطلس شاق نے وادی میں اُترتے ہی مخصوص انداز میں چلنا شروع کر دیا تھا اور یوں اس کے سُموں سے زیادہ تیز آواز نہیں پیدا ہو رہی تھی۔۔ لیکن پھر بھی اس کی ٹاپیں سُنائی دے رہی تھیں اور یہ آوازیں ان تینوں تک پہنچ گئی تھیں۔

گل زمان نے جلدی سے رائفل تھامی اور اُٹھ کھڑا ہُوا۔

اس کی رائفل کا رُخ میرے سینے کی جانب تھا۔

میں کسی چٹان کی طرح، اطلس کی پُشت پر جما بیٹھا تھا اور میری نگاہ ان سب کو اپنے احاطے میں لیے ہُوئے تھی۔ میں نے گل زمان کی آنکھوں میں خوف کے سائے لہراتے دیکھ لیے تھے۔ وہ مجھ پر رائفل تانے ہُوئے تھا، اس کے باوجود میری دہشت اس پر طاری تھی۔ اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا جس کی وجہ سے رائفل کی نال بھی تھرکتی ہُوئی محسوس ہو رہی تھی۔

یہ بڑا خطرناک لمحہ تھا۔

جن لوگوں نے بیس ہزار روپے کی خاطر پانچ آدمیوں کا خون بہا دیا تھا، وہ اس میں ایک اور آدمی کے خون کا بھی اضافہ کر سکتے تھے لیکن اس قسم کے خوف و خدشے میرے ذہن سے ہمیشہ کوسوں دُور رہتے تھے۔ میں جانتا تھا کہ سامنے رہ کر ان دونوں میں سے کوئی بھی مجھ پر گولی چلانے کی ہمت نہیں کر سکتا جو مجھ سے واقف ہیں۔۔۔ البتہ تیسرا شخص کوئی ایسا اقدام کرے گا تو میں اس سے نمٹ بھی سکتا تھا۔

اس کے علاوہ انہیں یہ بھی توقع رہی ہوگی کہ میں محض اندازے ہی سے اس طرف نکل آیا ہوں ورنہ مجھے ان کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں ہوگا۔ اس کے علاوہ ایک اور خیال بھی انہیں مجھ پر گولی چلانے سے باز رکھ سکتا تھا کہ کہیں میں نے اس طرف آنے سے پہلے چند اور آدمیوں کو نہ بتا دیا ہو۔ ان کی نگاہیں میرے عقب میں دُور دُور تک چکرا رہی تھیں لیکن انہیں کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

میرے ساتھ کوئی تھا ہی نہیں اس لیے انہیں نظر بھی کوئی نہیں آنا چاہیے تھا۔ . . لیکن بات یہ تھی کہ میرے عقب میں پہاڑ تھا اور اس پہاڑ کی اوٹ میں کسی کی موجودگی کے امکان کو ملحوظ رکھا جا سکتا تھا۔ ایسی صورت میں وہ اطمینان کیے بغیر مجھ پر گولی چلانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔ کوئی بھی وجہ رہی ہو، مجھے کسی بات کی پروا نہیں تھی۔ میں نے زندگی کو ہمیشہ ایک ایسی امانت سمجھا تھا جو دینے والا جب چاہے واپس لے سکتا ہے۔

میں نے ان سے بیس قدم کے فاصلے پر گھوڑے کی لگام کھینچ لی۔

کچھ دیر میں باری باری ان سب کا جائزہ لیتا رہا۔

گل زمان اور بہرام کے چہروں پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ . . پھر میری نگاہ اُس تیسرے آدمی پر جم گئی۔

وہ میرے لیے اجنبی تھا لیکن اس کے چہرے اور آنکھوں کے تاثرات میرے لیے اجنبی نہیں تھے۔ وہ ایک سفاک اور درندہ صفت شخص تھا۔ اس کی آنکھیں سُرخ تھیں جیسے وہ ہر وقت خون بہانے کا سودا ذہن پر سوار رکھنے کا عادی ہو۔ اس نے اپنے دونوں ساتھیوں کی طرف دیکھا اور پھر ان کو خوف زدہ محسوس کر کے اس کی آنکھوں اور چہرے سے لمحہ بھر کو اُلجھن ظاہر ہوئی لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے خود کو حالات سے بے نیاز ظاہر کرنا شروع کر دیا۔

"کیا بات ہے، شہباز . . ." گل زمان نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ وہ بار بار تھوک نگل رہا تھا۔ "تم ہمیں اس طرح کیوں گھور رہے ہو؟"

"کیا تمھیں کچھ معلوم نہیں؟" میں نے لہجے کو ہر ممکن طور پر نرم رکھتے ہوئے سوال کیا۔

"نہیں . . . خیر تو ہے؟" اس نے حیرت ظاہر کی اور بہرام کے بعد اپنے اجنبی دوست کی طرف دیکھا۔ دونوں نے لاعلمی کے اظہار میں سر کو دائیں بائیں حرکت دی تو گل زمان دوبارہ میری طرف متوجہ ہو گیا۔ "ہمیں تو کچھ بھی معلوم نہیں ہے۔"

"سردار اور اس کے چار ساتھیوں کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا ہے۔" میں نے لہجے کی سختی سے جدوجہد کرتے ہوئے بتایا۔

"اور یہ کل کی بات ہے۔"

"اوہ . . . بہت افسوس ہوا۔" بہرام نے ہونٹوں پر گیلی زبان پھیر کر انہیں تر کرتے ہوئے کہا۔ "وہ ایک عظیم سردار تھا اور اس خبر نے میرے دل پر چوٹ لگائی ہے۔"

"سردار کو گولی مار دی گئی . . ." گل زمان جلدی سے بولا۔ "یقیناً یہ فرنگیوں کی حرکت ہے۔" یہ کہہ کر اس نے اپنے اجنبی ساتھی کی طرف دیکھا جس نے کوئی تاثر ظاہر نہیں کیا۔ "کیوں طلوط خان؟"

"ہو سکتا ہے . . . لیکن اس علاقے میں ڈاکوؤں کی بھی کمی نہیں۔" طلوط نے کہا۔ اس کی آواز سخت تھی جیسے وہ طوعاً وکرہاً اپنے ساتھیوں کی حمایت میں بول رہا ہو۔ "کوئی مالی نقصان تو نہیں ہوا؟" اس نے یہ سوال براہِ راست مجھ سے کیا تھا۔ اس کی آنکھیں میری آنکھوں میں گڑ گئی تھیں جیسے وہ اپنی قوتِ ارادی اور سخت گیری سے مجھے زیر کرنا چاہتا ہو۔

"مالی نقصان بھی ہوا ہے۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "اور مالی وجانی نقصان سے بڑھ کر جو نقصان ہوا ہے، اُسے تم جیسے لوگ شاید کوئی اہمیت نہیں دیتے۔"

"زبان کو اپنے قد کے برابر استعمال کرو، نوجوان۔" طلوط کی آنکھیں یکایک دہکتے کوئلوں کی طرح سُرخ ہو گئیں۔

"میرے قد کا تمھیں ٹھیک سے اندازہ نہیں۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ میری مسکراہٹ یقیناً ایسی تھی کہ اس کے لیے حوصلہ شکن ثابت ہوئی ہو گی کیوں کہ میں نے اس کی آنکھوں میں لمحے بھر کو خوف کا سایہ لہراتے دیکھ لیا تھا۔ "میرے قد سے جو لوگ آگاہ ہیں، یہ بات انہی کو کہنی چاہیے تھی۔"

"یہ لڑکا کون ہے؟" طلوط نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا۔

"اس کا نام شہباز ہے اور یہ نگوری کا شہ زور ہے۔" بہرام نے خشک ہونٹوں پر ایک بار پھر زبان پھیری۔

"ہوں . . . میں تمہارا نام سُن چکا ہوں۔" طلوط نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس کے انداز میں یکایک تبدیلی پیدا ہو گئی تھی۔ "میں تمھاری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتا ہوں۔"

میں گھوڑے سے کود چکا تھا اور اب گھوڑے کے قریب ہی ان لوگوں کے سامنے کھڑا تھا۔ میں نے طلوط خان کے بڑھے ہوئے ہاتھ کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ کچھ دیر اس کا ہاتھ پھیلا رہا . . . پھر آہستہ آہستہ جھکنے لگا حتیٰ کہ دائیں ران کے ساتھ لٹکتے ہوئے ہولسٹر کے قریب جا پہنچا۔ میں اس وقت بظاہر طلوط خان کی طرف سے غافل تھا لیکن درحقیقت میں اس کی ایک ایک حرکت کا جائزہ لے رہا تھا۔

مارے ذلت کے اس کا چہرہ سُرخ ہو گیا تھا اور اس کی آنکھوں سے غصے کی چنگاریاں سی نکل رہی تھیں . . . لیکن میں نے دیکھا کہ اس کی انگلیاں ہولسٹر کا تسمہ الگ کرتے وقت کانپ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رہی تھیں۔ غالباً اسی وجہ سے وہ اسے کھولنے میں کامیاب ہو سکا۔

"شیر خان کہاں ہے؟" میں نے گل زمان کو گھورتے ہوئے کہا۔

"معلوم نہیں۔" وہ تھوک نگل کر بولا۔

"تم بھی نہیں جانتے؟" میں نے بہرام کی طرف دیکھا۔

اس نے بولنے کی کوشش کی لیکن سُوکھے ہوئے حلق کی وجہ سے آواز نہ نکلی۔ تب اس نے سر کو نفی میں حرکت دیتے ہوئے لاعلمی کا اظہار کر دیا۔ میں نے طلوط خان کی طرف دیکھا۔ اس نے منہ پھیر لیا۔

"سردار اور ساتھیوں کو قتل کر کے بیس ہزار روپے لوٹے گئے ہیں۔" میں نے گونجیلی آواز میں کہا۔ "یہ رقم نگوری کے ان محنت کشوں کی سال بھر کی کمائی ہے جو اس سے زندگی کی راہ ہموار کرنا چاہتے تھے۔ یہ رقم امانت تھی اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ قاتلوں کو عبرت ناک سزا دوں گا . . . لیکن ایسے لوگوں کے لیے معافی و درگزر کا دروازہ بھی کھلا ہے جو اپنے جرم کا اعتراف کر کے رقم میرے حوالے کر دیں اور خود کو جرگے کے سامنے پیش کرنے کے لیے آمادہ ہوں۔"

تینوں خاموش کھڑے رہے۔

"کیا تم میں سے کوئی بتا سکتا ہے کہ یہ حرکت کن لوگوں کی ہو سکتی ہے اور وہ رقم کہاں ہے؟"

اس بار بھی تینوں نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ طلوط خان تو وہیں اسی جگہ جا بیٹھا تھا جہاں میری آمد سے پہلے براجمان تھا۔ اس کے ہاتھ تاش کے پتوں سے کھیلنے لگے تھے۔

بہرام اور گل زمان بھی منہ پھیر کر اس کے قریب جا بیٹھے۔

"تم دونوں نگوری سے اتنی دور کیا کر رہے ہو؟" میں نے ان سے پوچھا۔

"ہم پر کوئی پابندی تو نہیں۔" گل زمان نے قدرے جرأت سے کہا۔ میں نے اُسے طلوط خان سے آنکھوں ہی آنکھوں میں کوئی مشورہ کرتے دیکھ لیا۔ "ہم جہاں چاہیں گھوم سکتے ہیں۔"

"اور جسے چاہو اُسے لوٹ بھی سکتے ہو . . . اور اُسے قتل بھی کر سکتے ہو۔" میں نے حتمی لہجے میں کہا۔

اس بار انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا اور کھیل میں مصروف ہو گئے۔ میں کچھ دیر کھڑا انہیں گھورتا رہا۔ میرے ذہن میں نفرت کی آندھیاں سی چل رہی تھیں لیکن شیر خان کی عدم موجودگی مجھے ان لوگوں سے اُلجھنے سے روک رہی تھی۔

"میرا خیال ہے سردار اور ساتھیوں کو تم لوگوں نے قتل کیا ہے۔"

بہرام اور گل زمان چونک کر میری طرف دیکھنے لگے۔

"اور وہ رقم اس وقت بھی تمھارے پاس ہے۔"

"بہرام . . ." طلوط خان ہنس پڑا۔ "کہیں تمھارے اس شہ زور کو دم لگانے کی تو عادت نہیں۔ یہ کیا کہہ رہا ہے؟"

"اسے شاید اپنی شہ زوری کا نشہ ہو گیا ہے۔" گل زمان بڑبڑایا۔

"میں نشے میں ہوں اور نہ ہی شہ زوری کا خناس میرے ذہن پر سوار ہے۔ میں کمزوروں پر ہاتھ اُٹھانا پسند نہیں کرتا۔ تم دونوں اچھی طرح جانتے ہو۔"

"اور تم بھی اچھی طرح جانتے ہو، شہباز کہ میں نگوری کا سب سے کمزور آدمی ہوں۔" بہرام نے جلدی سے کہا۔

اس پر طلوط اور گل زمان کھل کھلا کر ہنس پڑے۔

"چونکہ قتل سردار کو کیا گیا ہے اس لیے قبیلے کا جرگہ ہی قاتلوں کے لیے سزا تجویز کرے گا۔ میں صرف وہ رقم حاصل کرنا چاہتا ہوں جو لوگوں کی امانت ہے۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔

"گل زمان . . ." طلوط نے مضحکہ اُڑانے والے لہجے میں کہا۔ "اگر تمھارے شہ زور کا اشارہ اس رقم کی طرف ہے، جو تم نے داؤ پر لگا رکھی ہے تو اس پر دیکھنا کسی کا نام تو نہیں لکھا ہوا ہے؟"

گل زمان نے ایک نوٹ اُٹھا کر دیکھا۔ "نام تو لکھا ہے . . . لیکن نگوری کے سردار کا نہیں بلکہ حکومتِ وقت کا نام لکھا ہوا ہے۔"

"بکواس بند کرو۔" میں چیخ پڑا۔ "تم فرنگی کے نطفے ہو۔"

گل زمان نے پتے پھینک دیے اور تڑپ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے دائیں ہاتھ میں رائفل دبی ہوئی تھی اور اس کے ہونٹ غصے کی زیادتی سے کانپنے لگے تھے۔ کچھ دیر وہ مجھے گھورتا رہا . . . پھر اس نے جارحانہ لہجے میں کہا۔

"شہباز! تو ہمارے ساتھ کھیل کر جوان ہوا ہے۔ مجھے تیری جوانی پر ترس آتا ہے۔ جان پیاری ہے تو خاموشی سے چلا جا۔ ہم نے کسی کو قتل نہیں کیا اور نہ ہی کسی کو لُوٹا ہے۔ یہ رقم جو تم دیکھ رہے ہو، یہ ہماری ہے اور ہم اسے ایک دوسرے سے جیتنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اگر تم اس رقم کو ہم سے چھین لینا چاہتے ہو تو یہ تمھاری بھول ہے۔ ہم اس میں سے تجھے ایک پیسہ بھی نہیں دیں گے۔ چاہو تو آزما کر دیکھ لو۔"

بہرام اب تک خاموش تھا۔ اس کی رائفل پہلو میں پڑی تھی جب کہ گل زمان کے اُٹھتے ہی طلوط نے ریوالور نکال لیا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اس گھوڑے کو لوگ پہچانتے ہیں" میں نے مشتعل ہوئے بغیر کہا۔ میں اس وقت دو گولیوں کی زد میں تھا . . . لیکن مجھے اُمید تھی کہ وہ دونوں بزدل اس وقت تک مجھ پر گولی نہیں چلائیں گے جب تک میں خود ان پر حملہ نہیں کر دیتا۔

"گھوڑا . . . کس کا گھوڑا ہے، یہ" گل زمان نے ہنس کر کہا۔ "اس سے پوچھو بہرام کہ یہ کس کا گھوڑا ہے۔"

"میرا خیال ہے یہ گھوڑا اکیلا ہی ادھر آنکلا تھا" بہرام بڑبڑایا۔

"اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک آوارہ گھوڑا ہے" بلوط نے مکروہ انداز میں ہنس کر کہا۔ "یہ یقیناً میری گھوڑی کو ورغلانے آیا ہوگا۔"

"شہباز . . ." گل زمان نے ایک بار پھر مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔ اس کا لہجہ دوستانہ ہو گیا تھا۔ "بلاوجہ ہم پر شبہ نہ کرو اور نہ ہی ہم سے اُلجھ کر تمہیں کوئی فائدہ ہوگا . . . پھر ہم تو اُدھر سے آ رہے ہیں۔" اس نے مخالف سمت میں اشارہ کیا۔ "ادھر سے نہیں . . ." ہاتھ کے اشارے سے اس نے اُدھر اشارہ کیا، جدھر سے میں آیا تھا۔

"سنو گل زمان . . ." بہرام نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔ "میرا خیال ہے، ہمیں شہباز سے یوں نہیں اُلجھنا چاہیے۔ اس کے اطمینان کی خاطر کیوں نہ ہم اپنی جامہ تلاشی دے دیں۔ اس طرح اسے یقین ہو جائے گا کہ سردار کی موت اور ڈاکے کی واردات سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے۔"

گل زمان چند لمحے سوچتا رہا . . . پھر اس نے نگاہ اُٹھا کر میری طرف دیکھا اور بولا۔ "تم ہمارے بچپن کے ساتھی ہو اور پھر معاملہ ہمارے اپنے سردار کا ہے اس لیے میں یہ توہین برداشت کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

"تلاشی لینے کی ضرورت نہیں" میں نے کہا۔ ان کی باتوں سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ رقم ان کے پاس موجود نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ مر جاتے لیکن جامہ تلاشی کے لیے رضامند نہ ہوتے۔ "مجھے یقین ہے کہ رقم تمہارے پاس نہیں ہے۔"

اس دوران میں، میں سوچ چکا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ رقم حاصل کرنے سے پہلے مجھے کسی کو بھی ٹھکانے نہیں لگانا چاہیے تھا کیونکہ مجھے سب سے پہلے سردار کی رُوح پر سے امانت کے بوجھ کو اُتارنا تھا۔ اس کے بعد میں اطمینان سے اس کے خون کا بدلہ لے سکتا تھا اور ایسے بدلے لینے کے لیے کئی موقعے تھے بلکہ پوری زندگی پڑی تھی۔

بلوط خان خباثت سے مسکرا رہا تھا۔

"تم صرف مجھے یہ بتا دو کہ شیر خان کہاں ہے؟" میں نے کہا۔

"وہ کئی دنوں سے ہمیں بھی نہیں ملا۔ نہ جانے آج کل کس چکر میں ہے" گل زمان نے کہا۔ "سنا ہے، وہ فرنگی حکومت کی غلامی کرنے کا ارادہ کر رہا ہے۔"

"ٹھیک ہے گل زمان" میں نے مسکرا کر کہا۔ "یار زندہ صحبت باقی۔ کیا میں اس لاوارث گھوڑے کو لے جاؤں جو یہاں لاوارث کھڑا ہے۔ ایسے لاوارث گھوڑے کبھی کبھی بدمعاش بھی ہو جاتے ہیں . . . یہ تمہارے دوست بلوط خان کے گھر میں بھی گھس سکتا ہے۔"

بلوط خان نے تڑپ کر ریوالور نکال لیا۔

میں خاموش کھڑا رہا۔

بہرام نے بھی رائفل اُٹھالی تھی اور اس کا رُخ بلوط خان کی طرف تھا۔ اس کمزور سے نوجوان کی اس ہمت پر میں حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ "نہیں بلوط خان۔ تم شہباز پر گولی نہیں چلاؤ گے۔" اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

بلوط خان غصے سے پاگل ہو رہا تھا۔ میں نے ابھی تک اپنی رائفل نہیں اُتاری تھی اور نہ ہی میں نے قمیص کے نیچے چھپے ہوئے ہولسٹر سے ریوالور تک ہاتھ لے جانے کی کوشش کی تھی۔

وہ اچانک ہی پلٹ پڑا۔

اچانک اس کا ہاتھ اُٹھا اور پھر اس نے پے در پے تین گولیاں چلائیں۔ اس کا نشانہ گھوڑا تھا۔ گولیاں گھوڑے کے پیٹ میں لگی تھیں اس لیے وہ گولی کھا کر پہلے تو زمین سے کئی ہاتھ اوپر اُچھلا . . . پھر زمین پر گرا اور بُری طرح تڑپنے لگا۔ گولیوں کے دھماکوں اور گھوڑے کی آوازوں سے ان کے تینوں گھوڑے بدک گئے۔

وہ بُری طرح ہنہنانے لگے تھے اور انہوں نے اُچھل کود کر خود کو رسیوں سے آزاد کرانے کی کوشش شروع کر دی تھی۔ وادی ان آوازوں سے لرز اُٹھی تھی۔ میں نے اپنے گھوڑے کی گردن پر ہاتھ پھیرا اور اُسے تھپک کر پُرسکون رکھنے کی کوشش کی۔

بلوط خان بُری طرح ہانپ رہا تھا۔

گھوڑا پیٹ میں گولیاں لگنے سے بُری طرح تڑپ رہا تھا۔

"بلوط خان . . ." میں نے مسکرا کر کہا۔ "اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تم انسان نہیں بلکہ درندے ہو۔ شاید تم نہیں جانتے کہ گھوڑے کے پیٹ میں گولی ماری جائے تو اسے مرنے میں کتنی دیر لگتی ہے . . . اور مرنے میں جتنی دیر لگتی ہے، مرنے والے کو اتنی

ہی اذیت ہوتی ہے۔"

"میں جانتا ہوں" اس نے خونخوار لہجے میں کہا۔

"جب تم یہ بات جانتے تھے تو تمہیں گھوڑے کے سر میں گولی مارنی چاہیے تھی" میں نے پُرسکون لہجے میں کہا۔

وہ خاموش رہا۔ بہرام اور گل زمان بھی خاموش تھے۔

"تم نے جانتے بوجھتے گھوڑے کے پیٹ میں گولی ماری ہے اس کا مطلب ہے کہ تم دانستہ اسے اذیت ناک موت مارنا چاہتے تھے۔"

"تم کچھ بھی سمجھ لو . . ." وہ بڑبڑایا۔

"لیکن میں تمہیں احساس دلانا چاہتا ہوں کہ اس قسم کی موت کتنی اذیت ناک ہوتی ہے" میں نے مسکرا کر کہا . . . اور پھر میرا دایاں ہاتھ بجلی کے کوندے کی طرح قمیص کے نیچے چھپے ہوئے ہولسٹر تک جا پہنچا۔ اگلے ہی لمحے ریوالور میرے ہاتھ میں تھا۔

. . . پھر میری شہادت کی اُنگلی نے دو بار دباؤ ڈالا۔

دو دھماکے ہوئے . . . دو گولیاں چلیں۔

ایک گولی نے بلوط خان کے ہاتھ سے ریوالور چھین لیا اور دوسری گولی اس کے پیٹ میں لگی۔ وہ چیخ کر زمین پر گر گیا۔ وہ بُری طرح ایڑیاں رگڑ رہا تھا اور اس کے حلق سے عجیب عجیب آوازیں نکل رہی تھیں۔

گل زمان اور بہرام دہشت زدہ کھڑے رہ گئے۔

انہیں احساس تک نہیں ہوا تھا کہ کب میرا ریوالور نکل کر ہاتھ میں پہنچا اور کب میں نے دو گولیاں بھی چلا دیں۔ انہوں نے تو صرف دو دھماکے سنے ہوں گے یا پھر انہوں نے اچانک ہی بلوط خان کو گرتے دیکھا ہوگا۔ میں نے ریوالور کی نال میں پھونک مار کر دھواں اُڑایا اور اسے دوبارہ ہولسٹر میں رکھ لیا۔

"اب قاتل اور مقتول دونوں ایک ساتھ دَم توڑیں گے۔" میں نے حقارت سے بلوط خان کی طرف تھوکتے ہوئے کہا۔ "اچھا دوستو! تم دونوں سے پھر ملاقات ہوگی۔ ہو سکے تو میری بات پر غور کرنا۔"

"کس بات پر؟" بہرام نے تھوک نگل کر پوچھا۔

"ایسے لوگوں کے لیے معافی اور درگزر کا دروازہ کھلا ہے جو اپنے جرم کا اعتراف کر کے رقم میرے حوالے کر دیں اور خود کو جرگے کے سامنے پیش کرنے کے لیے آمادہ ہوں۔"

دونوں نے سر جھکا لیا۔

میں خاموشی سے اپنے گھوڑے کی طرف پلٹ پڑا۔

مجھے کسی رائفل سے نکلنے والی گولی کا انتظار تھا مگر کسی نے مجھ پر فائر نہیں کیا۔ میں پلٹ کر دیکھے بغیر چلتا رہا۔ میرے اور دشمنوں کے درمیان فاصلہ بڑھتا گیا۔ گھوڑے پر سوار ہو کر میں نے اسے ایڑ نہیں لگائی تھی بلکہ اطمینان سے اُسے چلاتا ہوا بالآخر خطرے کی حدود سے نکل آیا۔

واپسی پر مجھے اپنی شکست کا احساس تھا۔

مجھے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا کیونکہ رقم ان کے پاس نہیں تھی بلکہ شیر خان رقم لے کر کہیں چلا گیا تھا۔ میں نے گل زمان اور بہرام کو غلط فہمی میں ڈالنے کے لیے مخالف سمت میں سفر کرنا شروع کر دیا تھا . . . اور پھر کافی دُور جانے کے بعد مجھے واپس آنا تھا۔ اب ان سے میری کھلی جنگ کا آغاز ہو گیا تھا۔ میں نے یہ صورتِ حال قبول کر لی تھی اور فیصلہ خدا پر چھوڑ دیا تھا۔

میں ابھی تو پے سے آٹھ دس میل آگے تقریباً اس مقام پر تھا جہاں سے گل زئی اور بارشئے تقریباً یکساں فاصلے پر واقع تھے۔ اس کے بعد شیبیار سے آگے ایک برساتی ندی تھی جس کے پُل کو عبور کرنے کے لیے چاہ نور کی طرف بیس میل سفر کرنا پڑتا تھا۔

یہ کم از کم تین روز کی مسافت تھی کیونکہ پہاڑی علاقہ کہیں کہیں بے حد دُشوار گزار ہو جاتا تھا۔ پہاڑی پگڈنڈی کہیں تو پُرپیچ بلندیوں کی طرف لے جاتی تھی اور کبھی خطرناک گھاٹیوں یا نشیبی جنگلوں سے گزرتی تھی۔ یہ راستہ بھی انسانی قدموں کا تراشا ہوا تھا۔ ان انسانوں کے پیروں سے جو صدیوں سے اس پر سفر کر رہے تھے۔ ان آزاد قبائل کے لوگوں کے سوا اس علاقے میں کسی اجنبی کا صحیح سمت میں سفر کرنا محال تھا جو فرنگی حکومت کی اصطلاح میں علاقہ غیر کہلاتا تھا۔ اندازے کی ذرا سی غلطی منزل سے اتنی دُور پہنچا دیتی تھی کہ ناواقف آدمی اِدھر سے اُدھر بھٹکتا ہوا اور پہاڑوں سے سر ٹکراتا موت کے منہ میں پہنچ جاتا تھا . . . اور کوئی اُسے راستہ بتانے والا نہیں ملتا تھا۔

جہاں چند قدیم قبائل کی آبادی پھیلتے پھیلتے قصبے کی صورت اختیار کر گئی تھی، وہاں کچی سڑکیں بھی تھیں جن پر ہر وقت دُھول اُڑتی رہتی تھی لیکن بیشتر علاقے میں پگڈنڈیوں جیسے رستے [illegible] کی طرح بکھرے ہوئے تھے اور ہر رستہ آگے جا کر دو یا تین شاخوں میں بٹ جاتا تھا چنانچہ قطب نما یا قطب ستارے کی رہنمائی کے بغیر محض اپنی عقل پر بھروسہ کر کے راستے کا انتخاب کرنے والا شخص اپنی منزل پر جا پہنچے تو اُسے اس شخص کی خوش قسمتی پر مبنی اتفاق کی بات ہی سمجھا جا سکتا تھا۔ [illegible] نہیں

آئی تھی۔

مجھے بار بار سردار کی اس قبر کا خیال آرہا تھا جو اپنے قبیلے سے بہت دُور ایک ویرانے میں بنی تھی۔ . . لیکن میرے لیے اس کو اُس ابدی آرام گاہ تک لے جانا ممکن نہیں تھا، جہاں اس کے آباؤ اجداد کے جسدِ خاکی، پہلو بہ پہلو لیٹے صورِ اسرافیل کا انتظار کر رہے تھے۔ گرمی اتنی زیادہ تھی کہ سردار کا جسم چند گھنٹوں سے زیادہ اپنی اصلی حالت میں نہیں رہ سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے اسے فوراً ہی دفن کر دیا تھا۔

میں ایک جگہ رُک کر غور کرنے لگا۔

ابھی تک مجھے اپنے تعاقب میں کوئی سایہ تک نظر نہیں آیا تھا۔ کسی کی آہٹ بھی سُنائی نہیں دی تھی اور نہ ہی اطلس نے کسی قسم کی بے چینی کا اظہار کیا تھا۔ میں ان امکانی جگہوں کے بارے میں غور کر رہا تھا جہاں مفرور مجرم خود کو روپوش کر سکتے تھے یا جہاں جہاں ان کو پناہ مل سکتی تھی۔

بہت سوچ وبچار کے بعد میں نے گل زئی کا راستہ اختیار کیا جہاں ڈیرے کے سردار کے بارے میں مجھے معلوم تھا۔ اس کا نام خوشحال خان تھا اور یہ قبیلہ ہمارے قبیلے کا حلیف تھا۔

ایک بار فرنگیوں کی ایک پلاٹون باغیوں کا پیچھا کرتی ہوئی خوشحال خان کے ڈیرے تک آپہنچی تھی۔ انگریز کپتان جیفرسن کا خیال تھا کہ مفرور باغی بارشے کی طرف نہیں گئے بلکہ ٹوپے سے آگے ان کا رُخ گل زئی کی جانب ہو گیا تھا۔ دراصل مفرور باغیوں نے راستے میں ایک جگہ قیام کیا تھا تو وہاں اپنی ایسی نشانیاں چھوڑ گئے تھے جو ہر اعتبار سے ان کی رہنمائی کر سکتی تھیں۔ اگرچہ وہ اشیا غیر اہم تھیں لیکن ان سے اندازے بے حد اہم لگائے جا سکتے تھے۔ چند ایسے کارتوسوں کے خول جنہیں کوہاٹ جیل کے مال خانے سے لُوٹا گیا تھا اور بسکٹوں کے وہ خالی ڈبے جو صرف فرنگی فوج کو راشن میں دیے جاتے تھے۔

کیپٹن جیفرسن کے نزدیک جو مفرور غدار اور باغی تھے، ان کے لیے اس نے سزائے موت تجویز کی تھی۔ ان لوگوں کا قصور یہ تھا کہ انہوں نے تین فرنگی افسروں کو صرف "سُور کا بچہ" کہنے پہ قتل کر دیا تھا۔

سردار خوشحال خان نے کپتان جیفرسن کو سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ کوئی بھی غیرت مند پٹھان اس گالی کو برداشت نہیں کر سکتا۔ . . بہرحال جُرم سے قطع نظر یہ خیال غلط ہے کہ مجرم گل زئی میں چھپے ہُوئے ہیں۔ ممکن ہے انہوں نے محض دھوکا دینے کے لیے وہ اشیا جان بُوجھ کر وہاں چھوڑ دی ہوں اور پھر وہ لوگ مختلف سمتوں میں فرار ہو گئے ہوں۔

کیپٹن جیفرسن غصّے سے پاگل ہو رہا تھا اس لیے وہ کوئی جواز سُننے پر آمادہ نہ ہُوا۔ اس نے حکم دے دیا کہ گل زئی کے ایک ایک گھر کی تلاشی لی جائے۔ نمک خوار بندوقیں تانے اس کے ساتھ ساتھ تھے اس لیے یہ تلاشی لی گئی۔ . . اور صبح جب جیفرسن کو ناکامی کی اطلاع دی گئی تو اس کا مارے غصّے کے عجیب حال ہو گیا۔ اس نے سردار خوشحال خان کو گرفتار کر لیا۔

سردار خوشحال خان کی گرفتاری سے گل زئی میں بے چینی کی لہر دوڑ گئی لیکن وہ لوگ فوج کے سامنے بے بس تھے۔ جیفرسن نے اعلان کر دیا کہ وہ خوشحال خان کو ساتھ لے جا رہا ہے۔ جب مفرور مجرم سیاسی ایجنٹ کے حوالے کر دیے جائیں گے تو سردار کو چھوڑ دیا جائے گا۔ یوں اس نے علاقے کے لوگوں کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنے سردار کی محبت میں وہ کام کریں جو فوج کو کرنا چاہیے تھا۔ . . یعنی ان مفرور مجرموں کو تلاش کر کے فرنگیوں کے حوالے کر دیں یا پھر سردار سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔

چاہ نور سے آگے پُل عبور کرتے ہی فرنگیوں کی اس پلاٹون کو مگوری کے سردار اور اس کے ساتھیوں نے ایک ایسی جگہ گھیرے میں لے لیا جہاں فرنگی لاتعداد ہونے کے باوجود زندہ واپس نہیں جا سکتے تھے۔ یوں پُوری فرنگی پلاٹون کا صفایا کر کے لاشیں دریا بُرد کر دی گئیں اور کیپٹن جیفرسن سمیت تمام نمک حرام اور ضمیر فروش انڈین سپاہیوں کے سَر، سیاسی ایجنٹ کو ارسال کر دیے گئے اور یہ پیغام بھی بھجوا دیا کہ اگر آیندہ کسی فرنگی دستے نے آزاد قبائل سے ناجائز چھیڑ چھاڑ کی تو ان کی چھاؤنیوں پر شب خون مارے جائیں گے اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک ایک بھی فرنگی اس مقدس سرزمین پر موجود ہے۔

سردار خوشحال خان کے قبیلے کو اس رہائی کی اطلاع دی گئی تو پُورا گل زئی عورتوں اور بچوں سمیت اُمڈ پڑا۔ لوگوں کی آمد پہ دونوں سردار اپنی اپنی کلاہ بدل کر بھائی چارے کے مضبوط رشتے میں بندھ گئے۔

گل زئی واپس آنے کے بعد سردار خوشحال نے اپنے ان تینوں مہمانوں کو خدا حافظ کہا جو اس کی قصر نُما حویلی میں ایک ایسی جگہ بحفاظت موجود تھے جہاں فرنگیوں کا ذہن رسائی نہیں پا سکتا تھا۔

یہ تینوں مفرور مجرم گورکھا رجمنٹ کے مسلمان سپاہی تھے۔

"خُدا کی قسم، ایک کیپٹن جیفرسن تو کیا خود وائسرائے کی فوج

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بھی آجاتی تو خوشحال خان کے بچّے بچّے کی لاش سے گزرے بغیر ان تینوں تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔" مگوری کے سردار نے یہ بات بچپن سے مرتے دَم تک نہ جانے کتنی بار میرے سامنے پُرجوش لہجے میں کہی تھی۔

برسوں پہلے استوار ہونے والی دوستی بالآخر ایک ایسے رشتے میں بدل گئی تھی جس کی بنیاد خون تھی۔ . . اور اب پھر وقت آگیا تھا کہ مگوری کا شہ زور شہباز اس کے گاؤں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ مجھے توقع تھی کہ وہاں پہنچنے کے بعد میرے لیے صورتِ حال بہتر ہو جائے گی۔

نہ جانے مجھے کیوں یقین تھا کہ شیر خان گل زئی کی طرف ہی گیا ہے اور ان دونوں بدمعاشوں کی منزل بھی وہی ہو گی۔ میں انہیں جس وادی میں چھوڑ کر مخالف سمت میں آیا تھا اس طرف سے گل زئی کا راستہ خاصا طویل تھا جب کہ وادی سے بستی تک پہنچنے میں زیادہ طوالت اور دُشواریاں حائل نہیں تھیں۔

میں بہت کم آرام کر رہا تھا اور گھوڑے کو بھی آرام کی مہلت نہیں مل رہی تھی اس کے باوجود میرا جفاکش اور وفادار گھوڑا میری طرح مسلسل آگے بڑھنے کی دُھن میں چلا ہی جا رہا تھا۔ گل زئی پہنچا تو مارے تھکن کے میری بُری حالت تھی اور گھوڑا پسینے سے یوں بھیگا ہُوا تھا جیسے ابھی ابھی پانی سے نکل کر آ رہا ہو۔ بستی کے جو لوگ مجھے پہچانتے تھے انہوں نے خوشی سے ہاتھ لہرائے اور مجھے خوش آمدید کہا۔

سردار خوشحال کو بھی غالباً اطلاع ہو گئی تھی۔

وہ دوڑا دوڑا آیا اور مجھ سے کچھ فاصلے پر ٹھٹھک گیا۔ اس کی جہاندیدہ آنکھوں نے دُور ہی سے بھانپ لیا تھا کہ کوئی غیر معمولی بات ضرور ہے۔ میری اور گھوڑے کی حالت اُسے سب کچھ بتا رہی تھی۔

"شہباز۔ . . میرے بے جگر بیٹے۔ . . یہ تو کس حال میں یہاں آیا ہے؟ خیریت تو ہے؟" اس نے لپک کر مجھے گلے لگاتے ہوئے کہا۔ "جلدی بتا کیا بات ہے۔ مگوری پر کوئی آفت تو نہیں ٹوٹ پڑی؟ میرا بھائی، میرا محسن اور میرا جگری دوست تو ٹھیک ہے؟"

"مگوری پر قیامت ٹوٹ پڑی ہے، سردار۔" میں نے جواب دیا۔

"لیکن کیسے؟ وہاں تک تو فرنگیوں کے قدم نہیں پہنچ سکتے۔"

"فرنگی وہی نہیں سردار جو برطانیہ سے آئے ہیں۔ فرنگی یہاں بھی پیدا ہُوتے ہیں۔ . . اور ان دیسی فرنگیوں نے سردار کو قتل کر کے اُسے لُوٹ لیا ہے۔"

سردار خوشحال چہرے سے بدحال نظر آنے لگا۔

اس کے چہرے کا خون جیسے اس خبر نے پل بھر میں چُوس لیا ہو۔ اس کی آنکھوں سے صدمہ آمیز ویرانیاں جھلکنے لگیں۔ اس کے ہونٹ کانپنے لگے اور پھر اس کے دل کا پانی آنکھوں کے راستے رُخساروں پر پھیل گیا۔ جذبات کی یہ طغیانی اس کے چہرے پر یوں پھیل گئی جیسے اَن گنت دریاؤں نے زمین پر ہر طرف پانی ہی پانی پھیلا دیا ہو۔

وہ مجھ سے لپٹا سسکیاں بھر بھر کر روتا رہا اور میں چٹان بنا کھڑا رہا۔ اس کی سسکیاں میرے دل ودماغ میں بھونچال پیدا کر رہی تھیں لیکن میں بے بس تھا۔ میرے آنسوؤں پر پہرے لگے ہُوئے تھے اور میں اپنے محترم بزرگ کی موت پر رو بھی نہیں سکتا تھا۔

"مگوری کا سردار۔ . ." ستّر سال کے سُرخ وسفید اور تنومند خوشحال خان نے سکتے کے سے عالم میں کہا: "وہ مر گیا۔ . . کیسے؟ کون ہے، وہ ظالم جس نے اس پر وار کرنے کی جرأت کی ہے؟ خُدا کی قسم! میں اس کمینے دشمن کے خون کو اتنا اُچھالوں گا کہ مقتل کے آس پاس کا ہر پتھر اس کے خون کے چھینٹوں سے سُرخ ہو جائے گا۔"

فرطِ جذبات سے اس کی آواز کانپ رہی تھی اور اس کا چہرہ آگ ہو گیا تھا۔ میں نے اُسے سارے حالات سے آگاہ کر دیا۔ اس وقت تک بستی کے اور بھی کئی لوگ وہاں جمع ہو گئے تھے۔ مگوری کے سردار کی موت کی خبر ان پر بجلی بن کر گری تھی ہر شخص افسردہ وغمگین تھا۔ خود میرا دل غم کی شدّت سے پھٹا جا رہا تھا لیکن میں خود کو سنبھالے ہُوئے تھا۔ اگر یہ حالت گریہ کچھ دیر اور برقرار رہتی تو شاید میرے ضبط کا دامن بھی ہاتھ سے چھوٹ جاتا۔ . . وہ جو غیر تھے، سردار کی موت پہ خون کے آنسو بہا رہے تھے۔ . . اور وہ جو اپنے تھے، انہوں نے سردار کا خون بہا دیا تھا۔ محض دولت کی لالچ میں انہوں نے زمین کو ایک محترم اور بزرگ ہستی سے محروم کر دیا۔ . . دولت جسے حاصل کرنے کے لیے قدرت نے انسان کو ہاتھ پیروں جیسی نعمتوں سے نوازا ہے اور جسے انسان کسی کے خون سے کھیلنے کی بجائے محنت ومزدوری کر کے بھی حاصل کر سکتا ہے لیکن ان درندوں نے دُنیا کا آسان ترین راستہ اختیار کیا تھا۔ . . انہوں نے وہ سب کچھ چھین لیا

تھا جیسے انہیں اپنے ہاتھ پیروں کے بل بوتے پر گمانا چاہیے تھا۔ مجھ سے قبر کا پتہ دریافت کر کے اسی وقت سردار اور گاؤں کے بیشتر لوگ چلے گئے اور جو نہ جا سکے انہوں نے بستی ہی میں نمازِ جنازہ ادا کی۔ میں خوشحال خان کی حویلی میں رہا جہاں تعزیت کرنے والوں کا تانتا بندھا رہا۔

میں نے ایک تیز رفتار گھڑ سوار کو فوراً ہی مگوری روانہ کر دیا تھا تاکہ وہاں کے لوگوں کو اپنی بد نصیبی کی اطلاع مل سکے۔ اس کے علاوہ چونکہ آس پاس کی چند بستیوں کے لوگ بھی تعزیت کے لیے آئے تھے اس لیے مجھے توقع تھی کہ خبر مختلف قاصدوں کی زبانی مگوری تک پہنچے گی تو زیبِ داستاں کے لیے حقیقت میں افسانے کا رنگ بھی شامل ہوتا جائے گا۔ میں یہ سوچ سوچ کر پاگل ہو رہا تھا کہ جب یہ افسانے گاؤں کے ان لوگوں تک پہنچیں گے جن کی امانت کو لوٹائے بغیر سردار مر گیا تھا، تو وہ لوگ نہ جانے کیسے کیسے تبصرے کریں گے اور سننے والے نہ جانے کیا کیا مطلب نکالیں گے۔

ہو سکتا ہے، کچھ لوگ مجھے بھی موردِ الزام ٹھہرائیں۔ وہ لوگ مجھے شیر خان کی سازش کا ایک فریق سمجھیں کیوں کہ میں سردار کے ساتھ گیا تھا لیکن واپسی میں عملاً پیچھے رہ گیا۔ جب مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ سردار کے پاس اتنی بڑی رقم موجود تھی تو میں نے اس کی حفاظت کے فرض میں کیوں کوتاہی کی؟ گویا میں نے بالواسطہ طور پر مجرموں کی مدد کی تھی... لیکن اپنا دامن بچا کر... جتنے منہ ہوں گے، اتنی ہی باتیں ہوں گی۔ میں کس کس کی زبان پکڑوں گا اور کس کس پر اپنی بے گناہی ثابت کروں گا۔

میرے لیے آبرو مندی کے ساتھ اور سرخرو واپس جانے کی ایک ہی صورت تھی کہ لوگوں کو ان کی امانت لوٹاؤں اور قاتلوں سے بھرپور انتقام لوں۔

رات ہو گئی تو تعزیت کرنے والوں کی بھیڑ بھی چھٹنے لگی اور نصف شب کو خوشحال خان کی کچی دیواروں والی قلعہ نما حویلی کے وسیع و عریض صحن میں بچھی ہوئی چارپائیاں خالی ہو گئیں۔ اب وہاں میرے علاوہ صرف ایک نوجوان باقی رہ گیا تھا۔ اس نے داڑھی اور مونچھیں مونڈ رکھی تھیں۔ اس کے چہرے کے سفید رنگ پر ہلکے سنہرے رنگ کا ایک تل اس کی شخصیت کو بے حد جاذبِ نظر بنا رہا تھا۔ چھ فٹ سے نکلتے ہوئے قد کا یہ جوان اپنی متانت سے ذہین، تجربے کار اور جہاندیدہ لگتا تھا۔ وہ تعلیم یافتہ لوگوں جیسے انداز و اطوار کا مالک تھا۔ اس کی بھوری بھوری آنکھیں سوچ میں ڈوبی ہوئی لگتی تھیں۔ وہ مجھ سے بات چیت کرتا رہا تھا اور اس کے شائستہ اور پُرسکون لہجے نے مجھے بے حد متاثر کیا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ عمر میں مجھ سے یقیناً دس سال بڑا ہے... اگر عمر اس عقل کا نام ہے جو زندگی کے تجربات سے حاصل ہوتی ہے تو اس اعتبار سے وہ شاید مجھ سے دُگنا رہا ہوگا۔

نصف شب کے بعد خوشحال خان اور اس کے غم زدہ ساتھیوں کی واپسی ممکن ہوئی۔ ایک بار پھر ماحول سوگوار ہو گیا اور دیر تک مقتول سردار کے بارے میں باتیں ہوتی رہیں۔ مجھے جو کچھ بھی معلوم تھا، وہ کئی کئی بار مجھ سے پوچھا گیا اور ہر مرتبہ مجھے تفصیل سے ہر بات بتانی پڑتی تھی۔

"شہباز... " خوشحال خان نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا، "میں جانتا ہوں کہ تم ذہین اور باہمت ہو۔ تمہاری مستقل مزاجی نے مجھے بے حد متاثر کیا ہے۔ خدا تمہیں، تمہارے ارادوں میں کامیاب کرے۔ میں اتنا بوڑھا ہو چکا ہوں کہ انتقام کی اس طویل راہ پر تمہارے ساتھ قدم ملا کر نہیں چل سکتا۔ خدا نے مجھے اولادِ نرینہ سے محروم رکھا ورنہ میں اپنے بیٹے کو حکم دیتا کہ وہ اس وقت تک گھر لوٹ کر نہ آئے جب تک شہباز کا مقصد پورا نہیں ہو جاتا..."

اس نے اسی جوان کی طرف دیکھا جو میرے ساتھ صحن میں تنہا رہ گیا تھا اور جس کی باتوں نے مجھے بے پناہ متاثر کیا تھا۔

"رفیق... " سردار خوشحال نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، "میں نے تجھے اپنے بیٹے ہی کی طرح پروان چڑھایا ہے۔ کیا میں تجھے کوئی ایسا حکم دے سکتا ہوں؟"

"میری جان بھی حاضر ہے، بابا!" رفیق نے ادب اور متانت سے کہا۔

"شہباز... " خوشحال خان نے رفیق کے کندھے کو تھپتھپاتے ہوئے مجھ سے کہا، "یہ میرا بھتیجا ہے لیکن بیٹوں سے بڑھ کر پیارا ہے۔ تم اس پر اعتماد کر سکتے ہو۔"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"شہباز خان... " رفیق نے مجھ سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا، "میں دیکھ رہا ہوں کہ تم ایک ایسی چٹان ہو جس پر کوئی طوفان بھی اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ تم جرأت و شجاعت کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پیکر ہو، تمہیں کسی کی مدد کی ضرورت نہیں... لیکن میرے خون کا آخری قطرہ تک تمہارے لیے وقف ہے۔ میں اپنے بابا کے فرمان کو اپنی زندگی کا نصب العین سمجھتا ہوں۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ فتح اور شکست تو مقدر کے کھیل ہیں لیکن تم مجھ پر اعتماد کر سکتے ہو۔"

قہوے کا آخری پیالہ پینے کے بعد خوشحال تھکے تھکے قدموں سے تہجد کی نماز پڑھنے کے لیے اٹھ گیا اور میں بھی کمر سیدھی کرنے کے لیے وہیں چارپائی پر دراز ہو گیا۔

صبح ناشتے کے بعد رفیق میرے پاس آ بیٹھا اور میں نے اس سے باز پرس شروع کر دی۔ صورتِ حال تو تفصیل کے ساتھ میں اسے گزشتہ رات ہی بتا چکا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ سوتے وقت اس نے اس سلسلے میں کافی سوچا ہوگا۔

"کچھ اندازہ ہے کہ وہ لوگ اب کہاں گئے ہوں گے؟" میں نے پوچھا۔

"جس شخص کا نام تم نے شیر خان بتایا ہے، اس کے بارے میں ایک افواہ سنی ہے۔" رفیق نے سوچ میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔

"وہ کیا؟" میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔

"سنا ہے کہ وہ ایک بے حد لالچی اور خود غرض نوجوان ہے اور اس نے پیسے کے لالچ میں خوارزم کی کسی بیوہ سے شادی کر رکھی ہے۔ جھوٹ سچ خدا جانتا ہے لیکن لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ عورت بھی کوئی اچھے کردار کی مالک نہیں ہے۔ اگر اس افواہ میں ذرا سی بھی صداقت ہے تو ممکن ہے، معاملات کے سرد پڑ جانے تک شیر خان اسی عورت کے ہاں روپوش رہے۔"

"وہ عورت کون ہے؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"اس کا نام زرین جان ہے۔ پہلے وہ ایک ناچنے گانے والی عورت تھی اور پشاور میں لذت فروشی کا دھندا کرتی تھی لیکن خوارزم کے ایک سادہ لوح نوجوان سے تعلق گہرا ہو جانے پر وہ اس سے شادی کر کے خوارزم آ گئی تھی۔ اس کا نوجوان شوہر فرنگیوں کے ہاتھوں مارا گیا تو زرین جان نے پھر وہی پرانی عادتیں اختیار کر لیں۔ لوگ اس سے نفرت کرتے ہیں لیکن چونکہ وہ خوارزم کے ایک شہید کی بیوہ ہے اس لیے کوئی مداخلت نہیں کرتا۔ البتہ اندھیرے کی چادر میں لپٹ کر خوارزم کے بے راہ رو اس عورت کی محبت کا دم بھرتے ہیں اور انہی کی در پردہ حمایت کی وجہ سے کسی کو اتنی ہمت نہ ہو سکی کہ زرین جان کو خوارزم سے نکال باہر کرے۔ خوارزم کے سیاسی ذہن رکھنے والے لوگ اس مسئلے کا کوئی حل نہیں نکال سکے کیوں کہ لوگوں کو اس سے جذباتی وابستگی بھی محسوس ہوتی ہے۔ اس کے شوہر نے ایک ناچنے والی سے شادی کر کے غلطی کی تھی تو آزادی کی خاطر اپنی جان دے کر اس نے کفارہ بھی ادا کر دیا تھا۔"

"لیکن رفیق..." میں نے ایک طویل سانس لے کر کہا، "ہو سکتا ہے شیر خان سے شادی محض نام کا پردہ ہو۔ میں شیر خان کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ اس قسم کے لوگ گھر بساتے ہیں، بساتے ہرگز نہیں ہیں۔"

"ممکن ہے، ایسا ہی ہو۔" رفیق نے تائید کی۔ "زرین جان کو ایک ایسے سہارے کی ضرورت تھی اور شیر خان کو روپوش ہونے کے لیے کسی ایسے ہی گھر کی تلاش تھی۔"

"میرا خیال ہے، ہمیں فوراً خوارزم روانہ ہو جانا چاہیے۔" میں نے بے چینی سے کہا۔ "ایسے کام میں زرین جان جیسی عورت ہی اس کی مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔"

سردار خوشحال خان اور بستی کے لوگوں سے رخصت ہو کر ہم خوارزم کے لیے روانہ ہوئے تو سورج کافی بلند ہو چکا تھا۔ ہم نے شروع ہی سے گھوڑوں کی رفتار خاصی تیز رکھی تھی کیوں کہ ہمیں رات ہونے سے پہلے پہلے بارشے پہنچ جانا چاہیے تھا۔

شام سے پہلے جس وسیع و عریض ویرانے سے گزرنا پڑتا تھا وہاں بھوکے بھیڑیوں کے غول گھومتے رہتے تھے۔ راستہ بھٹک کر پہاڑوں میں رہ جانے والے بھی ان بھیڑیوں کا لقمہ بن جاتے تھے۔ راستے میں ہمیں کئی خطرناک سانپ بھی نظر آئے جو سرسراتے ہوئے اپنے بلوں میں غائب ہو جاتے تھے۔ میرا گھوڑا تو ان سانپوں سے دہشت زدہ نہیں ہوتا تھا البتہ رفیق کا گھوڑا کئی بار بدک کر بھاگا تو بڑی مشکل سے قابو میں آیا۔

دوپہر کو ہم نے کہیں آرام نہیں کیا حالانکہ راستے میں ہمیں ایک چھوٹی سی ندی اور ہریالی بھی نظر آئی تھی۔ بارشے تک مسلسل سفر کرتے رہنا ایک مشکل کام تھا۔ رفیق اور اس کے گھوڑے کا بُرا حال ہو رہا تھا لیکن مجھے اور اطلس کو پُرجوش اور چاق و چوبند دیکھ کر وہ کسی نہ کسی طرح ہمارا ساتھ دینے پر مجبور تھے۔

اندھیرا پھیلنے پر ہم پہاڑوں سے نکل گئے تھے اور وہ ویرانہ بھی پار کر لیا تھا جہاں قدم قدم پر موت گھات میں رہتی ہے۔ پہاڑوں سے نکلتے ہی وہ ہموار علاقہ شروع ہو گیا جہاں گھوڑوں نے قدم رکھا تو میدانی علاقے کی بستی بارشے میں جلنے والے چراغ نظر

آنے لگے تھے۔

بستی میں داخل ہوتے تو بہت سی نوخواندہ نگاہوں نے ہمیں گھورا۔ اگر ہم اپنے قبائلی لباس میں نہ ہوتے تو یوں آزادی سے بارشے میں داخل نہیں ہو سکتے تھے۔ فرنگیوں کی وجہ سے اجنبی لوگوں پر کڑی نگاہ رکھی جاتی تھی۔ بعض سیدھے سادے آدمی تو سلام کرتے ہوئے قریب سے نکل گئے اور دو ایک نے ہمیں روک کر پوچھا کہ ہم کون ہیں اور ہمیں کس کے ہاں جانا ہے۔ انہیں مطمئن کر کے ہم آگے بڑھ گئے۔ میں نے انہیں بتایا کہ ہم مسافر ہیں اور خوارزم جا رہے ہیں اس لیے رات بارشے میں گزارنا چاہتے ہیں۔

... پھر ایک شخص نے رفیق کو پہچان لیا۔

"رفیق خانا... " اس نے حیرت سے نعرہ لگایا۔ "پہ خیر راغلے۔"

اس نے رفیق سے مصافحہ کیا اور میرا ہاتھ تھام کر کھڑا ہو گیا۔ یہ شخص پہلے خوشحال خان کے گاؤں میں رہتا تھا لیکن اس کی شادی بارشے میں ہوئی تھی اور پھر وہ اپنے سسر کے انتقال کے بعد یہیں آ گیا تھا کیوں کہ سسرال میں ایک مرد کی ضرورت تھی جو باقی خاندان کی دیکھ بھال کر سکے۔

رفیق نے راستے میں اپنے دوست کو صورت حال مختصراً بتائی تو وہ بے حد تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ اس نے اتفاق کیا کہ قبائل میں لاقانونیت بڑھتی جا رہی ہے اور اس کے تدارک کا مؤثر طریقہ یہی ہے کہ مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچا دیا جائے۔ وہ دوسروں کی زبانی شیر خان کی وارداتوں کا حال سن چکا تھا۔ رفیق کا یہ دوست ہمیں بڑی محبت سے اپنے گھر لے آیا۔

کھانے کے بعد جب ہم مہمان خانے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے تو میں نے گل زمان اور بہرام کے حلیے بتائے۔ ان حلیوں کے بارے میں جاننے کے بعد رفیق کا دوست گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

"آج دوپہر میں قہوہ خانے میں بیٹھا تھا تو تین اجنبی آئے تھے۔ ان میں سے دو آدمیوں کا حلیہ بالکل یہی تھا جو تم نے مجھے بتایا ہے۔"

"اور تیسرا شخص کون تھا؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"وہ ملک نواز کا آدمی تھا۔"

"ملک نواز..." میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

"ہاں... اس شخص کو علاقے میں بڑی طاقت حاصل ہے۔ سنا ہے کہ وہ در پردہ فرنگیوں سے ملا ہوا ہے اور فرنگی حکومت اسے اس خفیہ ساز باز کا ہر ماہ اچھا خاصا وظیفہ دیتی ہے۔"

"ہوں..." میں نے اثبات میں سر ہلایا اور اس شخص کا حلیہ بیان کرنے لگا جسے میں نے گھوڑے کے پیٹ میں گولی مارنے کی سزا دی تھی اور اس کے پیٹ میں گولی مار دی تھی۔

"طوط... طوطا خان؟" رفیق کا دوست بڑبڑایا۔ "تم اسے کیسے جانتے ہو؟" اس نے تشویش سے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

میں نے بلا کم و کاست اسے سب کچھ بتا دیا۔

رفیق کا دوست یہ سن کر زرد پڑ گیا۔ اس کی آنکھوں میں دہشت دیکھ کر میں بھی فکر مند ہو گیا۔ میں نے رفیق کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ بھی تشویش زدہ نظر آ رہا تھا۔

"طوطا خان... ملک نواز کا سب سے بڑا گرگا تھا۔" کچھ دیر بعد ہمارے میزبان نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "تم نے اسے قتل کر کے اچھا نہیں کیا۔"

"سنو دوست..." میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "میں جو کچھ کرتا ہوں، اسے کرنے سے پہلے خوب اچھی طرح سوچ لیتا ہوں... اور ایک بار عمل کرنے کے بعد میں اس کے نتائج کی کبھی پروا نہیں کرتا۔ طوطا خان کو اپنے کیے کی سزا مل گئی ہے اور اگر اس سلسلے میں کسی ملک نواز نے سامنے آنے کی کوشش کی تو خدا کی قسم اس کا کوئی نام لیوا بھی نہیں ملے گا۔"

"عقل مندانہ بات ہے۔" رفیق نے مداخلت کی۔ "ملک نواز جیسے لوگ کبھی خود سامنے نہیں آتے۔ ایسے لوگوں کے پاس تو پالتو آدمیوں کی کمی نہیں ہوتی۔ اگر طوطا خان کے مرنے کی اطلاع ملک نواز کو پہنچ گئی ہے تو سمجھ لو کہ اب ہمیں بے حد احتیاط سے آگے بڑھنا ہو گا۔"

"احتیاط کا دامن میں کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑتا۔" میں نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے شروع ہی سے یہ سبق دیا گیا ہے کہ جس چیز سے بے احتیاطی برتی جائے، وہ چیز اپنا روپ بدل لیتی ہے۔ جیسے زندگی سے بے احتیاطی کا دوسرا نام موت ہے۔ ہر چیز کے گرد احتیاط کا ایک حصار قائم ہے، جسے صرف ضرورت کے تحت ہی توڑنا چاہیے۔"

میں نے اپنے میزبان کی طرف دیکھا۔ ہماری باتوں سے اس کے چہرے پر رونق واپس آ گئی تھی۔ وہ بزدل نہیں تھا لیکن حد سے زیادہ محتاط آدمی بھی کبھی کبھی بزدلوں کو بھی مات کر دیتا ہے۔ اس کی حالت بھی اس وقت ایسی ہی ہو گئی تھی جب میں نے طوطا خان کی موت کا قصہ سنایا تھا۔ اس نے مجھ سے نگاہیں چرانا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شروع کر دیں جیسے وہ خوف کے اظہار پر نادم ہو گیا ہو۔

"قاسم نے انہیں دوپہر کے وقت قہوہ خانے میں دیکھا تھا۔" میں نے کہا۔ "اس کا مطلب ہے کہ وہ منزل مقصود پر پہنچ چکے ہوں گے۔"

"اور کچھ عجب نہیں کہ ان کے بدمعاش ساتھیوں میں سے چند ایک اس طرف بھی چل دیے ہوں۔" میزبان قاسم نے تبصرہ کیا۔ "بہر کیف ہوا، ٹھیک ہے، دوستو! اب تم آرام سے سو جاؤ۔ صبح دیکھیں گے کہ اس سلسلے میں کیا کیا جا سکتا ہے۔"

"کیا قہوہ خانہ اس وقت کھلا ہو گا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں... لیکن کیوں؟" قاسم نے دروازے میں رک کر پلٹتے ہوئے حیرت سے دریافت کیا۔ "کیا تم قہوے کی طلب محسوس کر رہے ہو؟"

"میں وہاں جانا چاہتا ہوں۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے، وہاں سے مجھے کوئی نہ کوئی کارآمد بات معلوم ہو جائے گی۔"

"میں بھی چل رہا ہوں۔" رفیق بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

"نہیں... تم آرام کرو۔ میں جلد ہی لوٹ آؤں گا۔" میں نے کہا۔ "اس قہوہ خانے میں کچھ لوگ جوا بھی کھیلتے ہوں گے۔"

"ہاں... لیکن تمہیں کیسے پتہ چلا؟" قاسم کی آنکھوں میں حیرت تھی۔ وہ ایک محدود سوچ والا آدمی تھا اس لیے اسے بار بار ذہنی جھٹکے لگ رہے تھے۔

"اگر کسی قصبے کا کوئی قہوہ خانہ رات گئے تک کھلا رہے تو اس سے اور کیا مطلب نکالا جا سکتا ہے۔" میں نے مسکرا کر کہا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

رفیق نے میرے ساتھ آنے کے لیے ایک بار پھر خواہش ظاہر کی لیکن میں تنہا ہی باہر آ گیا اور اس حصے کی طرف بڑھ گیا، جہاں بارشے کا قمار خانہ یعنی قہوہ خانہ تھا۔ گلی سنسان تھی۔ میں دیواروں سے قریب رہتے ہوئے آہستہ آہستہ آگے بڑھتا رہا... ابھی میں چند قدم ہی آگے بڑھا ہوں گا کہ ایک کتا مجھے اپنی پنڈلی کی طرف جھپٹتا محسوس ہوا۔

میں نے حلق سے ایک مخصوص آواز نکالی جسے سن کر وہ جھپٹتے سے رک گیا۔ یہ آواز کتوں کو مانوس کرنے کے لیے بڑی اہمیت رکھتی تھی۔ میں کچھ دیر تو اس کتے کی طرف دیکھتا رہا... پھر آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ کتا میرے پیچھے پیچھے چلنے لگا تھا۔

یہ ایک عام سا آوارہ کتا تھا۔ اس کا قد البتہ عام کتوں سے قدرے بڑا تھا۔ نیم تاریک رات میں اس کا ہیولا بے حد خوفناک نظر آ رہا تھا۔ میں نے چلتے وقت رائفل نہیں لی تھی کیوں کہ میری کمر سے ہولسٹر کی پیٹی بندھی ہوئی تھی اور بڑے گھیر کی قمیص اور شلوار کی وجہ سے ہولسٹر کا ابھار دکھائی نہیں دیتا تھا۔ جب سے مجھے ملک نواز جیسی شخصیت کا علم ہوا تھا، میری بے چینی بڑھ گئی تھی کیوں کہ اس قسم کے بااثر آدمیوں کے ہتھکنڈوں کا مجھے خوب اندازہ تھا... اور میرا خیال تھا کہ اسے طوطا خان کی موت کا نہ صرف علم ہو گیا ہے بلکہ اس نے ہمارے انتظام کے لیے اپنے دو ایک آدمی بھی بھیج دیے ہوں گے۔ ایسے آدمیوں کے لیے بارشے کے کسی باشندے کے ہاں قیام کوئی مشکل نہیں تھا لیکن ان لوگوں میں ایک خامی یہ بھی ہوتی ہے کہ یہ قہوہ خانے جیسی جگہوں پر بیٹھنے اور داؤ لگانے کے شوقین ہوتے ہیں۔

میں یہ سوچ کر قاسم کے گھر سے نکل آیا تھا کہ اگر چند ایسے آدمی بارشے پہنچ چکے ہیں تو ان سے باہر ہی نمٹ لیا جائے۔ نہ جانے کیوں مجھے توقع تھی کہ قہوہ خانے میں کسی ایسے آدمی سے ضرور مڈبھیڑ ہو گی۔

قہوہ خانہ ایک ایسی جگہ تھی جہاں بارشے میں غالباً سب سے زیادہ روشنی کا انتظام تھا۔ یہاں ٹوٹی پھوٹی اور بھدی میزیں اور بان کی چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں جن پر بیٹھے ہوئے کچھ لوگ تو قہوے کی چسکیاں لے رہے تھے اور بعض تاش کھیلنے میں مصروف تھے۔ ایک طرف بھٹی تھی جس پر قہوے کی نیلی نیلی کیتلیاں رکھی ہوئی تھیں۔

میں نے قہوہ خانے میں قدم رکھا تو وہاں خاصا شور تھا۔ ہر کوئی باتیں کرنے میں مصروف نظر آیا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی بھی کسی اور کی بات نہ سن رہا ہو... بلکہ اپنی ہی کہے جا رہا ہو۔ کسی نے میری طرف توجہ نہیں دی۔ کسی کو دروازے کی طرف دیکھنے کی فرصت ہی نہیں تھی۔

کچھ آگے بڑھ کر میں ایک میز کے قریب جا کھڑا ہوا۔ کتا بھی میرے ساتھ اندر آ گیا تھا۔

وہ میری ٹانگوں کے قریب بیٹھ گیا اور آنکھیں بند کر کے زبان نکالے ہانپنے لگا۔ یہ واقعی ایک خونخوار کتا تھا۔ نہ جانے کہاں سے میری رفاقت کی تلاش میں مجھ تک آ پہنچا تھا۔ میں نے میز پر پڑی ہوئی ایک پلیٹ سے ہڈیاں اٹھا کر کتے کی طرف پھینک دیں جنہیں اس نے جھپٹ کر چبانا شروع کر دیا اور چبا چبا کر ممنون نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ نہ جانے وہ کب کا بھوکا تھا۔ اگرچہ یہ کتا مجھے پسند نہیں آیا تھا لیکن میں نے اسے دھتکارا نہیں...

کی بھی کوشش نہیں کی تھی۔

قہوہ خانے کا مالک ایک کیتلی میرے قریب رکھ گیا تو میں نے محسوس کیا کہ وہاں فوراً ہی خاموشی چھا گئی ہے۔ یوں لگا جیسے یا تو سب کے سب کسی ناگہانی وجہ کے تحت گونگے ہو گئے ہوں یا فضا میں کوئی ایسا اثر پیدا ہو گیا ہے جس نے ہر آواز کو نگل لیا ہو۔

میں بظاہر تو خاموشی سے قہوے کی چسکیاں لے رہا تھا لیکن درحقیقت کن انکھیوں سے ایک ایک شخص کا جائزہ لے رہا تھا۔ انہوں نے میری موجودگی محسوس کر لی تھی اور سب کے سب میری طرف متوجہ تھے۔

"خوش آمدید، دوست!" ایک خوش رو نوجوان نے کہا۔ "میرا خیال ہے تم بارشے میں پہلی بار آئے ہو۔ کسی کے ہاں مہمان ہو کیا؟"

میں نے سر کو تائید میں ہلا دیا۔

"گونگا معلوم ہوتا ہے۔" ایک دور افتادہ چارپائی پر بیٹھے ہوئے چار آدمیوں میں سے ایک نے تبصرہ کیا۔

"اگر یہ تبصرہ میرے کتے کے بارے میں ہے" میں نے خوش دلی سے کہا۔ "تو میں تمہارے انداز ے کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ کتا واقعی تم سے ہم کلام ہونے کی سعادت سے محروم ہے۔"

میری بات پر بہت سے آدمی کھل کھلا کر ہنس پڑے۔

جس آدمی کو میں نے جواب دیا تھا، اس کی آنکھیں دہکتی ہوئی تھیں اور اس کے چہرے کے تاثرات بتاتے تھے کہ وہ کوئی اچھا آدمی نہیں ہے۔ اس کے تینوں ساتھی بھی بشرے سے خونخوار نظر آ رہے تھے لیکن مجھے اس کی کوئی پروا نہیں تھی کیوں کہ میں یہاں کسی اچھے آدمی کی تلاش میں آیا بھی نہیں تھا۔

"زبان کو لگام دے کر رکھو۔" وہ غرایا۔

"لگام میرے پاس صرف ایک ہی ہے اور اسے میں اپنے گھوڑے کے لیے استعمال کر رہا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ اس بار بھی میں نے اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ برقرار رکھی تھی۔

اس دوران میں جائزہ لے چکا تھا کہ صرف وہی چار آدمی جارحانہ عزائم کے مالک ہیں۔ باقی ہم دونوں کی باتوں اور چہروں کے تاثرات سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں دبا دبا سا جوش بھی تھا جیسے وہ کسی جنگ کی جھلکی اور پُرلطف تجربہ یا تماشا پائی کی بھی توقع کر رہے ہوں۔ میری مسکراہٹ البتہ ان سب کو الجھن میں ڈال رہی تھی۔ جو نوجوان سب سے پہلے مجھ سے مخاطب ہوا تھا، اس کی آنکھوں میں میں نے اپنے لیے پسندیدگی کے جذبات بھی محسوس کر لیے تھے۔

"میرے پاس ایک فالتو لگام ہے۔" وہ شخص غراتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ "اور وہ میں تمہاری زبان کے لیے استعمال کر سکتا ہوں۔"

"بہتر ہوگا کہ اسے خود اپنی ہی زبان پر استعمال کر لو، دوست۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ "میں یہاں مہمان ہوں اور مجھے اس بات کی توقع نہیں تھی کہ بارشے میں مہمانوں کے ساتھ ایسا سلوک بھی کیا جاتا ہے۔"

میری اس بات سے قہوہ خانے کی فضا میں فوراً ہی تبدیلی رونما ہو گئی اور ہر آدمی غضیلی نگاہ سے اس شخص کو گھورنے لگا جس نے بلاوجہ مجھ سے الجھنے کی کوشش کی تھی۔ جواباً اس آدمی اور اس کے ساتھیوں نے قہر آلود نظروں سے لوگوں کو دیکھا تو میں یہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا کہ وہ چاروں باقی لوگوں پر کچھ نہ کچھ اثر رکھتے ہیں۔ اس صورت حال سے ماحول کی کشیدگی بڑھ گئی تھی... لیکن جلد ہی ماحول خوش گوار ہو گیا اور ہر کوئی اپنی اپنی مصروفیت میں ڈوب گیا۔

میں نے کتے کی طرف دیکھا۔ وہ آخری ہڈی چھوڑ رہا تھا۔ جن چار آدمیوں میں سے ایک نے مجھ سے زبانی الجھنے کی کوشش کی تھی وہ اب اپنے ساتھیوں سے کانا پھوسی میں مصروف تھا۔ ان کے ارادے خطرناک ہی معلوم ہو رہے تھے۔ میں کسی بھی ناخوش گوار صورت حال کے لیے خود کو پہلے سے تیار کر چکا تھا۔ اس بات نے البتہ مجھے الجھن میں ڈال دیا تھا کہ میں نے اس شخص سے کہیں بلاوجہ تو ناگواری مول نہیں لے لی؟ اگر اس گروہ کا تعلق متوقع لوگوں سے ہے، تب تو خیر کوئی بات نہیں تھی۔ دوسری صورت میں، میں بلاوجہ بدنامی مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ بات جب افواہ کے شانے پر بیٹھ کر سفر کرتی ہے تو بالآخر بتنگڑ بن کر ہی اترتی ہے۔

اچانک میں نے ان چاروں میں سے تین کو کسی بات پر کھل کھلا کر ہنستے دیکھا۔ مالک آ کر کیتلی اور پیالیاں اٹھا لے گیا۔ اس نے ایک نظر کتے کی طرف دیکھا تھا اور اس کی آنکھیں سکڑ گئیں۔

"یہ تمہارا کتا ہے؟" اس نے میری طرف دیکھ کر پوچھا۔

"ہاں... اور یہ قہوہ نہیں پیتا!"

میں نے مسکرا کر کہا اور قہوہ خانے کا مالک بھی مسکرا دیا... لیکن ابھی وہ میرے قریب سے ہٹ کر گیا ہی تھا کہ ان چار درشت رُو افراد میں سے وہی شخص اٹھا اور دروازے کی طرف آتا نظر آیا۔ میں جس جگہ بیٹھا تھا، وہ دروازے کے سامنے تھی اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دروازے سے جانے کے لیے اس شخص کو میرے سامنے سے گزرنا تھا... اور لطف کی بات یہ تھی کہ وہ بھیڑیا نما کتا بھی بالکل راستے ہی میں بیٹھا تھا اور گزرنے والے کو اسے ہٹائے بغیر گزرنے میں دشواری ہو سکتی تھی۔

وہ شخص آہستہ آہستہ چلتا ہوا آیا اور کتے سے کچھ فاصلے پر رک گیا۔

میں نے قمیص کے نیچے ہاتھ ڈال کر ہولسٹر کا تسمہ کھول ڈالا۔ اس شخص کی آنکھیں غصے سے دہک رہی تھیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کتے کو راستے میں حائل دیکھ کر اس پر دیوانگی سوار ہو گئی ہو۔

"ہٹ جاؤ راستے سے... غلیظ کتے!" وہ گرج پڑا۔

اس کے ساتھ ہی اس کی دائیں ٹانگ ٹھوکر لگانے کے لیے بلند ہونے لگی۔ اس کی دھاڑ سن کر بھیڑیے نما کتے نے ایک شان بے نیازی سے اپنی تھوتھنی پیروں کے اوپر سے اٹھائی اور اس شخص کو دیکھنے لگا۔ اس کی اٹھی ہوئی ٹانگ کو دیکھ کر کتے کے نتھنے تیزی سے پھیلنے اور سکڑنے لگے اور پھر اس کے ہونٹ پھیل کر تیز دھار دانتوں کی نمائش کرنے لگے۔ وہ اس شخص پر جھپٹ پڑنے کے لیے تیار تھا۔ بس اُسے ٹھوکر مارنے کی دیر تھی۔

کتے کے خوف ناک ردِعمل نے اس شخص کو کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے ٹانگ تو زمین پر رکھ دی، گویا ٹھوکر مارنے کا ارادہ ملتوی کر دیا... لیکن ایک قدم پیچھے ہٹ کر اس نے بڑی پھرتی سے رائفل کو کندھے سے اتار لیا تھا۔

قہوہ خانے میں سناٹا چھا گیا۔

یوں لگتا تھا جیسے اس شخص کی رائفل کندھے سے اترتے ہی ہر شخص کسی واقعے کے ظہور کا انتظار کرنے میں سانس تک لینا بھول گیا ہو۔ ریوالور میرے ہولسٹر سے نکلا اور میری ہتھیلی سے ٹکرایا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے نہایت پھرتی سے... لیکن بظاہر بڑی بے نیازی سے حفاظتی کھٹکا ہٹا دیا۔

کلک... ایک تیز آواز قہوہ خانے کی خاموش فضا میں پیدا ہوئی۔

اس آواز کو رائفل بدست اس شخص نے بھی سن لیا تھا۔ وہ اس آواز کو پہچانتا تھا اور یہ بات بھی غالباً اس کے علم میں تھی کہ اس آواز کے پیدا ہونے کے بعد رائفل استعمال کرنے کا وقت نہیں ملا کرتا۔ وہ جہاں تھا، وہیں یوں ٹھٹک گیا جیسے حفاظتی کھٹکے کے ہٹنے کی تیز آواز سن کر وہ منجمد ہو کر رہ گیا ہو۔

اس کی نگاہ بڑی آہستہ آہستہ کتے سے ہٹ کر میری طرف مبذول ہو گئی... اور تب اس نے اپنی آنکھوں سے میرا ریوالور دیکھ لیا۔ ریوالور کی نال میں نے اس طرف نہیں تان رکھی تھی بلکہ میں نے اسے بائیں ہتھیلی پر یوں رکھ لیا تھا جیسے بیٹھے بیٹھے وقت گزاری کے لیے میں نے اپنے ریوالور کا جائزہ لینا شروع کر دیا ہو۔

میں نے نگاہ اٹھا کر اس شخص کی آنکھوں میں دیکھا۔ میرے ہونٹوں پر اب بھی میری مخصوص مسکراہٹ سجی ہوئی تھی۔ اس مسکراہٹ کے بارے میں مجھے خوب اندازہ تھا۔ اس مسکراہٹ سے میں اپنے حریف کی خود اعتمادی کو متزلزل کر دیا کرتا تھا۔

"اگر یہ منحوس کتا تمہارا ہے تو اسے راستے سے ہٹا دو!"

وہ میری آنکھوں میں دیکھتا ہوا غرایا تھا لیکن اس کی غراہٹ اب پہلے جیسی خونخوار نہیں تھی۔ اس میں ہلکی سی کپکپاہٹ کا احساس ہوتا تھا۔ میں نے بدستور مسکراتے ہوئے جواب دیا... لیکن یہ جواب دیتے وقت میرا لہجہ سرسری تھا جیسے میں نہ تو اسے دھمکی دے رہا ہوں اور نہ ہی یہ جملہ میری طرف سے مشورے کے طور پر بولا گیا تھا۔

"اس کے گرد گھوم کر نکل جاؤ۔"

"اگر میں کسی بدذات کتے کی وجہ سے راستہ بدلنے پر مجبور ہو گیا تو وہ میری زندگی کا آخری دن ہوگا۔" وہ چیخ پڑا۔

میں نے اس بار کوئی جواب نہیں دیا کیوں کہ اس نے انتہائی بات کہہ دی تھی۔ ریوالور اب بھی میری بائیں ہتھیلی پر بے نقاب پڑا تھا اور میرا دایاں ہاتھ اس کے دستے پر یوں جھکا ہوا نظر آنے لگا جیسے میں اسے استعمال کرنے کی بجائے محض اس سے کھیل رہا ہوں... لیکن میری آنکھوں کی سختی اور ہونٹوں پر حوصلہ شکن مسکراہٹ سے اس شخص کو کوئی غلط فہمی نہیں تھی۔ وہ جانتا تھا کہ ذرا سی غلط حرکت کا مطلب کیا ہو سکتا ہے۔

قہوہ خانے میں اب اتنی خاموشی تھی کہ اگر وہاں بجا دینے والی سوئی بھی گرا دی جاتی تو اس کی آواز تک سنائی دے سکتی تھی۔

"ہر شخص کو وہی کرنا چاہیے، جو اس کے ذہن میں آتا ہے۔"

یہ جملہ میں نے کافی دیر بعد محض تبصرے کے طور پر کہا تھا اور کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں نے یہ بات اس شخص سے کہی تھی۔

اچانک ایک مکھی نہ جانے کہاں سے اندر گھس آئی اور وہ تیزی سے ہمارے درمیان آ کر چکراتی ہوئی بھنبھنانے لگی۔ اس خاموشی میں مکھی کی بھنبھناہٹ بھی اس وقت بے حد ہولناک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

محسوس ہو رہی تھی۔ باہر کہیں دُور کسی گھوڑے نے اپنی آہنی نعل زمین پر پٹخی تو لوہے اور کسی پتھر کے ٹکراؤ سے جھنکار پیدا ہوئی۔

وہ شخص کسی مجسمے کی طرح بے حس و حرکت کھڑا تھا۔

میں اس شخص سے ناواقف تھا لیکن جس انداز میں اس نے مجھ سے اُلجھنے کی کوشش کی تھی، اس سے پتہ چلتا تھا کہ میری ذات اس کے لیے اجنبی نہیں ہے۔ وہ میری طرف اب بھی متوجہ تھا اور میں نے اس کی پیشانی پہ پسینے کی بوندیں اُبھرتی محسوس کر لی تھیں۔ اس کی بائیں آنکھ کے نیچے ایک نس بار بار تڑپ رہی تھی۔

ایسے ماحول پر انسان اپنے حریف کے اعصاب پر جتنی زیادہ اثر انداز ہو سکتا ہے، اتنی ہی جلدی مدِمقابل کو شکست دی جا سکتی ہے۔ میں نے شروع ہی سے بے پروائی کا انداز اختیار کیا تھا اور اسے برقرار بھی رکھا تھا۔ میرے انداز میں گہرا سکون تھا اور کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں کسی بات کو کوئی اہمیت بھی دے رہا ہوں۔

اس شخص نے جس انداز میں رائفل کندھے سے اُتاری تھی اور اس سلسلے میں جتنی پھرتی کا اظہار کیا تھا، اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ رائفل چلانے کے سلسلے میں اُسے خاصی مہارت حاصل ہے اور وہ نہایت خود اعتمادی سے نشانہ لگانے کا عادی ہے۔ . . لیکن جس انداز میں میرا ریوالور نکل کر میری خالی ہتھیلی پہ پہنچا تھا اور پھر حفاظتی کھٹکے کے ہٹنے کی آواز پیدا ہوئی تھی، بظاہر وہ اس نے پہلے کبھی دیکھا بھی ہوگا تو اس میں اتنی پھرتی نہیں دکھائی گئی ہوگی۔

ان چند لمحوں کی خاموشی میں ہم ایک دوسرے کے بارے میں خوب اچھی طرح سمجھ چکے تھے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اس شخص کی خود اعتمادی متزلزل ہو چکی ہے اور وہ ندامت اور خوف کے اثرات سے مغلوب ہوتا جا رہا ہے۔ ہمارے درمیان وہ نیلگوں مکھی اب بھی بھنبھنا رہی تھی۔

اچانک وہ شخص کتے کے گرد گھوما اور پھر کسی پاگل اندھے کی طرح دروازے سے نکلتا چلا گیا۔ یوں محسوس ہوا تھا جیسے اس کی ٹانگیں کسی مشینی عمل کے تحت برق رفتاری سے حرکت کرتی ہوئی اس کے جسم کو اُٹھا لے گئی ہوں۔

ایک لمحے کے لیے قہوہ خانے میں قبرستان کا سا سکوت رہا۔ . . پھر کوئی شخص کھانسنے لگا۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ ہر شخص کچھ نہ کچھ بولنے لگا۔ تبصرے دھیمی آواز میں ہو رہے تھے۔ میں نے اُن تینوں کی طرف پہلی بار نگاہ اُٹھا کر دیکھا جو دُور اُفتادہ چارپائی پر براجمان تھے اور جن کا ایک خونخوار ساتھی کتے اور [illegible] جیسی خصلت کی وجہ سے میرے سامنے مصیبت میں مبتلا ہو گیا تھا۔ وہ لوگ یوں ایک دوسرے سے باتوں میں مصروف تھے جیسے انہیں اپنے ساتھی کی تذلیل سے کوئی سروکار ہی نہ ہو۔

جو خوش شکل نوجوان میرے قریب بیٹھا تھا اور جس نے سب سے پہلے مجھ سے بات کی تھی، وہ اسی میز کے پاس آ کھڑا ہوا جس پر میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں میرے لیے پسندیدگی کے ساتھ ساتھ احترام کے بھی تاثرات تھے۔

"تم کون ہو، دوست؟" اس نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

"دوست صرف دوست ہی ہوتا ہے۔"

"لیکن ہر دوست کا کوئی نام بھی تو ضرور ہوتا ہے۔"

"میرا نام شہباز ہے۔"

"شہباز منگولی۔ . ." وہ بڑبڑایا۔ "کیا تم منگوری کے رہنے والے ہو اور منگولی خاندان سے تعلق رکھتے ہو؟"

"معلوم ہوتا ہے میری شہرت مجھ سے پہلے ہی یہاں پہنچ چکی ہے۔" میں نے مسکرا کر کہا تو اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس نے محبت سے میرا ہاتھ تھام لیا۔ "تم ایک خوش اخلاق اور اچھے نوجوان ہو۔" میں نے اس کے چہرے پر نگاہ ڈالتے ہوئے نرمی سے کہا۔ "میں تمہارے اخلاق سے بے حد متاثر ہوا ہوں۔ کیا نام ہے تمہارا؟"

"نذیر۔ . . میرا نام نذیر ہے اور میں کوہاٹ کا رہنے والا ہوں۔ یہاں میرے دادا کی کچھ زرعی زمین تھی جس کے لیے مجھے ہر سال یہاں آنا پڑتا ہے۔ . ." اس نے دھیمی آواز میں کہا اور پھر کن انکھیوں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ "تم نے زرق خان سے اُلجھ کر اچھا نہیں کیا۔ وہ بے حد خطرناک آدمی ہے۔"

"اوہ۔ . . تو میرے اس دوست کا نام زرق خان ہے؟"

"دوست نہیں۔ . . وہ بدترین دشمن ہے۔"

"میں اسے دیکھ چکا ہوں۔"

"لیکن مجھے حیرت ہے۔ وہ جس انداز میں یہاں سے گیا ہے اس کے بارے میں کبھی کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ سب یہی سوچ رہے تھے کہ ابھی کسی نہ کسی کی لاش گرے گی۔"

"ایک لاش تو گر چکی ہے لیکن یہ لاش کسی کو دکھائی نہیں دے سکتی۔" میں نے مسکرا کر کہا اور زرق خان کے تینوں ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ میں نے ان تینوں کو شروع ہی سے نگاہ میں رکھا تھا اور ایک لمحے کے لیے بھی ان کی طرف سے غفلت نہیں برتی تھی۔

"کیسی لاش؟" نذیر نے حیرت سے کہا۔

"زرق خان کے غرور کی لاش۔" میں نے جواب دیا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ قہوے خانے کے مالک کو میں نے ادائیگی کرنا چاہی تو اس نے پیسے لینے سے انکار کر دیا۔ اس کے باوجود میں نے اصرار کر کے اسے ادائیگی کر دی اور قہوہ خانے سے باہر آ گیا۔

باہر ہوا بالکل ساکت تھی۔

چاندنی کا ہلکا ہلکا اُجالا بھی منجمد محسوس ہوتا تھا۔

بستی کے بیشتر مکین چراغوں کی لو مدھم کر کے سکون کی نیند سو گئے تھے۔ سکوتِ شب میں کبھی کسی بچے کے رونے یا کسی کتے کے بھونکنے کی آواز سُنائی دیتی اور جلد ہی ختم ہو جاتی۔ نسبتاً دُور کہیں ایک جھینگر مسلسل بول رہا تھا۔

میں آہستہ آہستہ اس گھر کی طرف روانہ ہو گیا جہاں رات گزارنے کے لیے رفیق کی وجہ سے رُک گیا تھا۔ اگر وہ ساتھ نہ ہوتا تو یہ رات بھی گھوڑے کی پشت پر گزار دیتا اور سورج طلوع ہونے سے پہلے منزلِ مقصود پر پہنچ جاتا۔ . . لیکن رفیق کی وجہ سے مجبور ہو گیا تھا۔

یہ اعصابی کشیدگی، ذہنی انتشار اور جسمانی تھکن کے سفر کی دوسری رات تھی لیکن میں اس وقت تک آرام نہیں کرنا چاہتا تھا جب تک بوڑھے سردار کا قرض نہ چکا دیتا۔ . . وہی قرض جسے وہ اپنی رُوح پر لے کر اس دُنیا سے رخصت ہو گیا تھا۔

***

میں دیوار کے قریب رہ کر چلتا رہا۔

ذہن تو رہ کتا اب بھی میری ایڑیوں کے قریب رہ کر میرے پیچھے پیچھے چلا آ رہا تھا۔ میں ہر طرف سے چوکنا تھا لیکن گھر کے دروازے تک پہنچنے کے باوجود کوئی ناگوار واقعہ پیش نہیں آیا جب کہ مجھے زرق خان جیسے شخص سے اس بات کی توقع تھی کہ وہ کہیں نہ کہیں میری تاک میں چھپا بیٹھا ہوگا۔

رفیق بڑی بے چینی سے میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں مہمان خانے کا دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوا تو اس نے لپک کر میرا ہاتھ تھام لیا۔ "تم نے بہت دیر لگا دی، شہباز۔ میں اب قہوہ خانے کی طرف جانے کا ارادہ کر رہا تھا۔"

باہر سے کتے کے بھونکنے کی آواز سُنائی دی۔

میں نے بند دروازے کی طرف دیکھا اور مسکرانے لگا۔

"اچانک ایک دوست سے ملاقات ہو گئی تھی۔" میں نے کہا۔ "اس لیے دیر ہو گئی۔ . ."

رفیق کافی تھکا ہوا تھا، میری آمد پہ مطمئن ہو گیا تو اس نے لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ میں اس کی طرف دیکھتا اور مسکراتا رہا۔ وہ کافی عرصے تک مردان میں رہ چکا تھا اور وہاں اُسے بہت سے پڑھے لکھے آدمیوں کی رفاقت حاصل تھی اس لیے وہ کسی قبائلی نوجوان سے زیادہ ایک شہری بابو لگتا تھا۔ گو مجھے بھی تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا تھا لیکن میری تعلیمی قابلیت میرے دو ایک اُستادوں کی قابلیت تک محدود تھی۔ . . اور میرے استاد وہ لوگ تھے جن کی اپنی تعلیم ایک خاص حد سے زیادہ نہیں تھی۔

میں بھی لیٹ گیا۔

باہر کچھ دیر تک کتے کی آوازیں سُنائی دیتی رہیں۔ . . پھر شاید وہ بھی کہیں دُبک کر خاموش ہو گیا تھا۔ میرا جسم سکون کی گہری نیند کا طلب گار تھا لیکن میری آنکھیں کھلی تھیں۔

ہوا بند تھی اس لیے کمرے میں حبس محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے گھٹن کے اس احساس کو دُور کرنے کے لیے کمرے کی کھڑکیاں کھول دیں۔ باہر چاندنی کا دُھندلا سا غبار اب بھی پھیلا ہوا تھا۔

میں کھڑکی سے ہٹ کر دوبارہ چارپائی پر لیٹ گیا۔

معلوم نہیں کب میں نے ذرا سی دیر کے لیے پپوٹوں کو آرام دینے کے لیے کچھ دیر کے لیے بند کر لیا تھا اور پھر نیند میری پلکوں پہ یوں بیٹھ گئی کہ میں انہیں اُٹھانے کی کوشش میں ناکام ہو گیا۔

دفعتاً کسی نادیدہ قوت نے مجھے جھنجھوڑ کر بیدار کر دیا۔

میں اُٹھ بیٹھا۔

میری نگاہ کھڑکی کی طرف اُٹھ گئی جہاں ایک سایہ سا اُبھرتا دکھائی دیا تھا۔ ایک خفیف سی آہٹ نے ہی میری نیند اچاٹ کر دی تھی۔ اس میں زیادہ تر اس تربیت کا دخل تھا جو مجھے بچپن ہی سے دی گئی تھی۔

میرا ریوالور تکیے کے نیچے تھا۔

میں نے اُسے نکالا اور سیفٹی کیچ ہٹا دیا۔

کمرے میں تاریکی تھی۔ چراغ کا تیل نہ جانے کب ختم ہو گیا تھا اور اس کی بتی کا جلتا ہوا سرا دم توڑ گیا تھا۔ باہر مٹیالی سی چاندنی اب گہرے غبار کی صورت اختیار کر گئی تھی۔

ریوالور ہاتھ میں لیے میں بغور سُنتا رہا۔ . . لیکن اب کوئی آہٹ نہیں سُنائی دے رہی تھی۔ کھڑکی کے سامنے جانا خطرناک تھا اس لیے میں نے تاریکی میں خود کو چارپائی سے زمین پر گرا دیا اور اگلے ہی لمحے میں چوپایوں کی طرح چاروں ہاتھ پیروں پر کھڑکی کی طرف بڑھ رہا تھا۔

اچانک مجھے اپنے تلوؤں پہ گرم [illegible] محسوس ہوئی

میں چونک کر رُک گیا۔ ۔ ۔ اور پھر میرے تلوے بھیگنے لگے میں بے ساختہ مسکرا دیا۔ یقیناً یہ وہی کتا تھا جو میرے ساتھ قہوہ خانے تک گیا تھا اور پھر گھر تک اس نے مسلسل میری ایڑیاں سونگھتے ہوئے راستہ طے کیا تھا۔

میں نے پلٹ کر کتے کی گردن سہلائی۔

اس کے حلق سے ہلکی سی غراہٹ نکلی اور پھر وہ اچھل پڑا۔ اس نے بڑی زبردست چھلانگ لگائی تھی۔

ایک لمحے کے لیے تو مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے اس کا چٹان جیسا جسم ہوا میں پرواز کرتا ہوا کھلی کھڑکی تک چلا گیا ہو۔ اس سے صرف ایک لمحے قبل کمرہ ایک دھماکے سے گونج اٹھا تھا۔ میں نے کھڑکی سے ایک شرارے کو اندھیرے کمرے میں سفر کرتے دیکھا۔

یہ شرارہ میری چارپائی تک پہنچا اور بجھ گیا۔

باہر یوں محسوس ہوا جیسے کتے نے کسی کو بُری طرح جھنجھوڑ ڈالا ہو۔ میں نے ریوالور سنبھالا اور جھکا جھکا کھڑکی تک جا پہنچا۔ اسی لمحے ایک لمبی سی "چیاؤں" کی آواز باہر سے میرے کانوں تک پہنچی ۔ ۔ ۔ اور پھر دوڑتے ہوئے قدموں کی چاپ سنائی دینے لگی۔

میں نے کھڑکی اور اپنی چارپائی کی طرف باری باری دیکھا۔ اگر میں چارپائی پر موجود ہوتا تو یقیناً میری کھوپڑی اس گولی کی زد میں حائل ہو گئی ہوتی جو کسی دشمن نال سے نکل کر میری زندگی چاٹنے آئی تھی۔

●

میں دیوار کے ساتھ چپک گیا۔

رفیق بھی دھماکا سن کر بیدار ہو گیا تھا اور اس نے فوراً ہی زمین پر لوٹ لگا دی تھی۔ باہر سے اب کوئی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی۔ میں آہستہ آہستہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"شہباز۔ ۔ ۔" رفیق کی سرگوشی سنائی دی۔

"زمین پر لیٹے رہو۔" میں نے جواباً دھیمی آواز میں کہا۔

اگرچہ باہر سکون تھا لیکن میں ابھی تک مطمئن نہیں ہوا تھا۔ میں نے گہری نظر سے کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھا۔ کھڑکی سے چاندنی کا ایک مستطیل ٹکڑا کچے فرش پر کسی روشن دھجی کی طرح نظر آ رہا تھا۔

"کیا بات ہے، کون ہے؟" رفیق نے دوبارہ سرگوشی کی۔

"انتظار کرتے رہو۔" میں نے جواب دیا اور آواز بے حد دھیمی رکھی۔ "جس نے بھی گولی چلائی تھی، وہ کھڑکی کے سامنے آیا تھا۔ ۔ ۔ لیکن اب شاید وہ اِدھر اُدھر ہو گیا ہے۔ کتے نے اس پر چھلانگ لگائی تھی۔"

گولی کا دھماکا رات کے سناٹے کو مجروح کر گیا تھا اس لیے نہ صرف ہمارا میزبان بلکہ آس پاس کے چند گھروں کے لوگ بھی بیدار ہو گئے تھے۔ جب لوگوں کا شور بڑھ گیا تو میں ایک طویل سانس لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔

میزبان دوڑتا ہوا آیا۔ اس کے ہاتھ میں رائفل تھی۔ اس نے کمرے میں قدم رکھتے ہی تشویش سے پوچھا۔ "کیا بات ہے، رفیق۔ تم دونوں نے خواب کی حالت میں بھی گولیاں چلانا شروع کر دی ہیں؟"

"فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا۔ "کسی نے کھلی کھڑکی سے گولی چلائی تھی لیکن اب وہ فرار ہو گیا ہے۔"

میزبان نے جلدی جلدی کمرے میں روشنی کا انتظام کیا اور گھر سے باہر جمع ہونے والے لوگوں سے ملنے چلا گیا۔ میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ کتا کچھ فاصلے پر بے حس و حرکت پڑا تھا۔

کھڑکی سے کود کر میں اس کے پاس پہنچا اور اس کی کھوپڑی کا جائزہ لیا۔ میرا اندازہ درست تھا۔ گولی چلانے والا اس کے دانتوں کا شکار ہوا تو تھا لیکن اُسے بروقت رائفل کا کُندا استعمال کرنے کا موقع مل گیا۔ چوٹ کتے کی کھوپڑی پر پڑی تھی اس لیے وہ اپنے شکار پر غلبہ برقرار رکھنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ ۔ ۔ اور اسے فرار ہونے کا موقع مل گیا۔

حملہ آور تنہا ہی تھا اس لیے ناکامی کے بعد فرار ہونے کے علاوہ اس کے سامنے کوئی دوسری صورت نہیں تھی۔ کتے کی کھوپڑی محفوظ تھی لیکن چوٹ غالباً اتنی شدید لگی کہ وہ ہوش و حواس ہی کھو بیٹھا تھا۔ میں نے اُسے ٹانگ سے پکڑ کر گھسیٹا اور دیوار کے قریب ڈال دیا۔ اس کا علاج کرنے کی کوئی صورت اس وقت ممکن نہیں تھی اس لیے میں کتے کا خیال ذہن سے نکال کر اِدھر اُدھر متلاشی نظروں سے دیکھنے لگا۔

یہ کھڑکی گھر کے عقبی حصے کی طرف کھلتی تھی۔

اِدھر چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں کا سلسلہ چٹانوں تک پھیلا ہوا تھا اور چٹانیں گھر سے زیادہ دور نہیں تھیں۔ کھڑکی کے قریب ہی ایک درخت تھا۔ اس درخت اور کھڑکی کا درمیانی حصہ ہموار تھا۔ کتے نے جب شکار پر چھلانگ لگائی تھی تو غالباً وہ اس شخص کے نرخرے پر دانت گاڑنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا بلکہ جسم کا کوئی اور حصہ اس کے جبڑوں کی زد میں آیا تھا۔ میں نے اس چھوٹی سی سیدھی جگہ خون کا ایک دھبہ دیکھا۔

یہ دھبہ چھوٹے چھوٹے سُرخ قطروں کی صورت میں جھاڑیوں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تک چلا گیا تھا۔ میں واپس کتے کے پاس آ گیا۔ اس کے جبڑوں کا جائزہ لیا تو اس کے دانتوں میں کپڑے کی ایک چھوٹی سی دھجی نظر آئی۔

میں نے اسے نکال لیا۔

کتا اب بھاری سانسیں لے رہا تھا۔

اس کی کھوپڑی پر جو ضرب لگی تھی اس سے نہ صرف کھوپڑی ٹوٹنے سے محفوظ رہ گئی تھی بلکہ اس سے خون بھی نہیں نکلا تھا بس ایک گومڑ سا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ خون کا وہ دھبہ اور بوندیں اسی شخص کے خون کی تھیں جو مجھے سوتے میں قتل کرنے آیا تھا۔

میں کپڑے کی دھجی لیے اندر آ گیا۔

رفیق تشویش سے کھڑکی ہی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ قاسم بھی لوگوں سے مل کر واپس آ گیا۔ اب باہر سے باتوں کی آوازیں آنا بھی ختم ہو گئی تھیں۔ غالباً سب لوگ مطمئن ہو کر اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے تھے۔ قاسم نے ہمیں بتایا کہ اس نے لوگوں کو یہ کہہ دیا کہ رائفل گرنے سے اس کا گھوڑا دب گیا تھا۔

اس نے واقعی بڑی سمجھ داری سے کام لیا تھا۔ میں نے اس سلسلے میں اب تک کوئی بات نہیں کی تھی اور نہ ہی قہوہ خانے میں زرتی خان سے ہونے والی بدمزگی کا تذکرہ کیا تھا۔

"کون تھا۔ ۔ ۔؟" رفیق نے قاسم کے جانے کے بعد کھڑکی بند کرتے ہوئے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"خدا کے بندے کھڑکی تو کھلی رہنے دو۔" میں نے کہا۔

"کیوں۔ ۔ ۔ کیا ایک دھماکے سے تمہارے حواس ٹھکانے نہیں آئے؟" اس نے قدرے ناگواری سے کہا۔ "تم نے کھڑکی کیوں کھول دی تھی؟"

"کھڑکی کھول دو۔ اب کوئی نہیں آئے گا۔"

"تم یقین سے کیسے کہہ سکتے ہو؟"

"اب اگر کوئی آیا تو میں اُسے اس دنیا کا سب سے بڑا احمق ہونے کا خطاب دوں گا۔" میں نے یقین سے کہا۔ "اس کے پاس صرف ایک موقع تھا اور وہ اُسے کھو بیٹھا۔ اس سلسلے میں تمہیں میرے ایک بے زبان دوست کا بھی شکر گزار ہونا چاہیے۔"

"شاید تم اس کتے کا تذکرہ کر رہے ہو جس کی لاش باہر پڑی ہے؟"

"لاش نہیں۔ ۔ ۔ وہ زندہ ہے۔"

رفیق گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ میں نے اس کے شہری اور پرُسے کا جو اندازہ لگایا تھا، وہ غلط نہ نکلا۔ اس کی سوچ انہی لوگوں جیسی تھی جن میں اس نے زندگی کا زیادہ تر وقت گزارا تھا۔

اس نے رائفل کو چارپائی کے ساتھ ٹکا کر کھڑی کر دیا اور میری طرف متوجہ ہو کر بولا۔ "تم نے دیکھ لیا شہباز! دشمن بے خبر نہیں ہے۔ انہیں معلوم ہو چکا ہے کہ تم ان کا تعاقب کر رہے ہو۔ اب بھی وقت ہے۔ ۔ ۔ سوچ لو کہ تم کیا چاہتے ہو اور کیوں چاہتے ہو؟"

میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

اس کے بارے میں میرا جو بھی اندازہ تھا وہ صرف اس کے رویے اور خیالات کی بنا پر تھا۔ میں نے اس کے کردار کے متعلق کچھ بھی نہیں سوچا جب کہ اس وقت وہ جو کچھ بھی کہہ رہا تھا اس کا تعلق براہِ راست اس کے کردار سے تھا۔ مجھے اس کی آواز میں شکست اور خوف کی آمیزش محسوس ہو رہی تھی۔

رفیق نے بہت عجیب سوال کیا تھا۔

"میں جو کچھ چاہتا ہوں، وہ تمہیں خوب معلوم ہے۔"

"سنو شہباز۔ میں نے بابا کا دل رکھنے کے لیے اس وقت حامی بھری تھی، اس سے قطع نظر مجھے ایک ایسے موقع کا انتظار تھا جب میں تمہیں سمجھا سکوں کہ یہ راہ بے حد خطرناک ہے۔"

میرے سر میں جیسے بھونچال سا آ گیا۔ میں کبھی یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ رفیق مجھے میرے مقصد سے باز رکھنے کی مہم سر کرنے کے لیے میری رفاقت پر آمادہ ہوا ہے۔ اگر اس نے اشارتاً بھی کوئی ایسی بات کہہ دی ہوتی تو میں کبھی اسے ساتھ لے کر نہ چلتا۔ ۔ ۔ مجھے اس مہم میں کسی کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ میں تنہا ہی اس فرض کو نبھانا چاہتا تھا کیوں کہ یہ میرا ذاتی درد تھا جس کی ایک ہلکی سی ٹیس بھی کسی اور کے حصے میں نہیں آنی چاہیے تھی۔

"تمہارا بے حد شکریہ دوست!" میں نے سختی سے کہا۔ "تم صبح ہوتے ہی واپس جا سکتے ہو۔ مجھے شروع ہی سے یہ تربیت دی گئی تھی کہ کبھی کسی انسان کی رفاقت پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔ جانتے ہو باہر جس کتے کا بے ہوش جسم پڑا ہے، اس سے میرا تعلق صرف چند گھنٹے پہلے پیدا ہوا تھا۔ اس نے اب تک میرے ہاتھ سے چند ہڈیاں ہی پائی ہیں۔ ۔ ۔ لیکن اس نے وفاداری نبھانے کے لیے ہر بات کی پروا کیے بغیر اپنی جان داؤ پر لگا دی تھی۔"

"تم انسان اور کتے میں فرق خوب جانتے ہو۔" وہ غرّایا۔

"ہاں۔ ۔ ۔ میں یہی بات تمہیں بھی سمجھانا چاہتا ہوں کہ کتے اور انسان کی دوستی میں بہت بڑا فرق ہے۔ جہاں کتے پر اعتماد کیا جا سکتا ہے، وہاں آدمی ہمیشہ ناقابلِ اعتماد ثابت ہوتا ہے۔"

"زمانہ بدلتا جا رہا ہے۔ اب یہ قدیم اصول ترک کر دو۔ ۔ ۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

انتقامی کارروائیاں انسان کو تباہی کی طرف ہی لے جاتی ہیں۔"

"جن جسموں میں خون موجزن ہے، ان میں ہیجان پیدا ہوتا ہی رہتا ہے۔ کیا تم نے کبھی کسی ایسے دریا کے بارے میں بھی سُنا ہے، رفیق جس میں کبھی طغیانی نہ آئی ہو؟ بہرحال فضول بحث کی ضرورت نہیں۔ میں تمھارا شکرگزار ہوں کہ تم مجھے سمجھانے کے لیے اتنی دُور تک میرے ساتھ چلے آئے ہو۔"

میں چارپائی پر لیٹ گیا اور چھت کو گھورنے لگا۔

رفیق میری چارپائی کی پٹی پر بیٹھ گیا۔ "اچھا ایک بات مجھے بتا دو۔" اس نے کہا۔ "اگر تم مجھے قائل کرنے میں کامیاب ہو جاؤ تو میں تمھارا ساتھ ضرور دُوں گا۔"

"مجھے تمھاری رفاقت نہیں چاہیے، دوست۔" میں نے مُسکرا کر کہا۔ "ویسے میں وقت گزاری کے لیے تمھیں قائل کرنے کی ضرور کوشش کروں گا۔"

"بتاؤ۔ اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تمھارے پہنچنے تک وہ رقم محفوظ ہوگی؟" اس نے سرسراتی آواز میں سوال کیا۔

"یہ انتہائی احمقانہ سوال ہے۔" میں نے زیرِلب کہا۔ "اس علاقے میں کوئی شخص اتنی بڑی رقم محض ایک دو روز میں خرچ نہیں کر سکتا۔"

"اگر یہی بات تھی تو تم نے بہرام اور گل زمان کو فرار ہونے کا موقع کیوں دیا تھا؟ کیا تم ان سے انتقام نہیں لے سکتے تھے؟"

"میں سب سے پہلے رقم برآمد کرنا چاہتا ہوں اور رقم ان دونوں کے پاس نہیں تھی۔ رقم شیر خان کے پاس تھی۔"

"اس لیے تم نے ان دونوں کو زندہ چھوڑ دیا۔" وہ ہنس کر بولا۔ "تم جذباتی ہو . . . اور جذبات اندھے ہوتے ہیں۔ اس لیے میں تمھیں ایک بار پھر مشورہ دیتا ہوں کہ انتقام کے اس اندھے جذبے کو لگام دو۔ تم آج تو بچ گئے ہو لیکن ہو سکتا ہے کہ اگلی مرتبہ نہ بچ سکو گے۔ بیس ہزار کی رقم ویسے تو بہت ہوتی ہے لیکن اگر کمانا چاہو تو میرے ساتھ چلو۔ میں مردان میں سبز پتھری کی کھدائی کا ٹھیکہ لینے کا ارادہ کر رہا ہوں . . ."

"وہ رقم برسوں میں نہیں، چند دنوں میں درکار ہے، رفیق۔ جن لوگوں کی وہ امانت ہے، انھیں اس رقم کی آج ضرورت ہے۔ جن کو اپنی بیٹیوں کے ہاتھ پیلے کرنے ہیں، وہ انھیں کئی سال تک گھر میں نہیں بٹھائے رکھیں گے۔ جنھیں قرض ادا کرنا ہے، وہ برسوں تک مہاجن کو سُود ادا نہیں کر سکتے۔"

"ہاں . . . یہ بات تو ہے۔" اس نے زیرِلب کہا۔

"ہماری سوچ میں کافی تضاد ہے۔" میں نے کہا۔ "میری پرورش انسانوں میں کم اور جانوروں میں زیادہ ہوئی ہے اس لیے میں تمھاری رفاقت سے زیادہ عرصے تک لطف اندوز نہیں ہوں گا۔ لہٰذا بہتر ہے کہ تم صبح واپس چلے جاؤ۔ میں سردار خوشحال خان کو کبھی نہیں بتاؤں گا کہ ہمارے درمیان یہ علیحدگی کس وجہ سے ہوئی تھی۔"

رفیق نے میرا کندھا تھپ تھپایا اور اُٹھ کھڑا ہُوا۔

"بہرحال، میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اتنی جلدی تمھارا ساتھ نہیں چھوڑوں گا۔" یہ کہہ کر وہ اپنی چارپائی پر لیٹ گیا اور میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس نوجوان کی باتوں کا میرے ذہن پر ذرا سا بھی اثر نہیں ہُوا تھا اور میں اُسے اس اندازِ فکر کے لیے مود الزام بھی نہیں ٹھہرا رہا تھا . . . میں نے کروٹ لی اور کھڑکی کو گھورنے لگا . . . جو اب بھی بند تھی اور رفیق نے اسے نہیں کھولا تھا۔

. . . پھر میری آنکھیں بھی اس کھڑکی کی طرح بند ہو گئیں۔

●

میں نے بازار سے گزرتے وقت گھوڑے کو روکا اور رفیق کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔ غالباً رات کو ہونے والی بات چیت سے اس کی سوچ کافی حد تک متاثر ہو گئی تھی۔

قاسم نے گھر کے دروازے سے ہمیں رخصت کر دیا تھا۔ آگے آنے کے بعد میں نے رفیق کو واپس جانے کے لیے کہہ دیا . . . لیکن وہ کوئی جواب دیے بغیر میرے ساتھ چلتا رہا۔ اس وقت ہم دونوں گھوڑے کی لگامیں تھامے پیدل ہی چل رہے تھے کہ میری نگاہ قہوہ خانے کی طرف اُٹھ گئی تھی . . . اور میں نے ایک ایسے نوجوان کو دیکھ لیا جسے میں پہلے سے جانتا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے قدرے حیرت بھی ہوئی۔

میں نے گھوڑے کو روکنے کے بعد لگام رفیق کے ہاتھ میں تھما دی اور خود قہوہ خانے کی طرف بڑھ گیا۔

"تم میرا یہیں انتظار کرو۔" میں نے چلتے چلتے کہا۔

اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا اور گھوڑوں کو بازار میں ایک طرف لے کر چل دیا۔ میں نے دیکھا کہ اس کا رُخ ایک چھپر کی طرف ہے۔ غالباً وہ دُھوپ سے بچنے کے لیے وہاں جا رہا تھا۔

میں نے رائفل گھوڑے کی زین ہی میں چھوڑ دی تھی۔ البتہ میرا ریوالور مخصوص ہولسٹر میں گھٹنے تک کی قمیص کے نیچے چھپا ہُوا تھا۔ میں قہوہ خانے کے دروازے میں رُک گیا۔

وہاں اس وقت خاصا ہجوم تھا۔

قہوہ خانے کا ماحول دُھوئیں سے دُھندلا دُھندلا سا لگ رہا تھا۔ یہ خاصا بڑا قصبہ تھا اس لیے یہاں کے بازار میں بھی خوب رونق تھی جب کہ قہوہ خانہ تو اس وقت لبالب بھرا ہوا لگ رہا تھا۔

میں نے دروازے میں رُک کر قہوہ خانے کا جائزہ لیا۔

کئی آدمی بیک وقت چلم پی رہے تھے۔ چند ایک نے تو سگریٹیں سُلگا رکھی تھیں۔ بڑی بُری ناگوار بُو پھیلی ہوئی تھی۔ شاید ان چلموں میں چرس بھری تھی۔ میں اس نوجوان کی تلاش میں اِدھر اُدھر نگاہ دوڑا رہا تھا کہ اچانک مجھے زرق خان بھی نظر آ گیا۔

وہ ایک طرف بیٹھا تھا اور اس کی پُشت میری طرف تھی۔

مجھے جس نوجوان کی تلاش تھی وہ زرق خان کے سامنے بیٹھا تھا۔ ان کے اطراف میں تین اور آدمی براجمان تھے جنھیں میں نہیں جانتا تھا اور یہ وہ تینوں بھی نہیں تھے جنھیں میں نے رات اسی قہوہ خانے میں زرق خان کے ساتھ بیٹھے دیکھا تھا۔

میں لوگوں کے ہجوم سے گزرتا ہُوا جب اُن کی میز کے قریب پہنچا تو زرق خان نے نگاہ اُٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں چوٹ کھائے ہُوئے بھیڑیئے جیسی چمک تھی اور مجھ پر نگاہ پڑتے ہی اس کے ہونٹ نفرت سے سکڑ گئے تھے۔

"اسلم خانا . . ." میں نے مُسکرا کر اُس نوجوان کی طرف دیکھا۔

"اے . . . شہباز . . ." وہ مجھے دیکھ کر چونک پڑا۔ "تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ گوری سے کب آئے؟"

"کل رات آیا تھا۔" میں نے مُسکرا کر کہا۔

"وہاں سب خیریت تو ہے نا؟"

"ہاں . . . سب ٹھیک ٹھاک ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "تمھارے گھر والوں کا ایک پیغام ہے۔"

"اوہ . . . کہو، کیا بات ہے؟" وہ قدرے حیرانی سے بولا۔

"یہاں نہیں . . ." میں نے کہا۔ "اگر تمھارے دوستوں کو کوئی اعتراض نہ ہو تو میرے ساتھ باہر چلو۔"

اس نے ان نوٹوں کو سمیٹنا شروع کر دیا جن کا اس کے سامنے چھوٹا سا ڈھیر لگا ہُوا تھا۔ وہ اُٹھ کھڑا ہُوا۔ "چلو . . . شہباز۔" اس نے کہا۔

"مجھے اعتراض ہے۔" زرق خان غرّایا۔

اسلم نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ میں اس کے چہرے کی بدلتی ہُوئی حالت کو پہلے ہی دیکھ چکا تھا اس لیے میں بھی اس کی طرف متوجہ تھا۔ اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔

نامور مصنف محمود احمد مودی
وہی تحریر اور وہی انداز
کے ساتھ 'اپنے چاہنے والوں
کے لئے ایک نئی سوغات لئے
Scanned By: Azam & Ali
قیمت =/180
مکتبہ القریش
سرکلر روڈ اردو بازار لاہور
7668958

وہ اتنی زور سے چیخا تھا کہ قہوہ خانے کا ہر شخص چونک کر ہماری طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

جو لوگ رات بھی قہوہ خانے میں موجود تھے اور جنھوں نے ہمارے درمیان ہونے والی زبانی جنگ کو سُنا تھا، ان کی آنکھوں میں تشویش کے آثار گہرے تھے جب کہ کچھ لوگ محض تجسس سے ہماری طرف متوجہ محسوس ہو رہے تھے۔

"کیا تم کوئی خدائی فوجدار ہو؟" میں نے قدرے بدلے بدلے سے لہجے میں کہا۔ اس بار میں نے رات جیسا رویہ نہیں رکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میرے ہونٹ مسکراہٹ سے عاری تھے۔

"تم اسے باہر نہیں لے جا سکتے۔" وہ پاؤں پٹخ کر بولا۔ "اس نے آتے ہی ایک بازی جیت لی تھی اور میں کھیل ختم ہونے تک کسی کو جانے کی اجازت دینے کا قائل نہیں ہوں۔"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ "شکست تو تمھاری حالت ہی سے ظاہر ہے، زرق خان۔ . . اس لیے میرا مشورہ ہے کہ اسے زیادہ عبرت ناک نہ بننے دو تو اچھا ہے۔" میں نے یہ جملہ بے حد دھیمی آواز میں کہا تھا تاکہ زیادہ لوگ نہ سُن سکیں۔

زرق خان کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔

میں نے اس کی حالت کا غور سے جائزہ لیا۔

اس نے قمیص کی ایک آستین تہہ کر کے چڑھا رکھی تھی جبکہ دوسری آستین نیچے تھی۔ گویا اس کا ایک بازو برہنہ تھا جب کہ دوسرے بازو کی آستین اس کی کلائی پر موجود تھی۔

"آؤ چلیں۔ . ." میں نے اسلم خان کی طرف دیکھ کر کہا۔

اسی لمحے زرق خان دھاڑا تھا۔ "رُک جاؤ۔" یہ کہتے ہوئے اس نے میرا گریبان تھام لیا۔ میں نے اس کی مُٹھی کی طرف دیکھا جس میں میرا گریبان سمٹا ہُوا تھا۔

"میں نے یہ قمیص حال ہی میں خریدی ہے۔" میں نے نرمی سے کہا۔ "اس لیے اسے نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کرو۔"

میرا جملہ ختم ہوتے ہی زرق خان نے خالی ہاتھ لہرایا تھا۔ میں نے نیچے سے اوپر کی جانب متحرک ہاتھ سے زرق خان کے اس ہاتھ کو جھٹکا مارا جس سے اس نے میرا گریبان تھام رکھا تھا اور اسی لمحے ایک قدم دائیں طرف ہٹ کر نہ صرف اس کے گھونسے کو اپنے جبڑے تک پہنچنے سے بچایا بلکہ میرا دوسرا ہاتھ اس کی ٹھوڑی کے نچلے حصّے پر پوری قوت سے ٹکرا گیا۔

وہ لڑکھڑا گیا۔

اس سے پیشتر کہ وہ سنبھلتا میرا دایاں گھونسہ براہِ راست اس کی ناک پر پڑا۔ یہ چوٹ اُسے عقب میں بیٹھے ہُوئے ایک شخص کی گود میں براجمان کرنے کے لیے کافی تھی۔ . . لیکن جیسے وہ گرا میں نے پوری قوت سے اس کی وہ آستین تھام لی جسے اس نے تہہ کر کے چڑھا رکھا تھا۔

ایک ہی جھٹکے میں وہ آستین اس کی قمیص سے الگ ہو گئی۔

وہ جس شخص پر گرا تھا، اس نے دونوں ہاتھوں سے اُسے اُچھال دیا۔

زرق خان اُچھل کر ایک بار پھر میری طرف آیا تھا اس لیے میرا دایاں گھٹنا اس کے استقبال کے لیے اُٹھ گیا۔

اس کے پیٹ میں شدید چوٹ آئی۔

وہ دھیمی آواز میں کراہ اُٹھا۔

ساری چوٹیں مؤثر تھیں اور پے در پے لگی تھیں اس لیے وہ حواس کھو بیٹھا۔ وہ تو یوں ہی غصّے سے اندھا ہو رہا تھا۔ اوپر سے یہ چوٹیں اس پر قیامت ڈھا گئیں۔

پیٹ سے گھٹنا ٹکراتے ہی وہ دُہرا ہو گیا۔ اس نے خود کو سنبھالنے کے لیے کسی گرتے ہُوئے پرندے کے پھڑپھڑاتے ہُوئے پروں کی طرح اپنے بازوؤں کو لہرایا تو میرا ہاتھ اس آستین کو تھامنے میں کامیاب ہو گیا جو ابھی اس کے بازو پر موجود تھی اور جس نے کندھے سے کلائی تک اس کا بازو ڈھانپ رکھا تھا۔

میں نے اس آستین کو ایک جھٹکا دیا۔

اس بار آستین اس کے بازو سے الگ نہ ہو سکی لیکن میں نے اس کی کلائی کے نچلے حصّے پر زخم دیکھ لیا۔ زخم کی جھلک ایک لمحے کے لیے دکھائی دی تھی لیکن میں دانتوں کے گہرے نشان دیکھنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

میرا شُبہ یقین میں بدل گیا۔

رات مجھ پر جس نے گولی چلائی تھی، وہ زرق خان کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔ اس کی کلائی کے نچلے حصّے میں جو دانتوں کے نشان تھے، وہ یقیناً کتّے ہی کی وجہ سے پیدا ہُوئے تھے۔ کتّے نے جس وقت کھڑکی سے کود کر اس پر حملہ کیا تھا تو غیر ارادی طور پر اس نے اپنا ہاتھ آگے کر دیا ہو گا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی کلائی کا نچلا حصّہ کتّے کے دانتوں میں دب گیا ہو گا۔

ہنگامے کی وجہ سے قہوہ خانے میں بیٹھے ہُوئے سبھی لوگ اپنی اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑے ہُوئے تھے اور اب اتنی جگہ پیدا ہو گئی تھی کہ ہم اطمینان سے اپنا جھگڑا نمٹا سکتے تھے۔

زرق خان کچھ فاصلے پر گرا ہُوا تھا۔ اس کا چہرہ غصّے کی زیادتی سے مسخ نظر آنے لگا۔ جتنی چوٹیں اُسے لگ چکی تھیں، وہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایک عام آدمی کو بے ہوش کرنے کے لیے کافی تھیں لیکن زرق خان ایک مضبوط جسم کا آدمی تھا۔ اگر وہ غصّے سے اندھا نہ ہو گیا ہوتا تو پھر ہاتھوں سے یوں آسانی کے ساتھ نہ پٹتا۔ . .

وہ اُٹھ بیٹھا اس کی آنکھیں زخمی لگ رہی تھیں۔

اس کی ناک سے خون بہہ کر مُنہ تک آ رہا تھا۔ اس کی مونچھیں ناک سے بہنے والے خون سے تر ہو گئی تھیں۔ جب وہ زمین پر بیٹھا رہا تو میں نے اس تہہ شدہ آستین کو کھولا جسے میں اس کی قمیص سے الگ کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

جہاں کتّے نے غالباً دوسری بار مُنہ مارنے کی کوشش کی تھی وہ صرف کپڑے کی دھجی ہی اس کے دانتوں میں پھنس گئی تھی، وہاں سے کپڑا غائب تھا۔ میں نے اپنی جیب سے وہی دھجی نکالی جسے رات زمین سے اُٹھایا تھا۔ اس دھجی کو آستین کے سوراخ پر رکھنے کے بعد میں نے اُسے زرق خان کی طرف اُچھال دیا۔

"اگر تمھارے گھر میں کوئی خاتون سوئی دھاگے کے کام میں مہارت رکھتی ہے تو وہ اس دھجی کو لگا کر آستین مکمل کر دے گی اور یہ سوراخ زیادہ بد نُما نہیں لگے گا۔" میں نے مشورہ دینے والے انداز میں کہا۔ "لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں تمھاری شخصیت کے زخموں کی رفوگری کے لیے کسی کا پتہ نہیں بتا سکتا۔"

وہ بیٹھا دانت پیستا رہا۔

قہوہ خانے کا ہر شخص حیرت سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

اگر محض ہاتھا پائی کی بات ہوتی تو اس کی وجہ انھیں معلوم ہو چکی تھی لیکن آستین والا معاملہ سب کے لیے تجسس کا باعث بنا ہُوا تھا۔ میں نے اسلم خان کی طرف دیکھا۔

وہ حیرت اور خوف سے کبھی مجھے اور کبھی زرق خان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے اُسے چلنے کا اشارہ کیا۔

ابھی میں پلٹ کر دو قدم ہی چلا تھا کہ اچانک کوئی شخص چیخ پڑا۔ "نہیں۔ . . پُشت سے نہیں۔ . ."

میں پھُرتی سے پلٹا اور پلٹنے کے ساتھ ہی میری ٹانگ بھی گھوم گئی تھی۔ میں نے آواز سُنتے ہی سمجھ لیا تھا کہ وہ بُزدل عقب سے مجھ پر فائر کرنا چاہتا ہے۔ اس کے قریب چونکہ رائفل نظر نہیں آئی تھی اس لیے میرا اندازہ تھا کہ قمیص کے نیچے ہولسٹر میں یا پھر اس کی شلوار کے نیفے میں پستول اُڑسا ہُوا ہو گا۔ . . میں جتنے قدم چلا تھا، اس سے مجھے زرق خان کے ہاتھ کا بھی اندازہ تھا اس لیے میری ٹھوکر رائگاں نہیں گئی۔

وہ ابھی نیفے سے پستول کھینچنے میں کامیاب ہی ہوا تھا کہ ہاتھ پر پڑنے والی ٹھوکر کام کر گئی۔

پستول اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔

اس کی اس بُزدلانہ حرکت پر ہر شخص اُسے گھورنے لگا تھا جب کہ میری پھُرتی نے سب کو حیرت میں ڈال دیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ ہر شخص میری دلیری اور برق رفتاری پر عش عش کر اُٹھا ہے۔ مجھے اس کی بُزدلانہ حرکت پر بے حد غصّہ آ رہا تھا اس لیے میں نے جھُک کر اس کا گریبان تھام لیا اور ایک جھٹکے سے اُسے پیروں پر کھڑا کر دیا۔ اُسے اُٹھاتے وقت میں نے ایک بار پھر گھٹنے سے اس کے پیٹ میں چوٹ لگائی۔

اس چوٹ سے زرق خان کا مُنہ کسی ایسی مچھلی کی طرح کھُل گیا جیسے پانی سے نکال کر باہر زمین پر پھینک دیا گیا ہو۔ اس کا گریبان ابھی تک میری گرفت میں تھا۔

اس کے ہاتھ پیروں میں اب جان نہیں رہی تھی اس کے باوجود میں نے اس کے جھُکے ہُوئے مُنہ پر ایک گھونسہ ملا اور پھر گریبان سے جھٹکا دے کر پوری قوت سے دروازے کی طرف اُچھال دیا۔ وہ دروازے کے قریب مُنہ کے بل جا گرا۔

چند قدموں کی دوڑ کے بعد میں اس کے اُٹھنے سے پہلے ہی اس کے سر پر جا پہنچا۔ . . پھر قمیص کے پچھلے حصّے اور شلوار کے عقبی حصّے پر اپنے پنجے گاڑنے کے بعد میں نے اُسے زمین سے اُٹھا لیا۔ اگلے ہی لمحے میں نے اُسے دونوں ہاتھوں سے جھُلایا اور یکایک دونوں ہاتھوں کی گرفت ختم کر دی۔

وہ میرے ہاتھوں سے نکلا اور اُڑتا ہُوا دروازے سے گزر کر باہر بازار میں جا گرا۔ وہ مُنہ کے بل دھول آلود کچی زمین پر گرا تھا۔ میں نے چند لمحوں تک اس کی طرف دیکھا۔ . . پھر قہوہ خانے میں موجود لوگوں کو گزشتہ رات ہونے والی چپقلش، فائرنگ اور آج کے واقعے کے بارے میں مختصراً بتاتے ہُوئے میں نے کہا۔

"بے جا غرور خدا کو بھی پسند نہیں۔ یہ شخص جس انجام کو پہنچا ہے، اس میں ذلت اور رُسوائی ہے۔ . . کچھ عجب نہیں کہ یہ اپنی زندگی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔ تم لوگ گواہ رہنا، اس نے مجھ پر پُشت سے وار کرنے کی کوشش کی تھی اور یہ پٹھانوں کی نہیں، فرنگیوں کی روایت ہے۔"

ایک پٹھان نے نعرہ لگایا اور اس کے بعد قہوہ خانے کا ہر فرد نعرے لگانے لگا۔ میں نے کن انکھیوں سے دروازے کے باہر زمین چاٹتے ہُوئے زرق خان کی طرف دیکھا۔

وہ اب آہستہ آہستہ اُٹھ رہا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس نے دونوں ہاتھ فرش پر ٹکا رکھے تھے۔
زمین پر بیٹھ کر چند لمحوں تک وہ اپنے منہ کو دونوں ہاتھوں سے چھپائے رہا۔ . . پھر اس نے دیوانوں کی طرح اپنے ہاتھ جھٹک دیے اور ایک جھٹکے سے اُٹھ کھڑا ہُوا۔ وہ چہرے سے کوئی پاگل ہی لگتا تھا۔ غصے اور ذلت کے جذبے اپنی انتہا کو چھوتے ہُوئے محسوس ہو رہے تھے۔ اوندھا گرنے کی وجہ سے اس کا بالائی لب زمین سے رگڑ کھا گیا تھا جس کی نتیجے اس کے ہونٹ پر فوری طور پر سوزش نمودار ہو کر اس کے چہرے کو مزید بھیانک بنا رہی تھی۔ اس کے نوکیلے دانت اس وقت کسی زخمی بھیڑیے کی طرح نکلے ہُوئے تھے۔
"تم نے جو کچھ کیا ہے اس کی تمھیں بھاری قیمت ادا کرنی پڑے گی:" اس کی غراہٹ میں درندگی تھی۔
"فی الحال میں، تمھیں تمھاری زندگی ہی قیمت کے طور پر ادا کر رہا ہُوں۔ اسے بچا کر لے جانا چاہو تو چلے جاؤ:" میں نے فاتحانہ مُسکراہٹ کے ساتھ کہا: "جب تم اس ذلت کا بدلہ لینے آؤ گے تو یہ توقع رکھنا کہ تمھیں اس سے بھی زیادہ ذلت ملے گی۔ . . کیونکہ تم جیسے لوگوں کے نصیب میں یہی کچھ لکھا ہوتا ہے:"
میں نے اِدھر اُدھر دیکھا لیکن وہ نوجوان نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا جسے دیکھ کر میں قہوہ خانے میں داخل ہُوا تھا۔ میں چند لمحوں تک اس کی تلاش میں نگاہ دوڑاتا رہا۔ . . پھر میں نے کندھے اچکائے اور قہوہ خانے سے باہر آ گیا۔ وہ نوجوان غالباً پہلو کی کھلی کھڑکی سے نکل بھاگا تھا۔ میں اس کے فرار کی اُلجھن کا شکار آہستہ آہستہ باہر آ گیا اور اس طرف چل دیا جہاں ایک چھپر تلے رفیق گھوڑوں کی لگامیں تھام کر کھڑا تھا۔
"یہ کیسا ہنگامہ تھا:" اس نے میری طرف دیکھتے ہُوئے کہا اور قہوہ خانے کی طرف دیکھنے لگا۔
"کوئی خاص بات نہیں:" میں نے جواب دیا اور اس کے ہاتھ سے اپنے گھوڑے کی لگام لے لی۔
میں نے بازار میں اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔
قہوہ خانے کے باہر اب خاصا ہجوم نظر آ رہا تھا۔
زرق خان اٹھ کر ایک طرف جاتا دکھائی دیا۔ اس کے انداز میں شکست کے احساس کی بجائے غصے کی تیزی تھی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کسی خاص جگہ پہنچنے کے لیے تیز تیز چلا جا رہا ہو۔
میں نے گھوڑے کے عقب میں دیکھا۔
وہی کتا زبان نکالے کھڑا ہانپ رہا تھا جسے رات کھڑکی کے باہر دیوار کے قریب بے ہوش چھوڑ دیا گیا تھا۔

"ہمیں چند ضرورت کی اشیا خرید کر اپنے سفر پر روانہ ہو جانا چاہیے:" میں نے کہا اور رفیق نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
خریداری کرنے میں ہمیں خاصی دیر ہو گئی۔ اس دوران میں نے اطلس کی ایک اکھڑی ہُوئی نعل کو بھی ٹھیک کروا لیا اور پھر ہم دونوں سفر پر روانہ ہو گئے۔
دھوپ خاصی تیز ہو گئی تھی۔
میں اسلم خان کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ آخر وہ اس ہنگامے سے خوف زدہ ہو کر کیوں فرار ہو گیا؟ اس کی وجہ صرف خوف ہی ہو سکتی تھی لیکن اُسے مجھ سے ڈرنے کی کیا ضرورت تھی بالآخر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ میری بجائے زرق خان سے خوفزدہ ہو کر بھاگنے پر مجبور ہو گیا ہو گا۔ . . شاید اس نے یہ سوچا ہو گا کہ کہیں انتقام کی آگ میں جلتا ہُوا زرق خان اس سے وہ رقم نہ چھین لے جو اس نے پہلی ہی بازی میں زرق خان سے جیت لی تھی۔
رفیق اب بھی خاموش تھا۔
میں کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔
وہ میری طرف متوجہ نہیں تھا۔ میں نے سوچا کہ منزلِ مقصود پر پہنچنے کے بعد جو صورتِ حال پیدا ہو گی اس سے گھبرا کر یہ خود ہی واپس چلا جائے گا۔ مجھے اب اس سے کوئی دل چسپی بھی نہیں رہی تھی البتہ میں اس کتے سے زیادہ دل چسپی لے رہا تھا، جو مجھ کا پیاسا زبان نکالے گھوڑے کے پیچھے پیچھے دوڑ رہا تھا۔ اگلے پڑاؤ پر میں نے اسے کچھ کھانے کو بھی دینے کا ارادہ کر لیا۔
دوپہر کے وقت اس جھلستے ہُوئے میدانی علاقے میں سفر کرنا بے حد دشوار تھا لیکن میں اپنے جذبوں کی تسکین کے لیے اس دشواری کو خاطر میں لائے بغیر بے شکن چہرے کے ساتھ مسلسل آگے بڑھتا رہا۔ رفیق کے انداز میں البتہ اب پہلے جیسا جوش و خروش نہیں تھا۔ اس قسم کے دوست سے نقصان ہی پہنچنے کا اندیشہ ہوتا ہے اس لیے میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ اگر اس نے خوارزم سے واپس جانے سے انکار کر دیا تو میں اسے زبردستی واپس بھیج دوں گا۔ . . یا پھر خاموشی سے خود ہی کھسک جاؤں گا۔
دوپہر ڈھلنے لگی تو ہوا میں بھی آگ سی بھرنے لگی۔ اب لو کے تھپیڑے رُخساروں کو جلانے لگے تھے گھوڑوں کے جسم بھی پسینے سے بھیگنے لگے اور عقب میں دوڑتے ہُوئے کتے کی زبان مزید سُرخ اور معمول سے کہیں لمبی لمبی سے نظر آنے لگی جیسے وہ حلق سے کسی بھی لمحے زمین پر گر جائے گی۔
اب تک میں نے کئی بار پلٹ کر بھی دیکھا تھا لیکن عقب

میں کوئی بھی دکھائی نہیں دیا تھا۔ زرق خان جس انداز میں پٹ کر گیا تھا اس سے مجھے شبہ ہونا ہی چاہیے تھا کہ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہمارا تعاقب ضرور کرے گا۔ . . لیکن اب تک نہ تو کوئی دُور افتادہ آواز سنائی دی تھی اور نہ ہی کوئی سایہ سا لہراتا نظر آیا تھا۔
شام کے سائے ڈھلنے تک سفر جاری رہا۔
جب سورج غروب ہو گیا تو ہم پہاڑوں میں پہنچ چکے تھے۔ اگر ہم نے بازار میں وقت ضائع نہ کیا ہوتا تو ان چٹانوں سے نکل گئے ہوتے لیکن انسان کی ہر سوچی ہُوئی بات پوری بھی کب ہوتی ہے۔
"ہمیں یہیں کہیں پڑاؤ ڈال دینا چاہیے:" رفیق نے پہلی بار دن بھر میں لب کشائی کی۔
میں بے ساختہ مسکرا دیا۔ یوں محسوس ہُوا تھا جیسے وہ بالآخر تنگ آ کر ہی بولا تھا۔ . . گویا اسے خدشہ تھا کہ اگر اس نے رُکنے کی خواہش ظاہر نہ کی تو شاید میں رات بھر سفر جاری ہی رکھوں گا۔ میں نے قیام کے لیے کسی مُناسب جگہ کی تلاش میں اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔
نشیب میں ایک چٹان دکھائی دے رہی تھی جس کے اِرد گرد جھاڑیاں پھیلی ہُوئی تھیں۔ میں نے اپنے گھوڑے کو اس چٹان کی طرف بڑھا دیا قریب سے اس چٹان کا جائزہ لیا تو میں نے اسے قیام کے لیے ایک محفوظ جگہ پایا۔
شام کے سائے ڈھلتے ہی گرمی کی لہریں سرد پڑ گئی تھیں۔ اور اب فضا میں خنکی کا احساس ہو رہا تھا۔ یوں بھی پہاڑوں میں راتیں سرد ہی ہوتی ہیں اور آگ کے بغیر کسی ایسے مقام پر رات بسر کرنے کا عام آدمی تو تصور بھی نہیں کر سکتا۔
رفیق کو آگ جلانے سے منع کر کے میں نے خشک غذا سے پیٹ بھرنا شروع کر دیا۔ رفیق بے حد تھکا تھکا نظر آ رہا تھا۔ کتے کو بھی کھانے کو مل گیا تھا اس لیے اُسے جھاڑیوں میں گھس گھس کر شکار تلاش کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔
کھانے سے فارغ ہو کر میں نے پہاڑی کے عقب میں ایک چھوٹی سی میدانی جگہ سونے کے لیے موزوں تصور کی۔ اس جگہ کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اس کے چاروں طرف خاصی دُور دُور تک سوکھی گھاس اور خشک جھاڑیاں پھیلی ہُوئی تھیں۔ ان سوکھی ہُوئی شاخوں اور گھاس پر دُنیا کی کوئی بھی ہستی بے آواز نہیں چل سکتی تھی۔ ویرانوں میں قیام کرنے کے لیے ایسے قدرتی سہارے تلاش کرنا بے حد ضروری ہوتے ہیں۔ ہم دونوں ہی تھکے ہُوئے تھے اس لیے گھوڑے بیچ کر سو رہتے۔ . . کبھی ویرانے میں ایسی جذب کی نیند کا دوسرا مطلب ابدی نیند بھی ثابت ہوتا ہے، اس لیے ہر

Scanned By: Azeem

اعتبار سے خود کو محفوظ کر کے پُر لطف نیند میں ڈوب جانا چاہیے۔
گھوڑوں کو میں نے ایک درخت کے نیچے باندھ دیا۔ اس درخت کی شاخیں خاصی گھنی تھیں اس لیے اوپر سے گھوڑوں کو بہ آسانی نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔
وہ قد آور کتا ہم سے کچھ فاصلے پر اپنی تھوتھنی کو سامنے والے پنجوں پر رکھ کر آنکھیں بند کیے زمین سے چپکا ہُوا تھا۔ میں نے لیٹتے وقت یوں کروٹ لے لی کہ کتا میری نگاہ میں رہ سکے۔ وہ خطرے کو مجھ سے کہیں پہلے اور آسانی سے محسوس کر سکتا تھا اور میں اس پر ایک نگاہ ڈالتے ہی اس خطرے سے آگاہ ہو سکتا تھا اس لیے میں اسے نگاہ سے اوجھل نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔
خنکی میں رفتہ رفتہ اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔
رفیق تو لیٹتے ہی کمبل اوڑھ کر سو گیا۔
میں البتہ جاگ رہا تھا۔
ریوالور کو ہولسٹر سے نکال کر میں نے سوکھی ہُوئی گھاس کے بستر میں یوں رکھ دیا کہ جب چاہوں آسانی سے ہاتھ بڑھا کر اُٹھا سکوں۔ یوں بھی ہولسٹر میں رکھا ہُوا ریوالور نیند اچاٹ ہو جانے کے بعد کسی ضرورت کے تحت فوری طور پر نکالنا ذرا مشکل ہی ہوتا ہے۔
مجھے بچپن ہی سے سر کے نیچے تکیہ رکھ کر سونے کی عادت نہیں تھی کیوں کہ میرا نظریہ تھا کہ تکیے کا ایک نقصان دہ پہلو یہ ہے۔ اس پر سر رکھ کر سونے سے عموماً کان دونوں طرف سے بند ہو جاتے ہیں اور انسان اُن خفیف آوازوں کو نہیں سُن سکتا جو ہر خطرہ اپنی آمد

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے پہلے نشر کر دیتا ہے۔ کبھی کبھی گردن کی اکڑن کے باعث میں البتہ گھوڑے کی زین ضرور رکھ لیا کرتا تھا کیوں کہ اس میں کانوں کو بند کر دینے والی ڈراہٹ نہیں ہوتی۔

میرا زیادہ تر وقت ایسے ہی ویرانوں میں گزرا تھا اس لیے میں کسی ایسے مقام پر انسان کی بجائے جانوروں جیسی عادت اپنا لیا کرتا تھا۔

جلد ہی میں بھی سو گیا۔

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا کہ خفیف سی آہٹ سے میری نیند اچاٹ ہو گئی۔ میں نے رفیق کی طرف دیکھا۔ وہ بے سُدھ پڑا سو رہا تھا۔ میں نے اس کے بارے میں رات ہی اطمینان کر لیا تھا کہ وہ سوتے میں بڑبڑانے اور خراٹے لینے کا عادی نہیں ہے۔ ایسے افراد کو ویرانوں اور جنگلوں میں صرف دن کے وقت ہی سونا چاہیے کیوں کہ رات کو یہ آوازیں ان کے لیے خطرے کا باعث بھی بن سکتی ہیں۔

میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔

ایک چمک دار ستارہ دُور آسمان پر کسی دُور افتادہ چراغ کی طرح ٹمٹماتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اس وقت تک میں نے کتے کی طرف بھی دیکھ لیا تھا۔ وہ بے چینی سے کان کھڑے کیے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا لیکن میں نے بھی وہ آواز سُن لی تھی جس کی وجہ سے وہ بے قرار ہو کر ہلکی ہلکی غراہٹیں نکالنے لگا تھا۔

کوئی چیز تیزی سے سُوکھی ہوئی گھاس میں سرسرا رہی تھی۔ میں نے جیسے ہی کروٹ بدل کر ریوالور کو اُٹھایا، کتا تیزی سے اُٹھ کھڑا ہُوا۔ غالباً اس نے بھی دیکھ لیا تھا کہ میں بیدار ہو چکا ہُوں۔ کتے کی غراہٹیں بے حد دھیمی تھیں۔

اس کا احساس مجھے فوری طور پر نہیں ہُوا تھا اور یہ ایک غلطی تھی۔ . . ایسی غلطی جو زندگی کی آخری غلطی بھی بن سکتی تھی۔ کتے نے اس سانپ کی بجائے کسی اور کی موجودگی کو بھی محسوس کر لیا تھا۔ آس پاس کچھ گھڑ سوار موجود تھے جن کی وجہ سے یہ سانپ خوف زدہ ہو کر اس چٹان کی طرف نکل آیا تھا، جہاں ہم لیٹے ہُوئے تھے۔ . . لیکن آگے ایک قدآور کتا کھڑا تھا۔

"خاموش ہو جاؤ۔" میں نے دھیمی آواز میں کتے کو ڈانٹ دیا۔

اگرچہ وہ میری زبان نہیں سمجھتا تھا لیکن اس نے اپنی حیوانی حسیات سے اندازہ لگا لیا تھا کہ میں کیا چاہتا ہُوں۔ اگلے ہی لمحے اس کے حلق سے نکلنے والی غراہٹیں ختم ہو گئی تھیں اور وہ خاموش کھڑا اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے اسی طرف دیکھ رہا تھا جدھر سانپ کی حرکت سُنائی دے رہی تھی۔ . . لیکن اس کے ساتھ ہی کتے کے کان گھوم کر ایک اور طرف بھی متوجہ تھے اور میں اسی سمت میں متوجہ تھا۔

سانپ کتے کی غراہٹوں سے خوف زدہ ہو کر راستہ بدلنے کے لیے مجبور ہو گیا تھا اور اب وہ اس طرف بڑھ رہا تھا جدھر اسے خاموشی اور سکوت محسوس ہُوا تھا۔ . . لیکن درحقیقت خطرہ اسی طرف تھا۔ نہ صرف اس سانپ کے لیے بلکہ ہمارے لیے بھی

جاسوسی ڈائجسٹ کے مقبول سلسلے

ناگ بھون — اقلیم علیم
(دو جلدیں) قیمت =/300 روپے
سنگتراش — اقلیم علیم
(دو جلدیں) قیمت =/300 روپے
برہمچاری — انوار صدیقی
قیمت =/150 روپے
سرکش — محمود احمد مودی
(12 حصے) مکمل سیٹ =/600 روپے

مکتبہ القریش سرکلر روڈ اردو بازار لاہور
فون 7668958

پراسرار اور خوفناک کہانیاں جنہیں پڑھتے ہوئے آپ چونک اٹھیں گے
انوار صدیقی کے پراسرار قلم سے
آسیب زدہ — قیمت =/110
دستک — قیمت =/100

مکتبہ القریش سرکلر روڈ اردو بازار لاہور
فون 7668958

. . . میں نے بلندی کی طرف نگاہ ڈالی۔ ایک طرف دو گھڑ سوار کھڑے تھے اور رائفلیں ان کے ہاتھوں میں تھیں۔ . . لیکن اسی لمحے چٹان کے عقبی حصے میں بھی چند گھوڑوں کی ٹاپیں سُنائی دیں اور تب میں نے دیکھا کہ وہ ان گنت گھڑ سوار ہیں۔

میرا ہاتھ آہستہ آہستہ رفیق کی طرف بڑھنے لگا اور پھر میں نے اُسے جھنجھوڑ ڈالا۔ "رفیق . . . اُٹھ جاؤ۔" میں نے سرگوشی کی۔

وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ . . پھر میں نے مدھم چاندنی میں اس کے چہرے پر خوف اور دہشت کی زردی پھیلتے دیکھی اور ایک طویل سانس لے کر رہ گیا . . .

چاندنی میں رفیق کا چہرہ دہشت کا شاہکار لگ رہا تھا۔ میں چند لمحوں تک اس کا جائزہ لیتا رہا۔ مجھے افسوس ہونے لگا کہ میں اسے بلا وجہ ہی ساتھ گھسیٹ لایا۔ اس قسم کے بزدل ساتھی کبھی کبھی مہلک بھی ثابت ہوتے ہیں۔ جس طرح نادان دوست سے دانا دشمن اچھا ہوتا ہے، بالکل اسی طرح بزدل ساتھی سے بہادر حریف اچھا ہوتا ہے۔ میں نے رفیق کا ہاتھ تھپ تھپا کر اُسے تسلی دی۔

"گھبراؤ نہیں، رفیق! جب تک میں زندہ ہوں، کوئی تمہاری طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔" میں نے سرگوشی کی۔

"یہ کون لوگ ہیں؟" اس نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

میں نے بلندی کی طرف دیکھا جہاں دو گھڑ سوار نظر آ رہے تھے۔ یہ دونوں ابھی تک ہمیں دیکھنے میں کامیاب نہیں ہوئے تھے کیونکہ میں نے رات گزارنے کے لیے ایک ایسی جگہ کا خاص طور سے انتخاب کیا تھا جسے اُوپر سے نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ جھاڑیوں اور چٹانوں کی وجہ سے اس کمین گاہ کو نیچے وادی سے بھی مشکل ہی سے دیکھا جا سکتا تھا۔

"اوہ . . ." رفیق کے حلق سے ایک کراہ نکل گئی۔

"کیا بات ہے؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"پیچھے دیکھو۔ اُدھر وادی کے بلند حصے کی طرف بہت سے گھڑ سوار ہیں۔"

"ہاں . . . میں ان کی موجودگی کو محسوس کر چکا ہُوں۔"

"یہ کون لوگ ہیں؟"

نامور مصنف محمود احمد مودی کی
وہی تحریر اور وہی انداز
کے ساتھ اپنے چاہنے والوں
کے لئے ایک نئی سوغات لئے

تلاش

دو جلدیں جلد اول =/150
جلد دوئم =/150
خوبصورت ...
طباعت و کتـ...

مکتبہ ... سرکلر ...

Scanned By: ...

"سامنے والے دونوں گھڑ سواروں کو تو میں جانتا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ "لیکن عقب میں موجود سوار نہ جانے کون ہیں۔"

"سامنے والے کون ہیں؟"

"زرق خان اور اس کا کوئی ساتھی۔" میں نے جواب دیا۔

"اوہ... تو پھر عقب میں موجود سوار یقیناً ملک نواز کے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔" رفیق نے خوف زدہ سرگوشی کی۔ "ہم چاروں طرف سے گھر چکے ہیں، شہباز۔"

"پروانہ کرو۔" میں نے ایک بار پھر اس کا ہاتھ تھپتھپایا۔ "ابھی تک ان سب نے ہمیں نہیں دیکھا... پھر جس جگہ ہم موجود ہیں یہاں سے ہمیں شکار کرنا آسان کام نہیں ہے۔"

"اُف... میرے خدا۔" رفیق کے حلق سے پھر ایک کراہ نکل گئی۔

اسی لمحے سانپ تیزی سے پھنکارا تھا اور غالباً رفیق کی اس پر نگاہ پڑ گئی تھی۔ رفیق کی کراہ اور سانپ کی پھنکار نے کتے کو ایک بار پھر بے چین کر دیا۔ لیکن میرے حلق سے نکلنے والی دھیمی آواز کی تنبیہ نے اُسے غرّانے سے باز رکھا۔

کتا سانپ سے زیادہ دُور نہیں تھا۔ وہ اُسے خونخوار نظروں سے گھور رہا تھا۔ سانپ کو بھی غالباً اس کی آنکھوں میں دشمنی کی جھلک نظر آ گئی تھی اور ہم دونوں کی موجودگی کو محسوس کر کے اس نے غالباً خود کو خطرے میں محسوس کیا تھا۔ اسی لیے وہ ایک جگہ ہی چکر کاٹنے لگا تھا۔ اس کا پتلا سا جسم تیزی سے دائرے میں گھوم رہا تھا اور اس کی پھنکاروں سے فضا میں شور پیدا ہونے لگا تھا۔

گھوڑے وہاں سے کچھ فاصلے پر تھے۔ اس کے علاوہ ہوا کا رُخ گھوڑوں کی طرف نہیں تھا، ورنہ سانپ کی ان پھنکاروں سے وہ بھی بے چین ہو سکتے تھے اور ان کی بے چینی کا اظہار ہماری موجودگی کا پتہ دے سکتا تھا۔ میں نے سوچا کہ پہلے سانپ سے نمٹ لینا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ چاروں طرف بکھرے ہوئے موت کے ہرکاروں کو ہماری کمین گاہ کا پتہ چل جائے اور ہم کسی مہلک صورت حال کا شکار ہو جائیں۔

میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔

صبح ہونے میں تھوڑی ہی دیر باقی تھی۔

دُور آسمان پر ایک روشن ستارہ کسی دُور اُفتادہ لیمپ کی طرح لٹکا ہوا چمک رہا تھا اور ہوا کے جھونکوں سے جھاڑیاں ہل رہی تھیں جس کی وجہ سے ایسی آوازیں پیدا ہونے لگیں جیسے یکا یک ان گنت اژدہے پھنکارنے لگے ہوں۔

اچانک کتے کے حلق سے ایک دھیمی غرّاہٹ نکل گئی۔ وادی کے بالائی حصے میں ان گنت گھوڑوں کی وجہ سے میں بھی بے قرار ہو گیا تھا... لیکن صورت حال کو سنبھالنا بہر حال میری ذمے داری تھی اور میں اس وقت تک کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہتا تھا جب تک صورت حال کا صحیح اندازہ نہ ہو جاتا۔

میں نے سانپ کی طرف دیکھا۔

وہ اچانک ہی سیدھا ہوا اور پھر سامنے والی جھاڑی کی طرف لپکا۔ اس نے بے پناہ تیزی سے حرکت کی تھی۔ اس کا رُخ اُسی جانب تھا جدھر زرق خان اپنے ساتھی کے ساتھ گھوڑے کی پشت پر براجمان وادی پر نگاہ دوڑاتا ہوا غالباً ہمیں تلاش کر رہا تھا۔

اس نے ہمارا تعاقب کرنے کے لیے غالباً کوئی اور ہی راستہ اختیار کیا تھا۔ گویا وہ ہمارے پیچھے پیچھے نہیں آیا تھا ورنہ میں اس کی آمد سے بے خبر نہ رہتا۔

"لیٹ جاؤ۔" میں نے رفیق سے کہا۔ "اور کوشش کرو کہ تمہاری سانس زیادہ تیز نہ چلے۔ اپنی دھڑکنوں کو قابو میں رکھو۔"

میں خود بھی لیٹ گیا۔

سانپ جھاڑی میں جا کر غائب ہو گیا تھا۔

کتا بھی دُبک گیا۔

میں نے نگاہ اٹھا کر وادی کے اس کنارے کی طرف دیکھا جہاں زرق خان اور اس کے ساتھی کا ہیولا دکھائی دے رہا تھا۔ ان کی رائفلیں ہاتھوں میں تیار تھیں اور وہ کسی بھی لمحے فائرنگ شروع کرنے کے لیے بے چین تھے۔

دُھندلی دُھندلی چاندنی کے غبار میں وہ مجھے تو صاف نظر آ رہے تھے جب کہ جھاڑیوں اور ان پر چھائی ہوئی دُھند کی وجہ سے وہ ہمیں نہیں دیکھ سکتے تھے۔ میں نے عقب میں دیکھا اس طرف موجود گھڑ سوار بھی چٹانوں کی وجہ سے زرق خان اور اس کے ساتھی کی نگاہوں سے اوجھل تھے۔ مجھے صرف یہ اُلجھن تھی کہ عقب میں کھڑے گھڑ سوار کون ہیں؟ یہ زرق خان کے ساتھی تو ہرگز نہیں ہو سکتے کیونکہ یہ کسی اور سمت سے آئے تھے۔

دفعتہً میرے کانوں سے ایسی آوازیں ٹکرائیں جیسے دو آدمی چٹانوں پر کود پڑے ہوں۔ میں نے اُدھر نگاہ دوڑائی تو زرق خان اور اس کا ساتھی غائب ہو چکے تھے۔ ان کے گھوڑوں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے ہیولے بھی نظر نہ آئے۔ گویا انہوں نے وادی میں اترنے کا ارادہ کر لیا تھا۔

اس سے مجھے اندازہ لگانے میں آسانی ہو گئی کہ یہ دونوں احمق ان درجنوں گھڑ سواروں کی موجودگی سے آگاہ نہیں ہیں، جو وادی کی دوسری جانب چٹانوں میں چھپے کھڑے غالباً ان دونوں ہی کی طرف متوجہ تھے۔

میں نے رائفل اٹھالی۔

رفیق بے حس و حرکت اوندھا پڑا تھا۔

زرق خان اور اس کا ساتھی آہستہ آہستہ نیچے آ رہے تھے۔ انہوں نے وادی میں اترنے کے لیے ایک ایسی پگڈنڈی اختیار کی جس پر نرم نرم ریت تھی اور راستے میں جھاڑیاں بھی حائل نہیں تھیں۔ یہ راستہ میری نگاہ میں تھا اور میں انہیں صاف دیکھ سکتا تھا۔

وہ دونوں احتیاط سے "قدم بہ قدم" وادی میں اُتر رہے تھے۔ رائفلیں ان کے ہاتھوں میں یوں دبی ہوئی تھیں جیسے وہ ذرا سی آہٹ پر فائر کرنے کے لیے تیار ہوں۔

اچانک ایک پرندہ زور سے چیخا اور پھر پھڑپھڑاتا ہوا فضا میں بلند ہو گیا۔ دُور کہیں کسی گھوڑے نے زور سے پاؤں زمین پر مارا اور بے حد دھیمی آواز میں ہنہنایا... دونوں ٹھٹک گئے۔

یہ سارا عمل نہایت عجیب انداز میں ہو رہا تھا۔ دُھند تیزی سے چھٹ رہی تھی۔ عقب میں چٹانوں کی آڑ لیے جو گھڑ سوار کھڑے تھے، ان کی موجودگی کا ابھی تک زرق خان اور اس کے ساتھی کو پتہ نہیں چلا تھا۔

پہاڑوں میں کبھی کبھی شام و سحر اچانک ہی اتر آتے ہیں۔ اس وقت بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ وہ ٹمٹماتے چراغ جیسا ستارہ آسماں سے غائب ہو گیا اور مشرق سے سُورج جھانکنے لگا۔ اس کی پہلی کرن عقب میں کسی دھات پر پڑی اور منعکس ہو کر زرق خان کے ساتھی کے چہرے پر پڑی۔

وہ اس روشنی کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

میں سمجھ گیا کہ چٹانوں کی اوٹ میں کھڑے گھڑ سواروں میں سے کسی کی رائفل سے یہ روشنی منعکس ہوئی ہے۔ میں اور رفیق جہاں تھے، وہیں دُبکے رہے۔ کتا فاصلے پر بیٹھا تھا۔ اس کی زبان غائب تھی اور اس کے کان بار بار مختلف آوازوں کی طرف گھوم رہے تھے۔

رائفل کی نال سے جو روشنی کا انعکاس ہوا تھا، اس سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ شخص تقریباً چالیس گز دُور کھڑا ہے۔ زرق خان کے ساتھی کی نگاہ غالباً اس پر پڑ گئی تھی۔

میں نے اس کی آنکھوں میں خوف کی جھلک دیکھی اور اس کے ساتھ ہی اس کا چہرہ زرد و زرد دھوپ میں کسی لاش کے چہرے کی طرح سپید دکھائی دینے لگا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے اُس شخص نے موت کو دیکھ لیا ہو... اور جب انسان موت کا چہرہ دیکھ لیتا ہے تو اُس کے چہرے پر جو تاثرات پیدا ہوتے ہیں، وہ سارے کے سارے اس شخص کے چہرے پر نمایاں ہو گئے تھے۔ اچانک ہی وہ جیسے ہوش میں آ گیا۔

اس نے رائفل کی نال کو اس سمت میں اٹھانے کی کوشش کی جدھر سے روشنی منعکس ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اُس نے کہا تھا۔ "اوہ... میرے خدا۔"

اگلے ہی لمحے وادی گولی کے دھماکے سے گونج اٹھی۔

میں نے گولی کی بازگشت سنتے ہوئے، زرق خان کے ساتھی کی طرف دیکھا۔ جس کسی نے بھی اس پر فائر کیا تھا، اس کا نشانہ بے حد سچا تھا۔ گولی زرق خان کے ساتھی کے جبڑے پر لگی اور اُسے توڑتی ہوئی، حلق کو چیرتی نکل گئی۔

اس نے غالباً چیخنا چاہا تھا۔

...لیکن گولی نے اس کی چیخ کو دبا دیا۔

وہ گر گیا۔

اس فائر سے کتا بُری طرح خوف زدہ ہو گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ زور زور سے بھونکنا شروع کر دیتا، میں نے دھیمی آواز میں اُسے پکارا اور میری آواز سُن کر وہ دُم ہلانے لگا۔ رفیق کسی لاش کی طرح بے حرکت پڑا تھا۔

الف لیلہ ڈائجسٹ کا مقبول سلسلہ
انسان اور شیطان
مصنف محمد فراز
امیر علی خان کی خوفناک آپ بیتی
مکتبہ القریش سرکلر روڈ اردو بازار لاہور
فون 7668958

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اُسے دیکھ کر مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔ یوں لگتا تھا جیسے گولی زرق خان کے ساتھی کو نہیں بلکہ میرے اس ساتھی کو لگی ہو۔ مجھے اس پر رحم بھی آیا۔ وہ دراصل ایک شہری لڑکا تھا اس کی رگوں میں خیمہ بستیوں میں رہنے والوں کا خون موجزن تھا لیکن چونکہ ایسے حالات سے کبھی نہیں گزرا تھا اس لیے اس کی حالت بزدلوں جیسی ہوگئی تھی ورنہ اگر وہ بزدل ہوتا تو اس مہم میں میرے ساتھ کبھی نہ نکلتا۔

میں نے رتیلے راستے کی طرف دیکھا، جہاں زرق خان کا ساتھی گرا تھا۔ وہ منہ کے بل پڑا صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اس کا منہ اور چہرہ خون آلود تھا جیسے وہ اپنا ہی لہو پی رہا ہو۔ اس کے منہ سے خون بہہ بہہ کر زمین میں جذب ہو رہا تھا۔

وادی ایک بار پھر گولیوں کی آوازوں سے گونج اٹھی۔

ایک کراہ گونجی اور کوئی جھاڑیوں میں آ کر گر گیا۔

کتے نے جست لگائی۔

میں بھی تیزی سے اُسی طرف دوڑنے لگا۔

جھاڑیوں میں زرق خان پڑا تھا۔ اس کا چہرہ دھواں دھواں تھا۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی اس آنکھوں میں خون اتر آیا لیکن میرے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کر وہ جہاں اور جس حالت میں تھا، اُسی میں ساکت ہو گیا۔

”تمہیں زیادہ چوٹ تو نہیں آئی؟“ میں نے پوچھا۔

اُس نے میری بات کا جواب دینے کی بجائے اپنے گریبان کی طرف دیکھا۔ گریبان کھلا تھا اور اس میں جھولتا ہوا مجھے ایک تعویز دکھائی دے رہا تھا اس تعویز پر گولی لگ کر پھسل گئی تھی اور یوں گولی کا رُخ بدلنے سے اُس کی جان بچ گئی۔

اچانک مجھے عقبی حصے سے گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دینے لگیں میں ادھر متوجہ ہوا۔ اُسی لمحے کتے کی غراہٹ سنائی دی۔ میں نے آوازوں کی طرف متوجہ ہوتے وقت زرق خان کی پوزیشن ذہن میں رکھی تھی اور مجھے یہ بھی اندازہ تھا کہ اس کی رائفل ہاتھ کی دسترس سے دور ہے... اس کے باوجود اس نے کوئی ایسی حرکت کی تھی جس پر غصہ آ جانے کی وجہ سے کتا غرایا تھا۔ یہ حرکت سوائے اس کے کیا ہو سکتی تھی کہ اس نے ریوالور نکال لیا ہو گا۔

میں تیزی سے ایک دم گھوما۔

اُسی لمحے میرے کولہے سے [illegible] ریوالور بھی گرج اُٹھا۔

گولی زرق خان کے لگی اور وہ جھاڑیوں کے نیچے بچھی ہوئی ریت پر گر کر تڑپنے لگا۔

میں نے دوسری گولی چلانے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ وادی کے عقبی حصے پر گھڑ سوار غالباً زرق خان اور اس کے ساتھی پر گولیاں چلانے کے بعد مطمئن ہو کر چلے گئے تھے۔ میں ان کے گھوڑوں کی ٹاپیں سن سکتا تھا۔ غالباً یہ ڈاکوؤں کا کوئی گروہ تھا جو اتفاق سے اس طرف آ نکلا تھا۔ یہ دونوں چونکہ وادی کے بلند حصے میں تھے اس لیے ان کی نگاہ سے اوجھل نہ رہ سکے جب کہ جھاڑیوں کی وجہ سے مجھے اور رفیق کو دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ ڈاکوؤں نے ان دونوں کو پُراسرار انداز میں، وادی میں اترتے دیکھا تو غالباً یہی سمجھے کہ یہ دونوں انہیں دیکھ چکے ہیں اور ان پر حملہ کرنا چاہتے ہیں۔ یوں یہ دونوں مارے گئے۔ گھوڑوں کی ٹاپیں جلد ہی معدوم ہو گئیں۔

میں نے رفیق کو اطمینان دلایا کہ خطرہ ٹل گیا ہے۔

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

اس کے چہرے پر ندامت کے تاثرات تھے۔

”میں، تم سے شرمندہ ہوں، شہباز“ اس نے نگاہ جھکا کر کہا۔

”دراصل میری زندگی کا زیادہ تر حصہ...“

”چھوڑو ان باتوں کو میں سب کچھ سمجھ گیا ہوں۔“ میں نے اس کا کندھا تھپتھپایا اور اُس غار نما چٹانی حصے کی طرف چل دیا جہاں ہمارے گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔

خوارزم تک چالیس میل کی مسافت نسبتاً آسان تھی کیونکہ راستہ ہموار میدانی علاقے سے گزرتا تھا۔ راستے کے دونوں طرف گھنے درخت تھے لیکن یہ راستہ بظاہر جتنا آسان تھا اتنا ہی خطرناک بھی تھا کیونکہ جنگل میں چھپ کر دشمن ہمیں آسانی سے نشانہ بنا سکتا تھا۔

... لیکن خوارزم پہنچنے تک کوئی ناخوشگوار واقعہ نہیں ہوا۔

خوارزم میری توقع سے کہیں بڑا گاؤں تھا۔ اس کی ایک وجہ غالباً یہ بھی تھی کہ کوہاٹ سے بنوں اور ڈیرہ اسماعیل خان جانے والی پختہ سڑک یہاں سے زیادہ دور نہیں تھی... اور یہاں وہ لوگ بھی آباد تھے جن کا شہروں میں کاروبار تھا۔ یہ لوگ نسبتاً خوشحال تھے۔ یہی وجہ تھی کہ خوارزم میں زیادہ تر پختہ مکانات نظر آ رہے تھے۔ ایک ایسے ہی مکان کی کھڑکی کے اوپر مجھے گول روشن دان میں رنگین شیشے بھی لگے ہوئے دکھائی دیے تو میں حیران رہ گیا۔

گاؤں کا ایک بازار بھی تھا جس میں کم و بیش ساٹھ ستر دکانیں تھیں۔ ان دکانوں میں اتنا سامان اور بازار میں اتنی چہل پہل تھی کہ بار بار میرے قدم رُک جاتے تھے۔

قہوہ خانوں میں لوگ لکڑی کی بینچ اور چٹائی پر بیٹھے تھے۔ خمیری نان اور چپلی کباب کی رال ٹپکا دینے والی مہک دور ہی سے محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ بہت سے لوگ رفیق کو پہچانتے ہیں۔ یہ زیادہ تر ایسے لوگ تھے جو شہروں سے آئے تھے اور ان کا تعلق کسی نہ کسی کاروبار سے تھا۔

ہم گھوڑوں کی لگامیں تھام کر پیدل ہی چل رہے تھے۔

ایک گلی کا موڑ کاٹتے ہی میری نظر بہرام پر پڑی۔ اس کے ساتھ گل زمان بھی تھا۔ نہ جانے وہ کس گھر سے نکلے تھے اور باتیں کرتے چلے جا رہے تھے۔ اُن کی پشت ہماری طرف تھی... بہرام نے غالباً پھر چرس کا دم لگا رکھا تھا۔ اس کی چال میں لڑکھڑاہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے انہیں وہیں سے للکار دیا۔ وہ ٹھٹک گئے اور جیسے ہی ان دونوں کی نگاہ مجھ پر پڑی، ان کی آنکھوں میں حیرت اور خوف کے سائے رقص کرنے لگے۔

میری للکار سن کر اور بھی کئی آدمی متوجہ ہو گئے تھے اور اس بات کا احساس بہرام اور گل زمان کو بھی تھا۔

”کیا بات ہے؟“ بہرام نے قدرے ہمت کر کے پوچھا۔ اس کے انداز میں بیگانگی اور اجنبیت تھی جیسے وہ مجھے سرے سے پہچانتا ہی نہ ہو۔

”کون ہو تم... اور کیا چاہتے ہو؟“ گل زمان نے بھی فوراً یہی انداز اختیار کر لیا۔

میں نے گھوڑے کی لگام رفیق کے ہاتھ میں دے دی اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا اُن دونوں کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اس وقت کم و بیش درجن بھر آنکھیں ہمیں الجھن سے دیکھ رہی تھیں۔ یہ مقامی لوگ تھے... ان کی حیرت بجا تھی کیونکہ ہم [illegible] سب کے سب ان لوگوں کے لیے اجنبی تھے... لیکن یہ اجنبی آپس میں الجھنا چاہتے تھے اس لیے لوگوں کو ہماری باتوں پر حیران ہونا ہی چاہیے تھا۔

میرا مقصد بھی یہی تھا۔

میں ان دونوں کو یہ جتانا چاہتا تھا کہ ماحول اور فضا چاہے کیسی بھی کیوں نہ ہو، میرا ہاتھ ان کی گردن پر پہنچ کر ہی رہے گا... اور مجھے اُن کی حمایت کرنے والوں کی بھی پروا نہیں تھی۔

”گل زمان... وہ حرام کا مال نہیں تھا“ میں نے غصے سے کہا۔

وہ یکایک آگے بڑھا اور اس کا گھٹنا تیزی سے اُٹھا۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ خوارزم کی فضا میں آتے ہی وہ اتنا دلیر ہو سکتا ہے کہ مجھ پر حملہ کرنے کا ارادہ کرے گا۔

اس کے بڑھتے ہوئے گھٹنے پر میری ٹھوکر پڑی۔

وہ ذرا سا عقب میں لڑکھڑایا... اور پھر میں اسے رگیدتا ہوا دیوار تک لے گیا۔ بہرام اس کی مدد کے لیے آگے بڑھا لیکن رفیق اس کی راہ میں حائل ہو گیا۔ مجھے اس حرکت پر خوشی ہوئی ورنہ میں سمجھا تھا... کہ وہ یہاں بھی بزدلی کا مظاہرہ کرے گا یا پھر مصلحت سے کام لے گا۔

گل زمان کی رائفل کندھے سے لٹک رہی تھی۔ اُسے رائفل آزمانے کا موقع نہیں مل سکا اس لیے پہلے ہی ہلے میں رائفل میں نے گرا دی اس نے خالی ہاتھ مجھ سے بھڑ جانا چاہا... لیکن شاید اُسے میرے ہاتھوں کا اندازہ نہیں رہا تھا میری انگلیاں چبھیں۔

وہ بُری طرح چیخ پڑا۔

انگلیاں اس کی آنکھوں میں لگی تھیں اور وہ وقتی طور پر اندھے پن کا شکار ہو گیا۔ درد کی شدت سے بے چین ہو کر وہ بُری طرح چیخنے لگا پھر اس نے مجھے اپنی دونوں ٹانگوں پر اچھال دینا چاہا لیکن میں اس کے سینے پر سوار ہو چکا تھا۔

نہ جانے اس نے کب اور کہاں سے ایک خنجر نکال لیا۔

میں نے ایک ہاتھ سے اس کی خنجر والی کلائی تھام لی اور دوسرے ہاتھ سے اس کے جبڑے پر گھونسا مارا۔ کلائی کو جھٹکا دیا تو اس کی انگلیوں کی گرفت خنجر پر ڈھیلی پڑ گئی۔ ... پھر دوسرے جھٹکے کی وجہ سے خنجر اُس کے ہاتھ سے نکل گیا۔

خنجر جیسے ہی اُس کے ہاتھ سے نکلا، اُس نے جلدی سے خود کو میری گرفت سے نکالنے کی کوشش کی۔ اُس نے پورا زور صرف کر دیا تھا۔ لیکن یہی طاقت آزمائی اُس کے لیے خطرناک ثابت ہوئی۔ میں نے اُسے اس انداز میں جکڑ لیا تھا کہ وہ جتنا بھی زور لگاتا، وہ زور خود اُسی کے خلاف استعمال ہوتا۔

نتیجتاً اُس کے حلق سے ایک دلدوز چیخ نکل گئی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ بُری طرح تڑپنے لگا۔

آدمی جاندار تھا ورنہ اس داؤ میں اُس کا بازو کندھے سے الگ بھی ہو سکتا تھا۔ وہ اپنا کندھا دبائے بُری طرح چیخنے لگا اور میں اُسے چھوڑ کر اُٹھ کھڑا ہُوا۔

"یہ کیا فساد ہے؟" ایک بزرگ صُورت باوقار شخص نے اچانک آگے بڑھ کر میری راہ میں حائل ہوتے ہُوئے کہا۔ "تم لوگ کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو اور اپنے جھگڑوں کے لیے تم نے خوارزم ہی کا کیوں انتخاب کیا ہے؟"

"ہم... ہم تو مسافر ہیں۔" بہرام جلدی سے بولا۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ "یہ شخص شاید پاگل ہے۔ راہ چلتے ہم سے اُلجھ گیا۔ شاید یہ کمزور لوگوں پر اپنی طاقت آزما کر خوش ہونے والا نوجوان ہے۔"

میں اُس کی بات پر مُسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

اُس نے اپنی دانست میں بڑی کامیاب چال چلی تھی۔

میں نے اس کی بات کا ردِعمل بھی فوراً ہی دیکھ لیا۔ ہمارے گرد جو ہجوم تھا، اُس میں کھڑے ہُوئے بیشتر لوگوں کے نتھنے غصّے سے پھیلنے اور سُکڑنے لگے تھے۔

بزرگ صورت شخص کی آنکھوں میں بھی غصّے کی سُرخی پیدا ہو گئی۔ وہ مجھے گھُور رہا تھا۔ "سُنو نوجوان...؟" اُس نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ "تم کون ہو اور تمہارا کیا نام ہے؟"

"میں مگوری کا رہنے والا شہباز خان ہُوں۔"

"کیا تم اپنے قبیلے کے سرزور ہو؟"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"تب تمہیں کمزوروں پر ہاتھ اُٹھاتے ہُوئے شرم آنی چاہیے تھی۔" بزرگ صورت شخص نے کہا۔ "یا تم نے یہ سمجھ لیا تھا کہ خوارزم کے لوگ اتنے گئے گزرے ہیں کہ کسی کمزور مُسافر کی حفاظت بھی نہیں کر سکتے؟"

میں نے فوراً ہی کوئی جواب نہیں دیا۔

ہجوم میں ہر شخص کی آنکھوں میں، میں نے اپنے لیے نفرت کی چمک دیکھ لی تھی۔ میرے ذہن نے تیزی سے کام کرنا شروع کر دیا... پھر میں نے دل ہی دل میں ایک فیصلہ کیا اور بزرگ صورت شخص کا ہاتھ تھام کر دھیمی آواز میں کہا۔

"مجھے افسوس ہے محترم بزرگ۔ میں غلط فہمی میں اس شخص سے اُلجھ بیٹھا۔ دراصل ایک شخص میرے قبیلے کے سردار کو قتل کر کے اسی طرف بھاگ آیا ہے۔ مجھے اس پر اُسی مفرور قاتل کا شُبہ ہُوا تھا۔"

بزرگ صورت شخص کے چہرے پر فوراً ہی ملائمت پیدا ہو گئی۔ میں نے گل زمان کو زمین سے اُٹھایا اور اُس کے کپڑے جھاڑتے ہُوئے کہا۔ "مجھے معاف کر دینا، جوان..."

گل زمان کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

غالباً اُسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں ان حالات میں مصلحت کوشی کا دامن بھی تھام سکتا ہوں۔ مجھے اُس کی نادان سوچ پر ہنسی آ گئی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کا کیا حال ہونے والا ہے اور اس کے ساتھیوں کا کیا انجام ہو گا۔ مجھے صرف شیر خان کی تلاش تھی۔ اُس کا سُراغ ملتے ہی میں فیصلہ کُن صورتِ حال پیدا کر دینا چاہتا تھا۔

رفیق بھی میرے اس رویّے پر حیران تھا۔

میں نے بہرام کی طرف دیکھا۔

اُس کا چہرہ کرختگی سے یوں بگڑ گیا تھا جیسے کسی نے گھونسے مار مار کے اس کے نقش و نگار میں گڑھے ہی گڑھے پیدا کر دیے ہوں۔

میں نے رفیق کے ہاتھ سے اطلس کی باگ لی اور خاموشی سے بازار میں آگے بڑھ گیا۔ لیکن اس دوران میں میرا دایاں ہاتھ اپنے ریوالور سے زیادہ دُور نہیں رہا تھا۔ عقب سے کسی بھی لمحے کوئی شرارت ہو سکتی تھی۔

رفیق بھی جلد ہی میرے پہلو میں پہنچ گیا۔

اُس کے چہرے پر اب بھی حیرت تھی۔

اُس کی آنکھوں میں بے یقینی تھی۔

"کیا بات ہے؟" میں نے مُسکرا کر اُس کی طرف دیکھتے ہُوئے پوچھا۔ "تم اس وقت بے حد حیرت زدہ نظر آ رہے ہو؟"

"تم نے اس وقت جو کچھ بھی کیا، وہ ناقابلِ یقین ہے۔"

"یقین تو مجھے بھی نہیں آ رہا..."

"پھر... تم نے یہ سب کچھ کیسے کیا؟"

"بہت جلد تمہیں معلوم ہو جائے گا۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "مجھے ان کے سرغنہ کی تلاش ہے۔ وہ جیسے ہی سامنے آئے گا، سب کچھ تمہاری سمجھ میں آ جائے گا۔"

"بہر حال..." رفیق کافی دیر بعد پہلی بار مُسکرایا۔ "مجھے خوشی ہے کہ تم وقت کی نزاکتوں کو بھی محسوس کر لیتے ہو۔ اگر تم صورتِ حال کو قابو میں نہ کر لیتے تو شاید اس وقت ہم دونوں کی لاشیں وہاں پڑی تڑپ رہی ہوتیں۔"

"میں بے گناہوں کے خون سے ہاتھ رنگنا پسند نہیں کرتا۔" میں نے دُرشت لہجے میں کہا۔ "ہجوم جذباتی ہو رہا تھا۔ اگر وہ لوگ ہتھیار استعمال کرنے پر اُتر آتے تو یقین کرو کہ اس وقت وہاں اَن گنت لاشیں ہوتیں... میں اپنے دفاع کے لیے سب کچھ کر گزرتا ہُوں۔"

"کک... کیا مطلب؟" رفیق بوکھلا گیا۔ "کیا تم ان سب سے اُلجھ پڑتے؟"

"میں تو نہیں اُلجھتا... البتہ اُلجھنے والوں کو سُلجھانے کی ضرور کوشش کرتا... اور ایسے میں لاشیں ضرور گرتی ہیں۔" میں نے کہا اور کن انکھیوں سے رفیق کی طرف دیکھا۔

اُس کا چہرہ یکایک زرد پڑ گیا تھا۔

کچھ دُور جا کر میں نے عقب میں دیکھا۔

مجمع منتشر ہو گیا تھا اور اُن دونوں کا کہیں نام و نشان تک دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے رفیق کی طرف دیکھا۔ اُس کے چہرے کی اصلی رنگت کسی حد تک لوٹ آئی تھی۔ گویا وہ خود پر تیزی سے قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"رفیق..." میں نے رُک کر اطلس کی ایال کو چھیڑتے ہُوئے کہا۔ "خوارزم میں تمہارے کئی جاننے والے ہیں؟"

اُس نے گونگوں کے سے انداز میں سر کو حرکت دے کر میری بات کی تائید کر دی۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ بازار میں خاصی ہلچل تھی۔ کچھ راہ گیر ہمیں دیکھتے ہُوئے گزر رہے تھے، چند ایک خاموشی سے اور کچھ سلام کر کے گزرتے رہے۔ میری نگاہ کسی ایسی سرائے کی تلاش میں بھٹک رہی تھی، جہاں ہم دونوں قیام کر سکیں۔

"یہاں کی سرائے شاید بازار سے ہٹ کر ہے۔" میں نے کہا۔

"تمہارا خیال درست ہے۔"

"تم چاہو تو اپنے کسی جاننے والے کے ہاں جا سکتے ہو۔"

"اور تم...؟"

"میں سرائے میں قیام کروں گا۔"

"تم بھی میرے ساتھ ہی کیوں نہیں چلتے؟"

"مجھے شیر خان کو تلاش کرنا ہے۔" میں نے کہا۔

"شہباز..." رفیق نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہُوئے ایک بار پھر سمجھانے کی کوشش کی۔ "کیا تمہیں یقین ہے کہ تم شیر خان کے پاس محفوظ رہ سکو گے؟ ممکن ہے...؟"

"تم جاؤ دوست۔" میں نے اُس کا ہاتھ اپنے کندھے سے ہٹاتے ہُوئے کہا۔ "بلکہ کوشش کرو کہ واپس اپنے گاؤں ہی چلے جاؤ۔" یہ کہہ کر میں بازار میں آگے بڑھ گیا۔

"میں شیر خان کو تلاش کرنے کی کوشش کروں گا۔" اُس نے عقب سے کہا۔ "اور پھر سرائے میں تم سے ملنے بھی آؤں گا۔"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا اور چلتا رہا۔

وقتی طور پر رفیق سے پیچھا چھُڑانے کے بعد مجھے بے پناہ سکون محسوس ہُوا۔ میں واضح طور پر محسوس کر چکا تھا کہ اس کم بخت کے خیالوں نے میرے ذہن کو تھوڑا بہت متاثر ضرور کیا ہے... ورنہ شاید میں اپنے دُشمنوں سے نمٹنے کی کوئی اور ہی راہ نکال لیتا۔

سرائے زیادہ اچھی حالت میں نہیں تھی لیکن صاف سُتھری تھی اور اس کا مالک خوش اخلاق اور سیدھا سادہ آدمی تھا۔ میں نے ایک چارپائی اور بستر لیا اور سرائے کے ایک کونے میں چارپائی ڈال کر لیٹ رہا۔ سرائے کا مالک میرے گھوڑے کو چارہ ڈالنے کے لیے لے جا چکا تھا اس لیے میں اطمینان سے سو سکتا تھا۔ رفیق کہیں گھومنے نکل گیا۔

میں شام تک پڑا سوتا رہا۔

سرائے میں قیام کا ارادہ کرنے سے پہلے ہی میں نے تہیّہ کر لیا تھا کہ رات بھر اپنی سرگرمیوں میں مصروف رہوں گا۔ یہی وجہ تھی کہ میں سرائے میں پہنچنے کے تھوڑی ہی دیر بعد سو گیا تھا۔ جب میری آنکھ کھُلی تو سُورج مغرب کے دامن میں دفن ہو رہا تھا۔ وہ اپنی روشن کرنیں سمیٹ کر مغرب کی گود میں اُتر گیا تو کائنات پر اُداس اور غمگین سا اندھیرا پھیل گیا اور دُور آسمان پر ننھے ننھے ستارے مزاروں کے چراغوں کی طرح ٹمٹماتے دکھائی دینے لگے... تب میں اُٹھ کھڑا ہُوا۔

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد میں نے سرائے کا جائزہ لیا۔ اس میں ایک ہی کشادہ کمرہ تھا جس میں قطار در قطار چارپائیاں بچھا دی گئی تھیں۔ زیادہ تر ایسے لوگ اس وقت یہاں نظر آ رہے تھے جو کاروبار کے لیے آئے تھے یا کہیں آگے جاتے ہُوئے شب گزاری کے لیے سرائے میں اُتر گئے تھے۔ سرائے کے مالک سے اِدھر اُدھر کی باتوں کے دوران میں نے رُسوائے زمانہ زرین جان اور شیر خان کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا کیوں کہ سرائے کا مالک اپنی ہی ذات میں مگن رہنے والا آدمی تھا اور اُسے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خوارزم کے قدیم باشندوں کے علاوہ کسی کے بارے میں معلوم ہی نہیں تھا۔

میں نے سوچا کہ مجھے خود ہی باہر جا کر سب کچھ معلوم کرنا چاہیے۔ میرا خیال تھا کہ شام تک رفیق کچھ نہ کچھ معلومات حاصل کر کے مجھے بتانے ضرور آئے گا... لیکن وہ تو یوں غائب تھا جیسے گدھے کے سر سے سینگ... اور مجھے اس کی پروا بھی نہیں تھی۔

بہرام اور گل خان سے جس انداز میں مڈبھیڑ ہوئی تھی اس سے مجھے توقع تھی کہ وہ میری طرف سے غافل نہیں رہیں گے... اور میرا کوئی نہ کوئی بندوبست کرنے کی ضرور کوشش کریں گے... لیکن اب تک اُن کی طرف سے بھی خاموشی ہی رہی تھی مجھے اس خاموشی سے خدشہ ہوا کہ کہیں وہ خوارزم سے بھی فرار نہ ہو گئے ہوں۔ بشیر خان سے تو میں اس انداز میں بھاگ جانے کی توقع نہیں کر سکتا تھا کیوں کہ وہ ایک پیشہ ور لٹیرا اور بدمعاش تھا۔ یوں بھاگ بھاگ کر آخر وہ کب تک خود کو روپوش رکھ سکتا تھا۔ اس لیے مجھے اُمید تھی کہ وہ خود میری ہی تلاش میں ہو گا۔

میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے ان لوگوں کی تلاش کا کام اُسی جگہ سے کرنا چاہیے، جہاں گل خان اور بہرام سے مڈبھیڑ ہوئی تھی۔ میں بازار سے گزرتا ہوا اُس جگہ جا پہنچا۔

گلی سنسان تھی اور گھروں پر خاموشی کا پہرہ تھا۔

میں دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا رہا... گھوڑے کو میں گھوڑے کے پاس سرائے کی اصطبل میں چھوڑ آیا تھا۔ گلی کے آخری حصے تک جانے کے بعد میں لوٹ آیا۔ ابھی میں چند قدم ہی آگے آیا تھا کہ اچانک ایک شخص نہ جانے کہاں سے نکل کر میرے سامنے آ گیا۔

"کون ہو تم؟" اُس نے سرد لیکن دھیمی آواز میں پوچھا۔

"مسافر ہوں۔"

"گلی میں کیوں گھوم رہے ہو؟"

میں نے فوراً ہی کوئی جواب نہیں دیا۔

"کس سے ملنا ہے تمہیں؟"

میں اب غور سے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُس نے جس انداز میں باز پرس کی تھی اس سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کوئی خدائی فوجدار ہے۔ اُس کا چہرہ سیاہ پگڑی کے ایک پلو میں لپٹا ہوا تھا اور اس کی دونالی بندوق میری طرف اُٹھی ہوئی تھی۔

ایک اعتبار سے اُس کا اعتراض جائز بھی تھا۔ گاؤں کی گلیوں میں رات کے وقت کسی اجنبی کا یوں آوارہ گردی کرنا کسی طرح بھی مناسب نہیں تھا۔ یہ کسی بھی غیرت مند باپ یا بھائی کے غیظ و غضب کو للکارنے کے مترادف تھا۔

"بتاؤ کس کے گھر جانا ہے تمہیں؟" اس نے دوبارہ سوال کیا۔

"زرین جان۔" میں نے یونہی کہہ دیا۔

"تم اس کے کیا لگتے ہو؟"

"فی الحال تو کچھ نہیں لگتا لیکن چند دنوں میں..."

"بکواس مت کرو۔" وہ غرایا۔

میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہونے لگی... اور اس کے ساتھ ہی میں نے خطرے کی بُو سونگھ لی۔ میرے خفتہ احساسات بھی فی الفور بیدار ہو گئے۔

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔

اُسی لمحے ایک اور سایہ دکھائی دیا۔ یہ شخص دیوار کے ساتھ رہ کر آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ میں کسی چیز کی جھلک دیکھ لی تھی۔ یقیناً اس کے پاس ریوالور تھا۔ اس شخص کا چہرہ بھی سیاہ پگڑی کے پلو میں لپٹا ہوا تھا۔

میں نے عقب میں نگاہ ڈالی۔

اسی لمحے کا ایک اور شخص دکھائی دیا۔

میں دل ہی دل میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کا مطلب تھا کہ میرا خیال درست ہی نکلا۔ بشیر خان نے فرار ہونے کی بجائے کرائے کے آدمیوں سے ابتدا کر دی تھی۔

"سنو..." وہی شخص غرایا۔ "کیا تمہیں اپنی زندگی سے ذرا بھی محبت نہیں ہے؟"

"اپنی زندگی کسے پیاری نہیں ہوتی۔"

"اگر ایسا ہے تو اسی وقت خوارزم سے نکل جاؤ۔ میں بلا وجہ کسی کے خون سے ہاتھ رنگنا پسند نہیں کرتا۔"

"اس دھمکی کی کوئی وجہ بھی ضرور ہو گی۔"

"گویا تم یوں نہیں مانو گے۔" اُس نے دونالی بندوق میرے سینے پر ٹکا دی اور پھر زور سے دھکا مارا۔

دھکا شدید تھا لیکن اُسے میرے بارے میں غلط فہمی تھی۔ اس قسم کے دھکوں سے مجھے پیچھے ہٹانا ممکن نہیں تھا۔ میں اپنی جگہ جما کھڑا رہا تو اُس نے بندوق کو ذرا سا کھینچ کر دوبارہ

دھکا مارنے کی کوشش کی۔

اس بار میں ذرا سا ہٹ گیا۔

وہ اپنی ہی جھونک میں آگے آیا۔

... پھر وہ میری بغل میں سے عقب میں یوں اُڑا جیسے اُسے یکایک پر لگ گئے ہوں۔ اُس کے حلق سے بھیانک غراہٹ نکل گئی اور وہ میرے عقب سے آنے والے پر گرا۔ تو دونوں ڈھیر ہو گئے۔ آدمی خاصا وزنی تھا اس لیے جس سے ٹکرا کر گرا تھا اُس کے حلق سے نکلنے والی کراہ خاصی بلند تھی۔

جو شخص دیوار کے ساتھ ساتھ آگے بڑھ رہا تھا وہ کسی درندے کی طرح اُچھلا اور مجھ پر آ رہا۔

میں نے اُسے دونوں ہاتھوں پر روکا اور پھر اُسے ہاتھوں پر سنبھالے سنبھالے گھوم گیا۔ جو دونوں ابھی ڈھیر تھے اُسے ان پر پوری قوت سے کھینچ مارا تو ایک بار پھر کراہیں سنائی دیں... ساتھ ہی کسی نے مجھے گالی بھی دی۔

جب میں نے دونالی بندوق والے کو عقب میں پھینکا تھا تو میرا ایک ہاتھ اُس کی بندوق پر پڑا تھا۔ بندوق ایک ہی جھٹکے میں میرے قدموں کے قریب گر گئی تھی۔

میں نے جھک کر بندوق اُٹھائی۔

اس سے پہلے کہ ان تینوں میں سے کوئی ایک بھی سنبھل کر مجھ پر دوبارہ حملہ آور ہوتا، میں نے دونالی بندوق کو نال کی طرف سے تھام لیا اور اُسے لٹھ کی طرح گھمانے لگا۔

اوپر تلے تین چوٹیں لگیں۔

تین کھوپڑیاں، تربوزوں کی طرح چٹخ گئیں۔

میں نے بندوق پھینک دی اور متلاشی نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا... اچانک ہی مجھے ایک اور سایہ دکھائی دیا۔ یہ سایہ تیزی سے چل رہا تھا۔

میرا ہاتھ فوراً ہی ریوالور کے دستے پر جا پہنچا۔

"کون ہے۔ رُک جاؤ۔" میں نے کرخت لہجے میں کہا۔

"اوہ... کون... شہباز...؟" جواباً ایک بوکھلائی ہوئی آواز سنائی دی۔

میں ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔ یہ رفیق کی آواز تھی۔ میں نے اُس کی آواز فوراً ہی پہچان لی تھی ورنہ شاید میرے ریوالور کی گولی اس کی کھوپڑی پر ہی پڑتی۔

"رفیق... تم...؟" میں نے کہا۔

وہ تیزی سے آگے بڑھا تو گلی میں پڑے ہوئے تین آدمیوں کے ڈھیر پر پاؤں پڑتے ہی لڑکھڑا گیا۔ میں نے تیزی سے بڑھ کر اُسے سہارا دیا۔

"یہ کون لوگ ہیں؟" اُس نے بوکھلا کر پوچھا۔

"معلوم نہیں۔"

"تو پھر انہیں قتل کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"تمہارا مطلب ہے آدمی کو صرف اپنے واقف کاروں ہی کو قتل کرنا چاہیے۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "اگر میں ان کا ڈھیر نہ لگاتا تو شاید تم میری ہی لاش سے اُلجھ کر لڑکھڑاتے۔"

"اوہ... تو یہ بھی دشمن ہی تھے؟"

"ہاں... لیکن تم اس وقت کہاں سے آ رہے ہو؟" میں نے کہا اور اس کا ہاتھ تھام کر گلی سے نکل آیا کیونکہ اب وہاں کھڑے رہنا واقعی خطرناک تھا۔

ان تینوں کو ٹھکانے لگانے میں چونکہ زیادہ شور نہیں ہوا تھا اس لیے کسی نے گلی میں جھانکنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ ہمارے درمیان باتیں دھیمے انداز میں ہوئی تھیں اور ہلاکت کے کھیل میں تو خفیف سی آہٹوں کے علاوہ کچھ بھی سنائی نہیں دیا ہو گا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ کسی مرنے والے کی چیخ نہیں نکلی ورنہ حالات واقعی خاصے خراب ہو جاتے۔

گلی سے بازار میں آنے کے بعد میں نے رفیق سے ایک بار پھر پوچھا کہ وہ کہاں سے آ رہا ہے۔ اس نے اپنی بے ترتیب سانسوں کو درست کیا اور بولا۔ "میں بہت دیر سے تمہیں تلاش کر رہا ہوں۔"

"کیا تم بابا رحمان کی سرائے میں بھی گئے تھے؟"

"ہاں... لیکن تمہیں وہاں نہ پا کر میں سمجھ گیا کہ تم اسی طرف آئے ہو گے۔"

"بہرحال... میں کوئی اہم خبر سننے کے لیے بے چین ہوں۔" میں نے اس کی تمہید طولانی کے سامنے بند باندھتا ہوا کہا۔

"میں اپنے ایک دوست کے پاس چلا گیا تھا۔ اُس نے مجھے بتلایا ہے کہ زرین جان کس قماش کی عورت ہے اور اس بات کی بھی تصدیق کر دی ہے کہ اُس نے حال ہی میں شیر خان نامی ایک شخص سے شادی کر لی ہے جو خود بھی بدمعاش ہے۔"

"یہ دونوں باتیں تو تمہیں اور مجھے پہلے بھی معلوم تھیں۔" میں نے جھنجھلا کر کہا۔ "کیا تم صرف ان باتوں کی تصدیق

سے لیے اب تک مارے مارے پھرتے رہے ہو؟"

"زرین جان کے لیے یہاں دو قتل بھی ہو چکے ہیں" اس نے انکشاف کیا تو میں سمجھ گیا کہ اس نے دن کافی مصروف گزارا ہے اور اب وہ دن بھر کی رُوداد اسی طرح سُنائے گا۔

میں خاموش رہا تا کہ اُسے جو کچھ کہنا ہے، جلد سے جلد کہہ ڈالے۔

"خوارز کے تمام بدقماش لوگ زرین جان کی مٹھی میں ہیں!" وہ پُرجوش لہجے میں کہہ رہا تھا۔ ہم دونوں بابا رحمان کی سرائے کی طرف چلتے رہے۔

"میرا خیال ہے گلی میں جو تین آدمی پڑے ہیں، یہ بھی زرین جان کے چاہنے والے ہی تھے۔ تمہیں وہ بزرگ صورت شخص یاد ہے جس نے آج دن میں جھگڑے کے وقت مداخلت کی تھی!"

"ہاں... کون ہے، وہ؟"

"وہ یہاں کے ایک بڑے قبیلے کا سردار ہے۔ میں اس سے ملنے چلا گیا تھا۔ میں نے اُسے ساری بات بتا دی ہے کہ کس طرح ان بدمعاشوں نے مگوری کے سردار اور اس کے ساتھیوں کو قتل کر کے دولت چھین لی تھی... اور اب یہ تینوں قاتل زرین جان کی پناہ میں ہیں۔ زرین جان کی گلی میں تمہیں یوں تنہا نہیں جانا چاہیے تھا، شہباز۔"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا اور خاموش رہا۔

"میرا خیال تھا کہ اگر سردار کو میری بات پر یقین آگیا تو وہ ہماری مدد ضرور کرے گا۔ یہاں کے کسی بدمعاش میں اس سردار سے ٹکرانے کی ہمت نہیں ہے۔ اُسے میری بات پر یقین آگیا تو وہ اپنے ساتھیوں کو لے کر میرے ساتھ... زرین جان کے ہاں پہنچا... لیکن گھر کا دروازہ چوپٹ کھلا تھا اور..."

"اور...؟" میں نے اُسے رُکتے دیکھ کر پوچھا۔

"وہاں کوئی بھی نہیں تھا!"

میں ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔

"اگر تم نے آج دن میں بہرام اور گل زمان سے اُلجھنے کی کوشش نہ کی ہوتی تو وہ سب یوں فرار نہ ہوتے۔"

"ہوں..." میں نے تلملا کر کہا۔ واقعی غلطی ہو گئی تھی۔ "میں اس وقت خود پر قابو نہیں رکھ سکا تھا... پھر مجھے توقع تھی کہ شور سُن کر شیر خان اگر کہیں قریب ہی ہُوا تو ضرور باہر آ جائے گا۔"

"بہر حال! اب ان میں سے کوئی بھی خوارز میں موجود نہیں ہے" رفیق نے ایسے لہجے میں کہا جیسے ان لوگوں کے فرار کے بعد سارا معاملہ خود بخود ہی حل ہو گیا ہو۔

مجھے اپنی اس جذباتی غلطی اور اندازے کی ناکامی کا افسوس ہو رہا تھا جس کی وجہ سے صورتِ حال فوراً ہی تبدیل ہو گئی تھی... لیکن مجھے اپنے آپ پر اعتماد تھا۔ لغزشوں سے سبق حاصل کر کے انسان اپنی تکمیل کر سکتا ہے۔

"ٹھیک ہے۔ تم جاؤ۔" میں نے اس کا کندھا تھپتھپا کر کہا۔ "میں دیکھتا ہوں کہ اس صورتِ حال میں مجھے کیا کرنا چاہیے۔"

"سرائے میں سونے کی بجائے میرے ساتھ چلو۔" رفیق نے کہا۔ "میرے دوست کا گھر یہاں سے قریب ہی ہے۔"

میں نے عقب میں خفیف سی آہٹ سُنی۔

ٹھٹکنے کی بجائے میں آہستہ آہستہ چلتا رہا حتیٰ کہ رفیق اپنے دوست کے دروازے تک پہنچ کر دستک دینے لگا۔ میں نے کافی دیر بعد گردن گھما کر عقب میں دیکھا۔

گلی کے موڑ پر مجھے ایک سایہ سا لہراتا دکھائی دیا۔

میں اُدھر دیکھتا رہا۔

کوئی شخص نہایت خاموشی سے ہمارا تعاقب کر رہا تھا۔ فاصلہ کافی تھا اس لیے میں اُسے صاف نہیں دیکھ سکا لیکن مجھے یقین تھا کہ یہ شخص ہمارا پیچھا کر کے دیکھنا چاہتا ہے کہ ہم رات کا باقی ماندہ حصہ کہاں گزاریں گے۔ میں نے اپنے طور

سرزمین نیپال کا سچا واقعہ

درندہ

یعقوب جمیل کے ہوشربا قلم سے

دو جلدوں میں

مکمل سیٹ =/300 روپے

مکتبہ القریش سرکلر روڈ اردو بازار لاہور

فون 7668958

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پر شبینہ سرگرمیوں کا جو منصوبہ بنایا تھا، وہ خاک میں مل گیا کیونکہ میں خوارز اور یہاں پر چھپے ہُوئے اپنے دُشمنوں کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔

رفیق نے دوسری بار دستک دی۔

تیسری دستک کے بعد دروازہ کُھلا تو ایک نوعمر لڑکا دکھائی دیا۔ اس کی آنکھوں میں نیند تھی۔ اس نے رفیق کی طرف دیکھ کر کھسیانے ہُوئے انداز میں دانت نکال دیے جیسے دیر سے دروازہ کھولنے پر معذرت کر رہا ہو۔

میں نے دروازے میں داخل ہونے سے پہلے ایک بار پھر گلی کی نکڑ کی طرف دیکھا لیکن اب وہاں کوئی نہیں تھا گویا جو بھی شخص ہماری منزل کا متلاشی تھا، وہ مطمئن ہو کر واپس جا چُکا تھا۔

میں، رفیق کے ساتھ یہاں آ تو گیا تھا لیکن میری خواہش تھی کہ واپس سرائے میں جا کر رات گزاروں۔ جس سائے کو میں نے تعاقب میں دیکھا تھا، وہ بار بار میرے ذہن میں گھوم رہا تھا۔

رفیق نے مجھے بیٹھک میں ایک چارپائی پر دھکیل دیا۔

"چلو دوست، اب آرام سے سو جاؤ۔ صبح ہوگی تو دیکھیں گے۔ مجھے اُمید ہے کہ کوئی نہ کوئی بہتر صورت نکل آئے گی۔"

میں اُسے کوئی جواب نہیں دے پایا تھا کہ یوں لگا جیسے بیرونی دروازے کے کواڑوں میں خفیف سی حرکت ہُوئی ہو۔ میں اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کے بل بوتے پر محسوس کر سکتا تھا کہ کوئی دروازے کے باہر موجود ہے۔

... اور اس نے دروازے کو دھکیل کر یہ آزمایا ہے کہ دروازہ اندر سے بند ہے یا کُھلا ہُوا ہے۔ میرا ہاتھ فوراً ہی ریوالور کے دستے پر پہنچ گیا۔ رفیق میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میرے چونکنے کے انداز سے پتہ چل گیا کہ کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔ وہ بھی کان لگا کر سُننے لگا۔

"باہر دروازے پر کوئی ہے۔" میں نے سرگوشی کی۔

"کون ہو سکتا ہے؟" رفیق کی آواز بھی دھیمی تھی۔ "میں نے تو کوئی آواز نہیں سُنی۔"

"کسی نے کواڑوں کو دھکیلا تھا۔"

"ممکن ہے ہَوا کے جھونکے سے ایسا ہُوا ہو۔"

اُسی لمحے خفیف سی دستک ہُوئی۔ آواز خاصی واضح تھی اور اس بار اسے رفیق نے بھی سُن لیا تھا۔ اس نے وضاحت طلب نگاہ سے میری طرف دیکھا۔

"ہَوا دستک دے رہی ہے؟" میں نے ہنس کر کہا۔

وہ کھسیا گیا لیکن اس کے چہرے پر ہلکی سی فکرمندی کی سلوٹیں اُبھر آئی تھیں۔ ایک بار پھر دستک ہُوئی۔ اس بار آواز قدرے مزید بلند تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے باہر موجود شخص کم سے کم آواز پیدا کر کے دروازہ کھلوانا چاہتا ہو۔

"دروازہ کھولو..." اس بار دھیمی سی آواز بھی سُنائی دی۔

بیرونی دروازہ چونکہ بیٹھک کے سامنے ہی تھا اس لیے میں لالٹین کی روشنی میں اسے واضح طور پر دیکھ سکتا تھا۔ رفیق کا دوست اور گھر کے باقی افراد عقبی کمروں میں تھے، شاید اسی لیے اس نوعمر لڑکے نے ہمارے لیے خاصی دیر بعد دروازہ کھولا تھا۔

دستک ایک بار پھر ہُوئی۔

اس دفعہ آواز پہلے کی بہ نسبت بلند تھی۔

"دروازہ کھولو..." باہر موجود شخص نے قدرے اونچی آواز میں کہا تو میں نے اس کے لہجے میں مایوسی محسوس کر لی۔ غالباً وہ نااُمید ہو چُکا تھا کہ دروازہ خوب شور کیے بغیر نہیں کھلے گا۔

"رفیق..." میں نے ریوالور نکالتے ہُوئے کہا۔ "دروازہ کھول دو... لیکن زنجیر ہٹانے سے پہلے پوچھ لینا کہ باہر کون ہے۔ میرا ریوالور تمھاری حفاظت کرے گا۔"

وہ آہستہ سے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

"کون ہے؟" اس نے قدرے سخت لہجے میں پوچھا۔

"دوست..."

"کس نیت سے آئے ہو اور تمھارے ساتھ کون ہے؟"

"میں دُشمن نہیں ہُوں۔" باہر سے بولنے والے نے کہا۔ "میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے اور میں تنہا ہوں۔"

"کیا چاہتے ہو؟" رفیق نے سختی سے پوچھا۔

"چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

"اس وقت...؟"

"بہت اہم باتیں ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" رفیق نے مطمئن ہو کر کہا۔ "میں دروازہ کھول رہا ہوں لیکن یاد رکھو اگر کوئی دھوکا ہُوا تو اندر قدم رکھنے سے پہلے ہی تمھاری لاش مُنہ کے بل گرے گی۔"

رفیق نے میری طرف دیکھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلا کر دروازہ کھولنے کا اشارہ کر دیا۔ رفیق نے دروازہ کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو میں نے ریوالور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کا حفاظتی کھٹکا ہٹا دیا اور ریوالور کی نال دروازے کی طرف اُٹھا دی۔ میں ذرا سی بھی گڑبڑ دیکھ کر فائرنگ کے لیے بالکل تیار تھا۔ رفیق نے زنجیر ہٹا دی۔

کواڑ آہستہ آہستہ کھلتے چلے گئے۔

میری انگلی ٹریگر پر سخت ہوتی چلی گئی۔

رفیق دروازہ کھولتے ہی تیزی سے ایک طرف ہٹ گیا تھا اس لیے کواڑوں کے درمیان پیدا ہونے اور تیزی سے بڑھنے والی جھری میں جو چہرہ نظر آیا، اُسے دیکھ کر میں نے نہ صرف ایک طویل سانس نے کر رہ گیا بلکہ ٹریگر پر میری انگلی کی گرفت بھی قدرے ڈھیلی پڑ گئی۔

"اندر آ جاؤ۔" میں نے دروازے میں کھڑے شخص سے کہا۔

وہ بیٹھک کے کھلے دروازے سے میری طرف دیکھنے لگا۔ رفیق کی طرف اس نے نگاہ اُٹھانے کی شاید ضرورت ہی نہیں سمجھی تھی یا پھر ممکن ہے اس نے رفیق کو دیکھا ہی نہ ہو۔

رفیق کھلے دروازے کے ایک کواڑ کی آڑ میں تھا۔

اس شخص نے دروازہ بند کر دیا۔ یہ عمل اس نے نہایت احتیاط اور آہستگی سے مکمل کیا تھا جیسے وہ ذرا سی بھی آہٹ نہ پیدا کرنا چاہتا ہو۔۔۔ اور تب اس کی نگاہ رفیق پر پڑی تو وہ اُچھل پڑا۔

اس آدمی کے بارے میں میں نے فوری طور پر جو رائے قائم کی تھی، اس کے مطابق وہ بے ضرر اور دوست ہی ہو سکتا تھا۔ رفیق نے زنجیر لگا دی اور اس شخص کو بیٹھک میں لے آیا۔ جب وہ لالٹین کے قریب آیا تو میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ ایک اُدھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ اس کے چہرے پر زردی تھی جیسے وہ کئی ماہ سے بیمار چلا آ رہا ہو۔ میں نے اس کمزور اور ناتواں شخص کی طرف سے ریوالور ہٹا کر ہولسٹر میں ڈال لیا اور سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے دریافت کیا۔

"میں تمھیں ایک اطلاع دینے آیا ہوں۔" اس نے بے قراری سے دونوں ہاتھوں کو رگڑتے ہوئے کہا۔

"بولو۔۔۔ میں ہمہ تن گوش ہوں۔"

"تمھارے دُشمن خوارزمی میں موجود ہیں۔"

"کیا۔۔۔" میں چونک پڑا۔ "کہاں؟"

"قصبے کی مسجد کے سامنے ایک دومنزلہ مکان ہے۔ وہ

نئے افق کا مقبول سلسلہ
سرفروش
نامور مصنف اظہر کلیم
کے ایڈونچرس قلم سے
دو حصوں میں مکمل سیٹ =/100
مکتبہ القریش سرکلر روڈ اردو بازار لاہور
فون 7668958

لوگ وہاں چھپے ہوئے ہیں۔"

"کون لوگ۔۔۔؟" میں نے پھنکارتی ہوئی سرگوشی کی۔

"شیر خان اور اس کے ساتھی۔"

"ہوں۔۔۔" میں حیران تھا کہ یہ شخص کون ہے اور رات کے اس پہر جب کہ پورے قصبے پر نیند غالب ہے، یہ ہمیں آتی جو نکا دینے والی اطلاع دینے کیوں آیا ہے۔ میں وضاحت طلب نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

میں نے ریوالور کی نال اس کی طرف اُٹھا دی۔

"تم یہ بات ہمیں کیوں بتانے آئے ہو؟" اس بار رفیق نے سخت لہجے میں سوال کیا۔ "اور تمھیں کیسے معلوم ہوا کہ ہمارے دُشمن کون ہیں؟"

"تت۔۔۔ تم۔۔۔ تم شیر خان کا تعاقب کر رہے ہو نا؟" وہ تھوک نگل کر بولا۔ "تمھارا اس کے ساتھیوں سے بازار میں جھگڑا ہوا تھا۔ اس جگہ سے قریب ہی میری دُکان ہے۔"

میں نے اثبات میں سر ہلا کر گویا اُسے یہ جتا دیا کہ میں اس کے بیان سے کافی حد تک مطمئن ہو گیا ہوں۔ یہ دیکھ کر وہ پُراسرار شخص بھی مطمئن نظر آنے لگا۔

"وہ تینوں زرّین جان کے ساتھ آئے تھے تو میں نے انھیں دیکھ لیا تھا۔ شام کے بعد مجھے کسی نے بتایا کہ تم سردار اور رنگ زیب کے ساتھ زرّین جان کے گھر گئے تھے لیکن وہاں تمھیں ان میں سے کوئی بھی نہیں ملا۔"

"ایک بات کا جواب تم نے ابھی تک نہیں دیا۔" میں لہجے کو خاصا نرم رکھتے ہوئے کہا۔ "تم یہ سب کچھ ہمیں کیوں بتا

رہے ہو؟"

"خدا کی قسم۔۔۔" اس نے ہانپنا شروع کر دیا۔ "میں جھوٹ نہیں بولتا۔ اس ذلیل عورت کا وجود میری آنکھوں میں کھٹکتا ہے۔ اس کی وجہ سے میرا چھوٹا بھائی مارا گیا تھا۔ وہ نوجوان تھا اور حماقت اس کے دل و دماغ پر حاوی ہو گئی تھی۔۔۔ لیکن وہ میرا ایک ہی بھائی تھا۔ اس فاحشہ نے اپنے یاروں سے اُسے مروا دیا۔ میں بوڑھا ہوں۔۔۔ اور میرا کوئی وارث بھی نہیں جو اس کا بدلہ لے سکے۔" فرطِ جذبات سے اس کی آواز بھرا گئی۔

اس کا چہرہ دُکھ کی تصویر بن گیا۔

۔۔۔ اور صداقت خود اس کی آواز بن گئی۔

"جب تمھارا شیر خان کے ساتھیوں سے جھگڑا ہوا تو میں نے تمہیں غور سے دیکھا تھا۔۔۔ تم انتقام کے فرشتے ہو۔۔۔ میں سمجھتا ہوں کہ تم ان لوگوں سے اپنا انتقام لینے آئے ہو۔ اگر تم اس مقصد میں کامیاب ہو گئے تو میں سمجھوں گا کہ میں نے بھی اپنا انتقام لے لیا ہے۔ میں تمھاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔۔۔" میں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "تم مجھے اس مکان تک پہنچا دو۔۔۔ لیکن ایک بات کا خیال رکھنا۔ میں تم پر اعتماد کر رہا ہوں۔ اگر تم شیر خان کے آلۂ کار ہوئے تو سب سے پہلے موت تمھارا ہی مقدر ہو گی۔"

"میرا خیال ہے، اس وقت جانا۔۔۔"

"رفیق۔۔۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "اگر اب تم نے ایک لفظ بھی کہا تو میں تمہیں اپنے دُشمنوں کا ہمدرد سمجھوں گا۔"

"خدا کی قسم، مجھے صرف تمھاری زندگی عزیز ہے۔"

"ایسی زندگی میرے نزدیک بے معنی ہے۔" میں نے اس سے کہا۔ "چلو۔۔۔ تم دونوں آگے آگے چلو گے اور میں پیچھے چلتا رہوں گا۔" میں اس شخص کی طرف متوجہ ہوا۔ "تمھارا نام کیا ہے بابا؟" میں نے رائفل سنبھالتے ہوئے پوچھا۔

"میرا نام داؤد ہے۔" اس نے جواب دیا اور رفیق کے ساتھ بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ میں ان دونوں سے کچھ فاصلے پر رہا۔

باہر نکل کر میں نے دروازے کو کنڈی لگا دی اور گلی میں دوڑتے ہوئے انسانی سایوں کا پیچھا کرنے لگا۔ یہ دونوں سائے رفیق اور داؤد کے تھے۔

شیر خان اور اس کے ساتھیوں کا پتہ چلنے کے بعد میں ایسا پُرجوش ہو رہا تھا کہ میں داؤد سے ایک بات پوچھنا ہی بھول گیا۔۔۔ لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ دراصل میں اس سے یہ دریافت کرنا چاہتا تھا کہ کچھ دیر قبل وہی ہمارا تعاقب کر رہا تھا یا نہیں؟

مجھے پوری اُمید تھی کہ داؤد وہی وہ شخص تھا جس نے رفیق کے دوست کے گھر تک ہمارا پیچھا کیا تھا۔

رات اپنے تمام تر اندھیروں سمیت قصبے میں اُتر آئی تھی۔

ہم آگے پیچھے چلتے رہے۔

کبھی کبھی کوئی کتا ہمارے قدموں کی خفیف سی آہٹ پا کر بھونک اُٹھتا تو ہمیں رُک کر اُسے ڈانٹنا پڑ جاتا۔ کئی گلیوں سے گزر کر بالآخر ہم اس گلی میں پہنچ گئے جس کے آخری حصے میں مسجد تھی۔

وہ مکان مسجد کے سامنے ہی واقع تھا۔

بوڑھا داؤد رُک گیا۔

"میں آگے نہیں جاؤں گا۔" اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ "مکان تمھارے سامنے ہے۔" اس نے ایک دریچے کی طرف اشارہ کیا جس کے پیچھے روشنی کی موجودگی کھڑکی کی درز کی چمکتی ہوئی لکیر سے ثابت ہوتی تھی۔

رفیق کو وہیں ٹھہرنے کا اشارہ کر کے میں آگے بڑھا۔

رائفل پر میری گرفت مضبوط ہو گئی تھی۔ کسی آہٹ کے بغیر میں عین کھڑکی کے نیچے جا پہنچا۔ مکان کی نچلی منزل تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اوپر والی منزل کے اس حصے تک جہاں روشنی تھی، لکڑی کے تختوں کا ایک زینہ جاتا تھا۔ مگر یہ زینہ احاطے کے اندر تھا۔

میں احتیاط کے ساتھ لکڑی کے پرانے پھاٹک پر چڑھ پھاٹک چرچرایا اور اوپر والی کھڑکی ایک دم کھل گئی۔ میں پھاٹک کی دوسری جانب گرا اور گرتے ہی ساکت ہو گیا۔ کھڑکی میں سے آدھا دھڑ نکال کر کسی نے مجھ پر فائر کیا۔۔۔ لیکن میں اندھیرے میں تھا اور وہ روشن دریچے کے فریم سے صاف دکھائی دے رہا تھا۔

میری گولی ٹھیک نشانے پر بیٹھی اور اس کے حلق سے ایک بھیانک چیخ بلند ہوئی۔ اس کے قدم اُکھڑ گئے۔ پہلے اس کی رائفل باہر گری جو اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی۔۔۔ پھر وہ خود نیچے آیا اور سڑک کی دُھول پر گر گیا۔

میں اس کی پروا کیے بغیر اوپر پہنچ گیا۔ لکڑی کے تختوں والے زینے پر میں دو بار گرتے گرتے بچا۔۔۔ پھر میں نے لات مار

کر دروازہ کھول دیا۔

اندر ایک لالٹین جل رہی تھی۔

دونوں دیواروں کے ساتھ بان کے پلنگ بچھے ہوئے تھے جن کی شکنوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ کچھ دیر پہلے وہاں کوئی سویا ہوا تھا۔ کھانے کے جھوٹے برتن ایک کونے میں رکھے ہوئے تھے اور پیالے کے پاس پڑے تھے... لیکن کمرے میں کوئی نہیں تھا۔

مجھے اپنے روبرو دوسرا دروازہ دکھائی دیا۔

میں نے لپک کر اس دروازے کو کھینچا۔ آگے ایک برآمدہ تھا جس کے بعد دوسرا زینہ تھا۔ دروازہ کھلتے ہی میرے کانوں نے گھوڑوں کی ٹاپیں سن لی تھیں۔ میں نے اندھیرے میں اندھا دھند دو فائر کیے... مگر گھوڑوں کی آواز تیزی سے دور ہوتی جا رہی تھی۔ دشمن اپنے ایک ساتھی کو چھوڑ کر نکل بھاگے تھے۔ غالباً انہیں یقین تھا کہ بہرام اپنے مورچے سے ہمارا مقابلہ کرے گا اور بعد میں ان سے آملے گا۔

زرین جان واقعی چالاک عورت تھی۔ ممکن ہے اس نے باتوں کے پھندے میں الجھا کر بہرام کو قربانی کا بکرا بنا دیا ہو اور اس طرح ایک حصے دار کم کر کے اپنے یار کے ساتھ نکل گئی ہو۔ پہلے شیر خان اور وہ آدھے کے مالک تھے... مگر اب ان کا حصہ دو تہائی ہو گیا تھا اگر گل زمان بھی بہرام کی طرح احمق ثابت ہوا تو بلاشبہ وہ پوری رقم کے مالک ہوں گے... مگر اس کا امکان کم تھا کیونکہ وہ نہیں جانتے تھے کہ کون ان کا پیچھا کر رہا ہے۔

میں لوٹ کر نیچے آیا تو رفیق کے علاوہ اردگرد کے مکانوں سے نکل آنے والے بہت سے لوگ بہرام کے گرد حلقہ بنائے کھڑے تھے۔ گولی بہرام کے دائیں شانے میں لگی تھی اور دو عدد دائیں پسلیوں کے درمیان سے نکل گئی تھی۔ اگر نشانہ بایاں کندھا ہوتا تو یہی گولی اس کے دل سے گزرتی اور وہ اب تک مر چکا ہوتا... مگر وہ زندہ تھا۔

اس کا خون مٹی میں جذب ہو رہا تھا۔ زخم زیادہ مہلک نہیں تھا لیکن وہ مارے تکلیف کے چلا رہا تھا۔ میں نے اس کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھتے ہوئے اس کے بال پکڑ لیے۔

"رقم کہاں ہے؟" میں نے خنجر نکال کر کہا۔

"خدا کے لیے مجھے مت مارو... ساری رقم شیر خان کے پاس ہے۔" وہ چلایا۔ "مجھ پر رحم کرو۔"

میں نے اس کے سر کو ایک زبردست جھٹکا دیا۔ "تم نے گموری کے سردار پر رحم کیا تھا؟ یہ تو قدرت کا انصاف ہے۔"

پھر میں نے خنجر سے اس کے کپڑے چاک کر دیے۔ واسکٹ کے نیچے مجھے چمڑے کی وہ پیٹی نظر آئی جس میں پستول کے لیے اضافی کارتوس رکھے جاتے ہیں۔ پیٹی کے ساتھ نہ پستول تھا اور نہ ہی کارتوس تھے پھر بھی اس کی موٹائی خلافِ معمول زیادہ لگ رہی تھی۔ میں نے خنجر کی تیز دھار سے چمڑے کو بھی کاٹ دیا۔

اس میں سے چھوٹے بڑے نوٹوں کی گڈیاں ابل پڑیں۔

"بے غیرت..." میں نے اس کے سر کو زمین پر دے مارا۔ "یہ کیا ہے... کیا یہ گموری کے سردار کا وہ پیسہ نہیں ہے جو تم نے اسے قتل کر کے چھینا تھا۔ یہ خیال کیے بغیر کہ سردار کے پاس یہ رقم کسی کی امانت ہے؟"

میں یہ سب باتیں اس لیے دہرا رہا تھا کہ جو لوگ اردگرد خاموش تماشائی بنے کھڑے ہیں ان پر حقیقت عیاں ہو جائے۔ ان میں مجھے اس سردار کا چہرہ بھی نظر آیا تھا جو رفیق کے ساتھ زرین جان کے ہاں گیا تھا... لیکن وہ وہاں سے فرار ہو چکی تھی۔

"یہ... یہ تو صرف دو ہزار روپے ہیں۔"

میں نے رقم اپنی واسکٹ میں منتقل کی اور کھڑا ہو گیا۔ "میں ایک ایک پائی وصول کر لوں گا بہرام... اور تمہارے ساتھیوں کا حشر تم سے بھی برا ہو گا۔"

"شہباز...! خدا کے لیے مجھے میری ماں کے پاس پہنچا دو۔" وہ اٹھنے کی کوشش میں گرا... "میں مر گیا تو وہ بھی مر جائے گی۔"

"پھر کیا ہوا؟" میں نے بے رحمی سے کہا۔ "گموری کا سردار بھی تو مر گیا تھا۔ ماں کے قدموں کے نیچے جنت ہوتی ہے مگر تم نے اپنے کرتوتوں سے اس کی زندگی کو بھی جہنم بنا دیا۔ اب تمہیں اس کی فکر کیوں ہے... مرنے دو اُسے..."

"آدمی کو اس کے اعمال کی سزا ملنی ہی چاہیے۔" مجمعے میں سے کسی نے کہا۔ "لیکن ہو سکتا ہے اس سبق سے یہ سدھر جائے اسے اٹھا لو اور حکیم کے پاس لے جاؤ۔"

میں نے پلٹ کر دیکھا تو مجھے سردار کا چہرہ نظر آیا جسے شاید اس دبلے پتلے مریل سے نوجوان پر ترس آ گیا تھا۔ مجھے اور رفیق کو یہاں تک لانے والا نہ جانے کب غائب ہو گیا تھا۔

"بہرام...!" میں نے ایک اور خیال کے تحت جھک کر کہا۔ "تمہیں یہاں چھپنے کا خطرہ مول لینے کی کیا ضرورت تھی؟"

"وہ... وہ ملک نواز... اس نے اپنے آدمی بھیجے تھے" بہرام نے کراہتے ہوئے کہا۔ "زرین جان نے کہا... انہیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

معلوم ہو جائے گا کہ ہمارے پاس بیس ہزار روپے ہیں... وہ اپنا حصہ مانگنے آ جائیں گے... وہ خطرناک آدمی ہیں... اور اگر ہم نے فرار ہونے کی کوشش کی تو وہ ہمارا تعاقب کریں گے ... اور ہمیں مار ڈالیں گے... ہم دو ایک روز یہاں چھپے رہیں گے۔ یہ گھر مدت سے خالی پڑا ہے اور جب خطرہ ٹل جائے گا۔ یعنی تم بھی چلے جاؤ گے تو..." وہ یکلخت رک گیا۔

"تو...؟" میں نے خنجر اس کے گلے پر رکھ دیا۔ "تو کیا بہرام؟... پھر تم کہاں جاتے؟"

"اوگور..." وہ ہانپتے ہوئے بولا۔

... پھر کسی نے اسے اٹھایا اور ایک گھوڑے پر ڈال دیا۔ میں نے سردار کی طرف سوالیہ نگاہ سے دیکھا۔

"خدا تمہیں اپنے مقصد میں کامیاب کرے نوجوان۔" اس نے میرے کندھے پر تھپکی دی۔ "اپنا فرض مت بھولو اور انصاف خدا پر چھوڑ دو۔" اس نے انگلی اوپر اٹھا کر کہا۔

میں نے کن انکھیوں سے بہرام کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار تھے لیکن آنکھیں مطمئن تھیں۔ کوئی بات نہیں۔ میں نے سوچا۔ تم سے خون کا حساب بعد میں لوں گا۔

"شہباز..." رفیق نے واپسی کے دوران کہا۔ "بہرام کے پاس صرف دو ہزار ہی کیوں تھے؟ اور وہ لوگ بھاگ کیوں گئے؟"

"انہوں نے دیکھ لیا ہوگا کہ مقابلے پر ایک نہیں تین آدمی ہیں۔" میں نے کہا۔ "تم نے بہرام کی بات پر غور نہیں کیا۔ یہ زرین جان کی چال ہوگی۔ اس نے اطمینان کرنے کے لیے بہرام کو دو ہزار دلوا دیے ہوں گے اور باقی اپنے پاس رکھے ہوں گے... کہ محفوظ رہیں گے... پھر وہ جانتے بوجھتے اسے مرنے کے لیے چھوڑ گئے ہوں گے... اگر وہ زندہ سلامت ان سے جا ملتا تو پریشانی کی کوئی بات نہ ہوتی۔ وہ اسے باقی رقم بھی پکڑا دیتے... یا اسے راستے ہی سے ہٹانے کا کوئی دوسرا موقع اور بہانہ تلاش کرتے۔"

••

صبح میں نے اٹھارہ سو روپے گموری قصبے تک بھجوانے کا بندوبست کیا اور دو سو روپے ذاتی اخراجات کے لیے رکھ لیے۔ اب میں رفیق کے ساتھ فوراً اوگور روانہ ہونے کی فکر میں تھا۔ بہرام نے مجھے شیر خان کی اگلی منزل کے بارے میں جو خبر دی تھی وہ جھوٹ بھی ہو سکتی تھی اور سچ بھی... اگر وہ پہلے سے اس اندیشے میں مبتلا ہوتے کہ ہم پشاور پہنچتے ہی انہیں گرفتار کرا دیں گے تو وہ فی الحال غیر علاقے ہی میں رہیں گے جہاں پولیس کی رسائی نہیں تھی۔ ایسی صورت میں ان کا اوگور جانا سمجھ میں آتا تھا۔

میں اپنے خیالات میں محو چلا جا رہا تھا کہ کسی نے آواز دے کر مجھے پکارا۔

میں نے چونک کر دیکھا تو مجھے وہی چہرہ نظر آیا جو میں نے گزشتہ رات بھی دیکھا تھا۔ وہی شخص داؤد جس نے زرین جان کے ٹھکانے تک ہماری رہنمائی کی تھی، مجھے بلا رہا تھا۔

میں نے ادھر ادھر دیکھا اور لپک کر اس کی دکان میں گھس گیا۔ یہ دیسی ساخت کے اسلحے کی دکان تھی۔

"شیر خان تو بھاگ گیا..." داؤد نے کہا۔ "اب تم کیا کرو گے؟ مجھے افسوس ہے کل مجھے کچھ دیر ہو گئی تھی ورنہ..."

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" میں نے ادھر ادھر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ "میں ان کے پیچھے اوگور جا رہا ہوں۔ ... مجھے... مجھے ایک اچھی سی رائفل چاہیے جو زیادہ قیمتی بھی نہ ہو۔" میں نے یہ موقع غنیمت جانا کیوں کہ میں اپنی پرانی... رائفل سے واقعی مطمئن نہیں تھا۔

"رائفل...!" وہ کچھ دیر سوچتا رہا... پھر کچھ یاد کر کے بولا۔ "میرا خیال ہے تمہارے کام کی ایک چیز میرے پاس موجود ہے۔"

اس نے پردہ ہٹایا اور دکان کے عقبی حصے میں غائب ہو گیا۔ جہاں غالباً اس کی رہائش تھی۔

کچھ دیر بعد وہ ایک بالکل نئی ولایتی رائفل اٹھائے نمودار ہوا... "یہ میرے اسی بھائی کی رائفل ہے جسے بزدلوں نے نہتا پا کر مار دیا تھا۔"

اس کا چہرہ احساسِ الم سے تاریک پڑ گیا۔

"اس نے یہ رائفل ایک فرنگی کو جہنم رسید کر کے چھینی تھی اور پھر اسی رائفل سے دو اور فرنگی مارے تھے۔ اس کا نشانہ بے خطا تھا اور وہ اس رائفل کے بغیر کہیں نہیں جاتا تھا۔ رائفل تو مرد کا زیور ہوتی ہے... صرف وہی ایک دن تھا جب اس نے دیکھا کہ میں اپنی رائفل صاف کر رہا ہوں تو وہ اپنی رائفل بھی صفائی کے لیے چھوڑ گیا۔ کمینے دشمنوں نے دیکھ لیا کہ وہ خالی ہاتھ ہے تو انہوں نے اسے گھیر لیا اور مار کر ندی میں پھینک دیا کہ معلوم ہو وہ ڈوب کر ہلاک ہوا ہے... لیکن میں نے اس کے جسم پر چوٹوں کے گیارہ نشانات شمار کیے تھے۔ میں جانتا ہوں وہ کون لوگ ہیں... زرین جان کے آشنا۔

PVL
PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

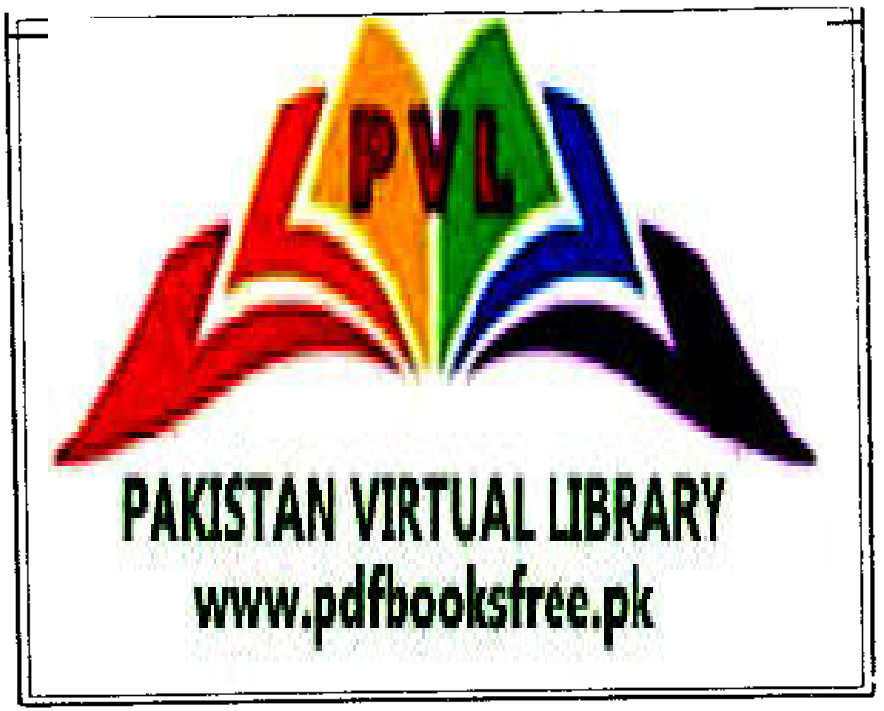

... میں... میں اصل قاتل کو تو نہیں پہچان سکتا لیکن مجھے ... یقین ہے کہ زرین جان ہی میرے بھائی کی موت کی ذمے دار ہے... اُسی نے میرا گھر ویران کیا... خدا اُس کا خانہ خراب کرے۔ عاقبت سے پہلے اسے دُنیا میں سزا ملے۔"

رائفل میرے ہاتھ میں تھما کر وہ تیزی سے پلٹا اور پردے کے پیچھے غائب ہو گیا۔

اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

میں بوجھل دل کے ساتھ باہر آ گیا۔ یہ ایک اور بارِ امانت تھا جو میں نے خود نہیں اُٹھایا تھا بلکہ حالات نے میرے کندھوں پر رکھ دیا تھا... میرا جی تو چاہا کہ لوٹ کر جاؤں اور رائفل اُس بوڑھے کو واپس کر دوں... مگر ہمارے دشمن مشترک تھے اس لیے قدرتی طور پر اس کا انتقام بھی میرے ہاتھوں پورا ہو جائے گا۔

••

بابا رحمان کی سرائے میں اس رات میرے اور رفیق کے سوا کوئی مسافر نہیں تھا۔ چنانچہ میں بے خیالی میں نیم تاریک نیم روشن کمرے میں داخل ہوا تو میں دوسری چارپائی پر بیٹھے ہوئے شخص کو رفیق سمجھا... پھر مجھے اچانک احساس ہوا کہ رفیق مجھے دیکھ کے یوں خاموش نہیں رہ سکتا تھا۔

میں تیزی سے پلٹا... اس وقت تک میرا ہاتھ ریوالور کے دستے تک پہنچ چکا تھا۔

"نہیں جوان..." وہ شخص ہاتھ اُٹھا کر بولا۔ "میں تمہارا دشمن ہوتا تو اندر قدم رکھنے سے پہلے ہی تم میری بندوق کا نشانہ بن چکے ہوتے... یہ... یہ رائفل تمہاری ہے؟" اس نے مشتبہ لہجے میں پوچھا۔

"رائفل اُسی کی ہوتی ہے، جس کے ہاتھ میں ہو۔" میں نے کہا۔ "کیا تم یہی پوچھنے کے لیے یہاں بیٹھے تھے؟"

"تم نے... میرا مطلب ہے، یہ رائفل تمہیں اس شخص نے تو نہیں دی جو کل رات آیا تھا؟" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

میرا ماتھا ٹھنکا... "کل رات کون آیا تھا؟ یہ رائفل تو میں نے بازار سے خریدی ہے... مگر تم یہ فضول باتیں کیوں پوچھ رہے ہو... اپنے آنے کا مقصد بتاؤ؟"

"میں تمہیں ایک کام کی بات بتانے آیا تھا۔" وہ یکایک مسکرانے لگا۔ "میں تمہیں بتا سکتا ہوں کہ شیر خاں کہاں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ اڈگور نہیں گیا... بلکہ کسی اور جگہ چھپا ہوا ہے کیونکہ اُس کا خیال ہے کہ تم اُس کے تعاقب میں اڈگور ضرور جاؤ گے۔"

"میں کیسے اعتبار کر لوں کہ تم جو کچھ بتاؤ گے، وہ غلط نہیں ہو گا؟" میں نے دریافت کیا۔

"مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے... میں تم پر احسان کرنے نہیں آیا ہوں۔"

"پھر کیا بات ہے؟"

"بات یہ ہے کہ مجھے جو کچھ معلوم ہے، وہ میں تم سے معاوضہ لیے بغیر نہیں بتاؤں گا۔"

میں اُسے گھورتا رہا۔

"تمہارے لیے یہ اطلاع ایک شکاری چاقو سے کہیں زیادہ قیمت کی ہے۔" اس نے معلومات کا بھاؤ بتایا۔

میں نے اپنی پیٹی سے شکاری چاقو نکال کر اُس کی طرف اُچھال دیا۔ "جلدی بتاؤ۔" میں نے کہا۔

"یہاں سے اڈگور کی طرف جاتے ہوئے دائیں جانب ایک پہاڑی ہے جس کی بلندی کسی پہاڑ سے کم نہیں..." وہ شکاری چاقو اُٹھاتے ہوئے بولا۔ "راستہ تمہیں خود ہی مل جائے گا۔ درختوں کے درمیان ایک جھونپڑا بنا ہوا ہے۔ چھوٹا سا جھونپڑا ہے، جس میں شاید ایک پاگل بوڑھا رہتا ہے... وہ لوگ وہیں موجود ہیں۔"

میں نے ریوالور کے دستے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا... "خدا کو حاضر ناظر جان کے حلفیہ کہو کہ یہ جھوٹ نہیں ہے۔" جب اُس نے مخصوص الفاظ سے حلفیہ بیان دینے کے بعد یہ کہا کہ وہ ہاتھوں میں قرآن اُٹھا کر بھی یہ بات کہہ سکتا ہے تو میرے لیے شک و شبے کی کوئی گنجائش نہ رہی۔

میں اُسے باہر جاتے دیکھتا رہا۔

اس کا گھوڑا سرائے کے باہر بندھا ہوا تھا... رفیق نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔ مجھے بے چینی ہونے لگی۔ چند منٹ انتظار کرنے کے بعد میں نے بابا رحمان سے کہا کہ میرا دوست آئے تو اس سے کہہ دے کہ میں ایک کام سے چلا گیا ہوں اور کچھ معلوم نہیں کب واپسی ہو گی اس لیے میرا انتظار نہ کرے۔

میں نے نئی رائفل کندھے پر لٹکائی اور گھوڑے پر سوار ہو کر نکل گیا۔ سُموں کے نشان میری راہنمائی کر رہے تھے لیکن کچھ دور جا کر یہ نشانات گم ہو گئے۔

میں گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتا ہوا بستی سے دور پہاڑ کی جانب بڑھتا گیا۔ درخت جو پہلے زیادہ گھنے تھے، کم ہونے لگے اور پہاڑی جو زیادہ بلند نہیں لگتی تھی، قریب پہنچنے پر پہاڑ جتنی اُونچی نظر آنے لگی۔

یوں لگتا تھا جیسے کسی زلزلے نے اس پہاڑ کو ہلا کر جگہ جگہ سے شق کر دیا ہو۔ گہری دراڑیں پہاڑ کے سیاہ وجود پر یوں پھیلی ہوئی تھیں جیسے ہاتھ کی پُشت پر اُبھری ہوئی رگیں نظر آتی ہیں۔ بڑے بڑے پتھر لڑھک کر نیچے آ پڑے تھے اور زمین پر چٹانیں یوں نظر آتی تھی جیسے کسی بہت بڑے ہاتھ نے ان کو اُٹھا کر وہاں سجا دیا ہو... چھوٹے بڑے ان گنت سیاہ پتھر درختوں کے درمیان اٹکے ہوئے تھے اور غاروں کے کھلے دہانے کسی دیو کے کھلے منہ کی طرح لگتے تھے ... لیکن اس کے باوجود راستہ واضح نمایاں تھا۔

میں سوچنے لگا کہ اگر واقعی پہاڑ کی یہ شکست و ریخت کسی زلزلے کا نتیجہ ہے تو وہ چھوٹا سا جھونپڑا کیسے سلامت رہا ہو گا؟ ممکن ہے اسے زلزلے کے بعد بنایا گیا ہو... میں نے خود کو قائل کیا لیکن ایک سوال جسے میں ٹالنے کی ناکام کوشش میں مصروف تھا، بدستور میرے ذہن کے ایک گوشے میں فساد برپا کرتا رہا۔

اگر یہ جھوٹ ہوا...؟

اگر یہ دشمن کی کوئی چال ہوئی تو...؟

دم بدم بلند ہونے والے پہاڑی راستے پر میرے سوا کوئی بھی نہیں تھا اور دشمن کسی بھی غار کے اندھیرے سے میرا نشانہ لے کر مجھے کتے کی موت مار سکتا تھا... مگر مجھے اس مخبر کے حلف کا خیال آتا تھا جو قرآن اُٹھانے کو تیار تھا کہ شیر خان اور اُس کے ساتھی یہاں ایک جھونپڑے میں موجود ہوں گے۔

آسمان پر بادل گھر آئے تھے اور ہوا تیز ہونے لگی تھی۔ میں نے نظر اُٹھا کر دیکھا تو مجھے چوٹی کے قریب دھوئیں کی لکیر سی نظر آئی۔

دھواں اُسی جھونپڑے سے اُٹھ رہا تھا، جو میری منزل تھا۔ میں نے اطلس کو تھپکی دی... "شاباش دوست! اس قدرتی طوفان کے آنے سے پہلے پہلے ہمیں دشمنوں پر کسی طوفان کی طرح ٹوٹ پڑنا چاہیے۔"

گھوڑے نے میری بات سمجھ لی اور پُرخطر راستے پر سنبھل سنبھل کر تیز تیز قدم اُٹھانے لگا۔ ہوا یک لخت تیز ہو گئی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور درختوں سے سنسناتی ہوئی گزرنے لگی... پہاڑوں میں یہ سنسناہٹ طوفانی ندی کے شور کی طرح گونجنے لگی۔

سیاہ بادلوں نے شام کا سماں پیدا کر دیا... پھر بجلی چمکنے لگی اور بادل زور سے گرجا۔

میری منزل اب قریب تھی۔

بارش کی پہلی بوند میری پیشانی پر ٹپکی تو میں نے گھوڑے کو ایک درخت سے باندھ دیا... طوفان ہر لمحے شدت اختیار کر رہا تھا اور میرے لیے گھوڑے پر اپنا توازن برقرار رکھنا مشکل ہو گیا تھا۔ درختوں کے خشک پتے میرے منہ پر لگتے تھے تو مجھے راستہ نظر ہی نہیں آتا تھا۔ اتنا زبردست طوفان مجھے بُرا شگون لگتا تھا... مگر میں اپنے دل کو تسلی دینے کے لیے سوچتا تھا کہ شاید یہ بھی تائیدِ غیبی ہی ہو۔ ایسے موسم میں دشمن بے فکر بیٹھے ہوں گے اور اُن کے... وہم و گمان میں بھی نہ ہوگا کہ کوئی اُن پر عذاب بن کر بھی نازل ہو جائے گا۔

جھونپڑا اب میرے سامنے تھا اور منزل کو اس قدر قریب پا کر میرا دل شدت سے دھڑکنے لگا تھا۔ میں نے رائفل کو تیار کر لیا اور دبے پاؤں آگے بڑھا حالاں کہ اس شور میں جو شاخوں کے ٹوٹنے یا پتھروں کے لڑھکنے اور گرج چمک سے پیدا ہو رہا تھا، کسی کو میرے آنے کی خبر نہیں ہو سکتی تھی ...حتیٰ کہ کوئی کسی کھڑکی سے راستے کی طرف دیکھ نہ رہا ہو۔

ہموار زمین کے شروع ہوتے ہی میری نگاہ خود بخود گھوڑوں کے سموں کے ان نشانات پر گئی جن پر ہوا کے جھونکے اثر انداز نہیں ہوئے تھے۔

میں یکلخت رُک گیا۔

بچپن سے اب تک کا تجربہ غلط نہیں ہو سکتا تھا اور میری نظر دھوکا نہیں کھا سکتی تھی۔ سموں کے ویسے ہی نشانات بالکل واضح تھے جو میں نے رحمان بابا کی سرائے کے باہر دیکھے تھے... مگر جو آگے جا کر گم ہو گئے تھے... میرا محسن بن کر مجھ سے ایک شکاری چاقو لے کر اطلاع دینے والے مخبر کے گھوڑے کے سموں کے نشان...

حلف کی حد تک اس شخص کے الفاظ درست تھے کہ شیر خان اور اُس کے ساتھی یہاں موجود ہیں... مگر اُن کی نیت کے بارے میں اُس نے حلفیہ کچھ نہیں کہا تھا... اور نہ ہی یہ بتایا تھا کہ وہ خود بھی مجھ سے پہلے ہی یہاں موجود ہوگا۔

میں دشمن کے پھیلائے ہوئے جال میں آ پھنسا تھا ...اُس شکار کی طرح جو دانہ چُگتا ہوا زیرِ دام آ جائے۔

ایک زبردست دھماکے سے میرے قدم اُکھڑ گئے اور میں پلٹ کر نیچے گر گیا۔ میری ایک ٹانگ میں انگارے سے بھر گئے تھے۔

نشیب کی طرف لڑھکتے ہوئے میں نے بہت سے چھوٹے بڑے پتھروں کو بھی ساتھ لے لیا۔ بارش اب تیز ہو گئی تھی اور طوفان درختوں کو اکھاڑ اکھاڑ کے پھینک رہا تھا۔ بجلی کوڑے کی طرح لہرائی اور ایک قیامت خیز دھماکا ہوا۔ نیچے ایک درخت الاؤ کی طرح جلنے لگا۔

یہ سب کچھ میری آنکھوں نے چند لمحوں میں اُوپر نیچے ہوتے دیکھ لیا... پھر میں نے خود کو سنبھالنے کی دیوانہ وار جدوجہد میں اِدھر اُدھر ہاتھ مارے کہ کوئی جھاڑی، کسی درخت کا تنا یا کسی چٹان کا کونا ہی میری گرفت میں آ جائے۔

ایک درخت کی شاخ جو تنے سے ٹوٹ کر زمین پر آ گری تھی مگر ابھی درخت سے منسلک تھی، میرے ہاتھ میں آ گئی

جاسوسی ڈائجسٹ کے مقبول سلسلے
ناگ بھون — اقلیم علیم
(دو جلدیں) قیمت =/300 روپے
سنگتراش — اقلیم علیم
(دو جلدیں) قیمت =/300 روپے
برہمچاری — انوار صدیقی
قیمت =/150 روپے
سرکش — محمود احمد مودی
(12 حصے) مکمل سیٹ =/600 روپے
مکتبہ القریش سرکلر روڈ اردو بازار لاہور
فون 7668958

...میں نے اپنے جسم کو ایک ایسی چٹان کے کنارے پر روک لیا جس کے بعد کم سے کم پچاس فٹ کی عمودی گہرائی تھی۔

پتھروں کی رگڑ سے میرے سارے جسم پر خراشیں آ گئی تھیں لیکن مجھے ان کی کوئی پروا نہیں تھی۔ اطمینان کی بات یہ تھی کہ رائفل ابھی تک میرے کندھے سے الگ نہیں ہوئی تھی۔ میں بمشکل تمام کھڑا ہونے میں کامیاب ہوا... دائیں ٹانگ کے نچلے حصے میں لگنے والی گولی نے گوشت کو اُدھیڑ دیا تھا اور ہڈی سلامت تھی۔ میں نے کندھے پر پڑی ہوئی چادر کو الگ کیا اور اس میں سے ایک گز کپڑا پھاڑ لیا۔

چھاجوں پڑنے والی بارش زخم کو دھو رہی تھی۔

میں نے زخم پر کس کر پٹی لپیٹی اور خون وقتی طور پر تھم گیا۔ خود کو چھوتے اور ہوا کے زور سے دُہرے ہوتے درختوں سے بچاتا اور لڑھکنے والے پتھروں سے بچتا، پانی میں بھیگ کر چکنے ہو جانے والے پہاڑی راستے پر قدم جماتا اور درد کی ٹیس کو برداشت کرتا ہوا میں چند قدم آگے بڑھا۔

میرا ارادہ اب گھوم کر عقبی طرف سے جانے کا تھا لیکن میں مشکل سے دس گز چلا تھا کہ دوسرا فائر ہوا اور میں گھوم کر منہ کے بل گر گیا۔

ایک مرتبہ پھر گہری وادی کا ہلاکت خیز نشیبی فاصلہ طے کرتے ہوئے میں نے اندازہ کرنا چاہا کہ دوسری گولی نے میرے جسم کے کس حصے کو نقصان پہنچایا ہے۔ ضرب مجھے کمر کے قریب محسوس ہوئی تھی... مگر کمر یا پیٹ میں کسی گولی کے زخم کی تکلیف کا کوئی احساس نہیں تھا۔

اس بار کوشش کے باوجود میرے ہاتھ کسی چیز کا سہارا نہ پا سکے اور میں پتھروں کے ساتھ پتھر بن کے لڑھکتا گیا ...پھر میرا جسم کسی چیز سے ٹکرایا اور میں نے دیکھا کہ ایک درخت کا تنا میرے اور موت کی وادی کے درمیان حائل ہو گیا ہے۔

قدرت کو ابھی مجھے زندہ رکھنا منظور تھا ورنہ اس کے بعد پچاس ساٹھ گز تک صرف چٹانیں تھیں اور اس کے بعد خلا تھا جو نہ جانے کہاں تک پھیلا ہوا تھا۔

وہیں لیٹے لیٹے میں نے چہرے کے سامنے ہاتھ رکھ کر خود کو پتھروں کی یلغار سے بچایا اور اپنی جسمانی قوت بحال کرنے کے لیے لمبی لمبی سانسیں لینے لگا... میں اب اس جھونپڑے سے سو گز دُور ہو چکا تھا جہاں میرے قاتل فروکش تھے اور جنہوں نے بڑی ہوشیاری سے کرائے کا نامہ بر بھیج کر مجھے مقتل تک بلا لیا تھا۔

ستم ظریفی یہ تھی کہ اس اجل کے نامہ بر کو آمد و رفت کی زحمت کا معاوضہ بھی میں نے ہی ہنسی خوشی ادا کیا تھا۔ یہ شامتِ اعمال ہی تھی جو مجھے گھیر کر یہاں لے آئی تھی۔ اگر میں مخبر کی طرف سے بے پروا نہ ہوتا تو اس بے نام و نشاں مقام پر یوں نہ مارا جاتا۔

میرے چاروں طرف درخت گرے ہوئے تھے اور شاخیں ٹوٹی پڑی تھیں۔ جس درخت پر بجلی گری تھی، اُس کی آگ کو موسلا دھار بارش نے بجھا دیا تھا... مگر دھواں اب بھی اُٹھ رہا تھا۔

زلزلے جیسی گڑگڑاہٹ سن کے میں نے اُوپر دیکھا۔ سینکڑوں من وزن کی ایک چٹان جو شاید اب تک کسی سنگریزے پر توازن کی قوت کے سہارے کھڑی تھی، یکایک لڑھکتی ہوئی میری طرف آ رہی تھی۔

اگر میں اس کی زد میں آ جاتا تو میرے جسم کا قیمہ ہو جاتا۔ اس درخت کی اوٹ میں پناہ لینا بھی بے سود تھی۔ میں بے اختیار اُٹھا اور زخموں کی پروا کیے بغیر ایک طرف چھلانگ لگا دی۔

پلک جھپکتے میں چٹان میرے پیروں سے چند انچ فاصلے سے گزری، درخت کے تنے سے ٹکرائی اور اسے گرا کر اپنے ساتھ نیچے لے گئی۔ متعدد چھوٹے بڑے پتھر جو اس چٹان کی راہ میں آئے، ٹوٹ کر بکھر گئے... پھر ایک اور دھماکا سُنائی دیا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ چٹان نیچے جا گری ہے۔ اس پر برسنے والے پتھروں کا شور پتوں پر پڑنے والی بارش کے اور ہوا کے شور میں شامل ہو گیا۔

یہ طوفان نہیں تھا بلکہ ایک قیامتِ صُغرا تھی جس نے اس علاقے کو تہس نہس کر دیا تھا۔ دوسری بار گرنے کی سے رائفل بھی مجھ سے جُدا ہو گئی تھی۔ میں پھر اُٹھا اور جسم کی ہر چوٹ کے درد کو بھول کر رائفل کی تلاش میں نظریں اِدھر اُدھر دوڑانے لگا... اسی وقت میری نگاہ دشمنوں پر گئی۔

وہ مختلف سمتوں سے نیچے اُتر رہے تھے اور راستے میں پڑے ہوئے بڑے بڑے پتھروں کو نشیب کی طرف دھکیلتے میری طرف آ رہے تھے۔ اس شور میں اُن کی آواز میرے کانوں تک نہیں پہنچ رہی تھی... مگر میں ان کے اشاروں کو سمجھ رہا تھا

وہ ایک دُوسرے کو بتا رہے تھے کہ میرا کہیں نام و نشان تک نہیں ہے گویا وہ مجھے دیکھنے میں ناکام ہو گئے تھے۔

موجودہ حالات میں اُن سے مقابلہ خودکشی کے مترادف تھا... وہ میرے جسم کو چھلنی کر کے چھوڑ جاتے اور کسی کو کبھی کچھ بھی معلوم نہ ہوتا... فوری طور پر خود کو کہیں پوشیدہ رکھنے کا مسئلہ تھا۔

مَیں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔

کہیں کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جہاں مَیں چھپا رہ سکتا وہ تین تھے اور ہر ایک کی نظر صرف مجھے تلاش کر رہی تھی۔

اچانک مجھے ایک چٹان نظر آئی جو کبھی پہلے یا اِس طوفان کے ذریعے ایک اور چٹان پر آ کر اٹک گئی تھی اور ان دونوں کے درمیان ایک تنگ و تاریک خلا تھا جس میں میرا وجود سما سکتا تھا... مَیں ہمت کر کے گھسٹتا ہوا آگے بڑھا اور لیٹ کر اس دَرز میں سما گیا۔

تھوڑا تھوڑا سرک کر مَیں نے اپنے جسم کو اندر پھنسا دیا اور دَم سادھے پڑا رہا۔ پتھروں کے لڑھکنے کی آوازیں مسلسل آ رہی تھیں۔ یہ بات بعید از قیاس نہیں تھی کہ کوئی پتھر اس چٹان پر بھی آ گرتا... تو مَیں پتھر کے دو پاٹوں میں پِس کے رہ جاتا۔ رفتہ رفتہ اُن کے باتیں کرنے کی آواز آنے لگی...

... پھر وہ عین چٹان کے اُوپر آ کھڑے ہوئے۔

”دُوسری گولی اُسے یقیناً لگی ہے... اور وہ اسی سے گرا تھا۔“ یہ آواز شیر خان کی تھی۔

”مَیں کہہ رہا ہوں کہ مَیں نے خود اُسے نیچے جاتے دیکھا تھا۔“ گل زمان بولا۔ ”اُس کی لاش کا تو قیمہ بن گیا ہو گا۔“

”اگر ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے تو اچھا تھا۔“ شیر خان نے کہا۔

”اس کا کام تو پہلی گولی نے ہی تمام کر دیا تھا...“ گل زمان بولا۔ ”مگر آدمی فوراً کہاں مرتا ہے... اس کے سنبھلتے ہی تم نے دُوسری گولی چلا دی تھی۔“

”ہاں... میرا خیال ہے وہ چٹان اسے پیستی ہوئی اس کے اُوپر سے گزر گئی ہو گی۔“

”اِس میں شک کی کون سی بات ہے۔ یہ تو ہم سبھی نے دیکھا تھا...“ گل زمان جھنجلا گیا۔

”اس طوفان نے اتنی تباہی مچائی ہے کہ لاش ڈھونڈنا ناممکن ہے۔“ یہ تیسری آواز اجنبی تھی مگر تھوڑا سا غور کرنے پر مَیں نے اسے شناخت کر لیا۔ یہ مجھ سے شکاری چاقو اینٹھ کر یہاں تک لانے والا شخص تھا۔

مجھے رفیق کی بات یاد آنے لگی۔ اُس نے کہا تھا کہ انتقام کے اس اندھے جذبے کو لگام دو... یہی بے لگام

ایک ایسی عورت کی کہانی
جو مردوں کے معاشرے میں
ملکہ بن کر جینا چاہتی تھی
ناگ رانی
دو جلدوں میں
جلد اول =/145
جلد دوئم =/145
مکتبہ القریش سرکلر روڈ اردو بازار لاہور
فون 7668958

نئے اُفق کا مقبول سلسلہ
سرفروش
نامور مصنف اظہر کلیم
کے ایڈونچرس قلم سے
دو حصوں میں مکمل سیٹ =/100
مکتبہ القریش سرکلر روڈ اردو بازار لاہور
فون 7668958

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جذبہ مجھے موت کے منہ میں کھینچ لایا تھا اور مَیں وقتی طور پر دشمن کی نگاہ سے اوجھل ہونے کے باوجود پُورے یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ خطرہ ٹل گیا ہے۔

وہ تینوں چٹان سے نیچے اُترے اور کچھ دیر میرے سامنے مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑے رہے۔ اُن کی آنکھیں مسلسل ہر سمت میں دیکھ رہی تھیں۔ مَیں اتنے قریب سے انہیں صرف اسی صورت میں نظر آ سکتا تھا جب وہ جھک کر دیکھتے جبکہ دُور جانے کے بعد انہیں تاریک دَرز میں کچھ دِکھائی نہیں دے سکتا تھا۔

”میرا خیال ہے اب ہمیں چلنا چاہیے۔“ شیر خان نے کچھ دیر کے بعد کہا۔ ”وہ لوگ آنے والے ہوں گے۔“

”جھونپڑے والے شام سے پہلے نہیں آئیں گے۔“ تیسرے شخص نے کہا۔

”مگر اب یہاں ٹھہرنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔“ شیر خان غرّایا۔

اگر رائفل اس وقت میرے ہاتھ میں ہوتی تو شیر خان کی لاش سب سے پہلے کھائی میں گرتی... دُوسری گولی سے گل زمان اُس کے اُوپر گرتا اور اگر اتنی دیر میں تیسرا شخص رائفل سنبھال کر مقابلہ کرنے کی کوشش کرتا تب بھی نہ بچتا کیوں کہ مَیں ایک خندق نما مورچے میں تھا اور وہ میرے بالکل سامنے تھے لیکن مَیں کوئی حماقت کر کے زندگی کو خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ میرے پاس ریوالور موجود تھا لیکن فاصلے کی وجہ سے مَیں اسے استعمال نہیں کر سکتا تھا... اس کے علاوہ زخمی ہونے کی وجہ سے مجھے توقع نہیں تھی کہ مَیں اتنی پھرتی کا مظاہرہ کر سکوں گا... مَیں بے بس تھا۔ گوری سردار اور میرے ساتھیوں کے قاتل سامنے تھے... مگر مَیں اُن کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔

وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے نیچے اُتر گئے۔ رفتہ رفتہ باتیں کرنے کی آواز بھی معدوم ہو گئی۔

طوفان کی شدّت میں کمی آ گئی تھی۔ مَیں اپنی کمین گاہ سے نکلا تو میرے لیے اپنے وجود کا بوجھ سنبھالنا بھی مشکل ہو گیا... میری زخمی ٹانگ کا درد پُورے جسم کو مفلوج کر رہا تھا لیکن ہمّت ہارنا زندگی کی بازی ہارنے کے مترادف تھا۔

آدھے گھنٹے کی جدوجہد کے بعد میں رائفل تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس دوران میں کئی بار گرا... چٹانوں کا سہارا لے کر اُٹھا اور چاروں ہاتھوں پیروں پر، جانوروں کی طرح چلنے کی کوشش بھی کرتا رہا...

نقاہت بڑھتی جا رہی تھی اور مَیں ڈر رہا تھا کہ کہیں مجھ پر بے ہوشی نہ طاری ہو جائے جس کا انجام موت تھا۔

ایک بار پھر مَیں نے اُوپر دیکھا... سو گز کی بلندی اس وقت ایک سو میل کے برابر ہو گئی تھی... اُوپر ایک جھونپڑا تھا، جہاں قاتل اس لیے چھپ گئے تھے کہ وہاں کے مکین کہیں گئے ہوئے تھے۔

تیسرے شخص نے کہا تھا کہ مکین شام سے پہلے نہیں آئیں گے۔ جہاں گھر ہو اور مکین بھی ہوں تو وہاں پناہ بھی ہوتی ہے۔ مَیں نے اُوپر کی طرف رینگنا شروع کر دیا۔ چڑھائی پر پھسلن تھی۔ کئی مرتبہ مَیں منہ کے بل گرا اور کچھ دیر کے لیے بے ہوش بھی رہا... مگر منہ پر گرنے والے بارش کے ننھے ننھے قطروں سے مجھے جلد ہی ہوش آ گیا۔

میری زخمی ٹانگ اتنی بھاری ہو گئی تھی کہ میرے لیے اس کا بوجھ گھسیٹنا دشوار ہوتا جا رہا تھا... دُوسری گولی اگر میری جیب میں رکھی ہوئی چاندی کی منقش ڈبیا سے نہ ٹکراتی تو میرے جگر کو چھلنی کر دیتی۔ اس ڈبیا میں وہ تعویز تھا جو مجھے ماں رحیم جان نے دیا تھا اور کہا تھا کہ یہ تعویز مجھے ہر آفت سے محفوظ رکھے گا۔ اس کے اعتقاد میں ماں کا ناقابلِ تسخیر جذبہ بھی شامل تھا جس کی قوّت نے آج معجزہ دِکھایا تھا۔ واقعی میری جان بچ گئی تھی۔

آخری چند قدم انتہائی صبر آزما تھے۔ میری جسمانی قوّت ختم ہو چکی تھی اور مَیں قوّتِ ارادی کے بل پر اپنے آپ کو آگے گھسیٹ رہا تھا... مَیں ہاتھوں کو آگے بڑھاتا تھا اور جسم کو تھوڑا سا اُٹھا کر باقی دھڑ کو کھینچ لیتا تھا۔ کیوں کہ جس ٹانگ میں گولی لگی تھی، وہ عملاً مر چکی تھی اور مَیں ٹانگ کی لاش کو بھی ساتھ اُٹھائے رکھنے پر مجبور تھا۔

مجھے بار بار زمین و آسمان گھومتے دکھائی دیتے تو مَیں آنکھیں بند کر کے چند گہری لمبی سانسیں لیتا اور پھر ایک قدم کا فاصلہ طے کرنے کے لیے تیار ہو جاتا... بالآخر جھونپڑے کا دروازہ نظر آنے لگا، جو کھلا ہوا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے آخری کوشش میں دہلیز کو جا لیا اور اپنے جسم کو اندر پھینک دیا۔

اب میں بارش سے محفوظ ہو گیا تھا اور ایک چھت کی پناہ مل گئی تھی۔ نہ جانے کتنی دیر میں ایسے ہی آنکھیں بند کیے فرش پر سکت پڑا رہا... پھر میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔

جھونپڑے کے ایک گوشے میں چولہا تھا اور سلگتی ہوئی لکڑیاں اب بھی دھواں دے رہی تھیں... بان کی ایک پرانی چارپائی پر چٹائی بچھی ہوئی تھی... چولہے کے قریب کچھ برتن اور ڈبے پڑے تھے... ایک اور دروازہ ساتھ والے کمرے کا معلوم ہوتا تھا مگر مقفل تھا اور بظاہر یہ جھونپڑا انہی دو کمروں پر مشتمل تھا۔

میں پیٹ کے بل سرکتا ہوا چولہے تک پہنچا... اور دھواں دیتی ہوئی لکڑیوں کو آگے کھسکا کر پھونک مارنے لگا۔ مگر بہت جلد میری سانس پھول گئی۔ ایک برتن کا ڈھکنا کھول کر دیکھنے سے مجھے خوشی ہوئی۔ شیر خاں اور اس کے ساتھیوں کا چھوڑا ہوا قہوہ اس میں موجود تھا۔

میں نے برتن کو انگاروں پر رکھ دیا۔

ایک سوکھا ہوا پتہ انگاروں میں رکھ کر پھونک مارنے سے یہ فائدہ ہوا کہ پتے کے ساتھ ہی لکڑیوں نے بھی آگ پکڑ لی... قہوہ گرم ہو جانے کے بعد میں نے اسے ایک بڑے پیالے میں انڈیل لیا اور قریب رکھے ہوئے گھڑے میں سے برتن میں پانی ڈال کر ابلنے رکھ دیا۔

گرم قہوے کا پورا پیالہ پینے کے بعد میری جسمی توانائی تیزی سے بحال ہونے لگی۔ میں ہمت کر کے باہر گیا اور ایک درخت کے پتے توڑ لایا جو زخم کے دھونے کے لیے ابال کر استعمال کیے جاتے تھے۔ پانی میں نمک ڈال کر میں نے اپنی ٹانگ پر سے خون آلود پٹی کھولی۔

زخم کو دیکھ کر مجھے ابکائی سی آئی اور میرا سر چکرانے لگا... لیکن میں نے خود کو سنبھالا اور گوشت میں سے چھرے نکالنے لگا۔ یہ انتہائی کٹھن اور حوصلہ آزما کام تھا۔

درد کی شدت سے بار بار میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگتا تھا۔ جب آخری چھرہ نکال کر میں نے گرم پانی کا برتن اٹھایا تو میرا ہاتھ کانپ رہا تھا۔

دانت پر دانت جما کر میں نے زخم پر پانی کی دھار ڈالی تو بے اختیار میرے حلق سے کراہ نکل گئی۔ میں نے

نامور مصنف محمود احمد مودی
وہی تحریر اور وہی انداز
کے ساتھ 'اپنے چاہنے والوں
کے لئے ایک نئی سوغات لئے
نجات
خوبصورت سرورق' بہترین
طباعت و کتابت' سفید کاغذ
قیمت =
Scanned By: Azam

فوراً ضبط کیا۔ اس وقت اگر ماں ریشم جان زندہ ہوتی اور وہ مجھے کراہتے ہوئے سن لیتی تو یقیناً بھیانک سزا دیتی۔ کچھ دیر بعد میں زخم کی صفائی سے فارغ ہوا... تو نیم جان تھا مگر میں نے اپنی چادر میں سے ایک اور طویل پٹی پھاڑ لی... اسے کھولتے ہوئے پانی میں ڈبو کر نچوڑا... اور زخم پر لپیٹنے لگا۔

...پھر بے ہوشی نے فوراً مجھے درد کے عذاب سے نجات دلا دی۔

••

... پھر ایک طویل خواب شروع ہوا جس کا سلسلہ بار بار ٹوٹ جاتا تھا۔ .. مگر عجیب بات یہ تھی کہ ٹوٹا ہوا خواب ہر بار تھوڑے سے فرق کے باوجود پہلے جیسا ہی لگتا تھا۔ اس کے کردار وہی رہتے تھے۔ ایک بوڑھا جس کی عمر پچپن ساٹھ سال کے درمیان تھی۔ اس کی داڑھی کے بال سیاہی و سفیدی کا امتزاج تھے۔ ایک بار میں نے اس کا سر کھلا دیکھا تو دوسری بار اسی سر پر کلاہ نظر آئی۔ اس کی آنکھیں، جو پُرشکن چہرے کے حلقوں میں دبی ہوئی تھیں، ایک پُرشفقت نرمی تھی... دوسری ایک لڑکی تھی۔ .. شاید سولہ سترہ سال کی۔ .. مگر جسمانی صحت سے بیس برس کی نظر آتی تھی۔ اس کا بھرا بھرا بدن ایک مکمل ہوتی ہوئی عورت کا بدن تھا۔

لڑکی کا چہرہ گول اور سرخ و سفید تھا۔ سیاہ بڑی بڑی آنکھوں میں کبھی معصومیت ایک سوال بن کر ابھرتی تھی اور کبھی ان میں خوف کا سایہ اترتا آتا تھا۔ .. یا پھر کبھی امید کی روشنی جھلملانے لگتی تھی۔ اس کے ہاتھ ملائم اور گداز تھے۔ ایک بار میں نے سیاہ بالوں کے درمیان مانگ کو کہکشاں کی طرح چمکتے دیکھا۔ دوسری بار یہ بال مجھے ابریشم کی طرح سایہ فگن محسوس ہوئے۔

میری نظر کے سامنے سے مختلف مناظر گزرتے رہے۔
بوڑھا میرے پیر کے گرد لپٹی ہوئی پٹی کھول رہا ہے۔
لڑکی برتن لیے کھڑی ہے...
بوڑھا جائے نماز پر قبلہ رو بیٹھا ہے۔
لڑکی چولھے پر کچھ پکا رہی ہے۔
بوڑھے نے مجھے سہارا دے رکھا ہے اور اپنے ہاتھوں میں اتنا اٹھا لیا ہے کہ لڑکی ایک پیالہ میرے منہ سے لگا سکے۔
باہر کبھی دھوپ چمکتی تھی تو کبھی اندھیرے میں صرف جلتی ہوئی لالٹین کا اجالا ہی رہ جاتا تھا۔ .. پھر وہ وقت آیا، جب میں نے سمجھ لیا کہ یہ سب کچھ خواب نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ میں اسی جھونپڑے میں تھا، جہاں میرے قتل کا سامان کیا گیا تھا۔ .. مگر اب اسی گھر میں ایک بوڑھے اور ایک لڑکی نے اپنے اعجازِ مسیحائی سے مجھے زندگی کی طرف کھینچ لیا تھا۔

آہستہ آہستہ میرے کان آوازیں سننے لگے اور ان کا مطلب بھی سمجھنے لگے۔

وہ بوڑھا اس لڑکی کو بیٹی کہتا تھا۔ .. بیٹی گل... اور وہ لڑکی اسے بابا کہتی تھی۔ جھونپڑے میں ہمارے سوا کسی چوتھے شخص کا وجود نہیں تھا۔ گل کی ماں کا بھی نہیں...

ساتویں روز میں اٹھ بیٹھنے کے قابل ہو گیا۔ بخار اتر چکا تھا اور ٹانگ کا زخم پہلے سے بہت بہتر تھا۔

"گل... " میں نے کہا۔ "اب تک میں نے جو بھی سوال کیا ہے تم نے اور تمہارے بابا نے مجھے خاموش کرا دیا... لیکن اب میں پوچھ کر ہی رہوں گا کہ تم لوگ یہاں کیسے پہنچے؟"

گل اپنے بالوں میں کنگھی کر رہی تھی۔ اس نے پلٹ کر مجھے حیرانی سے دیکھا۔ "یہ ہمارا گھر ہے... ہم لوگ... میرا مطلب ہے، بابا اور میں ایک رشتے دار کے ہاں گئے ہوئے تھے... اپنی پھوپھی کے گھر جس کے بیٹے کی شادی تھی... ہم شام کو آئے تو تم یہاں بے ہوش پڑے تھے... لیکن اگر ہم نہ آتے تب بھی تم نہ مرتے..."

"وہ کیوں... " میں نے حیرت سے پوچھا۔ "مجھے تو اپنا بھی ہوش نہیں تھا۔ مجھے تو اب بھی یقین نہیں آ رہا کہ میں زندہ ہوں۔"

"تم نے اتنی عقل مندی ضرور کی تھی کہ زخم دھو کر اسے صاف کر لیا تھا۔" وہ مسکرا کر بولی۔ "یہ سات روز پہلے کی بات ہے۔"

... پھر اس نے مجھے بتایا کہ اس کا باپ بستی میں وہ سبزی فروخت کرتا ہے، جسے وہ اپنی تھوڑی سی زمین پر خود ہی کاشت کرتے ہیں۔ ماں گل کے بچپن ہی میں مر گئی تھی۔ بھائی فرنگیوں سے لڑتے ہوئے شہید ہو گیا اور اب وہ گاؤں سے باہر... سب سے الگ رہتے ہیں کیوں کہ اس کے بھائی کی قبر اسی جگہ ہے، جہاں یہ جھونپڑا کھڑا ہے۔ بوڑھا باپ اپنے جوان بیٹے کی موت سے تقریباً پاگل ہو گیا تھا۔ پہلے تو دن رات قبر ہی پر بیٹھا رہتا تھا... پھر اس نے گاؤں والا مکان بیچ کر یہ جھونپڑا بنا لیا جس کے باہر بیٹے کی قبر تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"وہ، تمہیں یہاں اکیلا چھوڑ جاتا ہے؟" میں نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔ "میرا مطلب ہے کہ۔۔۔"

"میں تمہارا مطلب سمجھ گئی۔" اس نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ "لیکن مجھے اپنی حفاظت کرنا آتی تھی۔۔۔ اور یہاں کے لوگ بھی بے غیرت نہیں ہیں۔۔۔ مگر بابا نے مجھے بیٹا بنا کر پالا ہے۔" اس نے میری رائفل اٹھائی۔ "تمہاری رائفل اچھی ہے تو تمہارا نشانہ بھی یقیناً اچھا ہوگا۔۔۔ میرا نشانہ دیکھو گے؟"

اس نے رائفل کندھے سے لگا کر نال کا رُخ دروازے سے باہر کی طرف کیا۔ درختوں، پہاڑ اور اوپر پھیلے ہوئے نیلے آسمان کے سوا سامنے کچھ بھی نہیں تھا۔۔۔ پھر ایک پرندہ آسمان کے پس منظر میں نمودار ہوا۔ رائفل نے گولی اگلی اور میں نے دیکھا کہ سیدھا پرواز کرنے والا پرندہ یکلخت سمت بدل کر اسی خطِ مستقیم پر سفر کرنے لگا جس پر گولی گئی تھی۔

میں بھونچکا رہ گیا۔

گل نے پلٹ کر مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔۔۔ مگر دروازے میں اپنے بابا کو دیکھ کر سہم گئی۔

اس نے جلدی سے رائفل کونے میں رکھ دی۔

"گل۔۔۔" وہ سخت لہجے میں بولا۔ "یہ کیا بدتمیزی ہے۔ کسے دکھا رہی تھی تُو نشانے کی یہ مہارت؟"

"مجھے بابا۔۔۔" میں نے کہا۔ "خدا کی قسم اگر میری کوئی بہن ہوتی تو ایسی ہی ہوتی اور میں اس پر فخر کرتا۔"

بوڑھے کا رنگ ایک لمحے کے لیے متغیر ہوگیا۔ وہ آہستہ آہستہ میری طرف بڑھا۔ "شہباز۔۔۔ شہباز خانا۔۔۔ تُو نے اسے پہچانا نہیں، گل۔۔۔ میں نے تو دیکھتے ہی پہچان لیا تھا۔"

"بابا۔۔۔" گل تڑپ کر بولی۔ "یہ شہباز خان نہیں ہے۔"

"تم غلط کہتی ہو۔" میں نے کہا۔ "میں شہباز خان ہوں۔ میرا نام یہی ہے۔"

"دیکھا تُو نے گل۔۔۔" بوڑھا خوشی سے چیخ پڑا۔ "میں نے کہا تھا نا کہ تیرا بھائی لوٹ آیا ہے۔"

"بابا مرنے والے لوٹ کر نہیں آتے۔" گل نے دُکھ بھرے لہجے میں اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"کون کہتا ہے شہباز مر گیا ہے؟" بوڑھا برہم ہو کر بولا۔ "شہید زندہ ہے۔۔۔ اور زندہ رہے گا۔ وہ ہمیشہ زندہ رہے گا۔۔۔" وہ بڑبڑاتا ہوا جیسے اپنے آپ سے ہی باتیں کر رہا تھا۔ رائفل نیچے رکھ کر اس نے میرے پیر کو اپنی گود میں رکھ لیا اور پٹی کھولنے لگا۔ "میں نے دیکھ لیا تھا تیرے پاس فرنگی کی رائفل ہے۔ اسی نے تجھے گولی ماری تھی نا؟۔۔۔ مگر تُو فکر نہ کر۔۔۔ یہ زخم ٹھیک ہو جائے گا۔" وہ میرے زخم کا معائنہ کرتے ہوئے بولا۔ "ایسے زخم مردوں ہی کو لگتے ہیں۔ آج تُو مجھے بتا نا کہ خنزیر کا گوشت کھانے والوں کا کیا انجام ہوا؟"

گل کچھ کہنا چاہتی تھی۔۔۔ مگر میں نے اسے آنکھ کے اشارے سے روک دیا۔ ایک ترماں نصیب بوڑھا جھوٹے سہاروں پر ہی فخر و مسرت کے چند لمحے حاصل کر لے تو کسی کا کیا بگڑتا ہے۔ دُنیا میں کھوٹے سکے بھی تو چلتے ہیں۔ وہ جس کے نصیب میں خوشی نہ ہو اُسے خوشی کے سُراب سے کیوں محروم کیا جائے؟

میری مرہم پٹی کے بعد اس نے نماز پڑھی اور کھانا کھا کر وظیفہ پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔ گل ایک کونے میں جا کر سو گئی تھی لیکن مجھے یوں لگا جیسے میں نے اس کی ہلکی سی سسکی

ایک نوجوان کی عجیب داستان
اشت کھو بیٹھا تھا
Scanned By: Azeem & Ali
سرکلر روڈ اردو بازار لاہور
7668958

سُنی ہو۔

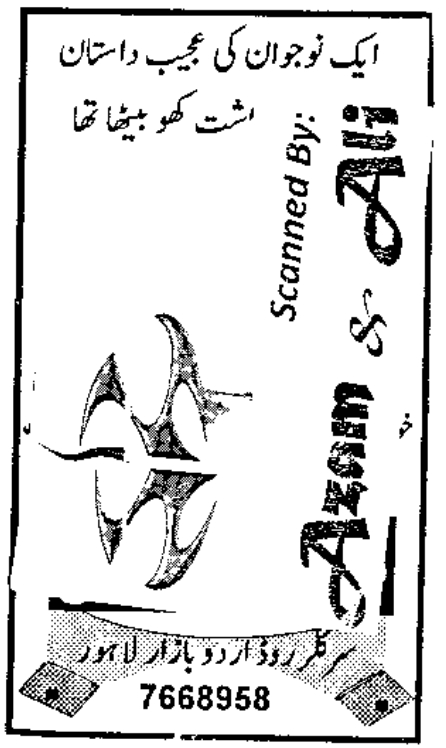

میں نے آنکھیں بند کر لیں۔۔۔

میرے خدا۔۔۔ مجھے اس جھوٹ سے بچا جو سچ سے زیادہ بے رحم ہے۔ شاید وہ دُعا کے مستجاب ہونے کی گھڑی تھی۔ بوڑھا میرے قریب آیا۔ "شہباز خانا۔۔۔ سو گیا؟۔۔۔ اچھا سو جا۔۔۔ کل سہی۔" وہ بڑبڑایا اور اسی کونے میں چلا گیا جہاں گل سو رہی تھی۔ "یہ فرنگی سمجھتے ہیں اپنی طاقت سے ہمیں غلام بنا لیں گے۔ جب تک ایک بھی شہباز خان زندہ ہے، پٹھان سے اس کی آزادی کون چھین سکتا ہے؟ ہم ان کو کتوں کی طرح ماریں گے۔" اس کی آواز اب تک میرے کانوں سے ٹکرا رہی تھی۔

رات نہ جانے کب تک میں اس درد کے احساس سے جاگتا رہا جو میرے دل میں جاگ اٹھا تھا۔ صبح میری آنکھ کھلی تو گل کا باپ جا چکا تھا۔ وہ چولھے کے پاس بیٹھی پاؤں کے انگوٹھے سے زمین کرید رہی تھی۔

"تم بابا کی باتوں کا بُرا مت ماننا۔" وہ مجھے جاگتا دیکھ کر بولی۔ "وہ سب سے ایسی ہی باتیں کرتا ہے۔"

"اس میں بُرا ماننے کی کون سی بات ہے، گل، وہ مجھے اپنا بہادر بیٹا سمجھتا ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ تو میرے لیے فخر کی بات ہے۔"

"تمہیں یہ گولی کیسے لگی تھی؟" اس نے ناشتہ میرے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ "کیا بتایا تھا تم نے اُسے؟"

"کل میں نے اسے کچھ نہیں بتایا تھا۔" میں نے کہا۔ "کیونکہ مجھے جھوٹ بولتے ہوئے ڈر لگتا تھا۔۔۔ اور آج میں اس کے واپس آنے سے پہلے چلا جاؤں گا۔ تم کہہ دینا، شہباز پھر فرنگیوں سے لڑنے چلا گیا ہے۔ ہاں، تمہیں اصل بات بتا دیتا ہوں مگر اس شرط پر کہ تم اسے کچھ نہیں بتاؤ گی۔"

۔۔۔ پھر میں نے اُسے اپنے یہاں تک پہنچنے کی داستان بلا کم و کاست سُنا دی۔

"تم ابھی سفر کے قابل نہیں ہو۔" وہ میری بات ختم ہونے کے بہت دیر بعد بولی۔ "تم یہاں رہ سکتے ہو۔"

"ہاں۔۔۔ مگر میرا فرض مجھے اس کی اجازت نہیں دیتا۔" میں نے کہا۔ "جس روز بھی موقع ملا، میں اپنی اس بہن کے پاس ضرور آؤں گا جس کے نشانے کی مہارت نے مجھے خوش کر دیا ہے۔"

"شہباز۔۔۔!" باہر سے رفیق کی آواز آئی۔ خُدا نے میری دُعائیں قبول کی تھی کہ میرے سفر کا انتظام بھی کر دیا تھا۔ "یہ میرا دوست ہے جو مجھے لینے آیا ہے۔" میں نے کہا۔ "تم اندر چلی جاؤ۔۔۔ اور اب خدا حافظ۔۔۔ جاؤ۔۔۔ خبردار، رونا مت۔"

چپل پہن کر میں نے رائفل کندھے پر لٹکائی اور دیوار کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔ پیر میں درد کا احساس ابھی باقی تھا کیونکہ زخم مندمل نہیں ہوا تھا۔۔۔ لیکن میں چل سکتا تھا۔

رفیق باہر میرا منتظر تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ مسکرایا۔ "خدا کا شکر ہے کہ تم زندہ ہو۔"

"جب تک وقت نہ آ جائے کسی کے چاہنے سے کوئی بھی نہیں مر سکتا۔" میں نے بھی مسکرا کر کہا اور اس سے ہاتھ ملایا۔ "اچھا ہوا کہ تم مجھے لینے آ گئے۔ یہ بتاؤ کہ تمہیں میرے بارے میں کس نے بتایا؟" میں نے اس کا سہارا لے کر آگے قدم بڑھایا۔

رفیق نے ایک لمحے کے لیے اُس جھونپڑے کی طرف دیکھا جس میں سے میں ابھی ابھی برآمد ہوا تھا اور پھر کوئی سوال کیے بغیر میرے ساتھ چل پڑا۔

"غالباً اسی نے جو تمہیں یہاں تک پہنچانے کا ذمے دار تھا۔" رفیق بولا۔ "وہ ایک ضمیر فروش شخص ہے۔ شیر خان نے اس سے چند روپوں میں سودا کیا تھا کہ تم کو یہاں لے آئے۔۔۔ مگر انہوں نے بعد میں ادائیگی نہیں کی تو کل وہ میرے لیے ایک پیغام چھوڑ گیا۔ سرائے والے رحمان بابا نے بتایا کہ وہی شخص اس روز بھی آیا تھا جس دن تم اچانک غائب ہو گئے تھے۔"

"اس نے یہ نہیں بتایا کہ شیر خان اور اس کے ساتھی اب کہاں گئے ہیں؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"کل رات میں اس سے ملا تھا۔" رفیق بولا۔ "مگر وہ اکیلا نہیں تھا اور اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں مسلح ہو کر نہ آؤں۔ اس کی بات سُن کر واقعی میرا دماغ گھوم گیا تھا۔ میں نے اسے بتا دیا تھا کہ اگر شہباز زندہ نہ ملا تو اچھا نہیں ہوگا۔ اس نے کہا کہ شہباز کے قاتل تو شیر خان اور اس کے ساتھی ہیں۔ گل زمان کے علاوہ ان کے گروہ میں تین افراد کا اضافہ ہو گیا ہے۔"

"کون تین افراد؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"ملک نواز کے لوگ ہیں۔" رفیق نے انکشاف کیا۔ "غالباً اس ڈاکے کی اطلاع ملک نواز کے کانوں تک بھی پہنچ گئی ہے۔ اگر یہ اطلاع درست ہے، شہباز تو سمجھ لو کہ اب تمہاری مہم مزید خطرناک ہو گئی ہے۔ ملک نواز، شیر خان اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گل زمان کو پناہ دے دے گا۔"

"ذراسی جلد بازی نے سارا کھیل بگاڑ دیا۔" میں نے زیرِ لب کہا۔ "لیکن خیر... کوئی بات نہیں۔ ایک ملک نواز تو کیا، دس اور جرائم پیشہ بھی ان لوگوں کو اپنی پناہ میں لے لیں، میں انہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

"ایک اطلاع اور بھی ہے شہباز!"

"وہ کیا؟"

"سُنا ہے زرین جان، شیر خان سے ساری رقم لے کر پشاور چلی گئی ہے۔ ایبل چبوترہ کی علاقائی پولیس چوکی پر میرا ایک دوست ہے۔ میں نے اس چوکی اور کوتل کی چوکی سے رابطہ قائم کر کے شیر خان اور گل زمان کا حلیہ بتایا تو معلوم ہوا کہ یہ دونوں ابھی اسی علاقے میں ہیں۔ گویا رقم زرین جان کے پاس ہے اور دونوں بدمعاش یہاں ہیں... ملک نواز کے گرگوں کے ساتھ۔"

"یہ اطلاعات ہیں یا محض اندازے ہیں؟" میں نے حیرت سے کہا۔ "آخر ملک نواز کو شیر خان اور گل زمان سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟"

"میرا تو خیال ہے کہ یہ دونوں ملک نواز کے خاص آدمی ہیں۔" رفیق نے خیال آرائی کی۔ "اگر ایسا نہ ہوتا تو زرین جان رقم لے کر پشاور پہنچنے میں کامیاب نہ ہوتی۔"

"میں سمجھتا ہوں کہ تمہیں غلط فہمی میں مبتلا کیا گیا ہے۔"

"ایک اطلاع اور بھی ملی ہے۔"

"وہ کیا؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔

"سُنا ہے فرنگیوں کی ایک گھوڑا گاڑی سرکاری خزانہ لے کر اس علاقے سے گزرنے والی ہے... اور ملک نواز اس خزانے کو لوٹنا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے اس کے لیے اُسے شیر خان جیسے آدمیوں کی خاص طور سے ضرورت ہوگی۔"

میں سوچ میں پڑ گیا۔ سرکاری خزانے کو لوٹنے کا منصوبہ بناتے وقت واقعی شیر خان جیسے آدمیوں ہی کو سامنے رکھا جا سکتا تھا۔ صورتِ حال پیچیدہ ہو گئی تھی۔ رفیق نے مجھ سے پوچھا کہ میرا گھوڑا کہاں ہے؟

میں اطلس کو بھول ہی گیا تھا۔ اُسے میں نے ایک جگہ باندھ دیا تھا اور پھر زندگی و موت کی کشمکش نے ہر چیز میرے ذہن سے محو کر دی تھی۔ میں تڑپ اُٹھا۔ نہ جانے اتنے دنوں میں اطلس کا کیا حال ہُوا ہوگا...

... لیکن جب میں اس جگہ پہنچا جہاں گھوڑے کو باندھا تھا تو میری آنکھیں دُور دُور تک ویران چٹانوں میں بھٹکتی رہ گئیں۔ گھوڑے کا کہیں نام و نشان تک نہیں تھا۔

"میرا خیال ہے ان لوگوں نے جاتے وقت گھوڑے کو دیکھ لیا ہوگا۔" میں نے کہا۔ "اور گھوڑا اب انہی کے پاس ہوگا۔"

"یہ تمہارے لیے بڑا بے چین تھا۔"

"اوہ..." میں نے رفیق کی بات سُن کر دل میں کسک سی محسوس کی۔ میں جب سرائے سے موت کے اس سفر پر روانہ ہُوا تھا تو کتا کہیں آوارہ گردی کرنے گیا ہُوا تھا اس لیے میں اُسے ساتھ نہیں لا سکا تھا۔

میں رفیق کے ساتھ گھوڑے پر سوار واپس قصبے کی طرف چل دیا... لیکن ابھی ہم ویران چٹانوں کے علاقے سے نہیں نکلے تھے کہ ان گنت گھوڑوں کی ٹاپیں سُنائی دیں۔ ایک لمحے کو یوں محسوس ہُوا جیسے بے شمار ہتھوڑے زمین کی سینہ کوبی میں مصروف ہوں۔ میرا جسم ٹھنڈے پسینے میں ڈوبنے لگا اور رفیق کے حلق سے ایک گھٹی گھٹی سی چیخ نکل گئی۔ اسی لمحے ایک فائر ہُوا اور گولی میرے کان کے قریب سے سنسناتی ہُوئی گزر گئی۔

ابلیکا
اسلم راہی
جس میں حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک دنیا کی تاریخ پیش کی گئی ہے
سات جلدوں میں مکمل سیٹ۔ /1950 روپے
مکتبہ القریش
اردو بازار لاہور

ایک لمحے کے لیے مجھے یُوں محسوس ہُوا جیسے میرے اس کان کی سماعت ختم ہو گئی ہو جس کے قریب سے گولی سنسناتی ہُوئی گزری تھی... رفیق نے گھوڑے کی باگیں سختی سے کھینچ رکھی تھیں اور وہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔

"گھبرانے کی ضرورت نہیں۔" میں نے اس کے کان کی طرف جھکتے ہُوئے کہا۔ "یہ گولی ہم پر نہیں چلائی گئی... بلکہ کسی نے محض شرارتاً رائفل کی لبلبی دبا دی تھی۔"

میں نے رفیق کو سمجھایا اور اس کے باوجود زین سے لٹکی ہُوئی رائفل کو کھینچ لیا۔ میری نگاہ نیچے وادی پر جمی ہُوئی تھی جہاں بے شمار گھڑسوار نظر آ رہے تھے۔ اُن کا رُخ مغرب کی طرف تھا۔

ان بے شمار گھڑسواروں سے مقابلے کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا تھا لیکن وہ ہماری طرف متوجہ نہیں تھے۔ ہم اس وقت بلندی پر تھے اور وہ نیچے وادی سے گزر رہے تھے۔ غالباً ان میں سے کسی نے محض شغل کے لیے گولی چلا دی تھی اور رائفل کا رُخ چونکہ اس طرف تھا جدھر ہم موجود تھے اس لیے گولی اس طرف آئی اور میرے کان کے قریب سے گزر گئی تھی۔ گولی کے دھماکے کے ساتھ ہی بے شمار قہقہے بھی گونج گئے تھے۔

"اوہ... یہ تو ملک سکندر کا گروہ ہے۔"

"ملک سکندر...؟" میں نے حیرت سے دُہرایا۔ "یہ کون ہے؟"

"اس علاقے میں اس کا سب سے زیادہ اثر و رسوخ ہے۔ ملک نواز سے بھی زیادہ... اگر شیر خان اور اس کے ساتھی ملک نواز کی بجائے ملک سکندر کے گروہ میں شامل ہو جاتے تو تمہارے لیے بے پناہ دُشواریاں پیدا ہو جاتیں۔"

"خدا جو کرتا ہے بہتر ہی کرتا ہے۔ میں دُشواریوں سے گھبرانے والوں میں سے نہیں ہوں۔" میں نے جواب دیا اور اُن گھڑسواروں کو وادی میں سے گزرتے ہُوئے دیکھتا رہا۔

جب وہ لوگ وادی سے نکل گئے تو میں نے رفیق کو ٹہوکا دیا۔ "چلو دوست! اب آگے بڑھ چلو... اب ہمیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔"

جاسوسی ڈائجسٹ کا مقبول سلسلہ
سرکش
محمود احمد مودی کے شہکار قلم سے
2
قیمت
مکمل
مکتبہ
Scanned By: Ali & Azam
ایک درندے کی پراسرار داستان
درندہ
یعقوب جمیل کے ہوشربا قلم سے جس کا قارئین کو برسوں سے انتظار تھا
مکتبہ القریش سرکلر روڈ اردو بازار لاہور
فون 7668958

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رفیق نے گھوڑا آگے بڑھا دیا۔

میں نے رائفل دوبارہ زین میں اُڑس دی۔ اس وقت میں گہری سوچ میں ڈوبا ہوا اس مکان کا جائزہ لے رہا تھا کہ شیر خاں اور گل زمان کا راستہ کہاں روکوں؟... اچانک مجھے ایک تدبیر سوجھ ہی گئی۔ میں نے رفیق سے ——— اس کا تذکرہ کرنا مناسب سمجھا کیونکہ وہ کم از کم اس سلسلے میں تو میری مدد کر ہی سکتا تھا۔

"رفیق... کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ میں سرکاری خزانہ لانے والی گاڑی کے ساتھ ہو جاؤں؟" میں نے کہا۔

"ہو تو سکتا ہے" رفیق نے کہا "لیکن چوکی کے انچارج سے بات کرنی پڑے گی۔ یہیں کوہاٹ سے بنوں جانے والی سڑک تک جانا ہوگا۔ گاڑی اکتیس تاریخ کو پشاور سے چلتی ہے وہ پہلی یا دوسری تک تین دن میں بنوں پہنچ جاتی ہے۔ راستے میں ایک رات ان کا قیام 'اسمٰعیل چبوترہ' پر ہوتا ہے۔ دوسری رات درمیانی چوکی پر بسر ہوتی ہے جہاں گارڈ تبدیل ہوتے ہیں۔ ویسے تو اس نگرانی کی کوئی حیثیت نہیں مگر پولیٹیکل ایجنٹ کے ذریعے ایک معاہدہ ہو چکا ہے جس کی رُو سے ہم اس کی حفاظت کے ذمے دار ہیں۔ ظاہر ہے شیر خاں جیسے لوگ اس ذمے داری سے مبرا ہیں۔"

"اگر مجھے اس گاڑی میں جگہ مل جائے تو میں شیر خاں اور گل زمان سے نمٹ سکتا ہوں" میں نے کہا۔

"شہباز..." رفیق نے تھوڑے سے تامل کے بعد کہا... "میں اب مزید تمھارا ساتھ نہیں دے سکتا کیونکہ مجھے جرگے کے سلسلے میں مردان جانا ہے لیکن میں تمھیں چوکی تک لے چلتا ہوں۔"

اس وقت تک ہم پھر اس مقام پر آ گئے تھے جہاں مگوری کے سردار اور باقی ساتھیوں پر قاتلانہ حملہ کر کے لٹیروں نے سردار سے زر چھین لی تھی۔ اب وہاں گھوڑے کی جگہ ہڈیوں کا ایک پنجر پڑا تھا۔ طوفان نے اس وفادار جانور کی جان لے لی تھی۔ گدھ اور حشرات الارض اور دوسرے جنگلی جانور اس کا گوشت چاٹ گئے تھے لیکن میں ڈھانچہ دیکھ کر ہی نہیں بلکہ دوسری بہت سی چیزیں دیکھ کر اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ یہ سردار ہی کے گھوڑے کا ڈھانچہ ہے۔ زین... لگام... اور رکاب وغیرہ۔

میں کچھ دیر وہاں افسردہ کھڑا رہا... پھر رفیق کے ساتھ ہی آگے بڑھ گیا۔

ذرا سی دیر میں وہ جگہ پیچھے رہ گئی جہاں میں ایک طوفان کے دوران قتل ہوتے بچا تھا... جہاں ایک شہباز خاں کی قبر پر اس کا بوڑھا باپ مجاور بنا بیٹھا تھا... اور جہاں ایک بڑی بڑی سیاہ آنکھوں والی دختر کوہسار رہتی تھی جو رائفل سے نشانہ لے کر اُڑتے پرندوں کو گرا سکتی تھی۔

کوہاٹ سے بنوں جانے والی سڑک وہاں سے دُور تھی۔ چھ گھنٹے بعد ہم چوکی تک پہنچ گئے۔

چوکی صرف دو کمروں پر مشتمل تھی۔ ایک کو دفتر کہا جا سکتا تھا کیونکہ اس میں ایک بھدی سی میز کے گرد چار کرسیاں پڑی تھیں۔ دوسرے کمرے میں نگران اپنے ایک ماتحت کے ساتھ رہتا تھا۔

دیوار پر اُن کے کپڑے ٹنگے ہوئے تھے۔ کمرے سے ملحق برآمدے کے بعد باورچی خانہ تھا اور پھر غسل خانہ وغیرہ تھے۔ جب نگران نے رفیق سے اس کا نام لے کر مصافحہ کیا تو میں حیران رہ گیا۔ وہ اس علاقے کی خاصی جانی پہچانی شخصیت تھا۔

نگران، پولیس کا سب انسپکٹر تھا اور اس کا ماتحت ایک کانسٹیبل... جب ہم رہائشی کمرے میں بیٹھ کر قہوہ پی چکے تو رفیق نے اپنی آمد کا مقصد بیان کیا۔

نگران سوچ میں پڑ گیا۔

میں نے اس کے شکوک رفع کرنے کے لیے ابتدا سے ساری بات اس کے گوش گزار کرنا مناسب سمجھی۔

وہ کچھ مطمئن تو ہو گیا لیکن اس نے مجھے بتایا کہ یہ کام بہت خطرناک ہے۔ اگر واقعی چند مجرم گاڑی کو لوٹنا چاہتے ہیں تو ان سے نمٹنے کے لیے زیادہ آدمیوں کی ضرورت پڑے گی... ایک کوچبان... ایک سائیس اور دو محافظ گاڑی کے ساتھ ہوں گے۔ یہ سب لوگ مسلح ہوتے ہیں اور ایسے حالات سے نمٹنے کے ماہر بھی ہوتے ہیں۔ پانچواں اگر میں ہوا تو امکان اس بات کا ہے کہ سب سے پہلے ڈاکو

مجھے ہی نشانہ بنائیں گے۔

میں نے کہا کہ مجھے آگے یا پیچھے بٹھانے کی بجائے گاڑی کے اندر چھپا دیا جائے۔ میں غیر متوقع طور پر کود پڑوں گا تو کم سے کم دو کو سنبھلنے سے پہلے نشانہ بنا لوں گا۔

نگران کو یہ ترکیب پسند آئی۔ اس نے بتایا کہ گاڑی اگلے روز اسی وقت آئے گی۔ لہٰذا چوبیس گھنٹے میں اس جگہ چھپ کے رہ سکوں گا۔

میں نے رضامندی ظاہر کر دی کیونکہ میں خود بھی کسی کے سامنے گاڑی کے اندر نہیں چھپنا چاہتا تھا۔ رفیق مطمئن ہو گیا تو اس نے جانے کی اجازت چاہی...

"شہباز...!" وہ چلتے چلتے بولا "میرا خیال ہے ایک مہینے بعد مجھے ٹھیکہ مل جائے گا۔ میں معاوضے کی بات نہیں کروں گا کیونکہ مجھے تمھارے تعاون کی ضرورت ہے۔ جو اعتماد مجھے تم پر ہے وہ کسی اور پر نہیں ہو سکتا۔ ہو سکے تو میرے پاس آ جانا۔"

"کوشش کروں گا" میں نے مسکرا کر کہا "دعا کرنا کہ مجھے اپنے مقصد میں کامیابی ہو۔"

"خدا تمھارا حامی و ناصر ہو" اس نے گھوڑے کو ایڑ لگاتے ہوئے کہا۔

میں اسے سرپٹ گھوڑا دوڑاتے اور دھول کے بادل میں غائب ہوتے دیکھتا رہا... پھر میں اندر آیا اور لیٹ گیا۔

تھکن کے باعث مجھے نیند نے آ لیا۔ شام کو میں نے کانسٹیبل کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھایا۔ نگران نے کچھ معذرت آمیز لہجے میں کہا کہ یہاں یہی سرکاری ضیافت ممکن ہے۔

★★

گھوڑا گاڑی کو صبح دس بجے آنا تھا۔ رات کو نگران نے مجھے آگے کا راستہ سمجھا دیا۔

"یہاں سے تقریباً دس میل تک سپاٹ میدان ہے جس میں کوئی قریب آنے کی کوشش کرے تو ایک میل سے نظر آ جاتا ہے... پھر چار میل تک چڑھائی ہے۔ اس کے بعد پانچ میل تک سڑک مسلسل موڑ کاٹتی ہوئی بلندی کی طرف بڑھتی جاتی ہے۔ عموماً اوپر پہنچ کے گھوڑوں کو دم لینے کے لیے روکا جاتا ہے۔ آگے چھ میل اُترائی ہے جہاں گھوڑا گاڑی کی رفتار بہت تیز ہوتی ہے۔ چنانچہ زیادہ امید یہی ہے کہ ڈاکو اس وقت حملہ کریں گے جب گھوڑا گاڑی چڑھائی کی جانب رواں دواں ہوگی۔ اس وقت رفتار کم ہوتی ہے۔"

... لیکن میرا خیال تھا کہ شیر خاں اتنا بے وقوف نہیں ہے۔ وہ غیر متوقع حملہ کرے گا... اور غالباً اس وقت جب گھوڑا گاڑی بلندی سے بستی کی جانب سفر شروع کرے گی لیکن میں نے اپنے خیال کا اظہار مناسب نہیں سمجھا۔

کمرے کی ایک کھڑکی سڑک کی طرف بھی کھلتی تھی۔ دفعتاً اندھیرے میں مجھے ایک سایہ سا متحرک دکھائی دیا۔ میرے متوجہ کرانے پر نگران نے لالٹین کی روشنی کی... مگر وہ شخص چھلاوا تھا فوراً غائب ہو گیا۔

نہ جانے کیوں مجھے خیال آیا کہ شیر خاں اور اس کے ساتھیوں میں سے کوئی یہاں مخبری کے لیے آئے گا اور جب گھوڑا گاڑی سرکاری خزانہ لے کر پہنچ جائے گی تو یہ اطلاع اپنے ساتھیوں تک پہنچانے نکل جائے گا کہ وہ تیار رہیں۔

صبح میں نے کھڑکی بند رکھی لیکن خود ایک درز پر آنکھ رکھے بیٹھا رہا۔

گھوڑا گاڑی گیارہ بجے کے قریب نمودار ہوئی اور عین چوکی کے سامنے رُکی۔ دونوں گھوڑوں کے منہ سے جھاگ نکل رہا تھا اور وہ بُری طرح ہانپ رہے تھے۔

آگے بیٹھا ہوا کوچبان بڑی مستعدی سے نیچے اُترا... کارتوسوں کی پیٹی اس کے ایک کندھے سے وتر بناتی ہوئی کمر تک پہنچ رہی تھی۔ رائفل دوسرے شانے پر تھی۔

آگے پیچھے رائفل لے کر بیٹھنے والے محافظ بھی اسی حلیے میں تھے۔ وہ نیچے اُتر کر گاڑی کے قریب کھڑے رہے اور مسلح سائیس نے گھوڑوں کے سامنے پانی کی بالٹی رکھ دی۔

چوکی کا نگران اور اس کا ماتحت کانسٹیبل تیار بیٹھے تھے اور اب انھیں محافظ کی حیثیت سے اگلی منزل

ـ جانا تھا۔ میں اُٹھنے ہی والا تھا کہ میں نے سڑک ـے ایک شخص کو گزرتے دیکھا جو گھوڑے پر تھا ن وہ گھوڑا گاڑی پر نگاہ ڈالے بغیر ہی نکل گیا۔ ہم اس ایک جھلک میں ہی میں نے گل زمان کو شناخت لیا۔

میرا اندازہ درست ثابت ہُوا تھا۔

گل زمان اب اپنے ساتھیوں کو بتانے گیا تھا سرکاری خزانہ آرہا ہے۔ گاڑی کے اندر بیٹھنے سے پہلے میں نے گران کو یہ بات بتا دی۔ نگران آگے کوچبان کے ساتھ بیٹھا ا۔ اس کا ماتحت کانسٹیبل پیچھے بنی ہوئی چوکی پر بیٹھ گیا۔ جو ڑی کے ساتھ آئے تھے وہ وہیں رہ گئے اور گھوڑا گاڑی آگے انہ ہوگئی۔

دس میل کا میدانی سفر کسی پریشانی کے بغیر ختم ہوگیا... ر گھوڑوں کی رفتار کم ہوگئی اور اندر بند ڈبے میں خزانے کے بہرہ دوقوں پر یٹ کرنے نے اندازہ کر لیا کہ چڑھائی شروع ہوگئی ہے رجگہ بہت کم تھی اور مجھے جھٹکے لگ رہے تھے لیکن میں ی طرح مستعد ذاتقل لیے ہنگامی صورتِ حال کا مقابلہ نے کے لیے تیار...

ڈیڑھ دو گھنٹے بعد چڑھائی بھی ختم ہوگئی اور وڑے رُک گئے لیکن میں اسی طرح بند رہا۔

میری قیاس آرائی کے درست ہونے کے امکانات یادہ ہوگئے تھے۔ ڈاکو ابھی تک سامنے نہیں آئے تھے۔

آدھے گھنٹے بعد گھوڑوں نے پانی پی لیا تو سفر پھر روع ہُوا۔ ابھی اترائی کا آغاز ہی تھا کہ مجھے دونوں طرف ے کسی کے چلانے کی آواز آئی۔

"رُک جاؤ... رُک جاؤ۔ ورنہ گولی مار دوں گا۔"

یہ شیر خان کی آواز تھی۔

للکار کے ساتھ ہی فائر بھی ہُوا... پھر کسی نے جوابی ر بھی کیا۔

کوئی محافظ چیخ پڑا۔

تانگے پیچھے کے محافظ نیچے کود گئے تھے اور اب گھوڑا ہی کی آڑ میں سے فائر کر رہے تھے۔ میں نے لات مار کر بے پیچھے کیبن کا دروازہ کھولا اور سڑک پر گر گیا۔ میری پہلی ہلے نے اس شخص کو چت کر دیا جو میرے بالکل سامنے تھا نگران کا نشانہ لے رہا تھا۔

"گاڑی نکال کرلے جاؤ۔" میں نے چیخ کر کہا۔"میں ان سے نمٹ لوں گا۔"

دوسری گولی میں نے شیر خان پر چلائی تھی... مگر ایک شخص گھوڑا دوڑاتا ہُوا درمیان آ گیا۔ اس وقت تک شیر خان کی گولی سے کانسٹیبل ہلاک ہو چکا تھا۔ نگران دوڑ کر گاڑی پر چڑھا اور کوچبان نے گھوڑوں کے چابک رسید کیا۔

گل زمان، شیر خان اور ان کا تیسرا ساتھی گاڑی کے پیچھے دوڑے۔ سامنے کی گولی نے ان کے تیسرے ساتھی کو نشانہ بنا دیا اور وہ گھوڑے پر سے گرا تو گھوڑا اسے گھسیٹتا ہوا دور تک لے گیا۔

شیر خان اور گل زمان میگزین خالی ہو جانے کے باعث فرار ہو جانے پر مجبور ہوگئے کیونکہ عقب سے میں ان پر پھر فائر کر رہا تھا۔ گھوڑا گاڑی سیدھی نکل گئی۔ گل زمان اور شیر خان پہاڑوں میں روپوش ہوگئے اور میں سڑک پر کھڑا رہ گیا۔

تقدیر نے ان دونوں کی یاوری کی تھی چنانچہ وہ تینوں تو مارے گئے تھے جنہوں نے ڈاکا ڈالنے کا منصوبہ بنایا تھا اور شیر خان اپنے ساتھی کے ساتھ جان بچانے میں کامیاب ہوگیا تھا۔

ایک کانسٹیبل ادائے فرض کی نذر ہُوا تھا اور اس کی لاش سب سے پیچھے پڑی تھی پھر تھوڑے تھوڑے فاصلے سے دو ڈاکوؤں کی لاشیں تھیں جو لالچ میں زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔

نامور مصنف ایم۔ الیاس۔ کے شہکار
قلم سے ایک اچھوتی کہانی
ذلیل
خوبصورت سرورق عمدہ پرنٹنگ کتابت
قیمت =\150 روپے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے نیچے بیٹھ کر اُن کی جامہ تلاشی لی۔

ان کی جیبوں سے تین تین ہزار روپے برآمد ہوئے اٹھارہ تقسیم چھ... حساب بالکل ٹھیک تھا... اور اس حساب کی رُو سے تیسرے کے پاس بھی تین ہزار ہونے لازمی تھے... مگر گھوڑا اُس کی لاش کو گھسیٹ لے گیا تھا۔

میں نے نیچے راستے پر اُتر کر تقریباً سو گز دور کھڑے گھوڑے کو دیکھا۔ اس کا سوار ابھی تک رکاب میں اُلجھا ہُوا لٹک رہا تھا۔ میں نے تین ہزار روپے نکال لیے اور کُل نو ہزار کی رقم اندرونی جیب میں منتقل کر لی۔ میں لوٹنے ہی والا تھا کہ میرے کانوں سے کسی کے باتیں کرنے کی آواز ٹکرائی۔ میں نے غور کیا اور آواز کی سمت کا تعین کر کے آگے بڑھا۔ تھوڑا سا اوپر پہنچ کر میں شیر خان اور گل زمان کے جھگڑے کی آواز صاف سُننے لگا مگر وہ ایک چٹان کی اوٹ میں تھے اور سامنے جانا میرے لیے خطرناک ثابت ہوسکتا تھا۔

وہ ناکامی پر سخت مشتعل تھے۔ خصوصاً گل زمان جو شاید یہ سمجھتا تھا کہ بیس ہزار کی رقم خاک میں ملنے کا ذمّے دار شیر خان ہے جس نے پہلے زرین جان کو اس میں شریک کیا... پھر اس کے تین رازداں اور پیغام بر تھے جو واقفِ راز ہونے کے بعد زبردستی برابر کا حصہ لے گئے اور مارے گئے۔ شیر خان نے کہا کہ مایوسی کی کوئی بات نہیں۔ ان کا مارا جانا اچھا ہی ہُوا۔ رقم ان کی جیب میں ہے اور لاشیں سڑک پر پڑی ہیں... اور زرین جان پنج دَر میں ہے پشاور میں نہیں۔ اس سے رقم واپس بھی لی جا سکتی ہے۔

"تم سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہو رہے ہو شیر خان۔" گل زمان بولا۔ "زرین جان اگر پنج دَر میں ہے تو کس کے پاس ہوگی؟ ملک سکندر کے پاس... تم میں اتنا حوصلہ ہے کہ ملک سکندر کا مقابلہ کر سکو؟... اور سڑک پر جو لاشیں رہ گئی ہیں ان کو تو بھول ہی جاؤ۔ اب شہباز نے سب سے پہلے ان کی دولت پر قبضہ کر لیا ہوگا۔ وہ آدھی سے زیادہ رقم تو واپس وصول کر چکا ہے اور اب بھی ہمارے لیے خطرہ بنا ہُوا ہے۔ ہم سڑک پر گئے تو وہ ہمیں کتّے کی موت مار دے گی اور اس نے نہ مارا تو بھی سرکاری گاڑی لاشیں اُٹھانے کے لیے واپس آئے گی... وہ ہمیں مار ڈالیں گے..."

"تم ٹھیک کہتے ہو گل زمان۔" میں نے چیخ کر کہا۔"میں واقعی تمہیں کتّے کی موت مار دوں گا۔ اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو آج رات پنج دَر کے قریب دریا کے پُل پر میری رقم پہنچا دو... پھر میں واپس چلا جاؤں گا۔"

جواب میں شیر خان نے مجھے ایک غلیظ گالی دی۔ "تم ابھی واپس چلے جاؤ شہباز۔ بعد میں تمہاری لاش بھی شاید نہ مل سکے۔"

"شیر خان! ہمت ہے اور مرد کے بچے ہو تو سامنے آکر مقابلہ کرو۔" میں نے اسے چیلنج کرتے ہُوئے کہا۔

"جو مل گیا ہے اسے ہی غنیمت جانو شہباز۔" شیر خان چلّایا۔ "اور باقی کو زندگی کا صدقہ سمجھ کے بھول جاؤ۔"

"تم ابھی تک بچے ہُوئے ہو۔" میں نے اس کی بات کو نظر انداز کر دیا۔ "کیا تمہاری ماں نے تمہیں اپنا دودھ نہیں پلایا تھا۔"

اس طرح میں اسے مشتعل کرنا چاہتا تھا کہ وہ چٹان کی اوٹ سے نکل آئے لیکن وہ بہت عیار تھا فوراً میری چال کو سمجھ گیا۔

"اس کا جواب میں مناسب وقت پر دُوں گا شہباز۔" وہ چیخ کر بولا۔

"اگر آج رات ہی پُل پر آجاؤ تو فیصلہ ہو سکتا ہے۔" میں نے اونچی آواز میں کہا۔"میں تمہارا انتظار کروں گا۔"

میری بات کا کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

چند منٹ بعد گھوڑوں کے روانہ ہونے کی آواز آئی۔ وہ دونوں نکل گئے تھے لیکن اب مجھے اتنا ضرور معلوم ہوگیا تھا کہ ان کی اگلی منزل پنج دَر ہے۔ وہ ایسی حالت میں تھے کہ میں اگلی چٹان پر چڑھے بغیر انھیں نشانہ نہیں بنا سکتا تھا اور جب وہ مجھے دکھائی دیے تو بہت دُور جا چکے تھے۔

میں آہستہ آہستہ واپس چل دیا۔

ایک گھوڑا اپنے مُردہ مالک کی لاش کا وزن سنبھالے وہیں کھڑا تھا۔ میں نے لاش کا پیر رکاب سے نکالا اور لاش کو وہیں چھوڑ کر گھوڑے پر سوار ہوگیا۔

دشمن مجھ سے نصف گھنٹہ پہلے روانہ ہو چکے تھے لیکن ان سے بعید نہیں تھا کہ وہ راستے میں رُک کر میرا انتظار کریں۔ انھیں معلوم ہو چکا تھا کہ میں بھی پنج دَر کی طرف بڑھ رہا ہوں۔

اگر زرّین جان وہاں نہ ہوتی تو عین ممکن تھا کہ وہ اپنی سمت بدل دیتے اور ڈیرہ شہے سے خاور اور غزنا کی طرف نکل جاتے۔ سردست وہ صرف مجھ سے دُور رہنا چاہتے تھے۔ چنانچہ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ پنج دَر سے بیزو ہو کر ڈیرہ اسماعیل خاں پہنچ جائیں... مگر شہر اُن کے لیے خطرناک تھے۔ پولیس کو اب تک اُن کے حلیے سے مطلع کر دیا گیا ہوگا اور یہ اطلاع ہر تھانے میں پہنچ گئی ہوگی کہ اس نام کے افراد پر سرکاری خزانہ لُوٹنے کی کوشش کرنے کا الزام ہے۔ اب وہ میرے ہی نہیں فرنگی سرکار کے بھی مُجرم تھے۔

تمانئی کی طرف راستے بند ہو جاتے تھے چنانچہ وہ صرف ذمیر اور پنوارہ کی طرف جا سکتے تھے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ دشمنوں کو انتظار کرنے دوں اور خود ذمیر پہنچ جاؤں۔

رات کو میری واپسی اسی پُل کے راستے ہو سکتی تھی جس پر ملنے کے لیے میں نے شیر خان کو مشورہ دیا تھا۔ گو اس کے امکانات بہت کم تھے کہ وہ کیوں آسانی سے مالِ غنیمت واپس کر دیں گے... مگر میرے لیے یہ راستہ اختیار کرنے میں کوئی نقصان نہیں تھا۔ پُل سے گزر کر میں پنج دَر پہنچ سکتا تھا۔

ذمیر تک ہموار میدانی راستوں پر میں نے اپنا سفر چند گھنٹوں میں طے کر لیا اور رات ہوتے ہوتے اس چھوٹی سی بستی میں جا پہنچا۔

یہاں مجھے جاننے والا کوئی نہ تھا اور نہ یہاں رات بسر کرنے کے لیے کوئی سرائے تھی۔ چنانچہ میں نے مسجد کا رُخ کیا۔

نماز پڑھ کر واپس جانے والے ایک شخص نے مجھ سے پُوچھا تو میں نے بتایا کہ میں مسافر ہوں اور مجھے پنج دَر جانا ہے۔

وہ کچھ دیر بعد اپنے گھر سے کھانا لے کر آیا اور

سنہری غول
اسلم راہی ایم اے   قیمت: /150
جاسوسی ڈائجسٹ کا مقبول سلسلہ
سرکش
محمود احمد مودی کے شہکار قلم سے
12 حصوں میں شائع ہو گیا ہے
قیمت فی حصہ =/50 روپے
مکمل سیٹ =/600 روپے
مکتبہ القریش
سرکلر روڈ اردو بازار لاہور
فون 7668958

میرے پاس بیٹھ گیا۔ عمر میں وہ تقریباً مجھ سے دس سال بڑا تھا۔

"پنج دَر میں کون ہے؟ تمھارا کوئی دوست یا عزیز؟" اس نے پُوچھا۔

یہ بڑا مشکل سوال تھا۔ میں کسی کو بتانا نہیں چاہتا تھا کہ پنج دَر میں صرف میرے دشمن ہیں۔ "میں... میں ملک سکندر سے ملنے جا رہا ہوں۔ تم جانتے ہو اسے؟ میرا مطلب ہے کیسا آدمی ہے وہ؟"

"تمھاری بات بہت عجیب ہے۔" وہ شخص کچھ دیر بعد بولا۔ "جب تم اسے جانتے ہی نہیں تو ملنے کیوں جا رہے ہو اور جا ہی رہے ہو تو پھر اس سے کیا کہ وہ کیسا آدمی ہے۔ یہاں کے لوگ اُسے اچھا نہیں سمجھتے بہرحال وہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خطرناک آدمی ہے۔"

میں نے اس کی بات پر کچھ کہنے کی بجائے کھانا ختم کر کے اس کا شکریہ ادا کیا اور سونے کے لیے لیٹ گیا... مگر اس کے جاتے ہی میں اُٹھا اور مسجد سے باہر آ گیا۔

پُل تک کم سے کم ایک گھنٹے کی مسافت تھی۔ چاندنی چھٹکی ہوئی تھی اور موسم میں ہلکی سی خنکی تھی۔ راستہ صاف نظر آ رہا تھا چنانچہ میں نے ایک گھنٹے بعد گھوڑے کو ایک درخت سے باندھا اور پیدل آگے چلنے لگا۔

مجھے یقین تھا کہ میرے دُشمن مخالف سمت سے میری آمد کے منتظر ہوں گے... پھر بھی میں پُھونک پُھونک کر قدم اُٹھاتا رہا اور درختوں کی اوٹ میں آگے بڑھتا رہا۔

بظاہر پُل پر کوئی نہیں تھا۔

پُل کے پہلے ستون کی اوٹ سے میں نے ایک پتھر پھینکا۔ ایک سایہ سا درمیان سے نمودار ہو گیا... مگر یہ شیر خان نہیں تھا۔ چاندنی میں اس کی صُورت کے نقوش تو واضح نہیں تھے لیکن قدوقامت اور چال ڈھال سے وہ گُل زمان بھی نہیں لگتا تھا۔

"شہباز خان۔ سامنے آ کر بات کرو۔" وہ بولا۔

"تم کون ہو؟" میں نے رائفل کا رُخ اس کی طرف رکھتے ہوئے کہا۔ "شیر خان نے تمھیں پیسہ دے کر بھیجا ہے یا مجھے چکّر دے کر لانے کے لیے۔ وہیں رُک کر جواب دو اور خیال رکھو کہ میری رائفل کا نشانہ تمھارا دل ہے۔"

"میں ملک سکندر ہوں شہباز...!" وہ رُک کر بولا۔ "مجھے شیر خان نے بتایا تھا کہ تم یہاں ملو گے۔ میرے آدمی ہر طرف موجود ہیں چنانچہ رائفل کو سنبھال کر رکھو۔"

میں نے ایک جُوا کھیلنے کا فیصلہ کیا اور رائفل کندھے پر لٹکا کر سامنے آ گیا۔ اس طرح کہ اب ہم دونوں ایک دُوسرے کو صاف دیکھ سکتے تھے۔

"میں یہاں اپنا پیسہ لینے آیا تھا۔" میں نے کہا۔

"میں بھی اسی لیے آیا ہوں۔" وہ ایک قدم آگے بڑھا۔ "مجھے بھی اپنا پیسہ چاہیے۔ ملک سکندر کو آج تک کوئی لُوٹ کر نہیں جا سکا۔ میرا مال مجھے لوٹا دو اور واپس چلے جاؤ۔"

"لیکن... لیکن میں نے تمھیں کب لُوٹا ہے؟ میں تو تمھیں جانتا بھی نہیں۔" میں نے حیرانی سے کہا۔

"تم زرّین جان کو جانتے ہو۔" وہ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر آ کر رُک گیا۔ "اس نے ملک سکندر کو غلط سمجھا۔ میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں شہباز۔ میں نے اس کے لبوں سے تمھارا ذکر کئی بار سُنا تھا۔ اب وہ میرا سب کچھ سمیٹ کر نکل گئی ہے۔ دس ہزار نقد اور اتنی ہی مالیت کے زیورات... تم اس کے یار ہو...!"

"ملک سکندر... تم نے غلط سمجھا ہے!" میں نے اس کی بات کاٹ کر بے خوفی اور اعتماد سے کہا۔ "زرّین جان ایک طوائف ہے جو صرف پیسے کی یار ہوتی ہے... اگر یہ بات تم سے شیر خان نے کہی ہے تو یقین کر لو کہ اس نے تمھارے ہاتھوں ایک بے گناہ اور مظلوم شخص کو قتل کرانے کی چال چلی ہے۔ میں تو شیر خان اور گُل زمان کے پیچھے آیا ہوں جنھوں نے مگوری کے سردار کو قتل کر کے اس سے بیس ہزار روپے چھین لیے تھے۔ یہ رقم لوگوں کی امانت تھی جو اسے لوگوں کو واپس کرنی تھی... اور میں اسی رقم کی واپسی کے لیے ان دونوں کا تعاقب کر رہا ہوں۔ انھوں نے جھوٹ بول کر تمھیں آلۂ کار بنایا تاکہ میں وضاحت سے پہلے ہی تمھارے ہاتھوں مارا جاؤں۔"

وہ توجہ سے میری بات سُن رہا تھا۔ چنانچہ میں نے اسے تفصیل سے بتایا کہ شیر خان اور گُل زمان نے اب تک کتنے لوگوں کے اعتماد کو دھوکا دیا ہے۔

"انھوں نے تو اپنے ایک ساتھی کو بھی مرنے کے لیے چھوڑ دیا تھا اور مجھے یقین ہے کہ وہ مر گیا ہوگا۔ انھوں نے سرکاری خزانہ لُوٹنے کی کوشش کی جس میں اُن کے تین ساتھی مارے گئے۔ اب وہ حکومت کی نظر میں بھی مُجرم ہیں کیونکہ اسی کوشش میں ایک کانسٹیبل بھی ہلاک ہُوا تھا۔"

زرّین جان کے علاوہ میں نے مختصراً ان دونوں کا پس منظر بھی بیان کر دیا۔ "ملک سکندر... میں انصاف چاہتا ہوں اور حقداروں کو ان کا حق دلانا چاہتا ہوں

خواہ اس میں میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے... وہ غریبوں کا پیسہ تھا۔"

"ملک سکندر نے کبھی غریب کا حق نہیں مارا۔" وہ بولا۔ "اور کبھی کمزور پر ہاتھ نہیں اُٹھایا... اور اُسے کبھی زندہ نہیں چھوڑا جس نے اس سے جھوٹ بولا یا اُسے احمق سمجھا۔ ملک سکندر بزدل اور بے غیرت نہیں ہے۔ میرے ساتھ آؤ... اگر تمھاری بات سچ ہوئی تو تمھیں میری حمایت حاصل ہوگی اور یہ جھوٹ ہُوا تو تمھیں صرف کلمہ پڑھنے کی مہلت ملے گی۔"

"مجھے منظور ہے۔" میں نے اس کے ساتھ چلتے ہُوئے کہا۔

ہم دونوں نے ساتھ ساتھ پُل عبور کیا۔

ملک سکندر کی شخصیت بہت باوقار تھی اور اس کے انداز و اطوار کا اعتماد قابلِ رشک تھا۔ پُل کے پار ایک گھوڑا بندھا ہُوا تھا۔ پھر دیکھتے دیکھتے مختلف تاریک گوشوں سے چھ افراد نمودار ہُوئے، جو سب کے سب گھوڑوں پر تھے۔ ملک سکندر کے اشارے پر ان میں سے ایک نے اپنا گھوڑا میرے حوالے کر دیا اور وہ دُوسرے کے ساتھ بیٹھ گیا۔

رات کا سناٹا گھوڑوں کی ٹاپوں سے گونجنے لگا۔

چاند آگے کھسکنے لگا۔

بالآخر ایک آبادی کے خدوخال اندھیرے میں یُوں نظر آنے لگے جیسے سیاہ سائے ہوں۔ ملک سکندر مجھ سے آگے تھا۔ اس کے ساتھی دائیں بائیں گھوڑے دوڑا رہے تھے۔

ایک قلعہ نما حویلی کے دروازے پر ملک سکندر گھوڑا روک کر اُتر گیا۔ چند منٹ بعد میں گل زمان اور شیرخان کے سامنے تھا جن کا رنگ مجھے زندہ سلامت رُوبرو پاکر اُڑ گیا تھا۔

ملک سکندر اُن کے سامنے جا کھڑا ہُوا۔ "اعتراف جرم تمھاری صُورت پر لکھا ہُوا ہے۔" اس نے شیرخان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ تم سکندر کی حویلی میں مہمان بن کے پناہ لے چکے ہو۔ میں اس شخص کو اپنے ساتھ لے آیا ہُوں جسے تم مروانا چاہتے تھے۔ یہ تم سے چند سوالات کرے

نامور مصنف محمود احمد مودی
وہی تحریر اور وہی انداز
کے ساتھ 'اپنے چاہنے والوں
کے لئے ایک نئی سوغات لئے
تلاش
دو جلدیں جلد اول 150/=
جلد دوئم 150/=
خوبصورت سرورق ' بہترین
طباعت و کتابت ' سفید کاغذ
مکتبہ القریش
سرکلر روڈ اردو بازار لاہور
7668958

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گا۔ اگر تم نے اِن کا جواب غلط دیا تو یہ دُوسرا جُرم ہو گا۔ ملک سکندر اپنے مہمان کے ایک جُرم کو معاف کر سکتا ہے۔ دُوسرے کو نہیں...!"

میں نے ان سے ایک ایک کر کے مختلف سوالات شروع کیے اور وہ اپنے سارے جرائم کا اقرار کرتے گئے۔ انھیں اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ خود اپنے پھیلائے ہُوئے جال میں گرفتار ہو گئے ہیں۔

"میں تمھیں سُورج نکلنے تک اس علاقے سے نکل جانے کی مہلت دے رہا ہُوں۔" ملک سکندر نے کہا۔ انتہائی غیظ و غضب کی حالت میں بھی وہ پُرسکون تھا۔ "لیکن جانے سے پہلے تمھیں بتانا ہو گا کہ وہ فاحشہ کہاں گئی ہے؟"

"ہم یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتے۔" شیرخان نے کہا۔ "وہ کہیں بھی جا سکتی ہے اور کسی کے ساتھ بھی جا سکتی ہے... مگر میرا خیال ہے وہ اب پشاور چلی گئی ہوگی... اسے شہر جانے کا بہت شوق تھا۔"

"پشاور شہر میں کس کے پاس؟" ملک سکندر نے سوال کیا۔

"اس نے ایک بار قصہ خوانی بازار کے کسی چپل فروش کا ذکر کیا تھا جو اس کے پہلے شوہر کا بھائی ہے!" شیرخان بولا۔

"جانے سے پہلے باقی نو ہزار روپے بھی میرے حوالے کر جاؤ۔" میں نے رائفل اُٹھاتے ہُوئے کہا۔

"شہباز خان۔" ملک سکندر نے میری رائفل پر ہاتھ رکھ کر نال نیچے کر دی۔ "ملک سکندر کی حویلی میں کسی نے آج تک سوائے ملک سکندر کے رائفل اُٹھانے کی جرأت نہیں کی۔ اس چھت کے نیچے یہ میری پناہ میں ہیں۔ اگر ان کے پاس تمھاری رقم ہو گی تو تمھیں مل جائے گی۔"

گل زمان اور شیرخان نے سوالیہ نظروں سے ایک دُوسرے کی طرف دیکھا... پھر گل زمان نے واسکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور تین ہزار روپے گن کر میرے سامنے رکھ دیے۔ "میرے حصے میں یہی آئے تھے۔" اس نے باقی رقم واپس اندر والی جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔

"میرا حصہ زرین جان کے پاس تھا۔" شیرخان نے خشک لبوں پر زبان پھیر کر کہا۔

ملک سکندر کے اشارے پر اردگرد کھڑے ہُوئے افراد میں سے دو آگے بڑھے اور انھوں نے شیرخان کی تلاشی لی... مگر ان کے پاس واقعی کچھ نہیں تھا۔

"کوئی بات نہیں شیرخان!" میں نے تین ہزار سمیٹتے ہُوئے کہا۔ "باقی چھ ہزار بھی میں وصول کر لوں گا۔ مجھے خوشی ہے کہ منگوری کا سردار مجھ پر جس قرض کا بار چھوڑ گیا تھا اس میں سے چودہ ہزار ادا ہو چکے ہیں!"

... پھر میں انھیں مجرموں کی طرح جان بچ جانے پر خدا کا شکر بجا لاتے ہُوئے خوف زدہ قدموں سے باہر جاتے دیکھتا رہا۔

اگرچہ میں نے شیرخان کی ایک چال کو ناکام بنا دیا تھا لیکن یہ ناکامی میری بھی تھی کہ شیرخان اور گل زمان میرے سامنے آ کر نکل گئے تھے۔ خوشی مجھے اس بات کی تھی کہ اب میری جیب میں کل بارہ ہزار روپے آ گئے تھے۔ بلاشبہ نو ہزار کی بازیابی تین افراد کی موت کا نتیجہ تھی اور میں نے یہ رقم زندہ انسانوں سے نہیں لی تھی بلکہ لاشوں سے چھینی تھی مگر خود شیرخان اور اس کے ساتھیوں نے بھی یہ دولت ایسے ہی حاصل کی تھی۔

دو تہائی رقم کا واپس مل جانا بڑی حوصلہ افزا بات تھی اور مجھے ابتدا میں اپنی مہم میں کامیاب ہونے کے امکانات نظر آنے لگے تھے لیکن اب خدا نے مجھے اس قابل کر دیا تھا کہ میں ان کو منہ دکھا سکوں جن کی امانتوں کو بحفاظت پہنچانے کی ذمے داری مجھ پر عائد ہوتی تھی۔ اب ایک تہائی سے بھی کم رقم رہ گئی تھی اور میں بہت مطمئن تھا۔

جب میں ملک سکندر کا شکریہ ادا کر کے رخصت ہوا تو مجھے قطعی اندازہ نہ تھا کہ شیرخان اور گل زمان کس سمت میں گئے ہیں۔ ان کی موجودگی کی خبر وہ خود ہی دے سکتے تھے کہ کسی پوشیدہ مقام سے مجھے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY

www.pdfbooksfree.pk

خط وکتابت کے لئے

مکتبہ القریش سرکلر روڈ، اردو بازار، لاہور۲

گولی کا نشانہ بنا کر وہ سب دولت بھی چھین لیں جو "حق بہ حقدار رسید" کے مصداق میری جیب میں پہنچ چکی تھی اور اپنی ہزیمت کا بدلہ بھی لے سکیں۔ مجھے اندازہ تھا کہ شکست کے احساس اور پے در پے ناکامیوں نے انھیں پاگل کر رکھا ہوگا۔

ان کے لیے بھی مناسب ترین وقت تھا کہ میرا حشر مگوری کے سردار سے بدتر کریں اور بارہ ہزار لے کر میری لاش کو لاوارث چھوڑ جائیں۔ میں بہت محتاط تھا لیکن احتیاط بے سود تھی۔ انھیں رات کی پناہ میسر تھی اور آگے ویران جنگل تھا۔ میں باہر جا کر لوٹ آیا۔

ملک سکندر نے حیرانی سے مجھے دیکھا "واپس کیوں آئے ہو شہباز؟" اس نے پوچھا۔

"ملک سکندر..." میں نے کہا "تم ایک باضمیر اور اصول پرست آدمی ہو۔ میں تم پر اعتماد کرنا چاہتا ہوں۔"

"تمھیں معلوم ہے لوگوں کی رائے میرے بارے میں اچھی نہیں ہے۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولا "لوگ مجھ سے ڈرتے ہیں۔"

"میں اپنی رائے خود قائم کرتا ہوں... اور میرا خیال ہے تم دشمن بھی ہوتے تو میں تم پر بزدل دوستوں سے زیادہ بھروسا کرتا۔ میں ایک امانت تمھارے سپرد کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا اور اپنی جیب میں سے بارہ ہزار روپے نکالے "یہ لوگوں کی امانت ہے جو میں اپنی جان کے ساتھ گنوانا نہیں چاہتا۔ کیا تم میری یہ امانت مگوری پہنچا سکتے ہو؟"

ملک سکندر اپنی مونچھوں کو بل دیتا رہا "شہباز تمھیں معلوم ہے کہ زرتین جان کے فرار ہو کر یہاں آنے کے ذمے دار تم ہو اور اس طرح بالواسطہ طور پر میرے نقصان کا باعث بھی تم ہو۔ نہ تم اس کا پیچھا کرتے نہ وہ یہاں آتی۔ اگر میں اس سے اپنا نقصان پورا کر لوں اور یہ رقم ضبط کر لوں تو کیا یہ غلط ہوگا؟"

"اس کا فیصلہ تم خود کر سکتے ہو۔" میں نے کہا "لیکن مجھے یقین ہے تم ایسا نہیں کرو گے۔"

وہ مسکرا دیا "جاؤ... رقم پہنچ جائے گی۔" پھر اس نے چٹکی بجائی "جاؤ شہباز خان تم پل تک چھوڑ آؤ۔ میں تم سے پہلے پل پر ملا تھا۔" وہ پھر مجھ سے مخاطب ہوا "وہاں تک تمھاری حفاظت کا ذمے دار میں ہوں۔ پل تک تم خود آئے تھے۔"

"آگے میرا خدا میرا محافظ ہوگا۔" میں نے اس سے مصافحہ کیا "میں مرنے سے نہیں ڈرتا کیونکہ موت خدا کے حکم کے بغیر نہیں آسکتی۔ جس چیز کی حفاظت کی ذمے داری تم نے قبول کر لی ہے وہ زیادہ اہم تھی۔"

میری ذرا سی احتیاط اس وقت میرے کام آگئی۔

وہ دونوں ملک سکندر کے ڈیرے سے کچھ دور میرے انتظار میں بیٹھے تھے لیکن انھوں نے مجھے ملک سکندر کے آدمیوں کی حفاظت میں دیکھا تو وہ دونوں بڑی عجلت میں فرار ہوئے اور شمال کی جانب نکل گئے۔ ملک سکندر کے ایک آدمی نے پیچھے سے دو فائر کیے اور اس کا قہقہہ دیر تک گونجتا رہا۔

مجھے پل پر چھوڑ کر وہ واپس چلے گئے تو میں کچھ دیر وہاں کھڑا سوچتا رہا کہ کیا شیر خان اور گل زمان واپس آئیں گے۔ عقل کہتی تھی کہ وہ چکر لگا کے ضرور آئیں گے۔ وہ بارہ ہزار لینے اور مجھ سے پیچھا چھڑانے کا یہ سنہرا موقع نہیں گنوائیں گے۔ انھیں معلوم ہوگا کہ ملک سکندر کے آدمی میرے ساتھ زیادہ دور تک نہیں جائیں گے۔ اکیلا پاتے ہی وہ مجھ پر حملہ کریں گے۔

میں پل سے گزر کر تقریباً سو گز دور گیا اور گھوڑے کو ایک درخت سے باندھ کر لوٹ آیا... پھر میں پل کے نیچے اتر گیا۔

اب صبح کاذب کا اجالا پھیلنے لگا تھا اور کچھ ہی دیر میں صبح ہونے والی تھی۔ موسمی دریا خشک پڑا تھا اور پل کے نیچے بڑے گول چکنے پتھروں کا بستر بچھا ہوا تھا۔ میں دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور اپنے تھیلے میں سے روٹی نکال کے کھانے لگا۔ جو خشک ہو چکی تھی۔

سفری مشکیزے میں سے پانی پی کر میں نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خود پر غنودگی سی طاری ہوتی محسوس کی۔ میں نے دوبارہ خود کو احساس دلایا کہ مجھے جاگتے رہنا چاہیے ورنہ میری مہم ناکام ہو جائے گی لیکن اس کے باوجود .... میری آنکھ جنگل میں گونجنے والے فائر کی آواز ہی سے کھلی۔

میں چونک کر اٹھ کھڑا ہوا۔

میری چال میرے اندازوں کے مطابق کامیاب رہی تھی۔ انھوں نے میرے گھوڑے کو گولی مار دی تھی۔ اب ان کا اِس کی طرف آنا یقینی تھا۔

کچھ دیر بعد گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز سنائی دینے لگی۔

میں دبے پاؤں کنارے سے اوپر کی طرف بڑھنے لگا۔

آسمان پر شفق کا اُجالا پھیل گیا تھا اور آہستہ آہستہ وہ دونوں عین میرے نشانے کی زد میں آ گئے۔ اگر میں چاہتا تو وہیں ان دونوں کو موت کی نیند سُلا سکتا تھا لیکن مجھے ان کے قتل سے زیادہ اس رقم کی فکر تھی جسے ان سے وصول کرنا تھا۔ یہ میری ذمے داری تھی کہ .... ہر ایک کو اس کی امانت واپس مل جائے اور خُدا کا شکر ہے کہ اس نے مجھے یہ ذمے داری نبھانے کے لیے زندگی کی جہلت اور ہمت عطا کی۔

"شیر خان...!" میں نے ان کے قریب آتے ہی کہا۔ "وہیں رُک جاؤ اور یاد رکھو کہ اس وقت میرا نشانہ خطا جانے کا قطعی کوئی امکان نہیں ہے۔ اگر تم نے ذرا بھی حرکت کی تو مارے جاؤ گے!"

وہ دونوں منجمد ہو گئے۔

ان کے ہاتھ جو غیر ارادی طور پر رائفل کی طرف بڑھے تھے نیچے ہو گئے۔

"شیر خان... گل زمان! میں تمھیں قتل نہیں کرنا چاہتا!" میں نے کہا۔ "سردار کے قتل کا بدلہ اُدھار رہے گا۔ فی الحال مجھے صرف باقی چھ ہزار روپے چاہئیں جو لوگوں کی امانت ہیں!"

"ہمارے پاس اس وقت کچھ بھی نہیں ہے!" شیر خان نے بمشکل تمام کہا۔

"میں تم سے ایک ایک پائی وصول کروں گا شیر خان!" میں نے کہا۔ "اور اگر مجھے مارنے کی کوشش میں تم خود مارے گئے تو قصور میرا نہیں ہو گا۔ چھ ہزار خاطر تم زندگی کو داؤ پر لگا سکتے ہو تو میں بھی سکتا ہوں۔ باقی رقم سے اب ہاتھ دھو لو کیونکہ وہ تم نے ملک سکندر کے ہاتھ مجبوری بھجوا دی ہے!"

میری بات کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ یکلخت ان کی یہ اُمید خاک میں مل گئی کہ بارہ ہزار انھیں پھر مل جائیں گے۔

"تم جھوٹ کہتے ہو!" گل زمان نے کہا۔ "ملک سکندر پر کوئی بھی اعتماد نہیں کر سکتا۔ وہ بدمعاش ہے۔"

"تم جیسے لوگ واقعی اس پر اعتماد نہیں کر سکتے!" میں نے کہا۔ "کیونکہ تم اس کے مقابلے میں بہت چھوٹے اور گھٹیا بدمعاش ہو جو دوستی اور دشمنی دونوں میں اصول اور اخلاق کی روایات کو پامال کر سکتے ہو۔ میں نے اس پر اعتماد کر کے کوئی غلطی نہیں کی اور اگر تمھیں یقین نہیں تو تم اس سے معلوم کر سکتے ہو... بشرطیکہ تم میں اس کی ہمت ہو!"

"ہمیں مہلت چاہیے!" شیر خان نے کچھ دیر بعد کہا۔ صاف ظاہر تھا وہ جان بچا کر نکلنے کے لیے جھوٹ بول رہا ہے۔

"میں تمھیں ایک ہفتے کی مہلت دوں گا!" میں نے بھی مصلحتاً کہہ دیا۔ "ایک ہفتے کے اندر اندر تم یہ رقم ملک سکندر کو پہنچا سکتے ہو۔ اگر یہ رقم زرین جان کے پاس ہے تو یقیناً تمھیں معلوم ہو گا کہ وہ کہاں ہے؟ شوہر کو اپنی بیوی کے بارے میں خبر تو ہوتی ہی ہے۔ ایک بات اچھی طرح سمجھ لو۔ اگر تم نے کسی شہر کا رُخ کیا تو پولیس تمھیں پکڑ لے گی۔ تم اب اشتہاری مجرم ہو اور اگر اسی علاقے میں رہو گے تو مجھ سے چھپ نہیں سکو گے۔ تم نے دیکھ لیا ہو گا کہ اس علاقے میں میرے کتنے دوست بن چکے ہیں۔ تمھارے ساتھ کسی کو ہمدردی نہیں ہے۔ میرا ساتھ دینے والے ملک سکندر جیسے لوگ بھی ہیں!"

"ہم تمھاری بات مان چکے ہیں!" شیر خان نے کہا۔ "اب تم کیا چاہتے ہو؟"

"اپنی رائفلیں نیچے ڈال دو!" میں نے حکم دیا۔ "گھوڑے سے اُتر کر پُل کی دوسری جانب پیدل روانہ ہو جاؤ۔ میں تمھیں دیکھتا رہوں گا۔ سو قدم چلنے کے بعد تم واپس آ سکتے ہو۔ تمھاری رائفلیں یہیں پڑی مل جائیں گی!"

ان دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر اپنی رائفلیں ایک ساتھ نیچے پھینک دیں۔

گھوڑی کو پُل سے باندھ کر وہ چند قدم آگے بڑھے ہی تھے کہ میں نے فائر کر دیا۔

ایک گھوڑا ہنہنایا اور نیچے گر کر ٹانگیں چلانے لگا۔

وہ دونوں اُچھل کر پلٹے۔

"شہباز خان۔ تم نے بدعہدی کی ہے!" شیر خان نے چیخ کر کہا۔ "تم نے ابھی کیا کہا تھا؟"

"میں نے صرف یہ کہا تھا کہ واپسی پر تمھیں رائفلیں یہیں ملیں گی!" میں نے مسکرائے بغیر کہا۔ "تم نے میرا گھوڑا مار ڈالا تھا۔ اس کے بدلے میں میں نے تمھارے گھوڑے کو مار دیا ہے۔ تیسرے گھوڑے پر میں اپنا سفر جاری رکھوں گا اور تم کسی غلط ارادے سے میرا تعاقب کرنا چاہو گے تو تمھیں پیدل چل کر آنا پڑے گا۔ اب اپنا رُخ دوسری طرف کر لو اور روانہ ہو جاؤ!"

یہ اُن کے عزائم کی بدترین شکست تھی۔ وہ اپنی چالاکی سے مجھے بیوقوف بنا کر اس مشکل سے نکلنے کی فکر میں تھے تاکہ بعد میں مجھے آسانی سے شکار کر لیں۔

"شیر خان...!" میں نے کہا۔ "کیا سوچ رہے ہو۔ میں تین تک گنوں گا... ایک... دو... تین...!"

اس کے ساتھ ہی میں نے فائر کر دیا۔

گولی یقیناً گل زمان کے کان کی لَو کو چھوتی ہوئی گزری ہو گی کیونکہ وہ ایک کان پکڑتا ہوا پلٹ رہا تھا... گرا... پھر اُٹھا اور مجھے گالیاں دیتا ہوا بھاگنے لگا۔

شیر خان اس کے پیچھے پیچھے دوڑا۔

ہنستے ہنستے میرا بُرا حال ہو گیا۔

بزدل اور بے ضمیر آدمی کو کتنی غلط چیزوں سے پیار ہوتا ہے۔ بے غیرت زندگی سے... حرام کی دولت سے... عورت کی صورت سے...

جب وہ سو قدم سے بھی آگے نکل گئے تو میں اپنی کمین گاہ سے نکلا اور شیر خان کے گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ اس کا گھوڑا بھی اپنے مالک کی طرح بزدل تھا۔ وہ فوراً میرے اشاروں پر دوڑنے لگا۔

میرا رُخ اب اسی پولیس چوکی کی طرف تھا جہاں سے میں نے سرکاری خزانہ لے جانے والی گاڑی میں سفر کا آغاز کیا تھا۔ وہ میرے لیے محفوظ ترین جگہ تھی۔

"شہباز خان...!" نگران نے مجھے دیکھ کر مسرت سے کہا۔ "تم کہاں غائب ہو گئے تھے۔ ہم تو سمجھے تھے کہ تم مارے گئے ہو اور دشمن تمھاری لاش لے گئے ہیں۔ ہم بعد میں لاشیں اُٹھانے کے لیے مسلح پولیس کی ایک اور گاڑی لے کر آئے تھے!"

"کیا وہ کوئی بدنام لوگ تھے؟" میں نے بیٹھتے ہوئے سرسری انداز میں پوچھا۔

"ان میں سے دو اشتہاری مجرم تھے!" نگران نے جواب دیا۔ "ہم نے تو تمھاری بہادری اور سرکاری خزانے کو بچانے کی کوشش میں جان کی بازی لگا دینے پر تمھارے ورثا کے لیے خصوصی انعام کی سفارش کر دی تھی!"

میں ہنسے بغیر نہ رہ سکا۔ "کیا اپنا وارث میں خود نہیں ہو سکتا۔ کتنا انعام ملے گا مجھے؟"

"ہم نے دس ہزار کی سفارش کی تھی!" نگران نے جواب دیا۔ "مگر سُنا ہے کہ پولیٹکل ایجنٹ صاحب بہادر نے پانچ ہزار منظور کیے ہیں۔ آج صبح جو سرکاری گاڑی ڈاک لے کر گئی ہے، اس میں ایجنٹ کے آفس کا ایک کلرک بھی تھا۔ گاڑی کل واپس جائے گی۔ تم چاہو تو پشاور جا سکتے ہو!"

"کیا واقعی مجھے پانچ ہزار مل جائیں گے؟" میں نے حیرانی سے دریافت کیا۔

"کیوں نہیں... میں صداقت نامہ لکھ دوں گا!" نگران نے مسکرا کر کہا۔ "کہ تم ہی وہ شہباز ہو جس کے بارے میں غلطی سے فرض کر لیا گیا تھا کہ مارے گئے ہو۔ میری ڈیوٹی بھی کل بدل جائے گی لیکن کل تک تم میرے یہاں رہ سکتے ہو!"

اس کا ماتحت اب ایک اور کانسٹیبل تھا۔ مجھے اندر جا کر لیٹتے ہوئے اس کانسٹیبل کا خیال آیا جو ادائے فرض میں مارا گیا تھا۔ نہ جانے اس کے ورثا کو حکومت کیا دے گی؟ جان کے بدلے مال؟ زندگی کی قیمت؟...

آخر زندگی کی کیا قیمت ہو سکتی ہے؟

میری سوچوں میں تلخی پیدا ہو گئی تھی کیوں کہ انگریز سرکار ایک ایسی حربے سے مسلمانوں کو بھٹک جانے پر مجبور کر دیتی تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے اس کارنامے کا انعام نہیں لینا چاہیے۔ لہٰذا بھی میں نے یہ سب کچھ کسی معاوضے کے لیے نہیں کیا تھا۔

... لیکن نہیں۔ مجھے خود کو تھوڑا سا بدلنا چاہیے!

میرے اندر سے ایک آواز خود بخود ہی ابھر آئی۔

میرے ذہن میں بابا شالیہ خان کا دھندلا سا پیکر تیار ہونے لگا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ وہ فرنگیوں کی قید میں ہیں۔

میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ مجھے چاپلوسی اور حکمت عملی کی راہ اختیار کرنی چاہیے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ میں بظاہر فرنگیوں کا وفادار بن جاؤں اور پس پردہ بابا شالیار کو تلاش کرتا رہوں... اور جیسے ہی اُن کا سُراغ ملے، میں انہیں رہا کروا کر راہِ فرار اختیار کر لوں؟

یہ میری سوچ نہیں تھی۔

اسے حالات نے میرے ذہن میں یوں پیدا کر دیا تھا جیسے بے یقینی کے عالم میں انسان کے دل میں خود بخود ان گنت وسوسے جنم لینے لگتے ہیں۔ اس خیال کے ساتھ ہی میری آنکھیں سختی سے بند ہو گئیں۔

میرے تصور میں ملال ریشم جان کا غضب ناک پیکر اتر آیا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ میری اس مصلحت کوشی پر بے حد ناراض ہو اور وہ مجھ سے چیخ چیخ کر کہہ رہی ہو کہ شہباز! میں نے تمہیں جو تربیت دی تھی کیا وہ اس لیے دی تھی کہ تمہارا اندازِ فکر بھی عام آدمی جیسا ہی رہے؟

میں کانپ گیا۔

ملال ریشم جان کے تصور نے مجھے خیالوں اور خوابوں کی دنیا سے نکل آنے پر مجبور کر دیا۔ شیر خان اور گل زمان کو میں نے جو مہلت دی تھی وہ اس سے استفادہ کر کے راہِ فرار بھی اختیار کر سکتے تھے... لیکن نہ جانے کیوں مجھے یقین تھا کہ وہ میری دسترس سے باہر نہیں جا سکتے۔

... پھر مجھے ملک سکندر کا بھی خیال آیا۔

میں نے اسے جو رقم دی تھی۔ معلوم نہیں اس نے اسے مگوری بھجوا دیا ہے یا نہیں؟ لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شاید بغیر وہ سکا کہ کہیں وہ رقم آسمان سے گر کر کھجور میں تو نہیں اٹک گئی... نہ جانے کیوں میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ ملک سکندر اس رقم میں ہیرا پھیری نہیں کرے گا۔ اگر اسے ایسا کرنا ہوتا تو وہ اپنے ساتھی آدمیوں کی موجودگی میں مجھ سے وعدہ نہ کرتا۔ اس پر کوئی دباؤ نہیں تھا اور نہ ہی وہ مجھ سے خوف زدہ تھا... پھر اسے مجھ سے وعدہ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

اچانک مجھے ملک نواز کا خیال آ گیا۔

اس شخص کو میں نے اب تک نہیں دیکھا تھا۔ رفیق نے اس کے بارے میں مجھے جو معلومات بہم پہنچائی تھیں، ان کے مطابق اس کا گروہ ملک سکندر کے گروہ سے چھوٹا تھا۔ لیکن شیر خان اور گل زمان نے تو ملک نواز کے ساتھیوں سے ساز باز کی تھی پھر یہ ملک سکندر کے ہاں پناہ لینے پر کیوں مجبور ہو گئے؟

اس بات کا صرف ایک ہی جواب تھا کہ ملک نواز اور شیر خان کے درمیان معاہدہ اطمینان بخش نہیں رہا ہو گا اس لیے شیر خان نے ملک نواز کی بجائے ملک سکندر کے ہاں پناہ لے لی تھی۔

یہ سب کچھ سوچتے ہوئے میرے ذہن میں ایک اور خیال سا ابھرا جس سے صورتِ حال کچھ واضح دکھائی دینے لگی۔ بگھی گاڑی کو لوٹنے میں ملک سکندر کے ساتھی شامل نہیں تھے بلکہ وہ کوئی اور ہی آدمی تھے۔ غالباً وہ ملک نواز کے آدمی رہے ہوں گے... چونکہ خزانہ لوٹنے میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی اس لیے ان میں معاہدہ تشکیل نہیں پا سکا ہو گا۔

... اور اب شیر خان اور گل زمان کو اگر کوئی پناہ دے سکتا ہے تو وہ ملک نواز ہی ہو سکتا ہے کیوں کہ ملک سکندر ان کا ہو کے آج نظر بہر حال ایک اصول پرست آدمی ثابت ہوا تھا۔ شیر خان اور گل زمان اب ملک سکندر کی طرف واپس نہیں آئیں گے۔ میں لیٹا ان بکھرے ہوئے خیالوں میں الجھا رہا... اور پھر نہ جانے کب گہری نیند میں ڈوب گیا۔

مجھے یوں بھی صبح تک اسی چوکی پر قیام کرنا تھا۔

صبح کی پہلی کرن کے ساتھ ہی میں بیدار ہو گیا۔

میں اٹھ بیٹھا۔ چوکی کا نگران گاؤں جانے کی تیاری میں لگا ہوا تھا۔ اس نے میرے لیے صداقت نامہ رات ہی تیار کر کے اس پر مہر لگا دی تھی۔ میں نے کاغذ کے اس پرزے کو تہہ کر کے جیب میں رکھ لیا اور نگران کے ساتھ قہوہ پینے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بیٹھ گیا۔

قہوہ کڑوا تھا لیکن موسمی ٹھنڈک کی وجہ سے اچھا محسوس ہوا۔ قہوے کی چسکیاں لیتے ہوئے نگران نے کہا "شہباز! اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟ اگر پشاور چلنا ہے تو میرے ساتھ چلو۔ راستے میں میرا گاؤں پڑتا ہے۔ وہاں ایک آدھ روز قیام کر کے تم پشاور چلے جانا۔"

"نہیں دوست۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"کیا تم پشاور نہیں جاؤ گے؟" اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

"جاؤں گا... لیکن ابھی نہیں۔"

"حیرت ہے۔ بھائی تمہیں اس صداقت نامے کے دکھاتے ہی ایک خطیر رقم مل جائے گی۔"

"تمہارا کہنا درست ہے لیکن مجھے ابھی اس رقم سے بھی زیادہ قیمتی کام کرنے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔ میرا ذہن بابا رحلن کی سرائے میں الجھ گیا تھا جہاں میرا سامان پڑا تھا۔ اس کے علاوہ مجھے ابھی شیر خان اور گل زمان پر بھی نظر رکھنی تھی۔

میں نے انہیں جو مہلت دی تھی۔ اس کا ایک مقصد تو یہ تھا کہ وہ رقم مجھے مہیا کر دیں اور دوسری وجہ اس قاتل عالم زیب جان کا سُراغ لگانا تھا جو مجھے خاصا نقصان پہنچا گئی تھی۔ میں اسے نہ جانے کیوں ایک نظر دیکھنے کے لیے بے چین ہو گیا تھا۔ میرے نزدیک اس رقم کی بہت اہمیت تھی جسے شیر خان اور گل زمان نے مگوری کے سردار سے چھینا تھا اور میری کوشش تھی کہ وہی رقم مجھے واپس مل جائے۔ صرف رقم ہی کا معاملہ نہیں تھا۔ ملک نواز اور ملک سکندر جیسے لوگوں کے بارے میں بھی مجھے بہت کچھ کرنا تھا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ ان دونوں کو واقعی تھوڑی سی چھوٹ دے دی جاتی۔

"بہر حال شہباز!" نگران نے مسکرا کر میرے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا "اس صداقت نامے کو لے کر جب بھی جی چاہے پشاور چلے جانا، تمہیں رقم مل جائے گی... اور ممکن ہے وہ لوگ تمہارے کارنامے کے پیشِ نظر تمہیں کوئی پیش کش بھی کر دیں۔"

"کیسی پیش کش...؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"کوئی اچھا سا عہدہ جس کے ذریعے تمہاری زندگی بن جائے گی۔"

"میں ملازمت کو غلامی سمجھتا ہوں۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ حالانکہ اس کی بات نے مجھے غصّے سے بھڑکا دیا تھا۔ "ان آزاد فضاؤں سے کہیں اور گیا تو شاید میرا دم ہی گھٹ جائے۔"

"اچھا اچھا...!" اس نے ہنس کر کہا اور مجھے باہر تک چھوڑنے آیا۔

میں نے گھوڑے پر بیٹھتے ہوئے اسے الوداع کہا اور خوارز کی طرف روانہ ہو گیا۔ سورج ابھی نہیں نکلا تھا اس لیے ٹھنڈک زائل نہیں ہوئی تھی... میں نے گھوڑے کو سرپٹ دوڑانا شروع کر دیا... خوارز تک جتنا بھی راستہ رات ہونے سے پہلے پہلے طے ہو جاتا، اتنا ہی اچھا ہوتا۔ چلتے وقت میں نے اپنے تھیلے میں کچھ خشک غذا اور سفری مشکیزے میں چوکی ہی سے پانی لے لیا تھا۔

سورج رفتہ رفتہ نکلا اور پھر اس کی پگھلے ہوئے سونے جیسی دھوپ چٹانوں پر پھیلتی چلی گئی۔ گھوڑا تیزی سے دوڑ رہا تھا اور اس کی ٹاپوں سے چٹانیں گونج رہی تھیں۔ میں ابھی چوکی سے تین میل کا فاصلہ ہی طے کر پایا تھا کہ اچانک مجھے گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دیں۔ میں نے اس سمت میں دیکھا جدھر سے یہ ٹاپیں سنائی دے رہی تھیں۔ دور سے غبار سا اڑتا دکھائی دینے لگا۔

میں نے ادھر اُدھر دیکھا۔ قریب ہی ایک چٹان تھی۔ میں نے گھوڑے کا رُخ اس کی طرف موڑا اور پھر چٹان کی اوٹ میں گھوڑے کو روک کر کھڑا ہو گیا۔ ٹاپوں کی آواز میں ہر گزرتے لمحے کے ساتھ شدت پیدا ہوتی جا رہی تھی۔ یہ ایک احتیاطی اقدام تھا۔ اس ویرانے میں یوں اچانک ہی کسی خطرناک ہستی سے مڈبھیڑ بلاوجہ کی مصیبت کا باعث بن سکتی تھی۔ اگر ایک گھوڑے کی ٹاپیں سنائی دیتیں تو شاید میں یہ احتیاط نہ کرتا لیکن آوازوں سے معلوم ہوتا تھا کہ چار گھوڑے اسی طرف دوڑتے ہوئے آ رہے ہیں جدھر میں چٹان کی اوٹ میں کھڑا ہو گیا تھا۔

گھوڑے اس چٹان کے قریب سے گزر گئے۔ وہ لوگ آپس میں باتیں کرتے ہوئے، قہقہے لگاتے ہوئے اور گھوڑوں کو دوڑاتے ہوئے چلے جا رہے تھے... ان کے انداز سے فاتحانہ صورتِ حال ظاہر ہو رہی تھی... ایک جملہ سن کر میں چونک پڑا۔

"لڑکی تھی خطرناک..."

اس جملے پر گھوڑوں کی ٹاپوں کا شور غالب آ گیا۔

میں الجھن میں پڑ گیا... لیکن میں ان گھڑسواروں کو روک کر اس جملے کی وضاحت نہیں طلب کر سکتا تھا۔

گھوڑے گزر گئے تو میں ایک بار پھر اپنی منزل کی طرف

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

روانہ ہو گیا۔ دُھوپ میں تیزی آتی جا رہی تھی اور مجھے احساس تھا کہ چند میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد مجھے رُکنا پڑے گا۔۔ کیوں کہ جلتی ہُوئی دُھوپ میں سفر کرنا اس ویران علاقے میں ممکن نہیں رہتا تھا۔

اچانک مجھے ایک عجیب سے احساس نے گھیر لیا۔

"لڑکی بھی خطرناک۔۔؟"

یہ جملہ بار بار میرے ذہن میں گونج رہا تھا۔

میں جس احساس کی وجہ سے بے چین ہو رہا تھا، وہ یہ تھا کہ گھڑسوار جس سمت سے آئے تھے، ایک گھر اُسی جانب واقع تھا۔ وہ گھر جہاں گل رہتی تھی اور جہاں ایک زخم خوردہ باپ رہتا تھا۔

میری بے چینی بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

میں نے گھوڑے کو مزید تیزی سے دوڑانا شروع کر دیا۔

جو چار گھڑسوار چٹان کے سامنے سے گزرے تھے، ان کی صرف ایک ہی جھلک مجھے دکھائی دی تھی۔۔۔ لیکن وہ چہرے میرے ذہن میں نقش ہو کر رہ گئے تھے۔

"گل۔۔!" میں نے یہ نام زیرِ لب دُہرایا۔

وہ میری بہن تھی۔ اس نے مجھے موت کے مُنہ سے نکالا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر خدانخواستہ ان بدمعاشوں نے اسے کوئی نقصان پہنچایا ہے تو پھر دُنیا کے آخری کونے تک انہیں پناہ نہیں ملے گی۔۔۔ اور میں انہیں ہر حال میں تلاش کر لوں گا۔

بے قراری کے عالم میں میں گھوڑے کو بار بار ایڑ لگا رہا تھا۔

گرمی بڑھتی جا رہی تھی۔

ہوا کے جھونکے اب کسی بھٹی سے نکلتے ہُوئے گرم بھبکے محسوس ہو رہے تھے۔ گل کا گول گول سُرخ سا چہرہ بار بار میری آنکھوں کے سامنے پھر جاتا تھا۔ مجھے اس کے بوڑھے باپ کا بھی خیال آیا جو پہلے ہی اپنے بیٹے کی موت سے زخم خوردہ تھا۔ اگر گل کو کچھ ہو گیا تو وہ زندہ درگور بوڑھا ایک سانس بھی نہیں لے سکے گا۔

گھوڑا بُری طرح ہانپ رہا تھا۔

گھوڑے کے پسینے کی وجہ سے میری ٹانگیں تک گیلی ہو گئی تھیں اور زین پر بیٹھنا دُشوار ہو رہا تھا۔ خود میرے سر کا پسینہ پیروں تک پہنچ رہا تھا۔۔۔ لیکن میں جلد [illegible] تک پہنچ جانا چاہتا تھا۔ میں اُسے ایک نظر دیکھ کر اطمینان کر لینا چاہتا تھا۔

سورج سر پر آ کر عقب میں سرکنے لگا اور جلتی ہُوئی دوپہر میں گھوڑا یوں ہانپنے لگا کہ مجھے اس کے گر جانے کا خدشہ لاحق ہونے لگا۔ میں نے اسے روکا نہیں۔ میں فیصلہ کر چکا تھا کہ اگر گھوڑے کی پُشت پر سفر جاری نہ رکھ سکا تو دوڑتا ہُوا اس جھونپڑے تک پہنچوں گا۔

راستہ جیسے جیسے کم ہوتا جا رہا تھا، میری بے چینی بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

سہ پہر تک میں اس جگہ جا پہنچا جہاں سے بوڑھے کا جھونپڑا صاف دکھائی دینا چاہیے تھا۔۔ لیکن وہاں جھونپڑا نہیں تھا۔۔۔ جھونپڑے کی جگہ جلتا اور سُلگتا ہُوا ملبہ تھا۔

میں نے گھوڑے کو طوفانی رفتار سے وہاں تک پہنچایا اور پھر کود گیا۔ "گل۔۔!" میں نے چیخ کر کہا۔ میری آواز وادی میں گونج اُٹھی اور میں جواباً اپنی ہی آواز کی بازگشت سُنتا رہا۔

"گل۔۔!" میں نے دُوسری بار اُسے پکارا۔

کوئی جواب نہیں ملا۔

میں اس جلتے ہُوئے ملبے کو گھورتا رہا۔ دفعتاً مجھے یوں محسوس ہُوا جیسے میں نے ایک دھیمی سی چیخ سُنی ہو۔ میں نے تیزی سے پلٹ کر اُس طرف دیکھا جدھر سے آواز آئی تھی۔ مجھے ایک رنگین کپڑا سا پھڑپھڑاتا دکھائی دیا۔

میں دوڑتا ہُوا وہاں تک پہنچا۔

یہ ایک بلند چٹان کا کنارہ تھا اور وہ رنگین کپڑے کی دھجی ایک خاردار جھاڑی میں اُلجھی ہُوئی تھی۔ میں نے چٹان سے نیچے دیکھا اور پھر مجھے یوں لگا جیسے کسی نے کوئی بہت بڑی چٹان اُٹھا کر میرے سینے پر دے ماری ہو۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر نیچے دیکھا اور پھر بے اختیار میرے ہاتھ بلند ہو گئے۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھوں کو ڈھانپ لیا۔ میرے جسم پر کپکپاہٹ طاری ہو گئی تھی۔

چند لمحوں تک میں اسی حالت میں رہا۔۔۔ پھر میں نے خود کو سنبھالا اور پلٹ کر اس راستے کی طرف دوڑتا چلا گیا جس پر چل کر میں اس چٹان کے نچلے حصّے تک پہنچ سکتا تھا۔

Shahzad Library SAHIWAL

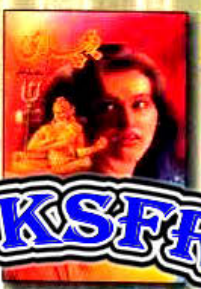

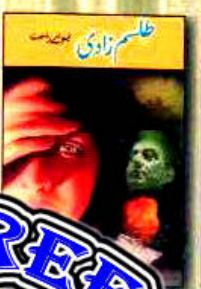

Courtesy www.pdfbooksfree.pk
خوبصورت اور مقبول کتابیں
درخشاں
(7 جلدیں) قیمت: 2000.00 روپے
(2 حصے) قیمت: 90.00 روپے
(4 حصے) قیمت: 180.00 روپے
(12-حصے) قیمت: 600.00 روپے
(5-حصے) قیمت: 250.00 روپے
خبیث
(2 جلدیں) قیمت: 300.00
(مکمل) قیمت: 150.00 روپے
PDFBOOKSFREE.PK
(2 جلدیں) قیمت: 300.00 روپے
(مکمل) قیمت: 400.00 روپے
(2 جلدیں) قیمت: 300.00 روپے
(4 جلدیں) قیمت: 600.00 روپے
(2-حصے) قیمت: 108.00 روپے
نجات
گنگا کے پجاری ناگ
(مکمل) قیمت: 150.00 روپے
(مکمل) قیمت: 150.00 روپے
(مکمل) قیمت: 150.00 روپے
(2 جلدیں) قیمت: 350.00 روپے
(2-حصے) قیمت: 103.00
مکتبہ القریش
سرکلر روڈ، اردو بازار لاہور 2 پاکستان
فون: 7231595-7668958